سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازی گر

پیش نوشت

بازی گر ایک آشفتہ مزاج اور مہم جو نوجوان بابر زماں کی آپ بیتی ہے۔ بڑی دھوم دھام سے اس کی بہت شہرت کمائی ہے اس نے۔ یہ سب رنگ کا ایک مقبول سلسلہ ہے۔ پڑھنے والے نہایت بے قراری سے اس کا انتظار کرتے ہیں اور بہت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں مگر اس کے مصنف کا نام کبھی شائع نہیں ہوا لیکن جو قارئین شکیل عادل زادہ کے اسلوب طرز نگارش سے آشنا ہیں اُن کے لیے یہ راز کبھی راز نہیں رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شکیل عادل زادہ کا طرز تحریر اس قدر منفرد اور یکتا ہے کہ بقول شاعر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے!

بازی گر کا اسلوب بیانیہ ہے مگر بیانیہ طرز اظہار جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اس میں کبھی کبھی بڑے نازک مقامات آتے ہیں۔ ایسے ہفت خواں سر کرنے پڑتے ہیں کہ بھگا کاتی لے کر نکلنے اور علامتوں کی بیساکھی کے سہارے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔ اس میں رمز و کنایہ سے اس خوبی اور مہارت سے کام لینا پڑتا ہے کہ تحریر میں جھول پیدا نہ ہو۔ سلاست و روانی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ برقرار رہے۔ سچ پوچھیے تو یہ الفاظ کے برمحل استعمال اُن کی نشست برخاست اُن کی ترتیب و ترتیب کا فن ہے اور اس فن میں شکیل عادل زادہ کو مہارت حاصل ہے۔ یہ مہارت انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، محنت اور ریاضت سے حاصل کی ہے۔

شکیل عادل زادہ نے بہت لکھا اور خوب لکھا ہے۔ بازی گر کو اُن کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صرف بابر زماں کی آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے۔ اس کے کردار معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے انسان ہیں جو اندھیرے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اندھیرے ہی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ چور، اچکے، بدمعاش اور غنڈے ہیں۔ قتل و غارت جن کا پیشہ ہے مگر اس شر میں بھی خیر کا پہلو ہے اور یہ زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کا اظہار ہے۔ معاشرے کا کوئی بھی فرد مکمل پارسا نہیں ہوتا۔ اس کے وجود میں ایک اچھا انسان بھی چھپا ہوتا ہے اور اسی برائی اور اچھائی کے امتزاج سے اس کی شخصیت وجود میں آتی ہے۔ اور اسی اچھائی اور برائی کے تضاد سے اُس کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہی تضاد کمالی میں زندگی کا رنگ بھرتا ہے۔ فن کار کا کمال فن یہ ہے کہ اپنے کرداروں کے اس تضاد کی بازیافت کرے اور اس خوبی اور چابک دستی سے کرے کہ اُن کی نفرت اور نفرت اُن کے دکھ درد اور خوشیاں قاری کی اپنی محبت اور نفرت اور اپنی خوشی اور غم بن جائے۔ بات یہ ہے کہ قاری جب قصے کے حصار میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے محرکات صرف محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی خوشیاں، اپنی ناآسودہ خواہشات اور وہ سب کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اسے زندگی میں نہیں ملتا۔ لکھنے والا جب اپنے قارئین کے یہ مطالبات مہیا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تب ہی قبول عام کی سند حاصل کرتا ہے۔ بازی گر ایک ایسی ہی ادبی تخلیق ہے۔ اس میں صرف تفریح طبع کا سامان نہیں ہے، زندگی کی سنسنی آرائی ہے۔ دل چسپی ہے اور کہیں کہیں ہے جو سنسنی خون کی گردش تیز کر دیتی ہے، کبھی دل گرفتہ کر دیتی ہے اور کبھی مبہوت و درد کو کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں اندھیروں میں زخموں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ شکیل عادل زادہ کے فن کی خوبی یہ ہے کہ اندھیرے میں جنم لینے والوں اور اندھیرے میں رہنے والوں نے اپنے کرداروں کی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جس طرح اُن کی عادات و اطوار اور اقدار مختلف ہیں۔ اس طرح اُن کی شناخت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کا اپنا علیحدہ مزاج ہے اور اپنی زبان کی بھی الگ ہی اور سج دھج ہے۔

بازی گر کی تعمیر و تشکیل میں کلاسیکی داستان نگاری اور جدید افسانہ نگاری کا ایسا دل آویز امتزاج ہے کہ اُسے پڑھتے ہوئے الف لیلہ کا سند باد جہازی۔ آرائش محفل کا حاتم طائی، فسانۂ آزاد کا آزاد اور ایسے ہی دوسرے لازوال کردار بار بار آتے ہیں مگر جس طرح یہ تمام کردار اپنی اپنی جگہ منفرد اور یکتا نظر آتے ہیں اسی طرح بازی گر کا بابر زماں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا علیحدہ تشخص رکھتا ہے۔ وہ دلیر ہے، حوصلہ مند ہے، خوب صورت اور وجیہ ہے، دشت نورد ہے، محبت بھی ٹوٹ کر کرتا ہے۔ نفرت کی آگ میں بھی جلتا ہے۔ قدم قدم پر مصائب اور ابتلا سے دوچار ہوتا اور ہر مرتبہ اُن کا مقابلہ کرتا ہے، موت سے آنکھ مچولی کھیلنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ حسینوں اور مہ جبینوں کے حسن اور رعنائی سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ بازی گر ایک ایسا نظام شمسی ہے جس میں بابر زماں کو سورج کا مقام حاصل ہے۔ دوسرے تمام کردار اور واقعات اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ شکیل نے اس کردار کو جس محنت سے تخلیق کیا ہے اسی احتیاط اور مہارت سے اس میں توازن اور اعتدال بھی برقرار رکھا ہے۔ اپنے شگفتہ اور دل نواز طرز تحریر سے اسے سجایا ہے نکھارا ہے اور سنوارا ہے۔

بازی گر شکیل عادل زادہ کی ایک مقبول اور ہر دل عزیز ادبی تخلیق ہے۔ اسے کل بھی قبول عام کی سند حاصل تھی آج بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اسے یہی مقام حاصل رہے گا۔

شوکت صدیقی

۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء

یادگار

شاید یہ میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آتی اگر میں اُس روز گھر جانے کے بجائے خلاف معمول ریلوے اسٹیشن نہ چلا جاتا اور کلکتے سے آنے والی ہوڑہ ایکسپریس تین ساڑھے تین گھنٹے لیٹ نہ ہوتی۔ روزانہ صبح سویرے سیر کرنا میرا معمول تھا۔ یہ عادت میں نے اپنے والد سے سیکھی تھی۔ شروع شروع میں میں اُن کے ساتھ ہی آتا مگر وہ گھنٹوں کے درد کے باعث زیادہ دُور چلنے سے معذور ہو گئے تھے اس لیے میں نے تنہا سحر خیزی شروع کر دی تھی۔ کبھی اس طرف کبھی اُس طرف۔ میں شہر کے مختلف حصّوں میں نکل جاتا اور کوئی آٹھ بجے گھر واپس پہنچتا۔ اُس روز اسٹیشن کی رونق شباب پر تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج ہوڑہ ایکسپریس خاصی تاخیر سے آ رہی ہے۔

ریل جب کسی بڑے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر گرجتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے زندگی کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ جگمگ جگ جاتی ہے۔ خصوصاً میری عمر کے لوگوں کے لیے یہ تماشا دیدنی ہوتا ہے۔ بھاگتے ہوئے قلی، چیختے ہوئے خوانچہ فروش، گھبرائے ہوئے مسافر، آنے والے، جانے والے، بچے، بوڑھے اور جوان نئے نئے چہرے، گورے، کالے، چھوٹے لمبے، دُبلے پتلے۔

میں جس شہر کا ذکر کر رہا ہوں اُس کا نام گیا ہے۔ گیا، بہار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اُس کی آبادی دُھائی لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے تین اطراف پہاڑیاں ہیں اور چوتھی طرف ندی ہے۔ اس محلِ وقوع کے اعتبار سے اُسے دلکش شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کپل دستو سے شاکیہ منی یہاں آئے تو یہیں کے ہو گئے۔ اس شہر کی فضاؤں میں ایک سکون سا لہرا رہا ہے۔ گوتم بُدھ نے یہیں نروان حاصل کیا اس لیے اسے بُدھ گیا کہتے ہیں۔ کچھ لوگ گوتم بُدھ کے اس شہر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ گوتم بُدھ کے اس شہر میں بدھ مذہب کے پیرو برائے نام ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کی آبادی ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جن دنوں یاتریوں کی آمد شروع ہوتی ہے شہر کی گہما گہمی میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تیز ہو جاتی ہے، اذہان سوچنے لگتے ہیں اور بہت سے بے کار لوگ روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی سالگرہ کا یہ میلا مسلسل ایک مہینے تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں شہر کی آبادی خاصی زیادہ ہو جاتی ہے۔ شہر کی اضافی بوجھ کو برداشت کرنا بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ رضا کار طلبہ کے دستے بن جاتے ہیں۔ یہ دیہات سے آنے والے بُدھ مسافروں کی مدد کرتے ہیں اور انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اسٹیشن سے سات میل دُور بدھوں کا خاص علاقہ ہے۔ اسے بُدھ گیا کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کئی مربع میل میں پھیلا ہوا اور ایک جزیرے کی سی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں کی دُنیا قطعی مختلف ہے۔ سارے علاقے میں گوتم بدھ کے چھوٹے بڑے مندر اور دیگوٹے بنے ہوئے ہیں۔ گیروے رنگ کے کپڑوں میں لپٹے بدھ یاتری ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تمام مندروں کی حفاظتی باڑھ کے اندر ہے۔ بعض مندر تو ایسے ہیں جن میں ہیرے جواہر جڑے ہوئے ہیں۔ مندروں کے اس سلسلے کا سب سے نمایاں مندر وہ ہے جس کے احاطے میں پیپل کا ایک بہت قدیم درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ نے اسی درخت

کے سامنے میں ریاضت کی تھی اور رزدان حاصل کیا تھا۔ یہاں ہر طرف گوتم کی مورتیاں ہیں اور اس ترتیب سے نصب کی گئی ہیں کہ ان سے گوتم بدھ کی پوری زندگی کی جھلکیاں ہوتی ہے۔ اس مندر کا کلس بدھ گیا پہنچنے سے بہت پہلے دکھائی دینے لگتا ہے۔ جن دنوں یہاں میلا لگتا ہے اسٹیشن تک سات میل کا راستہ مختلف رنگوں اور نسلوں کے یاتریوں سے آباد ہو جاتا ہے۔ بعض یاتری پیدل چل کے آتے ہیں اور اس طرح گوتم بدھ سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ اُس دن کا ذکر ہے جب شاکیہ منی کی ولادت کا جشن منایا جا رہا تھا اور سارا شہر بدل گیا تھا۔ مجھے بھی طلبہ کے رضا کار دستے میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر میری طبیعت ذرا مختلف تھی، اس لیے میں نے اپنی والدہ کی علالت کا بہانہ کر کے چھٹی لے لی تھی۔ ہوڑہ ایکسپریس آنے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی اسٹیشن پر لگائی گئی ہے کہ وہ یاتریوں کی رہبری کریں۔ آج انھیں خوب مزا آیا ہوگا۔ انتظار میں ساری رات گزر جائی ہوگی۔ اُن کا حال احوال پوچھنے اور ہوڑہ ایکسپریس سے اُترنے والے مسافروں کا تماشا دیکھنے کے لیے میں پلیٹ فارم پر آ گیا جیسے ایک دم کسی نے پلیٹ فارم کی زور سے چٹکی لے لی ہو۔ فضاؤں میں افراتفری بج گئی۔ ہوڑہ ایکسپریس کا سیاہ انجن تیز سیٹیاں بجاتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہو رہا تھا۔ سب طالب علم منتشر ہو گئے۔ میں ایک جگہ چائے کے اسٹال پر دیوار کے ساتھ ٹکا کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے ایک بوڑھا اور اُس کی کم سن لڑکی بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ کسی قلی کی بھی نظر اُن پر نہیں گئی۔ یہ سیزن کا زمانہ تھا۔ قلی کم مسافر زیادہ تھے۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست تھا۔ کوئی رضا کار طالب علم بھی ان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ گو اُن کے پاس سامان مختصر تھا لیکن بوڑھا اُسے اپنے کاندھے پر اٹھاتے ہوئے جھک جاتا تھا۔ کم سن لڑکی اضطراب میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اُس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میری نظریں اسی پر جم گئی تھیں۔ وہ بہت نازک اور حسین تھی۔ میں اُس کی طرف کھنچا چلا گیا اور میں نے آگے بڑھ کے اُن کا سامان اٹھا لیا۔ بوڑھے نے ٹوٹی پھوٹی ہندی اردو میں میرا شکریہ ادا کیا۔ لڑکی کی نگاہیں ممنونیت سے چمک اٹھیں۔ بوڑھا شکل سے ہمالیا کی ترائی والے علاقے کا کوئی باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن لڑکی کے نقش و نگار خاص ہندوستانی تھے۔ صرف اُس کے ماتھے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا تعلق بوڑھے کی نسل سے بھی ہو سکتا ہے، مجھے یقین تھا کہ سکم، نیپال، تبت اور بھوٹان کے سوا ان کا وطن کہیں اور نہیں ہو سکتا۔

اسٹیشن سے باہر آ کے میں نے کسی نہ کسی طرح جدوجہد کر کے ایک تانگا حاصل کیا، میں تانگے والے کے ساتھ بیٹھا اور وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کے رخساروں پر سُرخی چھائی ہوئی تھی ویسے اُس کا رنگ خون میں تھوڑے سے پانی سفید اور پیلا رنگ ملا کے بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے روایتی لبادہ نما ریشمی لباس میں ایک نازک سی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے گندھے ہوئے لمبے سیاہ بال کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اُس کے دانت موتیوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی دراز پلکوں کو جنبش دیتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے تارکا جھلکورے کھانے لگا ہے۔ میری عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی سولہ سترہ سال ہوگی۔ فرسٹ ایر کا طالب علم، گھر میں ضدّی، نک چڑھا اور خودغرض مشہور تھا۔ آج تک کسی لڑکی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ افسانوں اور ناولوں کے قصّے مجھے جھوٹ معلوم ہوتے تھے۔ خاندان میں کئی حسین لڑکیاں تھیں مگر اُن پر نظر ہی نہیں گئی تھی۔ اسکول میں بھی میں اپنے ساتھیوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ اعزا سمجھتے تھے کہ یہ لڑکا خود پسند، مغرور اور بدتہذیب ہے، چنانچہ والد صاحب کی توجہ بھی میری جانب کم سے کم تھی۔ مجھے زندگی ہی کچھ بے مزہ اور بے رنگ معلوم ہوتی تھی۔ صبح اٹھیے، شام تک محنت کیجیے۔ دوسروں کی برائیاں کیجیے، رات کو سو جائیے۔ سب یہی معمول تھا۔ میں جب نویں میں تھا اُسی وقت سے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں زندگی کے اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔ میں نے میٹرک فرسٹ کلاس پاس کیا۔ کالج نے مجھے فرسٹ ایر میں وظیفہ آفر کیا جو میرے زمیندار باپ کی شان کے خلاف تھا۔ انھوں نے حقارت سے اسے مسترد کر دیا حالانکہ زمیں داری کوئی ایسی بڑی نہیں تھی۔ بس کھاتے پیتے لوگ تھے عزت تھی، لوگ احترام کرتے تھے، جھک کے سلام کرتے تھے۔ چار بہنیں، دو چھوٹے بھائی، ایک ماں، ایک باپ۔ اگر مجھے شامل کر لیجیے تو کل نو افراد تھے، بہتر ہے مجھے شامل نہ کیجیے کیونکہ والد صاحب مجھے کالی بھیڑ کے نام سے پکارتے تھے۔ پتہ نہیں، یہ وہ کیوں کہتے تھے؟ میرا قد نکلتا ہوا، رنگ نکھرا ہوا اور چہرہ زمیں داروں کے بیٹوں کے چہروں کی طرح دلکش اور باوقار تھا۔ ہاں میں اپنے مزاج، فکر اور اطوار میں ضرور اُن سے مختلف تھا۔ ضبط کی یہ حالت تھی کہ گرمی، سردی برسات کچھ بھی ہو میرے معمولات میں فرق نہیں آتا تھا۔ ایک بار طے کر لیا تھا کہ صبح سیر کے لیے جایا کریں گے چنانچہ میں جاتا رہا۔ والد صاحب ہار گئے۔ میں نہیں ہارا۔

بوڑھے کے ساتھ اُس لڑکی کو دیکھ کے مجھ پر عجیب سے احساسات طاری ہوئے۔ جسم میں کوئی چیز رڑنے لگی۔ جی چاہا اُسے گھر لے جاؤں اور شیشے کی اُس الماری میں بند کر دوں جس میں چینی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ صبح و شام اُسے دیکھا کروں۔ زلفوں اور رخساروں کے متعلق میں نے صرف شعر پڑھے تھے اور وہ شعر مجھے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ میں شاعروں کو پاگل سمجھتا تھا مگر آج ان کی اور ان کے شعروں کی حقیقت مجھ پر واضح ہو رہی تھی۔ راستے میں بوڑھے شخص نے شفقت سے میرا نام پوچھا اور اپنا نام بتایا۔ اُس کا نام اتین تھا۔

"اور ان کا نام؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

اُس کا نام کورا ہے۔ میری بچی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ تبت سے آ رہے ہیں؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں۔" بوڑھا کچھ سوچتے ہوئے بولا لیکن

ہمارا تعلق ہمالیائی بستیوں ہی سے ہے۔"

"وہاں کے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، شریف، نیک، محنتی۔"

"کیا کے لوگ بھی کچھ کم اچھے نہیں ہوتے۔"

باتیں شروع ہوئیں تو ہم تمام راستے باتیں کرتے رہے۔ اُس نے مجھ سے میری تعلیم، خاندان کے بارے میں پوچھا۔ میری شرافت کی بڑی تعریف کی۔ بوڑھے کی ہندوستانی صاف نہیں تھی لیکن اُس کا لہجہ بھاری بھرکم تھا۔ آنکھوں میں گہرائی اور چہرے پر تدبر تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "آپ وہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"تجارت کیا کر سکتے ہیں؟" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اور یہ؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "یہ پڑھتی ہیں؟"

"ہاں کورا بہت اچھی طالبہ ہے۔"

"کورا! آپ کو یہ نام اچھا لگ رہا ہے؟" وہ اب تک خاموش رہی تھی۔ میں نے پہلی بار ڈرتے ڈرتے اُسے مخاطب کیا۔

اُس کے چہرے کی سُرخی گہری ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں پٹ پٹا کر شکستہ لہجے میں کہا۔ "بہت اچھا۔" اُس کی ہندوستانی بھی ٹوٹی پھوٹی تھی مگر آواز بڑی سریلی اور لچک دار تھی۔

آپ ہمارے گھر آئیے نا، ہماری بہنیں ہیں، ماں ہیں۔ وہ سب آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گے۔"

اُس نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے بجائے بوڑھے نے جواب دیا۔ "ضرور آئیں گے۔ ہم اپنے بیٹے کے گھر ضرور آئیں گے۔"

سات میل کا یہ سفر باتوں باتوں میں کٹ گیا۔ جب ہم بدھ گیا پہنچے تو دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔ مندروں کے کلس چمک رہے تھے اور ہر طرف بدھ یاتریوں کے غول کے غول رواں دواں تھے۔ میں ان دونوں کو خیموں کی طرف لے گیا جہاں منظم نے اُن کے ناموں کا اندراج کیا اور جب انھیں قیام کا پرمٹ نارمل گیا تو انھیں اُن کے خیموں میں بسا کے میں نے اجازت چاہی۔ بوڑھا اتین مجھ سے بہت متاثر تھا۔ وہ مجھے بار بار دعائیں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ اگر اُس کا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ آج میرے برابر ہوتا۔ وہ اپنے خچر سے ایک گہری ڈوبی مگ گر گیا تھا۔ بوڑھے کے لہجے میں سکون، وقار اور دُکھ شامل تھا۔ جب میں واپس جانے لگا تو اتین نے مجھے روک کے اپنا مسند فوق کھولا اور موتیوں کی ایک مالا نکال کے زبردستی میرے گلے میں ڈال دی۔ میں نے مالا کو واپس کرنا چاہی مگر اُس نے میری ایک نہ سنی۔ چلتے چلتے اتین نے میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ پتہ بہت آسان تھا، میرا مکان محلہ کریم گنج میں تھا۔ میں نے اُسے مکان کا نقشہ خوب سمجھا دیا تھا تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ اسی لمحے کورا نے اپنی شیریں آواز سے مجھے روک لیا۔ "آپ ادھر آئیں گے؟" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"ضرور آئیں گے۔" میں نے چہک کر کہا۔ "لیکن آپ بھی آئیں گی۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ضرور ضرور آئیں گے۔"

واپسی میں راستے بھر میرے ذہن میں کوئی اور چیز نہیں تھی۔

کیسا اُلٹ دونوں ہی کے متعلق سوچتا رہا۔ بوڑھے اتین کی دی ہوئی مالا میں نے جیب میں رکھ لی تھی اور کورا کا چہرہ میری آنکھوں میں محفوظ تھا۔ آج کا دن مجھے ایک نیا دن معلوم ہو رہا تھا اور میں خود کو اجنبی اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ گھر کے میں نے اللہ کو تنہا چھوڑنے کی وجہ سے جو سچی بے بندگی اس روح اور اُس کی تعلیق کے لیے میرے پاس اتین کی مالا موجود تھی، اُسے الٹ پلٹ کے دیکھا۔ کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر کہنے لگے۔ "تمھیں یہ مالا کسی صورت میں قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ بیش قیمت موتیوں کی مالا ہے۔ مجھے حیرت ہے اُس شخص نے اتنی معمولی خدمت پر یہ تمھیں کیوں بخش دی؟"

"ہاں، اُسی نے مجھے دی ہے۔" میں نے قدرے ناراضی سے کہا۔ "میں نے اُسے بہت منع کیا مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ ایک بہت نیک، شریف اور مال دار شخص معلوم ہوتا ہے۔"

انھیں مجھ پر شبہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، پہلے ہی میں اُن کا سب سے مشکل بیٹا تھا۔ انھوں نے مالا کئی بار پرکھی اور کسی جوہری کی طرح اسے نگاہوں، ہاتھوں اور والدہ کے سر کی دی جنموں نے احتیاط سے اپنے زیور بکس میں اسے منتقل کر دیا۔

الٰہی جیسے گزرتا تھا گزر گیا، رات آئی تو مجھے نیند نہیں آئی۔ حالانکہ میں جلد سو جانے کا عادی تھا۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ کورا کا چہرہ نظروں میں ہیولا بنا ایسے چپکا تھا کہ کسی کروٹ قرار نہیں تھا۔ میں نے بھی دیکھی تین بجے تھے۔ والد صاحب نہ کی نماز سے پہلے جاگ جاتے تھے تو مجھے اُٹھاتے تھے اُن کے بیدار ہونے سے پہلے گھر سے باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی میں پہلی ہی آواز پر اُٹھ بیٹھا۔ انھیں سلام کیا اور جلد سے جلد کپڑے بدل کے گھر سے نکل گیا۔ آج اِدھر اُدھر جانے کے بجائے میرا رُخ بدھ گیا کی مستقل سڑک کی طرف تھا۔ آدھے راستے تک میں پیدل چلتا رہا، پھر ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ بدھ گیا پہنچنے سے پہلے ہی سُن گُن ہو گیا تھا۔ ہر شخص جاگ گیا تھا اور شاکیہ منی کے مندروں میں پھول چڑھا کر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ شاکیہ منی کو سکون بہت پسند تھا اور صبح سکون اور امن کی علامت ہوتی ہے۔ اس سال دُنیا کے مختلف حصّوں سے گوتم بدھ کے پیروؤں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اتین اس وقت اپنی بیٹی کورا کے ساتھ کسی مندر میں ہوگا۔ احتیاطاً میں نے خیمے میں بھی جھانک لینا مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں وہاں موجود تھے، جب کہ باقی خیموں کے یاسی مندروں میں عبادت کے لیے چلے گئے تھے۔ میں نے خیمے کے باہر سے آواز لگائی۔ بوڑھا اتین برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کے کھل اُٹھا اور میری کرید ہاتھ دکھ کے بولا۔ "آؤ آؤ بیٹے اندر آؤ۔"

"آپ ٹھیک تو ہیں تاپ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں شکل۔ دیکھو کورا! بابر آیا ہے۔" میں رات تم سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔" اتین نے مجھے پہچان لیا۔ وہ چٹائی پر بیٹھا تھا جس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ہی کورا کا بستر تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی، میرے پہنچتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے

اپنی چمکتی اور مسکراتی آنکھوں سے میرا خیر مقدم کیا۔ سلام کے لیے بے اختیار میرے ہاتھ اٹھ گئے، اُسے سلام کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اُٹھے، پھر اُس نے اپنا ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ کے کچھ کہا جسے میں نہیں سُن سکا۔

"آپ کہیں باہر نہیں نکلے؟"

"نہیں مجھے بھیڑ بھاڑ پسند نہیں ہے۔" اعین نے اسے کہا۔

"جب بھیڑ چھٹ گئی تھی، اُس وقت ہم نے رات کو بُدھ گیا کی سیر کی تھی۔ شاکیہ منی جانتے ہوں گے کہ میرا دل اُن میں اٹک دیا ہوا ہے۔"

"اور کورا آپ؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

کورا سے بولا نہیں گیا۔ "یہ۔ یہ تو گھبرا ہی ہوگی۔" اعین نے جواب دیا۔ "کورا تم باہر سے بات نہیں کرتیں؟" کورا کچھ اور شرما گئی اور اُس نے شعائی کا دامن سامنے لا کر رکھ دیا۔ "کچھ کھاؤ نا بیٹے!" اعین نے مجھے شفقت سے کہا۔

"آپ لوگ ہندوستانی بہت اچھی جانتے ہیں۔" میں نے مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" بوڑھا اعین ہنس کر بولا۔ "میں بہت عرصے تک ہندوستان میں رہا ہوں۔ کورا کو ہندوستانی میں نے ہی سکھائی تھی۔ پھر یہاں آ کے ہم نے ـــــ گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی۔ اس سے کورا نے کچھ خاصی ہندوستانی سیکھ لی ہے۔"

میں نے وہاں زیادہ دیر ٹھیرنے کے لیے شاکیہ منی کی تعلیمات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اُس کے سامنے گوتم بُدھ کی زندگی سے متعلق بہت سی روایتوں پر حیرت کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ اعین شدّومد سے گوتم بُدھ کے نظریات علمی اور زندگی کی تبلیغ کرے گا اور اس طرح مجھے یہاں کچھ اور قیام کرنے اور کورا کو اپنے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اعین نے میرا جوش خروش دیکھا مگر کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ اُس نے سرسری انداز میں گوتم بُدھ کی تعلیمات کا ذکر کیا اور کہا جو بدھ کہتے ہیں، وہ سچ ہے کیونکہ گوتم کے قریب آئے بغیر اُسے پہچانا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ اُس سے کم از کم مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک عام بُدھ شخص ہے۔ کوئی بہت یا مبلغ نہیں ہے۔ اس کے تجربہ کار عوامی نے سراغ لگا لیا تھا کہ میں محض لفاظی اور ثنا خوانی کر رہا ہوں۔ گفتگو میں شوق حصول کی وہ شدت نہیں تھی جو ہونی چاہیے۔ کچھ اور نہیں بتا تو میں نے اُس سے کہا۔ "آپ گیا شہر نہیں گئے گیا کیا؟"

"شہر سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دکانیں، بازار، چھوٹی بڑی عمارتیں، غریب امیر لوگ۔ مجھے تو تم کوئی خاص چیز دکھاؤ۔"

"خاص جگہ تو آپ خود ہی بیٹھے ہیں۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ "یہ ہے، کل آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"مجھے بھی یاد ہے، کورا کو بھی یاد ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ کب چلیں گے، کل میں نے امّی کو آپ کی دی ہوئی مالا دکھائی۔ وہ سب حیران تھے کہ آپ نے اتنی قیمتی چیز ایک اجنبی لڑکے کو کیسے دے دی۔ وہ مجھ پر شک کر رہے تھے، میں نے اُنھیں بہت سمجھایا۔ اب آپ کو میری بات کی لاج رکھنے کے لیے چلنا ہوگا۔"

"اچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میں اُن سے ضرور ملوں گا اور کہوں گا کہ تمھارا بیٹا بہت ذہین، خوش اخلاق اور مہمان نواز ہے۔ ایسے اچھے بیٹے پر تو آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا چاہیے۔"

اعتبار تو انھوں نے کر لیا ہے اور آپ کا بہت بہت شکریہ بھی بولا کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کسی دن ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔ آپ کے لیے ہم آپ کی پسند کے کھانوں کا انتظام کر دیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" بوڑھے اعین نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "میں ہر قسم کا کھانا پسند کرتا ہوں۔"

میری متجسس نگاہیں بار بار کورا کی جانب اُٹھتی تھیں، میں محسوس کر لیتا کہ اُس کا بھی کچھ یہی حال ہے، وہ بھی بار بار میری طرف دیکھتی ہے جب ہماری نگاہیں ٹکراتی تھیں تو ہم دونوں گردنیں جھکا لیتے تھے۔ کاش میں اُس میں کہیں بھی بدصورتی کا کوئی نقشہ کوئی نقطہ تلاش کر لیتا میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ تو میرے دل میں اُتر گئی اور محو، محو اور حسین اور حسین نظر آنے لگی۔ بوڑھے اعین کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے بہت سے لفظ سوچے۔ بہت سے طریقے اُسے مخاطب کرنے کے لیے میرے ذہن میں آئے، سب ناکام ہو گئے۔ میں قطعاً واقف نہیں تھا کہ ایک لڑکی سے اور اتنی حسین لڑکی سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ یہ سب کچھ مجھے بہت مشکل نظر آیا۔ میری طبیعت ایسی تھی کہ اپنی کوئی خواہش پوری ہونے کی صورت میں ہمیشہ کے لیے اُس سے دست بردار ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا، یہ یہی گھر، یہی کالج، یہی معمولات لیکن میں خود پر جبر کرنے میں ناکام ہو گیا۔ ہوم میں چلا آیا تھا اور یہاں اپنے خیمے میں خود پر جبر کرنے میں ناکام ہو گیا۔ آپ کو شہر سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔" میں نے پوچھا۔

"یہاں ہمارے پاس کم سے کم چیزیں ہونی چاہئیں جن کی ضرورت ہو انھیں بھی ترک کر دینا چاہیے۔ شاکیہ منی کہتے تھے کہ اپنے آپ کو ضرورتوں سے بلند کرو۔"

"شہر کے کالجوں میں بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی لگی ہے کہ وہ گیا میں آنے والے مہمانوں کا خیال رکھیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ میرے حصّے میں آپ جیسے مہمان آئے ہیں آپ بہت اچھے آدمی ہیں، جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھا رہوں اور آپ کی باتیں سنتا رہوں۔"

وہ اس بات سے بہت خوش ہوا۔ "ابھی تمھاری عمر کم ہے مگر تم بڑی اچھی باتیں کرنے لگے ہو تم ضرور ترقی کرو گے۔"

"آپ نے جواب نہیں دیا کہ آپ کب ہمارے ہاں چلیں گے؟"

وہ سوچنے لگا۔ "کسی دن بھی چلے چلیں گے ابھی تو ہم لوگ یہاں موجود ہیں، ایسی کیا جلدی ہے۔"

"جلدی تو مجھے ہے، میں آپ کو اپنا گھر دکھانا اور اپنے بہن بھائیوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔ وہ کورا کو اور آپ کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گے۔ آپ ہماری عزت بڑھائیں گے۔ دیکھیے اب نا لیے مت۔"

وہ مسکرانے لگا اور اُس نے دُسرے دن رات کو ہمارے گھر کھانا کھانے کا وعدہ کر لیا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جلد ہی بہت سی جذباتی باتیں کہہ ڈالیں۔ اُسے میری دعوت قبول فوراً کر لینی چاہیے۔ میں اُسے ٹالنے کا کچھ اور موقع دیتا تو کچھ دیر مزید یہاں بیٹھنے اور کورا کی سیر سے لُطف اٹھانے کا بہانہ مل جاتا۔ مجھے ہاں سے اٹھنا پڑا۔ اعین کے ساتھ کورا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے مجھے اور الجھن میں مُبتلا کر دیا۔ اُس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ لفظ جانے کیسے میری سمجھ میں آ گئے۔

میں وہاں سے تو رخصت ہو گیا لیکن بدھ گیا کے علاقے سے باہر نہیں گیا بلکہ کچھ دُور اِدھر اُدھر گھوم گھام کے ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میں آسانی سے اعین کے خیمے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ کسی کام کے بغیر ایک جگہ ٹھیرے رہنے سے بہت سے لوگوں کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی۔ "تمھیں کس کی تلاش ہے؟" ایک پڑھت نے نرم لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

"سکون کی تلاش۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اُس کے ماتھے کی شکنیں دُور ہو گئیں۔ "شاکیہ منی تمھیں سکون کا درس دیں گے۔" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ شاید میرے چہرے میں اُسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی۔

بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب بوڑھا اعین باہر نکلا، جاتے جاتے وہ خیمے کا پردہ ڈالنا نہیں بھولا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن تھا۔ میں سمجھ گیا، وہ دوپہر کا کھانا لانے کی غرض سے باہر آیا ہے۔ میلے کے زمانے میں یہاں لنگر کے سے انداز میں کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ جس میں عام سی دال بنتی تھی۔ اگر وہ کھانا خریدنے بھی جاتا تو اسے دکانیں آنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور لگ جاتا۔ میں اس آدھے گھنٹے میں اس کے خیمے میں داخل ہو کے کورا سے باتیں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ دور گیا، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور تیز رفتاری سے اعین کے خیمے تک کا فاصلہ طے کرنے لگا۔ خیمے کے قریب میرے قدم اُکھڑنے لگے۔ اندر جا کے میں کورا سے دوبارہ واپس آنے کا کیا جواز پیش کروں گا اور پھر کورا بوڑھے اعین سے یہ راز کیوں چھپائے گی؟ بات خراب ہو جائے گی۔ وہ باتیں بھی ذہن سے اچانک اتر گئی تھیں جو مجھے کورا سے کہنی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ اتنے قریب آ کے واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں خیمے کا پردہ ہٹا کے اندر داخل ہو گیا۔ کورا کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگی اور تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ میرا سانس جسم تھامنے لگا۔ اُس کی نظریں سوال کر رہی تھیں، کیوں دوبارہ کیوں آیا ہوں؟ ایسی گھبراہٹ سے زندگی میں کبھی وہ دوچار نہیں پڑا تھا۔ چند لمحے تک میں یوں ہی گنگ کھڑا رہا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

"بیٹھیے۔" کورا نے پیشکش کی۔

"نہیں میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا۔ آپ باتیں کرنے آئیں۔"

سب کچھ بھول گیا اس لیے واپس جا رہا ہوں۔" میں نے نیازمندانہ انداز میں اُنھیں یہ بتانا چاہا کہ میں دوبارہ یہاں آیا تھا۔ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے، مجھے معاف کر دیجیے۔ باہر آؤں تب تک آپ نے گھبراہٹ میں کہا۔

وہ میرے بے ربط جملوں اور اضطراب کی کیفیت پر کچھ حیرت زدہ سی ہوئی۔ "میں نہیں بتاؤں گی۔"

"کل آپ آئیں گی نا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے گردن ہلا کر کہا۔

"دیکھیے ضرور آئیے گا ورنہ۔" میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ضرور۔" اُس نے جیسے ایک ایک حرف علیحدہ علیحدہ ادا کیا اور اُس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ چھا گئی جو میں نے کسی اور لڑکی کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

میں سمجھ، ہاتھا جیسے میں امتحان ہال میں بیٹھا ہوں۔ پیا میں ہوا کرتے ہوئے پرچہ لکھ رہا ہوں۔ مجھے تیز بخار ہو گیا۔ اس کشمکش سے نجات پانے کے لیے میں فوراً چلا آیا۔ کسی لمحے بھی اعین آ سکتا تھا۔ تمام راستے مجھے یہی خوف تھا۔ اس لیے میں اعین کی نظروں سے بچتا ہوا بدھ گیا کے علاقے سے دُور نکل گیا اور تانگے میں بیٹھ کے گھر کی راہ لی۔ گھر آ کے میری وجہ سے پریشان ہو گئے ہوں گے۔ اطلاع دیے بغیر اتنی دیر تک کبھی میں گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ والد صاحب کی گرج دار آوازیں ابھی سے میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ گھر سے کچھ فاصلے پر تانگے سے اتر کے میں نے باقی راستہ پیدل طے کیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میری تلاش میں گھر کا ملازم محلے میں گھوم رہا تھا اور اب میرے ہم جماعت ساتھیوں کے گھر چلا تھا۔

گھر میں میری ناپسندیدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں جھوٹ کم سے کم بولتا تھا، منہ پھٹ تھا اور کسی مصلحت کا خیال کیے بغیر بات صاف صاف کہہ دیتا تھا۔ آج مجھے سو بہانے سوجھ رہے تھے۔ جھوٹ کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میری آہٹ پر سبھی دوڑتے ہوئے آ گئے۔ "کہاں تھے بھئی؟" امّی نے نرمی سے پوچھا۔

"گیا شہر ہی میں تھا۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "اب میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں کہ گھر سے کچھ دیر اپنی مرضی سے باہر نہ رہ سکوں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ بدھ گیا چلا گیا تھا۔"

"کوئی اطلاع بھی نہیں دی؟" امّی خفگی سے بولیں۔

"خیال تھا جلدی واپس آجاؤں گا۔"

"یتیم بچوں وغیرہ کے جھمیلے میں کیوں پڑ گئے؟ ہم مسلمان ہیں بیٹا!"

"تو کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں اپنا مذہب بدلنے گیا تھا؟"

"توبہ توبہ نعوذ باللہ۔" امّی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ "تو کیسی باتیں کر رہا ہے ذرا اپنے باوا کے سامنے آکے دیکھنا، وہ تیری کیسی خبر لیتے ہیں۔"

امّی نے اس بار مجھے کچھ زیادہ ہی برا بھلا کہا۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ امّی ناراض ہونے والی بات تو نہیں تھی۔ حیرت ہے کہ اس دن والد صاحب نے کچھ نہیں پوچھا، وہ دوسرے کمرے میں امّی کی ساری باتیں سن رہے تھے، میں سمجھا، یہ بھی اُن کے خفا ہونے کا ایک انداز ہے یا امّی نے اُن کا کرتا بھی پورا کر دیا تھا۔ میری بہن نرمی اور فہمیدہ نے امّی کی ڈور کھینچی تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ ایسی صورت میں کیسی طرح ممکن تھا کہ میں اس دعوت کا ذکر کرتا جو میں نے بوڑھے امین اور اُس کی بیٹی کو دی تھی میں نے بڑی بے بسی محسوس کی، اپنا گھر مجھے پڑوس کے کسی گھر کی طرح لگا۔ ایک اجنبی خانہ جہاں میں سزا کے دن کاٹ رہا ہوں۔ مجھے بے تحاشا غصہ آرہا تھا، میں نے اُسے پینے کی کوشش کی اور بڑھ گیا، اس جھنجلاہٹ میں، میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت دعوت کا ذکر کر دینا چاہیے۔ منع کریں گے تو میں گھر سے نکل جاؤں گا، آہا۔" میں نے آرام کرسی پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے انھیں کسی قدر گستاخی سے مخاطب کیا لیکن میں اپنے لہجے پر قائم نہیں رہ سکا، "ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"کہو۔" وہ ترشی سے بولے۔

"آہا! اگر میں یہاں کسی کی دعوت کروں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اعتراض کیوں ہوگا؟ یہ تمہارا گھر ہے۔"

مجھے اپنے کانوں کی صحت پر شبہ ہوا۔ "آہا!" میں نے نازاور پیار سے انھیں مخاطب کیا۔ "میں نے کل رات دو معزز آدمیوں کی دعوت کر دی ہے۔"

"کون ہیں وہ؟" آہا نے غیر متوقع نرمی سے پوچھا۔

"وہ وہی بزرگ بڈھا شخص ہے جس کا نام امین ہے اور اُس کی لڑکی، وہ لوگ بے حد شریف ہیں، کل مالا انھوں نے ہی مجھے دی تھی۔" میں نے جوش میں کہا، جواب دینے کے بجائے والد صاحب خفگی کا اظہار کرنے لگے۔ "میں اُن سے کہہ چکا ہوں آہا! اس سیکرٹ سے نکل گیا، آپ انکار کر دیں گے تو میری بھد ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، تم نے جو بات کر دی ہے اُسے پورا کیا جائے گا۔" آہا نے آہستگی سے کہا، "مگر آئندہ اتنی جلدی اجنبیوں کو دعوت دینے میں احتیاط برتنا، پتہ نہیں کون لوگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔"

"بہت اچھے لوگ ہیں، آپ اُن سے ملیے تو سہی، میں ایسے ویسیوں کو اپنے گھر میں کیوں مدعو کرتا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا اور بوڑھے امین کی تعریفیں کرنے لگا۔

والد صاحب نے میری لاج رکھ لی تھی، مجھے اُن پر بہت پیار آیا۔ تمام شکوے ایک ہی بات میں دُھل گئے۔ میں جس گاگا کر بہت مشکل سمجھتا تھا وہ اتنا آسان نکلا۔ اب میری عقل میں آیا کہ وہ تو میری محبت میں مجھ سے ناراض رہتے ہیں، دل کے بہت اچھے ہیں، اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بھی ہچکچا کر میں کہیں اور نہیں اصفاہان میں گیا تھا، امّی، بہنوں اور بھائیوں نے بدھ یاتری کے متعلق بہت سے سوال کیے۔ میں بتاتا رہا کہ وہ کتنا عقل مند، تجربہ کار اور خوش اخلاق شخص ہے، میں نے اپنے گھر میں اُس کا ایسا تصور قائم کر دیا کہ جب وہ آئے تو سب عزت و تکریم سے پیش آئیں، امّی کھنچی کھنچی رہیں تمام تک میں نے انھیں بھی سنایا لیکن میں خوب سے خوب رو دھا ہوا تھا۔

دوسری رات نیند تو آئی مگر عجب عجب طرح کے خواب آتے رہے کہ میں کورا کے ساتھ پہاڑوں، وادیوں کا سفر کر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر میں بیٹھی ہے، میرے ساتھ پڑھ رہی ہے، وہ چھوٹی سری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے ہے گلے میں دوپٹا بھی ہے۔

صبح جاگتے ہی میں سیدھا کچن گیا، سوچا، بدھ گیا کی طرف ہواؤں اور ایک بار پھر تصدیق کر آؤں۔ کہیں کورا نے میرے آنے کا ذکر امین سے نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو سکتا ہے، لیکن وہ نہ آئے، انکار کر دے اور گھر میں سب میرا خوب مذاق اُڑائیں لیکن یہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ کورا خاموش رہی ہوگی۔ میں جلد ہی گھر واپس آگیا اور چیزیں قرینے سے رکھنے لگا۔ قدیم تیشے کی صفائی کی، دیواریں جھاڑیں، دیوار گیریاں صاف کیں، فرش دھلوایا، مچھر میں چاندی جیسا چھوٹا سا خانوں پر مشتمل گلدستوں کے غلاف بدلوائے۔ بہنیں بھی میرا ساتھ دیتی اور مجھے چھیڑتی رہیں۔ امّی نے مختلف قسم کی لذیذ سبزیاں اور چاول پکائے، پٹھانی مرغ مسلم، گوشت کا کوئی سالن نہیں پکایا گیا، کورا کو تحفے میں دینے کے لیے امّی نے سلیم شاہی جوتیاں اور سکانوں کے بارے میں معلومات نکال کے رکھ لیے، کچھ بھی ہو ایک نرس والے کے گھر میں مہمان آرہا تھا۔

سرشام میں کپڑے پہن کے تانگے میں سوار ہو کے بدھ گیا کی جانب روانہ ہو گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ بدھ گیا کا وہ جانا پہچانا راستہ آج بدلا بدلا معلوم ہوتا تھا، مڑ کر تانگا، امین کا ہمدرد رویہ نہ بدل گیا ہو۔ یہ بھی خیال آیا کہ کہیں وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔ دل میں ہزار اندیشے لیے میں اُس کے نصیبے پہنچا تو وہ موجود تھا اور خوش خوش نظر آرہا تھا، میری جان میں جان آئی، رسمی سلام دُعا کے بعد میں نے کہا، "آپ کو مکان ڈھونڈنے میں شکل پیش آئی، اس لیے خود ہی چلا آیا، چلیے تیار ہو جائیے۔"

"میں ضرور آتا بابو! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، تم نے بے کار تکلیف کی بہرحال ابھی بیٹھو، ذرا لنگر کھا کے تو چلتے ہیں۔" تکرار نے پہلے ہی سامان باندھ رکھا تھا، اُس نے اپنا تھیلا اُٹھا کر تانگا پر رکھ دیا تھا اور پاجامے، کرتے پر ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا، ہلکی سی نیلی شال شانوں پر ڈال رکھی تھی، اس لباس سے وہ اور دل کش ہو گئی تھی۔

"آپ کی بہنیں کتنی بڑی ہیں؟" پہلی بار اُس نے مجھ سے سوال کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے میری بہت سی باتوں کا جواب دے دیا ہے۔ میں نے اُسے اپنی تمام بہنوں کے نام بتائے اور عمریں بتائیں۔ بوڑھا بھی انہماک سے سنتا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہی اُس نے مجھ سے معذرت چاہی اور کہا کہ لباس تبدیل کر لے، اس دیس اور کورا کچھ دیر کے لیے باہر چلے جائیں، ہم نے اُس کی درخواست کی قبیل کی، جب ہم دونوں باہر آگئے تو میں نے چپکے سے پوچھا۔ "آپ نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "ہم نے نہیں بتایا۔"

"میں بہت ڈر رہا تھا، پتہ نہیں وہ کیا سمجھیں، پر کہتے کہتے میں چھپ گیا پھر بولا۔ "آپ تو اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"

وہ لجا گئی اور کہنے لگی۔ "آپ کو اچھا لگ رہا ہے؟"

"آپ کچھ بھی پہن لیں، مجھے اچھا لگے گا۔" میں نے جذبات میں کہا۔ "دیکھیے، گھر مل کے خوب گھل مل جائیے گا، میں نے اپنی بہنوں سے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔"

"اور میں نے بابا سے آپ کی۔"

"آپ نے بالکل غلط تعریف کی، میں تو بہت بُرا ہوں۔"

"ہوں۔" اُس کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔

"آپ سے پرسوں ہی ملاقات ہوئی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، آپ کو ایسا لگتا ہے؟"

اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"گھر جا کے بھی آپ کا خیال رہا۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اس اثنا میں بوڑھے امین نے آواز دی۔ "اندر آجاؤ۔" ہم دونوں اندر گئے تو وہ لباس بدل چکا تھا۔ "میں تیار ہوں۔"

اندھیرا ہو چکا تھا، بوڑھے کی بغل میں کسی موٹی کتاب کے صفحات میں سفید کپڑے میں لپٹا ہوا بقچہ دبا ہوا تھا، میں نے اُس سے کہا۔ "یہ مجھے دے دیجیے۔" اُس نے کھسیا کے انکار کر دیا۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے، سڑکوں پر روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ میں خوشی اور فخر کے مدوجزر سے سینہ پھلائے گردن اکڑائے تانگے کی اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تانگا رُکنے کی آواز سن کے والد صاحب دوڑ انے پر آگئے۔ دونوں ایک دوسرے سے پرانے شناساؤں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ ڈیوڑھی میں امّی اور بہنوں نے کورا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ امّی نے تو اُسے گلے لگا لیا۔ کاش میں امّی ہوتا۔ وہ سب پچھاتی ہوئی اندر زنان خانے میں چلی گئیں اور میں، والد صاحب اور امین بیٹھک میں رہ گئے۔ چاندنی کے اوپر دسترخوان میں قالین بچھا ہوا تھا۔ امین کو عزت کے ساتھ وہاں بٹھا دیا گیا۔ "آپ نے میری عزت بڑھائی۔" والد صاحب نے خالص دیہاتی لہجے میں کہا۔ یہ لہجہ وہ اُسی وقت اختیار کرتے تھے جب گھر میں کوئی معزز مہمان آتا تھا۔

امین بیٹے کے کردار اور اخلاق کی تعریف کرنے لگا۔ "اس پنچنے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔"

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" والد صاحب نے اسی انداز میں بابر نے تو بس آپ کی تعریفیں کیں کچھ بتایا نہیں۔"

"جناب یوں تو کہانی بڑی ہے کسی وقت فرصت میں سناؤں تبت سے چلے ہوئے کچھ مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ چینیوں کی ریاست میں رہا پھر کیا چلا گیا، اب وہیں سے آرہا ہوں، تبت میں کیا کرتا تھا؟"

"اچھا اچھا۔ آپ بھی تو میں مارپیں۔ خوب!" والد صاحب نے ہنس کر کہا۔ "اپنا بھی ایک زمانے سے یہی پیشہ ہے۔"

دونوں بزرگوں میں جلد ہی غائبانہ ختم ہو گئی اور وہ دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔ والد صاحب اپنے بچوں کے متعلق باتیں کرنے لگے، بابا کی یادوں، چھوٹے اور غیر معمولی واقعات سنانے لگے۔ امین بیساختہ ہنسے، کہاں دستیاب ہوتا؟ میری بڑی بہن نجمہ نے آواز دے کے مجھے بلایا، میں گیا تو وہ کہنے لگی، "بابر! یہ تو بہت پیاری سے چھوٹی باتیں کر رہی ہے، گڑیا سی لگتی ہے، اگر یہ مسلمان ہوتی تو میں اسے گود لے جاتی، دیتی تمہارے لیے محفوظ رکھ لیتی۔ اب سمجھ میں آیا کہ کل تم کہاں غائب تھے۔ اچھا یہ بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے مصنوعی ناگواری سے پوچھا۔

"ہم سب سمجھتے ہیں جناب؟ تم اُدھر کیوں نہیں آتے۔" وہ شوخی کرنے لگی اور مجھے کھینچتی ہوئی اندر کمرے میں لے گئی جہاں کورا میری دوسری بہنوں اور بھائیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ انھوں نے اتنی جلدی دوستی کر لی تھی کہ اُسے چوڑیاں تک پہنا دی تھیں، وہ ابھی تک اُن کے نازک نازک ہاتھوں، اُن کے رنگ رنگ کے نرم نرم ہونٹوں اور دمکتے چہروں، زلفوں سے مبہوت تھیں۔ گو میری بہنیں بھی خوب صورتی میں کسی سے کم نہیں تھیں لیکن کورا کے آگے اُن کے جوہر گہنا گئے تھے۔

"بھائی جان! ہم انھیں اب جانے نہیں دیں گے، ان سے کہیے کچھ دن ہمارے گھر رہیں۔" میری چھوٹی بہن فرخ نے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں بھی بھنبھناتا ہوا ساتھ والی سے کہہ کر پھر امین صاحب سے۔

"آپ جائیں گی تو نہیں؟" میرے چھوٹے بھائی پرنے معصومیت سے پوچھا۔

کورا کو جواب دینے میں مشکل پیش آئی۔ "نہیں۔" اُس نے جہاں گیر کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

جہاں گیر اور فرخ امین کے پاس پہنچ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ کورا باجی کو آج رات جانے نہیں دیں گے۔ والد صاحب نے ہنس کر کہا کہ وہ پھر آئیں گے۔ امین نے فرخ اور جہاں گیر کو گود میں بٹھا لیا اور اُن سے دھیرے دھیرے کرنے لگا کہ ہم لوگ دوبارہ آئیں گے۔

میں گھر میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا، کبھی کبھی اُس کی طرف، امّی نے ایک پُرتکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا، رات کے دس بجے تک

وہ دونوں موجود ہے۔ کورا کو یہاں کے احساس ہوا کہ میں اُسے اپنے لیے کہاں لایا تھا؟ اتنے لوگوں کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی دل مطمئن تھا۔ بوڑھے امین نے چلتے وقت اتنی کہے تھے قدیم طرز کا ایک امینی گلوبند دیا۔ والد صاحب کے شدید انکار کے باوجود بھی وہ نہیں مانا اپنا بنجر جس طرح وہ کے آیا تھا اسی طرح واپس لے گیا جب کہ میرا خیال تھا کہ اُس میں کوئی تحفہ ہوگا جو وہ گھر جا کے والد صاحب کے حوالے کرے گا۔ اُس میں ضرور کوئی ایسی قیمتی چیز تھی جو وہ بیچنے میں جھجکتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چلا گیا لیکن دوبارہ آنے کا وعدہ بھی کر گیا۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں اُس کی اور کورا کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ بھئی خوشی تھی کہ والد صاحب اُس کی ذہانت اور شرافت کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ وہ پہلو چل بدل کے اُس کی اعلانسبی اور سماجی حسن سلوک کا تذکرہ کرتے تھے جب وہ ایسا کرتے تھے تو مجھے گمان تھا۔ جیسے وہ میری صفات بیان کر رہے ہوں۔

★

پھر تو اپنا کچھ یہ عالم ہوا کہ چند ہی ہفتوں میں جیسے

میری طرف جھپٹا لیکن ہابا نے اُسے دبوچ لیا۔ میں نے عمل کے اندھیرے میں کھڑی ہو گئی اور راستہ بدل کے مڑک کے کنارے بھاگتی رہی پھر مجھے ہانپنا بل گیا۔"

"ممکن ہے وہ زندہ ہوں۔"

"شاکیہ منی جانیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ رُکتے رُکتے بولے۔

اباجا خاموش گم سُم سے ہو گئے پھر چونک کے بولے۔ "تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"مگر انہیں صاحب تو بہت خریف آدمی ہیں اُن کے ایسے دشمن کیسے ہو گئے؟ وہ تو بہت..." ابا اُلجھتے ہوئے بولے۔

"ہم شہروں شہروں بھاگتے پھر رہے تھے نا اگر اُس نے ہمیں پکڑ لیا۔ وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔"

"کون بھاگتے پھر رہے تھے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟" والد صاحب نے تشویش سے پوچھا۔ پھر وہ یہاں بھی تو آ سکتے ہیں۔"

"آپ نہیں جانتے وہ بہت بڑے ہیں، پتہ نہیں وہ کیوں بابا کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ویسے یہاں اُن کا آنا مشکل ہے کیونکہ بابا نے کسی سے آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

میں اندھی اندھیرا ہوا تھا کہ ابا ایک معصوم لڑکی سے کیسے سوالات کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے وقت تو خاموش رہنا چاہیے تھا مگر ابا بہت عجیب آدمی تھے۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اس میں ہیرے جواہر اور کچھ کاغذات ہیں۔" کورا نے کہا۔

"ہیرے جواہر؟" والد صاحب اُس سے چھوٹی سی گٹھڑی لے کر وزن کیا۔ "یہ تو خاصی بھاری ہے۔" پھر وہ اُس کی اجازت کے بغیر گٹھڑی کھولنے لگے۔ کاغذات میں غالباً تبتی زبان میں آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں، وہ کاغذات ایک دبیز موٹی کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ گٹھڑی میں وہ بچہ بھی رکھا ہوا تھا جو انہیں اپنے ساتھ بے پھرتا تھا۔ ابا نے بچہ کھول کے دیکھا تو سب کی آنکھیں تیز ہو گئیں۔ روشنی میں جواہر جگ مگ کر رہے تھے۔ میں نے ابا اور اتی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں کے رنگ بار بار بدل رہے تھے کبھی مُردنی کبھی زردی کبھی سفیدی۔ ابا نے انہیں خاموشی سے گٹھڑی میں باندھ دیا۔ "یہ تو بہت قیمتی ہیرے جواہر معلوم ہوتے ہیں۔ تمہاری اور ان کی حفاظت دونوں مشکل کام ہیں، بہرحال اب تم آ گئی ہو تو اللہ مالک ہے، دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کے بولے اور اتی سے مخاطب ہوئے۔ "انہیں حفاظت سے رکھ دو۔"

اتی نے گٹھڑی ہاتھوں میں لینے سے انکار کیا۔ ابا نے انہیں گھور کے دیکھا۔ وہ سہم گئیں اور جھکتے ہوئے انہوں نے اُسے اُٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئیں۔ فنیدہ بھی اُٹھ گئی تھی ابا نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے کورا کو پہنائے اور صبح اُسے اُوپر والے کمرے تک عبور دلا دے تاکہ محلے والوں کی نظریں اُس پر نہ پڑ سکیں۔ ہمارے محلے کے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ بعض کا تو چھتیں چھتوں راستہ تھا۔ اُوپر کے کمرے میں عموماً میں رہتا تھا۔ وہاں ایک پلنگ تھا اور سٹر کیس مرحومہ تبتی ایک الماری میں میری نصاب کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ فنیدہ بھی سہمی ہوئی تھی، کبھی خاموش اور گم سم سے تھے۔ کورا کو فنیدہ نے اپنا لباس پہنا دیا، صرف فنیدہ ہی ایسی تھی جس نے اُس کے آنسو پونچھے اور میں نے ابا اور اتی کے سامنے تسلی اور تشفی کے بہت سے جملے ادا کیے۔

فنیدہ اُسے لے کے اُوپر کے کمرے میں چلی گئی اور میں نیچے آ گیا۔ نیچے ابا کورا کی عدم موجودگی میں آزادی سے تبصرہ کر سکتے تھے۔ "باہر!" انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "اس لڑکی کا انتظام جلد سے جلد کہیں اور کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ معاملہ اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے بہتر ہے یہ یہاں سے چل جائے ورنہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گھر سکتے ہیں۔ اب تک زندگی میں جو عزت اور مرتبہ حاصل کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ ہم اسے کہاں کہاں تک چھپائیں گے جب کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ پولیس اسے ضرور ڈھونڈ رہی ہوگی۔ وہ یہاں بھی آ سکتی ہے۔"

"مگر ابا وہ ہماری پناہ میں آئی ہے۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس کے ساتھ قیمتی زیورات ہیں اور نہ جانے کس قسم کے کاغذات ہیں۔"

"ابا وہ سیدھی اور معصوم لڑکی ہے ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"اس کی عمر ہی کیا ہے۔" اتی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ہمت تو دیکھو سات میل کا سفر تن تنہا طے کرتی ہوئی آ گئی۔"

"زندگی بچانے کے لیے آدمی سات میل تو کیا ستر ہزار میل بھی جا سکتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"فتی کی ماں! کیا تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہو سکتیں، ہمیں پہلے سے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے اور فیصلہ کرنے کے لیے جذبات کی نہیں سکون کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے یہ بچی کا محض گمان ہو کہ انہیں کو کچھ ہو گیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انہیں زندہ ہو؟ یا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تمہیں عدو دیکھنے چاہئیں۔ درجن آدمی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتا ہے۔"

"ابا صبح تک ہم انتظار کیوں نہ کریں؟ اُس وقت تک کورا کی حالت بھی سنبھل جائے گی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ انہیں صاحب زندہ ہیں یا۔"

میں نے اپنی زبان قابو میں کی۔

"نہیں وہ مر گئے، ٹھیک ہے صبح تک دیکھ لیتے ہیں مگر ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔" ابا یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔

میں اُن کے برابر ہی لیٹا ہوا تھا۔ آج وہ کورا میرے گھر میں تھی جسے گھر میں لانے کے لیے میں نے صرف چند روز میں لتنے خواب دیکھ لیے تھے کہ انہیں شمار کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک منزل اُوپر تھی بہت ہی قریب مگر نہ جانے وہ اس دن سے تھی جب میں نے اُسے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ انہیں جب سے ہی کوئی غیر معمولی شخص معلوم ہوتا تھا۔ کورا کے بیان سے اس کی تصدیق ہو

گئی تھی۔ وہ مارا گیا اور کورا اکیلی رہ گئی، اب کورا کا کیا ہوگا؟ اگر والد صاحب نے انکار کر دیا تو؟ اگر پولیس نے تفتیش کی تو؟ ابا کبھی یہ بات گوارا نہیں کریں گے یہ گھر میرا ہے مگر یہ گھر تو ابا کا بھی ہے اور اُنہی کا ہے، میرا کیا ہے۔ کورا کے آنے سے اچانک جو خوشی پھوٹی تھی وہ چند ہی لمحے باقی رہی۔ اب تفکرات نے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُوپر کورا بھی نہیں سوئی۔ ابا بھی ساری رات کھانستے لیٹے اور میری آنکھ تو پہلے ہی اُچاٹ ہو چکی تھیں۔

ابا صبح نماز کے لیے اُٹھے تو انھوں نے مجھے جگا کے تاکید کی کہ میں بدھ گیا کی طرف نہ جاؤں۔ میں نے حامی بھر لی اور حسبِ معمول سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سیر کا تو نام ہے۔ جب سے کورا کو دیکھا تھا صبح کی خوب صورتی تو جیسے اندھیرے میں گم ہو کر آنے لگی تھی۔ کورا بھی ایک صبح تھی، صبح کی طرح سچی، صبح کی طرح ملائم، شبنم کی طرح جھلملاتی ہوئی، بہتی کی طرح خوش گوار، پھولوں کی طرح دل کش۔ والد صاحب کی تاکید کے باوجود میرے قدم خود بخود بدھ گیا کی طرف اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ انہیں کے خیمے میں جانے کا نہیں تھا۔ صرف حقیقتِ حال جاننے کا ارادہ تھا۔ بدھ گیا کی رونق کا وہی عالم تھا، کہیں بھی کسی قسم کی خوشی کے آثار نہیں تھے۔ میں نے دُور سے دیکھا، انہیں کے خیمے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ کیا انہیں اندر موجود ہے؟ میں وہاں جاتے جاتے رہ گیا اگر وہ زندہ ہوتا تو گھر ضرور آتا۔ پھر کیا قاتل اسے پھر گھر نپ کے فرار ہو گیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ اندر مُردہ پڑا ہے؟ مرنے سے پہلے اُس کی مٹھیاں گونجی ہوں گی اور قریب کے خیموں کے لوگ جاگ گئے ہوں گے۔ موت کے وقت تو آدمی کو ضرور چیخنا چاہیے۔

مجھے اپنے چند طالب علم ساتھی مل گئے، اچھا ہوا کہ میں نے کسی سے کورا کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ وہ مجھ سے میرے مہمانوں کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ انہیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ انہیں کے خیمے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں بدھ گیا سے جلد ہی واپس آ گیا تاکہ والد صاحب کو تشویش نہ ہو جائے۔ گھر میں ابا اور اتی کے چہروں پر ابھی تک تکدر تھا اور اُس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو جوم سا محسوس کیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ "کچھ پتہ چلا؟"

"کیسے پتہ چلتا؟" میں نے لگا سا جواب دیا۔

"تو پھر مُردہ ہی گیا؟" ابا آفسردگی سے بولے۔ "اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک کورا کی خبر لینے ضرور آتا۔"

"ممکن ہے کوئی اور مجبوری ہو۔"

"تم اس کا بندوبست کر دو بیٹے مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" ابا ایسی اجنبیت سے بولے جیسے میرا اُن کا کوئی رشتہ نہ ہو۔

"آپ ہی بتائیے کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں پولیس میں بتا دینا چاہیے یا مندر کے پروہت سے بہتر یہ رہے گا کہ متعلم کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ ابا بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔

"ابھی سے کسی کو کیسے مطلع کر دیں؟ ہم کچھ انتظار بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" ابا نے متوحش ہو کے کہا۔

"کورا پولیس وغیرہ کا سامنا کس طرح کرے گی؟ ایک ایسی لڑکی جس کا کوئی سہارا نہیں ہے اُسے ہم پولیس کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں، وہ تو ویسے ہی مر جائے گی۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کیا جائے۔ ایک طرف اس لڑکی کا سوال ہے دوسری طرف اپنی عزت کا، اس لڑکی نے تو واقعی خاصی زندگی حرام کر دی اور اس کے ذمے دار تم ہو صرف تم۔" وہ غصے سے بولے۔

میں نے سوچا کہ ابا کی باتوں کا کیا جواب دوں؟ اُن کی نظر میں گھر گھر کی عزت خاندان، حسب اور برادری ہی سب کچھ ہے۔ ابا اُلٹے پیر اُوپر چلے گئے۔ فنیدہ اور دوسری بہنوں کے چہرے بہت تاباں نظر آئے تھے۔ وہ اُسے گڑیا کی طرح درمیان میں لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی مگر بہنوں کا خیال کر کے پھر وہیں بیٹھ گئی۔ یہ تھا ہی گھر ہے کورا! انہیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کی تکلیف تو نہیں ہے؟" میں نے جھجکتے لہجے میں کہا۔

"ہم سے بول نہیں رہیں۔" فرخ نے شکایت کی۔

"ہاں ہم سے ناراض ہیں۔" جہاں گیر نے تائید کی۔

"نہیں نہیں ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "تم لوگ انہیں پریشان کرو گے ہو گے؟"

کورا نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ "بہت شریر ہے۔"

اِدھر اُس کی پیڑائی کا یہ حال تھا۔ اُدھر ابا پر خفگی کے دورے پڑ رہے تھے۔ تمام تک وہ متعدد مرتبہ مجھے بُرا بھلا کہتے اور ہزار اندیشے ظاہر کرتے رہے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ممکن ہے کورا ہی اپنے باپ کو قتل کرا کے ہو اور انہیں اُس کا باپ نہ ہو۔

میں نے تائید نہیں کی کہ واقعی انہیں اُس کا باپ نہیں تھا اگر کیا وہ قتل کر سکتی ہے؟ ابا کر کیا ہو گیا تھا، انھوں نے میری زندگی عذاب میں مبتلا کر دی۔ شام کو میں ایک بار پھر بدھ گیا گیا۔ وہاں تو ہلا گلا ہوا تھا، کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ابا کے تلخ اور ترش جملوں میں ایک رات اور گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو میرے ایک کلاس فیلو ہری شنکر نے مجھے بتایا کہ بدھ گیا کے ایک خیمے میں ایک شخص قتل کر دیا گیا ہے، ہری شنکر بھی وہیں رہ رہا تھا، تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ انہیں ہی تھا۔ ہری شنکر کے بیان کے مطابق خیمے کے اردگرد پولیس لگی ہوئی تھی۔ یاتریوں میں دہشت پھیلنے کے خیال سے یہ واقعہ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی پھر بھی بہت سے لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا۔ لوگ کہتے ہیں اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو غائب ہے۔ ہری شنکر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے چاہا کہ اطلاع والد صاحب کو بھیج دوں لیکن پھر ان کا کیا حال ہوگا؟ وہ اور گھبرا جائیں گے گھر جاتے ہی مجھے اتی کی انتہائی تیز آواز

سنی پڑیں۔" میں کہتی ہوں باہر سے لڑکی کب تک بھاگے گھر میں بیٹھے گی؟ تمھیں کچھ پتہ نہیں تمھاری جوان بہنیں بھی ہیں اس کا آنا پتہ پوچھ کے اسے کہیں چھوڑ آؤ۔"

"چھوڑ آؤں گا، چھوڑ آؤں گا۔" میں نے غصے میں کہا۔

ایک دن، دو دن، تین دن ہوتے ہوتے ان تو آنا نے الٹی سیدھی دے دیا۔ انھیں کہیں سے معلوم ہوگیا تھا کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔ اور اب صرف نہیڑہ کو بھیجا جانا تھا۔ کوٹ کر دے بھی کرے میں بند رکھا گیا تھا۔ بڑوں بالوں کی عزتیں آتیں تو نہیڑہ کو آواز دے کے بلا لیا جاتا۔ گھر میں ایک دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی تک مجھے کورا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات ضرور اس سے ملاقات کروں گا لیکن وہاں نہیڑہ موجود ہوگی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تو میں نے آپے کیا میں کورا سے یہ کہوں، نہ پوچھوں کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کا پتہ بتائے تاکہ انھیں مطلع کیا جا سکے۔"

"یہ بات تو میں خود پوچھ چکا ہوں مگر وہ تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتی بس رونے لگتی ہے۔"

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے نہیڑہ کو وہاں سے ہٹا دیجیے۔" میں نے جرأت کر کے کہا۔

"کوشش کر لو مگر بھئی یہ سمجھ لو کہ اسے جلد از جلد یہاں سے جانا چاہیے کھانا پینا بھی ختم ہوگیا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی نکل نہیں سکتا کہ جانے میری عدم موجودگی میں کیا حادثہ پیش آ جائے۔"

"ٹھیک ہے، میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔"

اماں نے نہیڑہ کو آواز دے کے نیچے بلا لیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری حالت دگرگوں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے، کورا سے تنہائی میں ملنے کا خیال بھی مجھے دہشت میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ میں اس سے کیا کہوں گا اور وہ کیا جواب دے گی؟ تسلی و تشفی کے لیے میرے پاس چند جملے بس نہیں تھے۔ میں اوپر پہنچا تو کورا کو پھر رونا آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی قمیص سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ تھی کہ اور بھی زور زور سے رونا آ گیا۔

"میں نے گھر والوں کو بہت پریشان کر دیا ہے۔"

مجھے معلوم ہے کورا کا گلا بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن اب بھی کیا ہے، میں دنیا بھر کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ "نہیں نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں میں جانتا ہوں کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو قتل کر دیا؟ ممکن ہے تم نے کچھ باتیں والد صاحب سے چھپائی ہوں اور صرف مجھے بتانا چاہتی ہو۔"

"وہ انھی لوگوں میں سے کوئی تھا جو سیدھے رستے کے دشمن ہیں، وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں کیونکہ میں کاغذات حاصل کرنا چاہتی ہوں جو میں نے ابا کو لا کے دیے ہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں مارنا چاہتے ہیں اور وہ کاغذات کیسے ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ "اور یہ زیورات کس کے ہیں؟"

"یہ زیورات ہمارے ہیں بیٹے۔ بابا انھیں نے چلتے وقت انھیں اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ کاغذات میں بھی کوئی خاص بات ہے جو مجھے نہیں معلوم مگر انھیں بابا بار بار انھیں دیکھتے تھے اور کسی سوچ میں پڑ جاتے تھے، وہ لوگ مجھے اس لیے مارنا چاہتے ہیں کہ اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کی سرداری مجھے ملے گی۔ اس لیے کہ میرے باپ کی موت کے بعد قبیلے کی سرداری کے حق دار میں ہوں۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر کسی سردار کے ہاں صرف لڑکی پیدا ہوئی ہو تو وہ ولی عہد مقرر ہوتی ہے مگر اسے اس وقت تک سردار نہیں سمجھا جاتا جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، پھر اس کا شوہر ہی اس کے نام پر سرداری کرتا ہے۔ میرے باپ بہت رحم دل اور نیک تھے۔ قبیلے میں کئی خانہ جنگیاں کرنے کا رواج ہے مگر انھیں ایک ہندو عورت یعنی میری ماں سے محبت ہوگئی تھی۔ اس لیے انھوں نے ان کے سوا کسی سے شادی نہیں کی۔ میری ماں میری پیدائش پر مر گئیں پھر میرے باپ نے شادی نہیں کی اور مجھے پرورش کرنے لیے۔ انھوں نے قبیلے کے سب سے دانا شخص امین کو میرا اتالیق مقرر کیا۔ قبیلے کے بھی لوگ ان کے انصاف اور رحم کے باعث ان سے محبت کرتے تھے مگر میرے چچا نے انھیں مروا دیا اور خود سردار بن بیٹھا۔ پھر اس نے مجھے بھی مارنا چاہا کیونکہ میری شادی ہو جانے پر اسے سرداری چھوڑنی پڑے گی ہمارا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ ہماری کئی بستیاں ہیں، بچے مکانات ہیں، سڑکیں ہیں اسے جاگیر قبیلے کہتے ہیں، یہ سب باتیں کورا نے اٹک اٹک کر، تھک تھک کر لمبے بیان کیں، وہ بری طرح سے بچھڑ رہے تھے، مجھے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کاغذات پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تمھیں حاصل نہیں کر سکیں گے۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "تم اب تعلی محفوظ ہو، میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ بہت دور لے جاؤں گا میں تمھاری خاطر سب کو چھوڑ دوں گا۔"

"میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی، مر جاؤں گی۔"

"تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ ساکت سے بولی۔

"تم ایسا کرو کہ آج رات جاگتی رہو۔ صبح پانچ بجے یہاں سے ایک گاڑی جاتی ہے، میں تمھیں نہیڑہ کا برقع دے جاؤں گا، تم برقع پہن کر ساتھ چلنا۔"

"نہیں کوئی دیکھے گا رات کے وقت نکلنا مشکل ہوتا ہے۔"

"دن کے وقت نکلنا کون سا آسان ہوتا ہے، تھے کے سبھی لوگ گے مگر تم تو برقع پہنے ہوئے ہو گی۔ کون سمجھے گا کہ تم جا رہی ہو، میری کار بھی ہماری ہے۔ میں اپنی بہن کے ساتھ اکثر جاتا رہتا ہوں۔ ہم آنکھیں ڈال دیں گے لیکن دن میں گھر سے کیسے نکلیں گے۔ رات کو گاڑی کے تو تبھی نکلتے ہیں۔ میں ایک سوٹ کیس میں کپڑے تیار رکھوں گا اور کچھ

اکٹھی کرنی ہوگی، زیورات تو یہیں رہنے چاہئیں۔"

وہ منع کرتی رہی اور روتی رہی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ رات کو وہ میری ہلکی سی دستک پر اٹھ بیٹھے۔ نیچے آ کر میں نے والد صاحب سے کہا: "اس کا کوئی عزیز موجود نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ متعجب ہو بولے۔

"وہ یہی کہتی ہے۔"

"لیے کہتے دو۔" انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"مجھے تو وہ بڑی حزنا فہ معلوم ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے جان چھڑا دو کہ وہ اپنا ٹھور ٹھکانا ڈھونڈے ورنہ نکال باہر کرو۔" امی نے کہا۔

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

دن کے وقت چپکے سے میں نے نہیڑہ کے کپڑے چرائے۔ کچھ اپنے کپڑے رکھے اور ایک سوٹ کیس تیار کر لیا۔ میں نے یہ کام کئی گھنٹوں میں کیا پھر میں نے وہ مالا بھی رکھ لی جو امین نے مجھے دی تھی۔ یہ سب کام ہوگیا، اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ میری خوش قسمتی کہ امی کو ایک بہت پوش لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کوئی بھی جاننے والا دیکھ سکتا تھا مگر ان تمام اندیشوں کے باوجود مجھے رات کا انتظار تھا۔ یہ گھر چھوٹے بھی پر ایک نشہ تھا، اسے تو مجھے کبھی نہ کبھی خیرباد کہنا ہی تھا۔ اب امی رویا کریں، ابا خمایا کریں، انہیں یاد کیا کریں۔

آدھی رات کے بعد میں گھڑی دیکھ کے اٹھا، سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ننگے پیر چل کے سوٹ کیس اٹھایا اور دروازے کے پاس رکھ دیا۔ مالا کو کھڑکی میں نے کھلی رہنے دی تھی۔ پھر میں اوپر گیا اور ہلکی سی دستک دی۔ کورا فوراً اٹھ کے باہر آ گئی اور مجھ سے لپٹیں کرنے لگی۔ میں نے اپنے آپ سے بازو چھڑائے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ نہیڑہ کے سینڈل بھی میں نے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے۔ وہ ننگے پیر ہی نیچے آئی۔ برقع اوڑھ لو، میں نے سرگوشی میں کہا۔ اسے برقع اوڑھنا نہیں آتا تھا، میں نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی۔ پھر ہم دونوں دبے پاؤں نیچے آئے اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ سوٹ کیس اٹھا کے میں نے دروازہ آہستگی سے کھولا اور کورا کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کے میں نے پھر پھر دیکھا اور سوٹ کیس کھول کے نہیڑہ کے سینڈل اسے پہنا دیے۔ پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے ہم تیز تیز سڑک کی طرف چلنے لگے۔ میں نے شیروانی پہن لی تھی تاکہ میری عمر سولہ سترہ سال سے کچھ زیادہ معلوم ہو۔ برقعے میں کورا کی عمر چھپ گئی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ہم اندھیرے میں لپکتے ہوئے خاصی دور نکل آئے کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بھاگے جا رہے تھے۔ گلیاں جانی پہچانی تھیں۔ میں ان گلیوں سے ہزار ہا بار گزرا تھا۔ مگر اس وقت بڑی عجیب اور ڈراؤنی محسوس ہو رہی تھیں۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو ہم سانس روک کے اندھیرے کی آڑ میں ہو جاتے۔ پتا کھڑکتا تو دل لرز جاتا۔ ہم گھر سے خاصی دور نکل آئے تھے مگر ابھی تک سیوان جاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر قدم پر کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ جیسے خود اپنی آواز اور آہٹوں سے خوف آ رہا تھا۔ گلیوں میں اٹھتے ہوئے کتے قدموں کی ہلکی چاپوں سے بیدار ہو جاتے اور غلط انداز نگاہ ڈال کر دوبارہ پیروں میں سر رکھ کے سو رہتے جب وہ غراتے تھے تو ہم خاموشی سے کھڑے ہو جاتے اور انھیں ہم پر ترس آ جاتا۔ کورا بڑھ سے زیادہ سہمی ہوئی تھی۔ "گھر واپس چلو۔" اس نے ایک جگہ میرا ہاتھ روک کر منت کی۔

کئی بار خود میرے ذہن میں گھر واپس جانے کا خیال آیا تھا، وہ آزار کھلا ہوا تھا۔ گھر میں سب سوئے ہوں گے ہم بڑی آسانی سے اپنی جا سکتے تھے۔ اور اس اذیت سے نجات پا سکتے تھے، کوئی بھی ہمیں دیکھ لیتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا، ہم تو کہیں کے نہ رہتے۔ غم اور غصے میں آتا تو مہینوں تک کھانا بھی کھیں کھاتے کورا پولیس کے سپرد کر دی جاتی۔ نہیں میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اب تھوڑا سا راستہ رہ گیا ہے۔" میں نے جھوٹ کہا تھا۔ گلی کے نکڑ سے اسٹیشن کا راستہ دو میل کے قریب تھا اور یہ دو میل ہمارے لیے دو سو دو ہزار میلوں سے کم نہیں تھے۔

آگے بڑھتے رہے، چھپتے، راستہ بدلتے ہم دیا گنج پہنچ گئے جہاں تانگا ملنے کا امکان تھا۔ کورا ان، گھبرائی اور تانگا سب غنودہ تھے۔ میں نے ہمت کر کے ایک تانگے والے کے اٹھتے ہوئے جسیم پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ "کہاں جانا ہے؟" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔

"اسٹیشن۔" میں نے اپنی آواز بھاری بنانے کی کوشش کی۔

"مجھے اُدھر نہیں جانا، دوسرے تانگے والے سے پوچھ لیجیے۔" یہ کہہ کے اس نے ایک جماہی لی اور پھر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"کتنے پیسے لو گے؟" میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

"میں نے آپ سے کہہ دیا بابو جی! مجھے اُدھر نہیں جانا۔"

"دوروپے لو گے؟"

اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "جی پڑے دیں گے بابو جی، رات کا وقت ہے گھوڑا تھکا ہوا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے حیثیت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ یہاں سے اسٹیشن تک کا یہ بہت زیادہ کرایہ تھا اس وقت وہ سے سوا روپے بھی طلب کرتا تو میں اسے دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہم تانگے میں بیٹھے تو سردی کچھ کم ہوتی۔ دل قابو میں آنے لگا۔ رات کے وقت سڑک پر صرف ایک شور تھا، تانگے اور کتوں کا شور۔"

"کہاں جائیں گے بابو جی؟" تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگاتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ راستے میں تانگے والا اپنی عادت کے مطابق سوال و جواب ضرور کرے گا، گھوڑے کو برا بھلا کہے گا اور بڑبڑاتا رہے گا، اس کے سوال پر میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟

کسی اور شہر کا نام ذہن میں نہیں آیا۔ میں نے مختصراً کہا۔ "کلکتے۔"

"گاڑی پورے پانچ بجے آتی ہے مگر آج کل سالی گاڑیوں کا کیا اعتبار۔ ابھی کل ہی، ۱۱ بج کر ۱۰ منٹ ان لیٹ آئی تھی۔" وہ میری ہوں ہاں سے بے نیاز اپنی زبان ہلائے جا رہا تھا۔ "زیادہ خراب آگیا ہے بابو جی! کسی چیز کا ٹھیک نہیں رہا۔ اب دیکھیے آپ کو کب تک انتظار کرنا پڑے۔"

میں نے اس درمیان کورا سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ مگر قریب میں اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا ہوگا، ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی۔ وہ مڑ مڑ کے برقع کی جالی سے مجھے دیکھتی تھی اور کھسیانے لگتی تھی۔ اس سیاہ مضبوط سڑک پر گھوڑے کے ٹہل کی آواز آج مجھے بہت بُری معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خود ایک سڑک ہوں اور گھوڑا مجھ پر دوڑ رہا ہے۔ گھوڑے کا ہر ٹھوکر سے اوقدم فاصلہ کم کر رہا تھا لیکن راستہ کی آج طویل ہو گیا تھا۔ "تیز چلاؤ۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ہوا سے باتیں کر رہا ہے بابو جی! اور ابھی گاڑی آنے میں بھی بہت دیر ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت پر پہنچا دوں گا۔" کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ یہی عذاب ناک کیفیت۔ تانگے والے کو میری خاموشی پسند نہیں آئی چنانچہ اُس نے پیچھے ایک نظر ڈال کے پہلے برقع پوش کورا کو دیکھا پھر مجھے اور کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "ساتھ میں آپ کے گھر سے ہیں؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کہتا، تیری بلا سے یہ ایک غیر متعلق اور بے ہودہ سوال تھا لیکن مجھے خوش اخلاقی کا ثبوت دینا تھا۔ میں نے بمشکل تمام منمناتے ہوئے کہا۔ "بھائی ہیں، یکے آئی تھیں اب واپس جا رہی ہیں، بھیا کو چھٹی نہیں مل سکی اس لیے میں لے کے جا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" تانگے والا بولا۔ "بھائی کیا کام کرتے ہیں؟"

"انجینیر ہیں۔ عمارتیں بناتے ہیں۔ کلکتے میں بڑی بڑی، وہ سب وہی بناتے ہیں۔ بہت بڑے انجینیر ہیں، کلکتہ کبھی دیکھا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب بس سنا ہی سنا ہے۔ وہ آہ بھر کے بولا۔ "سنا ہے بڑا ظالم شہر ہے، آدمیوں کا جنگل ہے، وہاں ہر وقت روشنی رہتی ہے اور لوگ جاگتے رہتے ہیں۔ کلکتے کے بہت سے لوگ آتے ہیں تو اُنھی سے اُس شہر کے بارے میں سُن لیتا ہوں، بہت بار ارادہ کیا جانے کا مگر ....." وہ ایک مصرع گنگنانے لگا۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی ....."

سکلتے کا ذکر بہت سود مند ثابت ہوا۔ گو میں نے خود کلکتہ نہیں دیکھا تھا مگر میں اُسے اُس شہر کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں کر کے چونکاتا رہا۔ آخر اسٹیشن تک راستہ کٹ ہی گیا۔ اُسے مجھ سے میرے سفر اور کورا کے متعلق کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یقیناً یہ بات اُس کے لیے حیرت انگیز ہوگی کہ یکے سے اُتر جانے والی کسی لڑکی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر کوئی نہیں آیا مگر ممکن ہے یکے میں اُس کے تمام رشتے دار ضعیف ہوں، بیمار ہوں، اس کا دیور تو بہرحال اس کے ساتھ ہے۔ اسٹیشن کے باہر عمارت میں تیز روشنی تھی۔ میں نے پہلے ہی جیب سے تین روپے نکال کے ہاتھ میں رکھ لیے تھے تاکہ تانگے والے سے کوئی اور گفتگو نہ ہو سکے اور اترتے ہی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس نے مجھے دعائیں دیں۔ کئی قلی ہماری طرف دوڑے مگر میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس دیکھ کے ٹھٹک گئے۔

میرے لیے گھر سے باہر قدم نکالنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا، میں والد صاحب کے ساتھ قریب کے شہروں میں کئی بار جا چکا تھا۔ گھر سے اسٹیشن تک آنے کا شکل مرحلہ گزر چکا تھا، اب مجھے کہیں لوگوں کی نظروں سے بچ کے گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی، کہاں جاؤں، کون سے شہر میں لوگوں سے بچ کے رہنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ قریب کے کسی شہر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ ہر پھر کے ایک ہی شہر ذہن میں آیا اور وہ تھا کلکتہ۔ تانگے والے سے گفتگو کر کے مجھے کورا کے ساتھ سفر کرنے کی دشواریوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ہر آدمی چہرے پر لکھی ہوئی عمر دیکھتا ہے۔ ذہن کی بھی ایک عمر ہوتی ہے مگر وہ نظر نہیں آتی، جوان بوڑھے بچے ہوتے ہیں اور بچے بوڑھے ہوتے ہیں۔ میں زندگی کے بارے میں ہر چیز جانتا تھا۔ میں نے کتابیں پڑھی تھیں اور بہت کچھ سوچتا رہتا تھا، میرا ذہن خیالوں اور خوابوں کا کارخانہ تھا۔ لڑکے مجھے ہزاروں خراب دیکھا تھا، ہزاروں تصورات اس میں ڈھلتے تھے۔ کورا کا چہرہ برقع میں چھپ گیا تھا، قد کس کا پہلے ہی نکلا ہوا تھا۔ کوئی قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اندر ایک نوخیز لڑکی ہے۔ میں نے بھی شیروانی اسی لیے پہنی تھی کہ میرا قد بھی نکلتا ہوا تھا مگر میں کورا کی طرح برقع نہیں پہن سکتا تھا۔ میں آواز چاہے کتنی ہی بھاری بنا لیتا، چہرے پر سنجیدگی کی کتنی ہی تہیں جما لیتا اور چال میں کتنا ہی وقار پیدا کر لیتا، میرے چہرے پر صاف لکھی ہوتی تھی۔ میں اسٹیشن کی روشنیوں سے بچتا ہوا بلنگ نمبر ۶ پہنچا اور کلکتے کے ٹوکٹ خریدے کے تیزی سے پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں قلی اپنی سُرخ چادریں بچھائے اونگھ رہے تھے۔ ابھی چار بجے تھے اور گاڑی آنے میں پون گھنٹا باقی تھا۔ بلنگ کلرک نے بتایا تھا کہ آج گاڑی وقت پر آرہی ہے۔ پلیٹ فارم پر تیز روشنیاں نہیں تھیں، دُور ایک دھیمی روشنی کے نیچے دھری ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا اور میں نے کورا سے کہا کہ وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹانے کی غلطی نہ کرے۔

بہت ممکن تھا کہ محلے کا کوئی شخص اگر کسی رشتے دار یا کوئی شناسا بھی آج کی گاڑی سے کلکتے جا رہا ہو اس لیے میں پلیٹ فارم سے ہٹ کر ایک سنسان بنچ پر چھپا بیٹھا تھا اور میں نے اپنا چہرہ اس طرح جھکا لیا تھا جیسے مجھ پر نیند کا غلبہ ہو۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ مدھ گنج کے باتونیوں کو لینے کے لیے آنے والے رضا کار طالب علم اس طرف نہ آجائیں، جب تک گاڑی گیا اسٹیشن سے حرکت نہ کرتی، میرے لیے سکون محال تھا۔ شیروانی کے اندر سارا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" کورا کی سہمی ہوئی کمزور آواز اُبھری۔

"بہت دُور۔ جہاں کوئی ہمارے پیچھے نہ آسکے۔" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم کلکتے چل رہے ہیں کورا! ابھی کچھ دیر میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے پھر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔"

"اب ہم گھر واپس چل سکتے ہیں۔" کورا کے لہجے میں لرزہ تھا۔

"اب تو چلے آئے ہیں۔ اب گھر کا خیال چھوڑ دو کورا! ہم اپنا ایک گھر علیحدہ بنائیں گے۔ ٹھیک ہے، اب جو کچھ بھی ہو۔"

"بابر!" اُس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"بہت رکھو کورا! دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی حالانکہ میری حالت خود دگرگوں تھی۔ میں بڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا "گھر والے کیا سوچیں گے، وہ سب بہت روئیں گے۔"

"روئے تو انھیں کون سی میری فکر تھی۔ روپیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ سمجھ لیں گے کہ میں مر گیا، یا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

"سب مجھے بُرا بھلا کہیں گے۔ میں ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہوں۔"

"کورا ایسی باتیں مت کرو، ہم نے تب سب کچھ شاید ہمیں کسی دن گھر چھوڑ دیتا، اب اُن کا ذکر مت کرو۔"

ایک قلی کے تیز کھانسنے کی آہٹ ہوئی تو میں نے سر جھکا لیا کورا بھی چپ ہو گئی۔ قلی نے ہماری بنچ پر آکے کہا۔ "بابو جی! جگہ چاہیے؟"

"نہیں۔" میں نے گردن جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"اس گاڑی میں جگہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔" قلی نے تجربت کی۔

"نہیں بھائی! ہم خود جگہ تلاش کر لیں گے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

قلی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ یہاں کے قلیوں کا یہی حال تھا۔ وہ جگہ دلانے کے بہانے ایک دو روپے اینٹھ لیتے تھے۔ گاڑی میں اتنی ہی جگہ ہوتی تھی جتنی ہو سکتی تھی۔ قلی جگہ کھینچنے کے بڑی نہیں کر سکتا تھا۔ مسافرات کے لیے گاڑی میں علیحدہ ڈبے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کورا کو وہاں بٹھا دوں گا تو وہ بڑی محفوظ رہے گی۔ مگر میں اسٹیشن پر اُتر کے اُس کی خیریت نہ پا سکوں گا۔ مگر مسافرات کے ڈبے میں کورا کا نقاب اُٹھانا لازمی تھا۔ عورتوں کا پوچھ گچھ کرنا بھی یقینی تھا۔ کورا کی ہندوستانی خاصی صاف تھی مگر آتی بھی نہیں۔ بہرحال ہندوستان میں ہر جگہ مسلمان عورتیں صاف اُردو یا ہندوستانی نہیں بولتیں لیکن وُہ رہتا تھا کہ اگر ڈبے میں کوئی مسلمان عورت مل گئی اور اُس نے اِدھر اُدھر کے سوالات شروع کر دیے تو کورا ایک جھمیلے میں پھنس جائے گی۔ اُسے مڑانے میں اپنے پاس بٹھانے میں بھی خطرہ تھا۔ ڈبے میں تمام لوگوں کی نظریں اس بُرقع پوش لڑکی پر جم جائیں گی اور خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ ایک بُرقع پوش مسلمان لڑکی کا مڑانے ڈبے میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اس کشمکش و پنج میں گرفتار تھا جیسے جیسے

گاڑی آنے کا وقت قریب آرہا تھا، پلیٹ فارم کی زندگی کروٹیں لینے لگی تھی۔ قلیوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ کسی آوارہ انجن کی تیز سیٹیوں کی آواز آئی، یا اُس کی تیز روشنی نظر آئی تو گمان ہوتا جیسے گاڑی آگئی ہے۔ مسافروں میں بدھ راہب اپنے مخصوص لباس میں علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ گاڑی کے رکنے کے وقت تک اسٹیشن پر ہنگامہ ہو گیا تھا۔ مجھے چند طالب علم بھی نظر آئے میں اپنی بنچ سے اُٹھ کر جنگلے کے قریب اندھیرے میں ہو گیا کہ زندگی کی رونق اور شناسا چہرے اسٹیشن پر مٹر گشت کر رہے تھے۔ کورا اکیلی بنچ پر بیٹھی رہی۔ یہ بہت کربناک وقت تھا، کم بخت گاڑی نہ جانے کہاں اٹک گئی تھی جب پلیٹ فارم پر ٹہلنے والوں کی بھیڑ بڑھ گئی اور بہت سے لوگ ہر بس ناک نقشوں سے کورا کے اردگرد منڈلانے لگے تو اندھیرے سے نکل کے بنچ پر آگیا۔ بھیڑ خود بخود چھٹ گئی۔ میں ایک طرف سے دیکھنے لگا جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ جیسے ہاتھ لینے کے ہوں اور بیٹے اور بیٹی کو یہاں بھاگتے ہوں۔ کورا کے چمکیلے ہاتھ برقع کے پار سے تھے، اُس کے خوب صورت پیر بھی سیاہ لباس میں صاف نظر آتے تھے۔ جب بھی ہم طالب علم اسٹیشن آتے اور کسی سُرخ پوش عورت کو دیکھتے تو سب سے پہلے اُس کے پیروں پر ہماری نظریں جاتیں۔ پیروں اور ہاتھوں سے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی گوری اور گوری ہوگی اور گوری ہونے کا چہرہ کتنا دلکش ہوگا۔ اب یہی صورتیں میرے ساتھ تھیں۔ ہم پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر بھی لوگ یہاں تک آرہے تھے۔ اُنھیں کون روک سکتا تھا کہ اس طرف مت آؤ، اس طرف مت دیکھو، جب وہ اس طرف سے گزرتے تو کورا کی جانب گردن موڑ کے ضرور دیکھتے۔ میں نے تصور میں اُن میں سے بعضوں کی آنکھیں پھوڑ دیں۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ بُرقع میں ایک شہزادی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ نقاب اُٹھا دے تو اسٹیشن پر بجلی گر جائے اور سب کچھ پلٹ ہو جائے۔ یہ احساس کہ میرے پاس ایک شہزادی ہے، حُسن و جمال کا خزانہ، ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی۔ یہی احساس مصائب و آلام کے وقت میرا سہارا بنا رہا تھا۔ اپنا تو کیا میں نے اپنا کا ایک تیز دھار والا رم پوری چاقو بھی سامان میں رکھ لیا تھا۔ یہ چاقو دستے کے اوپری حصے پر لگا ہوا پیتل کا ایک چھوٹا سا کلپ لگانے سے کھٹ سے کھل جاتا تھا۔ آبِ قربانی کے موقعے پر اسے عموماً استعمال کرتے تھے۔ میں نے سوچا یہ چاقو بنچ کی لکڑی میں اپنے اور کورا کے درمیان گاڑ دوں گا۔ میں اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا کیونکہ آنے والوں کی نظریں ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔ مجھے غصہ تھا، خوف تھا، فکر تھا، مجھ پر تضاد کیفیتیں غالب تھیں۔ اسٹیشن پر ٹرین آنے لگی، گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ مغرب کی طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی ایک جھٹکے سے نقطے کی صورت میں اُبھری، یہ نقطہ بتدریج بڑھتا گیا، سب لوگ گاڑی کی طرف جھپٹ پڑے میں بھی سوٹ کیس اُٹھا کے بنچ سے اُٹھا مگر میں نے اتنی وحشت کا مظاہرہ

تحمل سے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، مستورات کے ڈبے کے اوپر ایک عورت کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ رات کے وقت وہ تصویر روشن ہو جاتی تھی۔ میں نے گاڑی پر ایک سرسری نظر ڈالی، لوگ ڈبوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، جائے والوں کو بھی جلدی تھی آنے والوں کو بھی۔ گاڑی وہاں کوئی پندرہ منٹ ٹھیرتی تھی مگر لوگ بہت بے چینی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ویسے بھی سوار ہونے میں تاخیر کی تاکہ بدحواسیوں کی رہبری کے لیے آنے والے رضاکار طالب علم اسٹیشن سے نکل جائیں۔

جہاں سے سامنے عورتوں کا کوئی ڈبا نظر نہیں آ رہا تھا میں نے کورا کو اشارہ کیا اور تیزی سے انجن کی طرف جانے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈبے ڈھونڈتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدم کس بے ترتیبی سے پڑ رہے ہیں۔ اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کورا مجھ سے پیچھے تھی۔ وہ وہیں ٹھٹک گئی جہاں کھڑی تھی۔ ایک لمحے میں جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا، وہ میرا کلاس فیلو جگ دیش تھا۔ "کہاں ہے؟" اس کی آواز مجھے سنائی دی۔

"کچھ نہیں ذرا سر درد ان تک، دو تین روز میں آجاؤں گا۔" میں نے گڑبڑا کے جواب دیا۔ "تم نے کہیں سے چھوٹے بھائی کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کیا وہ نہیں مل سکا ہے؟" اس نے ہمدردی ظاہر کی۔

"شاید ہاموں کے ساتھ ہو۔ ممکن ہے ماموں کو کہیں اور جگہ مل گئی ہو۔ میں انھی کو تلاش کر رہا ہوں۔"

اس نے میری پریشانی محسوس کر لی تھی۔ قریب ہی سہمی ہوئی کورا کھڑی تھی۔ "سسٹر؟" اس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ہاں اب تم ایسا کرو جگ دیش! ذرا گاڑی کے اس سرے تک چلے جاؤ، ممکن ہے چھوٹا بھائی تمھیں نظر آجائے۔ میں ادھر دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کے میں نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جگ دیش ڈبوں میں جھانکتا ہوا مجھ سے دور ہوتا گیا۔ سب سے آگے کے ڈبوں میں عورتوں کا ڈبا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے رک کر کورا سے کہا کہ وہ کسی سے بات نہ کرے، گونگی اور بہری بنی رہے۔ کورا میری نصیحت گرہ میں باندھ کے سر ہلاتی ہوئی ڈبے میں داخل ہوئی۔ خوش قسمتی سے جگہ کم نہیں تھی میرے اندازے کے مطابق ان میں مسلمان عورتیں بھی موجود تھیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کورا کے پیچھے پرسبھی نے منہ بنایا کیونکہ وہاں کی ہنڈیا میں خلل کا سبب بنی تھی۔

میں نے عورتوں کے برابر کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر مسافروں نے مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ میں چیخا چلّایا، کار بار بار ہاتھوں نے سامان ہی دروازے کے نزدیک رکھ دیا تھا تاکہ وہ آسانی سے رکھا جا سکے۔ "جگہ نہیں ہے کوئی اور ڈبا دیکھو۔" ایک گرج دار آواز آئی۔

"جناب! میں کھڑا ہو کے سفر کر لوں گا۔" میں نے التجا کی۔

"دوسرا ڈبا دیکھو میاں!" ایک مولوی صاحب نے کہا۔

"جناب مجھے بس ذرا سی جگہ چاہیے۔ میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ گاڑی چلنے والی ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے آرام میں خلل نہیں ہوں گا۔"

"میاں آپ سے کہہ رہا ہوں یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔"

"مولوی صاحب! کچھ تو انسانی ہمدردی کیجیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"کہاں اترنا ہے بالک؟" ایک نسبتہً نرم آواز نے پکارا۔

"جناب! جانا تو دور ہے مگر میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔"

ڈبے میں ابھی بھنبھناہٹ ہوتی۔ مسافر کسمسانے لگے۔ ایک صاحب نے سامان ہٹایا، دوسرے نے دروازہ کھولا، تیسرا اوپر کی برتھ پر لیٹے لیٹے حکومت کو برا بھلا کہنے لگا۔ مولوی صاحب بھی مدد دیا ہے تھے۔ ذرا سا دروازہ کھلا تو میں تیر کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ڈبے میں اتنے زیادہ مسافر نہیں تھے مگر ایک برتھ پر دو دو آدمی سوئے ہوئے تھے کچھ نے فرش پر چادر بچھائی ہوئی تھی۔ میں بیت الخلا کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

"صاحب زادے! کیا تنہا سفر کر رہے ہو؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں ساتھ میں بھی ہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ہیں، وہ کہاں ہیں؟" انھوں نے تشویش سے کہا۔

"ساتھ والے ڈبے میں۔"

مولوی صاحب نے کچھ سوچ کر کہا، "اچھا۔ میاں! مسافروں کا حال عجیب ہے، سب ایک ہی ڈبے پر پل پڑتے ہیں جگہ تلاش نہیں کرتے، بے آرام رہتے ہیں اور بے آرام کرتے ہیں۔"

میں سہما اور دبکا کھڑا رہا، اسی اثنا میں کسی نے مجھے آواز دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ جگ دیش ہی تھا۔ کم بخت پیچھے پڑ گیا تھا۔

"باہر!" اس نے کھڑکی کے اندر جھانک کے آواز لگائی۔

میں نے جواب دینے سے گریز کیا مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ "میں آگیا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"پھٹکال گیا۔" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں دونوں مل گئے۔ پچھلے ڈبوں میں ہیں۔"

"یار! کھڑے کیوں ہو، ٹرنک پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے ہمدردی سے کہا۔

"ٹرنک میرا نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا، اس طرح کب تک کھڑے ہو گے کن جھاٹے کا ہے یہ صندوق؟" ڈبے کے سرشخص نے اس کا سوال سنا۔

سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ جگ دیش کی یہ مداخلت مجھے بہت بری لگی۔ بڑی مشکل سے تو جگہ حاصل کی تھی، وہ مسافروں کو ناراض کیسے دے رہا تھا۔ "بیٹھ جاؤں گا جگ دیش! سفر ہی کتنا ہے۔"

انجن کی تیز سیٹی کے ساتھ ساتھ گاڑی کے پہیے چرمرائے۔ جگ دیش ڈبے سے چپکا سوا کچھ دور تک دوڑا پھر دور سے سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی یقین نہیں آیا کہ گاڑی گیا شہر سے روانہ ہو چکی ہے وہ جب روشنیوں سے دور آگے بڑھی اور کھیتوں سے گزری تو کھلبلیے میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ زنجیر کھینچ کے گاڑی سے اتر جاؤں بے اختیار گھر یاد آگیا، سب کے چہرے نظروں میں گھوم گئے۔ ابا جاگ گئے ہوں گے اور انھوں نے بستر پر مجھے نہیں دیکھا ہو گا تو ان کا کیا حال ہوا ہو گا؟ پھر انھوں نے امی کو جگایا ہو گا، امی کا دل دھک سے رہ گیا ہو گا وہ زار و قطار رونے لگی ہوں گی۔ ابا نے دروازہ کھلا دیکھا ہو گا تو ساری بات سمجھ گئے ہوں گے پھر انھوں نے چھت پر جا کے کورا کی موجودگی کی تصدیق کی ہو گی، وہ کیسے پریشان ہوں گے نیچے اتر کے سامان دیکھیں گے اپنی جیبیں اور نقدی دیکھیں گے اور سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائیں گے پھر امّاں انہیں دور آتی گئی ابا اسٹیشن تک آئیں گے اس وقت تک گاڑی گیا سے بہت دور آچکی ہو گی۔

♥

گاڑی نے رفتار پکڑی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے تو کبھی دوبارہ اونگھنے لگے۔ میں کمپارٹمنٹ کی دیوار سے لگا کھڑا رہا اور اپنے زاویے بدلتا رہا۔ درمیان میں مولوی صاحب کی آنکھ کھلی انھوں نے مجھے دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ میاں! کھڑے کیوں ہو، اب آہی گئے ہو تو آرام سے بیٹھو۔"

"شکریہ جناب! میں ٹھیک ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔ وہاں تکلیف ہے تو ادھر آجاؤ۔" مولوی صاحب نے حکم دیا۔

میں نے ٹرنک پر بیٹھ کے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ نیند آنے کا کوئی سوال نہیں تھا، بیداری کی بھی حد آگئے اب کیفیت تھی۔ صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا، ادھر کورا اور جوڈتھی۔ اس کا خیال میرے ذہن سے چپٹا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہو، گھبرا تو نہیں گئی ہو گی؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہو گی؟ کاش میں اس کے پاس ہی بیٹھ سکتا تاکہ اسے تسلی دیتا رہتا، رستا تھا، کلکتہ دن کے ساڑھے گیارہ بجے آتا ہے، یہ وقت انتہائی مناسب تھا مگر میں کلکتے میں کہاں جاؤں گا؟ کہاں ٹھیروں گا اور لوگ میرے اور کورا کے بارے میں پوچھیں گے تو انھیں کیا بتاؤں گا؟ خیال کے بھنور طرح طرح ستاتے ہے۔ کبھی حوصلہ کبھی خوف۔ کبھی آنے والے دنوں میں کورا کے ساتھ جینے کی سرشاری کبھی سوسو اندیشے لیکن میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا، مولوی صاحب کو جھٹکنے کی عادت تھی، ہر پانچ منٹ بعد ان کی آنکھ کھل جاتی تھی اور وہ انگڑائی لے کے میری خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ کچھ دور آگے بڑھ کر اترنے لگا اور ہر طرف ایک خیالی روشنی پھیلنے لگی اور لمحہ بہ لمحہ اجلی ہوتی گئی۔ ڈبے کے بہت سے مسافر جاگ

پڑے تھے گھلتے ہوئے سرمائی ایک ہندو سب سے پہلے جاگا۔ لمحہ اندر کی اجازت اس کی نہ دی تھی، پھر مولوی صاحب اٹھیں پڑھتے ہوئے وضو کرنے کے بعد جیسے ہی انھوں نے معلوم کیا، لوگوں نے بڑھ کر انھوں نے نماز جلدی ختم کر لی، پھر ڈبے کے کئی لوگ پیچھا کرنے لگے اور انھوں نے میری شکل دیکھی۔ میری شکل پر کوئی بھی علامتیں ہیں اس کی ان کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی۔ ایک صاحب نے کھسک کے کچھ جگہ سیٹ پر بنا لیا۔ "ماشاء اللہ میاں کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔" مولوی صاحب نے میرا چہرہ اور لباس دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کچھ پڑھتے ہیں آپ؟"

"بی اے کے پہلے سال میں ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔"

"یہ بچے کی عمر نہیں ہے۔" ایک صاحب نے کہا۔ "بہت خوب آپ کی آنکھوں پر چشمہ ہونا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بھئی حد سے زیادہ پڑھنے والے تمام عمر آنکھوں پر چشمہ لگا رہتا ہے۔" ڈبے میں سب ہنسنے لگے۔ میں بھی مسکرا کے ان میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ ماحول کی کثافت ختم ہو گئی۔ مولوی صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ انھوں نے میرا نام پوچھا تو میں نے اپنے نام کا دوسرا لفظ بتا دیا، زمان۔ وہ مجھ سے میرے خاندان اور والد صاحب وغیرہ کے متعلق سوالات کرتے رہے اور میں انھیں کچھ یہ کچھ جھوٹ بتاتا رہا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا۔

"تمھیں تو آگے جانا ہے۔" مولوی صاحب نے تکلیف دینے کی۔

"مگر میں نے آپ سے ای اسٹیشن تک بیٹھنے کی اجازت مانگی تھی اب میں کوئی دوسرا ڈبا ڈھونڈ لوں گا۔" مولوی صاحب کے ساتھ تمام مسافروں نے یک زبان مجھے اپنے ساتھ بٹھانے پر اصرار کیا جس پر حیرت ہوئی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ضرور اسی ڈبے میں آؤں گا، ذرا زنانے میں عورت دریافت کر لوں۔ وہاں سے آگے کے میں برابر کے ڈبے کی کھڑکیوں پر پہنچا۔ اندر جو عورتیں بیٹھی تھیں، ان کے مردوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔ کورا نے مجھے دیکھا تو بے تاب ہو گئی۔ اس نے نقاب اتنا تک بن رکھی تھی، اس کی آنکھیں اور پیشانی کے کچھ حصے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ادھیڑ عمر کی پرشکوہ مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے کھڑکی پر گردن ڈال دی۔ کچھ کہنے ہی والا تھا مگر فوراً خیال آگیا لہٰذا میں نے اشارے سے اس کی ہدایت پر عمل کی۔ اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ پھر میں نے ہاتھوں سے چائے کی پیالی کی شکل بناتے ہوئے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی یا کچھ کھائے گی؟ کورا نے اثبات میں سر ہلایا، اس مرتبہ پرس کے برابر بیٹھی ہوئی عورت بول پڑی۔ "بھیا! یہ تمھارا بہن ہے؟" میرے اقرار پر اس نے کہا۔ "مجھے بہت دکھ ہوتا ہے بڑی عمر کی

پہلو سے بیٹھی ہوتی ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو، میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔"

میں نے اس نیک خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اسٹال سے دو پیالیاں چائے اور بسکٹوں کی ایک پلیٹ لے کے اُن کے سپرد کر دی۔ کورا سے چائے پینے کے لیے نقاب ہٹانی تو وہ بے میں چکا چوند ہو گئی۔ جو سر دھکر پیں پر کھڑے تھے وہ مبہوت رہ گئے۔ تاجر کورا کو اپنا رخ بدلنا پڑا۔ برقع والی دوسری عورت نے اُس کی دلاسا دینے میں تعاون کیا۔ جب تک گاڑی نہیں چلی، میں پلیٹ فارم پر کھڑا رہا پھر واپس اپنے ڈبے میں آگیا۔

مولوی صاحب نے اپنا ناشتے دان کھول لیا تھا۔ جبرا، انھوں نے مجھے بھی شریک کر لیا اور میں ہر اسٹیشن پر اُتر کے کورا کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ بھگتہ آنے تک مولوی صاحب سے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں۔ اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی پینتالیس سال کے ہوں گے۔ اُن کے چہرے پر تراشی ہوئی داڑھی تھی، اُن کی آنکھیں چمکیلی اور تیز تھیں، پیشانی اور چہرے کا رنگ گھٹا ہوا تھا، قد بھی مناسب تھا۔ کھلے ہوئے ٹخنوں کی شیروانی میں وہ خاصے سلجھے ہوئے، مستعد اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ڈبے میں ہم دو ہی مسلمان تھے۔ مولوی صاحب کا نام محمد شفیق تھا۔ وہ مراد آباد سے آرہے تھے اور کُنھی کے قول کے مطابق وہ ایک مدرسے میں درس و تدریس کے لیے کلکتے جا رہے تھے۔ جزوقتی طور پر وہ مراد آبادی برتنوں کی کمپنی کے ایجنٹ بھی کرتے تھے۔ اُن کے پاس ایک صندوق میں مختلف قسم کے برتنوں کے نمونے سجے ہوئے تھے۔ یہ نمونے وہ دکانوں پر دکھا کے آرڈر لیا کرتے تھے اور آرڈر مراد آباد بھیج دیتے تھے۔ مولوی صاحب بہت شائستہ گفتگو کرتے تھے اور تب سے رہتے تھے کلکتے تک وہ مجھ سے تمیز کرتے رہے۔ انھوں نے شاری نہیں کی تھی، بساعت اُن کا مشغلہ تھا۔ وہ سارا ہندوستان دیکھ چکے تھے۔ میں نے اُن سے کلکتے کا پتہ لیا، اُس جہاز میں نے بازاروں اور محلّوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کلکتے میں اُن سے ضرور ملاقات کروں گا۔

ہوڑا اسٹیشن پر ظاہر ہے مجھے میرے ماموں جان لینے نہیں آئے مولوی محمد شفیق بھی سخت پریشان ہوتے۔ میں کورا کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ ازراہ ہمدردی مولوی صاحب بھی رُک گئے تھے اور گھور گھور کے کورا کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ دیکھ رہے تھے، پیر دیکھ رہے تھے۔ اُن کے تھرجانے سے میں بھی بُرکار ہا و رنہ اب تک میں اسٹیشن سے باہر ہوتا۔ نہ جانے رفتہ رفتہ کیا نہ ماندن عجب گومگو کا عالم تھا۔ میں اپنے خود ساختہ ماموں کا انتظار کر رہا تھا اور مولوی صاحب کو مجھ سے اتنی اُنسیت ہو گئی تھی کہ انھوں نے میرے بغیر اسٹیشن سے باہر جانا منظور کر دیا تھا۔ ماموں جان کو بھلا کیوں آنا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔

"میاں! تمھارے پاس اُن کا پتہ بھی ہے؟"

"جناب! اُس کا آنا بالکل یقینی تھا، تار تک دے دیا تھا، ایک ہفتے پہلے خط لکھ دیا تھا۔ وہ کولوٹولا اسٹریٹ میں کہیں رہتے ہیں، نمبر اور بلڈنگ کا نام وغیرہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔"

"مجھے بھی قریب ہی جانا ہے، آؤ وہیں کہیں تلاش کرتے ہیں، اب ٹرین کے آنے کی اُمید نہیں ہے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے اور گاڑی پہلے ہی آدھ گھنٹے لیٹ آئی ہے، آؤ میاں! اٹھو۔ اگر وہ آج نہ ملیں تو آپ دونوں میرے ساتھ رہ لیجیے گا، اپنا کھانا بھی بُرا نہیں ہوگا۔"

"شکریہ جناب! آپ کہاں زحمت کریں گے۔ میرا خیال ہے میں کچھ دیر اور انتظار کر لوں۔ آپ اپنا وقت ضائع نہ کیجیے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تکلیف کا تم نے خوب ذکر کیا۔ تم تو غریبت برتنے تھے، میاں! آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ میں یہاں سے اُس وقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک تمھارے ماموں جان قبلہ آ نہیں جائیں گے۔ یہ کلکتہ ہے ستار درا! بہت مخبوں شہر ہے یہاں یہ دن رات جنات بستے ہیں، آدمی کھو جاتا ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ دیکھ رہے ہو، لوگ کیسے بھاگ رہے ہیں، اِدھر دیکھو آدمی ہی آدمی نظر آتا ہے۔"

مولوی صاحب سچ کہتے تھے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ انسان گرمہ پسند ہوتا ہے۔ یہاں تو اتنے لوگ تھے کہ دہشت ہونے لگی تھی۔ مجھے جیسی سانس محسوس ہوا، اُدھر مولوی صاحب کو تالا بند ہو گیا تھا۔ وہ تو دھرنا دے کے ایک منبع پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے کورا کو بھی اُن کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ میری مجبوری اُسی طرح سمجھ رہی تھی۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پھر مولوی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ ہم لوگوں کی خاطر اپنا وقت برباد نہ کریں مگر وہ نہ مانے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسٹیشن سے اُن کے ساتھ باہر نکلیں اور کولوٹولا اسٹریٹ میں ماموں جان کو تلاش کریں۔

"ماموں جان کا نام اکبر مہاں ہے۔ وہ اجناس کے بڑے بیوپاری ہیں اور اسی سلسلے میں انھیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔" یہ باتیں میں نے پہلے ہی مولوی صاحب کو بتا دی تھیں۔ یہ اُس قسمت میں بھی وہی بتا چکا تھا جس میں مولوی صاحب موجود تھے۔ میں نے اُس بُرے وقت کو کوسا، ڈوبتے ہوئے دل سے مولوی صاحب کے ہمراہ اسٹیشن سے باہر آیا۔ بہلی نظر میں اس شہر کا کوئی اچھا تاثر ذہن پر مرتب نہیں ہوا۔ اب تک میں نے صرف چھوٹے چھوٹے شہر، قصبات اور دیہات دیکھے تھے۔ یہ تو دنیا ہی اور تھی۔ میں نے بے بسی سے کورا کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب نے ایک ٹیکسی روک لی تھی، "آؤ میاں بیٹھو!" انھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں اور کورا ٹیکسی میں قربانی کے بکروں کی طرح پھیلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب ڈرائیور کے قریب بیٹھے تھے۔ کچھ سامان ڈکی میں رکھ دیا گیا تھا اور کچھ ہم نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

میں سوچتا رہا، مولوی صاحب بے چارے ماموں جان کی تلاش

میں کہاں کہاں سر ماریں گے؟ کن کن لوگوں سے پوچھیں گے؟ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی میں نے مولوی صاحب سے کہا۔ "جناب! کیوں نہ ہم آپ کی قیام گاہ چلیں، وہاں نہا دھو کر اطمینان سے ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے۔"

"بخدا میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا۔" مولوی صاحب اُچھل کر بولے۔ "مکان تو نہیں البتہ ایک کمرے کا انتظام ضرور اُن لوگوں نے کیا ہوگا جیسے تیسے گزر کریں گے۔ مجھے تو تمھارے ماموں جان کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا حادثہ ہوا؟ خدا خیر کرے۔ انھیں تمھارا تار اور خط مل جانا چاہیے تھا۔" میں خاموش رہا اور شیشے سے کلکتے کا نظارہ کرنے لگا۔ عمارتیں ہی عمارتیں، سڑکیں، ٹرامیں، بسیں، ہاتھ گاڑیاں، ہر جگہ انسان، دکانیں، ہوٹل، بڑے بڑے بورڈ، نیلے پیلے، کالے، سرخ سفید، سرخ رنگوں کا شہر۔ مولوی صاحب کے کہنے پر ٹیکسی ایک بڑی مسجد کے قریب ٹھیرگئی۔ مسجد سے ملحق عمارت میں مدرسہ تھا، مدرسہ بند تھا۔ ٹیکسی ٹھیرا کے مولوی صاحب اندر خبر کرنے چلے گئے۔ میں نے سوچا، یہیں سے فرار ہو جاؤں مگر مولوی صاحب کا سامان بھی ٹیکسی میں رکھا تھا، اُسے کہاں چھوڑتا اور ٹیکسی والے سے کیا عذر پیش کرتا۔ مولوی صاحب جلد ہی واپس آگئے۔ اُن کے ساتھ ایک اور دراز ریش بزرگ تھے۔ انھوں نے سامان اُتروانے میں مدد کی۔ کرایہ بھی انھی صاحب نے ادا کیا۔ پھر ہمیں ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس میں ایک مرکھلا اور دروازہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی۔ سیلن تھی اور اندھیرا تھا لیکن کمرے کے باہر چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ روشنی ہونے پر کمرہ کچھ ایسا بُرا معلوم نہیں ہوا۔ "میں باہر چلا جاتا ہوں۔" مولوی صاحب نے چارپائی پر بستر بچھا کے کہا۔ "عزیزہ سے کہو کہ اطمینان سے بیٹھیں، بُرقع اتار دیں، چاہیں تو غسل کر لیں، ہم لوگ کھانے کا انتظام کرتے ہیں جس چیز کی ضرورت ہو، صابن، تولیا، لوٹا، وہ سب میرے سامان میں موجود ہے۔"

(ہولا مجھے اتنے مہربان آدمی کے سامنے کورا کا پردہ اُتروا دینا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا پینے کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ جگہ محفوظ تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ مولوی صاحب کو صاف صاف بتا دوں مگر ہمت نہیں پڑی۔ اتنے انسانے تراشے تھے کہ اب حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ مولوی صاحب نے خاصا پُرتکلف کھانا خرید کر کورا کو ان کھانوں کی عادت نہیں تھی۔ میں نے ساتھ میں اُس کے لیے پلیٹ کی دال بھی لے لی۔

جب ہم کھولی کے اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک اور چارپائی رکھی جا چکی تھی۔ مولوی صاحب صحن میں بیٹھ گئے۔ میں کورا کے لیے کھانا لے کے اندر چلا گیا، اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ میری بہن فہمیدہ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں اُسے نظر انداز کر گیا، اس لباس میں تو وہ کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اُس کے سامنے کھانا رکھ دیا اور خود مولوی صاحب کے ہمراہ کھانے کے لیے صحن میں آگیا۔ مولوی صاحب بہ ضد تھے کہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا مگر میں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ کورا کو دیکھ کے نفرت کی ساری شدت دور ہو گئی تھی۔ اتنے قریب تو وہ گھر میں بھی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ صحن سے میری نظریں اندر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کورا کو مجھ نے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے دیکھ کر مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے مدرسے کے اندر میں چلے گئے۔ مجھے آزادی نصیب ہوئی۔ میں نے دروازے کی کنڈی بند کی اور اندر گھس گیا۔ کورا چارپائی پر اُداس بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس خیال سے میرا حلق حال ہو گیا کہ وہ اور میں کمرے میں تنہا ہیں۔ میں دور ہی کھڑا رہا، کورا بھی کھڑی ہو گئی۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں، نظریں جھکائیں۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ میرے دل میں غبار اٹھا لیکن میں نے اپنے آنسو روک لیے۔ غم سمٹ کر کورا پر منتقل تھا۔ میرے منہ سے نکلا۔ "غم مت کرو، اس اجنبی جگہ چند دن پریشانی سے گزاریں، جیب میں ابھی پیسے ہیں۔ کچھ دن اور ویسے بھی اچھے گزر جائیں گے۔"

"مگر اب ہم جائیں گے کہاں؟" وہ ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ یہ شہر تو بہت خراب ہے، ہمارا اس جگہ گزارا نہیں ہوگا۔" پھر مجھے خیال آیا کہ میں خود ہی حوصلہ شکنی کی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے تو اس کی ڈھارس بندھانی چاہیے۔ میں اُس کے اور قریب ہو کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں اُس کی وجہ سے ایک تازگی اور روشنی معلوم ہوتی تھی۔ ایک اداس خوشبو سرطرف پھیلی ہوئی تھی۔ "بیٹھ جاؤ کورا!" میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "مولوی صاحب ابھی آتے ہوں گے، اُن کے سامنے پردہ کرتی رہنا اور مجھ سے کم ہی بولنا۔ ابھی ہم شاید باہر جائیں اور ماموں جان کی تلاش میں ناکام ہو کے واپس آجائیں۔ ہم مولوی صاحب سے زیادہ دیر جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اگر انھوں نے کہیں تمھاری شکل دیکھ لی تو وہ یقیناً شک میں پڑ جائیں گے چنانچہ ہمیں یہاں سے بھی چلنا ہوگا۔"

"مگر کہاں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"کہیں بھی۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"باہر میرا زیادہ گھومنا ٹھیک نہیں ہے، وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔" انھوں نے مرا پتہ چلا لیا تو مصیبت آجائے گی۔ اگر یہاں مکان نہیں ملا اور تم کسی کام پر نہ لگ سکے تو ہمارا کیا ہوگا؟ سب پیسے ختم ہو جائیں گے؟"

"ہو جانے دو۔ خدا سے اُمید رکھو، میں نہیں سمجھا کہ تم نے گھر سے بھاگ کر کوئی بُرا کام کیا ہے، میں اپنے ماں باپ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"باہر! مولوی صاحب سے سب کچھ کہہ دو، شاید وہ ہماری مدد کریں۔"

"اور اگر وہ خود گھبرا گئے تو کیا ہوگا؟"

کورا کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ آنسو بہتے

رہے۔ وہ آنسو تھے یا آگ کے قطرے جو میرے دل و دماغ پر گر رہے تھے۔ کاش میں چند سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا۔ میں خود کو بہت کم عمر محسوس کرنے لگا۔ کورا تو میرے پیروں میں لرزش پیدا کیے دے رہی تھی۔ اس اجنبی شہر میں کسی سے مکان اور کام کی بات کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ کسی کی مدد کے بغیر راستے بھی تلاش نہیں کیے جا سکتے تھے۔ کورا کو کسی محفوظ جگہ ٹھہرا کے ہی میں مکان اور کام تلاش کر سکتا تھا۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں کی اتنی شدید ضرورت ہوتی ہے، پہلے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اب تک آرام کی کھائی تھی، نہ صبح کی فکر، نہ شام کی، کھانا خراب ہوتا تو میں پلیٹ پھینک دیا کرتا تھا۔ اپنی اچھی کرشموں کی وجہ سے میں گھر میں جلد کڑا مشہور تھا۔ سارے کس بل ایک ہی دن میں نکلے جا رہے تھے۔ ہم نے غلط شہر کا انتخاب کیا تھا مگر ہم کسی بھی شہر میں جاتے، یہی صورت پیش آتی۔ کورا کو ساتھ لے کے سڑکوں پر گھومنے میں خدشے ہی خدشے تھے۔ کورا کو کسی اماں میں بھی بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی مکان نہیں تھی جسے مقفل کر دیا جاتا۔ وہ نقدی نہیں تھی کہ اسے جیب میں رکھا جا سکتا۔ کورا تو ایک لڑکی تھی، ایک ہیرا۔ سو سو کے نوٹوں کے پہاڑ بنا دیے جاتے تب بھی کورا کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی۔ بہت سی باتیں سمجھ میں آنے لگیں، ہر چیز بدلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جب اس کی آنکھیں رونے سے باز نہیں آئیں تو میں تھکا کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رو دو نہیں کورا! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" لیکن مجھے خود بھی خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ فی الحال بس ایک راستہ نظر آتا تھا کہ ہم کسی ہوٹل کا رُخ کریں۔ ہوٹل مسافروں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ میں نے اسٹیشن سے آتے ہوئے راستے میں بہت سے ہوٹلوں کے بورڈ دیکھے تھے۔ انھی میں سے کسی معقول سلم ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے، وہاں کوئی سہارا بنا دیں گے کہ ہم اپنے ایک فاضل بھائی کو منانے کے لیے آئے ہیں۔ جس کے متعلق سنا ہے کہ وہ لکھنؤ آگیا ہے۔ وہ ہوٹل اچھا ثابت نہ ہوا تو دوسرے ہوٹل میں مقیم ہو جائیں گے۔ جیب میں روپے کافی ہیں۔ شاید آئندہ دنوں میں جینے کا کوئی آسرا پیدا ہو جائے۔ میں غلط بنا اور بگاڑتا رہا۔ ذہن میں طغیانی آئی ہوئی تھی جو ترکیب نظر آتی تھی، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی اندیشہ بھی ضرور لگا ہوتا تھا۔ سارے مسئلے حل ہو جاتے اگر مولوی صاحب کی داڑھی جیسی داڑھی میرے چہرے پر بھی موجود ہوتی۔

کورا کے گلے میں چنا ہوا دھانی دوپٹا پڑا ہوا تھا۔ یہ دوپٹا اُسے امّی نے دیا تھا۔ کورا نے فہمیدہ کی طرح اُسے سر پر اوڑھ لیا تھا۔ میں اُس کا سر اپنے سینے سے لگائے اُسے تسلی دینے کا ارادہ کرتا تھا مگر وہ جاتا تھا میرے ہاتھ آگے نہیں بڑھ سکے۔ میں سوچتا ہی رہا، اسی اثنا میں ٹرائے پر کھٹکا ہوا۔ شاید مولوی صاحب آگئے تھے۔ میں اُٹھ کے باہر گیا۔ مولوی صاحب ہی تھے۔ آتے ہی کہنے لگے۔ "میں نے دفتر والوں سے کہہ دیا ہے کہ میرے عزیز ساتھ ہیں۔ فرض کرو اگر تمھارے ماموں جان نہ ملے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔" میں نے زوال گرفتہ لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی۔" وہ خفا ہو کے بولے۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ خفظِ ماتقدم کے طور پر پڑھنے والوں کو آگاہ کر دینا ضروری تھا۔ کہو، تم نے کمر کسی یا نہیں؟ اور عزیزہ کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے، آپ کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ آپ نہ ملتے تو ہمارا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ مجھے یہ شہر کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"اچھا، میاں! انتہائی نامراد شہر ہے لیکن سیر و سیاحت کے لیے بُرا نہیں ہے۔" وہ اس طرح پیش آ رہے تھے جیسے ہم اُن کے آبائی مکان میں مہمان ہوں۔ کچھ دیر وہ لکھنؤ کے بارے میں معلومات کے دریا بہاتے رہے۔ جو باتیں اُنھوں نے پہلے کہی تھیں، انھیں سہراتے رہے اور اپنے دُور دراز کے سفر کے واقعات سناتے رہے۔ میرا خیال ہے اُن کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ اب تک پیش نہیں آیا ہوگا کہ اُن کی ملاقات ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے سے ہوئی ہو جو ایک تیرہ سالہ غیر مسلم لڑکی کو لے کے گھر سے نکل پڑا ہو اور لڑکی بھی کون؟ تبت کے ایک سردار کی لڑکی جو جائز طور پر اپنے قبیلے کے تخت کی وارث تھی اور قبیلے کے مروجہ غاصب سردار کو بُری طرح مطلوب تھی اور اُس نے اُسے ختم کرنے کے لیے سندوستان بھر میں اپنے آدمی پھیلا دیے تھے جو کتوں کی طرح اُس کی بُو سونگھ رہے تھے اور اُس لڑکی کے لیے تبت کے ایک ذی شان شخص کا قتل ہو چکا تھا۔ اگر وہ موقع پا کر بھاگ کے ہمارے گھر میں پناہ نہ لے لیتی تو نہ جانے اُس کا کیا حشر ہوتا۔ مولوی صاحب کو کیا معلوم تھا اُن کے ساتھ کون ستم رسیدہ لوگ ہیں۔ میرے آباؤ اجداد نہیں مرتے ایک گڑیا سی لڑکی کو گھر میں رکھنے کے لیے آباؤ اجداد نہیں ہوتے تو غیروں سے کیا اُمید تھی۔ مجھے امّی کے جملے کھٹکے یاد تھے۔ وہ لوگ ذرا سا حوصلہ کرتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مولوی صاحب نے بہت سے پھول دیکھے ہوں گے بڑی عالی شان عمارتیں، باغات، عجائب گھر، نوادرات مگر اُنھوں نے کورا جیسی لڑکی نہیں دیکھی ہوگی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ ابھی وہ مجھ سے کہیں گے کہ چلو ماموں جان کی تلاش میں نکلیں۔ شاید مولوی صاحب کو باتوں میں خیال نہیں رہا تھا یا میں انھیں اس قدر پسند آ گیا تھا کہ وہ مجھے کچھ دیر اور ساتھ رکھنے کے لیے دانستہ ماموں کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔ میں اُن کی طویل گفتگو حیرت اور اشتیاق سے سنتا رہا۔ پھر انھیں اچانک خیال آیا۔ "ارے وہ بے چاری اندر کیا سوچ رہی ہوں گی ہم اُن کے پاس جا کے بیٹھیے۔ میں اُدھر کمرے میں ہی کرتا ہوں۔" پھر کہنے لگے۔ "مگر تمھارا دل اپنے ماموں سے ملنے کے لیے بے چین ہوگا۔ چلو کرنولول اسٹریٹ چلتے ہیں۔ اپنی بہن سے کہہ دو کہ وہ اطمینان سے آرام کریں، کسی قسم کی فکر نہ کریں۔"

"آپ پہلے آرام کر لیجیے۔ بعد میں ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے میرے مشورے پر چونکے ضرور مگر پھر کہنے لگے۔ "ہاں میاں، تم سے جُدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں، ماموں مل جائیں گے تو تم چلے جاؤ گے۔ تم سے بڑی انسیت ہو گئی ہے۔"

"ہم آپ کو بھی وہیں لے چلیں گے۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"اپنی زندگی تو تنہا گزری ہے۔" وہ مغموم آواز میں کہنے لگے۔ "تھوڑی سی اور رہ گئی ہے وہ بھی کٹ جائے گی۔"

"آپ کا کوئی نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کے بولے۔ "ہاں بھئی کچھ کوئی نہیں ہے۔"

"گھر والے، والدہ، والد، بہن، ذخیرہ؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک بہن ہے، اُس سے بھی ملے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے۔" وہ اُداسی سے بولے۔ "سب کے سب گئے، جو زندہ تھے وہ بھی اپنے لیے مر گئے۔ تم سناؤ، کتنے بہن بھائی ہو؟"

"تین۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ہم تو دو بہن بھائی ہیں۔ ایک میں، ایک یہ فہمیدہ، ماں باپ مرگئے چچا کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"کیا تم بھی میری طرح....." وہ کہتے کہتے سانس لینے لگے۔ وہ میرے بارے میں کچھ اور پوچھتے مگر میں نے کورا کا بہانہ کیا کہ شاید اُس نے مجھے آواز دی ہے۔ میں تیزی سے اندر گیا۔ کورا دروازے سے لگی ہوئی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "اس کمرے میں تمھارا دم گھٹ تو نہیں رہا ہوگا؟"

"نہیں۔" اُس نے پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"بس تھوڑی سی تکلیف اور ہے۔ ابھی میں اور مولوی صاحب شاید باہر جائیں۔ تم سونے کی کوشش کرنا۔ رات بھر جاگتی رہی ہو، تمھیں نیند نہ آئے تو مجھے دکھ ہوگا۔"

"اور تم....." وہ کہنا چاہتی تھی کہ تم بھی تو نہیں سوئے ہو، میری نیند تو اُس دن سے اُڑ گئی تھی جس دن میں نے اُسے دیکھا تھا۔

"میں تمھاری خاطر برسوں جاگ سکتا ہوں۔"

"میری خاطر تم کیا کیا کرو گے؟" وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"پتہ نہیں۔" میں عنقریب جواب دے سے باہر آ گیا۔

کورا کو اندر سے دروازہ بند کرنے کی تاکید کر کے میں اور مولوی صاحب باہر نکلے اور راہ سے جانے والے رکشا میں بیٹھ کر کرنولول اسٹریٹ پہنچ گئے۔ یہاں مولوی صاحب کے کئی شناسا مسلمان دکان دار تھے۔ اُن سے اجناس کی تھوک خرید و فروخت کے لوگوں کا پتہ پوچھتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر مڑتے رہے۔ دو چار مسلمان یہ کام کرتے تھے اور ان میں سے کوئی میرے ماموں اکبر جہاں خاں کو نہیں جانتا تھا۔ جب وہ سنجیدگی سے پوچھتے اور بار بار لوگوں سے میری زبانی اُن کا حلیہ بیان کراتے تو مجھے بڑی وحشت ہوتی۔ جیسے جیسے ہم مایوس ہوتے گئے، مولوی صاحب مجھ پر خفا ہوتے رہے کہ میں نے بلانگ کا نام اور پتہ یاد کیوں نہیں رکھا۔ میں لے دے میں پڑھا ہوں یا کھاتا لکھوتا ہوں اتنی اہم بات کا مجھے ہوش میں نہیں رہا۔ کیا لکھتے کہ تم نے کوئی قصبہ سمجھ لیا تھا یا؟"

ہم کورا لول اسٹریٹ اور اُس سے ملحق تمام علاقے میں ماموں جان کا سُراغ لگاتے لگاتے تھک گئے۔ مولوی صاحب کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ سے کام ہو کے وہ دوسری جگہ جاتے، دوسری سے تیسری جگہ، اسی تگ و دو میں شام ہو گئی اور ہم تھک ہار کے گھر لوٹ آئے۔ "اب کیا ہوگا؟" میں نے مرجھا ہو کے پوچھا۔

"اب کیا ہوگا؟ تم یہیں ٹھہرو گے، فوراً اپنے گھر تار دو کہ وہ تمھیں ماموں جان کا پتہ بھیجیں، مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ تم نے کورا لول اسٹریٹ ہی غلط یاد رکھا ہے۔ کوئی اور علاقہ ہوگا۔"

گھر تار دیں، گویا والد صاحب کو اطلاع دیں کہ بجز عافیت یہاں آ گئے ہیں۔ آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ..... میں نے فرداً عاجی بھیرا اور مولوی صاحب کی تجویز کی تائید میں ہلنے لگا۔

"گھر کا تار بھی یاد ہے؟" مولوی صاحب نے ہنس کر کہا۔

"جی۔ جی ہاں، خوب یاد ہے۔" میں نے گھبرا کے جواب دیا۔

چلتے چلتے اور بولتے بولتے مولوی صاحب اچانک رُک گئے۔ کچھ غنودہ ہونے لگے۔ اُن کی آنکھ لگ گئی لیکن وہ پندرہ بیس منٹ بعد ہی جاگ گئے۔ انھیں نماز پڑھنے کی طلب ہوئی۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ رات ہوتی تو دل کھول اور گڑگڑا کے روتا۔ اندر کورا بھی خاموش بیٹھی تھی۔ کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انھیں بھی کچھ چپ لگ گئی تھی۔ اُن کی یہ خاموشی مجھے زہر لگی۔ کھانا کھا کے انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی بہن کو چھوڑنے پر کھڑا کروں، وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اندر جلکے کورا کو بتایا کہ وہ مجھ سے اور تمھیں اور شکریہ کے ساتھ کچھ بولے مرد مولوی صاحب اُس کے بجے سے کھٹک جائیں گے کہ ہم دونوں پرانی ہیں۔ مولوی صاحب نے فلسفیانہ انداز میں اُسے ماموں جان کے ملنے کی تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔ مجھے سر دُھننے کی وہ سمجھ رہے تھے کہ کورا یقیناً بہت سے غم میں بڑی ہوگی، چنانچہ دلاسے عزیزہ اور آپ کہہ کے مخاطب کر رہے تھے، اُن کی گفتگو کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ جگہ کورا کے رہنے کی نہیں ہے مگر مجبوری پر صبر شکر کرنا چاہیے۔ انھوں نے کورا کو نہایت شفقت آمیز انداز میں تسلی دی۔ اُن کے ہر جملے پر کورا ہچکی کرتی رہی اور میں خود سے لڑتا رہا کہ کہیں مولوی صاحب اُس سے کچھ اور نہ پوچھ لیں۔

مجھے اگر یہ خبر ہوتی کہ مولوی صاحب مدّت سے ملحق مسجد میں عشا کی نماز پڑھتے ہوئے اپنا رکن بنا لیں گے تو میں کب کا یہاں سے رخصت ہو گیا ہوتا۔ ہم اسی کشمکش میں مبتلا رہے کہ وہ ابھی واپس آتے ہوں گے، ذرا کا ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ہمارے سروں پر ایک ہول ناک رات مسلط

تھی۔ بہت کم روشنی کا ایک بلب کمرے میں ٹمٹما رہا تھا اور دل کے تمام بلب بجھے ہوئے تھے۔ اندر تاریکی ہو تو باہر کی روشنی بھی کچھ کام نہیں کرتی۔ صحن میں کورا اس طرح بیٹھی تھی جیسے اس کے گھر میں موت ہو گئی ہو۔ میں تو بھی کورا کو کہہ کر آیا تھا۔ میرے گھر میں بھی شاید اپنے بیٹے کی موت پر ایسا ہی عالم ہو گا۔ سنا ہے موت بڑی اولاد کی بھی اچھی نہیں لگتی۔ مولوی صاحب نے آنے کے بعد تار گھر چلنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ آتے ہی خاموشی سے لیٹ گئے کورا نے اُن کا بستر تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ میرے لیے زمین پر چادر بچھا دی تھی اور تکیے کے لیے چند کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کو آج نیند نہیں آ رہی تھی وہ مجھ سے کہتے ہے کہ مجھے اندر جا کے ہی تسلی دینی چاہیے۔ شاید دو ہم دردوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کی تسکین کر لینا چاہتے تھے۔ بُرے وقت میں آدمی ہر قسم کے شبہے کر تا ہے آخر آدھی رات کے وقت نیند نے اُن پر قبضہ کر لیا۔ مجھے آج رات کو یہاں سے بھاگنے کی ہمت نہیں پڑی۔ میں نے کورا کو آہستہ سے آواز دی۔ اُس نے ایک ہی سرگوشی میں دروازہ کھول دیا۔ نیند نہیں آ رہی ہے؟ میں نے چوڑیوں کی آواز میں کہا۔ اُس نے سر ہلا کے اثبات میں جواب دیا۔ ہم کل صبح یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

"بیٹھ جاؤ۔" اُس نے کمرے میں رکھی ہوئی اکلوتی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پہنچنے سے پہلے ایک بار پھر دروازہ کھول کے دیکھ لیا، مولوی صاحب سوئے ہوئے تھے۔

جب میں نے آہستہ سے گردن لگائی تو نہ جانے کیوں میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ حلق خشک ہو گیا اور آنکھیں جلنے لگیں، سارے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میرے لیے چارپائی تک جانا مشکل ہو گیا۔ میں بیٹھ گیا تو میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم یوں کھڑی ہو؟"

وہ بھی بیٹھ گئی اور میری زبان پر فالج گر گیا۔ منہ سے کوئی بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میں کسے عزم و ہمت کی تلقین کرنے آیا تھا۔ خود میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے، ہم کچھ دیر یوں ہی ہم چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ بڑی اذیت ناک خاموشی تھی۔ میں اُس کے جسم اور بالوں کی خوشبو صاف محسوس کر سکتا تھا۔ پہلو بدلتے وقت اُس کے کپڑے سرسراتے تو مجھے عجیب لگتا۔ "باہر!" آخر وہ خود بولی۔ "میں نے تمہیں بہت پریشان کیا۔"

"تم دن میں بھی کئی بار یہ جملہ کہہ چکی ہو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہیں پتہ نہیں۔ بالکل احساس نہیں کہ تمہیں دیکھ کر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ تمہیں قریب پا کے میری ہمت بڑھ جاتی ہے۔" میں نے بے ترتیب لفظوں میں کہا۔ کوئی لفظ ادھر تھا تو کوئی اُدھر۔ زبان میں لکنت آ گئی تھی۔

وہ مجھ سے کچھ اور قریب آ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے۔ جی تو بہت کچھ کہنے اور کرنے کو چاہتا تھا مگر خدشہ تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سمجھے گی۔ مجھے بہت چھوٹا آدمی سمجھے گی۔ کہے گی کہ میں عام آدمی ہوں۔ بے کردار، بدنیت، مجھ پر اُس کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔ سو جلد کر لوں۔ میں نے سے تاکید کی۔

"بیٹھے رہو۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُس چارپائی کا کوئی سرا تھامنا بھی نہیں تھا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے بہانہ کیا۔

"میں دبا دوں؟" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں، نہیں کچھ ایسا خاص درد نہیں ہے۔" وہ جھجکتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ "نہیں تم رام کر دو۔" میں نے بھیگی ہوئی سرگوشی کی لیکن اُس نے میرے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ سر میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اُس کی لمبی انگلیاں میں بجلی کے تنگے تار تھے۔ میرے سر میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ پھر وہ کرنٹ پورے جسم پر چھا گیا، جب اُس کی انگلیاں میری پیشانی پر تیرتی میں دھیرے دھیرے سنبھلا۔

"تمہیں بخار آ رہا ہے۔" وہ میری گرم پیشانی چھوتے ہوئے بولی۔

"نہیں تو، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مجھے سر درد نہیں آتا۔ مجھے تو کوئی بھی کام نہیں آتا۔"

"تم تو بہت اچھا بول رہی ہو، دروں بس بھاگنے الا ہے۔"

آئی مدت میں وہ پہلی بار کھل کھلائی۔ "تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔"

کمرے میں جل ترنگ بج اُٹھے۔

"آہستہ، مولوی صاحب جاگ جائیں گے۔"

اُس کے ہاتھ میری آنکھوں پر آ گئے۔ اُس کی انگلیاں میری پلکوں سے مس ہوئیں تو میری آنکھیں کپکپانے لگیں۔ زندگی میں بہت سے لذیذ کھانے کھائے تھے انعامات جیتے تھے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی، شہر کی بہترین جگہیں بہترین لباس پہنا تھا، باغوں کی سیر کی تھی۔ ابا کے ساتھ ایک بار شکار کا لطف بھی اُٹھایا تھا مگر جو لذت کورا کے لمس میں تھی اُس کا پہلا پتا۔ الگ ہوا تھا، اُس کی بے قرار انگلیاں میرے سر پیشانی اور آنکھوں پر رقص کرتی رہیں اور میرے سینے میں جذبات کی فصل لہلہاتی رہی۔ "بس بس۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے بس نہیں کیا۔ اُس کے نازک ہاتھ میرے بالوں کی گرد سے پیلے ہو گئے ہوں گے۔ وہ تو ایک آئینہ تھا۔ ذرا سی ہوا چلی اور گرد جم گئی۔ میں نے بے بسی سے اُس کے ہاتھ تھام لیے اور انھیں گھر کے دیکھا۔ میرے ہاتھوں میں جیسے ریشم آ گیا۔ انھیں احتیاط سے تھامنا چاہیے کہیں خراب نہ ہو جائیں۔ وہ میری فریفتگی، میرا خوف میری لرزش، میرا اضطراب دیکھتی رہی۔ "کورا ایک بات کہوں؟" میں نے بے تابی سے کہا۔ اُس نے گردن جھکا لی جیسے میں جو بات کہنے والا ہوں، وہ اُسے پہلے سے معلوم ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا تم..... تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی؟

کہنا یہ تھا کہ مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟ میں نے یہ سوال کر کے بُرا کیا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے۔ شاید یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی، اُس سے ایک دوری معلوم ہوتی تھی، اجنبیت سی۔ "تم پھر رونے لگیں؟ اچھا تو پھر میں باہر چلا جاتا ہوں۔" اُس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے۔

مولوی صاحب کے جاگنے کے خیال سے میں نے ایک بار پھر اُسے سے جھانک کے دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ وہ اپنی چارپائی پر کسمسا رہے تھے۔ میں نے کورا کو ہاتھ ہلا کے الوداع کہا اور اشارے سے اُسے موجانے کی تاکید کر کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ پھر میں زمین پر بچھی ہوئی چادر پر لیٹ گیا۔ "عزیزم! میرے پلنگ پر آ جاؤ، نیچے کھیں زحمت ہو رہی ہو گی؟"

"آپ جاگ رہے ہیں مولوی صاحب؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "میں قہوہ سے سفر لانے کے لیے اندر چلا گیا تھا۔ وہ بھی جاگ رہی ہے؟"

"ہاں بھئی، ایسے عالم میں کسے نیند آتی ہے؟" مولوی صاحب کا فقرہ میرے ملغا پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ انھوں نے ہماری باتیں تو نہیں سن لیں؟ ہم تو بہت آہستگی سے باتیں کر رہے تھے لیکن ہے انھوں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر سب کچھ دیکھ لیا ہو؟ وہ تو صرف میرا سہارا ہی تھی۔ مولوی صاحب ٹھنڈی سانسیں بھر رہے تھے۔ میں نے اُن سے اس کے بعد کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ رات کے آخری حصے میں بہت تمام میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

صبح طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے میں لیٹا رہا اور مولوی صاحب کو میں نے ایک غلط پتہ دے دیا تاکہ وہ گھر تار دے دیں۔ مولوی صاحب جیسے ہی تار دینے گئے، میں نے سامان سمیٹ کے سوٹ کیس میں بند کر دیا اور چائے جب میں رکھ لی۔ دفتر ابھی بند تھا۔ گلی میں مولوی صاحب کی عدم موجودگی کی تصدیق کر کے میں نے ایک مختصر خط اُن کے نام لکھا۔

"آداب جا ہے ہیں، آپ کی محبت اور عنایت کا شکریہ۔

ہم آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ یہاں رہ کے ہم خود پر ایک بوجھ محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے ہم جا رہے ہیں۔

یہ خط میں نے اُن کے ٹرنک پر پتھر سے دبا کے رکھ دیا۔ تیاری میں کچھ دیر نہیں لگی۔ کورا نے برقع اوڑھا میں نے سر عت سے شیروانی پہنی اور ایک مرتبہ پھر باہر جھانک کے دیکھا۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر گلی میں آ گئے اور گلیوں گلیوں ہوتے ہوئے کسی نامعلوم بازار میں جا نکلے۔ راستے میں ہر طرف سے نگاہیں تھیں مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایک برقع پوش لڑکی اپنے جاتی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کیڑے نالیوں میں رینگتے رہتے ہیں۔ مکھی نالیوں کی طرح ککھتے میں گلیوں کا جال بچھا ہوا ہے جس میں انسان کیڑے کلبلاتے مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بڑی سڑک پر آ کے ہم ایک رکشا میں بیٹھ گئے۔ رکشا ایک نہایت سیاہ فام نوجوان شخص چلا رہا تھا جس کی پسلیاں ایک ایک کر کے گنی جا سکتی تھیں میں نے اُسے ہیرا اسٹیشن کا پتہ دیا۔ کورا مجھ سے لگی بیٹھی تھی، یہ امر پہلی بار بے حد دلکش محسوس ہوا اور جی چاہا کہ کھلا ہی طرح قریب بیٹھی رہے اور رکشا ساری عمر چلتا رہے۔ میری نظریں دائیں بائیں کی سڑکوں کے بورڈوں پر جمی ہوئی تھیں ایک جگہ میری نظر ٹک گئی۔ میں نے رکشا رکوا کے بازو دیا۔ یہ جگہ معقول نظر آتی تھی۔ یہاں زیادہ شور غل بھی نہیں تھا۔ ہوٹل کا بورڈ اُردو میں لکھا ہوا تھا۔ رکشے والے کو پیسے دے کر میں نے شیروانی کے تین بند کیے اور چال میں ایک جھٹکا پیدا کر لیا۔ دروازے ہی پر میرے ہاتھ سے ایک شخص نے سوٹ کیس چھین لیا۔ "کمرہ چاہیے جناب؟"

"ہاں جج۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "مگر..."

"مگر کیا صاحب؟ ایک نمبر ہوٹل ہے، فل کا انتظام، مرغن کھانا، صاف ستھرا بستر۔ آپ آزمائیے تو سہی۔ اس علاقے میں دور دور ایسا ہوٹل نہیں ہے۔"

"ہمیں زیادہ نہیں ٹھہرنا، چار تین دن۔"

"آپ ایک بار ٹھہر کے تو دیکھیے۔ پھر آپ بار بار ادھر آئیں گے۔" وہ لگے بڑھتے ہوتے بولا اور ایک زینہ عبور کر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ منیجر نے مجھے ڈیپازٹ سے بچا اور جب اُس کی نظر کمرے کے باہر کھڑی ہوئی کورا پر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ پھر اگر وہ فوراً مجھے چابی نہ دیتا تو میں وہیں سے واپس ہو جاتا۔ "دوسری منزل کمرہ نمبر ۲۱۲۔" اُس نے سلام سے کہا اور مجھے ہدایت کی کہ میں دو مہمانوں کے نام اور پتہ لکھوا دوں۔ "ہاں۔" وہ مجھے دوبارہ متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "پندرہ روپے یومیہ ہوں گے جناب!"

یہ رقم بہت زیادہ تھی خصوصاً اُس شخص کے لیے جس کا کل اثاثہ پانچ چھ سو روپے ہو مگر میں نے بے فکری سے سُنا اور واپس آ گیا۔ دوسری منزل پر ہمیں جو کمرہ دیا گیا تھا، وہ اثاثہ نہیں تھا مگر ہمارے لیے کسی محل کے برابر تھا۔ ہمیں اور چھپانے کی جگہ چاہیے تھی، میری زندگی کا پہلا مرحلہ تھا کہ میں کسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ کمرے میں دو پلنگ موجود تھے جن کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی۔ ایک طرف سنگھار میز اور کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ منسل خانہ بھی صاف ستھرا تھا۔ چٹخنی بند کر کے میں دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ کورا نے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی۔ چاند بدلی سے نکل آیا تھا۔ کیسی جگہ ہے؟ میں نے کسی قدر مطمئن لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے سے ہمدردی سرشار تھی۔

"تم آرام جتنی بار کے ساتھ بہت سے ہوٹلوں میں ٹھہری ہو گی اچھے ہوٹلوں میں۔"

"ہاں، ہندوستان آنے کے بعد ہم کئی جگہ ٹھہرے ہے۔"

"میں نیچے نام لکھوا کے آتا ہوں۔ تم صرف میری آواز پر دروازہ کھولنا۔ میں تین بار ٹک ٹک کروں گا۔" یہ کہہ کے میں نیچے آ گیا۔ راستے میں میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے رجسٹر میں کیا اندراج کرانا ہے۔ نیچے کے کمرے میں جو لوگ بیٹھے تھے وہ مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ منیجر نے ایک رجسٹر میرے سامنے

رکھ دیا۔ میں نے اپنا نام انور علی لکھا، عمر مہماں، پتہ محلہ فیض گنج مراد آباد۔

اس جگہ کا نام میں نے مولوی صاحب سے سُنا تھا، ساتھ میں ایک بہن ہیں کا نام کیا بتاؤں اور عمر؟ عمر کا خانہ آیا تو میں جھجکنے لگا۔ ۲۵، ۳۰ یا ۳۵ اگر کہیں ان میں سے کسی کی نظر کورا کے چہرے پر پڑ گئی تو؟ میں نے بہن لکھ کے جگہ مالی سہنے می پنجہ میرا پس وپیش تاڑ گئی۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے مہذب لہجے میں کہا۔ "ہم خواتین کے نام اور عمریں نہیں لکھتے۔"

"شکریہ۔" میں نے مشکرا کے کہا اور اُس کے مطالبے پر ۳۰ روپے پیشگی دے دیے۔ اب تک ہر کام اطمینان بخش طور پر انجام پایا تھا۔ دُوسری منزل پر دونوں طرف کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ درمیان میں ایک تنگ راستہ گزرتا تھا۔ اُس کے آخری سرے پر ہوٹل کے میرے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نے نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ "اب کیا ہوگا؟" کورا نے پوچھا۔

"اب کچھ دیر آرام کریں گے، پھر سوچیں گے کہ کیا ہو۔ کچھ شہر کی تفریح کریں گے۔" اُسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دل اُچھل کے حلق میں آگیا۔ "میرا ہوگا۔" کورا نے یہ کہہ کے میری دہشت دُور کی۔

میں نے کورا کو آڑ میں ہونے کا اشارہ کیا اور ذرا سا دروازہ کھول کے دیکھا۔ میرا ہی تھا۔ "کچھ کھانا چاہئے، ظہیر صاحب؟" میں سامنے بیٹھا ہوں جس چیز کی ضرورت ہو، گھنٹی بجا دیجئے گا۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے کئی دو روپے تھامے۔ مولوی صاحب نے اپنے واقعات بتاتے ہوئے مجھے ایک بیرے کو زیادہ بخشش دینے کا حال سُنایا تھا۔ وہ بات میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ واقعی اُس کے چہرے کا موسم ہی بدل گیا۔ اُس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور ایک بار پھر اپنی خدمات کی پیش کش کی۔ میں نے جلد سے جلد اُس بلا کو ٹالنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

"کچھ کھاؤ گی؟" میں نے کورا کے کانوں کے قریب جا کے زور سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"کھایا پیا کرو، نہیں تو رُوئی ہو جاؤ گی۔"

"تم ذرا خود کر دیکھو، چہرہ کیسا ہو رہا ہے، پیلا ہو گیا ہے ایک من میں تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ذرا بسنے کی جگہ اور کام مل جائے۔ پھر دیکھنا میں کیسا امیر بن جاؤں گا۔"

"باپرے!" وہ پُرخیال لہجے میں بولی۔ "کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں انسان نہیں رہتے؟ چلو کسی پہاڑ پر کسی جنگل میں چلیں۔ جب ذرا بڑے ہو جائیں گے چلے آئیں گے۔"

"انسان، ہاں بھی ہوں گے، انسان ہر جگہ موجود ہیں۔" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور اُس نے اپنی گود میرے شانوں پر ٹکا دی تھی۔

"جب میں یہاں آئی تھی تو سب لوگ مجھے گھور گھور کے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں بابر؟"

"پتہ نہیں، شاید ان لوگوں کے گھروں میں عورتیں نہیں ہوتیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"چلو تم تیار ہو جاؤ۔ اس شہر میں رہنا ہے تو ہمیں یہ یہاں کے گلی کوچوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔"

پہلے میں نہایا، پھر وہ نہائی۔ جب وہ غسل خانے سے نکلی مرآمد ہوئی تو مجھے ایک بڑی سی لڑکی نظر آئی۔ وہ شہاری تھی۔ اٹھلاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ ہمارے پاس کپڑے کم تھے۔ اس لیے کہ اُس نے وہی کپڑے پہن لیے جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے صندوق سے سامان نکال کے اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر ہم تالا لگا کے ہوٹل سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ بیرا لپکتا ہوا آیا۔ سر کار کہیں جا رہے ہیں؟ اُس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے اچھی نہیں لگی۔ "کب واپس ہو گی؟"

"معلوم نہیں کب آئیں۔" میں نے جھنجلاہٹ سے کہا۔ "کیا یہاں بتانا پڑتا ہے یا یہاں آنے جانے کے اوقات مقرر ہیں؟"

"نہیں حضور، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ سر کار کچھ خدمت کا موقع دیں، کچھ کھانے پینے کا انتظام کر رکھوں؟"

"جب آئیں گے تو بتا دیں گے۔" میں نے سنے سنائے لہجے میں کہا۔ کورا میرے پیچھے پیچھے تھی۔ نیچے اُترنے تک میں دیکھ نے کئی نگاہیں کیں۔ کسی کے لبوں پر مسکراہٹ آئی، کسی کی نگاہ میں چمک پیدا ہوئی۔ ہم یہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے سڑک پر آگئے۔

چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ایک معقول شکل و صورت کے ٹیکسی والے نے ہمارے قریب ٹیکسی روک کے پوچھا۔ "کہاں جائیے گا جناب؟"

"کہیں نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کسی نہ کسی سواری میں تو بیٹھنا ہی ہوگا۔ "ٹھیرو۔" میں نے اُسے حکم دیا۔

"جناب! ٹھکانے کی سیر کیجیے۔" ڈرائیور نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"بہت کی ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ہمیں بڑے بازار تک لے چلو۔ بڑے بازار کا نام میں نے اسٹیشن پر لگے ہوئے اشتہاری بورڈوں میں کہیں دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک لمحے کچھ سوچا اور دروازہ کھول دیا۔ اب وہ تھا اور ٹھکانے کی سیر کیجیے۔

سامنے کی طرف دیکھا۔ دوسری فٹ پاتھ پر گورے لباس میں ملبوس درجنوں رایب نہایت محتاط انداز میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہے تھے وہ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ گو کورا رُتبہ میں بھی لیکن میں انہیں دیکھ کے اُسے قریب کی ایک گلی میں لے آیا۔ "وہ وہی ہیں میں انہیں جانتی ہوں، وہ ہمارے قبیلے کے لوگ ہیں۔"

گھبراہٹ میں اُنھوں نے ہمیں دیکھا نہیں ہے میں نے تسلی دی ہم ہندوؤں ایک محلے سے گزر رہے تھے، یہ بہت گنجان علاقہ تھا، گیوں میں گندگی پھیلی ہوئی تھی ہندو بنگالنیں ہیں اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے ہم انسان نہیں، درادر ہوں، اِدھر بھی نظر جاتی تھی، ہماری طرف اشارے ہو رہے تھے لگالیاں اُٹھ رہی تھیں، آج شاید اس گلی میں پہلی بار کوئی مُرتع پوش عورت اور شیروانی پہنے ہوئے ایک شخص دکھائی دیا تھا۔ ہمیں گیوں کا پتہ نہیں تھا، ہم یوں ہی اِدھر اُدھر گھومتے اور غور کرتے تماشا بنا رہے تھے۔ آخر ایک اور سڑک پر جا نکلے۔ خوش قسمتی سے وہاں ہمیں ہاتھ والا رکشا مل گیا، ہوٹل جاتے ہوتے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ پیروں میں دشمن ہونے لگی تھی۔ بھوک اور پیاس کے عالم میں ہم کہیں پانچ بجے ہوٹل پہنچے اور دروازہ بند کر کے ہانپنے لگے۔ کورا کا اُتکا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا، بار بار وہ سسکتے ہوئے بولی "بابر، ہم نے گھر سے آنے میں غلطی کی تھی اور دوسری غلطی مولوی صاحب کے ہاں سے آنے کی، واپس چلتے ہیں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔"

میں نے اُس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی۔ اُس نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے گردن جھکالی تھی۔ "کورا!" میں نے کرب سے کہا "خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو، یقین کرو، یہ بُرا وقت ٹل جائے گا، اچھے دن آجائیں گے۔"

اس کے سوا میرے پاس کہنے کے لیے اور کیا تھا۔ ان لفظوں میں کوئی جان نہیں تھی۔ اُسے ان پر اعتماد کیسے آتا؟ وہ ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اپنی روح جاتی ہوئی محسوس کی جیسے کوئی میری طاقت کھینچ رہا ہو۔ میں نے اُسے اُٹھا کے کھڑا کیا۔ اُس کے سر سبز چہرے پر شبنم پڑی ہوئی تھی۔ میرا جی ایسا اُمڈا، ایسی کھلبلی مچی، سینے میں ایسا درد اُٹھا، ایسا طوفان آیا کہ میں نے اُسے بے اختیار گلے سے لگالیا۔ کورا کو تو جیسے رونے کا بہانہ مل گیا، جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا۔ وہ ایسا روئی، آنا روئی کہ شاید ہی کوئی رویا ہوگا۔ میں اسے سمجھاتا اور تسلیاں دیتا رہا۔ روتی ہوئی تسلیاں بے اثر ہوتی ہیں۔ وہ جس ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی، اُس کی بنیادیں ہی کمزور تھیں۔ ستون غروب آشنا تھا اور اس کی مٹی اُس کے آنسوؤں سے بہی جا رہی تھی۔

مجھے اُس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے میری تخلیق اسی کے لیے ہوئی ہے۔ وہ رو رہی ہے تو میں اور رہا ہوں، وہ مسکرا رہی ہے تو میں مسکرا رہا ہوں، وہ دُکھ میں ہے تو میں دُکھ میں ہوں۔ وہ ہنس ہے تو میں بھی ہنس ہوں اور کچھ بھی نہیں ہے، پھر جو وہ میرے سینے میں سمائی تو مجھے یاد آیا کہ میں تو اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اپنے گھر سے رشتہ تو ایک ہی چیز تھا مجھے تو ہاں سے اُٹھ کے کہیں اور آنا تھا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ہمیں کچھ ہوش ہی نہیں رہا ہم ایک دوسرے کو شناخت کرتے رہے۔ کسی نے دروازے پر دستک دی، ہم اس دنیا میں لوٹ آئے لیکن اب ہمارے لوں پر اس قدر بوجھ نہیں تھا۔ میں نے اُسے سہری پڑھا کے روشنی کی اور اُس کے آنسو پونچھ کے دروازے پر پہنچا بیرا خدمت کے لیے حاضر تھا۔ "حضور نے کچھ طلب نہیں کیا؟"

"ضرورت ہی نہیں پڑی۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"میں یہیں موجود ہوں۔ گھنٹی بجا دیجیے گا اور ہاں کچھ شوق فرمائیں آپ؟" اُس نے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔ ان دنوں یہاں بڑی روک ٹوک ہے مگر ہم اپنے معزز مہمانوں کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام رکھتے ہیں۔ حکم ہو تو پیش کروں؟ انگریزی راج میں سبھی قسم کی چیزیں ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں ابھی اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہنے لگا۔ "دوسری پڑی بھی موجود ہو تو سرکار! بہار ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

"تم کس پڑی کی بات کر رہے ہو؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

اُس کے چہرے پر یک بارگی ناگواری پیدا ہوئی، پھر وہ سنبھل کے بولا۔ "یہاں تو سب اُسے پڑی کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں پتہ نہیں کیا کہتے ہوں؟"

"لے آؤ۔" میں نے سرسری انداز میں کہہ دیا، کورا اندر تھی۔ مجھے اس کی فکر ستا رہی تھی۔

"ابھی پیش کرتا ہوں۔" اُس نے جھکی جھکی جاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں سمجھا کہ بیرا اس ہوٹل کی کوئی خاص چیز پیش کرنے والا ہے۔ کورا نے مُرتع اُتار دیا تھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ بیرے نے اخباری کاغذ میں تہہ در تہہ لپٹی ہوئی کوئی وزنی چیز مجھے تھمائی۔ "انگلش مال ہے جناب! قیمت بھی انتہائی مناسب ہے، صرف تیس روپے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ کہنے لگا۔ "پھر دے دیجیے گا۔ ایسی کون سی جلدی ہے اور ہاں، ایک بات سرکار!" اُس نے اوپر کی منزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور شوقین معلوم ہوتے ہیں اور پھر بھی جناب کی پسند کے کچھ لوگ میرے ہوتے ہیں۔ ایک نظر دیکھ لیجیے گا۔ بخدا میرا دل کہتا ہے آپ کو کوئی نواب ہی ملیں۔ بالکنہ، جس دن سے وہ شہر چھوڑا ہے آدمی ہی نظر نہیں آتے، تیتے نظر آتے ہیں۔"

"تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"واہ حضور! کیسی سادگی ہے، رہی جناب! انجمن آرا، عشرت بیگم اور ننھی جان۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ "کہنے سے تو وہ بہت نالاں ہیں، یہاں اپنی دل کی تلاش میں آئی تھیں مگر یہاں کہاں وہ لوگ۔"

باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگیں۔ میں نے اپنے پہلو میں رکھی ہوئی چیز کے پرت کھولنے شروع کیے۔ جیسا کہ مجھے شبہ ہوا تھا، وہ شراب کی بوتل تھی، اسکاچ وہسکی۔ مجھے شدید گھن آئی۔ میں نے زندگی میں آج

دفعہ شراب کی بوتل چھوئی تھی۔ میں نے اُسے بیرے کے سر پر دے مارنے کا ارادہ کیا مگر میرے حیرت زدہ ہاتھ کچھ نہیں کر سکے، چند لمحوں تک میں نکٹی بانڈھے بوتل دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کے میں نے اُسے دبانہ کاغذ میں لپیٹ دیا۔ "تمہارا نام؟" میں نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

"نام کیا جناب! سب اکن میاں کہتے ہیں۔ کیسے چیز آپ کو پسند آئی؟" اُس نے آنکھ مار کے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے تدبذب سے جواب دیا۔ "اکن میاں! اب ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کھانا بھجوا دیجیے۔"

"ظاہر ہے ایک دو گھنٹے بعد۔" وہ شوخی سے بولا۔

"نہیں ابھی۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"جیسی مرضی جناب کی۔" اُس نے سر ہلا کے کہا۔ میں نے جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ میرے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ یہ ہوٹل شرابیوں اور طوائفوں کا ہوٹل تھا۔ وہ ذلیل کورا کے متعلق بھی یہی سمجھ رہا تھا، گاہکوں میں بیٹھا تھی اور یقین میں آتا تھا۔ اب سب کچھ سنانے تھا۔ میں نے اکن میاں کو جان بوجھ کر اُس کی بدزبانی کی سزا نہیں دی کیونکہ خطا میری تھی کہ میں کورا جیسی معصوم لڑکی کو ایسے گندے ہوٹل میں لے آیا تھا۔

ملگجے پردوں سے چھن چھن کے آتی ہوئی روشنی میں کورا پلنگ پر سوئی ہوئی ایک جانب ڈھلک رہی تھی۔ اُس کا چہرہ بے پناہ معصوم نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُس کا مال پوچھا تو وہ خیند میں بے چینی سے کسمسائی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ بیرے نے اخباری کاغذ میں تہہ در تہہ لپٹی ہوئی کوئی وزنی چیز مجھے تھمائی۔ "انگلش مال ہے جناب! قیمت بھی انتہائی مناسب ہے، صرف تیس روپے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ کہنے لگا۔ "پھر دے دیجیے گا۔ ایسی کون سی جلدی ہے اور ہاں، ایک بات سرکار!" اُس نے اوپر کی منزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور شوقین معلوم ہوتے ہیں اور پھر بھی جناب کی پسند کے کچھ لوگ میرے ہوتے ہیں۔ ایک نظر دیکھ لیجیے گا۔ بخدا میرا دل کہتا ہے آپ کو کوئی نواب ہی ملیں۔ بالکنہ، جس دن سے وہ شہر چھوڑا ہے آدمی ہی نظر نہیں آتے، تیتے نظر آتے ہیں۔"

"تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"واہ حضور! کیسی سادگی ہے، رہی جناب! انجمن آرا، عشرت بیگم اور ننھی جان۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ "کہنے سے تو وہ بہت نالاں ہیں، یہاں اپنی دل کی تلاش میں آئی تھیں مگر یہاں کہاں وہ لوگ۔"

باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگیں۔ میں نے اپنے پہلو میں رکھی ہوئی چیز کے پرت کھولنے شروع کیے۔ جیسا کہ مجھے شبہ ہوا تھا، وہ شراب کی بوتل تھی، اسکاچ وہسکی۔ مجھے شدید گھن آئی۔ میں نے زندگی میں آج

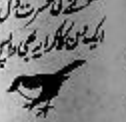

دولت میں دنیا بدل گئی۔ اپنے قد و قامت اور رہنے کی نیرنگی کا اندازہ ہوا۔ ملگجے کی ہر سُرخ و زرد کا کاٹا ٹھی جو ہر لمحے آدمی کو اس کی اوقات کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ ایک گھنٹے تک ہم یوں ہی گھومتے رہے، کہاں جائیں، کس طرف کا رُخ کریں، پتہ نہیں کوئی بھی تو نہیں ہے ہمیں نیکی اور محنت سے جینے کے لیے کوئی جگہ میسر نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ کاش مُرتع اُتار دوں تو لوگوں کا تجسس ختم ہو جائے گا مگر اُس کے دشمن یہاں بھی موجود تھے اور مسلسل اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ آدمی کو کہیں نہ کہیں پناہ ملتی ہے، اُس کا ارادہ سامان کا پابند ہے۔ میں نے حال ہی میں روسو کا ایک مقولہ پڑھا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جدھر دیکھو پابہ زنجیر ہے۔ اُس وقت برا بھی مجھ میں نہیں آیا تھا کہ روسو کا مطلب کیا ہے، حالانکہ مطلب گیا میں بھی اتنا ہی واضح تھا جتنا لکھنے میں۔ پھر مجھے ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک اندھے میں آدمی چھت کے بغیر رہ سکتا تھا مگر اب چھت کے بغیر اس کا گزارا نہیں ہوتا۔ یہاں ہر شخص کو ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ مجھے کسی اور سے ہوٹل میں جانے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ یہ ہوٹل پہلے والے ہوٹل سے خاصا مختلف تھا۔ ہم نے کمرے میں جا کے خود کو بند کر لیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں؟ ہم کام کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا مگر کورا کو ہوٹل میں تنہا چھوڑ کے کیسے جا سکتا تھا۔ پیسے جیب سے بھاگ رہے تھے۔ میں نے سوچا جلد ہی کام کا کوئی بندوبست نہ ہوا تو سارے پیسے ختم ہو جائیں گے پھر یہ ہوٹل بھی نہ رہے گا۔ کسی سے دل کی بات کہتے ہوئے خوف آتا تھا اور کسی سے کچھ کہے بغیر چارہ بھی نہیں تھا مگر کس سے بات کریں؟ ہر شخص پورا سراغ لگاتا ہے۔ اس ہوٹل میں بھی یہی ہوا۔ لوگوں نے مُرتع پوش کو اور مجھے کھانے کے اشارے کیے، آدھے کے شام کے وقت میں اُن کے ساتھ میرے میں سے اُتر سا تھا۔ ایک آدمی تیزی سے اُترتا ہوا کورا سے ٹکرا گیا۔ کورا زمین پر گر پڑی اور اس کی وزنی ہوئی دُوجاگری اس افراتفری میں اُس کا نقاب اُٹھ گیا۔ ہوٹل کے بیرے اور دوسرے لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھ لیا، وہ چہروں میں چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔ کورا کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی تھی۔ ہمارے اردگرد اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ وہ آدمی معذرت کرنے لگا مگر اُس سے کچھ ہو گیا تھا۔ ایک دم ادھیڑ عمر شخص ہماری ہمدردی میں اُسے بُرا بھلا کہنے لگا۔ میں ان دو پریشان حال تماشائیوں کو کس کس کا گریبان پکڑوں، کس کے پیٹ میں چاقو اُتاروں، کس کی آنکھیں نکال لوں؟ ہنگامہ بڑھ جانے کا خطرہ تھا مگر کورا نے غیر معمولی پُراعتمادی کا ثبوت دیا۔ وہ کراہتی ہوئی فوراً اُٹھ گئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ سب نے دیکھ لیا تھا کہ میرے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی ہے جس کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہے مگر ابھی سے اُس کے شباب کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ اُس کی ابتدائی سے انتہا کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کورا لنگڑا رہی تھی، اس لیے میں اُسے دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ وہ خمیدہ کا بھوری موری کا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ اپنا گھٹنا دکھاؤ تو وہ شرمانے لگی۔ لیکن اُس کی چوٹ کچھ شدید تھی۔ مرہم پٹی بغیر مجھے قرار نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اُسے ہاتھ دم بھیج دیا تاکہ وہ کوئی دیسی ایسا لیس لے آئے۔ وہ خجل خجل سے یہ کہتی ہوئی واپس آ گئی کہ معمولی چوٹ ہے۔ میں اُس کی پنڈلیاں دبانے لگا۔ وہ مجھ سے گھر واپس چلنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔

گلاب کہاں تھا؟ گھر اپنا ہوتا تو ہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی یہ اُسے سمجھا ہی رہا تھا کہ ٹیک ٹیک کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی پر چادر ڈال کے دروازہ کھول کے دیکھا۔ وہ اور ہیمر شخص میرے سامنے کھڑا تھا جو ہمیں پہلے پہل سیڑھیوں پر ملا تھا اور جس نے ہم سے بڑی ہمدردی ظاہر کی تھی۔ "مجھے کریم گل کہتے ہیں۔" اُس نے تعارف سے کہا۔ "کیسے اندر خیریت تو ہے؟"

میں نے اُس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری بہن کو معمولی چوٹ آئی ہے۔ خیال تھا کہ وہ جلد ہی رخصت ہو جائے گا مگر وہ دو از ہی اپنا تفصیلی تعارف کرانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ کچھ عرصے سے اُس کا قیام مستقل اسی ہوٹل میں ہے اور اس اعتبار سے وہ میرا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ کبھی آپ اور آئیے ان دنوں تو گھر سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے مل کے ہمارے گھر والے خوش ہوں گے۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟ مجھے خاموش دیکھ کے وہ بولا۔

طاہر بھائی نے مجھے اپنا غلط نام بتایا کہ کریم گل مجھ سے یہ وعدہ لیے بغیر نہیں ٹلا کہ رات کو میں ضرور اُس کے گھر میں آؤں گا۔ میں اب ہوٹل میں رہنے والے کسی شخص سے ملنے کا قائل نہیں تھا مگر کریم گل رات کو آٹھ بجے پھر آ دھمکا۔ میں نے اُسے اندر نہیں بلایا، دروازے ہی پر اُس سے کہہ دیا کہ میں کچھ دیر بعد خود آؤں گا۔ شکل و صورت سے وہ رکھ رکھاؤ کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں فیصلہ کر تا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اُس نے کوئی بھی بلایا تھا لیکن کوئی کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ پھر کوئی کے سامنے میں اکیلی رہوں گی۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ اگر میں نہ گیا تو وہ پھر آ دھمکے گا۔ ممکن ہے وہ کوئی ہمدرد آدمی ہو۔ شاید ہماری مصیبتیں دُور کرنے کا سبب بن جائے۔ میں نے کوئی سے ذکر کیا تو وہ بھی کشمکش میں پڑ گئی۔ کریم گل کا بڑھتا ہوا اندر سے سختی بند کر لے گی۔ دروازے پر تالا لگا دیا جائے گا۔ جب تک اُسے یہ یقین نہیں ہو جائے گا کہ میں لوٹا ہوں، وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ چنانچہ دو گھنٹے بعد میں چوتھی منزل کے کوریڈور ۳۰ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کریم گل کمرے میں تنہا تھا۔ اُس نے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ مجھے گھبے سے لگایا اور ادھر اُدھر کی دلچسپ باتیں کرتا اور میرے بارے میں پوچھتا رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں آسٹریل سے اپنی بہن کو ساتھ لے کے ماضی تباہ کے لیے یہاں آیا ہوں اور اپنے بڑے بھائی کی تلاش میں ہوں۔ وہ ہم سے ناراض ہو کے نکل گئے تھے۔ وہی ہمارا سرپرست تھا۔

"آپ اپنی بہن کو کیوں لائے؟" وہ شکایت کرنے لگا۔

"پھر آ جائے گی۔ آپ کے گھر والے کہاں ہیں؟"

"چچی جان برابر کے کمرے میں گئی ہوئی ہیں۔ ٹھہریے میں آپ کو اُن سے ملواتا ہوں۔"

"پھر مل لوں گا۔" میں نے کہا۔ "انھیں کیوں زحمت دیتے ہیں۔" لیکن وہ دروازہ پار کھلا گیا اور تین چار منٹ بعد ایک اوسط قد کی عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میں نے اُٹھ کر اُسے آداب کیا۔ عورت نے اشتیاق سے مجھے دیکھا۔ پھر پیار بھرے لہجے میں اُس نے میرے آداب کا جواب دیا۔ "بیٹھے رہیے۔" اُس نے نشست کی سے کہا۔

اُس کا رنگ گورا تھا اور جوانی زوال پر آ گئی تھی مگر گلاب بھی اُس کے نقش و نگار میں جاذبیت تھی۔ اُس نے ہلکا سا میک اَپ کر رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ اس کا بات کرنے کا انداز بڑا دل نشیں اور شائستہ تھا۔ وہ اپنے بھتیجے سے زیادہ خوش مخلق ثابت ہوئی۔ اُس نے مجھے اپنی ڈبیا سے گہری نکال کے کھلائی۔ وہ خاص انداز سے مسکراتی تھی۔

"کریم کے رشتے سے تم بھی میرے بھتیجے ہوئے۔" وہ شفقت سے بولی۔ "ارے تمھاری بہن کہاں ہے؟ کریم اُس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔" میں نے اُس کے ساتھ نہ آنے کی معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں اُسے ضرور ساتھ لے آؤں گا۔ وہ میرے بھائی کے بارے میں پوچھنے لگی کہ میں نے اسے کہاں کہاں تلاش کیا؟ وہ آخر کیوں ناراض ہو گیا؟ میں اطمینان سے مسکراتا رہا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے مجھے چائے بنا کے پلائی۔ وہ اتنی محبت سے پیش آئی کہ اب تک مجھے کوئی عورت اس طرح پیش نہیں آئی تھی۔

انھوں نے مشکل سے مجھے اجازت دی۔ کورا صبح و سلامت تھی۔ میری کاٹ پر اُس نے دوازہ کھول دیا۔ میں نے اُسے ساری باتیں بتا دیں۔ پھر رات کا کھانا کھا کے ہم اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ کورا کی ٹانگ میں درد ہو رہا تھا۔ یہ بات وہ مجھے پریشان نہ کرنے کے لیے چھپا رہی تھی۔ میں اُس کے پلنگ پر پہنچ گیا کہ مگر اُس نے سلانے کی ترکیب مجھے معلوم ہو گئی تھی۔

صبح ہوئی تو ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ کریم اپنی چچی کے ساتھ آ گیا۔ مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے اندر بلا لیا۔ چچی بھی اندر آتے ہی کورا کی بلائیں لینے لگیں۔ پھر وہ دونوں رشتے داروں کی طرح مکمل گھل مل گئیں۔ کورا کے لہجے میں ایک اٹک تھی۔ اُس باتونی عورت سے کچھ نہ کچھ بات تو کرنی ہی تھی۔ کورا نے بہت کم بات کی تاہم اُس کا لہجہ صاف غمازی کرتا تھا کہ اُس کا تعلق ادھر کے علاقوں سے نہیں ہے۔ ادھر کریم گل مجھ سے بے تکان باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں ہمیں دیکھ کے اور ہم سے مل کے بہت خوش ہوتے تھے۔ انھوں نے ہماری دوپہر کی دعوت کی۔ دوپہر کا کھانا ہوا پھر رات کا بھی ہوا۔ ایک دن میں وہ ہم سے اس قدر قریب ہو گئے کہ ہمارے درمیان کوئی بھید ہی نہیں رہا۔ میں کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بہت اچھے ثابت ہو رہے تھے۔ غم خوار تھے، زیادہ کریدتے نہیں تھے، جو کچھ میں نے کہا، انھوں نے کسی چون و چرا کے بغیر اُس پر یقین کر لیا تھا۔ اس کے باوجود میں اُن سے ملاقات بڑھانے میں ناغہ نہ کرتا تھا۔ وہ خود اس قدر آگے بڑھ کے ہم سے پیش آ رہے تھے۔

آدمی شرمندہ ہو جاتا ہے اور پھر ایسا آدمی جو محبت اور ہمدردی کی ایک نظر کے لیے ترس رہا ہو۔ کل رات کورا کہہ رہی تھی کہیں تم ہم سے بیزار ہو جاؤ۔ تمام دُکھوں سے نجات مل جائے گی۔ میں نے اُسے جواب دیا تھا کہ ابھی محبت اور پیسے باقی ہیں اور چاقو بھی جیب میں موجود ہے جب پیسے ختم ہو جائیں گے اور حوصلہ جواب دے جائے گا تو ہم اس چاقو سے اپنا کام تمام کر لیں گے۔ آج رات نہ حالت بدلی ہوئی تھی۔ سارا دن ہم نے اکٹھے اور اُس کی چچی کی دل کش باتوں کے سائے میں گزارا تھا۔ چچی جان کو کورا اتنی پسند آئی تھی کہ وہ اُسے اپنے پاس ہی بٹھائے رکھتی تھیں۔ انھوں نے ایک بار کورا کا پان بھی کھلا دیا۔ لالی اُس کے نازک ہونٹوں پر اتنی رچی کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ اس عُرفی کا عکس اُس کی صراحی دار گردن سے بھی جھلکنے لگا تھا، جیسے اُس نے ہونٹوں پر مہندی لگائی ہو۔

دوسرے دن کریم گل کی چچی نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم دکھو ریا میموریل چلیں، چڑیا گھر دیکھیں۔ چچی اور اُن سے بھتیجے کریم گل میں کوئی پرائیویٹ نہیں تھا۔ وہ زندگی کو زندگی کی طرح گزارتے تھے، خوب ہنستے تھے، خوب کھاتے تھے، خوب قہقہے کرتے تھے، جب سے چچی دلی سے آئی تھیں، وہ کہتی تھیں۔ "بھئی کریم نے تو لکھنے کی ایسی سیر کرائی ہے کہ میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔"

میں اُن کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ وہ اتنے چاؤ، تکلم اور شفقت سے بات کرتے تھے کہ انکار کرنے کے لیے ہمت رنگ مل اور غیر مہذب ہونا ضرور لگتا تھا۔ دوسرے دن بھی وہ ہمیں کلکتہ دکھاتے رہے۔ انھوں نے مجھے اپنی جیب سے تھیٹر کی کرایہ بھی ادا نہیں کرنے دیا۔ چچی کورا سے ایسی پیوستہ ہو گئی تھیں کہ مجھے اُس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل پاتا تھا۔ مجھے اُن کی یہ قربت زیادہ پسند نہیں آتی۔ میں کورا کو کسی اور سے بات چیت کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس رات کھانے کے بعد چچی کو اچانک سینما دیکھنے کی چڑ اُٹھی۔ بس اُن کے مُنہ سے بات نکلنے کی دیر تھی، کریم بھی سیر سپاٹے کا رسیا تھا، اُس نے چچی کی پُرزور تائید کی۔ مجھ سے کہا گیا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم سینما نہیں دیکھتے۔ چچی سے کون بحث سکتا تھا۔ میرے اور کورا کے شدید انکار کے باوجود انھوں نے ہمیں اُٹھا ہی لیا۔ وہی ہوا جو چچی چاہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہم لائٹ ہاؤس سینما کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ میری قسمت بُری تھی۔ چچی کورا کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں اور کریم مجھے کلکتے کی عمارتوں اور قصوں کی ہوں کے بارے میں مسلسل کچھ نہ کچھ بتا رہا تھا۔ اتفاق سے گیٹ ہی پر اُن لوگوں کے ایک شناسا جوڑے سے ملاقات ہو گئی۔ عورت بُرقع اوڑھے ہوئے تھی۔ مرد کا چہرہ درشت تھا۔ اُس کے سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کڑا بھی پڑا ہوا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ شخص مجھے ناپسند ہوا۔ چچی نے بڑھ کے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ عورت نے نقاب اُٹھا دی۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ سُرخی پاؤڈر میں پلی ہوئی تھی۔ اُس کی ناک میں نتھ تھی اور لبوں پر ایک اٹکا سکا سا بھابت تھی جسے کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کورا میں خاص طور پر دلچسپی لی اور سر سے پاؤں تک اُس کا جائزہ لیتی رہی۔

"ماشاء اللہ بہت پیارے بچے ہیں۔" بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکلا۔

کریم نے ناگواری سے مُنہ بنایا۔ "چچی بی نظر مت لگاؤ، ہم نے اسے بیٹی بنا لیا ہے۔"

"مٹھائی کے بغیر یہ بیٹی؟" چچی بی نے ایک بے تکلم قہقہہ لگایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بھلا کوئی عورت بھی اس طرح قہقہہ لگا سکتی ہے؟

"مٹھائی تمھاری چچی۔" چچی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"پھر کب ارادہ ہے؟" چچی بی نے آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"جلد ہی۔" چچی نے شوخی سے کہا۔

اسی اثنا میں مسز کریم گل کا بازو پکڑے ایک طرف لے گیا۔ پھر وہ زور زور سے باتیں کرتے ہوئے واپس آئے کہ نہیں ٹکٹ ہم لیں گے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کریم گل نے مجھے سُنانے کے لیے اپنی آواز بلند کی ہو۔ وہ سب ابھی تک مجھے نظر انداز کر رہے تھے اور کورا ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چچی نے اس ہجوم میں کورا کے شانوں پر بے تکلفی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ جی میں آیا کہ میں کورا کا ہاتھ تھام کے یہاں سے جتنی تیزی سے بھاگ سکتا ہوں، بھاگ جاؤں۔ بھاگ جانے کے لیے میں پہلے ہی کب تیار تھا۔ ان لوگوں کی باتیں سُن کے اور رویّے دیکھ کے مجھے طمانیت ہونے لگا۔ درشت چہرے والا مرد ٹکٹ لے آیا تھا اور اُن سب کے قدم سینما ہال میں جانے کے لیے اٹھ پیچھے تھے۔ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ مجھے کورا کے پاس بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اُن دونوں عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ پکچر شروع ہو چکی تھی، انٹرول ہوا تو چچی اور چچی بی کے قہقہے گونجنے لگے۔ میرا دھیان سینما کی طرف نہیں تھا۔ میں اُن دونوں کی سرگوشیاں سُن رہا تھا۔ وہ دونوں مرد شوہروں کی بات کر رہے تھے۔

جیسے تیسے میں نے وہ وقت گزارا۔ رات کو بارہ بجے پکچر ختم ہوئی۔ میں کریم گل کے بجائے کورا کے پہلو میں چلنے لگا۔ چلتے وقت چچی بی اور اُس کا شوہر وداع ہونے لگے تو انھوں نے چچی سے کہا۔ "ہماری طرف سے بات پکی سمجھ اور خیال رکھنا کہ فضل تیار رہنے میں دیر نہ لگے گی۔ اس عرصے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اب تک یہی ہوا ہے۔" چچی نے بے لی سے کہا۔ "بہر حال سوچ لو، تمھاری مرضی پھر انھوں نے میری طرف دیکھ کے کہا۔ "میری زمین سے اچھی فصل کہیں نہیں ہوتی اور اس بار تو ....."

"ٹھیک ہے ہم سوچ کے جواب دیں گے لیکن جب تک ہم جواب دے دیں تم کسی اور سے بات نہیں کرو گی۔"

"میں تمھارا انتظار کروں گی اور مجھے معلوم ہے تمھارا جواب کیا ہو گا۔" یہ کہہ کے چچی آگے بڑھ گئیں۔ وہ دونوں دوسری سمت چلے گئے۔ میرے جسم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چچی میری خاموشی محسوس کر کے کہنے لگیں۔ "دلی میں ہمارے پاس ہماری بڑی زمین پڑی ہوئی ہے۔ کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ کریم گل یہاں چلا آیا ہے اس کے ساتھ سال سوا سال کر انا پڑتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چچی تمام راستے ظلم کی باتیں کرتی رہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ آج رات کورا اُن کے پاس سوئے کورا نے خود سختی سے منع کر کے میری مشکل آسان کر دی۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے کورا کی

پیشانی کا بوسہ لیا اور بتایا کہ وہ بندر کے میں نے کورا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بھی اضطراب چھایا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی تمام پیسے سوٹ کیس میں ڈال لیے۔ اب یہاں ایک لمحے ٹھیرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اٹیچی کا میں نے ایک گھنٹا گزار دیا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے دروازے سے جھانک کے دیکھا، ہوٹل پر پُراسرار خاموشی مسلط تھی جیسے ہی دروازہ کھول کے نکلے، میرے نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھ کے اُس کا جسس نوٹ کر دیا، وہ سوٹ کیس تھام کے نیچے فرش میں آیا۔ دو روز کی بھاگ دوڑ کرایہ طے کرنے میں تیزی سے پیچھا تڑ آیا۔ نیچے دربان کی حیرت بھی میں نے پانچ روپے اور دے کر دور کر دی۔ ٹیکسی ملنے میں دیر لگی تو ہم پیدل چل پڑے۔ رات کے وقت ایک برقع پوش عورت کے ساتھ سوٹ کیس ہاتھ میں لے کے چلنے کی دشواری کا مجھے اندازہ تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی دُور ایک ٹیکسی مل گئی۔ زائد کرائے کے لالچ میں وہ آمادہ ہو گیا۔ چائو جیب سے نکال کے میں نے ہاتھ میں رکھ لیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے اچانک مجھ سے کہا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے پیچھے کے شیشے سے مڑ کے دیکھا ہم سے کچھ فاصلے پر تین روشنیاں تھیں۔ جہاں جہاں گاڑی مڑتی تھی وہ روشنیاں بھی مڑ جاتی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی جیب میں کچھ روپے ٹھونسنے کے میں نے خوشامد کی کہ وہ گاڑی تیز بھگائے۔ میری نظریں عقبی شیشے کی طرف تھیں۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ وہ علاقہ آگیا تھا جہاں مجھے اُترنا تھا۔ پچھلی گاڑی ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں کورا کو لے کے تیزی سے اُترا۔ جیب سے روپے نکال کے گنے بغیر ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ گاڑی آگے بڑھائے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا پھر اُس نے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر ایک پھپھوندی سی گلی میں رینگ گئے اور اندھیرے میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے چاقو کا کھٹکا باہر کے سرے پر دبا کر رکھا تھا۔ دو ایک منٹ بعد ہمارے پیچھے والی گاڑی کی روشنیاں سڑک پر نظر آئیں۔ گاڑی زن سے گزر گئی۔ ہم گلی تنگ گلی میں اور آگے بڑھ گئے۔

برسے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے پھاٹک پیٹا اور آوازیں لگائیں۔ ایک بڑھے شخص نے کھانستے ہوئے اندر سے پوچھا "کون ہے؟" میں نے بلند آواز سے کہا "زبان! میں مولوی محمد شفیق کا مہمان ہوں۔ دروازہ کھولیے۔"

بڑھے نے کھڑکی کھول کے ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مولوی صاحب نے ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا اور ہمیں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔ "آؤ، اندر آجاؤ۔" انھوں نے سکون سے کہا۔

ہم دونوں سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ "کہاں رہے؟" انھوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُن کے ٹھنڈے لہجے میں شدید ناراضی بھی ہوتی تھی۔

"ہمیں معاف کر دیجیے مولوی صاحب! خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم نے آپ کو ناراض کیا لیکن ہم نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ اُن کے خوف سے ہم چلے گئے تھے۔ آپ کے سوا اس شہر میں ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا اس لیے ہم آپ کے پاس آگئے ہیں۔ اب آپ جو بھی چاہے سزا دیں۔ ہمیں معاف کر دیجیے۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ جیسی اپنی جان میں لے لیجیے آپ ہمیں اپنا غلام سمجھ لیجیے۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ ہمیں اپنے ساتھ مراد آباد لے چلیے۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو دھوکا نہیں دیں گے۔"

"سکون! اطمینان۔ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔" مولوی صاحب نے ہاتھ اُٹھا کے میری تیز زبان کو قابو میں کی۔

"کورا تم مولوی صاحب سے پردہ مت کرو، نقاب اُٹھا دو۔" کورا نے نقاب اُتھاری اور جھجکتے ہوئے اُن سے معافی مانگنے لگی۔

"ارے تم تو اچھی خاصی چھوٹی ہو۔" مولوی صاحب پر حیرت طاری تھی وہ کورا کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

"اب میری سُنیے میں آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ایک لفظ جھوٹ نہیں کہوں گا، اس کے بعد آپ جو چاہیں فیصلہ کر دیجیے گا۔ ہمیں دھکے دے کے گھر سے نکال دیجیے یا ہار اگلا گھر نذر کر دیجیے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یہ لڑکی جسے آپ دیکھ رہے ہیں یہ ایک غیر مسلم لڑکی ہے۔ اس کا نام کورا ہے۔"

میں نے شروع سے آخر تک تمام روداد انھیں سُنا دی۔ میں نے اُن کا غدارانہ جرائم کا داستان کا ذکر نہیں کیا جو ہمارے گھر میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ تبت کے قبیلے جانگ کی جاسوس رہا ہے۔ میں نے اتنا ہی ترمیم مناسب سمجھی اور یہ کہا کہ کورا ایک سڑاسی لڑکی ہے۔ یتاسڑا اس کی عمر ہی کے باوجود اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا تعاقب انھیں اس کے باپ کی موت کے بعد اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ وہ اسے لے کے ہندوستان چلا آیا۔ نئے سرے سے ان دونوں کے پیچھے آدمی لگا دیے تھے۔ اُن آدمیوں نے بھگتی میں اُن لوگوں کو قتل کر دیا اور کورا ہمارے گھر بھاگ آئی۔

مولوی صاحب نے ایک ایک بات توجہ سے سُنی۔ "تمھیں یہاں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا ہمیری مراد اُن لوگوں سے ہے جو تمھارا تعاقب کر رہے تھے۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا پھر برسے کے دروازے تک پہنچنے کا راستہ تفصیل سے انھیں سُنایا۔ "ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں کھلنے اپنے شہر سے چلے جانے کا حکم دے دیجیے گا۔ ہم وہاں کام کریں گے۔ آپ پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ کورا کے لیے میں سب کچھ کر دوں گا، مزدوری کروں گا، لوگوں کے ڈھور چرائوں گا۔ بس صرف رہنے کے لیے جگہ چاہیے۔"

مولوی صاحب چند لمحوں تک خاموش رہے اُن کی یہ خاموشی ہمیں بہت گراں گزری۔ ہم عدالت میں کھڑے ہوتے تھے اور اُن کا فیصلہ سُننے کے منتظر تھے۔ انھوں نے اچانک اپنے دونوں بازو وا کیے اور کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ "باہر کورا!" انھوں نے اونچی آواز میں کہا۔ "اچھا ہوا کہ تم دونوں واپس آگئے۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے البتہ غلطی ضرور کی ہے غیر غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے اور تم تو ابھی بچے ہو جو غلطی ہو گئی اُسے بھول جاؤ، وہ ماضی کا حصہ بن گئی۔ تم نے اس چھوٹی عمر میں بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ اب تم فکروں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ میں تمھاری دیوار ہوں۔ میں تمھارا گھر ہوں۔"

"مولوی صاحب! ہم سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بس ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس رات ہم کوئی چار بجے سوئے اطمینان اور سکون کی نیند۔

❤

اب اُس شہر میں ایک پل بھی ٹھیرنے کا ہمارا ارادہ نہیں تھا مگر مولوی صاحب نے تین دن بعد جانے کا پروگرام بنایا۔ انھیں کچھ کام نمٹانے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ جب ہم نکلیں گے تو اُن کے ساتھ کچھ سپر تفریح بھی کر لیں۔ اب ہمیں ہماری خیر خبر پوچھنے لگے۔ انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ کبھی باغ میں جا رہے ہیں، کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ دونوں میں انھوں نے ہمارے تمام خوف اور دکھ دھو ڈالے۔ کورا بھی اُن کی خوب خدمت کرتی رہی۔ کورا کو مولوی صاحب کی شکل میں مخلص ہمدرد مل گئے تھے۔ ان دو دنوں کا پتہ ہی نہیں چلا۔ انھوں نے میرے اور کورا کے لیے نئے نئے کپڑے خریدے، چادریں، عطر کا کچھ سامان لیا، پھر ہمیں رات کو دریا کا منظر دکھانے کے لیے لے گئے۔ میں جہاں جہاں گیا اُن سے سنسان مقامات پر بیٹھنے کے لیے زور دیتا رہا۔ ہم دریا کے کنارے خاموش کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا ساتھ لے گئے تھے۔ کھانا کھا کے میں نے دیں کھایا، مسلسل ایسا دلکش تھا کہ اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ ہمی ہم کنارے کنارے چل رہے تھے۔ مولوی صاحب سب سے آگے تھے، کورا اُن کے پیچھے میں کورا کے پیچھے۔ سامنے سے ہمیں چار آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ اُنھوں نے فانوس اُن میں سے ایک نے بڑھ کے مجھے اس زور کا ہاتھ مارا کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ پھر کورا کی چیخ بلند ہوئی اور مدھم ہو گئی۔ مولوی صاحب نے شور مچایا۔ وہ آدمی کورا کو اُٹھا کے ایک طرف بھاگے۔ تیسرا مجھ پر بہت لگانے کے لیے بڑھا۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ چاقو اُس کے پیٹ میں اُتر گیا۔ اُس کی ایک کربناک چیخ ابھری۔ میں اُس کے جسم سے چاقو کھینچ کے دوسروں کی طرف بڑھا۔ جو شخص مولوی صاحب سے زور آزمائی کر رہا تھا میں نے پیچھے سے اُس کی پیٹھ میں چاقو اتار دیا تھا۔ مولوی صاحب آزاد ہو کے اُن لوگوں کی طرف بے تحاشا جا رہے تھے کیونکہ وہ لوگ کورا کو لیے ہوئے اندھیرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ مولوی صاحب چاقو بجا بجا کے آوازیں لگا رہے تھے۔ مجھے دو سرے شخص کی پشت سے چاقو نکالنے میں دیر ہو گئی کیونکہ چاقو اُس کی کمر میں پوری انس اُترا تھا۔ اُس نے دہاڑتے ہوئے مجھے دبوچ لیا۔ مجھ سے اور کچھ نہ بن پڑا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ وہ بلبلا اٹھا پیچھے ہٹا تو میری ایک لات نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ پشت کے بل گرا، چاقو زمین پر پڑا تھا۔ اسے اُٹھا کے میں نے اُس کی پسلی میں اُتار دیا اور ایک ہی وار پر بس نہیں کیا، کئی جگہ سے اُس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر میں نے آگے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ اندھیروں میں گم ہو گئے تھے مولوی صاحب بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ میں خون میں تربتر تھا میں اندازہ لگانے کی تیزی سے اُس سمت بھاگا جہاں مولوی صاحب بھاگتے ہوئے گئے تھے۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے پیروں پر ٹانگ مار دی۔ میں اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا۔ وہ کانسٹیبل تھا۔ اُس نے تیز سیٹی بجائی پھر دائیں بائیں طرف سیٹیاں بجنے لگیں اور جب میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو میں سپرمان سے گھرا ہوا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی پٹرقصہ ختم ہوا، کانسٹیبل میرے سر پر آن کھڑے تھے۔ ارشد کو لینے پرانی آگئے۔

اُن میں ایک اور کانسٹیبل کا اضافہ ہو گیا۔

پہلے کے تین کانسٹیبل میرے ہاتھوں پٹ چکے تھے مجھے قابو میں کرنے کی فکر میں تھے۔ آنے والے کانسٹیبل نے آتے ہی میرے شانے پر اپنی وزنی بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ میں یہ ٹھوکر برداشت نہ کر پایا لیکن گھومتے ہوئے دُور سے کہیں کورا کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پھر اُن کے حصار سے نکلنے کے لیے پر تولے۔ کانسٹیبل نے دوسری ٹھوکر کے لیے پیر اُٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے بے دم کر دیتا میں نے اُس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ بے توازن ہو کے زمین پر گرا۔ دوسرا کانسٹیبل چیختا ہوا میری طرف جھپٹا تو میں نے چاقو اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ پھر مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں چاقو نکالنے کی کوشش میں تھا کہ انھوں نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میری فریادوں اور چیخ پکار پر ان کی گرفت اور سخت ہو گئی اور کسی نے پیچھے سے میری کمر میں اس زور کا گھٹنا مارا کہ میں بلبلاتا ہوا زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں کچھ دیر زمین پر تڑپا لیکن پھر مجھے ہوش نہیں سا یا زمین تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو میں ننگی اور کھردری زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سارے جسم میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کپڑے بھی نہیں بدلی جاتی تھی۔ کپڑے کیچڑ اور خون میں سنے ہوئے تھے۔ شیرانی پر پسندیدی برا تھے نام رگی تھی۔ ہر طرف خون کے دھبے تھے، ہاتھوں پر چہرے پر، پیروں پر خون ہی خون جما ہوا تھا۔ کمرے میں ایک دھندلی سی روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا اور اُن سلاخوں کے پیچھے دو مسلح سنتری پہرا دے رہے تھے۔ میری آہٹ پر انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی پاگل کتا ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی "جاگ گیا۔ جاگ گیا، حرامی بچہ۔" انھوں نے صدا لگائی۔

اُن کے صدا لگانے کی دیر تھی کہ سلاخوں پر بہت سے سپاہیوں کا اجتماع ہو گیا، وہ سب حیرت اور غصے سے مجھے گھور رہے تھے۔ کسی کی نظر میں ہمدردی نہیں تھی۔ طرح طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں میری ماں اور بہن کے متعلق شرمناک تبصرے ہو رہے تھے۔ "سالا شکل سے کیسا معصوم نظر آتا ہے۔"

"ایک دم دس نمبری ہے ابھی اس کی عمر تو دیکھیے۔"

"چڑھ جا بیٹا سُولی پر رام بھلی کریں گے۔"

یہ سب آوازیں میرے کانوں میں چبھ رہی تھیں میرا دل زور زور سے لرزنے لگا۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ یہ تو ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ابھی

آنکھ کھل جائے گی اور میں اپنی دنیا میں واپس آجاؤں گا۔ میں نے دہشت سے زمین پر ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حالات کی سخت اور کھردری زمین سے میری جلد چھل گئی۔ اُن کی ہنسی کل گئی۔ "سالا بالکل جنگلی ہے۔"

میں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

پھر اچانک اُن کی زبانوں پر فالج گر گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے ڈپٹ کر انھیں سلاخوں سے دُور ہونے کا حکم دیا۔ میں نے ذرا سنجیدگی سے سر اُٹھا کے دیکھا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس لمبے قد کا ایک شخص مجھے زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی انسپکٹر ہوگا۔ "اسے علیحدہ لاؤ۔" اُس نے درشتی سے سنتری کو حکم دیا۔

سنتری دروازہ کھول کے دُور ہی سے کھڑا رہا۔ "چل بے صاحب بُلا رہے ہیں۔" اُس نے مجھے نفرت سے مخاطب کیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اُٹھنا سے یاد آیا، دماغ ٹھکانے لگا دیا؟ میں نے کسمسا کے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ سکا۔ "سالا ان رہا ہے۔"

"تم اسے اُٹھا کے سیدھے میرے پاس لاؤ۔" انسپکٹر نے شاید میری مخدوش حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ "خبردار اسے کوئی ضرب نہ پہنچانا۔ بہت احتیاط سے فوراً میرے پاس پہنچاؤ۔"

سنتریوں کو نرمی اور احتیاط کا مشورہ دیا گیا تھا مگر اُنھوں نے مجھے کسی جانور کی طرح گھسیٹا مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں اُٹھا تو میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے دروازے کے پاس لائے۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنی مسیحوں اور کراہوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں دو قدم چلا ہوں گا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میری آہ پر کوٹھری سے باہر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں انتشار سا پیدا ہوا۔ مجھے ایک مختصر تنگ راستے سے گزار کے انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے ہی دو کالے پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ "اسے پانی پلایا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ابھی نہیں جناب! سپاہی تو جاگا ہے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کیا یہ بیان دینے کے قابل ہے؟" دوسرے پولیس افسر نے پوچھا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔"

میں بری طرح بیدار ہونے اور منتشر اعصاب یکجا کرنے کی کوشش کی۔ بیان؟ کس بات کا بیان؟ ہاں میں نے دو آدمیوں اور ایک کانسٹیبل کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی بیان کی ضرورت ہے؟ یہ مجھ سے میرا نام، خاندان، پتہ اور پوری کہانی پوچھیں گے۔ میں انھیں کیا بتاؤں؟ کیا سارا واقعہ سچ سچ بتا دوں؟ انسپکٹر نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا تھا۔ اب مجھ سے سوالات کیے جائیں گے۔ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ پتہ نہیں، رات کیا ہوا؟ مولوی صاحب کا کیا حشر ہوا؟ کرایا کہاں گئی؟ میں انھیں کس طرح کا بیان دوں؟ "تمھارا نام؟" انسپکٹر نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ ایک سپاہی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔ "صاحب نام پوچھتے ہیں۔ سیدھے کھڑے ہو۔"

میں نے ویران نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ "میرا نام... میرا نام ظہیر خاں ہے۔" میری لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"ظہیر خاں۔" اُس نے دُہرایا۔ "باپ کا نام؟"

"حسن خاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ؟"

"میرا کوئی پتہ نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تمھارا گھر کہاں ہے؟" کانسٹیبل نے مجھے غور سے مار کے پوچھا۔

"گھر؟" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے۔"

"تم لکھتے کب آتے ہو؟" انسپکٹر کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے پولیس افسر نے دلچسپی سے پوچھا۔ "دیکھو میاں صاحب! تم نے رات جتنا قتل کیے ہیں سب کو صاف صاف بتا دو۔ تمھارا یہ سیلانیاں بہت اہم ہوگا۔ گھبراؤ نہیں، کھل کر بات کرو۔ تم لکھتے کب آتے ہو؟"

"بہت دن ہو گئے۔" میں نے بے خیالی کے انداز میں کہا۔

"یہاں کہاں بستے تھے؟" انسپکٹر کو میرے جوابات پر غصہ آنے لگا تھا۔ "کہیں نہیں۔ یہیں اِدھر اُدھر۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"صاحب اس طرح یہ نہیں بولے گا۔ اگر حکم ہو تو اس کی زبان کھولنے کا انتظام کروں؟" کانسٹیبل نے میرے بازو پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"تم چپ ہو۔" انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاں ظہیر خاں! لکھنے سے پہلے تم کہاں ملتے تھے؟"

"میں کسی ایک شہر میں نہیں رہتا، گھومتا رہتا ہوں۔" میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پوچھتے ہیں یا نہیں۔

"ماں باپ زندہ ہیں؟"

"مر گئے۔" میں نے کرب سے کہا۔

"کوئی عزیز رشتے دار؟"

"سب مر گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"ہونہہ۔" انسپکٹر نے اپنے ساتھی پولیس افسروں کی جانب دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔ "شاید کانسٹیبل کے مشورے پر عمل کرنا پڑے گا۔"

"نہیں۔" افسر نے سختی سے منع کر دیا۔ "اس کی حالت پہلے ہی خراب ہے۔" اُس نے انگریزی میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں زیادہ الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک صاف مقدمہ ہے۔ مطلب کی بات پوچھو۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کچھ پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

میں جواب دینے میں پھر جھجکا۔ "نہ جاننے کے برابر۔"

"یہ چاقو کس کا ہے؟" اُس نے میرا چاقو لہرا کے کہا۔

"میرا ہے۔" میں نے نقاہت سے جواب دیا۔

"اور یہ موتیوں کی مالا؟" اُس نے میری آنکھوں کے سامنے مالا گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی میری ہے۔"

"چُرائی ہے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"نہیں نہیں، یہ میری ماں کی نشانی ہے۔"

"ماں کہاں ہے؟"

"ماں بھی مر گئی۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ کہاں؟"

"مکھنر میں۔" میرے ذہن میں یہی نام آیا۔

"تو گویا تم مکھنر سے تعلق رکھتے ہو؟"

"جی نہیں۔ میری ماں کو مرے ہوئے بہت برس ہو گئے ہیں۔ اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ وہ مکھنر شہر میں مری تھیں۔ ہم دونوں ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی چور سامان میں یہ مالا دیکھ کے ہمارے پیچھے پڑ گیا، چنانچہ ماں نے اضطراری طور سے میرے گلے میں بنیان کے نیچے چھپا دیا۔ اس کے بعد میں ریل میں سو تا رہ گیا اور اُٹھا تو ماں نہیں تھی اور پھر کبھی نہیں تھا۔ میں نے ماں کو بہت تلاش کیا۔ اُس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔"

"ماں کو چور لے گیا؟" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب!" میں اپنی پوری توانائی سے چیخ پڑا۔ "تمھاری بھی کوئی ماں ہوگی، مجھے چاہے جتنا بُرا کہو، میری ماں کے بارے میں ایک لفظ نہ کہنا ورنہ میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا، کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں، اتفاق سمجھ لو۔ میں تمھارے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوں لیکن میری بھی ایک ماں تھی۔"

کمرے میں پُرسکوت چھا گیا۔ انسپکٹر نے اپنے ساتھی پولیس افسروں کی جانب دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ "پولیس افسر نے انگریزی میں تبصرہ کیا۔ "اچھی داستان سنا رہی ہے۔ پھر تم یہ مالا لیے شہر شہر گھومتے رہے ہو؟" میں نے جواب نہیں دیا، گردن جھکا لی۔

"اچھا ظہیر خاں!" انسپکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "رات کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ کچھ کہیں گے یا میری قسمت خراب تھی؟"

"وہ تو ہے لیکن میں اس کاغذ پر کچھ لکھنا ہے اور عدالت میں پیش کرنا ہے۔ تم اپنا تو سر چکے ہو۔" اب تک انھوں نے مولوی صاحب اور کرایا کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور سوال کرتے۔ میں نے چند لمحوں میں ہزاروں باتیں سوچیں۔ کاش مجھے جواب دینے سے پہلے معلوم ہو جاتا کہ اُن دونوں پر کیا گزری ہے؟ میں دو آدمیوں کے قتل سے انکار کر سکتا تھا۔ انکار کرنے میں کیا حرج ہوتا لیکن کانسٹیبل کے قتل کے تین چشم دید گواہ موجود تھے اور مقتول کانسٹیبل کے پیٹ سے جو چاقو برآمد ہوا تھا، اُس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پیٹ پر آگے پیچھے لگیں جو وار ملائیں پڑی ہوئی ملی تھیں، وہ بھی اسی سے لگائی گئی ہوں گی۔

وہ "جانا چاہتے تھے۔" میں انھیں کیا وجہ بتاتا۔ مجھے خاموش دیکھ کے انسپکٹر نے غضب ناک آواز میں کہا۔ "ہمارے سوال کا جواب دو۔"

"میں۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اُن پر جوابی حملہ کر دیا۔"

"کیا تم انھیں پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔ میں نے اُن کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"وہ تم سے کیا چاہتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا انھوں نے تمھیں چھیڑا تھا؟" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"انھوں نے آتے ہی مجھ پر حملہ کر دیا۔ شاید وہ میری مالا مجھ سے چھین لینا چاہتے تھے۔" میرے لہجے میں تلخی آگئی۔

"انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تمھارے پاس ایک قیمتی مالا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اور انھوں نے کیا کیا؟"

"انھوں نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ ایک نے میرے گال پر مکا مارا۔ میں نے چاقو دکھایا مگر وہ نہیں مانا۔"

"تم اعتراف کر رہے ہو۔" پولیس افسر نے کہا۔

"میں سچ بیان کر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ جھوٹ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اور دوسرا آدمی؟ وہ تو پہلے آدمی سے خاصی دُور سیدھا پایا گیا۔" انسپکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

"جب میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرے آدمی نے میرا تعاقب کیا، پھر میں نے اسے بھی مار دیا۔"

"اور کانسٹیبل؟"

"مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے دو آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ میں بھاگنا چاہتا تھا کہ کانسٹیبل نے میرا راستہ روک لیا۔" یہ کہہ کے میں خاموش ہو گیا۔

"کچھ اور پوچھنا ہے؟" انسپکٹر نے پولیس افسر سے پوچھا۔

"بظاہر کافی ہے لیکن صرف خانہ پُری کے لیے مجھے یہ معاملہ پیچیدہ نظر آ رہا ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس تیز لڑکے نے جو بیان دیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بہرحال اس نے اعتراف کر لیا ہے، ہمیں اپنے طور پر تفتیش جاری رکھنی چاہیے۔ کیا یہ معلوم ہوا کہ باقی دو مقتول کون تھے؟"

"نہیں۔ ابھی ان کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلا۔"

"اس لڑکے کی زبان اور لہجہ صاف ہے۔ تم نے اس خاص بات پر توجہ دی؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"ترمہ تو ابھی بہت سی باتوں پر دینی ہے، میرا خیال ہے، ہمیں آج صبح اسے حوالات میں پیش کرنے کے لیے ظاہری معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔"

"اسے خاص سنتریوں کی حفاظت میں رکھا جائے۔ پولیس میں استعمال پھیلا ہوا ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"اس مالا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"میں سمجھتا ہوں یہ ایک بیش قیمت مالا ہے۔"

"مجھے تو قطعی نظر آتی ہے ذرا غور سے دیکھو۔" انسپکٹر نے اُسے افسر کی طرف اُچھال کے کہا۔

افسر نے گھما پھرا کے مالا کا جائزہ لیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی پھر پہلے افسر نے مالا دوسرے افسر کی طرف بڑھا دی۔ "کیا خیال ہے؟"

"یہ قتل کا کیس ہے۔" اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہمیں یہ مالا فی الفور سیل کر دینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ..."

"تمہاری رائے صحیح ہے۔" انسپکٹر نے بات اُس کی زبان سے ادا کرنا چاہی۔ اُس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی اور لفافے میں بند کر کے اُسے سیل کر دیا۔ لفافے پر تینوں پولیس افسروں نے دستخط کیے اور اسے ایک الماری میں مقفل کر کے الماری بھی سیل کر دی گئی۔ "تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے گرج دار آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "ورنہ ہم تمہیں تمہارے اس ابتدائی بیان کے بعد عدالت میں پیش کریں گے۔"

"مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

میری آنکھوں کے نشانات لے کے مجھے پھر حوالات کی کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں ایک کونے میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ میں نے تھانے اور حوالات کے بہت قصے سنے تھے اور بہت کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں گیا میں روزانہ تھانے کی عمارت سے گزرتا تھا لیکن اندر سے تھانا کبھی نہیں دیکھا تھا اور میری کسی پولیس والے سے بھی دوستی نہیں تھی، محلے کا ایک شخص پولیس میں ملازم تھا۔ مجھے اُس کے چہرے سے ڈر لگتا تھا۔ گیا کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ اس وقت حوالات میں بیٹھا تھا۔ ایک ہفتے میں کیا سے کیا ہو گیا، تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ دن دیکھنا نصیب ہو گا۔ اگر کسی طرح ابا اور امی کو خبر ہو گئی کہ اُن کا بیٹا قاتل ہو گیا ہے تو ان دونوں کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ کمزور ٹانگوں سے اتنی تیز دوڑنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اب پچھتانے کا کیا موقع ہے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے اور مجھے قتل کی سزا ہی معلوم ہے کاش سزا پانے سے پہلے مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کور اخطوط ہاتھوں میں پکڑے گئی ہے۔ کاش ایسا ہی ہو ورنہ میری رُوح بے چین رہے گی۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، میں نے تو مولوی صاحب کو منع کیا تھا کہ وہ رات کے وقت دریا کے کنارے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں، حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو بہت سے دریاؤں کے کنارے جا کے سیر کریں گے مگر مولوی صاحب نے ضد کی اور مجھے میاں جسم میں پھنسا کے روانے کر دیا۔ گھر والے کدھر چلے گئے۔

ممکن ہے مولوی صاحب کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو، وہ تنہا دو بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ صحیح و سلامت ہیں تو مجھے ضرور پوچھنے آئیں گے، شاید آ جائیں یا شاید نہ آئیں، ہو سکتا ہے یہ معلوم ہو گا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون ہے تو وہ دل میں میرا زشت ترین چہرہ لیں گے اور کسی اُلجھن سے بچنے کے لیے میری خیر خبر لینے نہیں آئیں گے اور اگر وہ کوراکو غنڈوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کا امکان بہت کم ہے تو بھی وہ ادھر نہیں آئیں گے، انھیں سارا معاملہ معلوم ہے، وہ مجھ سے کسی طرح اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہیں گے پھر پولیس اُن کے سُراغ میں لگ جائے گی اور کرانگ پہنچ جانے کی صورت میں صاحب کا نہ آنا ہی بہتر ہے وہ بے چارے میری وجہ سے کیوں اُلجھن میں پڑیں۔

علی الصباح سنتری مجھے انسپکٹر کے کمرے میں لے جا رہے تھے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن اب کسی زخم کا احساس نہیں تھا، مردہ آدمی کو زخم کہاں ستاتے ہیں، میں نے شیر انی کو آہستہ سے کوٹھری میں حوالات کی کوٹھری سے بھی اجنبیت محسوس ہو رہی تھی، ایک سنتری نے سلاخوں سے اپنی مالا اندر کرو یا منہ دھو لے۔" اُس نے حقارت سے کہا۔

رسکس کے لیے دھڑوں پہ سنتری اور تھانے دار کے لیے پانی کے گلاس لے کے میں دو تین چپکے منہ پر مارے اور کُرتے سے پانی پونچھ کے پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ سنتری نے پھر ایک گلاس چائے سلاخوں سے میرے ہاتھ میں تھمادی، شکر میں کالا پانی گھول دیا گیا تھا۔ کبھی گلاس میں چائے نہیں پی تھی مگر کبھی حوالات میں بھی نہیں سایا تھا، بسم اللہ کر کے ایک گھونٹ بھرے حلق سے اتارلی۔ گھر یاد آنے لگا۔ بہنیں، بھائی، آپا، امی اور کور دجانے کو راپر کیا گزری ہو گی؟ میں نے اُسے دُکھ ہی دُکھ دیے۔ بے اختیار رونا آ گیا۔ سنتریوں نے بھی میری ہچکیوں کی آواز سن لی، اُنھوں نے افسوس ایسے اُداڈھنگ سے کیے کہ یہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ کون دیکھ رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر میں اپنے حواس بیگانہ ہو گیا۔

سنتریوں نے اندر آ کے مجھے جھنجھوڑا تو مجھے اپنا پتہ چلا۔ عدالت میں چلنا ہے۔" سنتری کی آواز میں پہلے جیسی گرج نہیں تھی، وہ تابکیں ہے، چل اُٹھ۔" اُس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں۔ تھانے کی چار دیواری کے کونے کونے وہ ناظمی وردی ہتھکڑیاں تھیں۔ تھانے کی چار دیواری میں کھڑی ہوئی بند گاڑی کے قریب مجھے دوسرے سے سپاہیوں نے سپرد کر دیا گیا اور اُنھوں نے مجھے گاڑی میں ٹھونس دیا۔

کوئی ایک میل راستہ طے کیا ہو گا کہ میرے پیر میں بیڑی پہنا دی گئی۔ سپاہی نے تاسف سے کہا۔ "کیا کریں بھئی، صورتِ شکل سے تو تم شریف

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟"

"تیری مرضی بھی، مجھ پر ترس آتا ہے۔" سپاہی نے ہمدردی سے کہا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا کم عمر قاتل نہیں دیکھا۔"

میری خاموشی پر سپاہی بھی چپ ہو گیا۔ گاڑی معتدل رفتار سے چلتی ہوئی ایک جگہ رُک گئی، سپاہیوں نے مجھے اشارہ کیا۔ "جلدی نانا جان کے پاس چلو، یا ہو تو بیان بدل دینا، میں پیر صاحب سے تیرے لیے ضرور دُعا کراؤں گا۔" ایک سپاہی نے پیچھے سے کہا۔

وہ میرے اردگرد میرا ڈالے ہوتے ایک بڑی عمارت میں داخل ہو گئے، وہاں غیر معمولی چہل پہل تھی، مجرم، سپاہی، وکیل، مخبر، گواہ، تماش بین، اجنبی خایہ سے، فوجداری، مترجم کا آدمی نظر آ رہا تھا۔ سلام ہوتا تھا جیسے سارا کلکتہ جرم سے اور سزا ہی سے کا فیصلہ ہونے والا ہے، چار سپاہیوں اور انسپکٹر کی گارڈ میں مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہر شخص مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا لوگ اشارے کر رہے تھے اور جن کی نظریں مجھ پر نہیں پڑ رہی تھیں، اُنھیں میرے بیدار کے لیے اُکسا رہے تھے۔ دبی دبی سرگوشیاں تھیں انسپکٹر میرے آگے ہاتھ باندھے اور سر گڑی سے بے نیاز فخر کے ساتھ ہجوم کے درمیان گھورتا ہوا آرام سے گھومنے لگا۔ ایک کمرے میں داخل ہو کے انسپکٹر نے مجسٹریٹ کے سامنے میری فائل پیش کر دی۔ میں قریبی دیوار سے پیٹھ لگا کھڑا رہا۔ فائل کے سرسری مطالعے کے بعد مجسٹریٹ نے عینک اُتار کے میرا جائزہ لیا۔ "یہ ہے وہ؟" اُس نے متعجب ہو کے پوچھا۔ "یہ۔ یہ قاتل ہے؟"

"جی جنابِ عالی!" اُس نے اعتراف کر لیا ہے۔" انسپکٹر کے اشارے پر مجھے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔

اُس نے پھر عینک چڑھا لی اور فائل پڑھنے لگا۔ "یہ بیان اسی کا ہے؟" اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

"جی جنابِ عالی!" انسپکٹر نے مختصر جواب دیا۔

مجسٹریٹ پھر سے تشکیک میں مبتلا رہا۔ "تمھیں مزید تین دن کا ریمانڈ درکار ہے۔" اُس نے انسپکٹر سے کہا۔ "حالانکہ یہ کیس تو صاف ہے۔"

"پوری تفتیش مکمل نہیں ہوئی ہے جنابِ عالی!" انسپکٹر نے مؤدبانہ کہا۔ مجسٹریٹ نے کاغذ پر دستخط کر کے فائل پیش کار کی طرف بڑھا دی۔ مجھے دوبارہ بٹھا دیا گیا تھا، پھر انسپکٹر اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ میں نہیں سمجھ سکا مگر دور سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ پر حیرت بھائی ہوئی ہے، وہ کبھی میری شکل دیکھتا تھا، کبھی انسپکٹر کی۔ فائل کی کارروائی مجسٹریٹ کے بعد مجھے عدالت سے اُٹھا لیا گیا اور جس طرح لایا گیا تھا، اُسی طرح ہتھکڑیوں کے ساتھ کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

پھر کوٹھری کا ایک حصہ روشنی اور پتلی دال سلاخوں کے اندر سے دکھائی دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے شاید بھوک لگی ہو گی، میں نے ہتھکڑیوں والے ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیے۔ "لے جاؤ۔"

"کھا لیں گے ابھی۔" سنتری نے پکار کے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیا کھانا پسند نہیں آیا؟" یہاں گوشت اور چکنی روٹی نہیں ملتی۔ یہاں جی! اس کی عادت ڈالو، آگے یہی کھانا ملے گا۔"

دال اور روٹی شام تک یوں ہی پڑی رہی اور میں ایک کونے میں سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام تک کمزوری میں اور اضافہ ہو گیا، ٹانگیں لرزنے لگتا تھا۔ اچانک بھوک کی اُٹھتی تھی اور آنکھوں میں سترے ناچنے لگتے تھے کبھی ایسا خوف طاری ہوتا کہ سامنے کوئی نظر نہیں آتا تھا، جسم میں سنسنیاں سی بج رہی تھیں، اپنے آپ سے باتیں کرنے کی قوت ہی نہیں رہی تھی، ہر طرف سناٹا تھا، ویرانی اور تنہائی تھی۔ ایسا لگتا تھا یہ دیواریں بھر پر گر جائیں گی اور دیواروں میں اُبھرے ہوئے نوکیلے مجھ پر سے سر پر پڑنے لگیں گے۔

شام کو پھر مجھے انسپکٹر کے کمرے میں طلب کیا گیا اور رات کی ہتھکڑی کی گئی، میرے جوابات سے انھیں مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کو آنا تھا تو اب تک آ گئے ہوتے۔ وہ کیا کہہ کے مجھے مختلف قسم کے سوال کرتے رہے پھر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اس بار اُن کے چہروں پر تشویش کے آثار نمایاں تھے، اُن کی آپس کی گفتگو سے مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ پولیس متعلقین کے گروہ سے کچھ معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اُن کے تبصروں کے مطابق دونوں متعلقین بھگتنے کے اوسط درجے کے بدمعاش تھے۔ اُن کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا گیا، لیکن تسلی بخش معلومات نہیں ہو سکی۔ سب نے شاید لاعلمی ظاہر کی تھی۔ پولیس کو موقعہ واردات سے بھاگنے والے دو بدمعاشوں کا بھی کچھ علم نہیں تھا، اس لیے کہ گن اور ڈکیتی نہیں کیا جا رہا تھا مگر اب سپاہیوں نے صرف مجھے جاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مولوی صاحب اکبر آباد اور باقی دو بدمعاشوں پر اُن کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میرا واقعہ ہی اتنا سنگین تھا کہ وہ کسی دوسری طرف توجہ دے بھی نہیں سکتے تھے ورنہ میں اُن کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے آخری بار دُور سے کراکل ایک جھلک دکھائی دی تھی جو شاید انھوں نے نہیں دیکھی۔ مگر مولوی صاحب کو راکو چھڑانے میں کامیاب بھی ہو گئے اور پولیس نے مطلوبہ بدمعاش سے رابطہ بھی قائم کر لیا تھا، اب کا امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں جائے واردات پر اپنی موجودگی کا اقرار کر لیں گے۔ پھر مجھے بار بار بلایا جاتا رہا اور مجھے بتایا گیا کہ مقتولین کی لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے ظاہر ہے کہ زخموں کے نشانات اُسی چاقو سے لگائے گئے ہیں جس کی ملکیت کا میں نے پہلے ہی اقرار کر لیا۔

ایک دن گزر گیا، میرے معدے میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن دوپہر مجھے جبراً کھانا کھلایا گیا اور شام کو میرے منہ پر طمانچے مارے گئے تاکہ میں اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤں۔ دماغ مجھے نرغے کھاتے رہے اور مجھ پر تشدد بھی کرتے رہے لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے پہلے بیان پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے چیخ چیخ کر اُن سے کہا۔ "جب میرا

اعتراف کر لیا ہے تو تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تمہارے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتے ہیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے تم جو سزا مناسب سمجھتے ہو، مجھے دے دو بار بار کیوں پریشان کرتے ہو۔" میں نے پہلی بار ان سے تلخی کے ساتھ بات کی۔

"تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"تم مر جاؤ گے۔"

"مجھے اب زندگی کی تمنا بھی نہیں ہے۔"

"لڑکے!" ایک ادھیڑ عمر افسر نے شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "پولیس تمہاری دوست ہے تمہیں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ ممکن ہے تم ہمیں کوئی ایسا نکتہ بتا دو جس سے تمہاری سزا کم ہو جائے، ہم عدالت میں تمہاری سفارش کر سکتے ہیں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"کیا تمہیں کسی کا خوف ہے؟ کسی بدمعاش کا۔" اس نے لالچ دے کر پوچھا۔ "تم یقیناً کچھ چھپا رہے ہو۔"

وہ خوف کی بات کر رہا تھا۔ اگر میں اسے بتا دیتا کہ مجھے کورا کا خوف ہے، کورا جو ایک معصوم اور ستم رسیدہ لڑکی ہے جس کے لیے میں نے گھر چھوڑ دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی جسے چھپانے کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ کیا میں اسی کو دہشت زدہ کروں؟ میں اپنے خاندان کی رسوائی کا سبب بنوں اور اپنے باپ کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑوں؟ میں مولوی صاحب کو پریشان کروں کہ انھوں نے میرے ساتھ سلوک کیا تھا میں نے دو قتل تو کیے ہی تھے، کانسٹیبل کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے تین گواہ موجود ہیں خود پولیس گواہ تھی۔ زیادہ باتیں کرنا فضول تھا، جو ہو گیا تھا، وہ تو ہو گیا تھا اور ممکن تھا میں انھیں بتا دیتا، اگر مجھے کسی طرح یہ یقین ہو جاتا کہ کورا کو ٹھنڈے ہی لے کے گئے ہیں، مولوی صاحب ناکام ہو گئے، ایک سزا وہ پکڑا لیتے تو دور تک پہنچ جاتے۔ بات گیا تک جا پہنچتی۔ میں نے انھیں اپنا سراغ نہیں دیا۔

تین دن بعد مجھے دوبارہ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ میری حالت ان تین دنوں میں مسلسل جاگنے اور فاقے کرنے سے ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ مجھے پہچاننے میں دشواری ہوتی۔ "کیا یہ وہی لڑکا ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے اسے بہت مارا ہے اور کھانا بھی نہیں کھلایا۔"

"ہم نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے جناب عالی! لیکن یہ بہت ڈھیٹ لڑکا ہے، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔" انسپکٹر نے اپنی تلخی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

وہی سوال، وہی جواب، آخر مجسٹریٹ نے فائل کا بغور جائزہ لینے کے بعد دستخط کر دیے، پیش کار نے مہر لگا دی اور مجھے حوالات سے جیل منتقل کر دیا گیا۔

حوالات کے ماحول سے جیل کی فضا بہتر تھی۔ اس چار دیواری میں آ کے میں نے سکون کی سانس لی، میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور مجھے ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھری میں پہلے سے ایک شخص مقیم تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک ابھری۔ میں چپ چاپ ایک گوشے میں سمٹ گیا۔ وہ اپنی بیڑیاں مکھاتا ہوا میرے پاس آیا، میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے درشتی سے میری ٹھوڑی اور پیشانی اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ لاڈلے تم بھی یہاں آ گیا، میری آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ "کمال ہے، تو نے اتنی عمر میں کمال کر دیا۔ کیسے مارا؟" وہ تجسس سے بولا۔

"خود کو مار دیا۔"

میری آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ میرے قریب کھسک گیا اور میرے کانوں کے قریب منہ لاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "دیکھ (وہ) "مین"

"مین ہو؟" وہ اچھل پڑا۔ "شاباش، اپنی قسمت بھی کیسی نیارتی ہے۔ میرے رب!" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی ٹیڑھی قسم کا آدمی ادھر نہ ڈال دیا جائے۔ جی دار آدمی دیا۔ تیرے صدقے ہاتھ میں مالک۔" اس نے ایک کے میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میں نے گھبرا کے اسے دیکھا، وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا ہو گیا تھا لاڈلے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جھجکتے کہا۔

وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ "بالکل نیا نیا ہے زندگی میں نیا نیا ہے۔ سب چیز تیری نئی معلوم ہوتی ہے چاہے اچھل میں بھید بھاؤ کیسا۔ بتا دے میری جان بتا دے ایمان سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اب تو اس کوٹھری میں آ گیا ہے تو اپنے کو یار سمجھ۔ دل چاہتا ہے تو پیلے دے ہم بعد میں تجھے بڑی ہنسی آئے گی، تو میری طرح ہنسے گا۔ تجربے کی بات ہے۔"

"تم کون ہو؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

اس کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ "واہ رب واہ۔" پوچھتا ہے تم کون ہو؟ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ ارے جو تو ہے وہی میں ہوں۔ ہم دونوں کی ایک ذات ہے ایک ہی دھرم ایک ہی مقدر۔ تو بھی یہ لڑکا تو کہاں کا ہے؟"

وہ عجیب آدمی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے اسے سر سے پیر تک دیکھنے کی کوشش کی وہ میری طرح جیل کا لباس پہنے ہوئے تھا اس کے پیروں میں بھی بیڑیاں تھیں میرے پیروں میں بھی۔ شاید اس نے داڑھی بہت دن سے نہیں بنائی تھی۔ اس کے بال بھی زرد ہو گئے تھے۔ "تم یہاں کیسے آئے؟" میں نے اپنے ہونٹ ہلائے اس سے سوال کیا۔

"خوب میرے بھولے بادشاہ۔" اس نے میرے گال کی چٹکی لے "اسی سوال سے تو دھوکا کھا گیا ہے ارے لاڈلے! اس نے اپنی

روک کر کہا۔ "یہ جگہ انھی لوگوں کے لیے بنی ہے جو کچھ کر کے آتے ہیں کچھ کھیل دکھا کے آتے ہیں ایک دو کو مار کے آتے ہیں۔"

"تو کیا تم بھی، تم نے بھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

"مگر تو مجھ سے بازی لے گیا۔ مجھ سے تو ایک آدمی بھی ٹھیک طرح نہ مرپایا۔ تو نے بھلا کیسے ان نازک ہاتھوں سے تین کو اتار دیا؟"

"میں نے تینوں کے پیٹ میں چاقو مار دیا۔"

"ارے واہ۔" اس نے کھل کھلا کے کہا۔ "جواری تھے؟"

"نہیں۔" میں نے منہ بنا کے کہا۔

"پھر کوئی دھوکا کیا تھا؟" اس نے آنکھ مار کے کہا۔ میں نے بھی بیان دہرانا شروع کیا جو میں نے پولیس کو دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا جب کانسٹیبل کے پیٹ میں چاقو اتارنے کی بات آئی تو اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "ایک بار پھر سے سنا میرے شیر!" اس نے مجھے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آتا۔" میں نے کانسٹیبل والا واقعہ اسے دوبارہ سنایا۔ "تو نے تو بار بڑے بڑے استادوں کی ایسی کی تیسی کر دی مگر تو بتا ان دو شہدوں نے تجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟ دیکھ کچھ چھپانا نہیں، یہ تھانا نہیں ہے یاروں کا گھر ہے۔"

"مجھے خود معلوم نہیں اچانک انھوں نے مجھ پر وار کر دیا۔"

"ارے کوئی وجہ تو ہو گی یا وہ سالے پاگل ہو گئے تھے۔"

"پتہ نہیں، وہ مجھے کیا سمجھے تھے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں بتاتا ہوں، وہ تجھے لونڈا سمجھے تھے۔ تو نے ضرور بھگوا کیا ہو گا لاڈلے! اڑنے اکھیں عکما دیا ہو گا۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابے جانے دے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دریا کا کنارہ ہو، تنہائی ہو، رات ہو اور نیت خراب ہو۔ تو جو بھی نہ ہو، تھرا دے۔"

"تم سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ اپنے کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "تو سچ بول رہا ہے، خراب نہیں تو پھر بتا دے گا، شرم آتی ہے۔"

"کیسی شرم؟"

"ہیجڑہ ذکر چھیڑ، یہ بتا کیس میں جان کتنی ہے؟"

"میں اعتراف کر چکا ہوں۔"

"کیا؟ یہ کیا کچی بات کہہ دی تو نے۔" وہ بگڑے ہوئے تیوروں سے بولا۔ "بتا تو نے حامی بھری ہے؟"

"ہاں کانسٹیبل کے قتل کے وقت تین اور کانسٹیبل بھی موجود تھے، انکار کا کیا سوال تھا۔"

"انکار کا کیا سوال تھا۔" وہ برہم ہو کے بولا۔ "ابے ہم تو پھانسی کے پھندے پر بھی انکار کرتے رہیں گے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"حاصل وصل کیا، ذرا آنکھ مچولی رہتی ہے اور کبھی کبھی لگ جاتا ہے۔ بیان بدل دیتا۔" اس نے میرے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم جیل میں پہلی بار آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی بار!" وہ قہقہہ لگا کے بولا۔ "تو ابھی مجھے نہیں جانتا، بے عزتی کرتا ہے۔ کھڑے پیر تو اپنا گھر ہے۔ اس بار ذرا اوچھا پڑ گیا تو اس بدبودار کوٹھری میں رہنا پڑ گیا ہے، باہر بڑی یاد آ رہی ہے۔ ارے سرکاری وکیل نے جان لڑا دی ہے لیکن اپنا ٹنڈا وکیل بھی کچھ کم نہیں ہے، اپنا کام ہو گیا تو دانے دانے کو ترسے گا۔"

"گویا تم بچ جاؤ گے؟"

"لے اگر نہیں گے نہیں تو بچنے کی آس کیوں توڑوں۔"

"کیا تمہارے خیال میں تم بچ سکتا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کوئی وکیل کیا ہے؟"

"میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔"

"دیکھ پٹھے سے بات کریں گے۔ سالا کیا واقعہ پیچ جانتا ہے، سرکاری وکیل کو توشی کا ناچ نچا دیتا ہے۔ ایسے ایسے پائنٹ ڈھونڈ کے لاتا ہے کہ بھری عدالت چکرا کے رہ جاتی ہے۔"

"مگر۔" میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے نہیں بچائے گا۔"

"ایسی تا امیدی؟" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کوشش کرنے میں کیا حرج ہے، تو دے کر آنے نے میں بات کر تا ہوں۔"

"نہیں، کسی سے بات نہ کرنا، پھر بہت سی باتیں پھیلیں گی۔"

"زندگی بڑی چیز ہے لاڈلے! اتنی جلدی گھبرا گیا؟ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے اپنا حال دیکھ آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ پھر بھی جینے کی آرزو ہے۔ کچھ شوق شغل کرتا ہے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں پی۔"

"بالکل کورا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تم بار بار ہنستے کیوں ہو؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لاڈلے! کیا ہنسنا بھی بند کر دیں، یہ ہنسی ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ان ساری باتوں ہنسی میں اڑا دیتے ہیں اور نہ اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ بدیا۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولا۔ "بڑا رلاتی ہے پیارے! بہت ستاتی ہے یہ، میں اسے ہنسی میں ٹال دیتا ہوں۔"

اس کا نام عجیل تھا، چھوٹے چھوٹے بالوں کی داڑھی اور گول مونچھوں والا بھلا آدمی گرج دار اور لہجہ تضحیک آمیز ہنسی بھی زہریلی۔ میں شروع شروع میں اس سے جھجکتا رہا، مجھے اس سے خوف آتا تھا لیکن پہلے ہی دن شام کو اس نے اپنی باتیں کیں کہ مجھے اس کے متعلق اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ ایک قتل کر کے آیا تھا۔ ٹھٹھے کے ایک بدمعاش کا قتل، وہ خود بھی بہت بدمعاش

تھا اور غنڈوں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ۔ جمیل پٹھے سے تعلق رکھتا تھا، پٹھے میں اس کے ساتھ پے در پے ایسے حادثے پیش آتے کہ اس نے اپنا آبائی شہر چھوڑ دیا اور کلکتے چلا آیا اور یہاں ترقی کرتے کرتے وہ بدمعاشوں کا بادشاہ بن گیا۔ وہ اونچی اونچی کڑوی کسیلی باتیں کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ بار بار جیل آتا تھا۔ یہاں کے سب لوگ اس سے واقف تھے، ہماری کوٹھری پر تعینات سنتری بھی اسے اچھی طرح جانتا تھا، جب رات کا کھانا آیا تو سنتری نے پہلے سے ایک تھیلا اس کی طرف اچھال دیا۔ اس میں سموسے رکھے تھے۔ جمیل نے کھانے پر مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور چار دن بعد نہ جانے کیوں میں نے بہت اطمینان سے جیل کا کھانا کھایا۔ پتلا شوربہ، ادھ پکی روٹیاں اور دال پانی کے تھے۔

رات کو ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ میرے ساتھ جمیل کے رویے میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ ہم اپنے بازوؤں کا تکیہ بنائے ایک دوسرے کے سامنے کروٹ لیے لیٹے تھے۔ اگر جمیل نہ ہوتا تو مجھے جیل کے آداب سیکھنے میں بڑی دشواری ہوتی اور اس مختصر تاریک کوٹھری میں میرا دم نکل جاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے کبھی گم ہو جاتا ہے اور چھت گھورنے آہیں بھرنے لگتا ہے پھر اچانک ہڑبڑا کے مجھ سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے بارے میں اسے کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے لگتا تھا۔ اس نے میرا نام بھی نہیں پوچھا تھا مجھے مسلسل لاڈلے کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں آدھی رات کے وقت اٹھ کے کوٹھری میں ٹہلنے لگا، بیڑیوں کی آواز سے سنتری چونک گئے۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ شاید جمیل بھی جاگ رہا تھا، سنتری کی آواز سن کے اس نے ایک عریاں انگوالی لی۔ سناٹے میں اس کی نقاہت بھری کھانسی کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ اس نے گھٹے گھٹے لہجے میں آواز بلند کی۔ "کیا ہے سنتری! کیوں بگڑ رہے ہو؟ ابھی نیا نیا ہے، پہلی رات اسی طرح گزرتی ہے، رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سو جا لاڈلے! سو جا۔ یہ تو باہر ہی رہی ہے حکم بند کرتے رہتے ہیں، اندر آکے دیکھیں تو اپنی یاد آجائے۔ زمین کتنی سخت ہوتی ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ سیلن اور تاریکی کی وجہ سے کوٹھری میں طرح طرح کے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔ جمیل بھی میرے قریب آکے بیٹھ گیا "لاڈلے!" اس نے نرمی سے کہا۔ "تو تو واقعی کوئی شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نام اور شہر میں کیسے پھنس گیا؟"

"بس جو لکھا تھا، وہ پورا ہوا۔" میری آواز بھرا گئی۔

"لے یہ چادر اوڑھ لے کیڑوں سے بچا رہے گا ورنہ تیری ناک جلد خراب ہو جائے گی۔ اب گھر کے رستے کا خیال چھوڑ دے۔"

"کیسا گھر؟" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اس نے اپنی چادر میرے جسم پر ڈال دی۔ یہ سنتریوں کی مہربانی ہے رات کو چادر مجھے دیتے ہیں اور صبح ہوتے ہی واپس لے لیتے ہیں۔"

"تمہیں پھر تم کیا اوڑھو گے؟" میں نے پوچھا۔ "تم سچ کہتے ہو، مجھے سب چیزوں کا عادی ہونا چاہیے۔" میں نے چادر اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"اب جی مت جلا لاڈلے! تکلف بند کر، حوالات میں کمبل مان لیا کر، مجھے حکم دینے کی کچھ عادت ہوگئی ہے۔"

جمیل اور میں یوں ہی ساکت و صامت رات گئے تک بیٹھے رہے۔ دوسرے دن تعطیل تھی۔ اس لیے مجھے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ جمیل نے بتایا کہ اب مجھے سیشن کورٹ کے سپرد کیا جائے گا، بیانات، جرح اور پورے واقعے کی الگ الگ پیشی ہوگی۔ وکیل عدالت میں عورتوں کی طرح ایک دوسرے کو کوستے دیں گے اور ہیجڑوں کی طرح عدالت کے اکھاڑے میں ادھر پھدکتے رہیں گے۔ وہ مجھے کچہری کی اصطلاحیں اس طرح سمجھا رہا تھا جیسے کوئی وکیل ہو۔ دوسرے دن اس کا بڑا وکیل اس سے ملنے کے لیے جیل آیا۔ وہ واقعی بڑا تھا، سیاہ فام اور پستہ قد۔ اس کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے اور ناک پر موٹی سی عینک رکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو بڑا وکیل جمیل سے اس کے کیس کی پیچیدگی کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ جمیل کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ پھر جمیل نے اس سے میرا تعارف کرایا، وکیل میری مختصر روداد سن کے کچھ دیر سوچتا رہا۔ جمیل نے مجھے کہنی ماری۔ "دیکھا، کوئی پائیدہ لا رہا ہے پت کرے گا، سرکاری وکیل کو ناک چنے چبوائے گا، چھوڑا ہے مگرمچھ نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے جسم میں عقل ہی عقل بھری ہوئی ہے۔"

چند لمحے غور و فکر کرنے کے بعد بڑے وکیل نے مجھے مشورہ دیا کہ میں عدالت میں اپنے بیان پر جما رہوں اور بہت کم بات کرنے کی کوشش کروں۔ اس پر جمیل وکیل کو برا بھلا کہنے لگا کہ وہ غلط مشورہ دے رہا ہے۔

"دیکھ بڑے صاحب! کہتی ہیں اپنا بیان بدلتا رہ، سیدھا جج کے دل میں جا کے لگے اور وہ ترس کھا کے اسے ایک دم رہا کر دے۔"

"یہ ناممکن ہے، جمیل!" وکیل نے سکون سے کہا۔

"ناممکن ہے؟" جمیل طیش میں آکے بولا۔ "مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ وکیل کا یہی جواب ہوگا۔ اس نے میرے معاملے میں دلچسپی نہیں لی۔ جمیل اس پر گرم ہوتا رہا اور اسے گالیاں دینے لگا۔ بڑا وکیل جمیل کا منہ خوب بند کرتا تھا اس لیے اپنا بیگ بند کے چپ چاپ چلا گیا۔

اگلے دن مجھے اور جمیل دونوں کو ساتھ ہی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ کچہری میں ہم جدا ہو گئے۔ مجھے ایک جج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ پھر پیشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرکار کی طرف سے مجھے اپنی صفائی کے لیے ایک وکیل دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا، اس نے کچھ اگلوانے کے لیے مجھ سے جرح بھی کی، لاچاری سے بھی پوچھا اور غصے سے بھی لیکن میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا رہا اور ان سوالات کی تکرار ہوتی رہی جو جمانے میں کیے گئے تھے۔ ایک ایک نکتے پر بحث ہوتی، تہوں کا تہیل لگا ہوا نے میرے خلاف بیانات دیے، چاقو اور مالا دونوں چیزیں عدالت میں پیش کی گئیں۔ چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات تھے اور مالا جوہریوں کی رپورٹ کے مطابق پچھتر موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا تھی۔ سچ کی ہدایت پر مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا، جس نے مختلف طریقوں اور آلوں سے میرے جسم کا معائنہ کیا۔ پیشی والے دن جمیل مجھے ریزنگ کھیلا اور میری ہمت بندھاتا رہتا۔ جمیل کے کرخت لہجے سے مجھے اب ایک انسیت سی ہو گئی تھی۔ ادھر میرا وکیل مقدمے کو نئے نئے رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک تم مجھے پوری تفصیل سے واقعہ نہیں بتاؤ گے میں اندھیرے میں رہوں گا اور صحیح طرح تمہاری حمایت نہیں کر سکوں گا۔ پیشیاں، سوالات اور بیانات ہوتے رہے۔ بیس دن گزر گئے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میری جسمانی اور ذہنی حالت نارمل تھی لیکن اس نے میری رپورٹ میں کوئی ایسی بات ضرور لکھی تھی جو کئی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اس نے لکھا تھا کہ مجھے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن میں عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قوت برداشت اور دماغی صلاحیتیں رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے میری عمر سولہ سال سے زیادہ بتائی تھی۔ سرکاری وکیل کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، ان کے ساتھیوں کے بیانات، جن باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا، دونوں وکیلوں کے درمیان بھی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے کالج کا کوئی تقریری مقابلہ ہے جس میں سب سے اچھی تقریر کرنے والے کو انعام ملنے والا ہے اور موضوع میری ذات ہے۔

میرے وکیل نے سارا زور بیان اس نکتے پر صرف کیا تھا کہ میں نے جھنجھلاہٹ سے واقعہ کرتے ہوئے پہلے دو آدمیوں کو قتل کیا، پھر اکیلا ہشت کا اثر تھا کہ مجھے پولیس والوں کی بیٹ پر بھی شبہ ہوا۔ گویا میرے لیے یہ بیت ٹرم تک بات تھی۔ میری زبان سے اپنے بارے میں ایسے لفظ ادا نہیں ہو سکتے تھے مگر جمیل اس کے بڑے وکیل اور اپنے وکیل صفائی کے ہمدم اور پیر میں اپنے بیان میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ بڑی مشکل سے عدالت میں میری زبان کھلی۔ بات بھی یہی تھی کہ میں نے اپنی مدافعت میں دھندلکوں پر چاقو چلایا، وہ مجھ سے کود کر یا کوئی مجھ سے بھی کود کر چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف دو سامنے تھے اگر چار ہوتے اور دس بھی ہوتے تو میں سب کے جسموں میں چاقو اتار دیتا۔

وکیل صفائی عدالت میں میرے ماضی کے متعلق عدالت کی رائے بہت کم اور مثبل نظر آنے لگی۔ میں ٹھہرے میں حیرت زدہ ہو کے اس کے دلائل سنتا رہتا تھا۔ اس نے بار بار میری عمر کی طرف توجہ دلائی، میرے چہرے کی شرافت پر اصرار کیا، جج سے اپیل کی کہ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرے۔ اس نے مجھے رلانے کا ستایا ہوا ایک مظلوم شخص قرار دیا، جو اپنا دکیل بھی نہیں کر سکتا تھا، اس نے ایسی جوشیلی باتیں، اتنے پُر اثر انداز میں کیں کہ اگر میں جج ہوتا تو اسے ضرور انعام دیتا۔ بڑا وکیل بھی شروع میں اس کے ساتھ شامل تھا۔ وکیل صفائی نے عدالت میں شکایت کی کہ ممکن ہے میرا موکل طویل عرصے پہلے کسی زبردست حادثے میں اپنی یادداشت کھو چکا ہو اور اب ماضی کے متعلق جو کچھ سنے وہ نقوش اس کے ذہن میں رہ گئے ہوں یا اسے اپنے معزز خاندان کی نیک نامی کا اس قدر شدید احساس ہو کہ وہ اس شرمناک واقعے میں ان اہم ناموں اور شخصیتوں کو رسوائی سے بچانے کے لیے اپنا پرانا مادہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اس نے بھگوڑوں اور رسوائیوں سے بچنے کے لیے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی حیثیت بھی مشکوک کر لی ہے۔

اس نے عدالت پر زور دیا کہ اس کے موکل کا کوئی خراب کارڈ ریکارڈ موجود نہیں ہے جبکہ مقتولین کا ماضی اور کردار بے حد گھناؤنا تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکے تھے اور متعدد مقدمات میں ماخوذ تھے، بدمعاشوں کے ساتھیوں اور رشتے داروں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وکیل صفائی نے اس نکتے کی طرف جج کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی۔ اس نے پُرزور آواز میں کہا۔ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے موکل اور مقتولوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے اسے دریا کے کنارے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کے غلیظ کردار کی رگ جاگ اٹھی۔ وہ وحشی ہو گئے۔ جب سرکاری وکیل نے میرے پاس چاقو کی موجودگی کا ذکر کیا تو وکیل صفائی نے اس گفت طلب کر دیا کہ وہ چاقو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے رکھا تھا کیونکہ میں دنیا میں تنہا تھا۔ میرے وکیل نے اصرار کیا کہ غنڈوں نے اپنے شرمناک منصوبے میں ناکامی کے بعد مجھ سے مالا چھیننی چاہی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ آخر مجھ پر باقاعدہ جرح کا وقت آیا۔ سرکاری وکیل نے مجھ سے جرح شروع کر دی تھی۔ میں جیسے بھی تھک گیا تھا، پھر وہ مجھ سے جانسوز سوالات کرنے لگا۔ جہاں تک بنا، میں شرماتا اور جھجکتا رہا بہت مختصر جوابات دیتا رہا لیکن پھر جو کچھ سرکاری وکیل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے؟ وہ اس شخص سے مخاطب تھا جسے زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کے سوال و جواب بہت جارحانہ ہو گئے تو میں نے بھری عدالت میں جج کو کہا۔ "ایسے سوال مت کرو۔ مجھے پھانسی دے دو، میں قتل کا اعتراف کر چکا ہوں۔ ایک آدمی مرت قبول کرنے کے لیے تیار ہے، تم اسے مزا دینے سے کیوں کترا رہے ہو؟ موت کے لیے برسیں کیوں ادا کی جا رہی ہیں؟ اب بہت ہو چکا، بس کرو۔ بس کرو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سیدھی اور صاف بات ہے، تنگ کیوں کرتے ہو؟"

میں نے تین قتل کیے ہیں۔ مجھے اس کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ میں نے جلاد کے عدالت کے سربراہ سے التجا کی۔ مجھے خاموش رہنے دیا جائے۔ مجھ پر رحم مت کرو۔ میں نے چلا چلا کے عدالت سر پر اٹھا لی۔ مجھے خاموش کرنے کے لیے جج کو کئی بار ہتھوڑی مارنی پڑی۔ میرا وکیل مجھے سر تھامے کے اشارے کر رہا تھا۔ عدالت میں اس آخری دن میری حالت خاصی خراب ہو گئی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے روتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے پھانسی دے دیں اور ادھر اُدھر کے فضول سوالوں میں وقت ضائع نہ کریں۔

جج نے فیصلے کے لیے چھ دن بعد کی تاریخ ڈال دی تب مجھے قرار آیا۔ میں نے جیل پہنچتے ہی یہ خوش خبری جمّل کو سنائی۔ وہ مقدمے کی ساری کارروائی کے درمیان مجھے مشورے دیتا اور تبصرے کرتا رہا تھا۔ ادھر خود جمّل کا مقدمہ طول اختیار کر گیا تھا۔ میں اُس کے بعد جیل میں آیا تھا۔ میرے مقدمے کا فیصلہ اُس کے فیصلے سے پہلے ہونے والا تھا۔ مجھ پر اُس کی مہربانیاں بتدریج بڑھ رہی تھیں۔ ان میں بیشتر میں ہم کیا باتیں کر سکتے تھے۔ جمّل نے اپنی کالی زندگی کے ہزاروں واقعات مجھے سنائے۔ اس دوران میں اُس نے میرا ایسا خیال رکھا تھا جیسے میں اس کا مہمان ہوں۔ اُس نے میرے متعلق خود ہی بہت سی رائیں قائم کر لی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ میں کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ سنتری بھی اُس کی وجہ سے میرا خیال رکھنے لگے تھے اور خود میں نے بھی کبھی آنکھیں پرنیاں نہیں کیا تھا۔ میرا فیصلہ ہونے والا تھا۔ جمّل اور سنتریوں کو حیرت تھی کہ میرے چہرے پر فکر اور تشویش کی کوئی علامت کیوں نہیں ہے جب کہ ممکن ہے مجھے موت کی سزا دے دی جائے۔ میں ہنس کر انھیں جواب دیتا: "موت کیا چیز ہے۔ کون شخص ایسا ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے۔ اس پر جمّل مجھے بے اختیار گلے سے لگا لیتا اور میرے ہاتھوں اور پیشانی کو بوسے دیتا۔ "تو مرنا ہے جگرا ہے لڑنے؟" وہ مجھ سے کہتا۔ "تو نے تو جمّل کو بھی مات کر دیا۔"

جمّل ایک ایک دن گن رہا تھا۔ جیسے میرے نہیں اُس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا ہو۔ جیسے مجھے نہیں اُسے موت کا سامنا کرنا ہو۔ آخری دو دنوں میں میری حالت غیر سی ہونے لگی۔ شاید فیصلے کے بارے میں جمّل کے بار بار ذکر کرنے سے مجھ پر اثر ہونے لگا تھا۔ میں کچھ اُداس اُداس اور خاموش خاموش رہنے لگا۔ فیصلے میں ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اور وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے کہ جمّل کہنے لگا۔ "لاڈلے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تیری طرف سے کرتی اور موت قبول کر لے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"مطلب یہ ہے شہزادے کہ اگر ایسا ہو جائے کہ تیری جگہ میں پھانسی کے تختے پر چلا جاؤں اور تو آزاد ہو جائے۔"

"اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو میں اسے قبول نہ کرتا۔"

"پتہ نہیں! اپنا کیا فیصلہ ہوتا۔ مُنڈا کہتا ہے کہ وہ مجھے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دے گا۔ مُنڈا کہتا ہے تو سچ ہی کہتا ہوگا۔ سانے کی زبان میں تاثیر ہے جو کہہ دیتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ مجھے صاف بچا لے جائے گا لیکن اگر تو زندہ نہ رہا تو مجھے اپنے فیصلے سے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تیرے بچائے وہ مجھے سزا دے دیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں موت سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ اسے کہو اور ترکیب کرلوں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیسی خرافاتوں کی باتیں کرتے ہو۔"

"لاڈلے! اگر تو مارا گیا تو سمجھ لے مرا مقدر اب جاری نہیں رہا۔"

"یہ تو کل پتہ چل جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ آخر کوئی فیصلہ تو ہو جائے گا۔ اِدھر یا اُدھر۔"

"لاڈلے! اگر تمناؤں کے لیے کھڑکیاں نہ ہوتیں تو میں تجھے نذرانہ دلاتا اور شہزادی میرے لڈو سے تجھے اس طرح نہ چھوڑ دیتے کہ پولیس کو تیاری کی خبر ملتی۔"

"جو باتیں ہو نہیں سکتیں اُن پر سوچتے کیوں ہو؟"

اُس رات ہم دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آئی۔ رات سے دل بوجھل طاری ہو گیا تھا۔ صبح ہوئی تو میں دُگدگانے لگا اور میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ جمّل نے گلے لگا کے مسکراتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ ایک ایک پل مشکل گزر رہا تھا۔ کوئی میرے جسم سے طاقت کھینچے لے رہا تھا۔ میں خود کو لاکھ سمجھاتا تھا کہ جو ہوگا، اُسے بہت سے قبول کرنا چاہیے۔ اُس دن عدالت لگانے والی گاڑی کی رفتار بھی شاید بہت سُست تھی۔ ہر طرف ایک شور سا مچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سامنے جسم میں سنسناہٹ تھی۔ ایک سرد لہر اُٹھتی تھی، گزر جاتی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب گاڑی عدالت کے احاطے میں کھڑی اور کب مجھے جج کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ میں گم سم سا جان سا بیٹھا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے سنبھالا اور نہ میں زمین پر اپنا توازن برقرار رکھ پاتا۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جب جج نے اپنا فیصلہ سنانا شروع کیا۔ عدالت میں غیر معمولی خاموشی طاری ہو گئی۔ سر شخص دم بخود تھا لیکن میرا سارا وجود لرز رہا تھا شاید میں بہرا ہو گیا تھا۔ شاید جج مجھے کی رعایت اور مختلف مدارج کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ مجھے ہوش اُس وقت آیا جب جیل کے ایک سنتری نے میرا بازو جھنجوڑ کے مجھے چونکایا۔ جج کہہ رہا تھا۔ "قتل کی ناقابلِ شہادتوں پہلے، دقتوں کے گزشتہ ریکارڈ، ڈاکٹری رپورٹ اور مجرم کی کم عمری دیکھتے ہوئے عدالت اس کے لیے چودہ سال قید بامشقت کی سزا تجویز کرتی ہے۔ دونوں سزاؤں کا اطلاق ایک ساتھ ہوگا۔"

جیسے ہی جج نے فیصلہ سنایا، وکیلِ صفائی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ "میں ان حالات میں تمھارے لیے یہی کر سکتا تھا۔ تمھیں زندگی مبارک ہو۔" عدالت میں بیٹھا ہر شخص میری طرف لپکنے لگا لیکن سپاہیوں نے مجھے اُن سے ملنے کا موقع نہیں دیا۔ کمرۂ عدالت میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا تھا۔ بڈھے وکیل سے سپاہیوں کی پرانی شناسائی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے جیل کی گاڑی تک پہنچانے آیا اور مبارک باد دیتا رہا۔

"میں جمّل کو جا کے بتاؤں گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔"

"میں خود جمّل کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب تمھاری جگہ بدل دی جائے گی۔ جمّل سے تمھاری ملاقات نہیں ہو سکے گی شاید وہ تم سے پھر بھی آ کے ملے۔"

۱۴ سال قید بامشقت۔ موت کے بجائے زندگی، آدھی زندگی زنجیروں میں بند زندگی۔ ۱۴ سال کس نے دیکھے ہیں؟ ۱۴ سال کے بعد کیا ہوگا؟ وہ سب خوش تھے کہ میں موت سے بچ گیا لیکن مجھے زندگی بھی تو غم ہی غم کی کچھ زیادہ تھا۔ ۱۴ سال تک جہنم کا عذاب زندہ درگور۔ اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں گا کہ کوئی اس دنیا میں کہیں ہے اور کہاں ہے؟ یہ مجھے شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ کورا کاغم سینے میں چھپائے زندہ رہوں گا۔ صرف ایک رات کے سفر کے فاصلے پر میرا گھر اور گھر والے موجود ہیں۔ مجھے ستانے کے لیے زندگی کی سزا دی گئی ہے میرے ساتھ ایک بے رحم مذاق کیا گیا ہے۔

"لڈو!" وکیل کی بات درست تھی۔ میری جگہ تبدیل کر کے مجھے عام قیدیوں کی بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کا پہلا تجربہ ہی ناخوش گوار ثابت ہوا۔ کوٹھری میں مجھے عمرِ قید ملا تھا مگر یہاں بھانت بھانت کے لوگ پڑے تھے۔ میری آمد پر سبھی نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ایک نوجوان قیدی میرے جسم کے چاروں طرف گھوم کے میرا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے قیدی یہ تماشا دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے غصّے سے کہا۔ جواب میں اُس نے ایک بے ہودہ جملہ کہا اور ہاتھ بڑھا کے میرے بال پکڑ لیے۔ پھر غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا اور بال پکڑے پکڑے اُس نے چہرہ تمام قیدیوں کے سامنے کیا اور میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میرا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے پیٹ میں گھٹنا مار نے میں مجھے کچھ دیر نہیں لگی۔ وہ چیخا اور بلبلاتا ہوا فرش پر گر گیا۔ پھر جیسے ہی اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی میں نے اُس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی۔ میرے گھونسوں اور لاتوں نے اسے تباہ حال کر دیا۔ ایک دوسرا قیدی اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھا مگر قیدیوں نے اسے روک لیا۔ وہ تجسّس اور حیرت سے اپنے ساتھی کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہتے ہیں کہتے: سبحان اللہ سبحان اللہ۔" ایک شخص نے آگے بڑھ کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا ہاتھ بلند کر کے مجھے فتح یاب قرار دیا۔ قیدیوں میں تالیاں بجنے لگیں جس نوعمر قیدی کو میں نے گرایا تھا، اُسے اُٹھا کے میرے پاس لایا گیا تھا۔ اُس کے مُنہ سے خون جاری تھا۔

"چلیے ہاتھ ملائیے صاحب زادے ہاتھ ملائیے۔"

اُس نے بہت نفرت اور غصّے سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "جناب کا نام؟" ادھیڑ عمر کے شخص نے شائستگی کے ساتھ پوچھا۔

"منظور خان۔" میں نے بے رحمی سے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ! کیا ہاتھ رکھتے ہیں جناب نے۔ خادم کو عظمت خاں عرف نصیب میاں کہتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کب تک قیام ہے گا؟"

"سات سال۔" میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

یہ اُس کے تمام قیدی میرے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ "حضور اس گی جیل میں گئے ویرانے دو چار۔" نصیب میاں نے کہا۔ "جناب سیاں نے کیا؟"

"پوری دنیا تیں" تے جواب دیا۔

"آہا! کیا شاعرانہ بات ہے۔ پھر اُس نے نوجوان مختلف قیدیوں کا تعارف کرایا۔ یہ بندھ ہے یہ ساسے ہے یہ چھین میاں ہیں۔ یہ گجرے یہ لیلا ہے۔ نام اُس کا لیلا ہے مگر کام مجنوں کا کرتا ہے۔ یہ ہر چرن ہے۔ اس نے ہر چرن کہتے ہیں۔ یہ تیتا ہے چاقو کے فن میں ماہر ہے۔ شوقین ہے گانا خوب گاتا ہے۔ اور اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ فقیر ہے۔ چور ہے۔ یہ اُن جیب تراشی کے فن میں یکتا۔ یہ گوش ہے ایسے ایسے چغیرے بدتن ہے اگر اُن کی شرما جائے۔ یہ لالہ ہے دولتی مار ہے اور یہ جسے جناب نے شکستہ ہاتھ دی ہے اس کا نام کاتے ہے۔ اس بیرک میں ایک سے ایک نامی گرامی شخصیت موجود ہے۔ اب اپنے بارے میں بتائیے۔ جناب کا آنا کیسے ہوا؟"

"قتل۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا خوب! وہ تو جناب کے تیوروں سے نظر آتے ہے کس کا بھانجی ہے؟ کچھ تفصیل سنا کے ہمیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجیے گا۔"

"لمبی داستان ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"تو پھر سوختے میں رسنا ہے گا۔ جناب خاصے تھکے ہوئے لگتے ہیں۔" نصیب میاں کا انداز مضحکہ خیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لاشعور میرا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ نصیب میاں سلسلہ باتیں کرتا رہا۔ "دیکھ کہ آیا ہو۔ مہمان کی خاطر کرو۔" نصیب میاں نے اُن سب کو اشارہ کیا۔

جس شخص کا نام جگو تھا، اُس نے بڑی کا بنڈل میرے آگے کر دیا۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اُس نے بھی مُرغا نہ سگر ایک دوسرے شخص نے اپنے لمبے بالوں میں اُنگلیاں ڈال کے سگریٹ نکالا اور مجھے پیش کیا۔ "نہیں میں تمباکو نہیں پیتا۔"

پہلے ہی تجربے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اور طریقے سے زندگی بسر کرنی ہوگی۔ شکل و شباہت سے اُن میں کوئی معقول آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ایک ایک چہرا سو اسو معاش معلوم ہوتا تھا۔ میں اُن سب سے کم عمر تھا۔ نصیب میاں البتہ کچھ مختلف قسم کا شخص تھا۔ بھینگا لانبا گندمی رنگ تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی، بہت چبا چبا کے باتیں کرتا تھا۔ جس شخص کو میں نے مارا تھا، اُس کی عمر بیس پچیس سال ہوگی۔ رنگ کالا اور جسم فربہ تھا لیکن اس کا قد میری طرح نکلتا ہوا نہیں تھا۔ چہرے پر چیچک کے دو واضح نشانات موجود تھے۔ اُس کی موٹی موٹی پھیلی ہوئی قلمیں بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے اُس کا چہرہ ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ بعد میں مجھے اُن کی گفتگو سے پتہ چلا کہ لوگ اُسے کوفتہ بوس کہہ دیتا تھا۔ اُن کے نزدیک بڑے بال گردے کی بات تھی خود کہتے تھے کہ یہ حکم تھا کہ جیب کترا کسی سے مقابلہ کرے تو کوئی قابلِ ذکر عضو نہ ہو جو دشمن کی ضرب کو روک سکے۔ سب حیرت زدہ تھے کہ میں کہتے پر غالب کیسے آ گیا؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ کہتے میں وہ غصّہ اور اشتعال نہیں تھا جو اُس

نے مجھے دلاسا دیا تھا مگر میں جیل کے ساتھ چند دن گزار چکا ہوں تو جانے اُس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کبھی نہ ہوتی۔

ایک دن میں وہ مجھ سے خاصے مانوس ہو گئے حالانکہ میں نے اُن سے اپنے سلسلے میں بہت کم باتیں کی تھیں۔ میں رات بھر اپنی سوچوں میں گم رہتا۔ دوسرے دن صبح تمام قیدی میدان میں لائے گئے اور انھیں مختلف کاموں پر لگا دیا گیا۔ میرے لیے ہر بات نئی تھی۔ میدان میں دوسرے سرکاری قیدیوں سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ دو ایک قیدیوں نے مجھ سے گنڈاسے کے قیدیوں کے ساتھ کھلنے کی کوشش کی تو میں نے کاٹنے والا تبصرہ آزمایا۔ جانوں نے مذاق کیا اور کھلنے کی کوشش کی تو میں نے کاٹنے والا تبصرہ آزمایا۔ جانوں نے سزا کے طور پر بید سے میری کھال اُدھیڑ دی لیکن میں نے جی اُف تک نہیں کی۔

صرف دو دن میں ہر شخص یہ مشہور ہو چکا تھا کہ میں ہی وہ لڑکا ہوں جس نے کاٹنے کو گرایا ہے اور میں اکٹھے تین قتل کر کے یہاں آیا ہوں۔ اُن میں مختلف چھوٹی بڑی سزاؤں کے قیدی تھے۔ مجھے سب سے پہلے زمین کھودنے کے کام پر لگایا گیا۔ صبح سے سہ پہر تک میں مٹی ایک جگہ سے کھود کے دوسری جگہ ڈھوتا رہا۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور انھیں مختلف دنیا میں بھرتا اور دوسری طرف ڈال آتا۔ ذرا بھی غفلت ہوتی تو سنتری کا بید میری کمر پر پڑتا، دو دن میں میرے ہاتھ چھل گئے۔ میں یہ سمجھ کے اپنے ہاتھ دوسرے قیدیوں سے چھپاتا تھا کہ وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ بوجھ اٹھانے پانی بھرنے اور مٹی کھودنے سے میرے جسم میں درد ہونے لگا اور سر پر لمبے کرارا کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ کاش وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیتی کہ میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ اُس سے بچھڑے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

تیسرے دن صبح ہی صبح ایک سنتری نے بیرک میں مجھے جھل کا پیغام سُنایا۔ جھل نے کہلوایا تھا کہ "لاڈلے کا خیال رکھنا۔"

"کون لاڈلا؟" نصیب میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ نیا لڑکا جو آیا ہے۔" سنتری نے میری طرف اشارہ کیا۔

کاٹنے پہلی بار ہوش میں میرے پاس آیا اور تیسری سے پوچھنے لگا۔ "تم اُستاد جھل کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

اُس نے مجھے اُٹھا کے سینے سے لگایا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا یار!" اُستاد کا آدمی ہے یہ بھی تو کہوں یہ جیت اچانک کون ٹپک پڑا۔ اُستاد نے اس کے لیے پیغام بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہو گا۔"

"واہ لاڈلے میاں! تم نے بھی کیسا اٹکل کیا۔" نصیب میاں نے جھڑکی دی۔ "جھل بڑی کام کی آدمی ہے اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔" جھل جاتی جب سے وہ گئے ہیں جیل کی رونق ہی چلی گئی۔ سنتری بھی اب نہ آنے لگے ہیں۔ اُن کی کیا بات ہے جب آتے ہیں جیل کے در و دیوار کانپ جاتے ہیں۔"

"سنا ہے اُستاد اس مرتبہ کچھ گھبرے سے ہی پھنس گئے ہیں؟" لیلا کی آواز بھی اُس کے نام کی طرح نسوانی تھی۔

"ہاں مگر انھیں یقین ہے کہ وہ چھوٹ جائیں گے کہ بڑا وکیل ہی کہتا ہے۔" میں نے بڑبڑے سے کہا۔ "اُن کا فیصلہ کل ہونے والا ہے۔"

"پھر وہ ادھر ہی آئیں گے۔" نصیب میاں نے کہا۔

پہلے ہی دو چار واقعوں سے میں تمام قیدیوں کا مرکزِ نگاہ بن چکا تھا، اب جھل کے حکم نے کچھ اور اثر دکھایا۔ وہ سب میرے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ میں ایک مہینے کی قلیل مدت میں اس نئے ماحول کا عادی ہو گیا۔ صبح اُٹھنا، کام پر لگ جانا، شام کو بیرک میں سنتریوں کی گنتی، اٹھنا، قتل، حاضری اور جیب کاٹنے کے اتفاقات شوالی کا گانا اور نصیب میاں کے پھڑکتے ہوئے شعر سننا۔ ہر قیدی کے ساتھ ایک عجیب داستان وابستہ تھی۔ نصیب میاں کسی زمانے میں بکھتر کے بھرے ہوئے نواب تھے۔ پھر ایک حسین و جمیل طوائف پر عاشق ہو گئے اور ساری دولت اُس میٹھے اور باتونی بن کے اپنی مٹھی میں کر کے چلتی ہوئی۔ وہ طوائف بکھتر میں اُن سے محبت کا دعویٰ کرتی تھی مگر ایک آشنا کے ساتھ کلکتے بھاگ آئی۔ نصیب میاں اپنا سب کچھ اُس پر لٹا چکے تھے، کلکتے میں اُسے مار کے ہی، انھیں چین ملا۔ وکیل نے کوشش کر کے اُن کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کروا دی۔ یہ واقعہ سناتے وقت نصیب میاں کی آواز بھرا جاتی تھی۔ وہ تصورات میں بکھتر پہنچ گئے تھے۔ شوالی اپنی پُرسوز آواز میں گانا گا کے انھیں جیل کی دنیا میں واپس لاتا۔ جب بھی نصیب میاں ماضی میں جاتے، شوالی یہی کرتا تھا اور وہ واپس آ کے پھر ہنسنے بولنے لگتے تھے۔

ہل چلانا، مار کھانا، بوجھ ڈھونا، پانی بھرنا، چادریں دریاں اور کھادی کے دوسرے کپڑے بنانا، جیل کے کارخانے میں مشقت کرانے کے کئی طریقے ایجاد کیے گئے تھے۔ اس چار دیواری میں صرف مرد رہتے تھے اور سردی بھی وہ تھے جو چار دیواری کے باہر طمطراق سے پھلتے پھولتے تھے۔ بدمعاش لوگ یہاں جمع تھے، کوئی ہفتہ، کوئی دس ہفتہ، کوئی دو ماہ، کوئی چھ ماہ۔ کوئی زمانے کو سر پر اٹھائے ٹھکراتا تھا، کوئی باہر کی دنیا کی یاد میں گم رہتا تھا۔ سب کے چہرے ڈھلکے ہوئے تھے، آنکھیں اندر دھنسی جاتی تھیں، ہر طرف گندگی تھی، مچھر، کھٹمل، پسو، ناکافی ہوا، گرمی، سردی، کی گالیاں، قیدیوں کی باہمی لڑائیاں، بات بات پر ٹکراؤ، کبھی دال کبھی چاول اور تیل والی ہفتے میں دو بار پانی کا شوربہ، بدبو، سڑاند، سیلی ہوئی روٹی، گھٹن، ایک مہینے میں جیل کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود مجھے بہت وحشت ہونے لگی، ایسی وحشت کہ میں نے سلاخوں سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں جب یہ سوچتا کہ مجھے ۱۲ سال تک اسی چار دیواری میں زندگی بسر کرنی ہو گی اور اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی تو میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے، میری یہ حالت کئی دن تک رہی۔ کاٹنے، بگڑ، لیلا، شوالی، نصیب میاں اور دوسرے لوگ میرے گرد اکٹھے ہو جاتے اور فحش مذاق کر کر کے پوچھتے۔ "کون یاد آ رہا ہے لاڈلے! کچھ ہمیں بھی تو بتا یار!"

لاڈلا کیا بتاتا؟ لاڈلے کے تو سارے لاڈ ختم ہو گئے تھے۔

ایسی ہی چار دیواری میں لاڈلے کا گھر تھا جس میں آزاد قیدی رہتے تھے۔ خبیث رہتی تھی، شریر رہتی تھی، ایک امی رہتی تھی، ایک ابا رہتے تھے، زمانے لاڈلے کے جی میں کیا آئی کہ ایک رات اُس نے سب کو اُس چار دیواری میں قید کر دیا اور خود بھاگ کے چلا آیا۔ وہ سب اپنی اپنی کہانی سناتے تھے۔ میں نے انھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ پھر میرے بال کچھ لمبے کر دیں گے، میں تو خالی ہو جاؤں گا۔ جیسے کرا کر میرے سینے سے کوئی چرا کے لے جائے گا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ جیل کی چار دیواری میں انھیں جو میسر ہے ہم نظر آتا ہے یہ تریک کا ہانچا ہے۔ اس کی جان تو ہاسپٹری بھنک رہی ہے۔ اس کی روح زخموں کو تلاش کر رہی ہے۔ کاش کوئی کرا کا کچھ نشان مل جائے اب کچھ نہیں رہا، صرف آنا سلام ہو جائے کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ورنہ یہ سانس اٹکی رہے گی۔

ڈیڑھ مہینے بعد جیل کے پُرسکون سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ معلوم ہوا کہ جھل آ گیا ہے اور اس بار چار سال کے لیے قیام کے لیے آیا ہے۔ اُس نے آتے ہی مجھے پوچھا اور مجھے دیکھ کے حیرت زدہ رہ گیا۔ لاڈلے! وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈیڑھ مہینے میں تجھے کیا ہو گیا؟ تیرا رنگ روپ کون چھین لے گیا؟" پھر وہ قیدیوں سے مخاطب ہو کے غرایا۔ "جوار کیا تمھیں میرا پیغام نہیں ملا تھا حرام کے جنو؟ اس کا کیا حال کر دیا ہے؟ کیا تمھیں سنتری نے نہیں بتایا تھا کہ یہ میرا لاڈلا ہے۔"

جھل کی گرج سے سب کانپنے لگے۔ نصیب میاں سب کے نمائندے کی حیثیت سے آگے بڑھے اور نیاز مندی سے بولے۔ "جھل جانی! آپ کا حکم ملا تھا، خدا جانتا ہے لاڈلے کا پورا خیال رکھا۔ ہم نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی، اسے کہانیاں سُنائیں، اس کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ شوالی نے اسے روز گانا سنایا مگر یہ خزاں رسیدہ کا اس اور خاموش ہوتا چلا گیا۔ اس نے ہم سے بات کرنی تقریباً بند کر دی ہے۔ سرِ شام کچھ سوچتا رہتا ہے، کھڑا رہتا ہے، کسی سے کچھ کہتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔ جھل جانی! بھلا آپ کا حکم ہو اور آپ کے جاں نثار اُس کی تعمیل نہ کریں۔"

"تم نے اسے کام کیوں کرنے دیا کم بختو! تم نے اس کے ہاتھ نہیں دیکھے تھے؟ اس کا رنگ نہیں دیکھا تھا؟ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا جو تم سب حرام خوروں سے الگ نظر آتا تھا۔" جھل گرجنے لگا۔ "تم نے میرے لاڈلے کو کیا سمجھا بنا دیا؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، سب نے گردنیں جھکا لیں کیونکہ جھل غصے میں تھا، اُس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بُلایا اور اپنے پہلو میں بٹھا کے کہنے لگا۔ "لاڈلے جانی! مجھ سے ایسا کیے پردہ داری میں کیا؟ بتا دیتا، مجھے معلوم تھا کہ تجھ پر کیا بیت رہی ہو گی۔ اب تو فکر کرنا چھوڑ دے، جیل عذور ہے مگر یہاں جھل موجود ہے۔ جھل کی موجودگی میں کسی کی مجال ہے تجھے ستائے۔ اب ہنس دے، تم خدا کی ہنسی دے، جھل کو خوش کر دے۔" وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ اتنا ہنس کہ آنسو نکل آئیں تیرے آنسو بھی تو ٹھیک سے نہیں نکلے ہیں بچے ہنس ورنہ....."

میں نے جھل تمام اُس کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی ہنسنے کا چہرہ بنایا تو وہاں موجود سب لڈے تالیاں بجانے لگے۔ جھل بھی ہنسنے لگا۔ جھل کے آنے کے بعد جیسے جیل کا نظم و نسق تبدیل ہو گیا۔ ہر چیز میں باقاعدگی آ گئی۔ لڑائی جھگڑے ختم ہو گئے۔ جھل کے گرد و پیش آدمی سگریٹ، پان اور کھانے کی دوسری چیزیں اُسے پیش کرتے تھے اور جھل انھیں سارے قیدیوں میں تقسیم کر کے ہم نوالہ کھاتا تھا۔ ہاں میں برائے نام کام کرتا تھا، سنتری بھی جھل کی وجہ سے درگزر کرتے تھے لیکن چار مہینے کی یکسانی سے اُکتا کے میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں قیدیوں کو یہ پتہ لگ گیا تھا کہ میں تھوڑا سیدھا ٹھکانا پڑ جاتا ہوں۔ پہلے وہ اپنے خط نصیب میاں اور دوسرے معمولی پڑھے لکھے لوگوں سے لکھواتے تھے، اب اُن کا یہ کام میں کرنے لگا۔ جھل نے سپاہیانہ انداز میں قرنی اور لٹھ بازی کے بہت سے داؤ مجھے سکھا دیے تھے، وہ کہتا تھا، "وہ آدمی ہی کیا ہے جو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ ثابت قدم رہنا پڑتا ہے لاڈلے!" جھل کے حکم سے یہ راہِ فرار ناممکن تھی۔ اُس کے گرد و پیش کے لوگ اور وہ لوگ بھی جو اُس کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، جیل میں نگرانوں کی طرح اُس کی اطاعت کرتے تھے، اُسے اُستاد کہتے تھے۔ اُن لوگوں نے بھی مجھے نئے طرز سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جھل مجھے اپنے قریب ہی رکھتا تھا، اُس سے میری قربت کے باعث جیل میں ہر شخص میری بڑی عزت کرتا تھا، عزت کرتا یا خوف زدہ تھا، کچھ بھی ہو مگر جھل کے آنے سے پہلے اور اُس کے بعد اُن کے رویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔ جب میں راتوں کو اچانک بے چین ہو جاتا اور اُٹھ اُٹھ کے بیرک سے نکلنے لگتا تو دوسرے قیدی جھل کو میرا احوال سُناتے اور وہ میری گردن پکڑ کے ہمراہ کرتا کہ لاڈلے! دماغ لگ جائے گا، رنگ لگ جائے گا۔ اتنا ہمت گنوا کر دل ہی ہو جائے گی میری جان! مجھے بتا دے کہ تجھے کیا غم ہے، تم نے اپنے رب کی، جھل سات تہہ خانوں سے تیرے بے چوں چرا لائے گا۔" جھل اسی قسم کے وعدے کرتا رہتا تھا لیکن معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی کو رہا کی خبر نہیں لا سکتا، میرا دل اب بالکل نہیں لگتا۔ کچھ دن اچھے گزرتے تھے پھر نہ جانے کیا ہو جاتا تھا، دیواروں سے سر پھوڑنے کو جی چاہتا تھا۔ میں کھانا نہ چوں کا تو اس کو دیکھ کر ہی پیٹ بھر جاتا تھا، پانی نہیں پیا جاتا تھا، راتوں کو جاگتا رہتا تھا، بہت سخت محنت کرتا تھا، دھوپ میں بے تحاشا کودتا رہتا تھا۔ جھل کے مجھے سمجھاتا، ڈانٹتا، ڈپٹتا، جھڑکتا، گالیاں دیتا، پیار کرتا، میرے گالوں پر طمانچے مارتا پھر سینے سے بھی لگا لیتا، ہر اک ایک اذیت ناک سلسلہ تھا۔ ایک دن ڈنڈا وکیل جھل سے ملنے آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا، مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ میں نے اس سے چند

کتابوں کی فرمائش کردی۔ اگلی ملاقات میں مُنّا کتابیں لے آیا۔ قصّے کہانیوں کی کتابیں۔ کتابوں سے میرا دل خوب بہلا۔ بُھل کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی اور اُس نے جیل میں اُس سے ملنے کے لیے آنے والے گروہ کے ہر شخص کو نئی نئی کتابیں لانے کا حکم دیا۔ میرے لیے یہ مشغلہ خاصا سود مند ثابت ہوا۔ بُھل پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ کبھی کبھی رات کو مجھ سے فرمائش کرتا، "لاڈلے! کوئی اچھی سی کہانی ہو تو ہمیں بھی سُنا۔" میں اُسے بلند آواز میں کہانیاں سنایا کرتا۔ بیرک کے دوسرے قیدی بھی دل چسپی سے کہانیاں سُنتے۔ جیل میں قیدیوں کو ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ پھر ایک دن مُنّا مجھ سے کہنے لگا، "میں جیل میں اپنا تعلیمی سلسلہ کیوں نہ شروع کروں؟"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے۔؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ میں تمہیں اس کی اجازت دلوا دوں گا۔" مُنّے نے گرم جوشی سے کہا۔ حالانکہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا اور فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا لیکن جیل میں میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں نے مُنّے سے جب یہ کہا کہ میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتا ہوں تو وہ ہنسنے لگا۔ "میٹرک بہت اونچی کلاس ہوتی ہے لاڈلے! ابھی مڈل کی سوچو۔"

"ٹھیک ہے مگر تم میٹرک ہی کی اجازت لے کر دینا۔"

"میٹرک مشکل ہوتا ہے لاڈلے میاں۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔"

مُنّے نے حامی بھر لی اور جیل کے حکام سے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت دلوا دی۔ اُس نے مجھے میٹرک کا پورا کورس بھی لا کے دیا جو میرے لیے بہت آسان تھا، پھر بھی میں شب و روز جب بھی وقت ملتا، پڑھتا رہتا اور بُھل میری ہمت بڑھاتا رہتا۔ سنتری بھی اس بات سے خوش تھے کہ میں عام قیدیوں کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے تعلیم کی طرف توجہ دے رہا ہوں اور میٹرک کی تیاری کر رہا ہوں۔ میں نے چار مہینے کی مسلسل محنت کے بعد امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو جیل میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ بُھل کا تو خوشی کے مارے بُرا حال تھا، وہ بار بار اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ "دیکھا میرے لاڈلے کا کمال۔" وہ قیدیوں سے مخاطب ہو کے کہتا۔ "یہ بُھل کا لاڈلا ہے کسی اور کا نہیں۔"

جیل میں ہر طرف سے قیدی مجھے دیکھنے آنے لگے۔ جن کے گھروں سے مٹھائیاں آئی تھیں، وہ انھوں نے بُھل کی خدمت میں پیش کیں اور اسے مبارکباد دینے لگے۔ بُھل چودھری بنا ہوا افتخار کے ساتھ مبارک باد یں قبول کرتا رہا۔ جیلر و وکیل بھی حیران تھا کہ میں نے پہلی ہی سیڑھی پر میٹرک کا امتحان کیسے دے دیا تھا۔ لاڈلے! تو نے بُھل کا نام روشن کر دیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے کہتا۔ "تو نے بُھل کے زندہ رہنے کا سامان کر دیا۔"

ادھر نصیب میاں سب سے کہتے پھرتے خدا کی قسم جیل میں پہلا جی دار آدمی آیا ہے بیرک میں سنتریوں کی اجازت سے ایک جشن منایا گیا۔ کانتے اور دوسرے قیدیوں نے رقص کیا، شمولی نے گانا گایا، طبلے کے طور پر تالیاں بجائی گئیں، مجھ سے آوازیں نکالی گئیں اور انگلیاں چٹخائی گئیں۔ میں دولھا بنا ہوا اور میان میں بیٹھا تھا۔ بُھل کو یہ گرمجوشیاں بہت پسند تھیں، اس موقع کے لیے خاص طور پر اگربتیاں منگوائی گئی تھیں۔ بُھل بار بار انس کا اظہار کرتا۔ "ہائے میں باہر نہ ہوا ورنہ ایک ہفتے کا جشن مناتا۔"

جیل میں یہ بڑی بات تھی۔ اس رات تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم آزاد ہونے کی خوشیاں منا رہے ہیں اور یہ جیل نہیں ہے۔ کھٹکے کا کوئی محلہ ہے دوسرے دن جب ہم واپس جیل آگئے۔ کھیتی باڑی، وہی مشقتیں، چادریں اور دریاں بنانا اور سنتریوں کی ڈانٹ اور سیدھا کھانا، وہی چاروں طرف اونچی دیواریں تقریباً ہر قیدی کو سزا کے طور پر ایک یا دو ہفتے کے لیے تنگ و تاریک کھولی میں تنہا رکھا جاتا تھا۔ اس طرح اس کے اوسان ٹھکانے آجاتے تھے اور وہ واپس آکے پوری تن دہی سے محنت کرنے لگتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں ابھی تک کسی کوٹھری میں نہیں گیا تھا اور میرا مجموعی ریکارڈ نہایت اچھا جا رہا تھا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد جیلر اور دوسرے حکام کی نگاہوں میں میرے لیے ایک زبردست احترام پیدا ہو گیا تھا۔ جب میں نے بُھل سے یہ کہا کہ میں آگے بھی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں تو اس نے اپنا سینہ کھول دیا۔ "لاڈلے! میں بھی کچھ سے بھی کچھ ہونے والا تھا۔ تُو نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ اپنا بیٹا بھی کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ میں تجھے وکیل بناؤں گا۔ جب تک بڈھا مر چکا ہو گا۔ بھلا وکالت میں کتنے دن لگ جائیں گے لاڈلے؟"

"کوئی چھ سال۔" میں نے جواب دیا۔

"اُس وقت تک تو بڈھا ضرور زندہ ہے گا مگر اُسے مال پانی زیادہ دینا پڑے گا۔ سالے کی مُچھیاں نکل آئی ہیں۔"

"تو تم راضی ہو؟" میں نے جوش سے کہا۔

"میں راضی، میرا خدا راضی لاڈلے!"

ایک سال بعد میں نے فرسٹ ائیر کا امتحان پاس کر لیا اور دوسرے سال ابھی میں امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ بُھل کی سزا کے دن پورے ہو گئے۔ جیل میں اداسی سی چھا گئی، اس درمیان کئی نئے قیدی آئے، کچھ پرانے گئے، کانتے ایک بار باہر جا کے چھ مہینے بعد پھر اندر آگیا۔ بُھل نے اسے ملا کے ادھم مچا دیا۔ اُس نے کوئی غلط داؤ لگا دیا تھا۔ مُحصنہ کے وقت بُھل نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اُس کی مدم موجودگی میں آدھی نہیں ہوں گا اور سُن پڑھتا رہوں گا۔ اُس نے تمام قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ میرا خاص خیال رکھیں۔ مگر کسی سے ذرا بھی شکایت ہوتی تو اُس کے باہر آنے کا انتظار نہ کیا جائے گا۔ جیل کے اندر ہی سزا دی جائے گی۔ بُھل کے جانے کے بعد جیل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سرپرست درمیان سے اُٹھ گیا ہو۔ نصیب میاں اگرچہ میری ضرورت کا سامان مہیا کرتا تھا مگر اس کا لہجہ اور انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اس میں وہ گرمجوشی نہیں تھی جو بُھل میں تھی۔ دو سال میں میرے بازو خاصے مضبوط ہو گئے تھے اور قد پیڑ کی طرح نکل آیا تھا۔ داڑھی کے بھورے بھورے بال اُبھرنے لگے تھے اور مسوں کی جگہ مونچھوں

نے لے لی تھی۔ میں نے ایف اے کا امتحان دیا اور ساری جیل جیلر اور پریس کے دوسرے حکام کو حیرت زدہ کر دیا۔ میں پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ جھٹ پٹ میں ایک بار ضرور مجھ سے ملنے آتا تھا۔ یہ عشرتی کے دماغ کا عارضہ جیل میں آگیا، اُس نے خود کو چوری کے الزام میں گرفتار کرایا تھا۔ اُسے تین مہینے کی سزا ہوئی۔ ڈیڑھ دو ماہ گزارنے کے بعد وہ پھر واپس چلا گیا اور میں اپنی تعلیم میں مصروف ہو گیا۔

میرا کام بہت آسان کر دیا گیا تھا۔ ایف اے میں میری کامیابی کے بعد جیلر کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔ اُس نے مجھے کلرکی کا کام سونپ دیا۔ وہ جیل میں آنے والے پریس کے حکام کے سامنے مجھے فخر سے پیش کرتا تھا۔ دوپہر کو وہ مجھے دفتر میں بُلا کے اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا کھلاتا تھا۔ بی اے کے پہلے سال میری مڈل شیٹ دیکھ کے وہ پہلے تو دنگ رہ گیا پھر ایسا خوش ہوا کہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ بہت دنوں بعد میں نے ایک گھر دیکھا، وہی بستر وہی الماریاں، وہی تاش، وہی گلاس اور گلدان سب کچھ وہی تھا جو میرے گھر میں تھا۔ برسوں سال اور کپڑوں کی خوش بو سے گھر میں رچی ہوئی تھی۔ جب بھی گھر کا خیال آتا، میں سر جھٹک کے کوڑے میں پھینک دیتا، یہ کوڑا خود میرے جسم کے اندر رہتا۔ ایک بلا اندر جمع ہو گیا تھا۔ یہاں آکے میرا جی گھبرانے لگا۔ جیلر ساتھ نہ ہوتا تو میں بھاگ جاتا۔ اُس نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا۔ "یہ ہے وہ قیدی، لاڈلا! اس کا نام خلیفہ خاں ہے مگر جیل میں سب اسے لاڈلا کہتے ہیں۔"

میں نے گھر کے اندر اُسے سلام کیا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی حیرت تھی جو چڑیا گھر میں ریچھ دیکھ کے بچوں کو ہوتی ہے۔ ریچھ نے سلام کیا لہٰذا اُس کا ڈرنا اور سہمنا لازم تھا۔ اُسے جیلر نے ضرور بتایا ہو گا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون ہے جو میں ریعت سزا کاٹ کے آ رہا ہوں۔ سلام کا جواب اُس نے جھجکتے ہوئے دیا۔ وہ مُرتی تنگ کی ایک ۳۰، ۳۵ سالہ عورت تھی۔ "بیٹھ جاؤ۔" اُس کے حکم میں کچھ خوف شامل تھا۔ میں نے کچھ تامل کیا مگر جیلر نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ "یہ ایک نیا آدمی بن کے جیل سے جائے گا۔" وہ افتخار سے بولا۔ "لاڈلے کا ریکارڈ بھی اچھا ہے، مگر اسے جلد سے جلد رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔ بچے کہاں ہیں؟"

عورت دزدیدہ اور مشتاق نگاہ سے مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے یہ سب نیا اور حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ کسی عورت کو دیکھے یا اُس سے بات کیے ہوئے ایک مدت گزر گئی تھی۔ جیل کی کڑی سزاؤں میں سب سے سخت سزا یہی ہے کہ مرد عورتوں کو نہیں دیکھ پاتے، اپنی ساڑی کا پلّو سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئی اور چند لمحوں بعد واپس آئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ اُن میں سب سے بڑی لڑکی کا رنگ کوئلے کا تھا۔ دوسری کوئلے کے برابر ہو گی۔ وہ اسٹری کے بغیر کپڑے کی طرح رسّی پر لٹکی ہوئی تھی۔ لیکن بڑی لڑکی ایک مکمّل اسٹری کی ہوئی لڑکی تھی۔ تیکھے نقش و نگار، بدن کا ہر حصّہ قرینے اور سلیقے سے اپنی جگہ رکھا ہوا تھا، متناسب بے ڈھنگ، متوازن اور تازہ۔ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ لاڈلے یہ ہے میری بڑی بیٹی بہنا جیلر نے کہا۔ "ایف اے کے آخری سال میں ہے اور ہے پھرتی کی ٹکٹ بلّو، بلا پڑھنے میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک نہیں سمجھ سکی ہے اور یہ لڑکا دو دو چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے۔ چلبھتی سب ملا کر دو لاڈلے کو مجھ نے ایک ساتھ ہاتھ جوڑے ہیں مگر ایسا نہیں ہوتا تھا جیسے آج وہ مجھے کمائی کر پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب گنگ تھے۔ اسے۔ تم سب خاموش کیوں ہو؟ جیلر نے نارضی سے کہا۔ "لاڈلے سے ڈرو، یہ بہت اچھا لاڈلا ہے۔"

بڑی مشکل سے سوہنیا کے لب کھلے اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میرے مصافحہ کے بارے میں پوچھا۔ میرا نام بھی سوہنی تھی اور پسینہ سے شرابا تھا۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ کورا کی آواز میرے قریب ہی گونجنے لگی۔ وہ بھی اسی طرح ٹھہر ٹھہر کے سنبھل سنبھل کے بولتی تھی۔ اب سوہنیا کے بارے میں بڑی ہو گئی ہو گی اور بڑی ہو کے وہ یقیناً مظلوم النسّاں لڑکی بنی ہو گی۔ وہ افلاطون کی طرح میں ہو گی میں تصوّر میں اُس کے خاکے بناتا۔ میری کسمپرسی، کم گوئی اور اُن کی جھجک کچھ دُور ہوئی اور وہ سب مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ میرا گھر کہاں ہے میری ماں کیسی ہیں، ابّو کتنے پڑھے ہیں، چچیرے بھائی مجھ سے کیسی باتیں پوچھنے سے منع کیا، اُن کا گھر کی قیمت کا یہ جیل ہی بتاتا ہے جیلیں شاید اسی لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگ گھر اور گھر والوں کی قدر و قیمت سے آشنا ہو سکیں۔ نصیب میاں کہتا تھا کہ بیوی کی اہمیت کا اندازہ طوائف کے پاس جا کے ہوتا ہے۔ انھوں نے مجھے اتنا کھانا کھلایا اور بڑی ہمدردی اور محبت سے باتیں کیں۔ منہ بھی میٹھا کرایا اور کان بھی ایسی باتیں سُننے سے نا آشنا ہو گئے تھے، میں نے اُن کا شکریہ ادا کر کے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہا لیکن جیلر نے روک لیا۔ جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ میں ایک خاص اور قیدی کے علاوہ ایک انسان بھی ہوں تب کہیں اُن کا خوف دُور ہوا اور انھوں نے آہستہ آہستہ بولنے دل چسپی لینے کی۔ سوہنیا نے سب سے زیادہ باتیں کیں۔ قرنطینہ کے بے لطف عرصے کے بعد میں آزاد ہو گیا ہوں اور کرداکے سامنے بے باکی سے باتیں کر سکا ہوں لیکن میں بد قسمت ہو گیا اپنی بیرک میں آکے میں خاموش لیٹا رہا۔ نصیب میاں مجھے چھوڑ آیا، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کچھ ایسا انگارا سا کسی نے جسم کر دیا سلاقی گاڑی ہے اور وہ مُنہ کھٹا سا اور کسی نے چھونک مارکے دبی ہوئی آگ کو ہوا دے دی ہے

"یہ کرشمہ ہے" نصیب میاں نے بڑی آنکھیں دیکھ کر کہا۔ "میں اب جانتا ہوں لاڈلے صاحب! یہ کب آگ لگی ہے خدا کی قسم آپ کو دیکھ کے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ جوانی کے دن ضائع نہیں گئے جو کچھ ہو گیا، وہ تو خیر سراپا گرانی کر بھی نہیں چھوڑی یقین کرنا۔ اس عمل نظر ٹھیرتی ہی نہیں تھیں میں کچھ اور سنگ ہوتا تھا، شام کو کچھ اور۔ جسم مٹی الگ سے بھرے ہوئے تھے اور اُس آگ میں ایسا لگتا تھا کہ وقت جلتے رہنے کی چاہتا تھا، لاڈلے میاں! ہم پر جوانی ٹوٹ کر آتی تھی اور ہم نے بھی ٹوٹ کر اُسے پیار کیا تھا۔"

♠

نصیب میاں کی باتیں آج بہت دل کو لگیں۔ کچھ مجھے بھی ایسی چنگاریاں اُبھرتی محسوس ہوئی تھیں لیکن میں نے کتابوں کے بوجھ سے انھیں دبا دیا تھا۔ جیلر نے مجھے اپنے گھر بلوا بھیجا تھا۔ میں رات کو پھر سلاخوں سے لپٹ کر آسمان تکتا رہا اور اپنا کچھ ادھیڑ بن سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ رات بھر میں کروٹ کے حصار میں سکتا رہا، وہ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے۔ کبھی اس طرف سے کبھی اُس طرف سے آتی تھی میں سلاخوں سے اپنا سر پھوڑنے اور چیخنے لگا۔ بیرک کے سارے قیدی جاگ گئے نصیب میاں مجھے اپنے اُس سے ہوا دینے لگا۔ پھر جیل کے گھر میں میری آمد و رفت بڑھ گئی اور سونیا مجھ سے اپنے مضامین اور کتابوں کے بارے میں مشورے کرنے لگی۔ یہ دیکھ کے جیلر نے مجھ سے سونیا کو پڑھانے کی باقاعدہ فرمائش کر دی۔ میں روزانہ دو گھنٹے اُس کے گھر میں بیٹھا سونیا کو پڑھاتا رہتا۔ اسی سے گھر والے میرا احترام کرنے لگے۔ یہ احترام رفتہ رفتہ اپنے تعلق میں بدل گیا جو عزیزوں کو عزیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ اچھے نمبروں سے بی اے ہوتی اور بی اے میں آ گئی۔ میں نے بی اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔

سنجیدہ، متین اور حسین سونیا بڑے انہماک سے پڑھتی تھی۔ ہم درمیان میں تعلیمی موضوعات کے سوا، دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی اور جب میں واپس ہوتا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ میں روز اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے میری نظریں ٹکراتیں تو وہ کچھ لرز کے اپنی لانبی اور گھنی پلکیں جھکا لیتی۔ اُس کی سماعت میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی مگر وہ فوراً اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ شروع شروع میں سونیا کی ماں بھی ہم دونوں سے کچھ دور بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی تھی، پھر اُس نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں ڈیڑھ سال تک بلاناغہ وہاں جاتا رہا۔ اب میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ جیل کو بھی معلوم تھا کہ میں وکالت کا امتحان دے سامنے وہ چھوٹی موٹی چوریاں کر کے ایک دو دو مہینے کے لیے میرے پاس پہنچے آیا کرتا تھا۔ میں جیل میں جس طرف سے بھی گزر جاتا، لوگ میرا مل پڑھتے سلام کرتے۔ ہر طرف لاڈلے میاں۔ لاڈلے صاحب ہی کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان دن نصیب میاں کو رہائی ملی وہ میرے گلے لگ کے بہت رویا۔ "میں باہر آپ کا انتظار کروں گا لاڈلے صاحب"۔ وہ ہر وقت شوخیاں کرتا اور جیل مجھ میں چھپ رہتا تھا مجھ سے نصیحت سنتے وقت بہت اُداس تھا۔ جیل کے بہت سے ساتھی چلے گئے لیکن یہ تو جیل تھی، قیدیوں کا بازار۔ جیل کی دکان ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ آنے والوں کو اس کے دروازے کبھی بند نہیں کرتے مگر واپسی کے لیے سبھی دروازے بڑے تنگ ہو جاتے ہیں۔

نصیب میاں بھی چلا گیا اور اُس کے جانے سے جیل خالی خالی معلوم ہونے لگی۔ سچی آ گئے پرانے قیدیوں میں میرے سوا چند ہی قیدی اور رہ گئے تھے۔ ساڑھے چار سال گزر گئے اور ایک دن سونیا نے مجھ سے کہا کہ جیلر کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھرا سی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری زبان کو تالا لگ گیا۔ میں نے اپنی ریگ زار آنکھوں سے اُسے دیکھا، اُس کی کھیتری پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ "ہم یہاں سے ٹھہر چلے جائیں گے، پتا جی کہہ رہے تھے کہ آپ کی سزا کے دن پورے ہونے والے ہیں۔" اُس نے انگلیوں سے اپنے رخسار گیسوؤں کے لچھے بناتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "آپ وہاں تو آئیں گے نا؟"

"ہاں۔" میں نے زندہ آواز میں کہا۔

"آپ سیدھے ہیں آئیے گا؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" میں اُس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"یہاں سے مجھے ملنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں معلوم۔" میں نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔

"پتا جی کہتے تھے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے وہ آپ کا بہت ذکر کرتے ہیں، آپ۔ آپ آئیں گے نا؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"آپ کب جائیں گی؟" میں نے اپنی آواز مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

"تین چار روز میں۔" اُس نے اُداسی سے جواب دیا۔

ہم دونوں دیر تک چپ بیٹھے رہے نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب۔ اُس کی ماں نے آ کے ہمیں چونکایا۔ سونیا نے سر جھکا کر آنسو خشک کیے اور کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُس کی ماں میرا حال پوچھتی رہی۔ عیادت کا حال پوچھ رہا تھا۔

پرانا جیلر چلا گیا، نیا جیلر بہت درشت آدمی تھا۔ اُس کے آنے کے بعد جیل میں سخت احکام جاری ہوتے۔ قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی، بید، منڈر، کوڑے برسنے لگے حالانکہ میرے متعلق پرانا جیلر اُس سے سفارش کر گیا تھا اور میرا سابقہ ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا مگر وہ آدمی طبیعت کا جلاد تھا، جیل کے لیے انتہائی موزوں۔ جیل کے گروہ کے لوگوں کا بھی اُس نے ناطقہ بند کر دیا۔ قیدیوں کو بیرک کے باہر ٹہلنے پر پابندی عائد کر دی گئی، مجھ سے مگر کی کام بھی چھین لیا گیا اور مجھے دوبارہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ دن میں کئی دفعہ جیل کے حکام معائنے کے لیے آتے اور نت نئے احکام صادر کر جاتے۔

جیل شوالی کاتے، جگو، بیلا، سارے نصیب میاں اور بہت سے دوسرے ساتھیوں کے جانے سے جیل یوں بھی اُجڑ گئی تھی۔ نیا جیلر آیا تھا سارا نقشہ ہی پلٹ گیا، پھر سونیا بھی چلی گئی۔ جس دن جو چند گھنٹے آزادی کے مل جاتے تھے، وہ بھی ختم ہو گئے۔ گھر گیا، کوٹھری، سب چلا جانے پر یہ کیا باقی ہے یہ بھی کیوں ہے؟ مجھے بعض اوقات خود پر حیرت ہوتی کہ میں کیوں باقی ہوں؟ میرے باقی رہنے کی اب کون سی ضرورت ہے؟

جیل میں سختی کے اُس نزلے میں ایک نیا قیدی داخل ہوا۔ وہ مجھے بیرک کے باہر نظر آیا تھا، میں نے اُسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے شناخت نہیں کر پایا کیونکہ میرا قد اونٹ کی طرح لمبا اور جسم گھوڑے کی طرح پھیل گیا تھا۔ میرے گالوں پر بھوری سی داڑھی تھی اور مونچھوں سے چہرہ اور بھی بدل گیا تھا۔ سنتریوں کا پہرا سخت تھا مگر میں اُس کے قریب پہنچ گیا اور جاتے ہی میں نے اُس کی گردن پکڑ لی۔ وہ فوراً گر پڑا۔ میں اُس پر چڑھ کے اُس کا نرخرا دبانے لگا۔ سنتریوں اور دوسرے قیدیوں نے آ کے میرے پنجے سے نجات دلائی۔ سب حیران تھے کہ آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اُسے دیکھ کے میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ میرے غیظ و غضب کی ایسی کیفیت قیدیوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کئی آدمیوں نے مجھے پکڑا لیکن میں ان سب سے آزاد ہو کے اُس پر پھر پل پڑا، وہ میری گرفت میں آتے آتے رہ گیا اور میدان میں اِدھر اُدھر بھاگنے اور شور مچانے لگا۔ پیچھے پیچھے سنتری دوڑ رہے تھے، انھوں نے سنگینیں تان لی تھیں مگر وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں تمھیں پہچان گیا ہوں مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔" اُس نے گھگیا گھگیا کر کہا۔ "تمھیں اپنی ماں اور بہن کی قسم، مجھے معاف کر دو۔"

میں نے اپنے مضبوط پیروں سے اُس پر ٹھوکر ماری۔ "میں تمھیں چھوڑوں گا کمینے!" میں نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا۔ سنتریوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اس کے باوجود وہ میرے پیروں پر سر رکھ کے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔

وہ کریم گل تھا، وہ ظالم کریم گل جس نے اپنی چچی کے ساتھ مل کر مرا کریئر تباہ کیا تھا۔ سنتری مجھے پکڑ لیتے تو میں وہیں اُس کا کام تمام کر دیتا۔

"وہ کہاں ہے؟" میری گرج سے وہ لرز لرز گیا۔

"کون؟" اُس کی کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"وہی جسے تو چچی بی اور اس حرام زادے کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا تھا کمینے! مجھے بتائے وہ کہاں ہے؟ ورنہ میں تجھے یہیں زندہ دفن کر دوں گا۔"

"خدا کی قسم، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ عاجزی سے بولا۔

سنتری مجھے پکڑ کے ایک طرف لے گئے۔ کچھ میرے پرانے ریکارڈ کا اثر تھا کہ انھوں نے صرف تنبیہ کر کے مجھے چھوڑ دیا لیکن جیسے ہی میں اُن کی گرفت سے آزاد ہوا، میں نے کریم گل کی گردن دبوچ لی۔ "مجھے سب کچھ صاف صاف بتا۔" سنتریوں نے مجھے دوبارہ پکڑ کے جیسلا کی خدمت میں پیش کر دیا اور جیلر نے کسی تامل کے بغیر مجھے ایک ہفتے کی قید تنہائی سے نوازا۔ مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ سزا کاٹنے کے بعد جب میں اپنی بیرک میں واپس آیا تو وہاں جیل پہلے سے موجود تھا۔ لاڈلے صاحب اکٹھے بھائی تھوڑی میں سمٹ لیا۔ "جانی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو اب بڑا بڑھ لکھ گیا ہے۔ تیا مال کن کے مجھے فوراً یہاں آنا پڑا۔" میری خاموشی پر اُس نے بتایا کہ اسے کریم گل کی زبانی سارا حال معلوم ہو گیا ہے۔ "کون تھی وہ لاڈلے؟ تیرے لیے تو میں آسمان سے پری اُتار لاتا۔ جیلوں میں اور سے زیادہ قیدی عورتوں کی دکانے میں، مگر تو نے بتا چھپایا، لاڈلے! مجھے بتا تو سہی وہ کون تھی اور کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کہ اب کہاں ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تو اتنی عمر میں تجھے کہاں سے لایا تھا اور تیرا لاڈلا وہ کہاں تھا۔ یہ تو پاگل ہو گیا تھا؟"

"مجھ سے کچھ مت پوچھ۔" میں نے اشتعال میں کہا۔

"میں جانتا ہوں لاڈلے! وہ میری کریا پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "تیرے ساتھ کیا گزرا ہے؟ پر وہ کہتا ہے کہ اس نے بُری نیت ضرور کی تھی مگر اس کے بعد اُس کو کچھ نہیں معلوم۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہاں اُس کی میرے سر میں جس طرح خاطر کی ہے، اُس میں آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

جگو کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک رات بیرک میں اُس کے آدمیوں نے ایک ساتھ اُسے اتنا مارا کہ وہ وہاں ہو گیا۔ بیرک کے سارے قیدیوں کو سزائیں ملیں، ان کی کمر توڑنے کر کے اُدھیڑ بیسا تھے مگر انھوں نے اُف تک نہیں کی، انھوں نے میرا انتقام لے لیا تھا۔ جگو نے اُسے میرے پیروں پر لا ڈالا۔ کریم گل نے احتجاج کیا تھا کہ میرے ہوش سے فرار ہونے کے بعد اُس کے آدمیوں نے تیسری بار میرا تعاقب کیا تھا جو کہ اُسے یقین تھا کہ وہ میری بہن نہیں ہے لیکن وہ تیسری نظروں سے اوجھل ہو گئی اس کے بعد اُس نے کچھ نہیں کیا۔

پھر وہ کون لوگ تھے جو ہوا میں بھیا کرتے کرتے دریا کے کنارے تک پہنچ گئے۔ کریم گل اس سے زیادہ نہیں بتا سکا۔ وہ اب بھی ایک نالی کے اغوا کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ غالباً وہ کوئی اور گل تھے جو جرم پر نظر رکھے ہوئے تھے لیکن ہے تو کسی والا پی شکوک ہو گیا ہو، ممکن ہے وہ بی بی اور اُس کے شوہر کے زر خرید غنڈے ہوں، کریم گل نے بتایا کہ ہوش والوں کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ میں نے وعدہ معاف گواہ اور ایک کانسٹیبل کو قتل کروا دیا ہے مگر انھوں نے میرے بارے میں چھپ کر اپنا نے کے بجائے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی کیونکہ اس طرح "ان لا ٹرائل" عدم نام ہونے اور پولیس کی نظروں میں آنے کا خدشہ بھی تھا۔ مجھے مزید کی سزا کاٹنے کے بعد مجھے جیل کے باہر چھوڑ گیا۔ کریم گل اب ان دنوں رات بھر ڈیوٹی میں لگا رہتا تھا۔ کبھی وہ میرے پاؤں دباتا اور کبھی مالش کرنے لگتا۔ کبھی میرے قریب بیٹھ کے مجھے سمجھاتا رہتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جوش کے اپنا بچا چھڑایا۔

کریم گل کے حلقے سے جیل کے حکام کی تفتیش میں میری جو مدد ہو گئی تھی وہ ایک سال اوّل کے آخر میں کامیابی کے بعد کچھ بحال ہو گئی۔ نیا جیلر بھی احکام دیتے دیتے تھک ہار گیا۔ جیل کا پہیا پھر اپنی رفتار سے چلنے

لگا، قیدی آتے رہے اور اپنے جرائم کا جزیہ ادا کر کے واپس جاتے رہے، چھ سال میں جیل کے اندر میں نے رنگ رنگ کے چہرے دیکھے جیل میں بھی ویسے ہوتے ہیں، چھوٹا قیدی، بڑا قیدی، کمزور قیدی، طاقت ور قیدی، کالا قیدی، گورا قیدی، پٹھان اور اُس کے آدمیوں نے مجھے جیل میں بسنے کا سلیقہ سکھایا۔ جیل کے باہر بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جیل کے اندر بھی، کہ اس سے زیادہ خود میں نے اُن سے پڑھا اور اُن سے زیادہ خود سے پڑھا کہ میں اتنی طویل مدت کے بعد بھی طور کو نہ بھلا سکا۔ میرا خود "میری کو راقبی۔ ان چھ سال میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جب وہ مجھ سے دُور رہی ہو۔ میں جیل میں قید تھا، وہ میرے سینے میں قید تھی۔

میں ایم اے کے دوسرے سال کی تیاری کر رہا تھا کہ جیل میں ایک نیا قیدی وارد ہوا۔ وہ چوبیس پینتیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اُس کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی۔ وہ کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کی سنتا تھا۔ ہر وقت خاموش اور اُداس رہتا تھا۔ اپنے آپ میں گم۔ جو میرا حال تھا وہی اُس کا تھا۔ یہی بات مجھے اُس کے قریب لے گئی لیکن وہ میری طرح اپنا غم راز نہ رکھ سکا۔ اس نے اپنا ہی اُس کے قریب لے گئی لیکن وہ میری طرح اپنا غم راز نہ رکھ سکا۔ اس نے اپنا ہی کیا، جیل میں ویسے بھی کٹ پٹ کے سارے غم گرد ہو جاتے ہیں، وقت کی دھول اُن پر جم جاتی ہے۔ جس نے اپنے غم کا اظہار کر دیا، اُس نے اُسے نکال کر دیا۔ میں نے اُسے بہت نہیں نکالا تھا کیونکہ وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ نوجوان شکیل میری باتوں میں آگیا۔ وہ بنارس کا گریجویٹ تھا اور اپنے مختصر خاندان کا واحد کفیل۔ وہ روزی کی تلاش میں کلکتے آگیا تھا کہ ایک دن اُس کی بڑی بہن بنگلی میں ڈوب گئی کیونکہ اُسے سرشیل کے ایک امیر دوست نے دھوکا دیا تھا۔ وہ غیرت مند لڑکی جس نے اپنا سب کچھ اپنے بھائی کے عزیز دوست کے حوالے کر دیا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لا سکی۔ سرشیل نے اپنے دوست کو قتل کر دیا لیکن قتل کرتے وقت اُس نے اپنی بوڑھی ماں، دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کے متعلق نہیں سوچا، اگر وہ اپنے دوست کو قتل کرتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وکیل نے اُسے پھانسی سے بچا لیا لیکن سزا سے نہیں بچا سکا، اب کلکتے میں اُس کا خاندان فاقے کر رہا تھا اور وہ جیل میں تھا۔

میں نے مخمل سے کہہ کے اُس کے خاندان کے لیے گزارے کا انتظام کرا دیا۔ سرشیل نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ ایک صبح بیرک میں اُس کی لاش پائی گئی۔ وہ شدتِ غم سے مر گیا تھا۔ اس اعتبار سے مجھ سے زیادہ غیرت مند ثابت ہوا، اس نے مجھے شکست دے دی۔ مجھے مات دے کے چلا گیا۔

ساتویں سال جب میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کا امتحان پاس کر چکا تھا تو ایک دن مجھے جیلر نے طلب کیا اور آزادی کا مژدہ سنایا۔ مجھے یقین نہیں آیا، یہ تو توقع تھی کہ اس سال کے اختتام پر شب و روز ملا کے میری سزا مکمل ہونے والی تھی مگر اس قدر جلدی اور اچانک یہ پرواز آجائے گا، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آسے پڑھا اور آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ جیلر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے نصیحتیں کر رہا تھا، مجھے اس کی کوئی بات یاد نہیں۔ اس خبر سے میرے اوسان جواب دے گئے۔ رگ و پے میں جیسے برف گھل گئی۔

میں نے بیرک میں آ کے کسی کو نہیں بتایا کہ اب میں اُن سے بچھڑنے والا ہوں، یہ خبر مخمل تک ضرور پہنچ جاتی اور وہ ایک جلوس کی شکل میں دروازے پر میرا استقبال کرتا۔ میں ساری رات بیرک میں ٹہلتا رہا اور صبح اُٹھ کے جیلر کے دفتر میں حاضر ہو گیا۔ اُس نے میری خون آلود شیروانی، کرتا، پاجامہ اور سات سال پرانے نوٹ، جو میری جیب سے برآمد ہوئے تھے، واپس کر دیے اور میری بلا بھی میرے سپرد کر دی۔ میں نے جیلر کے سامنے بے اختیار ہو کے اُسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اب پرانا لباس میرے جسم پر نہیں سما سکتا تھا۔ اُس سخت مزاج جیلر نے میری مجبوری محسوس کر لی اور اپنا کرتا پاجامہ مجھے دے دیا، پھر اُس نے میری کمر تھپتھپائی، میری ناک پکڑی اور مجھے اپنے دفتر کے دروازے پر رخصت کرنے آیا۔ "میں نے تمہارا پاجامہ واپس نہیں کیا ہے، اس لیے کہ اب تمہیں اُس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اُس نے مسکرا کے کہا۔

"جناب ..." مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا۔

"جاؤ، میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"جناب ..." میں نے بے تابی سے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

سنتریوں نے مجھے جیل کے خاص دروازے تک پہنچا دیا۔

کچھ دیر بعد میں جیل کے آہنی پھاٹک کے باہر کھڑا تھا۔

باہر کی دنیا ہی بدل ہوئی تھی، یہاں نہ سنتری تھے نہ بیرکیں تھیں، نہ یہاں پتھریلی دیواریں تھیں اور نہ لوہے کی سلاخیں۔ چڑیوں کی سیاہ سرخیوں بلند و بالا عمارتیں، بھاگتے بھاگتے ہوئے لوگ، ڈگمگاتی، ٹھیلے گاڑیاں۔ یہ تو عجیب منظر تھا۔ میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ یہ خواب تھا یا حقیقت؟ جو کچھ پیچھے رہ گیا، وہ خواب تھا یا جو سامنے موجود ہے یہ خواب ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ کوئی مجھے نیند سے بیدار کرے اور میں دوبارہ سلاخوں کے پیچھے نہ چلا جاؤں۔ میں نے تیز قدموں سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جیل میں جانے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا واپس آنے کی خوشی ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

مگر یہ کیفیت کچھ ہی لمحوں میں جیل سے آزاد ہو گیا تھا، سات سال بعد میں دوبارہ کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ اب میں جہاں اور جدھر چاہتا، تب بھاگ سکتا تھا، اونچی آواز میں گا سکتا تھا، میں دکانوں پر دیر تک کھڑا ہو کے نت نئی چیزوں کا نظارہ کر سکتا تھا، یہاں ہتھیلیوں پر پھیل بچھر رہے تھے جو محبوں سے کھانوں کی مست خوشبو برآمد ہو رہی تھی، چائے کی پیالیاں کھڑک رہی تھیں، میں نے پورے سات برسوں میں صرف ایک بار جیلر کے گھر کی عورتیں دیکھی تھیں، مُونیا، اُس کی ماں اور چھوٹی بہن مگر اب یہاں تو عورتیں ہی عورتیں نظر آ رہی تھیں، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا بہت ترقی کر گئی ہے، ہر چیز بدلی ہوئی تھی۔ میں حیران حیران نظروں سے جیل کے پھاٹک کے باہر کی دُنیا کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے خود کو اجنبی محسوس کیا حالانکہ کسی شخص نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی، سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا۔ ہر شخص کو جلدی تھی جیسے آج کے بعد دُنیا ختم ہو جائے گی، جو کام نمٹانا ہے آج ہی نمٹا لیا جائے، خاصی دُور آنے کے بعد مجھے کچھ ہوش آیا اور سب سے پہلے مجھے کرا کا خیال آیا۔ جیل سے آزادی کی حیرت میں یہ خیال چند لمحوں کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ شاید اسی لیے تنہائی اور بے بضاعتی سی محسوس ہوئی تھی۔ کسی چیز کی کمی تھی۔ جیسے میں جیل میں کچھ بھول آیا ہوں۔ میں نے شکل کو اپنی رہائی کی اطلاع جان بوجھ کر نہیں دی تھی، ورنہ دروازے پر میرے استقبال کے لیے ایک بھیڑ موجود ہوتی، بھلے خوشی سے دیوانہ ہو جاتا اور مجھے جلوس کی شکل میں اپنے اڈے تک لے جاتا۔ اب اس شہر میں میرے جاننے والوں کی کمی نہیں تھی۔ سات سال میں نہ جانے کتنے قیدی جیل آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ نصیب میاں گانتے، شری، چوہدری، بندھو، سالے لیلا، تجا اور بہت سے دوست۔ یہاں سالی جیلر کا گھرانا بھی تھا اور سوشیل کا اُتنا پڑا نصیب خاندان بھی یہیں رہتا تھا، جسے بھی معلوم ہوتا کہ نوح لاڈلا جیل سے رہا ہو رہا ہے، وہ دوڑا ہوا آتا۔

وہی شہر گلیاں، عمارتیں اور وہی لوگ تھے لیکن میں وہی نہیں تھا۔

میرے چہرے پر اب بھوری داڑھی تھی اور میرا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا، میرے ٹخنے پھیلے ہوئے تھے، سینہ چوڑا تھا اور ٹانگیں مضبوط تھیں، مجھے بہت سے آدمیوں میں علیحدہ سے پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ تو بھی ظاہری حالت۔ اندر سے میرا حال وہی تھا، وہی بے چینی، مایوسی، خوف اور کرب۔ ایسا لگتا تھا جیسے صرف ایک رات گزری ہے اور صرف ایک بھیانک رات میں میرے جسم کا علیحدہ گیا حصہ کوما کی رات ہی مجھ سے جدا ہوئی ہے۔ یہ ایک طویل سیاہ رات تھی، میں نے مخمل اور اُس کے ساتھیوں کو اسی لیے اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ آجائیں گے تو مجھے کرا کو ڈھونڈنے کا وقت نہیں مل سکے گا۔ جب تک اُس کے بارے میں کوئی خبر نہ مل جاتی، اُس وقت تک مجھے چین کیسے نصیب ہو سکتا تھا۔ جیل سے رخصت ہوتے وقت جیلر نے وہ روپے بھی میری جیب میں ڈال دیے تھے جو سات سال پہلے میری جیب سے برآمد کیے گئے تھے۔ میں نے انھیں گنا نہیں تھا، دو ڈھائی سو سے کم کیا ہوں گے۔ مالا میں نے گلے میں کرتے کے اندر چھپا لی تھی۔

میں نے بے تابی سے ہاتھ اُٹھا کے ایک خالی رکشا کو آواز دی۔ خلما فاصلہ طے کرنے کے بعد رکشا اُس بازار سے گزرنے لگا، جہاں سے میں کرا کو کئی بار گزرا تھا۔ مجھے لگا، دونوں ہوٹلوں کے بوڑھے بھی نظر آئے جن میں انھوں نے وحشت ناک وقت بسر کیا تھا۔ میرا دل اندر سے کسی نے بجا دیا۔ اُس وقت کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ رکشا عدلے کے سامنے جا کے ٹھہر گیا۔ عدلے کی عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی بس دیواروں پر نئی نئی سفیدی کی گئی تھی۔ میں دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا اور میری نگاہ کسی شناسا کو تلاش کرنے لگی۔ کوئی پرانا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے دفتر کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے ایک اور عمر رسیدہ شخص سے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ کے اندر بلا لیا۔ فرمایئے؟ اُس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ مجھے کچھ کہتے ہوئے جھجک ہوئی۔ میں سوچنے لگا کس طرح پوچھوں؟ وہ شخص میرے تاثرات پر جھنجلا گیا اور کہنے لگا۔ "فرمایئے، کیا کام ہے؟"

"جناب، میں ایک صاحب کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ گم شدہ لوگوں کا دفتر نہیں ہے، مدرسہ ہے۔" اُس نے کہا۔ "البتہ اگر مدرسے کے کسی صاحب کے بارے میں پوچھنا ہے تو فرمایئے، میں حاضر ہوں۔"

"جناب، میں مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "وہ مراد آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"مولوی محمد شفیق؟" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس نام کے کسی صاحب سے واقف نہیں ہوں۔"

مجھ پر جمود طاری ہو گیا۔ "وہ یہیں پڑھاتے تھے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "وہ مراد آباد سے کبھی کبھی یہاں پڑھانے آتے تھے۔ آپ انھیں ضرور جانتے ہوں گے۔"

"بھائی، میں نے عرض کیا نا کہ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے پانچ سال گزر گئے ہیں۔" اُس نے کسی قدر ناراضی سے جواب دیا۔

"پانچ سال۔" میں نے میرتھ سے دہرایا۔ "اور پانچ سال میں اس نام کے کوئی مولوی صاحب ادھر نہیں آئے؟"

"جی نہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، قطعاً نہیں، اور میری یادداشت ایسی کمزور بھی نہیں ہے۔"

"اس سے پہلے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "کوئی سات سال پہلے وہ یہاں ضرور آتے تھے۔ آپ مدرسے کے کسی بزرگ سے پوچھیے۔"

"ہاں ممکن ہے اب میں اپنے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں تو یاد رکھ نہیں سکتا۔" وہ تلخی سے بولا۔ "فرض کیجیے میں آپ کو کسی بزرگ سے ملا بھی دوں تو آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ جو شخص پانچ سال سے یہاں نہیں ہے، اُس کے بارے میں آپ کچھ جان کر کیا کریں گے اور وہ آپ کو کیا بتا پائیں گے۔"

"مجھے اُن کے بارے میں کچھ ضروری باتیں معلوم کرنی ہیں۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "شاید کوئی بات معلوم ہو جائے۔ براہِ مہربانی میری مدد کیجیے، میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

اُس نے قلم دوات میں رکھ دیا اور اکتاہٹ سے بولا۔ "آیئے میرے ساتھ لیکن آپ کا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام کبیر خاں بتلایا اور اپنے آنے کی غرض و غایت بتاتے ہوئے بھی جھوٹ بولا۔ وہ جھکتے ہوئے مجھے ایک بزرگ کے پاس لے گیا۔ بزرگ ایک جماعت کو درس دینے میں مصروف تھے۔ میں اُن مولوی صاحب کو پہچان گیا۔

اب وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے جب اُن سے مولوی محمد تنقیص کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ چونک پڑے ساتھ ہی بیزار بھی۔ بھلا کسی کے ملنے میں اتنا گریز۔ پتہ نہیں میاں اتنا متاسف سے بولے۔ پتہ نہیں مولوی محمد تنقیص کہاں ہیں اگر ہم کو جلا کے بس گئے ہیں ساٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ یہاں سے گئے تھے پھر آج تک واپس نہیں آئے کوئی خیر خبر بھی معلوم نہیں ہوئی۔ اُن کی خیریت پڑھنے کے لیے مراد آباد کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہیں۔ واپس نہیں آیا۔ پھر مراد آباد کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی نہیں ہیں۔

- کیا وہ اُس ملک کے بعد سے واپس نہیں آئے؟ میں نے حیرانی آواز میں پوچھا۔ وہ کہاں چلے گئے؟"

- اللہ جانتا ہے۔ بزرگ مولانا ٹھنڈی سانس لے کے مختلف آوازیں بھرنے لگے گئے کہ اب تک نہیں لوٹے اُن کا سامان بھی بہت دنوں تک کمرے میں پڑا اُن کا انتظار کرتا رہا، پھر میں نے اپنے کمرے کی الماری میں بند کر دیا۔"

میرے اعصاب بھی جھنا گئے۔ میں سکتے کی حالت میں انھیں گھورنے لگا میری یہ کیفیت دیکھ کے بزرگ مولانا نے پوچھا: "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کتنے برسوں بعد مولوی مولوی عبادی کا جاننے والا کہاں سے آگیا؟"

- کیا آپ مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں اُن کے مرحوم دوست کا بیٹا ہوں۔"

- ضرور ضرور۔ بزرگ نے شفقت سے جواب دیا۔ کہو۔

- کیا آپ اُن کا سامان مجھے ایک نظر دکھا سکتے ہیں؟"

بزرگ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ کیوں نہیں لیکن سامان تو اُنھی کا ہے، میں اُنھی کے حوالے کر دوں گا۔"

- میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ میں نے صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی چیز طلب نہیں کروں گا۔

- بہر حال۔" بزرگ شخص جھکتے ہوئے بولے۔ آپ کلام مرا ہے تو یہی بھی وہ معمولی سامان ہے آیئے میرے ساتھ۔"

★

وہ مجھے ایک حجرے میں لے گئے جسے صاحب بھی تنہا بیٹھے تھے۔ حجرہ اس جیسے سے مختلف نہیں تھا جس میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ بزرگ نے اپنے کمزور ہاتھوں سے الماری کا تالا کھول کے میراث کیس اور مولوی صاحب کا کچھ سامان باہر نکالا۔ کپڑے کچھ جوں کا توں محفوظ تھا۔ میری بہن فہیدہ کا دوپٹا اور کرتا کے کپڑے۔ سٹیل سیٹ کے کپڑے۔ میری ہیئر کٹ کی سند۔ مولوی صاحب کے کپڑے، چلوں میں کھیا۔ (؟) اور وہ تمام سامان جو آخری مرتبہ اُن میں مولوی صاحب سے ہمارے لیے خریدا تھا۔ میں نے فہیدہ کا دوپٹا اٹھا کے بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا مگر میرے آنسو بری طرح نکل آئے۔ اتنے آنسو کہ پلکیاں بند ہو گئیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا پھر میں نے دوپٹا

بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ سینہ یوں اگر جیسا ایسا اُٹھا کہ بزرگ کی موجودگی کا خیال ہی نہ رہا۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے پوچھا۔

- میاں! آپ کو کیا ہو گیا؟ کیا ان کپڑوں سے آپ کا بھی کوئی تعلق ہے؟ ذرا صبر کیجیے آرام سے بیٹھیے اور مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں ضبط سے کام لیجیے۔"

میں نے اُن کے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُن کے ہاتھ میرے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ بزرگ نے اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ نکال کے میرے سر پر رکھ دیے۔ میاں۔ کیا بات ہے؟ آپ مجھ سے اپنے دل کا حال کہہ دیجیے اور خوب رو لیجیے۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ کے ساتھ کوئی بڑا سانحہ ہو گیا ہے۔ میں اگر آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھیے۔" میں نے سر جھکا لیا۔ بس مولوی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے رقت سے کہا۔ یہ سامان واپس رکھ لیجیے۔ شکریہ بہت بہت شکریہ۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ آنسو، سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان بولا اور ایک پل میں حجرے کے دروازے پر آ گیا۔ بزرگ مجھے آواز دیتے رہ گئے۔ میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرا۔ انھوں نے اس ضعیفی میں نہ جانے کس تیزی سے حجرے کے باہر آ کے بھی مجھے آوازیں دیں لیکن میں وہاں سے بھاگا اور مڑ کے کی عمارت عبور کرتا ہوا گلی میں آ گیا۔

⊙

گلی میں آ کے میں ہانپتا ہوا فٹ پاتھ کے ساتھ ایک کھمبے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا یا جا رہا تھا۔ اسی کھمبے سے ٹیک لگا کے میں پاش پاش کر کے روتا رہا تھا۔ مولوی صاحب کا کوئی پتہ نہیں۔ پھر وہ اسی جلدی میں کہاں چلے گئے کہ انھیں مڑ کے اپنا سامان اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی؟ دماغ میں کن کہانیاں رینگنے لگیں۔ میں خود کو اچانک ایک اور ڈھانچوں شخص محسوس کرنے لگا۔ بزرگ نے میرے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی تھی مجھے خبر نہیں کہ کتنے لوگ مجھے اس عالم میں دیکھ کے گزر گئے تھے اور کتنے میرے قریب کھڑے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے آ کے اپنی لاٹھی میرے بازو میں زور سے چبھوئی حالانکہ میں خاموش بیٹھا تھا۔ رکھی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے بیدرد کوئی فریاد تھی۔ اُس نے مجھے وہاں بیٹھنے تک نہیں دیا۔ "کون ہے تو؟" اُس نے نفرت سے پوچھا۔

میں نے سر اٹھا کے دیکھا، کانسٹیبل کے ساتھ اور لوگ بھی کھڑے تھے مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے انداز میں تنبیہ اور تمسخر تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ سکوڈ ہیڈ معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے، سالا ابھی جیل سے چھوٹ کے آیا ہے۔ بالی تو دیکھو پورے جسم پہ گھاس کی طرح اُگے ہوئے ہیں۔" لوگ میرے حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہ ہم کر چپ ہو گئے۔

میں گلی گلی کھرے کھوٹے دیرانی نظروں سے لوگوں کو دیکھتا ہوا گزرتا رہا اور نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے مجھے

تھا۔ میں نے کوئی صاحب مڈسے ملا ہیں نہیں سنا۔ مگر کوئی کہ وہ فسادیوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور دوسرے دن تیسرے پہر وہ مجھے ملاقات میں دیکھنے آئے تھے۔ میں ملاقات کے لیے آتے یا خط کے ذریعے اطلاع دیتے۔ اُن کی اتنی طویل گمشدگی اس بات کا ثبوت تھی کہ انھوں نے کوئی حل کر لیا اور وہ ہمارے کوئی رابطہ قائم کرنے میں تحفہ محسوس کر رہے ہیں۔ میں انھیں کیا کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ باقی باتیں خود کو لانے انھیں بتا دی جائیں گی کہ تب کے بھانگ جیسے کے لوگ اُس کی بُرسو گئے ہیں پھر سے ہیں یقیناً سے پیش نظر انھوں نے اپنے آپ کو چھپایا ہو گا اگر وہ کوئی کرنے میں ناکام ہو جاتے تو مڑ سے واپس آ کے اپنا سامان ضرور حاصل کرتے اُن کے واپس نہ آنے اور اپنے بارے میں کوئی خبر نہ دینے سے ظاہر تھا کہ کوئی کے معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے انھوں نے کلکتے سے چپ چاپ نکل جانے کو ترجیح دی ہو گی شاید انھیں نے دیکھ لیا ہو کہ میں نے ایک کانسٹیبل کو ہلاک کر دیا ہے اور توقع واقعی پاکستان کا کانسٹیبل آ گئے ہیں، اُس وقت سیٹیاں بجنے لگی تھیں جب مولوی صاحب کوئی کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے تو ایک غنڈا اُن کے پیچھے لگ گیا تھا اس کا راستہ روک کر میں نے مولوی صاحب کو آگے بڑھنے میں مدد دی تھی اور چاقو اُس کے پیٹ میں گھونپ کر اُس کا کام تمام کر دیا تھا اگر کانسٹیبل میں موقع پر نہ آ جاتا تو میں مولوی صاحب کو پکڑ لیتا۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ مولوی صاحب اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں نے دوسرے کو زخمی کیا ایک عمری بچ نکلنے میں اس کے بعد کے واقعات پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیل میں جب بھی اس واقعے کا تجزیہ کیا تھا۔ مجھے ایک اطمینان محسوس ہوا تھا اور تجزیہ میں نے ہزاروں بار کیا تھا۔ ہزاروں بار کیوں میں سوچتا ہی رہتا تھا۔ اسی لیے میں سب سے پہلے مڈسے آیا۔ خیال تھا کہ مولوی صاحب کے بارے میں یہاں سے کوئی قطعہ ضرور مل جائے گا۔

کیا میں یہی سننے کے لیے میل سے آیا تھا؟ میلوں پیدل چلتے ہوئے مجھے تمام ہو گئی منہ کھانے کا بخش تھا۔ نہ پینے کا۔ وہ شہر جو میل کے پھاٹک سے باہر آنے کے بعد بہت حیران کن لگ رہا تھا اب مجھے اُسے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ شہر تو کوئی معاملہ آرا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس شہر کو آگ لگا دیتا۔ مغرب کے بعد جب شہر و تنہیں میں نہا گیا تو میں نے اپنے آپ کو ہاوڑا اسٹیشن پر موجود پایا۔ جیل میں ایک بار مجھے ملاقات کرانی تھی۔ میری رہائی کی خبر سنتے ہی وہ کیا کہے گا۔ کہے گا بہت کمینہ اور کم ظرف نکلا۔ ہر بار جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے جیل آتا تھا۔ یہی پوچھتا تھا کہ میری قید کے دن کب ختم ہو رہے ہیں؟ کہتا تھا۔ "لاڈلے! جیل کے دنوں پر کبھی باتاً بڑا جشن نہیں ہوا ہو گا جو میں تیری رہائی پر مناؤں گا۔"

جیل کو کیا معلوم تھا کہ میرے لیے دنیا میں سب سے اہم ذات کون سی ہے۔ میں نے اُس کی ناراضی نظر انداز کر دی اور کھڑکی سے ٹکٹ گھر کے پیچھے پڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ مراد آباد جانے والی گاڑی میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ میں نے ایسی بیچ مغرب کی بھی جاہل مسافروں کی بھرمار تھی۔ ایک بار اندر کے نیچے کی میں ٹھاٹھ بھگ کے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسٹیشن پر ہونے والے شور سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ مجھے اس قسم ہلال کی کیفیت میں پڑے ہوئے کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ میں نے اپنے قریب کسی کی سرگرمیوں کی کوئی حس سا ہو گیا۔ خیال کر کے میں کروٹ بدلتے بغیر جیلے لایا پڑا رہا۔ وہ آدمی میرے پیر کی طرف بڑھا۔ ایک ہاتھ میرا ٹخنا پکڑا اٹھا میٹھا۔ ایک شخص کا ہاتھ میرے گریبان پر تھا اور دوسرے کا جیب میں میری اچانک ہیلی سے دھکا دیے بیٹھے۔ ایک میری ملا پر۔ ہاتھ ڈالنے کی فکر میں تھا۔ مراد میری جیب لانے کی کوشش میں میری بنیان پھٹ گئی۔ بڑھ جانے کے بجائے ہار پڑھ دوڑا۔ ایک نے ناک کے بائیں گال پر زور کا گھونسہ مارا۔ میں پیٹ میں گھونسا مارا۔ میں ہل ہو گیا۔ جیب والے ہاتھ ڈالنے والے شخص نے مغلوب الغضب ہو کے میری جیب پر ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ میں نے آنکھ کے مارے اپنا سر اس کے سینے پر مارا۔ وہ دھڑام سے پلیٹ فارم کی زمین پر گر گیا۔ اس اثنا میں جو شخص میری جیب سے پیسے نکالنے کی کوشش میں تھا وہ بنیان پھٹ کر ہوا میں اس کے ہاتھ میں روپے نہیں آئے تھے یا اس نے اپنے دوسرے ساتھی کا خون دیکھ کے ارادہ ملتوی کر دیا ہو گا۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکال کے مجھے وار کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ چیل چلایا اور اُس کے پیٹ میں اتنے زور سے گھٹنا مارا جتنے زور سے اُس کے ساتھی نے مجھے مارا تھا وہ کراہتا بلبلاتا پیٹ پکڑے ہوئے نیچے کی زیب فیرا کے ڈھونے لگا۔ میں نے وہاں سے فوراً بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن بندھ آگے کے وہ دونوں غنڈے مجھے گھیر لیا میں اپنی جگہ تک کہ اُن کے لاٹھی چلانے کے لیے تیار تھا کہ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس دوران میں دوسرے نے جو شخص میں کے مجھ پر حملہ کر دیا تھا لیکن میرے روکنے سے پہلے اُس کے ساتھی نے اُسے روک لیا اور میرانی سے مجھے گھورنے لگا۔

"لاڈلے!" اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے تعجب کیا۔ "تو آ گیا ہو گیا ہے نا؟"

"ہاں میں سالے!" میں نے بھی ہونقوں کی طرح جواب دیا۔

"لاڈلے! وہ چیخ کر جوش میں مجھے لپٹ گیا اور اپنے ساتھی کے بال پکڑ کے اُسے اُس نے میرے پیروں پر گرا دیا۔ اٹھ کے مجھے بھائی اپنا لاڈلے! اپنا یار۔ اُستاد میں کا ذکر میں تم کرتے ہیں یہ اُستاد جھل کا لاڈلا ہے۔"

اُس کا ساتھی آنکھیں پھاڑے ہوئے اُٹھا۔ "یہ ہے؟"

"ہاں یہ میرے سینے سے جیلوں کے فخر سے بولا۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس نے جیل میں آتے ہی اُستاد کا سینے کر دیا تھا۔ راستہ نے اسے خود داؤ سکھائے۔ یہ سالے تم کیا تھا سے جیلوں کی دنیا بھی اس پر قبضہ نہیں جما سکتے۔ غیرت ہوتی کہ لاڈلے نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ مگر ہٹ جا

وہ میری طرف متوجہ ہوکے تذبذب سے بولا۔ "تو یہاں کہاں نظر آرہا ہے؟ تو کب آزاد ہوا؟ استاد کو خبر نہیں کی؟"

"میں آج ہی آزاد ہوا ہوں۔ استاد کے پاس نہیں گیا۔"

"کیوں؟" اُس کی بھنویں سکوڑ گئیں۔

"مجھے پہلے ایک اور جگہ جانا تھا۔ میں جلد ہی واپس اُسکے استاد سے ملوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"نہیں لاڈلے! اگر استاد کو خبر ہوگئی کہ تو اُس سے ملے بغیر چلا گیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا، اپھل ایک بار نہ اپنی شکل دکھا آئے۔ مین ہلے گا۔ اُس پر تو نے جادو کردیا ہے چل۔" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"نہیں۔ میں ابھی نہیں جاسکتا۔" میں نے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت بُری بات ہے لاڈلے!" اُس نے مجھے سمجھانا چاہا۔ "تو نے تو جیل میں بہت پڑھا لکھا ہے، پھر بھی ایسی ناقدری کی بات کررہا ہے۔"

"مجھے بہت ضروری کام ہے ساڑے! اسی لیے میں جھل بھائی کے پاس نہیں گیا کہ وہ مجھے جلدی نہیں جانے دیں گے۔"

"لاڈلے سات سال تک کام پڑا رہا، جیل سے آزاد ہوتے ہی تجھے اتنی جلدی ہوگئی لاڈلے تو تو بڑا بے مروت ہے۔"

"دیکھ ساڑے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ کوئی بات نہیں ہے لیکن مجھے اندازہ نہیں ہے کہ مجھے اس ون کا کتنے سال سے انتظار تھا۔ میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ تو استاد کو یہ بات مت بتانا۔"

"لاڈلے! اگر استاد کو معلوم ہوگیا تو وہ میری کھال کھینچ لے گا۔"

"تو کہہ دینا۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "کہہ دینا کہ لاڈلے بہت بُرا آدمی نکلا۔ ہوسکے تو اُسے منانے کی کوشش کرنا اور تیری مرضی۔"

اس اوران میں وہ دونوں غنڈے جنھوں نے میری مالا اور بوٹوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا اکڑاتے ہوئے اُٹھ کر آگئے اور ساڑے کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ "ساوا!" ساڑے نے کہا۔ "غلط آدمی پر ہاتھ ڈال دیا میری نظر چوک گئی۔ لاڈلے! اچھے دیکھے ہوئے سانے دن ہوگئے کہ میں تیرا ہر جھگڑا سلجھا دیا کرتا تھا۔ تو بھلا ہوتی۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ سلام کو تک بھی سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔" تجھے کیا ہوگیا ہے بچے! مزدوری چکر ہے کیا؟ میں بھی نہیں بتائے گا۔ اپھل چلے پی۔"

"جی نہیں چاہ رہا ہے۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"لے چل۔" اُس نے دھمکاتے ہوئے کہا۔ "سُنا باقی دن جیل میں کیسے گزرے؟ کوئی ہاتھ اس دیمان اوچھا ہی نہیں پڑا کہ تیرے پاس آجاتا۔ تجھے دیکھے ہوئے تین سال ہوگئے مگر تو نے مجھے خوب پہچانا۔ میں بھی تو کہوں مرن سالا ایسا جلیا آگیا جس نے ایک ہاتھ میں دو آدمیوں کا دھرون تخہ کردیا۔ چلو بے۔" اُس نے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "لاڈلے سے معافی مانگو۔ سلے اپنے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کا گناہ کررہے تھے۔" پھر اُس نے اپنے گال پر دو چار طمانچے رسید کیے۔ "کان پکڑ لے۔ یار معاف کردے لاڈلے!"

"جانے دے ساڑے! تیری اور ان کی کیا خطا ہے۔ یہ مجھے جانتے تھوڑی تھے۔ بس ہوہوگیا، نہ ہوگیا۔ اپنی سُنا، شول کیسا ہے؟ گانا گاتا ہے یا نہیں؟ کانتے کا کیا حال ہے؟ بندھو کیا کررہا ہے اور وہ چاتو باز۔ تجما کہاں رہے نصیب میاں کیا کررہے ہیں؟"

"یار سب ایک ساتھ مل لے گا۔ میں کہتا ہوں میرے ساتھ چل سات کا وقت ہے۔ سبھی ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوں گے۔ سفر پہ جانا ہے تو کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہن لے جا۔ استاد جھل کا آدمی اور اس حلیے میں سفر کرے۔ استاد کے نام کی تو لاج رکھ لے یار۔"

"بس کر ساڑے! مجبور کررہا ہے تو میں نے عاجزی سے کہا۔

"استاد سے مت کہنا، بس تجھ سے یہی التجا ہے۔"

"دیکھ بھئی لاڈلے؟ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو بتا، ہاتھ پاؤں احتیاط سے چلانا۔ ابھی سات سال کی کاٹی ہے، خیال رکھنا۔ ورنہ جہاں جارہا ہے، مجھے بھی ساتھ لیتا چل۔ میں اڈے پہ بکھیڑا بتاؤں۔"

"نہیں ساڑے! میں تنہا جاؤں گا بے فکر رہ۔ میں اپنا پورا خیال رکھوں گا اور جلدی واپس آؤں گا۔ دعا کر میرا کام ہوجائے۔"

"لے اپنی دعا کہاں قبول ہوگی ہاں سالی بڈھا کرا تو وہ دعا میں بل جائے گی۔ چل چائے پی۔"

چائے کے اسٹال پہ آکے ساڑے نے نہ صرف چائے سے بلکہ اُس کے لوازم سے بھی میری خوب تواضع کی۔ اڈے مجھے ٹھونس ٹھونس کر کھلا رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پہ آگئی تھی، وہ آخر وقت تک اصرار کرتا رہا کہ میں ایک بار جھل سے ضرور مل لوں۔ اس نے مجھے اپنی قسمیں اور واسکٹ اُتار کے دے دی۔ اُس کے ایک ساتھی کا جوتا میرے پیر میں فٹ آگیا۔ ایک کے گلے میں رومال بندھا ہوا تھا۔ اُس نے رومال میں مکھن اور بسکٹوں کے پیکٹ باندھ دیے۔ پھر ساڑے نے اُن سب کو حکم دیا کہ وہ اپنی جیبیں خالی کرکے جو کچھ بھی اُن کے پاس ہے میرے حوالے کردیں۔ میں منع کرتا رہا مگر انھوں نے میری جیب میں روپے ٹھونس ہی دیے جب تک گاڑی چل نہیں دی اور انھوں نے مجھے اُپر کی ایک برتھ پر آرام سے ٹکا نہیں دیا۔ اُس وقت تک وہ پلیٹ فارم پر ٹہر رہے۔ گاڑی حرکت میں آتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

*

ساڑے یا اُس کے کسی ساتھی کی زبانی جھل کو میری "ہائی" کا پتہ چل جاتا تو وہ بہت برہم ہوگا مگر اسے یہ خبر دو تین روز بعد ملتی تھی۔ جب جیل میں حسب معمول اُس کے آدمی یا وہ خود جھل سے ملنے کے لیے آتا۔ تب بھی وہ یہ جان کے بہت ناراض ہوتا جس انداز سے ساڑے اور اُس کے ساتھیوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ اُس سے مجھے یہ توقع تھی کہ وہ جھل کو نرم کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ وہ میری سفارش کریں گے۔ اب جو بھی ہو، ساری دنیا ناراض ہے تو جھل بھی ہوگا۔

میں برتھ پہ لیٹا بھی سوچتا رہا۔ گاڑی اسٹیشن پہ اسٹیشن عبور کرتی رہی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نیند نہیں آئی۔ اڈے پہ سامنے کی برتھوں پر اوپر نیچے ہر شخص سو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں جاگ رہا ہوں تو اُس بڈھے شخص کو اپنی برتھ کیوں نہ دے دوں جو زمین پہ سکڑا ہوا بیٹھا ہے اور بار بار کروٹیں بدل رہا ہے۔ نیچے اُتر کے میں نے اُسے جگایا اور اپنی جگہ کی پیش کش کی۔ وہ اگنشت بدنداں رہ گیا۔

"نہیں نہیں بابو جی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"جاؤ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔" میں نے اکتا ہٹ سے کہا۔

"میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے بابو!" اُس نے اجنبی سے جواب دیا۔

"لیٹ جاؤ۔ ٹی ٹی آئے گا تو دیکھی جائے گا۔"

وہ جھجکتا اور سمٹتا ہوا اوپر چلا گیا اور میں اُس کی جگہ فرش پہ بیٹھ گیا۔ باقی رات یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزر گئی۔ مجھے کسی کل چین نہیں تھا۔ سفر خاصا طویل تھا اور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ مگر اسٹیشن پہ معلوم ہوا کہ ابھی مراد آباد دو منزل ہے۔ ڈبے میں ہر شخص ایک دوسرے سے مانوس ہوگیا تھا، کچھ درمیان میں اُتر گئے تھے، کچھ نئے سفر آگئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بات کرنا چاہا۔ "کہاں جانا ہے؟ کیا کرتے ہو؟" میں ہوں ہاں کرکے ٹالتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے مجھ سے بات چیت ہی بند کردی۔ میرے کپڑوں اور بالوں میں سفر کی خاک دھول اٹ گئی تھی۔ جب میں نے باتھ روم کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو پہچاننے میں نہیں آیا۔ آنکھیں سُرخ تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ دل آئینے میں نظر نہیں آیا ورنہ وہ بھی سُوجا ہوا دکھائی دیتا۔ میں کسی اور دنیا کا آدمی تھا۔ یہاں اگر ہر شخص مجھ سے مختلف دکھائی دے سکتا تھا۔ گاڑی رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ دیر ہی اسے لیٹ بھی ہونا تھا۔ جیسے جیسے بریلی اسٹیشن قریب آتا گیا، مراد آباد پچاس میل کے قریب رہ گیا ہے۔ پھر رام پور تک پہنچنے میں فاصلہ گھٹ کے ستر اسّی میل رہ گیا۔ میں ڈنڈے کھینچنے والے کے ڈبے پر کلاہو گیا۔ ایک سفر کو اسے ساتھ لیا تھا، اپنی زندگی کا ہولناک سفر۔ گاڑی میں اُس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ بار بار ہر اسٹیشن پر اُتر کے میرا اُسے دیکھنا، اُس کا گونگی بنی رہنا، خمیدہ کے سیاہ برقعے سے اُس کے خوبصورت اُجلے چہرے کا جھانکنا وہ لرزنا۔ وہ سہمنا۔ یہاں بھی ہر اسٹیشن پہ اترکے میں اُسے دیکھتا تھا کہ شاید وہ کہیں نظر آجائے، شاید کوئی اتفاق رونما ہوجائے مگر اب میں اُسے پہچانوں گا کیسے؟ وہ تو بدل چکی ہوگی۔ اور بڑی ہوکے کیسی ہوگئی ہوگی۔ اُف! اُس پر تو نظر بھی نہ ٹھہرتی ہوگی۔ میں اُسے ہر شکل میں، ہر روپ میں پہچان لوں گا اور وہ مجھے اس حلیے میں دُور سے پہچان لے گی۔ میں سرا اسٹیشن پہ عورتوں کو گھورتا، ماڑی اور شربتی والے لوگوں کو غور سے دیکھتا گھومتا۔ ان میں کوئی موری صاحب جیسا شخص نہیں تھا۔ کوئی کرداری شخصیت نہیں تھی۔ وہ سب کالے کالے ناٹے، بھدے، بے ہنگم لوگ تھے۔ موری صاحب جیسا فرشتوں کا اور کورا جیسا گڑیوں اور پریوں کا معصوم چہرہ کسی کا نہیں تھا۔

"تاخیر سے سہی مگر آخر گاڑی مُراد آباد اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والا سب سے پہلا مسافر میں تھا۔ میرے حواس بجھے بجھے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح باہر آیا، سامنے تانگے کھڑے تھے۔ میں تانگے والے کو نعیم گنج کا پتہ بتا کر جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ سکتا تھا لیکن اسٹیشن کے عین مقابل ایک وسیع اور پُرشکوہ عمارت پر میری نظر گئی۔ اُس عمارت پر یہ بورڈ لگا ہوا تھا۔ "اسلامیہ مسافر خانہ مراد آباد۔" عمارت کی اوپری منزل کی تعمیر رکی ہوئی تھی۔ مسافر خانے کے ساتھ اسلامیہ کا لفظ دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں کے منتظمین سے مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھوں تاکہ اُن کا مکان ڈھونڈنے کی اُلجھن سے بچ سکوں۔ مولوی صاحب عموماً سفر کرتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا، ممکن ہے مسافر خانے کے منتظمین انھیں جانتے ہوں۔ یہ سوچ کے میں عمارت میں داخل ہوگیا۔ میرے پاس چونکہ کوئی سامان نہیں تھا اس لیے کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔

مسافر خانے کی دیواروں پر جگہ جگہ مسافروں کے لیے ہدایتوں کے بورڈ آویزاں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ سارنے صحیح کہتا تھا مجھ کو سکہ بڑھ ہوئے بال ضرور ترشوا لینا چاہیے تھے لیکن اتنا ہوش تھا کہ سے، میں نے اسی حلیے میں منتظم کے دفتر پہنچ کے اپنا تعارف کرایا۔

"فیض گنج؟" اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں فیض گنج کے کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں لیکن یہ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ پتہ آسانی سے دست یاب ہوجائے گا۔ یہ فرمائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "کلکتے سے۔"

"آپ کا سامان کہاں ہے؟ جب تک آپ انھیں تلاش کررہے ہیں اُس وقت تک اپنا سامان یہاں محفوظ کرا سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو رکنے کا بھی انتظام ہوسکتا ہے۔ یہ مسافر خانہ خدمت خلق کے لیے تعمیر کیا گیا ہے اسی لیے واجبی کرایہ رکھا گیا ہے جو ہر شخص آسانی سے ادا کرسکتا ہے۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر مسافر خانہ کہیں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے پہلے آپ نہا دھو کے لباس تبدیل کرلیجیے۔ عمارت کے باہر دکانوں میں حجام موجود ہیں۔ کھانے پینے کا بھی معقول انتظام ہے پھر اطمینان سے مولوی صاحب کی تلاش میں نکلیے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"

میں اس باترتیب منتظم کا شکریہ ادا کرکے اور مسافر خانے کے انتظام کی تعریف کرکے باہر نکل آیا، وہ توقع سے زیادہ خوش اخلاق شخص

تھا وہ میرے پیچھے پیچھے آیا لیکن میں تیز رفتاری سے ایک تانگے میں بیٹھ گیا تھا۔ "کہاں صاحب؟" تانگے والے نے کہیدہ ہو کے پوچھا۔

"فیض گنج۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کچھ اور سواریاں بٹھالوں؟"

"نہیں۔ میں پورے تانگے کا کرایہ ادا کردوں گا، جلد سے چلو۔" میری عجلت پسند نے مجھے گھور کے دیکھا اور گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ تانگا کھلا اور مراد آباد کی سڑکوں پر سرپٹ بھاگنے لگا۔ مراد آباد گاہی کی طرح کا اوسط درجے کا شہر معلوم ہوتا تھا لیکن گاہی سے یہاں گرمی زیادہ تھی۔ تانگے والے نے حسبِ عادت مجھ سے مختلف سوالات کرنے چاہے، میں اسے ٹالتا رہا۔ تانگا ایک لمبی سڑک سے گزر کے پُررونق بازار میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک گنجان علاقہ تھا۔

"فیض گنج میں کہاں اُتریے گا؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"جہاں فیض گنج آئے اتار دینا۔"

تانگے والے نے منہ تانک کے گھوڑے کو ایک گالی دی، یہ گالی گھوڑے نے تو شاید نہیں سنی ہوگی، یا گھوڑا گالیوں میں تمیز کرتا ہوگا کہ کون سی اُسے دی گئی ہے اور کون سی مسافر کو۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد تانگا ایک چوراہے پر پہنچا جہاں ایک بڑی سی محراب پر لکھا تھا "فیض گنج آپ کا خیر مقدم کرتا ہے"۔ جناب کا فیض گنج آگیا، دیکھیے سامنے چوکی ہے۔ فیض گنج پولیس کی چوکی۔ تانگے والے نے میرا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھا تو اُسے اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ "مراد آباد پہلی بار آئے ہیں سرکار؟" اس نے تکلف آمیز انداز میں کہا۔ "میرا نام خیر الدین ہے، لوگ مجھے خیرا کہتے ہیں۔ یہیں فیض گنج کے قریب کیل کے قریب رہتا ہوں۔ کبھی مراد آباد اسٹیشن پر مجھے بلا لیجیے گا صاحب کہ آپ کہاں ٹھیرے ہیں، ابھی کچھ دن تو قیام رہے گا؟ جب ضرورت ہو بلا لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بمشکل اس کے برابر بیٹھ کی ہی گردن ہلا دی۔

"فیض گنج ہے۔ کاش یہاں کسی قریب ہی کو رہا ہو۔" اس کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن ہے مولوی صاحب نے سکتے کے بعد سے آنے والے خطوں کا جواب دانستہ نہ دیا ہو اور اپنے کسی عزیز سے جواب لکھوا دیا ہو کہ وہ تو جیب سے نکلتے گئے ہیں، واپس ہی نہیں آتے کہ ان کے خیال سے مولوی صاحب نے ہر ممکن احتیاط برتی ہوگی۔ کاش مجھے اُن کے گھر کا پتہ معلوم ہوتا اور میں اُن دونوں کو چونکا دیتا۔ یہ چند ہی لمحوں کی خوش خیالیاں تھیں، ہوا کی طرح گزر گئیں۔ گلی میں چند لوگ نظر آئے تو میں نے اُن میں سے معقول شکل و صورت کے ایک شخص کو روک کے مولوی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ وہ میری کوئی امانت ادا کرنے کے بجائے حیرت میں پڑ گیا۔ مولوی محمد شفیق؟" اس نے ماتھے پر اُنگلی مارتے ہوئے آنکھیں مٹمٹا کے کہا۔ "ہاں ہاں۔ وہ۔ اسے آپ کہیں

اُن مولانا کی تو بات نہیں کرسکتے ہیں جو عرصے سے تقریر نہیں آئے ہیں، کچھ سُنا تھا کہ وہ کسی اور شہر میں جا بسے ہیں، واللہ اعلم۔ بہرحال وہ اب اس محلے میں نہیں رہتے۔ شہر میں ہوتے تو کبھی نظر آتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے انھیں برسوں سے نہیں دیکھا۔"

مراد آباد کا یہ شخص باتونی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کی زبان روکی "اب وہ یہاں نہیں رہتے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں صاحب وہ یہاں نہیں رہتے، بالکل نہیں رہتے۔ اتنی بات تو میں تین سے کہہ سکتا ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو میں نہیں جانتا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"اُن کا کوئی عزیز وغیرہ؟" میں نے ذہانی لہجے میں کہا۔ وہ اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ کوئی رشتے دار یہ کوئی تو ہوگا جسے اُن کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور اُن کے والدین بھی نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یہاں پیدا ہوئے تھے اور اگر وہ یہیں پیدا ہوئے تھے تو اُن کے والدین کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں اور سے آئے ہوں۔ اس صورت میں عزیزوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دُور کیوں جائیے، میں بھی کو دیکھ لیجیے میں یہاں پیدا ہوا۔ یہیں پلا بڑھا لیکن میرے والدین بارہ بنکی سے آئے تھے۔"

"جناب جلب! کوئی بزرگ کوئی تو ایسا ہوگا جو اُن کے بارے میں آپ سے زیادہ جانتا ہو۔ از راہِ کرم مجھے ایسے کسی شخص سے ملوا دیجیے۔" میں نے تملق سے کہا۔

"کیوں نہیں ہوگا۔ ایسے کوشش کرکے دیکھتے ہیں مگر آپ نے اپنے اسم گرامی اور دیگر حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ خادم کو شیخ حسین کہتے ہیں، میں چنگی میں ملازم ہوں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سرسری طور پر اپنا تعارف کرایا۔ ایک گھنٹہ دو سرا گھر نیا گھر، وہ شریف آدمی اپنا کام پھر ڈھنگ سے مجھے کئی گھروں پر لے گیا، کسی کے کچھ بتایا، کسی نے کچھ، آخر تنگ آکر صاحب مولوی صاحب کے کچھ قریبی عزیز کل آئے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے بہت سے عزیز شہر کے مختلف محلوں میں بستے ہیں لیکن مولوی صاحب نے شروع ہی سے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ رکھا تھا، وہ لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے اور عموماً مطالعے میں مصروف رہتے تھے یا سفر کرتے رہتے تھے۔ یاد آرہا ہے کہ ایک رات انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ان کا کوئی نہیں سوائے زبان کے، صرف ایک بچن سے اور اس سے بھی ملے عرصہ ہوگیا ہے۔ میں رات ہونے تک مختلف محلوں میں اُن کے عزیزوں کے گھروں کے چکر لگاتا رہا لیکن ہر جگہ سے مایوسی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولوی صاحب کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے جس شخص سے بھی پوچھا، اس نے یہی کہا۔ ہوں گے کسی پرلے مقام پر، برسوں ہوئے ہیں سوں گئے یا سیاحت کر رہے ہوں گے۔ تعجب ہے کہ اُن کے دو چار قریبی عزیزوں نے بھی اُن سے زیادہ دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ مولوی صاحب بڑی جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی گفتگو میں شائستگی تھی اور روپ تھا۔ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے، لباس بہت عمدہ پہنتے تھے، بڑی نفاست سے رہتے تھے، محتاط بے حد ضرور تھے مگر ملاقاتی کے دل میں دوبارہ ملنے کی خواہش پیدا کردیتے تھے۔ ایسی باغ و بہار شخصیت سے اُن کے عزیزوں کی بے تعلقی اور لاعلمی عجیب بات تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خود میں بھی اپنے عزیزوں، محلے کے لوگوں اور گھر والوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ جیل میں ہم سب قیدی ایک ہی بیرک میں بستے تھے مگر حقیقت میں کبھی اُن کے ساتھ نہیں رہا۔ میں تو ہمیشہ کورا کے ساتھ رہا۔

کتنے ہی گھر دیکھ ڈالے، اُن کے کتنے ہی عزیزوں سے پوچھا۔ مولوی صاحب کے ذکر پر کچھ لوگ تو مجھے سے اُن کی شکایت کرنے لگے کہ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کے ماں باپ کے انتقال پر لوگوں نے اُن کی خبر گیری کرنی چاہی تھی مگر وہ کسی کی بھی دل گاہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کے اُنے تو عزیزوں نے اُن سے شادی کرنے اور گھر بسانے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے صاف انکار کردیا۔ جب وہ خود ہی اپنے رشتے داروں کی فکر سے آزاد تھے تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ ان کی فکر کرتا۔ فکریں تو اعلیٰ لوگوں کی کی جاتی ہیں جو خود کسی کی فکر کرتے ہیں۔ محبت تو ایثار کا باہمی معاہدہ ہے مگر کچھ لوگ اس سے بلند ہوتے ہیں۔ وہ پروا نہیں کرتے کہ دوسرا کس شے کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ سودے بازی نہیں کرتے۔

گویا مولوی صاحب کلکتے کے مدرسے میں اپنا سامان واپس لینے نہیں آئے اور نہ کلکتے ہی میں آئے۔ میں اس کے باوجود مراد آباد میں اُن کا نام جانے والوں کے دلوں پر مسلسل دستک دیتا رہا۔ بہت سے نیک لوگوں نے مجھے اپنے گھر میں مہمان بنانے کے لیے اصرار کیا۔ میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ رات خاصی ڈھل گئی تھی۔ اگر کچھ اور وقت ملتا تو میں مزید لوگوں سے رابطہ قائم کرتا۔ تھک ہار کے میں مسافر خانے چلا آیا اور ایک کمرے میں بند ہوگیا۔ ریل کی دو ڈبیاں بھی جاگ کر گزری تھیں مگر نیند آج بھی آنکھوں سے غائب تھی۔ دل اُڑا اُڑا جاتا تھا کہ بُری طرح دُکھ رہا تھا۔ بعض لمحوں میں جو حیرت جانے وغیرہ سے تو ضائع کی گئی تھی، وہی پیشگی پڑ گیا تھا۔ جیل سے باہر کی دنیا بہت وسیع تھی۔ صبح اٹھ کے میں پھر محلے محلے گھومتا رہا۔ بعض لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اتنا ضرور پتہ چلا کہ مولوی صاحب کی والدہ شاید حیدرآباد دکن میں رہتی ہے۔ کسی کو اُس کا پتہ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں مراد آباد کی ایک مسجد میں بھی گیا جہاں ایک بڑی درس گاہ میں مولوی صاحب دینی تعلیم دیتے تھے۔ یہاں بھی مولوی صاحب کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ کلکتے کے مدرسوں کی طرح وہ سب بھی مولوی محمد شفیق کی روانگی پر حیرت زدہ تھے۔ میں پوچھتا پھتا مراد آباد کی برتنوں کی اُن گلیوں پر بھی گیا جن کے برتنوں کے لوٹے دکھا دکھا کے مولوی صاحب مختلف شہروں سے آرڈر لیا کرتے تھے اور انھیں مراد آباد بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب کا جزوقتی کام تھا۔

جہاں بھی مولوی صاحب کی خیر خبر کا ذرا امکان ہوا، میں وہاں ایک پیشہ ور سُراغ رساں کی طرح گیا۔ دو دن میں مراد آباد کے بہت سے لوگ مجھ سے واقف ہو چکے تھے۔ مراد آباد کے آخری سرے کے محلے کٹ گھر سے لال کوٹھی تک، دیوان کا بازار، محلہ پیر غریب، کرنل مفتی ٹولا، بھٹی محلہ، محلہ تمبا کو والاں، گل شہید، مغل پورہ، محلہ قاضیاں گویاں، مسلمانوں کے جتنے بھی محلے تھے، میں مسلسل تین دن تک اُن کی خاک چھانتا رہا۔ ان تین دنوں میں میری حالت اور خراب ہوگئی، کپڑے سیاہ ہوگئے، پاؤں میں گھٹنے پڑ گئے۔ مجھے پاگل سمجھا جانے لگا۔ مجھے لے شہر میں چلتا ہوا آدمی بار بار نظر وں میں آتا ہے۔ تین دن میں مراد آباد کے لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے اشتیاق اور تپاک کے بجائے تجسس، طنز اور مزاح پیدا ہوگیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس شہر میں کوئی شخص مولوی صاحب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور جب یہ امکان ختم ہوگیا تو میری آنکھوں کی روشنی ماند پڑنے لگی اور میرا حلق خشک ہونے لگا، سانس رُکنے لگی، کھانسی ہونے لگی۔ حتاکہ بخار آگیا۔ میں اسی حالت میں ایک رات پھر فیض گنج گیا اور گلیوں میں گرتا پڑتا مارا مارا پھرتا رہا۔ مسافر خانے واپس جاتے ہوئے منڈی چوک کی ایک دُکان کے تختے پر نڈھال ہو کے بیٹھ گیا۔

مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ یہاں بھی کلکتے کے اسٹیشن والا واقعہ دُہرایا گیا، میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی، وہ تین تھپڑ کے تھے۔ پہلے تو انھوں نے مجھے فقیر سمجھ کر چھڑا، تھپڑ مارا۔ میں نے اُن کی بات سے بے نیازی برتی تو وہ شرارت پر اُتر آئے۔ وہ شاید آخری شو دیکھ کے واپس آرہے تھے۔ ٹرنگ میں تھے، کچھ جیب میں ہے میاں جی؟ ایک نے یہ پوچھتے ہوئے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اُسے ڈانٹ کر بھگانا چاہا تو وہ سب ہنسنے لگے۔ ان میں سے دو نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ میری تلاشی لے۔ میں بُری طرح اُن کی گرفت میں تھا۔ میں اپنے آپ کو خود اُن کے حوالے کردیتا لیکن میری گردن میں مالا پڑی ہوئی

تھی اور جو روپے میری جیب میں تھے، وہ میرا آخری سہارا تھے۔ میں نے اُن سے منت کی کہ وہ مجھے چھوڑ دیں، ایک بے گھر غریب آدمی کر پریشان نہ کریں۔ اُس نے روپے جیب سے نکال لیے۔ اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "لے یہ دیکھ۔ یہ دیکھ۔ اس کی جیب میں تو بڑا مال ہے۔" اُس نے اپنے ساتھیوں سے چیخ کر کہا۔

"اور دیکھ اور دیکھ۔ ان فقیروں کے پاس مال نہیں ہوگا تو کیا ہم کنگالوں کے پاس ہوگا۔ چل جلدی سے اپنا کام کر۔ وہ حرامی اِدھر ہی ٹہلتا رہتا ہے کسی بھی سمے آسکتا ہے۔" اُس کے ساتھی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میرے روپے واپس کرو۔" میں نے ہاتھ کر کہا۔

"ضرور ضرور، ہم تجھے سویرے ناشتے کے اور کل شام کی پکچر کے پیسے ضرور دیں گے بتا اور مال کدھر ہے؟"

"روپے واپس کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ارے جس شخص نے میری جیب سے روپے برآمد کیے تھے، وہ میرا نیفا اور جسم ٹٹولتے ٹٹولتے جب گردن تک پہنچا اور مالا سے اُس کے ہاتھ ٹکرائے تو حیرانی سے بولا "ابے یہ تو ایک مالا بھی پہنے ہوئے ہے۔"

"کھینچ لے گردن سے۔" اُس کے ساتھی نے گرج کے حکم دیا۔

"ہاتھ مت لگانا۔" میری آواز غصے سے کانپنے لگی۔ اُس کا ہاتھ میرے گریبان کے اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے یک بارگی اچھل کے اپنی دونوں ٹانگیں اُس خبیث شخص کی ٹانگوں پر مار دیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی دُکان کے بند دروازے سے ٹکرایا اور چیخنے لگا۔ یہ اُس کے ساتھیوں کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ دونوں میرا بازو جھپٹ کے بجلی کی طرح سامنے آگئے اور ایک نے کمر سے چاقو نکال کے اور پینترا بدل کے تیزی سے کہا۔ "مالا نکال۔"

میں ایک لمحے تک سُن کھڑا رہا۔ اُس نے چاقو لہرا کر مجھے گردن سے مالا نکالنے کا دوبارہ حکم دیا۔

"کیا مالا تیرے باپ کی ہے۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"یہ تو تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں یہی چاہتا تھا کہ وہ چاقو کا کوئی غلط ہاتھ دکھاتے۔ وہ مجھ سے اور نزدیک ہو گیا۔ میں یوں ہی کھڑا اُن دونوں کو گھورتا رہا۔ "یہ چاقو ابھی تیرے پیٹ میں اُتر جائے گا۔ جان پیاری ہے تو مالا حوالے کر دے۔"

میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔ ایک ثانیے بعد میرا بھرپور تیلا ہاتھ چاقو والے شخص کے نیچے پر تھا۔ دوسرے نے مجھے لاتیں ماریں اور مجھ پر گھونسے برسائے۔ لیکن میں نے اس کے ساتھی کا پنجہ نہیں چھوڑا اور اُس کا بازو مروڑ کے چاقو اُس سے چھین لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُن کے ایمان خطا ہو گئے۔ وہ گھگھیانے لگے۔ اگر مجھے سات سال کا تلخ تجربہ نہ ہوا ہوتا تو میں اُن کے پیٹ میں چاقو اتار دیتا۔ "روپے واپس کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ابھی سیاں جی ابھی، جلیے روپے لے۔" اُس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا "جا خبردار جو ایک پائی کی بھی کمی ہوئی۔ سیاں جی مجھے کوئی اُستاد آدمی رکھتے ہیں۔ میں نے اُس کے تبصرے پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ دوسرا ساتھی بھاگا ہوا اپنے کراہتے ہوئے ساتھی کے پاس گیا جو زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ روپے اُس کی جیب سے نکال کے تیزی سے واپس آیا۔ گن لیجیے سیاں جی! اُس نے روپے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ میں نے گنے بغیر انھیں جیب میں رکھ لیا۔ پہلے تو نہیں دیکھا۔ کیا نئے نئے شہر میں آئے ہو اُستاد؟"

سپاہی کی چاپ سے ہمیں پریشان ہو گئے۔ میرا جواب سُنے بغیر انھوں نے زمین پر پڑے ہوئے ساتھی کو اُٹھایا۔ وہ پندرہ بیس قدم بھاگ کے گلی میں بھاگنے ہی والے تھے کہ میری گرجتی ہوئی آواز نے انھیں روک لیا۔ "ٹھیرو۔ اپنا چاقو لیتے جاؤ۔"

انھوں نے چاقو واپس لینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے حیران ہی نہیں، ہکا بکا کر میرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ہے سپاہی میرے پاس آچکا تھا۔ میرا حلیہ اور چاقو دیکھ کے اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ "کون ہو تم؟" اُس نے سپاہیانہ آواز میں پوچھا۔

"ایک مسافر ہوں۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہاں کون تھا ابھی، یہ شور کیسا ہو رہا تھا؟"

"تین لڑکے تھے، چاقو چلانا آتا نہیں اور چاقو لیے پھرتے ہیں۔ مجھے یہ دکھا کے روپے لوٹنا چاہتے تھے۔ میں نے چاقو چھین لیا، بھاگ گئے۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"چاقو دیکھ کے بھاگے یا میرے قدموں کی آواز سُن کے؟"

"جو سمجھ لیجیے قسمت نے آپ کو بھی وقت پر بھیج دیا۔"

"میں تمھارے بیان پر کیوں یقین کروں؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں۔" میں نے تُرشی سے کہا۔ "اُن کا چاقو میرے ہاتھ میں ہے شاید آپ نے انھیں بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا ہو۔"

"یہ چاقو تمھارا بھی تو ہو سکتا ہے۔" دوگنے کے برابر "کہاں ہے ہوٹل، کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں یہاں ایک ملازمت کی تلاش میں تھا۔ انھیں دیکھتے دیکھتے تین ان ہو گئے۔"

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ "مجھے تم کوئی خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس شہر میں تمھیں کون جانتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر شہر میں آدمی کا جاننے والا

موجود ہو۔" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چاقو آپ لے لیجیے۔"

اُس نے ایک کر چاقو میرے ہاتھ سے لیا جیسے میں نے اُسے یہ دیا نہیں ہے بلکہ اُس نے مجھ سے چھینا ہے۔ معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے تمایدہ تم لوگوں کا ڈاکا ڈالنے کا پروگرام تھا۔ تم نے اپنے ساتھیوں کو بھگا دیا؟"

"حوالدار صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کر کہا۔ "یہ دیکھیے میرا ہاتھ۔ بخار میں جل رہا ہے۔ یہ دیکھیے۔" میں نے اپنی کلائی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"کیوں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"جرم؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ جرم نہیں ہے؟ رات کے وقت یہاں تمھارا شور شرابا کرنا جرم نہیں ہے؟ باقی جرم تھانے دار صاحب ثابت کریں گے اور وہ صبح سے پہلے تمھیں نہیں چھوڑیں گے جب تک انھیں اس علاقے میں آج کی رات صحیح و سلامت گزرنے کا یقین نہیں ہو جائے گا۔ چلو۔"

میں نے اُس کی منت سماجت کی، شہر میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے میں اپنے تعلق کا حوالہ دیتا۔ اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ آدمی دُنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا، اُس کی کوئی بنیاد ضرور ہونی چاہیے۔ کسی نہ کسی گھر اور کسی گروہ سے اُس کی وابستگی ضروری ہے کیونکہ ہر انسان پولیس کے حلقے میں رہتے ہیں۔ انھیں سب سے زیادہ ضرورت شناخت کی پڑتی ہے اگر میں اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا تو وہ اپنے گلے میں پڑی ہوئی سیٹی بجا دیتا۔ اس سیٹی سے مجھے بہت خوف آتا تھا، جب بھی مضری جیل میں سیٹیاں بجاتے تھے میں اپنے کان بند کر لیتا تھا۔ سیٹی کی آواز سے میرا دل روداں لرزنے لگتا تھا۔ حوالدار میری منت سماجت سے ضد پر اتر آیا۔ میں نے بہت کہا مگر وہ نہیں مانا، میں نے اُسے اُس روپے نکال کے دیے۔ وہ کچھ پسیج گیا، متذبذب ہوا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا۔ ہاتھ میں چاقو، گلے میں قیمتی مالا، جیب میں روپے اندھیری رات، اجنبی شہر، لٹیروں کا حلیہ، ان تمام خصوصیات کی ایک جاتی سے کسی کو بھی مجرم ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ تو ایک خصوصیت بھی تھی۔ اگر کوئی یہ پہچان لیتا کہ ٹھکنے میں میں قتل کے سات سال کی سزا کاٹنے والا شخص اُس کے سامنے موجود ہے تو میں چلتے تو پرزے رکھ دیتا پھر بھی اُسے میری بے گناہی کا یقین نہ آتا۔ میں کچھ دیر تک خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا پھر ایک نیم تاریک گلی کے قریب رک کے میں نے اُس سے ایک بار پھر درخواست کی۔ تھانا بہت قریب ہے، زیادہ دور نہیں جانا، اُس نے طنز کیا۔

"سنو حوالدار جی!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے آپ مجھے ہوٹل لے جا کے وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"سب مجرم ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔"

"آپ مجھے مجرم کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"ملزم سمجھ لو۔" وہ طنز آمیز انداز میں بولا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے برہم ہو کے کہا۔

"کیا؟" اُس نے میرے تیور دیکھ کے سیٹی پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے اُس کا ہاتھ وہیں روک لیا اور سیٹی کی ڈوری کو جھٹکا دیا۔ سیٹی دُور جا گری۔ "کیا کیا؟" وہ بوکھلاہٹ میں بولا۔ "یہ ایک اور جرم ہے۔ جگران کی سوگند اتنی مار لگواؤں گا کہ بھی کا دُودھ یاد آجائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں اُسے ران سے کھینچتا ہوا گلی میں لے آیا۔ "چپکے سے یہاں بیٹھ جاؤ اور آواز مت نکالو۔ شور کیا تو گلا گھونٹ دوں گا۔" میری آواز میں ایسی گرج تھی کہ کسی کی زبان کو قفل لگ گیا۔ میں تمھیں یہیں ختم کر کے فرار ہو سکتا ہوں۔ کل کسی تمھارے بیوی بچوں کا خیال آگیا جاؤ اپنا راستہ سنبھالو یہ۔"

وہ ٹھٹک گیا۔ اُس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کے زور کا اندازہ میں تھا، جب اپنے شانوں پر اُس نے دباؤ محسوس کیا تو غصے یا خوف سے اُس کا انگ انگ کانپنے لگا اُس نے اپنی ٹوپی سنبھالی اور سیٹی گلی کے پار ہو گیا۔ میں اندھیر گلی میں رینگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بھاگتے ہوئے سپاہیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہی ہیبت ناک آوازیں جو برسوں کے کانوں دل میں گھس جاتی ہیں۔ بھوک اور بخار کی تاراجی میں، میں گلی میں بھاگتا رہا۔ سپاہی نے مجھے معاف نہیں کیا۔ ایک سیٹی کی تو ہر طرف سیٹیاں گونجنے لگیں۔ نتیجتہً مجھے خود کو ایک تہ یافتہ مکان کی شکستہ دیوار کی اوٹ میں چھپ کے بیٹھ جانا پڑا۔ وہاں ہر غسیوں کا اڈا رہا تھا۔ میری آمد پر غسیوں میں افراتفری پھیل گئی وہ چیخ چلانے اور شور کرنے لگیں میں چپ چاپ پڑا رہا۔ یہ کسی کمرے کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا جو کبھی مکان کے اندر شامل ہوگا۔ آدھی چھت سلامت تھی۔ آدھی کی گری ہوئی اینٹیں ادھر اُدھر بکھری ڈھیروں میں پڑی ہوئی تھیں جو حصہ زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا، اب اُسی میں مکان تھا۔ مکان کے ایک مرکے میں روشنی ہوئی اور کسی عورت کی لرزیدہ آواز اُبھری "کون ہے؟" میں دم سادھے پڑا رہا۔ غسیاں کوسنے لگیں۔ عورت نے ایک بچے سے لالٹین باہر نکالی "کون ہے؟" وہ پھر چلائی۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا ہوگا دوسرے ہی لمحے ایک چیخ میری ہمیشہ کے لیے کراہ نکل گئی۔ مگر میں اسی طرح پڑا رہا۔ تاروں اور اینٹیں پھینکی جانے لگیں۔ کھسک کے دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ہر سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ کسی دوسری جگہ بھی پناہ نہیں لے سکتا تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ عورت

کے گھر والے جان کر شور نہ مچادیں۔ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "ایک پناہ گیر ہے۔"

"پناہ گیر؟" عورت کی خوف زدہ آواز ابھری۔

"ہاں اماں! پناہ گیر چور نہیں ہوں۔"

"مگر۔ مگر تم ہو کون؟" عورت کا خوف بڑھ گیا تھا۔

"میں ایک مسافر ہوں اماں! وہ شاید قریب آ رہے ہیں۔ ازراہِ کرم کچھ دیر کے لیے لالٹین اندر کر لیجیے اور خاموش ہو جائیے۔"

اُس نے میری بات مان لی، موکھلے سے لالٹین اور اونچا سر بنا لیا۔ برمیاں بھی شاید اپنی مالکن کی آواز سن کر خاموش ہو گئی تھیں۔ دیوار کے قریب تیز سیٹیوں اور تیز قدموں کی آوازیں آئیں۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ عورت نے لالٹین پھر موکھلے سے نکال لی تھی۔ "آپ کا شکریہ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔" یہ کہہ کے میں شکستہ دیوار سے باہر نکلا۔

"ٹھہریے۔" اس نے مجھے جاتے دیکھ کر کہا۔ میں پیچھے مڑ کے دیکھنے لگا، لالٹین پھر موکھلے کے اندر ہو گئی اور آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، چادر میں لپٹی ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اُس کا چہرہ سفید تھا۔ "اگر آپ نے اس رات بسر کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے تو آپ یہاں ٹھہر سکتے ہیں مگر صبح ہونے سے پہلے چلے جایئے گا۔"

"شکریہ۔" میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "میں مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں اور پہلی گاڑی سے واپس جانے والا تھا۔ گاڑی صبح چھ بجے جاتی ہے۔ راستے میں یہ لوگ پیچھے پڑ گئے۔"

"اندر آ جایئے۔ میری نظریں زمانے کے سرد و گرم سے خوب واقف ہو چکی ہیں، اندر آ جایئے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے تکلف کیا۔ "آپ کے گھر والے....."

"انھیں میں سنبھال لوں گی۔ آیئے۔" اس نے مخلصانہ لہجے میں اصرار کیا۔ میں انکار کرتے کرتے رہ گیا اور اس کے پیچھے جھجکتا جھجکتا مکان کے اندر داخل ہوا۔ کسی زمانے میں یہ ایک چھوٹی سی خوب صورت حویلی ہوگی۔ اب کھنڈر میں بدل گئی تھی، رات کو مزید ویران اور پُراسرار ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے برآمدے کی چوکی پر بٹھا دیا اور خود اندر جا کے شاید بستر کا انتظام کرنے لگی۔ پھر وہ مجھے ایک شکستہ کمرے میں لے گئی جہاں ایک چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ اس کے گھر میں کئی مرد نہیں تھا، شک انہی کے لیے یہ ایثار بڑی حیرت کی بات تھی۔ "آپ یہاں آرام کیجیے۔ میں فجر کی نماز سے پہلے آپ کو اٹھا دوں گی؟"

"آپ نے بہت زحمت کی اماں! آپ تو فرشتہ ہیں۔ آپ نے میرا یکلخت دیکھنے کے باوجود احسان کیا۔ میری جگہ میں نہیں آتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟"

"ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ میرے شوہر سرحد پر گئے ہیں، میری دو بچیاں ہیں۔ ایک کو اس کے ماموں لکھنؤ لے گئے ہیں۔ دوسری یہیں ہے۔ یہاں اردگرد سب میرے شوہر کے عزیزوں کے مکانات ہیں۔ آپ کے طلیے ہی نے مجھے متاثر کیا۔ وہ پڑھی لکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔ مر جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ آپ ایک اچھے آدمی ہیں اس لیے میں نے یہ جرأت کی اور پھر یہاں کیا رکھا ہے ——— ڈرتے ترماں دولت والے ہیں ہم غریبوں کے پاس خلوص کی دولت کے سوا کیا ہے۔ کچھ کھایئے گا یا پیجیے گا؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے ایک گلاس پانی پلا دیجیے۔ شاید مجھے بخار ہے۔ مسافر خانے جاتے جاتے میں ایک دُکان کے تختے پر سکتے کے لیے رک گیا تھا کہ....." میں نے مختصراً اپنی روداد سنائی۔

"توبہ ہے۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "آج تو آپ بچ گئے، مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک شریف اور بہادر شخص میرے گھر مہمان ہے مگر آپ کو بخار ہے؟ لایئے مجھے اپنا ہاتھ دکھایئے۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میری کلائی پکڑ لی۔ "اسے واقعی۔ آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔" مجھے گاہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یقیناً میرے گھر آپ کو اللہ نے بھیجا ہے۔ بھلا اتنے بہت سے گھروں میں آپ یہیں کیوں آتے مگر میں آپ کو پانی نہیں پلاؤں گی بغیر دودھ کی چائے پیجیے۔ آپ بالکل لیٹ جایئے۔ ٹھہریے میں کر لیجیے۔ دیکھیے کوئی تکلف مت کیجیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

بستر پر لیٹتے ہی جسم جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک دیا۔ تین دن کی مسلسل تھکن اور بھوک سے حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ تھی۔ اب بستر کے اور اس نیک عورت کے گداز نے تمام طاقت چھین لی۔ جیسا تپ کے بخار میں ہوش و حواس جاتے رہے۔ نہ جانے وہ عورت کب واپس آئی اور میں بخار میں کیا کیا بکتا رہا۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے دیکھا، میرا سارا کرتا پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ میں کئی لحافوں میں دبا ہوا تھا اور عورت میرے سر جانے بھیگی ہوئی میرے ماتھے پر بھیگا کپڑا رکھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی تیز تھی اور قریب ہی اس کی بچی ایک تسلے میں کپڑا بھگو بھگو کے دے رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے اٹھنے کی کوشش کی عورت نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کے مجھے لیٹے رہنے دیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو پسینہ آ گیا۔ ورنہ آپ کی حالت تو بگڑ گئی تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے نقاہت آواز میں پوچھا۔

"فجر قریب ہے؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، سارا کمرہ گھومنے لگا۔

"آپ اس حالت میں کہیں نہیں جا سکتے۔"

"تو میں یہاں بھی تو نہیں رہ سکتا۔"

"مگر آپ جائیں گے کیسے؟" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

"کسی نہ کسی طرح مسافر خانے تک پہنچ ہی جاؤں گا۔"

"آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے ——— دیکھیے اگر آپ کو ابھی دوا اور پرہیزی غذا نہیں ملے گی تو طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔ میرے لیے ایک اجنبی مرد کو سنبھالنا مشکل ہے۔ طرح طرح کی باتیں ہوں گی لیکن میں آپ کو اس حالت میں باہر بھی نہیں جانے دے سکتی۔" اب ایک ہی شکل ہے کہ میں آپ کو اپنے مکان کی اس بوسیدہ کوٹھری میں ٹھہرا دوں جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی۔ وہاں میرے مرحوم شوہر کا سامان بندھا ہے۔ مجبوری کی بات ہے وہ کوٹھری رہنے کے لائق تو نہیں ہے مگر آپ بھی باہر جانے کے لائق نہیں ہیں۔"

یہ اس کا فیصلہ تھا، کہنے کا انداز مختلف تھا، اس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے اس بوسیدہ کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا اور دن کے وقت باہر سے تالا لگا دیا گیا جب گھر میں کسی کے آنے کا اندیشہ نہ رہا تو وہ میرے لیے عجلت میں دعا بنا کے لائی اور اصرار کر کے ایک قدح مجھے پلوایا۔ باہر اس کی بچی پہرا دے رہی تھی تاکہ جیسے ہی دروازے پر دستک ہو وہ باہر چلی جائے۔ یہ ترکیب سود مند ثابت ہوئی۔ وہ دن میں متعدد بار مجھے دیکھنے آتی دوپہر کو اس نے مجھے دلیا بنا کے کھلایا۔ صرف ایک دن میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی بہن، اپنی ماں، اپنی بیوی کے گھر میں ہوں۔ اس نے مجھے رات کو بتایا کہ میں بنا سکی حالت میں کودا۔ فہمیدہ، امی، ابا، جمیل، جمیل، جاگو اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ سر نے ان رات کو وہ مسلسل کوٹھری میں رہی اور اس کی پلکیں میرے پیر باندھتی رہی۔ پہلے وہ سہمی ہوئی تھی، بعد میں اپنی ماں کی دیکھا دیکھی مجھ سے گھل گئی وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن معلوم ہوتی تھی۔ بالکل ایسی ہی تھی، اتنی ہی پیاری، اتنی ہی معصوم۔ دوسری رات اور دو سراں دن بھی میں نے اس کوٹھری میں گزارا۔ عورت کا نام امجد تھا، وہ ریاست رام پور سے بیاہ کے مراد آباد آئی تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس نے اس کا چہرہ دیکھا، بچہ داری، برداشت اور محنت کے علاوہ عزم اور حرکت بھی اس کے چہرے سے نمایاں تھی، کسی زمانے میں اس کا رنگ سرخ سپید گلابی رہا تھا۔

اب وہ غریبی اور عزلت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے شوہر کے عزیزوں کے ظلم و ستم، فضول تشنوں اور سرکاری شیخ کی ایک طویل اور دردناک داستان سنائی۔ اسکول کالج کی اور ملنے کی باتیں بھی اس کے ہاں پڑھنے آتی تھیں، وہ ایک بلند ہمت عورت تھی مگر غربت میں سلیقے کا رنگ کہاں نکھرتا ہے۔ بڑی جدوجہد کے دوران میں اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اسکول سے چھٹی لے لی تھی اور بچیوں کو منع کر دیا تھا، چار دن تک وہ خدا ترس عورت میری تیمارداری کرتی رہی۔ چار دن بعد میری حالت کسی قدر سنبھلی۔ اس نے اپنے گھر کی کتنی مرغیاں کاٹ کے اور ان کا شوربا بنا کے مجھے پلایا۔ وہ میرے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش مند تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کلکتے میں ایک استاد جو اچانک غائب ہو گئے، میں انھی کی تلاش میں آیا تھا۔ میں نے بخار کے ہذیان میں جن جن لوگوں کے نام لیے تھے وہ میرے عزیز تھے یا ملاقاتی۔

چوتھے دن بھی اس نے مجھے نہیں جانے دیا۔ پانچویں روز بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ میرے چلتے وقت وہ بہت روئی، اور اس کی بچی رات بھر جاگتی رہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اسے دوبارہ ملنے آؤں گا۔ صبح کاذب کے وقت میں نے اس کے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا، جب میں انسوؤں کے ساتھ اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے میرے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھما دیا۔ میں نے اسے کھول کے دیکھا، اس میں کرتے، پاجامے کے دو جوڑے، دو چادریں اور دو بنیان رکھے ہوئے تھے۔ ایک پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ کچھ نہ بول سکی، رو رہی تھی۔ میں نے سر ہلا، اس کی بچی فرخ آ کر روتے روتے دوں لیکن یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں نے فرخ کو گلے سے لگا کے خوب پیار کیا۔

مراد آباد اسٹیشن سے آنے جانے والی گاڑی صبح سویرے روانہ ہوتی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ دو راتوں اور ایک دن کی رات کے بعد حیدر آباد دکن کے سنگ پلی اسٹیشن پر اترا۔

اسٹیشن سے باہر آتے ہی مجھ پر اداسی کا غلبہ ہوا۔ میرے ذہن میں اس شہر کا تصور کچھ اور تھا۔ یہ تو ایک وسیع اور گنجان شہر تھا، بڑا مگر کلکتہ قدیم و جدید طرز کی عمارتیں چوڑی سیاہ سڑکیں، ٹیلوں پھیلے ہوئے بازار مگر دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہ ایک بدلا ہوا شہر تھا۔ یہاں کے ہنگامے میں بھی سکون تھا، مسرت پر اداسی

دکانوں میں جتنے بھی آدمی نظر آئے سب بند گلے کی شیروانیوں میں ملبوس تھے، ہر جگہ اُردو کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے۔ لوگوں کے انداز میں ایک تمکنت تھا، نفاست اور سجاوٹ تھی۔ میں سارے دن کی دی ہوئی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں ہوٹل میں ٹھیرنے اور اپنا حلیہ درست کرنے کے بجائے ارجمند بانو کا تھیلا ہاتھ میں لیے جدھر منہ اُٹھا، اُدھر نکل پڑا اور مختلف مدرسوں اور مسجدوں میں جا کے محمد شفیق نامی ایک مولوی کا پتہ پوچھتا رہا۔ لوگ مجھ پر ہنسنے لگے میں عاجزی سے درخواست کرتا کہ وہ ذرا توجہ سے میری بات سُن لیں، مجھے مولوی محمد شفیق یا اُن کی بابت بتا دیں۔ اُن کا اور اُن کے شوہر کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ نام پلی اسٹیشن سے کئی میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا میں پرانے شہر میں داخل ہو گیا اور اس آخری سرے تک گیا جہاں چاؤش رہتے تھے اور جہاں نظام نے ایک پُرشکوہ عمارت فلک نما بنائی تھی۔ اب تو منہ کھولتے ہوئے بھی ندامت ہوتی تھی۔ پہلے ہی دن کی ناکامی دیکھ کے مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ یہاں تو وقت محض ضائع کرنا تھا مگر وقت کی کمی کس کے پاس تھی۔ میرے پاس زندگی باقی پڑی تھی۔ ابھی میری عمر ۲۲، ۲۴ سال سے زیادہ نہیں تھی جب کچھ نہ بنا تو میں نے حیدر آباد میں مراد آباد کے لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ لوگ طرح طرح کے سوال کرتے کہ اُن کی شادی کب ہوئی تھی؟ وہ کب حیدر آباد منتقل ہوئیں؟ اُن کے شوہر کا نام کیا ہے؟ کہیں یہ تو نہیں ہے؟ کہیں وہ تو نہیں ہے؟ اس تگ و دو میں ایک اخبار نویس سے میری ملاقات ہو گئی۔ اُس نے میری درخواست پر اپنے اخبار میں اس مضمون کا اشتہار شائع کیا۔

مراد آباد (یوپی) کے جناب مولانا محمد شفیق
بالقابہ اور اُن کی ہمشیرہ محترمہ جہاں کہیں بھی قیام
فرما ہوں، توجہ فرمائیں اور مدینہ ہوٹل میں بار خاں
سے رابطہ قائم کریں۔ بار خاں کے پاس ہر دو موصوف
کے لیے ایک امانت محفوظ ہے۔

مشتہر: اختر بار خاں

اخبار میں اشتہار چھپنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اخبار پرانا ہو گیا۔ میں حیدر آباد میں ایک ہفتے قیام کرنے کے بعد آخر دلی آ گیا۔ دلی سے لاہور اور لاہور سے پشاور گیا اور وہاں سے پیوند بریلی پھر لکھنؤ آ گیا۔ اس سفر میں مجھے دو مہینے لگ گئے۔ میں نے مختلف دینی درس گاہوں میں مولوی صاحب کو تلاش کیا لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کہیں نہیں ملے۔ آخر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ لکھنؤ آخری شہر تھا جہاں مجھے اپنے آپ کو یہ جبریہ سمجھانا پڑا کہ مولوی صاحب سے ملاقات اب ممکن نہیں ہے، نہ جانے اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ وہ کس کھوہ میں گم ہو گئے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں کس سے اُن کا پتہ پوچھوں؟ ابھی تو صرف چند شہر دیکھے ہیں کہاں کہاں جاؤں۔ اب مجھے کچھ سکون ہو چلا تھا، مُردوں جیسا سکون، مفلوج اور معذور آدمیوں جیسا سکون۔ مایوسی مجھے کوئی جلدی تھی نہ وحشت۔ جیب میں صرف چند پیسے باقی رہ گئے تھے مجھے اور انتظام کرنے کی فکر بھی نہیں تھی۔ بس ایک کرب بہ تھا کہ مرنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔ سات سال کس اُمید پہ کاٹے تھے پڑھا لکھا تھا اور قیدیوں سے زندگی سمجھنے کی کوشش کی تھی تاکہ کورا کو بھی پریشانی نہ دے۔ میں اُس کے لیے اپنی ذات کا ایسا مضبوط قلعہ بناؤں کہ کوئی اس پر نگاہ اُٹھانے کی جسارت نہ کر سکے۔ قلعہ اپنے لیکن تلاش کر رہا تھا مگر ہوا کیا؟

قیاس کیا تھا کہ مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مجھ سے خون کی واردات سرزد ہو گئی ہے اب کورا کی موجودگی میں مجھ سے رابطہ قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے جیل کا رُخ نہیں کیا، وہ کسی خط کے ذریعے تو مجھے مطمئن کر سکتے تھے مگر انھیں کیا معلوم ہو گا کہ میں نے جیل میں اپنا نام کیا بتایا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے میرے اصل نام پر خط لکھا ہو اور جیل کے حکام نے اسے تلف کر دیا ہو کہ اس نام کا کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے۔ بہرحال اب سات سال گزر چکے تھے، درمیان میں وقت کی موٹی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو کیا سانحہ پیش آیا۔ میں نے کسی اور خیال کو دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ شاید اسی مثبت خیال سے میں اپنی سزا کاٹ سکتا تھا۔ سوچا تھا کہ مولوی صاحب نے ضرور کورا کو حاصل کر لیا ہو گا جبھی تو وہ نہیں آئے۔ انھیں معلوم ہو گا کہ میں جیل سے چھوٹتے ہی ان کی تلاش میں آؤں گا۔ وہ کورا کو دلاسا دے کے زندہ رکھے ہوئے ہوں گے۔ کورا ایک ایسی لڑکی تھی جس کے لیے بڑے بڑے ایثار کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی مثال خود میرے سامنے تھی۔ میں نے ابا کی بات نہیں مانی، اتنی دور صرف اس لیے آ گیا تھا کہ میں کورا کو بدھ گیا کے بڑے جھگڑے کے پاس چھوڑ آؤں لیکن امی اور ابا سے اتنا پرانا تعلق ہونے کے باوجود کورا کے لیے میں نے انھیں چھوڑ دیا۔ بوڑھے معین نے اس کی خاطر اپنا قبیلہ چھوڑ دیا تھا، مولوی صاحب نے اس کا پیرہ دیکھا تو اُن میں شفقتوں کے سوتے اُمڈ آئے اور کورا ایسی بدنصیب نکلی کہ اسے کہیں سکون نہ ملا۔

اب بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ کہیں تو مولوی صاحب کا نشان ہوتا۔ یقیناً اس رات واقعات اس طرح پیش نہیں آئے تھے جس طرح میں نے سوچا تھا۔ غنڈے میری کورا کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے ہوں گے اور انھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر کے اُن کی چھاپا دی ہو گی یا پھر کورا کا تعاقب کرنے والے لوگوں نے اسے اور مولوی صاحب کو کسی جگہ دیکھ لیا ہو گا اور مولوی صاحب کا کام تمام کر کے کورا کو اپنے ساتھ واپس لے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے مولوی صاحب سے کہیں چوک ہو گئی ہو اور وہ کورا کو چھپانے میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مولوی صاحب بھی میری وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پرماگھر، کورا، مولوی صاحب، تین کا ٹیبل نہ جانے کتنے لوگ میری وجہ سے متاثر ہوئے۔

کورا کو کوئی بھی لے گیا ہو، اُس کے قبیلے کے لوگ یا غنڈے وہ ضرور زندہ ہو گی۔ میں اسے ایک بار صرف دیکھنا چاہتا تھا، صرف ایک بار۔ اس سے زیادہ اب میرا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ اس ایک بار کی دید پر کوئی معاوضہ مجھ سے میری جان بھی لے لے۔ مجھ سے عمر بھر خرکاری کام لے لے، ہمیشہ کے لیے جیل میں رکھ دے، میری آنکھیں نکال لے، میرے ہاتھ کاٹ دے، مجھے بے دست و پا کر کے کوڑے پر پھینک دے، مجھ سے کہے تو میں اُس کے قدموں میں مال و زر کے انبار لگا دوں، میں برزخی کروں گا، ڈاکو بن جاؤں گا، وہ جسے کہے میں اُسے قتل کر دوں گا مگر ایک بار وہ مجھے کورا کی صورت دکھا دے۔

کہیں ایسا تو نہیں نہیں نہیں۔ میری انگلیاں تھرتھرانے لگیں اور سر چکرانے لگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کئی بار پہلے بھی یہ خیال دل میں آیا تھا۔ میں نے سر جھٹک کے خود پر لعن طعن کی تھی۔ مولوی صاحب کے کردار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ ایک فرشتہ صفت آدمی تھے، جب انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر پناہ دی تھی تو اُن کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ پھر انھوں نے ہمارے لیے سامان خریدا، کورا کے لیے بہترین لباس خریدا، وہ ہمیں کس وقت شوق سے کلکتے کی سیر کراتے رہے۔ وہ ایک نوری شخص تھے ایک ربانی و لاہوتی۔ اُن کی ساری عمر شرافت کے پیچھے میں گزری تھی۔ وہ اتنے پست نہیں ہو سکتے مگر وہ میرے اور کورا کے کون سے رشتے دار تھے جو بھلا دیا جب میں نے گیا اسٹیشن پر اُن کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو انھوں نے نہایت درشت انداز میں مجھے جاگ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ تجت کے آدمی نہیں تھے۔ مراد آباد میں بھی اُن کے تعلقات محدود تھے رشتے داروں تک سے رسمی مراسم تھے۔ انھوں نے شادی کی تھی کرن کے دل میں بیوی، بچوں کی محبت کا گداز ہوتا۔ اپنے بدن سے بھی وہ عرصے سے غیر ملے۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میں یہاں بیٹھا ہوں، شمل و صورت سے ایک معصوم شخص نظر آتا ہوں مگر کون جانتا ہے کہ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ کون کسی کے دل میں جھانک سکتا ہے۔ ہر ایک کے مختلف ہیں، دنیا میں ہر آدمی دوسرے سے الگ نظر آتا ہے۔ اندر سے آدمی کریہہ شکل ہوتا ہے، اندر سے عورت اُس کی تلاش بھی برآمد ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کو اندر سے دیکھنے کا وقت بے کہاں ملا تھا، ریل میں ملاقات ہوئی، ایک رات ساتھ گزارا، پھر دو دن مگر انھوں نے جیب ریل میں مجھ سے شفقت کا اظہار کیا تھا، اُس وقت انھوں نے کورا کو کہاں دیکھا تھا۔ کورا تو دوسرے ڈبے میں بیٹھی تھی، مولوی صاحب اپنے روپے پر شرمندہ تھے۔ مجھے کھانا کھانے اور غریب محبت کی باتیں کرتے تھے۔ ہاں اسٹیشن پر بھی وہ ادھر اُدھر کی ٹھہر گئے تھے کہ ماموں جان ہمیں لینے آ جائیں تو وہ جائیں۔ اُس وقت کورا بُرا تو نہیں تھی اور انھوں نے اُس کے چہرے اور عمر کا انداز نہیں کیا تھا۔ میں نہیں۔ مولوی صاحب پر شبہ کرنا گناہ ہے۔ وہ بیچارے تو صرف میری وجہ سے مذاب میں مبتلا ہو گئے۔ نہ جانے اُن پر کیا گزری ہو گی۔ نہ جانے وہ کس عالم میں ہوں گے۔ پتہ نہیں زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔

سوچتے سوچتے میرا دماغ پک گیا تھا اب ایک آخری اُمید رہ گئی تھی کہ میں اُن غنڈوں کو تلاش کروں جنھوں نے دریا کے کنارے ہم پر حملہ کیا تھا۔ اگلی سے کوئی صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ زندہ ہوں اور کلکتے میں موجود ہوں۔ غنڈوں کی زندگی کا کیا بھروسا، سات سال میں کتنے غنڈے مر گئے ہوں گے۔ میں نے سنجے سے نام ہو کے کلکتے کا رُخ کیا۔ بکھرا اور کلکتے کے درمیان گیا شہر تھا، گیا قریب آنے پر دل میں ہُوک سی اُٹھی۔ جی میں آیا بس ایک بار گھر کی طرف سے گزر کے واپس ہو جاؤں گا، کوئی مجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہے سات سال میں تو لوگ بھول بھال گئے ہوں گے۔ بس ذرا نہ ایک نظر دیکھوں گا اور چلا آؤں گا شاید کسی کا چہرہ بھی دیکھنے کو مل جائے۔ میں ایک فقیر کی صورت میں جاؤں گا، ایک مٹھی چنے لوں گا اور ڈیوڑھی پر کھڑا ہو کے بھیک کی صدا لگاؤں گا۔ کوئی تو دروازے پر آئے گا، ممکن ہے امی آ جائیں لیکن اگر کسی نے پہچان لیا تو؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ داڑھی، بدلی ہوئی رنگت، میلے پھٹے ہوئے کپڑے کوئی بھی شناخت نہیں کر سکے گا۔

گاڑی جب گیا اسٹیشن پر ٹھیری تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ اسٹیشن پر اچھی خاصی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پلیٹ فارم پر اُترا۔ سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ آگے جاؤں یا نہ جاؤں؟ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں ڈبے کی طرف بڑھا، پھر واپس آ گیا۔ دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر جیسے مسافروں کی چیخ پکار نفسا نفسی تھی کچھ یہی کیفیت میرے جسم کی تھی۔ اسٹیشن عبور کر کے میں اپنے مانوس سڑک پر آ گیا۔ گھاس کا وہ چھوٹا سا میدان خشک ہو گیا تھا۔ جہاں میں کبھی کبھی صبح سویرے ٹہلنے آتا تھا۔ میرے جانے کے بعد شاید کسی نے اس کی خبر ہی نہیں لی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ بگٹٹ سڑک

بنیے کی حویلی پر بھی کافی بھی ہوئی تھی، سلام ہوتا تھا مرحبے سے سفید نہیں ہوئی ہے جب میں یہاں تھا تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہر سال دیوالی کے موقع پر سفیدی ہوتی تھی۔ اب تو یہاں دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ عمارتیں نئی بن گئی تھیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ لوگ مکھنے کا فنڈ دیکھ لیتے ایسی بھونڈی عمارتیں بناتی تھیں۔ میونسپلٹی کو بھی سڑکوں کا خیال اس زمانے میں کچھ کم رہا تھا۔ بڑی سڑک سے گزرنے میں تانگے والے چکی میں آگیا اور نوکیل کے رُک گیا۔ آگے بڑھنے کی قوت جسم میں نہیں تھی۔ سانس قابو میں نہیں آرہی تھی۔ کوئی جسم کی بوٹیاں لے رہا تھا اور درد بھر رہا تھا۔ کوئی بجلی سے جسم سے گزر رہا تھا۔ کنپٹیاں سُرخ ہوگئی تھیں، چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں اپنے محلے میں داخل ہوگیا۔ محلے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ احسان الٰہی پرچونی کی دکان بھی اُسی جگہ قائم تھی جہاں میں اُسے چھوڑ گیا تھا۔ میں اُدھر سے بیلہ بچاتا ہوا گزرا۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں اور راہ گیروں کی نگاہ مجھ پر پڑی، محلے میں کسی بھی اجنبی کی آمد پر یہی ہوتا ہے۔ میں نگاہ چُراتا ہوا گزر گیا۔ کوئی مجھے پہچان نہیں سکا تھا، ایک گلی مڑنے کے بعد میرا گھر تھا۔ میں نے اپنی رفتار کسی قدر تیز کردی۔ دکان دار احسان الٰہی بوڑھا اور موٹا ہوگیا تھا میں اسے دیکھتا ہوا گلی میں مڑ گیا، سامنے میرا گھر تھا، میرا گھر پہلے ہی سے بری حالت خراب تھی گھر کا دروازہ دیکھ کے سنسناہٹ ہونے لگی۔ یقین نہیں آیا کہ میں ایک مدت بعد اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔ مکان کی دیواروں پر حال میں رنگ و روغن کیا گیا تھا، کھڑکیاں بھی تبدیل کی گئی تھیں لگی میں میرا تنگ کھڑا رہنا نامناسب بات تھی، وہاں سے سرسری گزر گیا۔ دوسری بار پھر گلی میں آیا اور ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ ڈیوڑھی کا آدھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دوسری بار بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ میں چوروں کی طرح اپنی گلی۔ اپنے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ میں جب چوتھی بار ادھر سے گزر رہا تھا تو ایک خوش پوش آدمی سے برآمد ہوا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کون ہوسکتا ہے یہ، یہ تو کوئی اجنبی لڑکا ہے۔ مجبور ہوکے میں نے ایک راہ گیر کو روک لیا، وہ جلدی میں تھا لیکن میرے متکسر لہجے نے اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ "کیا ہے بھئی؟" وہ اکتاہٹ سے بولا۔

"بھائی۔ میں بڑی دیر سے زمین دار صفدر خاں صاحب کا گھر دیکھ رہا ہوں۔ کوئی شخص رہبری نہیں کرتا۔ آپ ہی کچھ مدد کیجیے۔"

"صفدر خاں۔ زمین دار؟" اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "اب وہ یہاں کہاں بھائی عرصہ ہوا انھیں گئے ہوئے۔"

"اچھا پھر وہ کہاں گئے ہیں؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے پٹنے میں جا کے بس گئے۔ کوئی کہتا ہے دلی میں آباد ہوگئے۔ کوئی لکھنؤ کہتا ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔"

"وہ کب گئے اور اب یہاں اُن کے مکان میں کون رہتا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "معاف کیجیے میں آپ کے کام میں حرج ہرا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی، لوگ اُن کے بارے میں عجب عجب باتیں کرتے ہیں دھانیا مکان کوڑیوں کے مول فروخت کر گئے۔ اُن کا ایک جوان لڑکا گم ہوگیا تھا۔ شاید اس کا اُن پر بہت اثر تھا۔ ذہنی حالت بھی کچھ خراب سی ہوگئی تھی۔ گھر بیٹھے کھاتے رہے پہلے زمینیں بکیں پھر بیوی کا انتقال ہوگیا۔"

"نہیں نہیں۔ کیا کیا آپ نے۔" میں نے چیخ مار کر کہا۔ اگر وہ مجھے جھٹکے سنبھال نہ لیتا تو میں زمین پر بے سُدھ پڑا ہوتا۔ میری ہاں مرگئی تھی۔ وہ کس روانی سے یہ خبر سُنا رہا تھا جیسے میں تو پتھر کا آدمی ہوں۔

"ارے اسے کیا ہوا بھائی آپ کو؟" وہ میرا بھی سے بولا۔ "آپ اس قدر پریشان کیوں ہوگئے۔ اور یہ آپ انھیں امی کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ کون ہیں؟" وہ مٹ پٹا کے بولا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میرے کان بند ہوگئے تھے۔

"کہیں آپ۔" میری حالت دیکھ کے وہ اضطراب سے بولا۔ "کہیں آپ وہ تو نہیں ہیں؟"

"تم سچ کہہ رہے ہو یا جھوٹ؟" میں نے اس کا جسم جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "کہہ دو کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"بھائی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا مگر آپ سے ان کا کیا تعلق تھا؟ آپ کون ہیں؟"

"میں ایک بدنصیب ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کب۔ کیسے ہوا؟"

"معصوم بھائی، ان کے والد صاحب زادے کے فرار ہوجانے کے بعد۔"

"اوہ۔ اوہ۔" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ مجھے یہی خبر سننے کے لیے آتارہ گیا تھا۔ میرے ہزار کیے کرے پڑیں۔ میں سر پٹکتا ہی کہتا تھا کہ وہ دونوں مر گئے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں اپنی گلی میں کس طرح سے کھڑا ہوں اور کس شخص سے مخاطب ہوں میری انتہا کا شیرازہ منتشر ہوگیا تھا۔

"کیا آپ۔ آپ اُن کے۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"میں ہی اُن کا ایک بیٹا تھا۔" میں نے اس کے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"آپ باہر تو نہیں ہیں ہمبار خاں۔" وہ حیرت سے بولا۔

"نہیں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو کوئی اور ہوں۔ میں اُن کا اصل بیٹا نہیں تھا۔ وہ مجھے بیٹا سمجھتی تھیں۔ میں تو اُن کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ پر احسان کرتی تھیں کہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی تھیں۔ بابر زماں تو کم بخت اُسی دن مر گیا تھا جس دن گھر سے نکلا تھا وہ سالا تو یاگل ہوگیا تھا وہ بہت بُرا لڑکا تھا۔ اپنی ماں کو قتل کر گیا۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے گھر چلیے۔ آیئے آیئے، وہاں آرام سے بیٹھیے گا مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے بے خبری میں زخم چھیڑ دیا۔ آیئے میرے ساتھ بھائی!"

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے پھر کے کہا۔ "ہو سکے تو یہ بتادو کہ اس گھر کے باقی زندہ لوگ کہاں ہیں؟"

"کچھ نہیں معلوم۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "انھوں نے چلتے وقت اپنے عزیزوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ یہاں اُن کے بہت سے عزیز رہتے ہیں۔ دُور سے تو ہمارا بھی کوئی رشتہ نکلتا ہوگا۔ بیٹے کے جانے کے بعد لوگوں نے انھیں بہت کم گھر سے نکلتے دیکھا۔ انھوں نے ملنا جلنا بھی بند کردیا تھا۔ بہت چڑچڑے ہوگئے تھے۔ کوئی عورت اُن کے گھر ملنے جاتی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کرلیتے۔ لوگ کہتے تھے کہ اُن کے دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے کچھ کہتے تھے کہ وہ گھر میں بیٹھے کیسا بناسپتے ہیں۔ بچوں پر باہر نکلنے کی پابندی تھی۔ بیوی کی موت کے کچھ دنوں بعد ایک دن صبح اچانک لوگوں نے دیکھا کہ گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔ پڑوسیوں سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ مکان فروخت کرکے گئے ہیں۔ بہت دنوں سے بات چیت چل رہی تھی۔ ایک رات وہ چابیاں دے کے چلے گئے۔ کچھ کہہ کے نہیں گئے کہ کہاں جارہے ہیں پھر کسی کو اُن کے بارے میں خبر نہیں ہوئی۔ وہ میرے کانوں میں زہر اُنڈیلتا رہا۔

"کسی کو بھی معلوم نہیں؟" میں نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے دکھ سے انکار میں سر ہلایا اور مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اس کا شکستہ چہرہ میں بدلا گیا تھا کہ میں ہی اُن کا گم شدہ بیٹا ہوں۔ محلے کے دو ایک آدمی اور ہمارے گرد جمع ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہاں بھیڑ لگتی، مجھے ہوش آگیا اور میں اپنے مخاطب فضل کا کندھا پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ وہ حیران و پریشان تھا پہلے ہی بہت رسوائی ہو چکی تھی۔ اب وہ یہاں سے منہ کالا کرتے تو میں انھیں مزید رسوا کرنے چلا آیا۔ بے خیالی میں نہ جانے کیا کیا منہ سے نکل گیا سامنے میرے گھر کا دروازہ تھا مگر لباس میں میرے داخلے پر پابندی عائد ہوگئی تھی۔ یہ وہی گلیاں تھیں یہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا رونے کے لیے بھی کوئی بھروسے مند نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی اور اس شخص کو لے کے دور آگیا۔ میں واپس جارہا ہوں۔ میری خدمت ہے جو کچھ آپ نے دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے بھول جائیے گا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں ہے؟"

ایک جھوٹ چھپانے کے لیے میں نے اس سے بہت سے جھوٹ بولے وہ مجھے کریدنے لگا۔ وہ میری شکل صورت سے کچھ خوفزدہ بھی ہوگیا تھا کچھ مدت پوچھ گچھ میں نے گریز کیا۔ وہ سمجھ کے رخصت ہوگیا۔ اس کے سوا اُس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں جب ایک طرف نکل گیا تو اس نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ میں نے اپنے قریب کے عزیزوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ابا کو اور جینے کی تاب نہیں تھی۔ امی بھی چلی گئیں۔ مولوی صاحب اور کھوکا بھی اب کہیں گم ہوگئے۔ ٹھیک ہے جائیں سب جائیں، سہانی دنیا گم ہو جائے۔

مگر وہ چلے کیوں گئے؟ ایسی بھی کیا بات تھی کہ کسی کو بتایا تک نہیں، گھر چھوڑ دیا ہے تو ضرور کوئی اور بات ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے وہ شخص بھی واقف نہیں تھا جس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا ہے میں تو بہت خاموشی سے چلا آیا تھا۔ ایسا میں نے ابا اور امی کے آرام کے لیے کیا تھا جب تک کوراوہاں موجود رہتی، وہ دونوں پریشان اور خوف زدہ رہتے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ چند سو روپے لے کے کسے بغیر گھر سے آگیا تھا۔ اس میں امی کے اتنے اثر ہوجانے کی کیا بات تھی۔ سنا ہے جنھیں اپنی اولاد کا انتظار رہتا ہے مرنے بھی انھیں انتظار کا وقت دیتی ہے اُن کی سانس رُکی رہتی ہے۔ بڑے بڑے مشکل وقتوں میں میں نے اُن کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے تنہائی میں اُن کا نام پکارا ہوگا۔ جیل میں کسی کو میرا نہیں لگتا تھا کہ میرا اب کون ہے اور میں کس شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک ذرا انتظار کرکے ایک لیا ہوتا، جب میں واپس اسٹیشن جارہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔ مجھے رونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس گھر سے میرا تعلق تو فرار کے وقت ہی ختم ہوگیا تھا۔ میں رسید بھاکے واپس جارہا تھا۔ یہاں اتفاقاً آگیا تھا۔ نہ میرا کچھ جانے کا ارادہ تھا۔ نہ کسی سے بات کرنے کا۔ میں تو یوں ہی ادھر آگیا تھا۔ بس اپنی پرانی گلیاں اور گھر دیکھنے کے لیے۔ اپنا کالج دیکھنے کے لیے۔

میری جیب میں صرف چند آنے رہ گئے تھے جیب میں موجود ٹکٹ تھا جو میں نے لکھنؤ سے کھٹکے کے لیے خریدا تھا۔ خیال تھا کہ ایک گاڑی سے گیا جاؤں گا، دوسری سے کھٹکے کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پر بعد راہوں کو دیکھ کے میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہوگیا اور میں ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ یہ میلے کا زمانہ تھا۔

اس لیے بدھ گیا میں شاکیہ منی کا سکون جھلیا ہوا تھا۔ راہبوں کی ٹولیاں ایک مندر سے دوسرے مندر آجارہی تھیں اور اس پیڑ کے نیچے بھیڑ لگی ہوتی تھی۔ جہاں شاکیہ منی نے نروان حاصل کیا تھا۔ میں بھی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سیلا ہو رہا تھا تو بدھ گیا کے مظلم میرے اس عزم دھرنا سے کے بیٹھنے پر کئی مرتبہ مجھے ڈھکنے آتے۔ باپ کی نے خبر بھی نہیں لی۔ دیر تک میں یوں ہی سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام کو ایک بھکشو ادھر سے گزرتے وقت مجھے یکجہ کے رُک گیا اور ملائمت سے کہنے لگا۔ "شاکیہ منی تم پر سکون کی بارش کرے تمھیں کیا دُکھ ہے؟"

"زندگی کا دکھ ہے۔" میں نے سخت سے کہا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم ٹھیک جگہ آگئے ہو۔ ایسے دکھیاروں کے لیے شاکیہ منی کے پاس بڑی اچھی دوا ہے۔"

"زہر سے اچھی دوا کون سی ہوگی۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شاکیہ منی کے پاس ایسی اچھی دوا ہے۔"

"میں نے پہلے بھی اس کے پاس آنا چاہا تھا، مجھے نکلتے ہیں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو ملا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ میں دُنیا میں تنہا تھا اور دُنیا نے مجھے بہت دُکھ دیے تھے پھر اُس نے مجھے شاکیہ منی کے سکون کی تعلیم دی میں نے جو کچھ میرے پاس تھا، وہ لوگوں میں بانٹ دیا۔ ایک رات وہ غائب ہوگیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا جب میرے پاس پیسے نہیں رہے تو سب مجھ سے رُوٹھ گئے۔ پھر مجھے ایک ناکردہ گناہ کے الزام میں جیل ہوگئی۔ میں سات سال کی سزا کاٹنے کے بعد اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ اس کا نام کیا تھا؟"

"کیرسا، ایک بھکشو نے اداسی سے بولا۔" ایک بھکشو۔"

"ہاں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"میں شاکیہ منی سے اس کی شکایت کرنے آیا ہوں۔"

"شاکیہ منی ضرور تمھاری شکایت سُن رہا ہوگا۔ میں کسی ایسے بھکشو کو نہیں جانتا لیکن یہاں تبت کے چند لوگ آئے ہوئے ہیں، میں تمھیں اُن سے ملواتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔"

وہ تاسف کا اظہار کرتا ہوا مجھے ایک بھکشو کے پاس لے گیا جو اپنی کٹیا میں ریاضت کر رہا تھا۔ آواز دینے پر وہ باہر آیا اور میرے ساتھی بھکشو کی زبانی میری داستان سُن کے حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کیرسا کے متعلق لاعلمی ظاہر کی تو میں نے اس کے متعلق کچھ اور معلومات سے اُسے آگاہ کیا۔ میں نے کہا۔ "وہ کہتا تھا کہ وہ اجین نامی ایک شخص کی تلاش میں آیا ہے۔ اجین اُس کے قبیلے کی ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے قبیلے کے سردار سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کی بیٹی ضرور واپس لے آؤں گا۔ وہ تو بہت سی باتیں کرتا تھا۔"

"وہ جھکشو نہیں ہوگا، وہ بھکشو نہیں ہوگا۔ وہ جھوٹا ہوگا۔ کوئی بھکشو جھوٹ نہیں بولتا اور کوئی بھکشو ایسے کام نہیں کرتا۔" وہ میری سے بولا۔ "دوست! تمھیں دھوکا ہوگیا۔ تم سچ کہتے ہو، اجین نامی ایک شخص جانگ قبیلے سے ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا تھا۔ اجین کو یہاں بدھ گیا میں کسی نے مار دیا لڑکی کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو پھر وہ لڑکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوگا۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہوگا۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مجھے یقین ہے وہ بھکشو نہیں تھا۔"

"کیا میں جانگ قبیلے جا سکتا ہوں؟ میں اسے تلاش کروں گا۔ وہ ایسا نہیں تھا، وہ میرے ساتھ کئی دن ٹھیرا تھا۔"

"تم جانگ قبیلے کسی وقت بھی جا سکتے ہو مگر تمھیں وہاں جا کے کیا ملے گا دوست؟ آؤ ہمارے ساتھ رہو۔ بھکشوؤں کو ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ آؤ، ہم تمھیں شاکیہ منی کے پاس لے جائیں گے۔"

میں نے تذبذب سے حامی بھری اور پہلے بھکشو کے ساتھ اس کی کٹیا میں چلا گیا۔ تمام رات اس نے مجھے صبر و ضبط کی تلقین کی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ساتھ میرے ٹھیرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں کسی طرح اس بھکشو سے ملاقات کروں جو جانگ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، یقیناً کوئی ایسا بھکشو یہاں موجود ہوگا، نہیں ہوگا تو آجائے گا۔ بدھ گیا میں ہزاروں یاتری روزانہ آتے جاتے رہتے تھے۔ دوسرے دن میرے ساتھی بھکشو نے مجھے نیا دھلا سا کے مجھے کپڑے پہننے کے لیے دیے۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اب یہ کپڑے لے میں نے پہلے ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ میں شاکیہ منی کے پاس آنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکا ہوں۔ میں نے کپڑے پہن لیے۔ گیرُوے رنگ کا بھکشوؤں کا لباس لیکن اب مالا چھپانے کا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔ سُندر نے بالآخر یہی تجویز مجھ سے کہا کہ میں اسے اپنے دونوں لیکن میں نے بہانہ بنا کے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا کہ یہ میری ماں کی یادگار ہے۔ سُندر نے سوچا ہوگا کہ چند دنوں بعد یہ خود اسے اُتار کے کسی کو دان کر دوں گا۔

میں پانچ چھ روز بھکشوؤں کی ٹولی کے ساتھ مندروں میں گھومتا اور بدھ کی تعلیمات سنتا رہا۔ وہ سب میری بہت عزت کرتے تھے۔ تمام راہبوں میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ایک شخص نے شاکیہ منی کی تعلیمات سے متاثر ہو کے سارا دھن لٹا دیا ہے

وہ مجھے ریاضتوں کے طریقے سمجھانے اور یک سُو ہونے کی مشقوں کی تعلیم دینے لگے۔ میں بار بار اُن سے کیرسا کا ذکر کرتا تھا اور انھیں اپنی داستان سُناتا تھا۔ بدھ گیا کا ماحول بہت پُراسرار تھا۔ بھکشو کسی ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتے تو پھر ان جاتے تھے۔ پھر انھیں دنیا کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ ابھی تک خاص جانگ قبیلے کا کوئی ایسا بھکشو مجھے نہیں ملا تھا جس سے کیرسا کے بارے میں کوئی خبر مل سکتی۔ پھٹے پرانے کپڑے مانگ کر پہننے کے بعد میں کٹیا میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آواز لگائی۔ میں اُٹھ کے بیٹھ گیا اور میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔

راہبوں کے مخصوص لباس میں وہ شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کے اُس نے یکایک اپنا ہاتھ بلند کیا، اُس کے ہاتھ میں چُھرا تھا۔ "یہ مالا تمھارے پاس کہاں سے آئی؟" اُس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ میں نے پیشتر اس کہ مالا چھپانا چاہتا، اُس نے چُھرے کی نوک میرے سینے کے سامنے کر دی۔

اندھیرے میں اُس کا چہرہ خوف ناک ہوگیا تھا۔ اُس کی راہبوں جیسی معصومیت اور سادگی سفاکی اور درندگی میں بدل گئی تھی۔ اُس کے چُھرے کی نوک میرے سامنے تھی۔ وہ اگر چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ پہلے پہل تو میں کچھ بھی نہیں سمجھا اُس کی اچانک آمد اور حملے سے گھبرا اُٹھا لیکن پھر میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ میری مزاحمت میں نرمی آگئی۔ یہ وہی شخص تھا جس کا مجھے انتظار تھا اور جس کے لیے میں نے بدھ گیا کے اس اجنبی ماحول میں بدھ راہبوں کا حلیہ اختیار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی دن کسی نہ کسی دن یہ ضرور آئے گا۔ یہ ایک یا اس کے دوسرے ساتھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری گردن میں لٹکی ہوئی مالا دیکھ کے پریشان ہو جائیں گے اور قتیش مال کے لیے ضرور میرے پاس آئیں گے۔ صرف مالا حاصل کرنے کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جو خنجر بدست مجھ پر حملہ آور تھا۔ وہ کچھ اور بھی جاننا چاہتا ہوگا۔ کہ میں نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی ہے اور جب مکمل معلومات اُسے فراہم کر کے سلطان نکر دیتا، اُس وقت تک میری زندگی یقیناً محفوظ تھی۔ میرے ہلتے ہوتے رویئے اور چہرے پر چھاتے ہوئے سکون سے وہ مشتعل ہوگیا اور جھنجلا سا گیا۔ اس نے میرے گال پر ایک تھپڑ مارا اور دوسرے ہاتھ سے مجھ پر آن کر میرے اور قریب ہوگیا۔ اب میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔" اُس نے شقاوت سے کہا۔

"پھر سلسلے سے بتاؤ اور جو کچھ پوچھا ہے وہ اطمینان سے پوچھو۔" میں نے کسی قدر بے پروائی سے کہا۔

"نہیں۔" اُس نے میری آنکھوں میں اپنی مُسرخ آنکھیں ڈال دیں اور بدتمیزی سے بولا۔ "بتاؤ تم نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی ہے؟"

"اس کے پیچھے ایک طویل داستان ہے لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ اس چُھرے کے بل پر مجھ سے کوئی راز اگلوا لو گے تو تم غلطی پر ہو۔" میں نے جرأت سے کہا۔

اُس نے چُھرے کی نوک میرے سینے میں چبھو دی۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھیں باہر نکلنے لگیں لیکن میں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ "میں اسے تمام کا تمام تمھارے سینے میں اُتار دوں گا۔" اُس نے کہا۔

اُس کے لہجے میں رحم یک سر مفقود تھا۔ میرا اندازہ غلط نکلا۔ مالا کو کر وہ کچھ پاگل سا ہوگیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ متشدد ہوتا جا رہا تھا۔ "اتار دو، ورنہ پھر کبھی کچھ جان نہیں سکو گے اور امیر یاں رگڑ رگڑ کے مر جاؤ گے۔ بہت مال ہو گئے۔ اب تو تمھیں کچھ ہوش آجانا چاہیے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے بے سر پا باتیں شروع کیں۔ وہ کچھ سوچنے اور مجھے گھورنے لگا۔ اُس نے چُھرا کچھ پیچھے ہٹا لیا۔ اور اپنے جسم کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میرے گلے اُس کے بازو سے کچھ آزاد ہوگئے۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور اسے کہا۔ "یہ مالا میری ماں کی نشانی ہے۔"

وہ ایک دم برافگیختہ ہوگیا۔ "جھوٹ، میں تمھیں قتل کر دوں گا۔"

"میرے باپ کے ایک تبتی دوست نے یہ مالا مجھے دی تھی۔ شناید اُس کا نام اجین تھا۔ اس بات کو سات آٹھ سال گزر گئے۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بے تاب ہوگیا۔ "اجین، اجین اُس کا نام یہی تھا نا! بتاؤ کیا ہوا۔" وہ دہشت سے بولا۔

"اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی، بہت پیاری سی لڑکی۔" میری آواز بھٹکنے لگی۔ "بالکل گڑیا جیسی تھی اُس کے۔ انت چاندی کے بنے ہوتے تھے، چہرے پر چاندنی چھٹکی ہوتی تھی۔ اُس کا جسم قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔" یہ کہتے کہتے میں خاموش ہوا اور کہیں کھو گیا۔

میرے بیان پر وہ بھی بہوت ہوگیا تھا۔ جھرجھری لے کے بولا۔ "اجین زندہ گیا؟"

"ہاں۔" میں نے دُکھ بھری آواز میں جواب دیا۔ "اُسے مار دیا گیا۔"

"اور لڑکی کہاں ہے؟" اُس نے یہ سوال اتنی تیزی سے کیا کہ زبان ہکلانے لگی میں نے اُس کا سخت رویہ دیکھ کے جان بوجھ کر اجین کا نام لیا تھا اور کیرسا کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ یہ وقت اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے ٹالنے اور کچھ سوچنے کا نہیں تھا۔ مجھے اس شخص سے کیرسا کے بارے میں کچھ معلوم ہیں ہو گا تاہم دونوں کی حیثیت ایک ہی تھی۔ اُس کی تشویش سے ایک بات تو واضح ہوگئی کہ کیرسا اپنے قبیلے واپس نہیں پہنچی مگر یہ کیا راز ہے کہ لوگ ابھی تک اُس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں؟ اتنی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے یہ کیوں نہیں سمجھ لیا کہ کیرسا کو کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہوگا۔ اس کا نگراں بوڑھا اجین مر چکا تھا، یقیناً کم سن کیرسا نے کسی شخص کا سہارا لیا ہوگا۔ اتنے بڑے ہندوستان میں وہ نہ جانے کہاں اور کس عالم میں ہوگی۔ کیا یہ لوگ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کیرسا کسی وقت قبیلے میں نمودار ہو کے اور اپنا پرنختب کر کے سرداری کا اعلان کر سکتی ہے؟ وہ مجھ سے کچھ جاننے کے لیے بُری طرح مچل

رہا تھا اور میں اُس کی زبانی کچھ سُننے کا شدت سے منتظر تھا۔

"تم چُپ کیوں ہو گئے؟" میں پوچھتا ہوں کہ لڑکی کہاں ہے؟" اُس نے پھر سے کالا ہاتھ بلند کر کے دوبارہ اُسے میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ جیسے شاید میں اپنے اور اُس کے درمیان اس تیز دھار ہتھیار کی موجودگی بھلا جا رہا ہوں۔

"وہ زندہ ہے۔" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"وہ کہاں ہے؟" اُس نے پھر کے تکرار کی۔

"تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے نفرت سے پوچھا۔

"میرا تعلق؟" اُس کے تیور بگڑ گئے مگر وہ جلد ہی سنبھل کے بولا۔ "میں اُسی کے قبیلے کا ایک آدمی ہوں، ہم اُسے مدتوں سے تلاش کر رہے ہیں، وہ ہمارے سابق سردار کی بیٹی ہے اور قبیلے کی امانت ہے۔ ہم کسی بھی قیمت پر اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"تو تم نے اسے قبیلے سے نکال کیوں دیا تھا؟"

"اسے بڑھاجین اموناک کے لے آیا تھا۔" وہ مجھے جواب دینے پر مجبور تھا کیونکہ میں اُسے ریتا فرینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں کورا کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ اُس کے بارے میں کسی قدر کمی آگئی تھی، اس دوران میں کتنی ہی بار میں نے قبیل اور اُس کے ساتھیوں کے سکھائے ہوئے اوزار آزمانے کا ارادہ کیا گردن کچوری طرح چوکنا تھا اور ہتھیار رکھنے کے آداب جانتا تھا۔ قبیلے کے سردار نے لوگ چھانٹ چھانٹ کر کورا کی تلاش میں دوڑائے ہوں گے۔ اُن نے مجھے ایک بھی داؤ آزمانے کا موقع نہیں دیا البتہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا کہ میں نے اپنے سینے اور گردن پر چھرے کا خوف کہی محسوس کیا ہے۔

"بڑھاجین اُسے اموناک کے بغیر نہیں لایا تھا۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "تم مجھ سے، بڑھاجین نے اپنے سردار سے دشمنی کا فرض نبھایا تھا، اُس نے اُس کی بیٹی کو ظالموں کے پنجے سے بچایا، اُسے پناہ دی، ضعیفی اور ناتوانی میں دُور دراز کا سفر اختیار کر کے اُسے زندہ رکھنے کے لیے یہاں تک لے آیا اور تم اُس سے زندگی چھیننے کے لیے گلی گلی کُوچے کوچے اُس کا تعاقب کرتے رہے ہو۔ تم بڑھاجین کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر کان کھول کے سُن لو کہ کورا تمہارے ہاتھ نہیں آسکتی، جاؤ اپنے قبیلے واپس چلے جاؤ۔ اپنے سردار سے کہنا سردار کی تھی کو مبارک ہو، کورا واپس نہیں آئے گی۔"

"ارے تم اُس کا نام بھی جانتے ہو؟" وہ زبانی انداز میں بولا۔ "بتاؤ، وہ کہاں ہے؟" وہ میرے مُنہ پر اپنے سخت گھٹنوں سے مسلسل ضربیں لگانے لگا۔ میرا ایک دانت ٹوٹ گیا اور مُنہ سے خون بہنے لگا۔ پھر اُس نے میرے بال پکڑ لیے اور وحشت ناک طریقے سے گردش کے ساتھ بھینچنے لگا۔

بھلا کتنا تھا کہ جب ایسی کوئی صورت پیش آجائے اور تم خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگو تو اپنے مخالف کو حد سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کرو، اشتعال میں وہ ضرور کوئی غلطی کرے گا، بس تم اُسی لمحے کے منتظر رہو۔

اب کورا کا ذکر ہو رہا تھا اور اُس کا دشمن میرے سامنے تھا۔ وہ کورا کو مارنا چاہتا تھا اور میں اُسے تا قیامت زندہ دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ کورا کا دشمن تھا لہٰذا میرا دشمن تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے کورا جیسی پھول لڑکی کی زندگی حرام کر دی تھی اور اُسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے دل میں اُس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ میرے مُنہ سے خود بھی ایسی باتیں نکلنے لگیں جو اُستاد حشیل کے فرمُودے پر پوری طرح اُترتی تھیں۔ وہ بہت غضب ناک ہو گیا تھا۔ غیض کے عالم میں اُس کا دھڑ بے اختیار میرے جسم سے اُوپر اُبھرا۔ میں نے فی الفور پوری طاقت سے اپنے گھٹنے اُس کے پیٹ میں مار دیے۔ وہ گیند کی طرح اُوپر اُچھلا، میں چوک کر چشم زدن میں ایک طرف ہٹ چکا تھا۔ وہ ایک تہائی کی مدت میں تڑپ تڑپ کر سب ہو جانا چاہتا تھا کہ میں نے دہان میں اُسے جالیا اور سینے کے بل دوبارہ زمین سے چپکنے کا پابند کر دیا۔ میں اُس کی پُشت پر سوار تھا۔ اُس کا بھرتے الا ہاتھ میری گرفت میں آچکا تھا۔ ویسے بھی وہ زمین پر یکسی سے اوندھے مُنہ پڑا ہوا تھا اس لیے بھرے کے ہاتھ دکھانے سے معذور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا کہنی کی گرفت ڈھیلی کر دی، اُس نے میری توقع کے مطابق نیچے کی طرف سے میرے جسم پر ایک زور کا جھٹکا دیا۔ میں اس جھٹکے کے لیے آمادہ تھا، وہ بھول گیا تھا کہ میں نے اپنا سارا زور اُس کے ہاتھ پر لگا پایا ہے، اُس کے جھٹکے سے میں ایک طرف تو جا پڑا لیکن بھرے کا ہاتھ چھوٹنے سے اُس کی گرفت ٹوٹ گئی۔ وہ تکلیف سے بلبلانے لگا، بھرا ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ میں نے اُس کے سینے پر نشست جمالی۔

"تم پوچھ رہے تھے کہ لڑکی کہاں ہے، اب تمھیں لڑکی کی کیا ضرورت ہے، وہ کبھی وہاں واپس نہیں جائے گی۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ وہ گئی کہاں ہے؟ اُسے کون لے گیا؟" اُس کی آواز بالکل بدل گئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا، کراہ رہا تھا۔

"کیوں؟" میں نے تِلملا کر کہا۔ "آخر کیوں؟ جب تمہارا اُس سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا اور تم سے کہہ دیا گیا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی تو تم اُس کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ تم اُس سے اُس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

"کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ کرب سے بولا۔

"ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ وہ تمہارے لیے مر چکی ہے۔ مجھے بتاؤ تم اُسے کس طرح صاف کر سکتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا، ہمیں اُسے تلاش کرنا ہی ہے۔"

"تم اُس کی گرد بھی نہیں پا سکتے، میں تمہارے سینے میں تمہارا چھرا اُتار دوں گا تاکہ تمہارے سردار کو معلوم ہو جائے کہ کورا کو بچانے والے لوگ اس سے زیادہ طاقت ور ہیں۔"

"مجھے مت مارو۔" وہ گڑگڑا کے بولا۔ "میں اُن کا ایک کارندہ ہوں، میرے جیسے بہت سے لوگ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک کو مارو گے تو ہم تمام آدمیوں کو ختم نہیں کر سکتے، پُورے جانگ قبیلے کو ختم نہیں کر سکتے، وہ جاؤں گا تو میری جگہ کوئی دُوسرا اُس کی تلاش میں نکل آئے گا۔"

"تم ہندوستان کے کتنے گھروں، کتنے تہہ خانوں میں جھانکو گے؟"

"پر ہست کہتے ہیں کہ ایک دن وہ ضرور ملے گی۔"

"پر ہست جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"تو کیا، تو کیا وہ مر چکی ہے؟" اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

میں نے اُس بدزبان کے مُنہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ "وہ زندہ ہے اور زمانوں تک زندہ رہے گی۔"

"تو پھر مجھے اُس کا پتہ بتا دو۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "اور میری بات کا یقین کرو، میں اُس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اُس سے صرف کاغذات حاصل کر کے تب چلا جاؤں گا اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"

"کیسے کاغذات؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ شرمک کا کاغذات جو اُتین کورا کے ہمراہ قبیلے سے لے آیا تھا۔ اُتین کے ساتھ جواہر کا ایک بڑا خزانہ بھی تھا، ہمیں اُس خزانے اور کورا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں کاغذات درکار ہیں، تم نہیں جانتے، وہ کاغذات کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ردّی کے ٹکڑے ہیں مگر ہمارے قبیلے کے لیے اُن کی حیثیت متبرک ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ہمارے پُرکھوں نے شاکیہ منی کے فرمودات اُن کاغذات پر لکھے تھے۔ شاکیہ منی اُس وقت ہم لوگوں کے درمیان زمین پر موجود تھے۔ پھر وہ آسمانوں میں چلے گئے ہمارا عقیدہ ہے کہ جب قبیلے میں وہ کاغذات محفوظ رکھنے کی طاقت نہیں رہے گی یا وہ اپنی کوتاہیوں اور بے پروائیوں کے باعث ان سے محروم ہو جائے گا تو قبیلے پر محوست کے بادل منڈلانے لگیں گے۔ قبیلے میں خوں ریزی ہوتی رہے گی۔ قبیلے کے سردار کے لیے لازم ہے کہ وہ یہ انمول دستاویز اپنی تحویل میں رکھے، وہ قبیلے کی جانب سے اُن کا امین ہے جب ایک سردار کے بازوؤں میں طاقت نہیں رہتی تو اُسے ہونے والے سردار کو کاغذات سونپ کر کے اقتدار سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔ قبیلے میں صرف بڑے پروہت اور سردار ہی اس کا علم ہوتا ہے کہ یہ متبرک دستاویز کہاں چھپا کے رکھی جاتی ہیں، انہیں نہیں ہم سے چھین کے لے گیا، اُس وقت سے اب تک ہمارا قبیلہ اپنے بہت سے آدمی کھو چکا ہے۔ کئی بار آسمانی آفتیں ہماری زمینوں پر نازل ہوئیں، ہم دانے دانے کو محتاج ہو گئے، ہر نئے سردار کے ساتھ قبیلہ یہ شرط وابستہ کرتا ہے کہ وہ متبرک کاغذات ضرور حاصل کرے گا، اُسے دس برس کی مدت دی جاتی ہے، جب اس مدت میں وہ ناکام ہو جاتا ہے تو دوسرا سردار منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم متعدد سردار بدل چکے ہیں اور قبیلے میں بدنظمی بے یقینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہمیں وہ کاغذات دوبارہ مل جائیں تو ہم اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر لیں گے۔"

میں نے دہان میں دخل نہیں دیا، اُسے بولنے دیا۔ اُس کی آنکھیں شعلہ افروزی اور گرمجوشی کی عنادی کر رہی تھیں۔ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا، زبان میں لکنت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے یہ انکشاف کرنے پر سخت ذہنی اذیت ہو رہی ہو۔ برسوں بعد اسے ایک شخص ملا تھا، اُس کے سامنے کورا کا نام لے رہا تھا۔ پھر بے کل، لوک اور موت کے خوف سے زیادہ اُس کے دل میں یہ اضطراب انگیز تجسس موجود ہو گا کہ میں ضرور اُس کی راہ تکتا ہوں، وہ مجھ سے مفاہمت کرنے اور اعتماد میں لینے کے لیے سرگرداں ہر اہم انکشاف کرنے پر مجبور تھا۔ میرے لیے اب اس میں تردد کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ کورا کا نام سُننے کے بعد تھا، مجھے وہ جن کاغذات کی بات کر رہا تھا، وہ ابا جان کی تحویل میں تھے اور مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ انھوں نے انھیں محفوظ بھی رکھا یا نہیں۔ میں ابا جان کے موجودہ پتے سے بھی ناواقف تھا۔ میں اُس سے اور کیا بات کرتا؟ کاغذات کے بدلے کورا کا سودا کرتا؟ تو کورا کہاں تھی؟ اُسے تو میرے تعصب نے مجھ سے چھپا دیا تھا اور کاغذات حوالے کر کے جانگ قبیلے کا سکون واپس کرنے اور کورا کو ایک عذاب ناک تعاقب سے نجات دلانے کی کوشش کرتا تو ابا جان کہاں تھے۔ میری خاموشی پر وہ مجھ سے اصرار کرنے لگا۔ میں جست لگا کے اُس کے سینے سے اُٹھ گیا۔ "جاؤ، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "خود میں بھی اُس کی تلاش میں ہوں، وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، شاکیہ منی کی قسم تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں دنیا بھر کا خزانہ تمہارے قدموں پر ڈال سکتا ہوں، میرے قبیلے کا یقین مجھے واپس ڈلا دو۔ اُسے نحوستوں سے بچاؤ۔"

میں نے ٹھوکر مار کے اسے اپنے پیروں سے جُدا کر دیا۔ وہ مجھ سے رحم کی بات کر رہا تھا۔ میرے لیے کورا کے بغیر ہر دولت بے کار تھی۔ میرے لیے کورا ہی سب سے بڑا خزانہ تھی، سب سے بڑی دولت تھی۔ اُس پر دوبارہ وحشت کا دورہ پڑا، اُس نے حیرت انگیز پھرتی سے میرے سینے پر اپنا سر مارا، چھرے والے ہاتھ سے پھر ٹکر گرگیا، اُس نے جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیا، میں نے پُرہراست ترک کر دی تھی، اُس کے سامنے کسی حیل و حجت کے بغیر تن کر کھڑا ہو گیا تھا، اب بھی پُرہوش ہر اساں ہو گیا اور اُس کا بلند ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ "تم اپنی طاقت ضائع کر رہے ہو، یہ چھرا پھینک دو اور انسانوں کی طرح بات کرو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" اُس نے طیش میں کہا۔

"تم کبھی یہ ہمت نہیں کر سکتے۔"

"تو مجھ پر رحم کرو، مجھے کچھ اور نہیں چاہیے صرف وہ کاغذات میرے حوالے کر دو۔" وہ کبھی نرم پڑتا، کبھی گرم ہو جاتا۔ "نہیں تو۔" اُس نے چھلا کے کہا اور دفعتہً میری گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ الا ٹوٹ کر نیچے گر پڑی، اُس کے دانے فرش پر بکھر گئے۔ میرے خون میں رعشہ ہونے لگا۔ وہ میرے چہرے کی جانب متوجہ تھا کہ شاید اب میں اُس کے سامنے کوئی انکشاف کروں گا، اُس کی اس بے خبری کے وقت میں نے اُڑنگا مار کے اُسے

بے توازن کر دیا اور جب اُس کا پھریرا میرے ہاتھ میں آیا تو نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ پھریرا بدھا اُس کے دل میں اُتر گیا۔ ابھی گنگا میں اُس کی بھیانک چیخ اُبھری ہی تھی کہ میں نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے ڈاکو میں اُسے چیخنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر وہ فرش پر تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی مالا کے دانے سمیٹے۔ ایک ایک کو نمن میں چراغ لے کے اُنھیں ڈھونڈا کہ کوئی دانہ رہ نہ جائے۔ پھر میں نے خون آلود پھریرے سے اس کے لباس کا ایک حصّہ کاٹ کے اس میں اُنے اعتیاط سے باندھ لیا۔ اس کے لباس کا ایک حصّہ کاٹ کے اس میں اُنے اعتیاط سے باندھ دیے۔ ایک کونے میں میرے پرانے کپڑے پڑے تھے۔ راہبوں کا گیروا لباس اُتار کے میں نے وہی میلے اور شکستہ کپڑے پہن لیے۔ پھٹا پرانا لباس پہن کر میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اُس کی آنکھیں بند کیں اور اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کا چہرہ بالکل پُرسکون تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اُس کے ماتھے پر ایک سیاہ تل تھا۔ میں نے اُس تل

اور سوگواری صاف محسوس کر لی تھی جیسے اسے سفر کی صعوبتوں کی عادت نہ ہو۔ جیسے وہ تھک گئی ہو، جیسے اس نے گھر سے پہلی بار قدم نکالا ہو۔

کھڑکیوں سے بوندیں اندر آنے لگیں۔ عورت نے اٹھ کے کھڑکی بند کر لی اور سر ٹیکا کر رکھ کے جماہی لینے لگی۔ اس بار پھر بے اختیار میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور جب میں نے اسے پہچانا تو پہچانتا چلا گیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ سات سال میں اس کے چہرے پر صرف معمولی رد و بدل ہوا تھا جسے اس نے غازے کی تہہ میں چھپانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ میری آنکھوں میں سوزش سی ہونے لگی۔ میری ساری رگیں تن گئیں اور خون شریانوں میں ابلنے لگا۔ وہ کریم گل کی چچی تھی۔ خود ساختہ یتیم و دارچی۔ کلکتے کے ہوٹل میں اس نے مجھ پر بڑی نوازشیں کی تھیں۔ کوارٹر تو وہ میری جان سے فدا تھی۔ چہرے مہرے سے وہ اب بھی کوئی بیگم نظر آتی تھی۔ اس نے کوارٹر فروخت کر دینے کا سودا کر لیا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟ اس نے میری عزت، میری ناموس نیلام پر چڑھا دی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کی آنکھیں نکال لوں اور اس کی زبان کاٹ لوں۔ میں نے اسے خوب پہچان لیا تھا مگر اس نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ سات سال میں میری وضع قطع بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کے میں خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ فرسٹ کلاس میں تنہا سفر کرنا، ساتھ میں ایک نوجوان لڑکی۔ گویا اس کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ مجھے وہ لڑکی کوڑی کی طرح معصوم لگی۔ بے بس مگر قابل رحم۔ میں نے سوچا کہ یہ کسی معزز خاندان کی لڑکی ہو گی جو اس ذلیل عورت کے پھندے میں نہ جانے کس طرح پھنس گئی۔ اس کا چہرہ مضطرب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے ڈر لگ رہا ہو گا۔ آگے نہ جانے کیا ہو۔ یہ پشیمان ہو رہی ہو گی۔ گھر واپس جانے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گا مگر پیچھے کا تمام راستہ مٹا ہوا نظر آ رہا ہو گا۔ چند لمحوں میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ان دونوں کے درمیان عزیز و دل جیسا ربط ضبط معلوم نہیں ہو رہا تھا بے ساختگی کے جاتے ایک جھجک تھی۔ میری تخیل خبط ہو گئی۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ میں پھر بھی کھڑکی میں جھوٹ آیا تھا ورنہ اس کے بیٹے میں بھونک دیتا۔ میں شعلوں میں گھرا بیٹھا تھا۔

"بیگم صاب! کچھ کھانے کو ہو گا؟" میں نے اپنی زبان پر بمشکل قابو پاتے ہوئے التجا آمیز انداز میں کہا۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس بار اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور طنطنے سے بولی۔ "بھوکا ہے؟"

"جی" میں نے بے تابی سے گردن ہلا کے جواب دیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"کلکتے۔ روزگار کی تلاش میں۔"

اس نے گندیا میں سے کچھ بسکٹ اور پوریاں نکال کے میری طرف بڑھا دیں۔ مجھے بہر صورت انھیں زہر مار کرنا تھا۔ میں نے بسکٹ اور پوریاں اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور بے تحاشا منہ میں ٹھونسنے لگا۔ چچی کے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "اطمینان سے کھا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "کہاں سے آ رہا ہے؟"

"بنارس سے بیگم صاب!" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"بنارس میں کیا کرتا تھا؟"

"کوئی ایک کام کیا ہو تو بتاؤں۔ پر قسمت خراب ہے بیگم صاب! پہلے ایک ہندو سیٹھ کے ہاں نوکر تھا۔ وہ مر گیا تو اپنا کام جگہ گیا۔ وہ کیا گیا، اپنی قسمت بھی ساتھ لیتا گیا۔"

"کچھ پڑھا لکھا نہیں؟"

"بس جی اپنا نام لکھ لیتا ہوں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں کہاں ہیں بیگم صاب! سب اللہ کو پیارے ہو گئے شاید۔ مجھے تو ہندو سیٹھ کسی میلے سے پکڑ کے لایا تھا۔ بہت خاطر کرتی اس نے اپنی۔ اب وہ مرا بھی نہیں آئے گا مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا لیکن میرا بڑا خیال رکھتا تھا۔ جتنے بھی اچھے اچھے پکوان پکتے تھے، وہ مجھے کھلاتا تھا۔"

میں بولتا رہا مگر میرے ہی لفظ میرے دل پر گھونسے مارتے رہے۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا، بہت جبر کیا، تب کہیں اپنا لہجہ بدلنے پر قادر ہو سکا۔ اس نے میری کہانی میں خاصی دل چسپی لی۔ لڑکی بھی گوش بر آواز تھی۔ "نام کیا ہے رے تیرا؟" چچی نے پوچھا۔

"فقیرو۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"فقیرے!" وہ اونچی آواز میں بولی۔ "سکتے میں کسی کو جانتا ہے یا یوں ہی منہ اٹھاتے چل پڑا ہے؟"

"بس چل پڑا ہوں بیگم صاب! اللہ سائیں کوئی سبب پیدا کر دے گا۔ آتی بڑی جگہ ہے۔ کہیں نہ کہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی اور اللہ میاں نے منہ چیرا ہے تو کھانے کو بھی دے گا۔ اب پیچھے نا، دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے۔ آج آپ کا دانہ قسمت میں لکھا تھا، کھینچ کر یہاں لے آیا۔"

"تو باتیں تو خوب کرتا ہے پر تو سکتے میں کام کیا کرے گا فقیرے؟"

"وہ تو بڑی ٹامڈ جگ ہے میں کہتی ہوں واپس چلا جا بنارس ہی میں کوئی نوکری تلاش کر۔"

"اب چل دیا تو چل دیا بیگم صاب!" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تیری مرضی۔ یہ بتا تجھے کون سا کام پسند ہے؟"

"مجھے کسی کام میں عار نہیں ہے۔ جو کے کو کیا چاہیے دو روٹی۔" میری زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ جیل سے آنے کے بعد اب تک میں نے کسی سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں اور جیل کی ہمجائی میں بھی کہاں کی تھیں لیکن وہ ایک کہنہ عورت تھی۔ وقت اور مقام دونوں بُرے تھے۔ پولیس پیچھے لگی ہوئی تھی۔ بردوان کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس بار پھر صرف پلیٹ فارم پر موجود ہو، وہ دونوں طرف کھڑی ہو کے اترنے والے مسافروں پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اگر میں چچی سے ایسی باتیں شروع نہ کرتا تو مجھے اگلے اسٹیشن پر اترنا پڑتا پھر پولیس کی نظر سے بچ کے دوبارہ کسی ڈبے میں چڑھنا پڑتا۔ ایک شخص جس کے پاس سفر کا ٹکٹ بھی نہ ہو، جو پولیس کو مطلوب ہو اور جس کا حلیہ بھی مشکوک ہو اور جس کے لیے فرار کے راستے محدود ہوں، وہ کیسی کیسی بدترین مصاحبت پر مجبور آ رہے گا چچی سے اسی حال میں ملاقات ہونا رہ گیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ کلکتے اترتے ہی میرا رخ جیل کی طرف ہو گا۔ وہاں میں کریم گل سے ملوں گا اور اس سے اس شیطان کا پتہ پوچھوں گا جو سات سال پہلے سینما میں کریم گل اور چچی سے کوارٹر کا سودا کر رہا تھا۔ اسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے ہوں گے۔ اب وہی ارکانات تھے یا تو کوارٹر ان غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی ہو گی جنھوں نے اس رات ہم پر حملہ کیا تھا یا اسے مولوی صاحب لے گئے ہوں گے اور آج کریم گل کے بجائے براہ راست اس کی چچی سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے کریم گل کی حیثیت تو محض ایک کارندے کی تھی۔ چچی اس سے کہیں زیادہ مشاق اور پختہ کار عورت تھی۔ خیریت گزری کہ چچی مجھے پہچان نہیں سکی۔ اگر پہچان جاتی تو واقعات مختلف انداز سے پیش آتے۔ ممکن تھا کہ میں اسے کھڑکی سے پھینک دیتا۔ اندھیری رات میں اونگھتے ہوئے مسافروں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ گس گنہ گار کے بوجھ سے گاڑی کا وزن کم ہو گیا ہے۔ دوسرے میں نے چچی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے بہت سوچ سوچ کر، غصے کے باوجود ہر طرح لڑکی کا جائزہ لے کے گفتگو کی ابتدا کی۔ میرا یقین بتدریج پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت کوارٹر سے مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی کہیں سے خواب دکھا کے لائی گئی ہے۔ کسی بے غیرت نے اسے بیچ دیا ہے یا پھر اپنے حالات سے تنگ آ کے چچی کی خواب آور باتوں پر ایمان لے آئی ہے۔ میں نے کوارٹر کا کرب دیکھا تھا۔ میں نے جیل میں ایک نہری بدمعاشوں سے بے خبری اور انسانیت سوزی کے ہزاروں واقعات سنے تھے۔ مجھے اس کی منزل معلوم تھی۔ "کن بھئی فقیرے" چچی نے کندھے اچکا کے کہا۔ "بنارس اور کلکتے میں بہت بڑا فرق ہے۔ بنارس کی دنیا اور ہے، کلکتے کی اور۔ کلکتے میں تجھے نئی نئی باتیں سننے کو ملیں گی۔ تیرا دیدہ پھٹ جائے گا۔ اب اگر تو مجھ سے حامی بھرے کہ تو میرے بتائے ہوئے شاستروں پر چلے گا۔ میری مرضی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھائے گا تو میں تیرے لیے کچھ سوچ سکتی ہوں۔"

"بیگم صاب! بیگم صاب!" میں نے چیل کے کہا۔ "میں آپ کی مدت کتنا رہوں گا آپ رات کو ران کہیں گی تو میں بھی اسے دن کہوں گا۔" آپ جان کو رات کہیں گی تو میری چھوٹی زبان پر ایک بھی لفظ شکایت کا نہیں آئے گا۔ بس آپ ہاں کہہ دیجیے۔ کہہ دیجیے نا!"

"بھئی دیکھ فقیرے!" چچی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے نہیں جانتی۔ تیرا کا پیچھا مجھے کچھ نہیں معلوم مگر تو انسان کا بچہ لگتا ہے اس لیے اعتماد کرتی ہوں۔ مجھے تیری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔ بنارس اچھا ہے ہندو جیسے کہ ہاں طوطے انڈے کھانے سے تیرے چہرے پر یہ چھوٹے چھوٹے پھوڑا پھنسیاں اس کا ذکر تو نہیں لیتی پر تجھے اپنے گھر میں سب کچھ عجیب ہو گا۔ خدا نے ہر چیز دی ہے لیکن بس ایک بات گڑبڑ ہی ہے۔ کسی کی اولاد نہیں ہے۔ کوئی اختر اختر نہیں کرتی۔ زمانہ بدل گیا ہے ہم لوگ پرانے چونچلوں اور بناوٹی رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم فطرتی بھی کرتے ہیں اور جی بھر کے دنیا کا مزا بھی لیتے ہیں سمجھا؟ کچھ آیا دماغ میں؟"

سب کچھ آ گیا۔ میں نے جوش سے کہا۔ بس جی بھر نے زمزمے آگے بیگم صاب! آپ مجھے ہر معاملے میں دو قدم آگے پائیں گی۔ میں گھونٹ کہیں گی بگٹٹ بھاگوں گا لیکن....." میرا چہرہ تنک گیا۔

"لیکن کیا فقیرے؟ کیا تنخواہ کی بات کر رہا ہے؟"

"نہیں بیگم صاب! میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو میں نے خود کو آپ کے قبضے میں دے دیا ہے بیگم صاب! میں ایک غلطی ہو گئی۔" میں نے اٹک اٹک کے کہا۔

"کیسی غلطی؟" وہ چونک کے بولی۔ "کھل کے بتا۔"

"گیا اسٹیشن پر ایک ہندو سے لڑائی ہو گئی تھی۔" میں نے سہمتے ہوئے کہا۔ "اس نے میری ماں کو گالی دے دی تھی۔ میں برداشت کر گیا۔ پھر نہ جانے کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ میں چپ رہا۔ پھر اس نے میرے رخسار پر جھوک دیا۔ بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اس کا خون بہنے لگا۔ آدمی کوئی بڑا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کر دی گئی۔ اب پولیس مجھے اسٹیشن اسٹیشن پکڑنے کی فکر میں ہے۔"

"تو لڑنا جھگڑنا بھی ہے؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"بس بیگم صاب! غصہ آ گیا۔ دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"غیر آدمی کو کبھی کبھی لڑنے جھگڑنے بھی رہنا چاہیے۔"

"اب وہ بردوان اسٹیشن پر پھر میری تلاش میں آئیں گے۔ اسی لیے میں کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا اور دوبارہ آپ کی خدمت میں بیس آجاؤں گا۔"

"آنے دے انھیں، تجھے کیا تھوڑی جائیں گے۔"

"ان پولیس والوں کا دین ایمان کچھ نہیں ہوتا بیگم صاب! میں ان کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا۔" میں نے مضطرب ہو کے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا رے، بردوان تک اطمینان رے بیٹھا رہ۔" یہ کہہ کے چچی نے مٹی کے برتن سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا نکال کے مجھے دیا۔ میں نے بے دھیانے پن سے اسے سلام کیا۔ لڑکی میری داستان ادبے پیتن باتیں حیرت اور حسرت سے سن رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ میرے کسی جملے پر مسکرانے کی کوشش کرتی اور پھر اداسی میں ڈوب جاتی۔ "یہ چھوٹی بیگم آپ کی بہن ہیں؟" میں نے چچی سے لڑکی کے متعلق پوچھا۔ [illegible]

نے دانستہ استعمال نہیں کیا تھا۔ چچی نے جس طرح ایک بار کورا کی بلائیں لی تھیں اسی طرح اُس کی ٹھوڑی پکڑ کے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ چچی کی اس وارفتگی پر لڑکی کا رنگ سُرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں شرم کے ڈورے پڑ گئے۔ "یہ میری زندگی ہے" یہ میرا سہارا ہے۔" چچی نے اُسے بازو سے پکڑ کے خود سے قریب کر لیا۔ لڑکی دُہری ہو گئی۔

بردوان اسٹیشن تک میں اُس سے بنارس کی باتیں کرتا رہا۔ پھر جب پلیٹ فارم پر گاڑی سُست پڑنے لگی تو چچی نے میری طرف دیکھ کے لیٹرین کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے سوا اُس کے ذہن میں مجھے چھپانے کے لیے کوئی ترکیب ہی نہیں آ سکتی تھی۔ میں وہاں چلا گیا۔ پھر دَبے کے اندر کون آیا؟ کون گیا؟ ہمیں اس تمام رُوداد سے بے خبر رہا۔ پلیٹ فارم سے اُٹھنے والا شور اتنا تیز تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پولیس والوں نے کھڑکی سے جھانک کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والی ان دو برقع پوش معزز خواتین سے ادب کے ساتھ پوچھا ہو گا کہ انھوں نے اپنے ڈبے میں کوئی مشتبہ تو نہیں دیکھا؟ چچی کے تیور بگڑتے ہوں گے اور پولیس والے کوئی جواب دیے بغیر آگے نکل گئے ہوں گے۔ اندر میرا دم گھٹتا رہا۔ ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ میں کریم گل کی چچی کی سمجھ میں بند تھا۔ میں نے سوچا کہ فرض کر لو اُس نے یہ بہروپ مجھے پہچان کر بھرا ہو اور پولیس کے انتظار ہی میں بیٹھی ہو؟ مجھے جھرجھری آ گئی۔ بردوان اسٹیشن سے گاڑی کی روانگی میں خاصی تاخیر ہوئی۔ میرے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے جب گاڑی نے حرکت کی تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ پھر چچی کی دستک پر میں باہر نکلا۔ "آئے تھے وہ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آئے تھے اور جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔" چچی مسکرائی۔ "کیا کہتے تھے؟" چچی اکیلے میں یقیناً مجھ پر احسان جتانے کے لیے باتیں بنا سکتی تھی مگر لڑکی کی موجودگی میں مبالغے سے کام نہیں لے سکی۔ اُس نے صرف یہ کہا۔ "بس بیٹھ جا آرام سے کاہے کی فکر کرتا ہے۔ تیرے لیے جھوٹ بولنا پڑا۔"

میں نے احسان مندی کے طور پر اُسے سلام کیا۔ میری سادگی پر وہ کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ لڑکی اُس کی ہنسی میں شریک نہیں ہوئی جیسے جیسے کلکتے کا فاصلہ گھٹ رہا تھا' لڑکی کے چہرے پر وحشت سی پھیلتی جا رہی تھی۔ کسی اسٹیشن پر ٹھیرنے کے لیے گاڑی کی رفتار مضمحل ہونے لگی میں نے دوبارہ چھپنے کے لیے پر تولے۔ "بیٹھا رہ۔" چچی نے حکم دیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ کہاں تک تلاش کریں گے۔ بس اب نچلا ہو کے بیٹھ جا۔"

چچی کا اندازہ درست تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سا اسٹیشن تھا۔ وہاں پولیس کا کوئی ہرکارہ ڈبے کی طرف نہیں پھٹکا۔ دو اسٹیشنوں پر مطلوبہ ملزم کی تلاش میں ناکامی کے بعد انھوں نے ہار مان لی ہو گی اور یہ قیاس کیا ہو گا کہ ملزم گیا سے رات کو جانے والی ہوڑا ایکسپریس میں سوار ہو گیا ہو گا۔

وہ آنی ہی ٹَل دو کر سکتے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے شبہے میں چند غریب مسافروں کو پکڑ بھی لیا ہو۔ پولیس خانہ پُری کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے لیکن ابھی گاڑی ٹھیرے ہوتے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ دو سپاہی کے آدمی نہایت بے تکلفی سے کھڑکی پر کھڑے ہو گئے۔ مجھے وہاں دیکھ کے اُن کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ شکل و صورت سے اُن کے مشتبہ صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں گزارا تھا۔ ایک کچھ لمبا اور دوسرا اوسط قد کا تھا۔ وہ معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ "خیریت تو ہے؟" لمبے قد کے آدمی نے چچی سے پوچھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" چچی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اُس آدمی نے میری جانب آنکھ کا اشارہ کیا۔ چچی نے اشاروں ہی سے اُسے مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ چچی کی خاموش زبان سمجھ نہیں سکا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دم شکلے لپکے اور وہ مجھے گھور کے دیکھنے لگا۔ چچی نے کھڑکی کی طرف بازو بڑھا کے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے تو اُسے حیرت ہوئی لیکن پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ لڑکی نے اُن دونوں کے آنے سے پہلے منہ پھیر لیا تھا اور چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔ وہ چچی کے یہ اشارے کنائے نہیں دیکھ سکی تھی۔ چچی کے ملازموں کے سامنے وہ بے پردہ اور بے جھجک ہونا نہیں چاہتی ہو گی۔ ظاہر ہے چچی نے اُسے یہ بتایا ہو گا کہ اُس کے ساتھ دو خدام مل رہے ہیں۔ پہلے مجھے تعجب تھا کہ چچی جیسی جہاں دیدہ عورت ایک جوان لڑکی کے ساتھ تنہا کیسے سفر کر رہی ہے۔ دونوں خادموں کی آنکھوں میں میرے لیے خشونت اور حقارت بھری ہوئی تھی چچی نے پان دان کھول کے ان کے لیے گلوریاں بنائیں اور مجھ سے پوچھا۔ "کھاتا ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تینوں بعد پان کھانے کو ملا۔ آخری پان بھی سات سال پہلے بڑھا دیا۔ تینوں بعد پان کھانے کو ملا۔ آخری پان بھی سات سال پہلے اسی نے کھلایا تھا۔ میرے ہونٹ لال ہو گئے۔ چچی نے ویسے ہی پھانے پہلو بدل کے میری طرف پاس بھری نظر کی اور خوالال ہو گئی۔ جیسے اُسے ہزاروں پان کھلا دیے گئے ہوں۔ کلکتے تک آنے والے ہر اسٹیشن پر دونوں خادم حاضری لگا جاتے اور مجھ پر نفرت برساتے ہوئے رخصت ہو جاتے میں سارے وقت فرش پر بیٹھا رہا۔ اونگھ بھی نہیں آئی۔ چچی اور لڑکی کے درمیان بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں نے چچی کی غفلت کا بہت انتظار کیا کہ وہ ادھر اُدھر ہو تو میں لڑکی سے کچھ بات کروں مگر کسی بھی لمحے چچی کی آنکھ نہیں لگی اور نہ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

ہوڑا اسٹیشن پر گاڑی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن پر گاہک تلاش کرنے والے قلی اور چائے کی دکانوں کے بیرے ہمیں دیکھ کے ہماری طرف لپکے۔ ہم تینوں کے پاس ایک ایک اٹیچی کیس تھا۔ لڑکی کے پاس ایک بیگ تھا۔ چچی نے اپنا اٹیچی کیس ایک قلی کے سر پر رکھا۔ دوسرا قلی لڑکی کا بیگ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ لڑکی نے بیگ اُس کے حوالے کر دیا۔ تیسرا قلی میرا اٹیچی کیس اٹھانے کے لیے جھپٹا۔ میں نے اُسے روک دیا۔ "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف یہ کپڑے ہیں۔" قلی نے میرا بستر بند اٹھا لیا۔ چچی نے اُسے بھی روک دیا۔ "ہمارے ساتھ چل۔" چچی نے حکم دیا۔ "تیرا پیسا مارا نہیں جائے گا۔" چچی کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ قلی نے اپنا بوجھ اٹھا لیا۔ اسٹیشن سے باہر آ کے چچی نے ایک ٹیکسی والے سے بھاؤ تاؤ کیا۔ ٹیکسی والا ہمیں ہاوڑا اسٹیشن سے ہٹ کر ایک سنسان جگہ پر لے گیا۔ وہاں ایک اور ٹیکسی کھڑی تھی۔ چچی نے اُس ٹیکسی والے سے بھی بھاؤ تاؤ کیا۔ پھر ہم تینوں اُس ٹیکسی میں بیٹھ گئے

ہوئی تھی اور لباس بھی ڈھنگ کا تھا مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نرس کی مرضی کے خلاف اُسے ساتھ لے کے گھر سے باہر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جس بدمعاش کی مجھے تلاش ہے، وہ بچی کے ہاں ایک نئی لڑکی کی آمد کا ذکر سن کر خود اس طرف آجائے۔ سوتے وقت بچی نے مجھے اپنے پیر دبوانے کے لیے طلب کر لیا۔ یہ بات بڑی انوکھی تھی مگر بچی کے ہاں ہر چیز جائز تھی۔ مجھے بڑی جھجک ہوئی۔ پھر بھی قہر درویش برجان درویش، مجھے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ میرا جی چاہا کہ میں اُس کے پیروں کی انگلیوں کے بجائے فاختہ کھلنڈلوں مگر میں ضبط کیے ہوئے نہایت احتیاط سے اُس کے پیر دبا رہا۔ زرّیں اُس کے ساتھ ایک پلنگ پر نیم دراز تھی۔ بچی نے مجھے ڈانٹا۔ "کم بخت ہاتھوں میں دم نہیں ہے کیا؟ ذرا زور سے دبا۔ سارے بدن کی جان نکلی ہوئی ہے۔" یہ سن کے زرّیں نے اس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ "نانا" بچی نے اٹھلا کے کہا۔ "یہ نازک ہاتھ پیر دبانے کے لیے نہیں، چوڑیاں پہننے، مہندی لگانے اور پیار کرنے کے لیے ہیں۔" میں نے زور زور سے اُس کے پیر دبانے شروع کر دیے۔ "ہاں اب ٹھیک ہے۔" وہ کہتے ہوئے بولی۔ "ابھی اپنی نوکری پکی مت سمجھو، جب تک میں تمہیں اچھی طرح دیکھ اور پرکھ نہ لوں گی، کوئی پکی بات نہیں کروں گی۔"

دوسرے روز میں نے گھر کے کاموں میں زیادہ تن دہی سے حصہ لینا شروع کر دیا اور ہر چیز چمکا دی۔ کرسیاں، الماریاں اور شیشے کے برتن۔ اس طرح میرے کام اور میری زبان سے بچی مطمئن ہونے لگی۔ شام کو چار بجے وہ نیکی ننگو کے اور زرّیں کو ساتھ لے کے گھر سے کہیں جانے لگی میں اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ "بیگم صاب! مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ مکلہ دیکھ لوں گا موٹر میں بیٹھوں گا۔" میں نے بچوں کی طرح ضد کی۔ اُسے مجھ پر ترس آگیا اور اس نے اپنے ساتھ مجھے بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ نیکی مکلے کی سڑکوں پر موتی رسی، بچی زرّیں کو کٹورہ یا گارگن لے گئی۔ وہ پہلے مجھے اور کورا کو بھی اسی جگہ لائی تھی۔ یہ خوب گھومے اور آخر تھکے ہارے گھر واپس ہوتے۔ دوسرے دن زرّیں کچھ کچھ کھلنے لگی۔ میں بیشتر وقت اُس کے قریب گزارنے کی جستجو میں رہا۔ رات کو بھی موٹریں آئیں اور مہمان بچی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کے چلے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھ گئی۔ تین دن بعد صرف ایک بار بچی اکیلی کہیں باہر گئی۔ میرے لیے یہی وقت مناسب تھا۔ میں زرّیں کے پاس بیٹھا اُس سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے کچھ بات کرے گی، اپنے بارے میں مجھے کچھ بتائے گی لیکن وہ تو صرف سرد آہیں بھرتی رہی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اتنا اعتماد تو مجھے ہو گیا کہ زرّیں مجھے ایک بے ضرر خدمت گزار اور وفادار شخص سمجھنے لگی ہے۔ تین دن تک میں نے جی جان سے بچی کی خدمت کی تھی۔ زرّیں بیگم! آپ سے ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے آخر جرأت کر ہی لی۔ میرا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "آپ ہی کے فائدے کی ایک بات ہے۔" میں نے زور دے کے کہا۔

"کہو۔" وہ آہستگی اور سنجیدگی سے بولی۔

"پہلے ایک وعدہ کیجیے۔" میں نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیسا وعدہ؟"

"یہ وعدہ کریں جو کچھ کہوں گا اُسے آپ اپنے ہی تک محدود رکھیں گی۔ میرے خلوص پر شبہ مت کیجیے۔ میں آپ سے کچھ کارآمد باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ تجسس سے بولی۔

"آپ کو اپنی سب سے عزیز چیز کی قسم، میں جو کچھ کہوں کسی سے اُس کا ذکر کرنے سے پہلے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں نے سچ کہا ہے یا نہیں۔"

"تم بات تو بتاؤ۔" وہ اکتا کے بولی۔

"آپ۔ آپ مجھے کسی معزز اور شریف خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہیں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "لیکن آپ بُرے لوگوں میں پھنس گئی ہیں۔" اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "کیا؟" وہ سٹ پٹا کے بولی۔ "تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟"

"ان لوگوں کے بارے میں جو آپ کو یہاں تک لائے ہیں۔" میں نے مضمحل لہجے میں کہا۔ "آپ بہت معصوم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون آسامی تھے کہ آپ کو یہاں تک آنا پڑا۔ آپ بیگم صاحب کو کب سے جانتی ہیں؟" جواب دینے میں گریز ہوا۔ میں نے کہا۔ "زیادہ دنوں سے نہیں۔ آپ کا جواب یقیناً یہی ہوگا۔"

"ہاں۔ زیادہ دنوں سے نہیں۔" وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم کیسے جانتے ہو؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"میرے جاننے کی بات بعد میں پوچھیے گا۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ یہاں آنے پر تیار کیسے ہوئیں؟ دیکھیے، آپ کو یہ بتانے میں جھجک ہے لیکن بہرحال میرا مقصد آپ کے بھلی طرح جاننا نہیں ہے۔ میں زرّیں کو بروقت ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔ آپ نے بہت بُرا کیا جو گھر سے چلی آئیں۔ چند ہی دنوں میں آپ کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کن مصیبتوں میں گھر گئی ہیں۔ میں کہتا ہوں آپ بھی واپس چلی جائیے۔"

"مگر میں کیسے جا سکتی ہوں؟ گھر کے دروازے تو ہمیشہ کے لیے مجھ پر بند ہو گئے ہیں۔" اُس نے کرب سے کہا۔ "میں تو کہیں بھی واپس نہیں جا سکتی۔"

"آپ کے والدین آپ کو پھر گلے لگا لیں گے۔"

"میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ اُن کا انتقال ہو گیا تو خالو مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن پھر انھوں نے

کے بچوں نے میری زندگی عذاب کر دی۔ پھر ایک دن مختاری بیگم صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے ہمارے پڑوس میں گھر لے رکھا تھا۔ اس لیے اُن کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور جب انھوں نے مجھ پر ٹوٹنے والے ظلم و ستم دیکھے تو پریشان ہو گئیں۔ وہ مجھ سے بڑی ہمدردی کرنے لگیں۔ شاید خالو مجھے اس لیے برداشت نہیں کرتے تھے کہ میں اپنے باپ کی تمام جائداد کی تنہا وارث تھی۔ بہرحال میں وہاں بڑی تکلیف میں تھی۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بیگم صاحب کے ساتھ چلی آئی۔ انھوں نے مجھے اس جہنم سے نکالا اور میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئیں۔ اب تم اُن کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ ایک جہنم سے نکل کے دوسرے جہنم میں آگئی ہیں۔ پہلے والے جہنم میں کم سے کم آپ کی عزت تو محفوظ تھی۔ یہاں تو کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ میں آپ سے اتنی بات نہ کرتا لیکن میں چونکہ خود اس جہنم سے گزر چکا ہوں۔ اس لیے زبان بند نہ رکھ سکا۔"

"بیگم بیگم صاحب کو پہلے سے جانتے ہو؟"

"چونکہ آپ انتخائے راز کا وعدہ کر چکی ہیں اس لیے یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہاں میں انھیں پہلے سے جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"لیکن وہ تو تمھیں نہیں جانتیں؟"

"ہونہہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انھیں اگر میرے یاد دہستے اور انسانیت سے کوئی ہمدردی ہوتی تو وہ مجھے ضرور پہچان لیتیں۔ اب وہ مجھے بھول گئی ہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ نے اس ماحول پر غور نہیں کیا؟ بیگم صاحب نے آپ کی آنکھوں پر غلاف ڈال رکھا ہے۔ آپ ذرا غلاف اٹھا کے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ رات کو یہاں جو لوگ آتے ہیں، ذرا اُن کی اور بیگم صاحب کی باتیں سننے کی کوشش کیجیے گا۔ پھر مجھ سے بات کیجیے گا۔"

اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ میں نے اُسے مٹھی بھنچے خوف زدہ اور سراسیمہ کر دیا تھا۔ "بیگم..... وہ نہیں ہو..... وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "تم نے اُن کی نوکری کی ہے اور تم.....؟"

"ہاں نوکری کی ہے اور سن لیجیے کہ صرف آپ کی وجہ سے کی ہے۔"

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے۔ بیگم صاحب کے ساتھ آپ کو دیکھ کے میرے بہت سے دکھ تازہ ہو گئے۔ اب آپ کو کیا کیا بتاؤں....." میں نے لمبی سانس لے کے کہا۔

اچانک برآمدے میں کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں فوراً اُس کمرے سے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے چلتے چلتے اُسے تاکید کی کہ اگر وہ اپنے وعدے پر قائم رہی تو کل وہ اس سے میری باتوں کی تصدیق کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور کان کھڑے رکھے تو امکاناً اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس بات پر اُس کا تاثر دیکھنے کا وقت کسی نہیں سائیں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے بھاگ کر اپنی خفیہ جگہ میں پناہ لی۔ زرّیں تو کورا کی طرح سیدھا کاندھی۔ وہ میری باتیں بڑی حیرانی سے سن رہی تھی۔ لڑکپن کا رنگ اتنا ہلکا نہیں ہوتا تھا کہ دھوپ سے اُڑ جائے۔ ویسے میں اُس کے لیے ایک بالکل نیا آدمی تھا۔ اُس کے نزدیک میرا سچ جھوٹ سے پرکھنے کی حیثیت زیادہ مستند اور محترم تھی۔ بہرحال اُسے ایک خطرے سے آگاہ کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ اگر زرّیں نے اُس سے میرے بارے میں کچھ کہہ دیا اور بچی نے مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دینے کا حکم دے دیا تب بھی مجھے اسے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

بچی کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس کا چہرا اُس کے پیشے کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم اور کھلے ڈھنگ کی عورت تھی۔ بچی نے اُسے بڑے کمرے میں بٹھایا اور زرّیں کو ساتھ لے کے ذرا گئی۔ میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر منڈلانے لگا۔ آنے والی عورت کی گرج دار آواز اچانک بلند ہوئی۔ "چشم بد دور۔ یہ ہے وہ ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ، اس بار تو نسترن خانم تم نے ہم سب کو شکست دے دی۔ بھئی، لڑکی تو اب ہماری ہو گئی۔"

"تمھاری ہی ہے۔" بچی فراخ دلی سے بولی۔ "اُس کا باپ بھی بار معلوم ہوا۔" میں نے کب انکار کیا ہے۔ پھر وہ زرّیں سے مخاطب ہوئی۔ "آداب کرو، خبر ہے تمھارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ یہ کھلکھلتے کی نامی گرامی بیگم ہیں — مہتاب بیگم۔" میں نے جھانک کر دیکھا۔ زرّیں نے اُسے آداب کیا۔ مہتاب بیگم نے جواباً اُسے سینے سے لگایا۔

بچی نسترن خانم نے باورچی کو آواز دی۔ باورچی اس خان آیا تو مجھے اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا۔ اس لیے میں باقی حال دیکھ اور سن نہیں سکا۔ مہتاب بیگم دیر تک بیٹھی رہیں۔ پھر نسترن زرّیں کو اُس کے کمرے میں بھیج کے مہتاب بیگم کو بڑے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ موقع اچھا تھا، گو میں جان بوجھ کر زرّیں کے کمرے میں نہیں گیا۔ پھر نسترن خود بھی کہیں باہر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک جاتا، ایک آتا۔ دوسرے دن صبح تک خیریت رہی۔ زرّیں نے نسترن سے برے تعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میرے ساتھ نسترن کا رویہ مستعد نوکر کی اور اپنائیت کا تھا۔ البتہ زرّیں کچھ اداس ہو گئی تھی۔ جب کبھی میرا اُس کا سامنا ہوتا میں اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا۔ وہ دن بھر کھوئی کھوئی۔ اُسی دن شام کی چائے کے وقت نسترن نے ایک بار پھر زرّیں سے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "بی بی، یہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ دنگے لگا رہا ہے۔ کیا تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ کیا تجھے کسی سے کوئی شکایت ہے؟

کیا کوئی ملازم تیار کرنا نہیں مانتا؟ مجھے بتا کہ آخر کیا بات ہے؟ میں تیرے لیے دنیا بھر کی خوشیاں خرید لوں گی۔"

زرّیں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں، یہاں ہر چیز موجود ہے، مجھے تو کوئی غم نہیں ہے۔"

"اب اپنا وہ پہیلی بازار بھول جا بی بی! توبہ توبہ تیرے ساتھ کیسا بُرا سلوک کرتے تھے وہ لوگ۔ میں جب بھی خیال کرتی ہوں، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"بھول ہی گئی ہوں۔" زرّیں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"اور یہ تو اندر کیا چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ کچھ باہر بھی آیا جایا کر پگلی! اس مکان میں صرف ایک کمرہ تھوڑی ہے۔"

"جی۔" زرّیں اُس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"تو یہاں کھڑا کھڑا منہ کیوں تکتا رہتا ہے؟ اچانک نسترن میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "کچھ بی بی کا بھی خیال رکھا کر اس کی خدمت کیا کر۔"

"میں تو بہت کہتا ہوں بیگم صاحب!" میں نے فدویانہ انداز میں کہا۔ "مگر زری بی تو کمرے میں بند پڑے رہنے کی عادت ہے۔"

"نہیں نہیں بس بہت غم ہو چکا۔" نسترن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آج سے کمرہ بند، شام کو میرے دو منہ بولے بھائی آ رہے ہیں اُن کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، اُن سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ آج شام اُن کے ساتھ بائیسکوپ چلیں گے۔ زرّیں! تم اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن لینا۔ سمجھیں میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"جی۔" زرّیں نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج آپ ہو آئیے۔ مجھے مَردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" زرّیں نے جرأت کر کے کہا۔

"کون مرد۔" نسترن کچھ تلخی سے بولی۔ "بی بی! وہ اپنے بھائی ہیں، چاہے سگے نہ ہوں مگر کیا عزیزوں سے کم ہیں۔"

"پھر بھی میرے لیے تو اجنبی ہیں۔" زرّیں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اجنبیت تو ختم کرنے سے ختم ہو گی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا میری لاڈلی کہ یہ کلکتہ ہے، فیض آباد نہیں ہے، لکھنؤ نہیں ہے، یہاں تم وہاں کی باتیں کرنے لگیں تو بس کام ہو گیا۔ اری نگھی بی! میری جان! جب میں تمہاری عمر کی تھی، اُس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔ اب گرد بیٹھنے کے بعد پتہ چلا کہ سارا وقت کتنے دھکے سہلوں، کتنے دھوکوں میں گزر گیا۔"

زرّیں کا یہ بدلا ہوا انداز نسترن کے لیے تازیانہ ثابت ہوا۔ اُس نے اتنی باتیں تک، ایسی نرمی، گرمی، تلخی اور شفقت سے باتیں کیں کہ زرّیں کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ پھر اُس دن نسترن غیر متوقع طور پر کہیں باہر گئی۔ میں اسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس لیے جھٹ زرّیں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ سسک سسک کے رو رہی تھی۔ مجھ سے کچھ نہیں ہو گا زرّیں!" میں نے یہ پروا نہیں کی کہ میں اُسے کس لہجے میں مخاطب کر رہا ہوں۔ "اب تم نے زیادہ دیر کی، کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر لیا ہو گا۔ میں اس وقت صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم اُن مَردوں کے سامنے چلی جانا جنھیں بیگم صاحب نے اپنے منہ بولے بھائی بتایا ہے۔ تم ضرور بھی ماما جانا۔ میں بیگم صاحب کے انکشاف پر مکمل یقین ہو جائے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہیں موجود ہوں اور ہاں یقیناً تم مجھ پر بھی شبہ کر سکتی ہو کیونکہ میری عمر میرا حلیہ اور میرے کپڑے میری باتوں کی نفی کرتے ہیں لیکن یقین کرو، تم جس طرح خود پر اعتبار کر سکتی ہو اُسی طرح مجھ پر کر لینا اور باقی معاملہ اپنے خدا پر چھوڑ دینا۔ سمجھیں تم نے بیگم صاحب سے میرا ذکر سُن کر مجھ پر اور خود پر احسان کیا ہے میں کوشش کروں گا کہ تمھارے اعتماد پر پورا اُتروں۔ اب مجھے کیا بتاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں۔ بس اپنا خیال رکھو، میں یہی کہنے آیا تھا۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

زرّیں نے لرزتی ہوئی پلکیں اٹھا کے مجھے دیکھا پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگی۔ "رونا بالکل بند۔ میں نے اُس کے قریب ہو کے کہا۔ "رونے سے کام اور بگڑ جائے گا۔ تمھیں تو یہ تاثر دینا چاہیے کہ تم اس ماحول میں بہت تازگی محسوس کر رہی ہو۔"

"میں اُن مَردوں کے سامنے نہیں جاؤں گی۔" وہ تقت سے بولی

"آج کے بعد مت جانا۔ میں چاہتا ہوں تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ میں قریب ہی کہیں موجود رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔ بیگم صاحب نے سارے نوکروں کو چوکنا رکھا ہو گا۔ اپنے رویّے سے کسی قسم کا اظہار مت کرنا۔" میں اُس کے کمرے سے نکل آیا۔

نسترن خانم کا کوئی بھی وفادار ملازم اُسے میرے بارے میں شکوک کر سکتا تھا۔ ویسے ابھی تک تو بات ٹھیک چل رہی تھی۔ چائے کے بعد نسترن کا اچانک گھر سے باہر جانا کسی خطرے کی علامت ضرور تھا۔ اُس کا زندگی میں بے شمار لڑکیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ لڑکیوں کے مختلف مزاجوں سے خوب آشنا ہو گی ہو گی۔ آج اُس نے زرّیں کے لہجے کی ترشی محسوس کر لی ہو گی۔ نسترن کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آ گئی۔ وہ بھنّائی جھنجلائی ہوئی تھی۔ آج اُس نے مجھ پر بھی ملائمت کی وہ نظر نہیں ڈالی اب تک ڈالتی رہی تھی۔ پھر جب اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو گیٹ پر بیٹھے ہوئے بوڑھے چاٹ ملازم نے اُسے اُس کے دونوں بھائیوں کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اُن کے استقبال کے لیے دوڑتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔ ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں روشن کر دی گئیں۔ باورچی کو پہلے حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ کچھ خیرسگالی کا اہتمام کرے۔ میں بھی اُس کی مدد کی خاطر باورچی خانے میں مصروف تھا مگر ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہاں کچھ دیر بعد ہی جانا مناسب تھا۔ باورچی نے چائے تیار کر لی تو اُس کے بھجانے میں خود چائے کی ٹرے لے کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ نسترن سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کے دونوں بھائیوں کی پشتیں میری جانب تھیں۔ نسترن کی رازدارانہ نگاہ پر اُن کی آوازیں ایک دم ماند ہو گئیں۔ دونوں نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی اور چالیوں میں ایک چھناکا ہوا۔ نسترن ہنس کر بولی۔ "بنایا ہے، ہر وقت ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔"

میرے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ میں پورے سات سال کے بعد اُس شخص کو دوبارہ دیکھ رہا تھا یہ وہی بدمعاش تھا جس نے ایک رات مینا میں نسترن سے کوراکی فروخت کے سلسلے میں بھاؤ تاؤ کیا تھا۔ کریم گل نے جیل میں سمیں کھا کھا کے کہا تھا کہ اُس کے غنڈوں نے ہمارے ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد صرف اُس وقت تک ہمارا تعاقب کیا تھا جب تک ہماری ٹیکسی نظر آتی رہی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اُسے کوئی خبر نہیں تھی۔ جیل کے ساتھیوں نے صحیح بات اگلوانے کے لیے کریم گل کی چمڑی اُدھیڑ دی تھی مگر اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یکدم کریم گل کا نہیں کسی اور کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام اُس شخص کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا، جو اس وقت یہاں موجود ہے۔ اُس رات مینا میں اس نے اور اس کے ساتھ والی عورت سچّی بی نے جن ہوس ناک نظروں سے کوراکی پذیرائی کی تھی، وہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ اُن کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کورا کو نسترن سے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے میرے اور کورا کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہو۔ اُس نے مجھے اور کورا کو مولوی صاحب کے ساتھ کہیں بازار وغیرہ میں دیکھ کے ہمارا تعاقب کیا ہو۔ میں اندر سے بُھک سا ہوا۔ اس لیے مجھے میز تک پہنچنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ میرے پیر من من بھر کے ہو گئے تھے۔ دل کی حرکت اچانک تند سی ہو کے تیز ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے خود کو سنبھالنے کی اضافی مشق کرتے ہوئے۔ اُن دونوں کو سلام کیا۔ وہ میری جھجک پر ہنسنے لگے۔ دونوں تنومند تھے۔ میرے مطلوب شخص کا رنگ روپ خاصا بدلا گیا تھا۔ سر کے بال اُڑ گئے تھے۔ داڑھی میں کترا بھی نہیں تھا۔ وہ بالکس معقول پہنے ہوئے تھا۔ کیوں نہ پہنتا، ایسے نامعقول لوگوں کو معقول بامسلی کی کمی ہی کیا ہے؟ اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اُس کے ہونٹوں پر تلوار کے مانند کھنچی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں بہت تیز چمک تھی۔

دوسرا شخص سفید شیروانی میں ملبوس تھا اور تن و توش کے اعتبار سے چوڑے جسم کا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ سرمئی تھا۔ انگریزی بال نہیں تراشے خوشنما سے آراستہ کیے گئے تھے۔ وہ اگر خود کوئی نواب نہیں تو کسی نواب کا مصاحب ضرور معلوم ہوتا تھا۔ نسترن کو اپنے گاہکوں کی قسموں کا خوب اندازہ ہو گا کہ کون سی لڑکی کے لیے کس قسم کے گاہک سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ منعم خانم! ہماری بے چینی کب دور ہو گی؟" نواب زادے نے کہا۔

"گھبرائیے نہیں مرزا صاحب!" خانم کے بجائے وہ بدمعاش بولا۔

"پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ ہمیں عقیقے چاند سیاں کرم اس بار بھی ہمیں تباہ کروا دو گے۔" نواب ہنس کر بولا۔

کہ سے کم مجھے اُس بدمعاش کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں دل زیادہ دیر ٹھیرنے کی غرض سے خود چائے بنانے لگا۔ تو اب نے بے حیا لہجے کی۔ "بھئی خانم! ہم تو آپ کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔"

"ذرا دیکھیے تو سہی۔" خانم نے ایک ادا سے کہا۔ "فقیر اکیسی اچھی چائے بناتا ہے۔ میں اندر جا رہی ہوں۔ ذرا سنبھل کے بیٹھیے اور سلیقے سے پیالیاں ہاتھ میں تھامیے۔"

"تم ہے۔" نواب اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "خانم! آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ کا ہم سے بڑا قدر دان کھان ہو گا۔"

"چلیے جانے بھی دیجیے۔ اب بہار چلی گئی ہے تو آپ کے چٹکلے شروع ہو گئے۔" خانم نے اُٹھتے ہوئے کہا مگر کچھ سوچ کے پھر بیٹھ گئی اس نے مجھے حکم دیا۔ "جا ذرا باہر جا کے دیکھ کہ اندر کیا چھپی بیٹھی ہیں، ہمارے محسن بھائی آئے ہیں۔" خانم نے میرے ہاتھ سے پیالی لے لی۔

میں دروازے سے باہر جا کے آگے بڑھنے کے بہانے وہاں ٹھیر کر اندر چاندیاں کر رہا تھا۔ "خانم! چھوکریوں کے انتخاب میں تو دور دور تک تمھارا کوئی ثانی نہیں، یہ چھوکریں پرتمھاری نظر کیسے پڑنے لگی ہے، بھانت کے لائی ہو۔ خیال رکھنا۔ اس کے چہرے سے یہ سمجھا، ہنگامہ مت مچوا دینا سمجھ لو، چھوکریاں باہر جانے سے انکار کر دیں گی۔"

"چلو ہٹو، کچھ مرزا صاحب کا بھی خیال کرو۔" خانم کی آواز آئی۔ "یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ موقع بے موقع زبان چرچرا کرتے رہتے ہو۔ بس اب وہ آنے ہی والی ہے۔ ذرا احتیاط سے میٹھو اور خبردار اُس کے سامنے کوئی اول فول بات مت کرنا۔"

میں نے زرّیں کے کمرے میں جا کر اُسے حتمی حکم سنایا۔ تتلیں نہایت بہترین لباس پہنے ہوئے تھیں۔ شاید نسترن نے اُس کی آرائش و زیبائش میں فیاضی سے دل چسپی لی تھی۔ وہ ایک دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ وہی غرارہ تھا اور تنگ چمبر۔ سر پر دوپٹا تھا۔ وہ چھ تیلوں میں سے ایک آگے کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ میں مبہوت رہ گیا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔" اُس نے منہ پھیر کر کہا۔

"چلی جاؤ زرّیں! پہلی بار۔" میری مانو، اس وقت یہی مناسب ہے۔ میں تمھیں کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ کبھی کبھی آدمی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ ایک بُرا خواب دیکھا تھا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"ایک طرف تو تم منع کرتے ہو، دوسری طرف مجھے وہاں بھیجنے کے لیے بھی مُصر ہو؟" وہ اضطراب سے بولی۔ "میرا جی وہاں جانے کو نہیں چاہتا۔"

"جی تو میرا بھی نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے زرّیں!" میں نے نرمی سے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اُس نے ایک غیر متعلق سوال کیا۔

"میں کوئی بھی ہوں لیکن ہوں تمہارا غم خوار۔ خدارا اس وقت میرے بارے میں کچھ سوچو۔ تمہیں پہنچنے میں دیر ہو گی تو بیگم صاحب خود اندر آجائیں گی۔"

وہ بہت مشکل سے آمادہ ہوئی۔ میں اُسے ساتھ لے کے چلا۔ اُس کا لباس خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سن کے نسترن پکی لوٹ اُسے شانے سے پکڑ کے اس طرح آگے لے چلی جیسے دلہنیں لے جائی جاتی ہیں۔ نواب مرزا اور چاند میاں کے دیدے پھٹ گئے۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سے ہو گئے۔ چاند میاں کی پتلیاں اُس کی آنکھوں میں پارے کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اُس نے مرزا کا ہاتھ پکڑ کے کوئی سرگوشی کی۔ تب کہیں مرزا ہوش میں آیا۔

"میں نے ان دونوں سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔" نسترن نے چمک کے نرگس سے کہا۔ "انھیں تسلیمات کرو۔"

"آداب!" نرگس کا سیدھا ہاتھ اُٹھتے ہوئے کپکپا گیا۔

"تسلیمات، تسلیمات۔" مرزا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "ہم نے جب سے آپ کا تذکرہ سنا ہے، آپ کو دیکھنے کے لیے طبیعت بے قرار تھی۔ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ گویا خانم نے آپ کی تعریف میں بخل سے کام لیا تھا۔"

نرگس نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ نسترن استیاق سے اُن دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُن کے چہروں پر تو بس حیرت پھیلی ہوئی تھی۔ نرگس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے شاید اُن دونوں کے چہرے تک نہیں دیکھے ہوں گے۔ "خانم باجی! آپ نے شاید انھیں نہیں بتایا کہ آپ سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟" چاند میاں نے زبان کھولی۔ "یہ تو ہم سے اچھی خاصی اجنبیت برت رہی ہیں۔"

"میں نے بتا دیا ہے لیکن یہ تو فطری شرم ہے۔ اب تم طویلے سے نکلنے کے آدمی۔ اس گڑبڑا کو تو ابھی یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔"

"سچ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہم نرگس بانو کے لیے تو کچھ بھی نہیں لائے۔" نواب مرزا بے قراری سے بولا۔ "خال ہاتھ چلے آئے۔" اُس نے شیروانی کا بٹن کھول کے اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "خانم! آپ ہماری طرف سے یہ پانچ ہزار روپے رکھیے اور نرگس کے لیے ان کی پسند کے مطابق ایک بہت عمدہ سا تحفہ خرید لیجیے۔"

"ارے نہیں مرزا بھائی! نرگس بھی یہیں ہے آپ بھی یہیں ہیں۔ دسیوں موقع آئیں گے۔" نسترن نے گڈی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"بھلا آپ کون ہوتی ہیں درمیان میں دخل دینے والی؟ یہ ہمارا اور نرگس بانو کا معاملہ ہے۔" خدا کو اپنی جگہ قرار نہیں تھا۔

آتچھا تو دیکھیے نرگس سے پوچھ لیجیے۔ کیوں نرگس؟ نسترن نے نرگس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

نرگس نے پہلی مرتبہ چہرہ اوپر کیا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی نظر میری طرف اُٹھی۔ میں نے اثبات سے اُسے تحمل کی تلقین کی۔ اسی وقت نسترن کو جیسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس نے مجھے ڈانٹ کے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں باہر تو آگیا لیکن چائے کے برتن اُٹھانے، میٹھی اور نمکین نعمتوں کی پلیٹیں سجانے کے بہانے بار بار اندر جاتا رہا۔ نرگس خاموش بیٹھی تھی۔ وہ تینوں بات پر کھلے جا رہے تھے۔ نسترن کہہ رہی تھی۔

"آج ہمارا اقبال آپ لوگوں کے ساتھ سیر کو جانے کا تھا۔"

"چشم ما روشن دل ما شاد، موٹر حاضر ہے۔" مرزا اپک کے بولا۔

"لیکن نرگس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، پھر بھی۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ پھر تو انھیں ضرور چلنا چاہیے۔ طبیعت بہل جائے گی۔ ہم انھیں دریا کے کنارے لے چلیں گے۔ رات کا کھانا لاہور میں کہیں نہ کھائیں۔ کیوں نرگس! آپ کا کیا خیال ہے؟" نواب مرزا بلا واسطہ اُس سے مخاطب ہوا۔

نرگس کے بدن میں، عجیب سا ہیجان پیدا ہو گیا۔ اُس کے بجائے نسترن نے جواب دیا۔

"آج نہیں پہلے آپ سے نرگس کا حجاب تو اُٹھ جائے۔"

"تو گویا ہمیں رونمائی یہاں حاضری دینی ہو گی؟"

"آپ کا گھر ہے جب چاہیں تشریف لائیے۔"

خاصی دیر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ رات کو نوبجے وہاں سے چلے۔ نسترن نے نرگس کو اُن کے جانے سے پہلے اُس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ میں کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ چاند میاں آگے چلا ہی گیا اور میں دیکھتا رہ گیا۔ میں ایک وقت میں یا تو نسترن کی فکر کر سکتا تھا۔ چاند میاں کی۔ میں نے سوچا کہ خیر جہاں سات سال گزرے ہیں، وہاں چند روز اور سہی۔ کم سے کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ بدمعاش کتنے میں موجود ہے اور اُس کو سیاہ کام چاند میاں سے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اُسے کوڑا کرکٹ معلوم نہ ہو کاش دعا لگا کر دیکھے کہ اُس کے ٹھنڈے کوڑا کرکٹ سل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ نرگس نے رات کا کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں ایک بار اندر گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپائے پڑی تھی اور نسترن اُس کو کر سہلاتے ہوئے اُسے سمجھا بجھا رہی تھی۔ میں نے بھی اُس رات کچھ نہیں کھایا دیے بھی میں محض زندگی برقرار رکھنے کے لیے چند لقموں سے صبح و شام پیٹ کا جہنم بھر لیتا تھا۔

اب مجھے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ چاند میاں اور نواب مرزا کی باتیں سننے کے بعد نرگس کا کیا حال ہو گا۔ کوئی اُس کا دل پہلے لیتا ہو گا۔ میں اپنی کوٹھری کے فرش پر بیٹھا ہوا آنے والے لمحوں کے خطرے بانٹ رہا تھا۔ اب نرگس کو یہ بتانا آسان تھا کہ نسترن اُس کے لیے کیا سوچ رہی ہے کیوں اس سے آگے خوبصورت راستے گم نظر آتے تھے۔ کوئی گرہیں تھا۔ کوئی سایہ تھا۔ کوئی وہی نکلتا تھا۔ وہی سڑکیں، وہی ویرانی اور وہشت تھی لیکن کوئی اور رہا ہو، ہی نہیں تھا۔ ابھی مجھے اپنے ذہن کے جالے صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ نہیں پتا

تھی کہ ملازم نے اطلاع دی بیگم صاحب طلب کر رہی ہیں۔ میں اُٹھ کے بجھے ہوئے پیمانوں میں کام کرنے باہر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر سے نسترن کی آواز آئی۔ "ادھر آجا۔"

میں کشمکش کے عالم میں اندر پہنچا۔ نسترن بستر پر تنہا پڑی ہوئی تھی۔ آہٹ پر بھی اُس نے کوئی جنبش نہیں کی۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔ "آج مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "تم یہیں بیٹھ جاؤ۔ تیرے ہاتھوں میں کرشمہ ہے اور تو نے بڑے بڑے حکیموں کے ہاں کیا کھایا پیا ہے۔"

میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ اُمڈنے لگا اور کانوں میں سائیں سائیں بجنے لگی۔ "جی؟" میں نے ایک اٹک کر کہا۔ "آج تو نرخرہ میرے ہاتھوں میں ہی دے دے۔"

"آج ہی تیرے ہاتھوں میں درد ہونا رہ گیا تھا کم بخت! میں انکار سننے کی عادی نہیں ہوں۔ چل! ہاتھ چلانے لگا تو تیرے ہاتھ بھی دب جائیں گے۔"

"جی بہت دُرست۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

اُس نے مجھے گھور کے دیکھا پھر اُس کے لبوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "آ۔ تیرا درد میں دُور کرتی ہوں۔"

"آپ؟" میری آواز میں لرزش تھی۔

"وہاں کھڑا کھڑا کیا لرز رہا ہے۔ جا دُور ہو۔ مُردار کہیں کا۔" وہ درشتی سے بولی۔ میں نظریں جھکائے یوں کھڑا رہا۔ اُس نے چیخ کر کہا۔ "جاتا ہے یا بھائیں دربان کو اور اُس سے کہوں کہ اس کُتے کو گھر سے نکال دے یہ تو مخرے کرتا ہے۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آپ ہی کے پاس رہوں گا۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "آپ جتنے دُرے کے نکال دیں گی، تو وہ واپس آجاؤں گا۔"

"بھاگتا ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔

اُس کے بعد نہیں تھا کہ وہ مجھے اسی وقت نکال باہر کرتی۔ میں آہستہ آہستہ اُس کی سمت کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر میں نے پائنتی مٹھیچے کے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہنے لگی۔ میرے ہاتھ تیز تیز حرکت کر رہے تھے۔ نسترن نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ "روشنی آنکھوں میں چُبھ رہی ہے اُٹھ کے بڑا بلب بجھا دے۔" میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ "اے تیرے ہاتھ تو جنگ جادو میں نہیں آتے۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔ "کہاں درد ہوا ہے تیرے؟"

مسئلہ ہاتھوں میں! یہ لفظ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلے۔ اُس نے میرے ہاتھ دبانے شروع کر دیے اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔ زور پڑنے کی وجہ سے اُس کے کاندھے کے جوڑ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ "کمر بھی ہو گئی ہے۔"

میں نے خشم سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ ایک لمحہ ایک صدی کے مانند گزرا۔ پھر غصے اور نفرت کی ملی جُلی کیفیت طاری تھی۔ میرا دل دو حصوں میں بٹا گیا تھا۔ ایک دل یہ کہتا تھا کہ پیروں کے بجائے اُس کی گردن دبا دوں اور وہ ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔ دوسرا دل کہتا تھا۔ چند دن اور گزار لے۔ میں نے اس سے پہلے کسی عورت کی آنکھ میں ایسی چمک نہیں دیکھی تھی۔ فرق یہاں جیلیاں کی نظر پڑتی تھی وہاں وہاں آگ سی لگنے لگتی تھی۔ "تو جو کچھ کہتا تھا وہ سچ خانہ خواہ مخواہ" آواز میں بولی۔ "تیری آزمائش پر پورا اُترا۔ تیسری نرگی بھی اسی طرح تیرے لیے اچھے اچھے کپڑے بنوائوں گی۔ بیٹھیں بنا دوں گی تجھے کہیں بھیجنا آسکیں پھیر لینا یہ نہ ہو کہ تو مجھے عورت سمجھ کے کہیں لیا نہ ہو جائے۔" اُس نے باتیں کرتے پر کمر باندھ لی تھی اور مجھ پر اپنی نوازشیں نچھاور کر رہی تھی۔ چند لمحے سکے لیے مجھے کچھ سکون ہوا۔

"اب میں یہاں آگیا ہوں تو کہیں اور کھیل جاؤں گا۔ اس کی جگہ کہاں ملے گی۔" میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔

"بس سمجھ لے۔" تو نے میرے تعلقات تو دیکھ ہی لیے۔ یہ گنج کا برے سے بڑا آدمی یہاں آتا ہے۔ تو نے اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تجھے حوالات تہہ خانوں سے بھی نکال لاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گئی۔ اُس نے کہا۔ "ذرا میرے بازو تو دبا۔" میں نے اس بار کسی چوں و چرا کے بغیر اُس کے بازوؤں پر ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ وہ کسمسائی اور آہیں بھرتی رہی۔ کبھی اس کروٹ ہوتی کبھی اُس کروٹ۔ اُس کا لباس بستر پہ بکھر گیا تھا۔ میں نظریں جھکائے رہا۔ پھر اچانک کسی نے حملے سے مردانے پر کھٹ کھٹ کی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اُس نے مجھے بستر پر کُتے کا حکم دیا اور کواڑ کا ذرا سا پٹ کھول کے باہر جھانکا۔ "کون؟ چاند میاں؟ ساتھ میں اور کون ہیں؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "اکیلے ہیں۔" نسترن نے مزید اور ملازم کو ہدایت کی کہ وہ چاند میاں کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

"جا آرام کر۔" اُس نے بے دلی کے ساتھ مجھ سے کہا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں کمرے سے نکل کے باورچی خانے میں گھس گیا۔ وہاں اپنا لباس درست کیا۔ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ مجھے اُن کی یہ گفتگو سننے کا موقع نہیں ملا پھر باورچی خانے کے دروازے کی اوٹ سے میں نے دیکھا کہ وہ چاند میاں کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی ہے۔ گویا معاملہ گمبھیر تھا۔ اتنی رات گئے چاند میاں کا آنا اور رات ہی کمرے میں بند ہو جانا بے علت نہیں تھا میرے ذہن میں ہزار اندیشے اُبال کھانے لگے جیسے ہی دالان کا دروازہ بند ہوا۔ میں نے باہر جا کے دیکھا۔ وہاں وہی ٹوٹی کھڑکی تھی جس میں سے ہم اُچھل کود کر نواب مرزا اور چاند میاں اُترے تھے۔ بلکہ بے وقت نرگس کے لیے آیا ہو؟ اندھیری رات ہے لیے میں اُسے ایک گھرے دوسرے گھر منتقل کرنے میں کیا دشواری ہو گی۔ بات میں بدن پر اکٹھی ہوئی ہو گی۔ نرگس کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ جلد از جلد اُس سے پیچھا چھڑانے کا اندازہ لگتی ہو گی اس لیے وہ رقم کے سودے پر بھی آمادہ ہو جائے گی۔ نواب مرزا کو کسی کل قرار نہیں آیا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اہل نظر نسترن کو لوٹ دیتا، اُس نے پہل فرصت میں چاند میاں کو نسترن کے گفت و شنید کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں نے ریشگی سے بچتے نرگس کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ پھر اندر سے نرگس کی نالاں آواز آئی میں نے سرگوشی میں اُسے اپنا نام بتانے کی کوشش کی لیکن اُس نے کہا میری آواز نہیں پہچانی چنانچہ مجھے دوبارہ باورچی خانے میں جانا پڑا۔ وہاں سے ایک لاٹی کا عنزر

کرنے سے اپنا نام لکھا اور وہ کاغذ جھاڑو کے تنکے کے ذریعے دروازے کے نیچے سے اُس کے کمرے کے اندر ڈال دیا۔ نرتیں نے فوراً دروازہ کھول دیا مگر وہ دشمن تھا مگر نرتیں کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئی تھیں۔ "خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔" اُس نے چیخنے کی کوشش کی۔

میں نے ایکدم اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تو پہلے ہی تھیں لے چلتا لیکن تم سے یہ بات کہا کس طرح؟ اب تو تم نے خود دیکھ لیا۔ سنو! چاند میاں پھر آیا ہے۔ جاگتی رہنا اور ہوشیار بھی رہنا۔ میں یہیں کہیں رہوں گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو فوراً مجھے آواز دے لینا۔"

"میں اب ایک لمحے بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔" اُس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"میں خود ایک لمحے بھی تمھیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا مگر باہر سچ مچ کے قدم نکالنا ہوگا۔ یہ رات غیریت سے گزر جائے تو بہتر ہے۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" اُس نے پوچھا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ کوراہی مجھ سے بار بار یہی سوال کرتی تھی۔

"دُنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں سے نکلیں تو سہی پھر دیکھا جائے گا کہ کہاں جانا ہے۔ تم بس حوصلہ قائم رکھنا۔ تم تو مسلسل رو رہی ہو۔"

"اور تم جو رو رہے ہو۔" اُس نے میرے آنسو دیکھ لیے تھے۔

"مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی تھی۔" میں نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اچھا اور وعدہ بند کرو۔"

اُس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر میں نے نہیں سنا کیونکہ نسترن اور چاند میاں کسی وقت بھی باہر آ سکتے تھے۔ میں باورچی خانے کی روشنی گل کر کے پھر مورچہ بندی کرنے لگا۔ میں نے احتیاطاً پیاز کاٹنے کا چاقو سنبھال لیا تھا اور لوہے کی سٹسی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کچھ دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے دروازے پر جھکے کان لگا دیے۔ اندر دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ اب میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کسی طرح یہ رات گزر جائے۔ صرف ایک رات کی مہلت اور مل جائے۔

میں چوکنا ہو کے بیٹھ گیا۔ جسم کی تمام طاقت کانوں میں سمٹ آئی۔ پھر چاند میاں بہت دیر بعد نسترن کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ دونوں خاموش تھے جب اُن کی چاپیں باورچی خانے کے قریب سنائی دیں تو میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔ چاقو اور سٹسی پر میرے ہاتھ تڑپنے لگے۔ وہ نرتیں کے کمرے سے آگے گزر گئے تھے۔ میں دم سادھے اندر بیٹھا رہا۔ گاڑی چلنے کی آواز آئی اور چند منٹ بعد نسترن نے نرتیں کے دروازے پر ٹہوکے مارنے شروع کر دیے۔ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ نسترن اپنی خواب گاہ میں چلی گئی مگر وہ باہر واپس نہیں آئی۔ میں صادی رات جاگتا رہا مگر نسترن نے چاند میاں کو ناشتا وغیرہ کروا کے واپس کر دیا تھا۔ اُسے اُمید ہو گی کہ کل نواب مرزا دریا ہو کے اپنی پیش کش میں اور اضافہ کرے گا۔ اُسے اس وحشت کی ستیاہی میں زمانہ گزر گیا تھا۔

مگر میں نرتیں کو کہاں لے جاؤں گا؟ میری جیب میں ایک پھوٹی بھی نہیں تھی۔ ایک نوجوان برقع پوش لڑکی کے ساتھ بڑھی ہوئی داڑھی اور کھل کھیلوں کپڑوں والے ایک نوجوان کو دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ اس لیے میں نے سوچا، بہتر ہے کہ اس بار پہلے سے سوچ لیا جائے۔ رات کو ڈاکے کے وقت کی طرح نرتیں کے موقع پر بھی دربدر مارے مارے پھرنا ہوگا۔ مجھے سوتیل کا گھر یاد آیا۔ سوتیل کے اڈے سے اُس بدقسمت گھر کے گزارے کے لیے ماہانہ رقم اب بھی پہنچتی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ میں نرتیں کو اپنی بہن بنا کے چند دنوں کے لیے وہاں ٹھہرا سکتا ہوں مگر میں نے اُن کا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ معلوم کیسا ماحول ہو۔ اور مگر کیسے لوگ رہتے ہوں۔ ہندوؤں کے محلے میں ایک برقع پوش لڑکی کا ٹھہرنا سوتیل کے گھر والوں کے لیے مصائب میں اضافے کا سبب بن جائے گا۔ سوتیل کے علاوہ میں اُس گھر کے کسی فرد سے واقف نہیں تھا۔ اُن کے سامنے خود کو شناخت کرانا بھی مشکل ہو گا کہ میں سوتیل کا بہی دوست ہوں جس کی ایما پر اُنھیں ہر ماہ ایک مقررہ رقم منتقل ہوتی ہے اور اب میں اُس رقم کا معمول وصول کرنے آیا ہوں۔ پھر ایک ہی گھر وہ جا رہا تھا۔ بھتیل کا اڈا۔ نرتیں جیسی نازک اندام لڑکی کو کوٹھے کے خطرناک بدمعاش کے اڈے پر لے جاؤں؟ میں نے جیل میں اُس ماحول کے قصے سنے تھے خود اپنی آنکھوں سے وہ جگہ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سوچنے اور منصوبے بنانے کا وقت بھی نکل گیا تھا۔ نواب مرزا نرتیں کے حسن و جمال کا نظارہ کر چکا تھا۔ اُس کی بے تابیاں شباب پر ہوں گی۔ اب مجھے ہر طرح جلد از جلد یہاں سے جانا تھا۔ چاہے بعد میں کچھ بھی واقعات پیش آئیں۔ میری جیب میں مالا کی چھوٹی سی پرلی پڑی تھی۔ میں نے اُسے کھول کے دیکھا اور آنکھوں سے لگا لیا۔ اس قیمتی مالا کا صرف ایک دانہ ازمیری بہت سی مشکلیں حل کر سکتا تھا مگر وہ اکی ایک ہی یادگار تو رہ گئی تھی۔ اس یادگار کی میں نے کہاں کہاں حفاظت کی تھی۔ جیسے دیکھیے سب سے پہلے اس کی نظر اسی پر پڑتی تھی یقیناً اس کے موتیوں میں کوئی خاص بات ضرور ہوگی۔ اسی لیے بدھ گیا میں اس مصنوعی راہب نے مجھے شناخت کر لیا تھا ورنہ ایسی مالائیں تو ہزاروں گھروں میں پڑی ہوں گی۔ کوراکا خیال آیا تو میں بہتا جلا گیا۔ میرا چہرہ بھیگ گیا۔ اماں یاد آئیں، ابا یاد آئے اور بہنوں کی شکلیں۔ باورچی خانے کی دھندلی دیواروں پر اُبھر آئیں۔

نہ معلوم اُن کے مرنے کے بعد کبھی نصیب بھی ہو یا نہیں۔ اتی کی موت کے بعد ابا جان کے چڑچڑے پن سے وہ کتنی پریشان ہوں گی۔ مجھے یاد کر کے آنسو بہاتی ہوں گی۔ بے چاریوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں گا۔ ہاں میں مر ہی گیا تھا۔ میں اُن کا بھائی ہوتا تو اُن کے پاس ہوتا۔ اس وقت وہ کہاں ہوں گی؟ کیا کر رہی ہوں گی؟ کیسا مکان ہوگا؟ مجھے حالے کیسے ہوں گے؟ مجھے لڑے بڑے ہو گئے ہوں گے۔ کاش ابا جان کا سایہ اُن کے سروں پر سلامت رہتے مگر یہ ابا جان کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں گیا میں بیٹھے ہوئے خون آنے لگا ہو۔ اُن کے پاس کوئی خزانہ محفوظ تھا۔ جالنگ قبیلے کے حق مخلص کو میں نیت نابود کر آیا تھا۔ اُس کو کہا تھا کہ وہ ایک انمول خزانہ ہے۔ ممکن ہے ابا جان نے وہی خزانہ بھنانے لگانے کے لیے گیا کی سکونت ترک کر دینا مناسب سمجھا ہو اور پھر وہ کاغذات وہ بھتیل کا کاغذات جن کی جالنگ قبیلے کے لوگوں کو ضرورت تھی۔ ابا جان نے ضرور اُن کاغذات کا مطالعہ کیا ہوگا اور اُن کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے بدھ راہب جھوٹ بول رہا ہو اور اُن کاغذات میں کوئی غیر معمولی رمز

پوشیدہ ہو۔ جالنگ قبیلے کے لیے مہاتما بدھ کی وصیت یا کوئی راستہ یا کچھ اور۔ تبھی تو وہ اتنا پریشان تھا۔ متبرک کاغذات کی گم شدگی پر اُس کا یہ اضطراب ناقابلِ فہم تھا۔ خود میرے لیے جس نے اعلا تعلیم حاصل کی تھی، اُس کی یہ بات جیرکول کو نہیں لگی۔ اُن کاغذات میں ضرور کوئی اہم نکتہ درج ہوگا۔ ابا جان نے اُس نکتے کی جستجو کی ہوگی تو اُن کی تشویش بڑھ گئی ہوگی۔ گیا میں اپنے سابق مکان کے قریب جو نیک آدمی مجھے ملا تھا، اُس کا بیان تھا کہ ابا جان کمرہ بند کر کے بیٹھے جلتے تھے اور کسی کو گھر میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے وہ جالنگ کاغذات کا مطالعہ کرتے ہوں اور انھیں ڈیکوڈ کر لیا ہو۔ کسی پر راز کھل نہ جائے اور جب اُن کی تحقیق و جستجو میں رکاوٹ پڑی ہو تو انھوں نے گیا سے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ کون اپنا آبائی مکان، زمین اور جائداد چھوڑ کے اس طرح روپوش ہو سکتا ہے کہ کسی ہمسائے کو بھی خبر نہ ہو۔ چپ چپاتے مکان بیچ دیا۔ کسی سے کہا نہ سُنا۔ کسی پر اعتماد کرتے۔ کسی مُعمر معمول واقعے کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پھر ضرور میں کوئی بے حد اہم بات ہو گی۔ ذہن کسی حل پر نہیں پہنچا تھا۔ اتنی قیاس آرائیوں اور خیال آفرینیوں میں صبح ہو گئی اور مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں کہاں اور کس گھر میں ہوں۔ میں تو نرتیں کی چوکیداری کر رہا تھا۔ اس غفلت پر مجھے جرم کا احساس ہونے لگا۔

ناشتے کی میز پر نسترن کا چہرہ فکر میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ جیسے رات اُس نے مجھے قریب بلا کے کوئی بات ہی نہ کی ہو۔ البتہ نرتیں موقع پا کے آنکھوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کم سے کم رات تک تو اُن میں سے کوئی مجھ سے نہیں اُلجھے گا۔ نسترن اُس سے کہہ رہی تھی کہ آج نواب مرزا شاید دو چار دنوں کے لیے مقیم نہ ہو جائیں۔ تبھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ اُس نے مجھے اچٹتی نظر دیکھا۔ میرے بے اجازت اندر پہنچنے سے اُس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آئیں۔ میں ایک دم اُس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ پھر سرگوشی کے ساتھ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سہم کا بکرہ گئی۔ "اے! پری طرح بے اُفت میں لینے کے لیے مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔" "تم کون؟" میری دبی دبی آواز ابھری۔ "کسی تاخیر کے بغیر دروازہ بند کرو اور تیار ہو جاؤ۔" میرا لہجہ یکسر تھا۔ نرتیں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ "دیر مت کرو، وقت نہیں ہے۔" اُس کے تسلی پر مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ "نسترن میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بار بار ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ پھر جب اُس نے شور مچانے کا ارادہ کیا تو میں نے باورچی خانے سے اٹھایا ہوا چاقو نکال لیا اور اپنے دونوں کی تمام نفرت سمیٹ کے اُس سے کہا۔ "نسترن خانم! میں نرتیں کو لے کے جا رہا ہوں۔ پہلی بار تو میں چوٹ کھا گیا تھا مگر اب دوسری بار ایسا نہیں ہوگا۔ میں اس شریف اور معصوم لڑکی کو تم سے بہت دُور لے جاؤں گا۔ پیچھے آنے کی کوشش نہ کرو۔ اس وقت تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ چاند میاں کہاں رہتا ہے؟"

"تم کون ہو؟" دہشت سے اُس کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔

"یہ میں تمھیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے چاند میاں کا پتہ چاہیے۔"

"وہ کیلا باگان میں رہتا ہے۔" نسترن لرزتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نرتیں کو اُس کے پاس لے کے جا رہے ہو؟"

"تم نے کیا سب کو اپنے جیسا سمجھ لیا ہے۔ اس دنیا میں سبھی تم جیسے کمین نہیں رہتے نسترن خانم! وقت کم ہے۔ تم فوراً اس کرسی پر سیدھی طرح بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُسے دھکے دے کے اُٹھایا اور نرتیں سے چادر مانگی۔ نسترن تڑپنے لگی تھی اس لیے مجھے اُس کے منہ پر مکے اور جھانپڑ لگانے پڑے۔ وہ ہوشیار عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ اس وقت کرنا بھلا کا ہے سے نرتیں نے اسے کرسی سے باندھنے میں میری مدد کی۔ نسترن کو چادر اُن طرف سے اوڑھ کے میں نے نرتیں سے پوچھا۔ "تمھارے پاس کچھ نقدی ہے؟"

"نہیں، وہ تو سب میں نے انھیں دے دی تھی۔" نرتیں نے معصومیت سے کہا۔

میں نے نسترن سے کہا۔ "تمھارے روپے کہاں کے ہیں؟ میں صرف

وہ روپے مانگ رہا ہوں جو زریں نے نہیں دیے تھے۔ وہ پانچ ہزار روپے نہیں جو نواب مرزا نے زریں کی رونمائی کے لیے دیے تھے۔"

نسترن نے آنکھوں کی پتلیوں سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے تیزی سے سنگھار میز کی دراز کھولی۔ دراز میں اس کا چھوٹا سا بٹوا موجود تھا۔ بٹوے میں چابی رکھی تھی۔ چابی سے میں نے الماری کھولی۔ الماری میں بہت قلیل رقم تھی۔ وہ میں نے گنے بغیر جیب میں ڈال لی اور زریں کو ہدایت کی کہ وہ دروازہ بند کرلے اور میرا انتظار کرے اور جب تک اُسے تصدیق نہ ہو جائے کہ خود میں آیا ہوں، اُس وقت تک دروازہ نہ کھولے۔

باہر آکے میں نے عمر رسیدہ دربان سے کہا کہ بیگم صاحب کو ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ وہ کندھے اچکا کر گیٹ روانہ ہوگیا۔ میں بھاگا ہوا اندر آیا۔ میری آواز سن کے زریں نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے سے نکلتے وقت میں نے آیا کی نقل و حرکت دیکھ لی تھی۔ اُس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زریں نے برقع پہن لیا تھا۔ وہ بالکل تیار تھی اور اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے منع کر دیا اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا۔ میں چلتے چلتے ایک دفعہ نسترن کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا مگر اُس کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم نے اُسے ایسا کس کے باندھا تھا کہ وہ جنبش بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اُس سے میرا تعارف ہونا رہ گیا تھا۔ تعارف کے لیے اگر میں رُک جاتا تو ذرا سی دیر میں معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میرے سینے میں گھٹن سی ہوئی جیسے کوا مجھ سے شکایت کر رہی ہو کہ باہر تم نے اسے اتنی آسانی سے معاف کر دیا؟

بہرحال میں نے نسترن سے کہا۔ "نسترن خانم، ہم چاہے ہیں، تم نے زریں کے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔ اگر میں یہاں نہ بھی ہوتا اور تم نواب مرزا جیسے کسی شخص کے ہاتھ اسے فروخت کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتیں تو زریں اپنی عصمت بچانے کے لیے چوڑیاں پیس کر بھانک لیتی۔ یہ اسی کردار کی لڑکی ہے۔ ایک بار پہلے بھی تم نے ایک اور لڑکی کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ یاد ہے آج سے سات سال پہلے؟"

اُس کی پتلیاں جیت سے پھیل گئیں۔ میں نے زریں کا ہاتھ تھاما۔ اُس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ "چلو زریں!" میں نسترن پر قہر کی ایک نظر ڈالتا ہوا دروازہ بند کر کے باہر آگیا۔ زریں میرے پیچھے پیچھے تھی۔ ہم ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ زریں کو بوڑھی آیا کی نگاہ سے اوجھل کرنے کے لیے میں ٹھیر گیا اور زریں کو تنہا آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ احتیاط سے نکل گئی۔ میں بھی چلا۔ اس طرح ہم گیٹ تک پہنچ گئے۔ دربان اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب تک دربان ٹیکسی لے کے واپس آئے گا، اُس وقت تک ہم اُس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کے ارد گرد کی گلیوں میں گم ہو جائیں گے مگر اس اقدام میں ایک خطرہ تھا۔ وہ یہ کہ ٹیکسی آنے کے بعد دربان اندر اطلاع دینے جائے گا۔ ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ہوگی اور نسترن کو آزاد ذہن میں یہ نہیں لگے گی۔ وہ فوراً منتظر ٹیکسی میں بیٹھ کے ہمارا تعاقب شروع کر دے گی۔ اگر ہمیں کوئی سواری ملے تو یہ ہو گئی تو وہ آسانی سے ہمارے سر پر پہنچ جائے گی۔ میں نے گیٹ سے باہر گلی میں جھانک کے دیکھا۔ دربان ٹیکسی لے کے آرہا تھا۔ گویا میں چند منٹ اور ٹھیر جاتا تو دربان اندر اطلاع دینے پہنچ جاتا یا ہمیں باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیتا۔ میں نے زریں کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور خود گیٹ سے باہر آگیا۔ زریں گیٹ کے اندر کھڑی رہی۔ دربان مجھے منتظر دیکھ کے بولا۔ "جاؤ نقیرے! بیگم صاحب کو خبر کر دو۔"

میں نے جواب دیا۔ "وہ تیار ہیں۔ یہ سنتے ہی زریں باہر نکل آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "بیگم صاحب کدھر ہیں؟"

"آرہی ہیں، آتے آتے انھیں کچھ یاد آگیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے زریں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ہم نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر میں نے دربان سے کہا۔ "بابا! ذرا دیکھو بیگم صاحب کہاں رُک گئی ہیں؟" پھر وہ جیسے ہی اندر گیا، میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔ وہ سُنی اَن سُنی کر گیا۔ میں نے دوبارہ کہا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے کیا۔ اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ مست ہو کر اُس نے ایک نعرہ لگایا اور پوچھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"چلتے رہو۔" میں نے ادھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے دہشت سے کہا۔ اُس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اگلا موڑ مڑتے ہی مجھے نواب مرزا کی کار نظر آئی۔ میں نے زریں کو چپکے سے اشارہ کیا۔ چاندنیاں اور نواب مرزا پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوری طرح دن نکل آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ بہرحال وہ رُکے ہوئے تھے اور ہماری ٹیکسی لگتے کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح پھر رہی تھی۔ ڈرائیور بار بار نشست سے اچھلتا تھا جیسے اُسے ایڑ لگا رہا ہو۔ وہ نعرے بھی لگا رہا تھا۔ جیسے ٹیکسی کو چابک رسید کر رہا ہو یا گالی دے رہا ہو۔ کدھر جاؤں؟ کہاں ٹھیروں؟ کس کے دروازے پر دستک دوں؟ میرا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ نسترن کے بنگلے پر نواب مرزا کی گاڑی بروقت پہنچ گئی تھی۔ اس لیے یہ اندیشہ اب بھی تھا کہ نواب مرزا کی گاڑی ہمارے تعاقب کے لیے فوراً حرکت میں آجائے گی۔ اگر ایسا ہوا اور انھوں نے راستہ کاٹ کے کسی جگہ ہمیں روک لیا تو کیا ہوگا؟ "ہم کہاں جائیں؟" زریں نے اس طرح سرگوشی میں مجھ سے پوچھا کہ ڈرائیور اُس کی آواز نہ سن سکے۔

"تمھیں وہاں سے آنے پر کوئی دکھ تو نہیں ہو رہا ہے؟" اُسے جواب دینے کے بجائے میں نے اُس سے ایک عجیب سوال کیا۔

اُس سے جواب نہ بن پڑا۔ وہ جز بز ہو کے رہ گئی۔ میں برقع میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ کچھ توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔ "اب میں تمھارے ساتھ آگئی ہوں نا۔"

میرے جسم میں بجلی کا ایک جھٹکا سا لگا۔ کاش اس بار واقعات مختلف انداز سے پیش آئیں۔ ٹیکسی بے منزل بھاگتی رہی، بھاگتی رہی۔

ڈرائیور نے کئی بار پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ میری خاموشی سے تنگ آگیا تھا اور منزل کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا اور میری سمجھ میں کوئی منزل نہیں آرہی تھی۔ جدھر نظر اٹھاتا تھا، وہاں دروازوں پر بھوت کھڑے ہوئے ملتے تھے۔ آخر ڈرائیور نے ایک جگہ ٹیکسی روک دی اور تلخی سے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

میں نے سر اٹھا کے اُسے دیکھا اور تذبذب سے کہا۔ "سیالدے۔"

"سیالدے؟" اُس نے دہرایا۔ "ایسا بولو نا۔"

گاڑی نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اس مرتبہ اُسے کچھ قرار آ گیا تھا۔ رفتار متوازن اور سبک تھی لیکن میری بے قراری بڑھ گئی تھی اور میرے ذہن کی گاڑی کی رفتار اتنی ہی منتشر اور تیز ہوگئی تھی۔ دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے گاڑی روکی۔

"سیالدے میں کدھر جانا ہے؟"

"استاد بھل کے ہاں!"

"استاد بھل!" میرے لہجے کی سردی اُسے لگ گئی تھی۔ اُس نے مجھے انتہائی حیران نظروں سے دیکھا۔ "تم بھل کے ہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے گردن ہلا کے کہا۔

وہ سٹ پٹا گیا۔ "کیا تم اُس کا اڈا جانتے ہو؟"

"نہیں۔ تم وہاں کسی جگہ بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"ہم اُس علاقے میں نہیں جاتا۔ وہاں کی سواری ہوتی ہے تو منع کر دیتا ہے۔" وہ کچھ تنک کے بولا۔

"یہیں و ہیں چھوڑ دو۔" میری آواز میں حکم تھا۔

وہ کچھ جھجکا، پھر ایک تنگ لمبی گلی میں مڑ گیا۔ ایک ہوٹل کے قریب گاڑی روک کے اُس نے پان والے سے کچھ پوچھا۔ میں نے دیکھا کہ پان والا اُسے پتہ سمجھا رہا ہے۔ اُس گلی میں بہت سے ہوٹل تھے اور ہر قسم کی دُکانیں تھیں۔ گاڑی ایک بڑی سی پیلی عمارت کے سامنے جا کے ٹھیر گئی۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر اڈا کے کسی راہ گیر سے پتہ پوچھا۔ اُس نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ "سنو!" میں نے مرتعش آواز میں ڈرائیور سے کہا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی۔ "اُدھر جا کے کہو استاد بھل کا ایک مہمان آیا ہے۔ اُسے اِدھر بھیج دو۔"

"ماہا با!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود اُدھر چلو اور جا کے بات کرو۔"

"جاؤ۔" میں نے زور دے کے کہا۔ "جاؤ۔"

وہ اُلجھتا، بڑبڑاتا، کسمساتا ہوا بائیں جانب کی عمارت میں گھس گیا۔ یہ عمارت بناوٹ میں دوسری عمارتوں سے مختلف تھی۔ حویلی نما تھی۔ دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ باہر لوہے کا ایک گیٹ تھا۔ ڈرائیور جھجکتا ہوا جیسے ہی گیٹ تک پہنچا، گھٹے ہوئے جسم کا ایک شخص اُس کے سامنے آگیا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کر کے اُسے کچھ بتایا۔ اُس نے مجھے خشونت اور حقارت سے دیکھا اور سینہ پھلا ہوا آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا۔ "کس سے ملنا ہے؟" سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا مگر اُس کی نظریں زریں پر لگی ہوئی تھیں۔

"استاد بھل سے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کون ہو تم؟"

"بس تم استاد کو بتا دو کہ اُس کا ایک مہمان آیا ہے۔"

"نام بتاؤ۔" اُس نے سختی سے کہا۔

"تمھیں جو کہنا ہے، وہی کرو۔"

اُس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ "استاد مصروف ہے۔"

میں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جاؤں۔ کیوں کہ ان لوگوں کے تو تیور ہی عجیب ہیں اور پتہ نہیں اس سرحدی بھل کے رویے میں کتنی تبدیلی آگئی ہو۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد میرے یہاں آنے پر وہ سخت ناراض ہوگا۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کے اگلے حصے پر کھڑا تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر آیا اور میں نے اُس سے کہا۔ "جاؤ۔" اُس سے کہو لاڈلا آیا ہے۔"

"لاڈلا؟" اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں لاڈلا۔"

اُس نے ایک آن میں کئی سیلوٹ مارے۔ اُس کی ٹانگیں پھڑپھڑانے لگیں۔ جیسے اُس کی آنکھوں سے ٹپکا پڑ گیا ہو۔ اُس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر سرپٹ بھاگا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ اُس کی ٹھوکر سے گرتے گرتے بچا۔

میں اپنی زندگی کا سب سے ہول ناک انتظار کر رہا تھا۔ میری نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کے طویل عرصے بعد بلند آواز سے دروازہ کھلا اور اندر سے بھل برآمد ہوا۔ ایک لمحے وہ ٹھٹک کے اُس نے متجسس نگاہ سے مجھے دیکھا اور دہشت میں پلک کے آیا۔ پھر وہ بے تحاشا میرے سینے سے لپٹ گیا۔ "لاڈلے! لاڈلے!" اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔ "میری جان! تو نے اپنے بھل کو بھی خبر نہیں کی؟ کہاں چھپ گیا تھا؟"

گلی میں بھیڑ لگ گئی۔

بھل کو یہ فکر نہیں تھی کہ گلی میں ہمارے اردگرد جمگھٹا لگ گیا ہے۔ وہ مجھے دلاسا دیتا ہوا میرے گلے سے لپٹا تھا اور میرے بازو ماتھا اور گال بے تحاشا چوم رہا تھا۔ اُس نے بڑھ چڑھ کے دونوں ہاتھوں میں بھر کے والہانہ انداز سے کہا۔ "میرا چاند آگیا۔ آہ! مجھے کیا معلوم ان مُلّاؤں سے پوچھ میں تیرے لیے کتنا فکرمند تھا۔ یہ نطفہ حرام کہتے تھے، استاد ولاد لاڈلے مرتوت مل گیا۔ کانوں نے اُسے بگاڑ دیا۔ اب دیکھ کہ تیرے پاس آئے گا، میں کتنا

تھا" دیکھ لینا" وہ ایک دن ضرور آئے گا میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ اٹھلے جانی اتو نے میری لاج رکھ لی" وہ سانس لیے بغیر کہتا گیا۔

گلی کا وہ حصہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ وہ سب حیرت زدہ تھے' جو لوگ پیچھے کی جانب تھے وہ اچک اچک کے یہ منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جمّل نے ایک ذرا سا اس لی تو میں نے نرم مسہاری سے اسے مخاطب کیا۔ "جمّل بھائی! میرے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" میں نے کوشش کی تھی کہ یہ بات اس کے سوا کوئی نہ سن سکے۔

"کہاں ہے؟" اس نے بے تابی سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا، پھر اس کی نگاہ خود ہی ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی پُرتقیم پوش زرّیں پر ٹھیر گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تبسم کے آثار ہویدا ہوئے لیکن اگلے لمحے اس نے زور سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو للکارا۔ "لے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے' میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو' ہوا خالی گیڑوا اپنی بہن کو عزت سے گھر پہنچاؤ۔"

ٹیکسی ہر طرف سے لوگوں نے گھیر لی اور چاروں دروازے کھول دیے جیسے زرّیں چاروں دروازوں سے ایک ساتھ برآمد ہوگی۔ انھوں نے تماش بینوں کو دُور ہٹنے کے لیے ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ سیاہ برقع میں ملبوس وہ سرو قد لڑکی ٹیکسی سے اُتری تو سب کی نگاہیں اس پر جم گئیں' اس کے سرخ و سفید مرمریں رنگت ہاتھ عریاں تھے اور جھل مل کر رہے تھے۔ تماش بینوں کے دیدے پھٹے ہوئے تھے۔ جمّل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس نے قہر آلود نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھا رسّے گھما کے نظریں نیچی کر لیں۔ "چلیے یہاں سے۔" وہ بُری طرح دہاڑنے لگا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "لاڈلے اچل۔ اپنے گھر چل۔ آداب میں تجھے خوب ہی جھر کے دیکھوں گا۔ آنکھیں ترس گئی تھیں۔"

زرّیں جمّل کے آدمیوں کی جلو میں مکان کے اندر چلی گئی تھی۔ جمّل کر قرار نہیں تھا، وہ کبھی میری گردن میں ہاتھ ڈالے مجھے دلو پتا تھا کبھی پیار کرتا تھا، جب ہم دروازے میں داخل ہوئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں اُسے سلام کیا۔ جمّل کو اُس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جمّل نے مجھے دھکا دے دیا اور اپنی جیبیں اُلٹ کر جتنے روپے برآمد ہوئے سب ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر دھر دیے۔ ڈرائیور نے خوف و دہشت میں کئی سلام کیے۔ ابھی جمّل چند قدم ہی اندر گیا ہو گا کہ کسی نے باہر سے ہانک لگائی۔ "استاد! یوں اندر نہ جاؤ۔ اب مٹھائی کا انتظام بھی کرو۔"

"ابے مٹھائی۔" جمّل پلٹ کے تڑپا۔ گیٹ پر ایک بوڑھا شخص سسکیاں بھر رہا تھا۔ "او سیاداد! تو نے خوب یاد دلایا۔ اُس راون کی اولاد بھنتے سے جا کے کہہ دے دکان میں جتنی مٹھائی ہو جھٹ پٹ اڈے پر پہنچا دے۔"

"استاد خال خول مٹھائی؟" لوہے کے آدمی کے برابر کھڑے ہوئے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ "سادی مٹھائی کیا مزہ دے گی۔"

"تو تاڑیا بھی لے آ جو سے جا کے کہہ دے آج اڈے پر

گانا ہو گا اور سُن۔ امیر سے جا کے کہنا' پانچ بکرے کٹ دے۔ منّے سے سب کہہ دیجو آج رات سب جمّل کے مہمان ہیں امیر سے کہہ دینا اگر گھی خراب ہوا تو اس کی انتڑیاں نکال لوں گا۔" وہ دروازے پر یہ احکام صادر کرتا رہا اور لوگ اُس سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہے وہ سُنتا رہا اور لوٹ کے حکم دیتا رہا۔ ایک آدمی نے یہ دیکھ کے گیٹ بند کر دیا، باہر شور مچنے لگا۔ جمّل نے گرج کے ایک موٹی سی گالی دی۔ گالی کی آواز باہر پہنچنے کی دیر تھی سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر جمّل کو مجھ پر توجہ دینے کی مہلت ملی۔ "تو نے داڑھی بھی نہیں بنائی اور کپڑے کیسے گندے پہن رکھے ہیں۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "رنگ بھی کیسا میلا کر لیا ہے۔ یہ تو کہاں اُلٹن چھو ہو گیا تھا لاڈلے میاں؟" جمّل نے میری ٹھوڑی پکڑ کے اشتیاق سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "تو نے جمّل کا کڑا امتحان لیا ہے میرے اوستاد۔"

اس حویلی نما عمارت کے اندر کا نقشہ باہر سے مختلف تھا، معلوم ہوتا تھا جیسے اسے ہاتھا دو منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا ہے' اندر بھول بھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ چند کمروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک لمبے کمرے میں آ گئے جہاں ایک دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جمّل نے دری بچھا کے فرش کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بے کار سے ایک پیتا تھا' اُسے گھماتے ہی کمرے کے مشرقی حصّے کی دیوار کھسکنے لگی اور پھر ایک روشن کمرہ نظر آیا۔ جمّل مجھے وہیں لے گیا اور دیوار برابر کر دی۔ اس کمرے میں مختلف دروازے تھے۔ سفید چاندنی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کا ایک دروازہ کھول کے جمّل مجھے لیے لیے دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ یہاں سہ ہری بھی ہوئی تھی اور دیواروں پر بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ راستے بھر کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ عمارت کے اس پُراسرار ماحول سے مجھ پر ہیبت سی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے میرے کاندھوں پر زور دے کے مجھے سہ ہری پر بٹھا دیا اور تالی بجائی۔ "کہاں سرگے کم بخت؟ اسے تمھیں خبر نہیں ہوئی۔" وہ چیخا۔ "ہاتھا۔" لاڈلے آ گیا ہے۔"

اُس کی چیخ پکار پر کئی آدمی بھاگ کے اندر آئے۔ اُن میں لالہ بھی تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھڑکنے لگا اور سہ ہری سے اُٹھا کے ناچنے لگا۔ اس پر توجہ نہ دینے پر پڑے۔ اُن میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جو جیل میں میرے ساتھ رہے تھے اور پھولی ہوئی سزائیں کاٹ کے رخصت ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں میرے سامنے انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کا انبار لگا دیا گیا۔ اس عالم میں مجھ سے کچھ کھایا پیا نہیں گیا۔ وہ سب مجھ سے ایک سوال بار بار کرتے تھے کہ میں جیل سے رہا ہونے کے بعد سیدھا اُنتاو جمّل کے پاس کیوں نہیں آیا؟ وہ بار بار جمّل کی بے تابی کا ذکر کر رہے تھے، رسّے نے آ کے بتا دیا تھا کہ میں اُسے ہاؤڑا اسٹیشن پر ملا تھا۔ جمّل نے استعمال میں اُسے اتنا مارا تھا کہ وہ کئی دن باہر نکلنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے بڑھ چڑھ کے ساری روداد سنا رہے تھے اور جمّل خاموشی سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا پھر اچانک غصّے میں اُٹھ گیا۔ "ابے! کیا یہیں بیٹھے رہو گے؟ کچھ انتظام و نتظام نہیں کرنا؟ منّے کے لوگ کیا کہیں گے کہ لاڈلے کے آنے کے بعد جمّل اپنے وعدوں سے پھر گیا۔ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو صورکے بچو! اُٹھو اُٹھو۔" وہ تلخی سے بولا۔ "منّے والوں سے کہہ دو کہ آج رات کسی کے گھر کھانا نہیں پکے گا۔ سب جمّل کے مہمان ہیں۔" جمّل کی گرج پر وہ ہڑبڑا کے اُٹھے۔ "الا چلتے چلتے ناک پر لگی رکھ کے منّے اور چمکنے لگا۔ جمّل نے اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ کمرے میں جمّل اور میں تنہا رہ گئے چند لمحے ایک تعین ناک سکوت طاری رہا۔ "کیا بات ہے تو کچھ پریشان ہے؟" جمّل نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جھوٹ۔" وہ میرے بال پکڑ کے بولا۔ "خیر تو ہے؟"

"ہاں سب خیر ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

وہ حقّہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے رک گیا۔ "خیر نہیں ہے لاڈلے!" اُس نے میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "بتا، کیا معاملہ ہے، کس نے تجھ پر نگاہ ٹیڑھی کی میں اُس کی آنکھیں نکال لوں گا۔"

"کسی نے نہیں۔ وقت اور زمانے کی آنکھیں نکال سکتے ہو تو نکال لو۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"ہاں' یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے لاڈلے۔" وہ افسردگی سے بولا "لیکن وقت اور زمانہ کچھ نہیں کہتے' انھیں لوگ کسی کے خلاف بھڑکا دیتے ہیں میں انھی لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"چھوڑو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ہاں کی سناؤ' سب لوگ خیریت سے ہیں؟ شمّی' نصیب میاں' کانتے' یہ سب کیسے ہیں؟"

"یہ تو سب حرام کی کھا رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں' تو اپنی بتا، بات کیوں ٹلتا ہے۔ مجھ سے چھپا رہا ہے جانِ من؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "پھر کچھ سوچ کے کھلکھلایا۔ "میں تو بھول ہی گیا۔ تیرے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟"

"ایک لڑکی ہے بس۔ ستم رسیدہ' آفت زدہ۔"

"صاف صاف بات کر۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں سمجھتا تھا کہ وہ اس اطلاع پر مشتعل ہو جائے گا مگر اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا البتہ وہ کچھ سوچنے ضرور لگا۔ "تو کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟" اُس نے بے نیازی سے پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں ہے لیکن ....." میں کہتے کہتے جھجکنے لگا۔

"لیکن کیا؟" وہ برہمی سے بولا۔ "لاڈلے اچل کے بات کر۔"

"بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت مت پوچھو۔"

"تیری مرضی تو تحکّا ہوا معلوم ہوتا ہے' اچھا ہر اندیشہ ذہن سے نکال کے کچھ دیر آرام کر لے تو آ کے جمّل کے ہاں ہے۔ اس سے زیادہ محفوظ جگہ جیل بھی نہیں ہے اور یہ اپنا حلیہ تو ٹھیک کر۔ جمّل کے یار آئیں گے تو کیا کہیں گے۔ سالہا لاڈلے! احرام کے جنے!" وہ چیخ کر بولا۔ "بلا جمّام کو اور لاڈلے کے لیے سفید کپڑے لا۔"

جمّل کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ جمّام نے آ کے میری داڑھی مونچھیں صاف کر دیں۔ غسل کے لیے گرم پانی تیار کیا گیا۔ ایک سفید کرتا اور پاجامہ فراہم کیا گیا۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو جمّل اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میری صورت نکارہ گیا۔ اُس نے آوازیں دے دے کے اپنے لوگوں کو بلایا اور مستانہ انداز میں کہنے لگا۔ "لو یکھو لاڈلے کا حسن دیکھو۔ یہ ہے لاڈلا۔ دیکھو قسم سے کیسا چمک کے آیا ہے لیے۔ کیا گھبرو گھبرو کے دیکھے ہیں۔ نظر لگ جائے گی سالو! ہے کوئی کلکتہ شہر میں ایسا جوان؟ اگر کوئی ہو تو اُسے ڈھونڈ کے میرے سامنے لاؤ' میں اُسے گولی مار دوں گا۔"

اس اثنا میں نصیب میاں بھی آ گیا تھا۔ اُن کے بالوں میں سفیدی گھی ہوئی تھی۔ وہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے بالکل نواب لگتا تھا۔ وہ آتے ہی میری بلائیں لینے لگا۔ "سبحان اللہ' استاد! سبحان اللہ' آہا! چشم بد دُور پہچانا نہیں جاتا۔ ستم ڈھا رہا ہے۔ رخسار پر لالہ نشان لگا دو اُستاد! ہم پر بھی جوانی آئی تھی پر ایسی ٹرٹ کے تیتیں نائی تھی۔"

اپنے بارے میں اُن کے تبصرے سن کے مجھے جھینپ آنے لگی اور برا دل چاہا کہ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھوں اور یہ بھی جی چاہا کہ زرّیں کے پاس جاؤں۔ اب تک مجھے اُس کی کوئی خبر نہیں تھی کہ اسے انھوں نے کہاں ٹھیرایا ہے۔ یہاں عورت کا نام و نشان نہیں تھا، وہ اکیلے میں گھبرا گئی ہو گی۔ نہ جانے اس پُراسرار جگہ کے وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ میں اُن سب کی موجودگی میں زرّیں کے پاس جانے کے ارادے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ خبر نہیں تھی وہ آتا جاتا تھا۔ جمّل موقع کے بارے میں گیا تھا۔ جہاں جامنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پھر کانتے آیا، سائے آیا، شمّی آیا، ہر چرن آیا، تجا آیا۔ بہت میل جلاپ ہوا اور نواس آئے اور مجھ سے مل گئے۔ رسّے جمّل کے کمرے کے دروازے پر ٹیک لگائے ایک شان سے بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا' اس کے برابر موجود تھا۔ جو بھی آتا، جمّل میرے بارے میں اُس سے چار پانچ جملے ضرور بولتا۔ آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب میرے نام سے واقف تھے اور اس طرح مل رہے تھے جیسے میری اُن کی پُرانی شناسائی ہو۔ کوا ایک ہی شکایت تھی کہ میں نے جیل سے آزاد ہو کے جمّل کے اڈے کا رُخ کیوں نہیں کیا۔ معاف ظاہر تھا، جمّل نے اُن سے میرا اس قدر تذکرہ کیا تھا کہ اب درمیان میں کوئی اجنبیت نہیں رہ گئی تھی۔ اتنی جلدی اتنی بڑی تبدیلی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے حواس بجا رکھنے میں دیر لگی۔ صبح تک میں نسرین بیگم کا ملازم تھا اور اس وقت کلکتے کے نامی گرامی بدمعاشوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ سب مجھ پر فدا ہو رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے اسی کمرے میں کھایا۔ کھانے کے بعد جمّل کے ملاقات و سلام جانے لگے' معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں دُنیا کا کوئی کام نہ ہو۔ وہ مجھے گرید گرید کے جیل کے واقعات یاد دلا رہے تھے اور مجھے زرّیں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بھیڑ میں نے بہت کر کے جمّل کے کان میں کہا کہ میں لڑکی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔

مجھے لاڈلے! اُس نے میرا کاندھا پکڑ کے زبردستی بٹھا دیا۔ "دیکھ میاں تیرے لیے کون لوگ آئے ہیں' وہ خیریت سے ہے' اپنی بیٹی ہے نہیں ہے۔"

تیر سا تھا آئی ہے تو اُس کے لیے تو عزت ہی عزت ہے۔ اُس کی فکر نہ کرو وہ آرام سے ہوگی۔"

"میں چند منٹ بعد واپس آجاؤں گا۔"

میں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا۔ "جاؤ دیکھ آؤ پر ابھی واپس آجاؤ۔" میری بے قراری پر سب مشوش نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کو کچھ کہنے لگے۔ جمّل نے بھی یہ دیکھ لیا۔ وہ اٹھیں گھر کہنے لگا۔ "تمھاری ماں کے لیے جارہا ہے تو تم اسے کمرے میں سنبھالو۔" لالہ مجھے لیے ہوئے ایک لینے پر آگیا۔ چکر دار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرا دل ہولنے لگا اور جسم میں پھریریاں سی اٹھنے لگیں۔ پہلی اور دوسری منزل پکے بنے ہوئے تھے، جو سب سے مکمل تھے تیسری منزل پر لالہ نے مجھے ایک فلیٹ میں چھوڑ دیا۔ رفتے ہاتھوں سے میں نے دستک دی ایک بڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور تحسین کو کے اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ ایک معمولی فلیٹ تھا لیکن وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بڑھی عورت کے ساتھ سلونے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اُس نے مسکرا کے مجھے دیکھا اور اندر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا تو زرّیں پٹ پٹائی ہوئی پلنگ سے اٹھی۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ آیا نسترن بیگم کا ملازم فقیر اُس کے سامنے کھڑا ہے یا کوئی اور شخص؟ اُس کی متذبذب اور مضطرب کیفیت سے مجھے کچھ لطف آیا میں نے مسکرا کے اُس سے پوچھا "پہچانا میں کون ہوں؟" اُس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ "یہ میں ہوں فقیر محمد۔" نسترن فقیر اکہتی تھی۔ "اُسے شاید پھر بھی یقین نہیں آیا۔ میں نے میز پر رکھا ہوا آئینہ اُٹھا کے اپنا چہرہ دیکھا۔ زرّیں کی حیرت بجا تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی اپنے آپ کو پہچاننے میں تامل ہوا۔ یہ چہرہ کسی اور شخص کا تھا، جیسے بدل گیا ہو۔ "میں وہی ہوں۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"تم تو بالکل بدل گئے ہو۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

"صرف چہرہ بدلا ہے، یوں کہو کہ ایک مدت بعد مجھے اپنا چہرہ واپس ملا ہے۔" میری آواز اچانک بھرانے لگی۔

اُس کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اُس میں استعجاب کا اضافہ ہوگیا تھا۔ "فقیر محمد تمھارا اصل نام ہے؟" اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا اصل نام یہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟" وہ تیزی سے بولی۔

"اب میں اُسے بھول چکا ہوں یہاں سب مجھے لاڈو لا کہتے ہیں، کچھ دن پہلے تک میرا نام ظہیر خاں تھا اور اس سے پہلے کچھ اور۔"

"اس سے پہلے کیا تھا؟"

وہ مت پوچھو۔" میں نے بے چین ہو کے کہا۔ "تمھیں وہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ جی تو نہیں گھبرا رہا ہے؟"

"نہیں۔ انھوں نے میرا بڑا خیال رکھا ہے۔ جب سے آئی ہوں یہ بڑھی اور ان کی بچی میری خاطر مدارات میں لگی ہوئی ہیں۔ انھوں نے یہ میرے کہنے پر اور سالے بھی میرے لیے لا کے رکھ دیے ہیں کپڑے بھی نئے ہیں۔"

"مگر تمھیں اچانک لگا جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" زرّیں نے تعجب سے پوچھا۔ "مگر تمھیں اچانک لگا جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" زرّیں نے تعجب سے پوچھا۔

"میں نے انھیں بتایا تھا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے مگر یقین کرو کہ وہاں سے آنا بہت ہی اچھا ہوا۔ وہ قاری بہت بُری عورت ہے۔ وہ نہ جانے تمھیں کہاں بھیج دیتی۔"

"یہ میری قسمت کی بات تھی کہ تمھیں اللہ میاں نے بھیج دیا۔" اُس نے تجی نظریں کر کے کہا۔ "میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"جو تمھیں اچھا لگے جاہو تو میرا کوئی اور نام رکھ لو، میں اب مختلف ناموں کا عادی ہو گیا ہوں۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے اگر مناسب سمجھو تو کچھ مجھے بھی بتاؤ۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "یقیناً تمھاری ہی جیسی غیر فطری نہیں ہے کہ تم جس تحمل کے ساتھ آئی ہو اُس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہو گی۔ مجھ سے کچھ کہا نہیں جاتا۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمھاری ہی طرح میں بھی ایک بدنصیب آدمی ہوں۔ میرا مقدر بھی کھوٹا ہے۔"

اُس کے سر سے دوپٹا ڈھلک گیا تھا اور گیلے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اس حالت میں وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اُسے بس دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ چٹاپٹا درست کر کے معصومیت سے بولی۔ "تم نے کچھ کھایا؟"

"بہت زیادہ تو نہیں، بھوک ہی نہیں لگی۔"

"سیب کاٹوں؟" اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

"کاٹ دو۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ وہ سیبوں کی قاشیں بنانے لگی۔ "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کہاں آگئی ہو اور یہ کون لوگ ہیں؟"

"میں تمھارے ساتھ آگئی ہوں اور مجھے اب کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" اُس نے بے باکی سے جواب دیا۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ "یہ وہاں سے تمھیں لے آیا ہوں، اب تم جہاں جانا چاہو میں تمھیں پہنچا سکتا ہوں اور اگر تم یہاں رہنا چاہو تو یہاں بھی تمھیں سب کے سینے کشادہ ملیں گے۔" بے خیالی میں سیب اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔ میں نے سیب اُٹھا کے اُس کے سپرد کیا تو میرے ہاتھ پر اُس کے آنسو گر گئے۔ "یہ کیا؟ تم تو رو رہی ہو۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تمھیں میری کوئی بات گراں گذری ہے؟"

اُس نے اپنا منہ پھیر لیا اور دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں اب کہاں جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں تم مجھے سمندر میں پھینک آؤ۔"

"میں نے آج تمھیں پریشان کیا میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مقصد تھا کہ اگر تم اپنے متعلق کوئی فیصلہ کرنا چاہو تو تمھیں پورا اختیار ہے۔ مجھے معاف کرو، مجھے ٹھیک سے بات کرنی نہیں آتی۔"

اُس نے سیب کی قاشیں کاٹ کر پلیٹ میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے دو ایک قاشیں اُٹھا کے منہ میں رکھ لیں اور اُس سے بھی اصرار کیا۔ جب اُس نے کوئی حرکت نہیں کی تو میں نے بے اختیار ایک قاش اُٹھا کے اُس کے منہ کی طرف بڑھائی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو تھرکنے لگے۔ ہاتھ بڑھا کے اُس نے اُسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ دیر تک ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب میں اُٹھ کے چلنے لگا تو اُس نے کہا۔ "ممکن ہے نسترن بیگم مجھے اور تمھیں تلاش کرنے کی کوشش کرنے باہر نکلتے، ہوئے احتیاط برتنا۔"

نسترن کے ہاں میں اُس سے بڑی روانی کے ساتھ باتیں کرتا تھا لیکن یہاں زبان گنگ ہو گیا تھا۔ کہنا کچھ چاہتا تھا، کہہ کچھ جاتا۔ زبان قینچی سے چل ہی نہیں رہی تھی۔ صبیح ہم ایک دوسرے سے چپکے بچھے ٹیکسی میں بیٹھ گئے تھے۔ اب ایک عجیب سا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے شام کو آنے کا وعدہ کر کے اُس سے رخصت ہونا چاہا تو وہ بھی مجھے روکنے کی ہمت نہیں کر سکی البتہ زینے تک رخصت کرنے آئی اور اوپر کی سیڑھیوں پر اُس نے یہ کہہ کے میرے قدم جکڑ لیے۔ "تمام کو آئے گا نا؟" میں نے نگاہ اُٹھا کے اُوپر دیکھا۔ وہ مجھے تعظیم دے رہی تھی میں تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آگیا۔

زرّیں کو کیا اندازہ تھا کہ میں نے اپنا کون سا کرب فراموش کر کے اُسے اُس جہنم سے نکالا ہے۔ میں ہی جانتا تھا اور تھی کو اُس پر ترس آرہا تھا۔ جی چاہا کہ اُسے واپس کر آؤں۔ جب کہ واپس نہیں آسکتی تو زرّیں کو ایک محفوظ مقام پر پناہ حاصل کرنے کا کیا حق ہے۔ یہ کورا کاغذ تھی جسے یہاں آنا چاہیے تھا۔ وہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ یہ کون سی لڑکی درمیان میں آگئی پھر اُسے کسی نے میرے پچھل لی کر دیا بہت بڑے دل کی لڑکی ہے۔ اگر تم پہلے تو ہو بہت خوش ہوگی کہ میں نے اسی جیسی ایک مظلوم لڑکی کی مدد کی ہے۔

نسترن کے ہاں چند دن میں نے محض زرّیں کی وجہ سے گزارے تھے اور اپنے آپ پر بڑا جبر کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کوئی یاد انتوا میں کالی اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے مقصد سے غافل رہا۔ زرّیں کو یہاں طوعاً دیکھ کے پھر میرے سینے میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ نسترن سے چاند میاں کا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ میں پہلی فرصت میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ یقیناً اُس کی آن غنڈوں تک رسائی ہوگی۔ جنھوں نے مجھ سے کورا کو چھین لیا تھا۔ جمّل کے ہاں ہتھیاروں کی کمی نہیں تھی یہاں آنے کے بعد متعدد مرتبہ میرا دل چاند میاں کی طرف جانے کے لیے ہوا پایا لیکن جمّل نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ میں ہر جگہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب چاند میاں ہی میری آخری اُمید تھا۔ اُسی سے کورا کا سراغ مل سکتا تھا بشرطیکہ وہ غنڈے اُسی کے خریدے ہوئے نہ ہوں۔ مجھوں نے دریا کے کنارے اُس سیاہ رات میں ہم پر حملہ کیا تھا اگر اوروں کی طرح اُسے بھی کورا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا تو میں بھی اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ سات سال میں وقت کی موٹی دیواریں درمیان میں حائل ہو گئی تھی چاند میاں کے علاقے میں اس وقت جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

نسترن بیگم نے اسامہ اور نواب مرزا کو تمام روداد سنا دی ہوگی۔ نواب مرزا کا تو برا حال ہو گیا ہوگا۔ ایک طرف نسترن پر شک کر رہا ہوگا کہ اُس نے زرّیں کے دام بڑھانے کے لیے اُسے کہیں چھپا دیا ہے۔ دوسری طرف وہ میرے غائب ہو جانے پر نسترن کو بھی اس طرح سیدھے سادے انداز میں باندھ لینے کا پھندا کھولتے کا پچھتاوا تھا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کم از کم وہ آنکھیں نہ پھوڑتا جو حسین لڑکیوں کو تاکنے اور بُری نظر سے دیکھنے پر لگی رہتی تھیں۔ کم از کم اُس کی ناک تو کاٹ آتا تاکہ دُنیا کو معلوم ہو جاتا کہ ماں بہن کے رشتے کی بے وفائی اور غداری کی ہے۔

جمّل کے اڈے پر شام تک سینکڑوں غنڈوں کا اجتماع ہو گیا۔ دُور دُور خبر پہنچا دی گئی تھی کہ آج جمّل اپنے اڈے کی بالا پر جشن منا رہا ہے۔ اس لمبی گلی میں پھیلا کاروبار کیا گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر میں فلمی ریکارڈ بج رہے تھے۔ گلی میں لکڑی اور ٹین کا ایک معمولی قلعہ سا بنا گیا تھا۔ بیسیوں مسلح افراد کی من مٹھائی بنا کے اڈے پر پہنچا دی گئی۔ ہر شام جمّل بے ہاتھ لے کے باہر آیا اور دندناتا ہوا گلی کے اس سرے سے اُس سرے تک گیا۔ دکاندار دائیں اور راہگیر میں نے اُسے مبارک باد پیش کی اور اُس نے اپنے ہاتھ سے سب کو مٹھائی تقسیم کی۔ گلی میں شادی جیسا سماں تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کے حیران ہو رہا تھا۔ جمّل سے کچھ کہنے کا سوال نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اپنا تماشا دیکھتا رہا۔ اسی صورت میں کیلا لگان میں چاند میاں کی طرف جانے کا تصور بھی جسے کیے جا سکتا تھا۔ جمّل کو ذرا فرصت ملی تو میں نے اُس سے زرّیں کے پاس چلنے کو کہا۔ وہ ٹالنے لگا لیکن میں اصرار کر کے اُسے اُوپر لے گیا۔ دروازہ زرّیں ہی نے کھولا۔ وہ شاید میرا انتظار کر رہی تھی۔ اب اُس نے وہ سراسیمگی نہیں دکھائی جو مجھے موجود پا کے اُس کے چہرے پر سُرخی بھاگی لیکن جب اُس کی نظر میرے کاندھے پر چڑھے ہوئے دیو ہیکل جمّل پر پڑی تو وہ سہم کے پیچھے ہٹ گئی۔ خوف و تحیر سے جمّل زرّیں کی یہ کیفیت نہیں دیکھ سکا تھا۔ اُس کی نگاہیں بھٹکی ہوئی تھیں جمّل بھائی آئے ہیں۔" میں نے پُرتپاک آواز میں زرّیں سے کہا۔ وہ بھی گھبرائی کہ میرے لہجے میں کیا تاکید پوشیدہ ہے۔

"آداب!" وہ اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کے ادب سے بولی۔

"خوش رہو۔" جمّل نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے حیرت ہوئی جمّل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

"اندر آیئے۔" زرّیں نے خیریت آواز میں کہا۔

"نہیں بیٹے! اب ہم چلیں گے۔ تیجے بہت کام ہے۔" جمّل کے منہ سے یہ لفظ بمشکل ادا ہوئے۔

"کچھ دیر تو بیٹھیے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔

"ہاں آیئے اندر آیئے۔" میں نے جمّل کا ہاتھ پکڑا۔ جمّل جھجکتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا۔ باہر کے کمرے میں ایک پلنگ اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر میں، دوسری پر جمّل بیٹھ گیا۔ زرّیں کھڑی رہی۔ "اے تم جمّل بھائی کی کچھ خاطر نہیں کر رہی ہو۔ یہ تمھارے گھر آئے ہیں۔" میں نے بظاہر زرّیں سے کہا۔

"نہیں یہ بجل اکھڑکے بولا۔ لاڈلے اُنے تکلیف کیوں دیتے ہو۔"

"یہ تکلیف کی کیا بات ہے ابھی آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔"

بجل کی آنکھیں چھلک گئیں۔ "ہاں میں نے ہی کہا ہے۔ تم لاڈلے کے ساتھ آئی ہو تو میری بیٹی میری بہن ہو۔" وہ جذبات سے بھرپور آواز میں بولا۔ "تم کسی بڑے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہو یہاں یہ گھر یہ علاقہ یہ لوگ سب گندا اور بُرا ہے پر ہمارے پاس ہی کچھ ہے۔" وہ یہ کہتے کہتے اداس ہو گیا۔ "کچھ دنوں تک یہاں ہر تکلیف برداشت کرو، پھر میں تمہیں کوئی صاف ستھری جگہ لے چلوں گا۔"

میرے لیے یہی بہت ہے کہ یہاں آپ لوگ موجود ہیں۔"

"میں تمہارے لیے کچھ لایا بھی نہیں پہلی مرتبہ آیا اور خالی ہاتھ آیا۔ خیر مجھ پر تھا اُدھار رہا۔"

"اب میں بڑی الجھن ہو۔ زریں! میں نے تمہیں بجل بھائی کے حوالے کیا۔"

میں بجل کی طرف متوجہ ہوا اور بجل بھائی! اب زریں کا خیال تمہی کو رکھنا ہوگا۔" میں نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"بجھ پرانی بڑی ذمے داری کیوں ڈالتا ہے لاڈلے؟"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ زریں بے حد اچھی لڑکی ثابت ہوگی۔ یہ تمہیں بہت لذیذ کھانے کھلائے گی اور تمہارا سر دبائے گی یہ تمہیں۔۔۔۔"

"بس بس" بجل نے ترش روئی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں بھلا اسے کام کرنے دوں گا۔ اس کے یہ نازک ہاتھ بھلا کام کرنے کے لیے بنے ہیں۔ میں کیا اس سے خدمت لوں گا۔ سعادت حاصل کروں گا۔ مجھے لالچ دیتا ہے لاڈلے؟ یہ خوش رہے بس یہی میری لالچ ہے۔"

"ان کا مطلب یہ نہیں تھا۔" زریں جلدی سے بولی۔ "ان کا مطلب تھا کہ ایک بیٹی کو اپنے ماں باپ کی خدمت کرنی چاہیئے میں اس فرض میں کوتاہی نہیں کروں گی۔"

"ہاں ہاں تمہی اس کی طرف داری نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔" وہ شرمکے باہر چلی گئی تو بجل بولا۔ "لاڈلے! کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ لایا ہے۔ کھول میرے زخم کریدنے کی نظارت کر رہا ہے۔ بڑی مشکل سے تو اسے چھپنا بنایا ہے۔" وہ اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں اپنا بوجھ کم کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اُسے یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اس نے کچھ کھویا نہیں پایا ہے۔ اُسے نرمی، مرہم اور گداز کی ضرورت ہے بجل بھائی! آپ سمجھے کیوں نہیں۔"

"میں سب سمجھ رہا ہوں مگر میں خود سے ڈر رہا ہوں۔"

"سچ بتاؤ کیا وہ تمہیں اچھی نہیں لگی؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"اچھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لاڈلے! ان آنکھوں نے زمانہ دیکھا ہے اچھی بُری آنکھوں کا تجزیہ کرتے ہوئے عمر گزر گئی ہے۔ تو اتنی اچھی لڑکی کو یہاں لے کے آیا۔ یہ جگہ تو بہت بُری ہے۔"

"اور کہاں لے جاتا۔ میرے پاس کوئی اور جگہ تھی ہی نہیں۔"

"اس چھت سے پانی ٹپکتا ہے۔ یہاں کی سیلن یہاں کی بُو اُس کا جسم جلا دے گی۔ میں یہی سوچ کے پریشان ہو رہا ہوں، وہ تو شہزادی ہے لاڈلے! شہزادی کا دل ان کھنڈروں میں کہاں لگے گا۔"

"اُسے دل لگانا پڑے گا۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔"

زریں چائے کی ٹرے لے کے اندر آئی تو ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر تک پیالیاں کھنکنے کی آواز آتی رہی۔ بجل سر جھکائے بیٹھا تھا۔ زریں نے اُسے چائے دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور گرم گرم چائے صرف دو گھونٹوں میں اُنڈیل گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو۔" اُس نے زریں سے کہا۔ وہ سٹ کے چونکے پر بیٹھ گئی اور اپنے ناخن کریدنے لگی۔ زریں! وہ گہری سانس لے کے بولا۔ "میں کسی بڑی آزمائش میں مبتلا نہ کہ کے وہ اٹھا اور میرا ہاتھ تھام کے دروازے کی طرف چلا۔ زریں اُس سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ نہ ہی وہ بجل کو کچھ خیال آیا۔ وہ دالیں مڑا۔ کمرے میں پہنچ کے اُس نے زریں کے سر پہ ہاتھ رکھا پھر باہر نکل کے کھٹ کھٹ سیڑھیاں اُترنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ نیچے آ کے میں نے بجل سے پوچھا۔ تم ناراض تو نہیں ہو؟ میں نے کوئی غلط لڑکی نہیں لایا ہوں کسی بھی معزز اور نیک آدمی کی بیٹی ایسی ہو سکتی ہے۔"

اُس نے پلٹ کے میرے بازو جھنجھوڑ ڈالے۔ "لاڈلے! ایسی ملی دکھا نے والی بات کہیں کرتا ہے۔ تو کنجری بھی لاتا تو میں اُسے سر پہ بٹھاتا مگر تو تو ایک فرشتہ لڑکی لایا ہے۔ مجھ میں دونوں باتوں میں فرق ہے۔ خواہ مخواہ کی باتیں مت کر۔"

بجل کی برہمی دیکھ کے میں نے اُس وقت خاموشی مناسب سمجھی۔ شام اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔ رات بھیگتے بھیگتے گلی میں میلے کا سماں ہو گیا۔ کانتے اور نصیب یہاں بجل کو اُن چوکیوں پر لے گئے جو دیگوں کے قریب بھی تھیں۔ گلی کے اس حصے میں ایک پرائمری اسکول تھا۔ اسکول سے ملحق مختصر کھلے میدان میں تیز روشنیاں ہو رہی تھیں اور ایک شامیانہ نصب تھا۔ کرسیوں، چوکیوں، اسٹولوں، بینچوں اور چارپائیوں پر سینکڑوں آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ترنج ناچ رہے تھے۔ نیچے اور بجل کو ایک اونچی کرسی پہ بٹھا کے بیس بارہ لوگ اچھل اچھل سے لاد دیا گیا۔ جواباً اُس کے اور میرے جگے میں ہار ڈال کے چلا جاتا۔ آنے والوں میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے جب بجل زریں کے پاس سے اٹھا تھا کچھ متفکر اور الجھا ہوا نظر آتا تھا لیکن اب اس کی تشادابی لوٹ آئی تھی۔ ملنے والوں میں زیادہ تر ہندو رہتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ آج کی رات کوئی تفریق کوئی امتیاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ بجل کسی زندہ پیر کی طرح مسند پر شان و شوکت سے بیٹھا تھا۔ بس اتنی سی کسر تھی کہ لوگ مُردوں کی طرح اُس کے ہاتھ پیر نہیں چوم رہے تھے۔ اس کے باوجود اُس کی نگاہوں میں بجل کے لیے جو محبت اور عقیدت تھی وہ الگ سے پہچانی جا سکتی تھی۔ بجل وہی بچے گی کے ایک ایک بچے کا نام معلوم تھا۔ وہ ہر ایک کا نام لے کے اُس کی خیریت دریافت کرتا۔ بچوں سے اُن کے والدین اور والدین سے اُن کے بچوں کا حال پوچھتا جب دیگیں کھلیں اور تمام چینی کی پلیٹیں بھر کھڑا نہیں تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک کھانے کا زور و شور رہا۔ بوڑھی عورتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کے بجل کو دعائیں دے رہی تھیں۔ جیل میں مجھے بجل کے آدمی اس گھن گرج کے متعلق بہت کچھ بتاتے تھے۔ جیل میں جو چیزیں کسی کو نصیب نہیں ہوتیں وہ بجل کی وجہ سے اندر آ جاتی تھیں لیکن یہاں تو اور ہی منظر تھا۔ جو کچھ میں نے جیل میں سُنا تھا وہ اس کا نصف بھی نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو اور میں خوبیوں کا ایسا متحمل اور اہل نہیں ہوں جتنا مجھے انعام دیا جا رہا ہو۔ نہ جانے یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے کھانے کے بعد عورتوں اور بچوں کو رخصت کر دیا گیا پھر طبلے، ہارمونیم، طلبا ایک گول دائرے میں بیٹھ گئے پھر ایک جانب سے رنگ برنگے کپڑوں میں سولہ سنگھار کیے ہوئے تین لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ ماں کے ساتھ ایک بڑی عورت بھی تھی۔ چاروں نے بجل کو جھک کر سلام کیا اور اپنی نشست پہ جا بیٹھیں۔ قمقموں کی روشنی میں اُن کا سنگھار چمک رہا تھا۔ ایک تو بہت چھوٹی سی لڑکی تھی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی دوسری سترہ سال کے قریب ہو گی۔ تیسری تیس بائیس سال کی۔ بڑی لڑکی سنانت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس سے پہلے ناچ رنگ کی کسی محفل میں بیٹھنے کا تجربہ نہیں تھا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی خوب صورت اور سلیقے کی لڑکیاں مردوں کے سامنے برملا میں گھنگرو باندھ کے آئیں گی اور گانا گائیں گی۔ ان کی آواز کیسے نکلے گی اور ناچنے کیلئے ان کے پیر کیسے اُٹھیں گے۔ سب سُنا ہی سُنا تھا میں نے جیل کے سات سالہ دور میں سُننے ہی کا کام کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ بہر حال ہارمونیم اور طبلے کی آواز گونجی تو لڑکیاں اپنی جگہ سے اُٹھیں انہوں نے گھنگرو باندھے اور پھر میں محفل اپنے طلسم میں جکڑ لی۔ اُن کے گھنگرو نوچ رہے تھے۔ طبلہ بھی شاید رقص کر رہا تھا۔ بجل کے سامنے نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں بڑی لڑکی طبلے والے کے ناچنے لگی۔ اُس نے خصوصاً مجھے اپنی نگاہوں کی زد پہ لے لیا۔ اُس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، گالوں میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ لمبی نکیلی ناک گلاب کے پھول کے رنگ کی۔ پیشانی پر ستارے جگ مگا رہے تھے۔ آنکھوں میں کالا جادو بھرا ہوا تھا میں اُس کی اس خصوصی توجہ سے گھبرا گیا۔ میری گھبراہٹ سے وہ گرد و نواح کے قہقہے اُبلنے لگے اور لوگ میرے کانوں، ناک، منہ، بالوں اور ہاتھوں سے نوٹ چپکانے لگے۔ دفعتاً مجھے انھیں نوچتی رہی۔ میں شرم سے دہرا ہو گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کے لڑکی کو بھی شاید خجالت پر ترس آ گیا۔ اُس نے سر کے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو منع کیا۔ وہ گا بھی رہی تھی، ناچ بھی رہی تھی۔ اُس کی آواز تینوں لڑکیوں میں سب سے اچھی تھی۔ ناچ میں توازن تھا، کوئی پرکا بھا نہیں پڑتا تھا۔ درمیان کی لڑکی کچھ زیادہ پھرتیلی اور لچکیلی تھی۔ بڑی لڑکی ٹھہراؤ اور سنجیدگی کی مالک تھی۔ بجل کو بھی یہ دونوں باتیں پسند تھیں۔ وہ میرے سامنے آئی تو جھک گئی اور آنکھوں سے اٹھلانے کرنے لگی۔ بجل کے لڑکوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ لڑکیوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے تڑپے جا رہے تھے۔ ایک نوٹ جیب سے نکالتے تھے۔ ابھی وہ سوچتے ہی تھے کہ دوسرا نوٹ نکال کے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ میں کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور لڑکیوں کے بدن پھڑک رہے تھے۔

بجل سر جھکا بیٹھا حقے کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ وہ میری کرامات دیکھ کے گھبرا گیا تھا۔ بڑی لڑکی نوٹ اُٹھا کے بار بار اُسے سلام کرتی تھی۔ گانے کے درمیان میں ایک بار گرک کے اُس نے مجھے سُنائی کے ساتھ پوچھا۔ "آپ ہیں داد نہیں دے رہے ہیں؟" میں بوکھلا گیا اور ادھر اُدھر دیکھ کے پہلو بدلنے لگا۔ وہ زیرِ لب مسکرائی۔ "یہ تو عام محفل ہے کبھی غریب خانے آئیے۔ پھر ہم آپ کو دو محفل کریں گے۔" میں نے نفرت جھکا لیں۔

کانتے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اور سرد آہ بھر کے بولا۔ "کیوں راؤ! کبھی ہم سے تو تم نے ایسے نہیں کہا۔ ہائے تڑپتے ہی رہ گئے۔"

"ہٹو۔ ہم لاڈلے صاحب سے بات کر رہے ہیں۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لاڈلا صاحب تو رلا آج دھلا ہوا ہے۔ تازہ تازہ ہے نا؟ اس پہ بجلی گرانے کی کوشش مت کرنا۔ ہمارے ہی سینے کافی ہیں ہائے۔" کانتے نے دل پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "راؤ! تم میری بات مان لیتیں تو آج میری دُنیا بدلی ہوئی ہوتی۔ تم نے مجھے اکارتھی پر چھوڑا اور اب لاڈلے کو قناعت نہ رہی ہو۔"

"تم بالکل نہیں بدلو گے کانتے! تم ہمیں بہت ستاتے ہو۔"

"ہے ہے۔" کانتے دہرا ہو گیا۔ "راؤ تم نے ملے ہی نہیں پھر ستانے کی مرضی۔ اب زار لگے ہاتھوں وہ ظالم گانا تو سُنا دو۔ ہم کو تمہاری نجر لگے۔ اُتار لو نظر کا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ذرا نتان دار۔"

"ہُوں۔" اُس نے ناگواری سے منہ بنایا پھر جذب لہجے میں بولا سے مخاطب ہوئی۔ "آپ بھی سُنیں گے؟"

"سنائیے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"سُنائیے۔" کانتے نے میری نقل اُتاری۔ "جیسے دولھا کہہ رہا ہو تو ہے۔"

راؤ کے موتی جیسے دانت چمکنے لگے۔ "کانتے! تم بہت وہ ہو۔" اُس نے سازندوں کو اشارہ کیا اور درمیانی لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ لمحوں میں ماحول گدگدا گیا۔ طبلے کی اور انداز سے صدائیں لگانے لگا۔ تینوں لڑکیاں ایک ساتھ اُٹھ کھڑی ہو گئیں۔ ایک نے آغاز کیا دوسری نے آدھا مصرع اُٹھایا اور تیسری کا نمبر آیا تو محفل میں شور مچ گیا۔ اُس کی دل کش آواز پر بعض من چلے ناچنے لگے۔ بجل کے قریب بیٹھے ہوئے تماش بین ہنس ہنس کے دُہرے ہو گئے۔ بجل نے انگلی سے اشارہ کر کے انھیں خاموش کیا۔ راؤ نے رقص میں کمال کر دیا۔ وہ اس کے پاس نہیں آئی بس رقص کرتی اور گاتی رہی اور لوگ نوٹ پکڑے اس کی طرف اشارہ کرتے رہے۔ پھر لوگ راؤ کی آواز کے ہمراہ ایسے ڈوبے کہ ہر قسم کی آواز چھپکار بند ہو گئی۔ صرف راؤ کی سُریلی آواز گونجتی رہی۔ جیسے اُن

سب کی ترانائی کھینچ لی ہو۔ ابھی یہ محفل شباب پر بھی کہ سامنے سے درشت چہروں کے کئی قوی ہیکل اشخاص اس طرف آتے نظر آئے۔ ہر ایک کی نگاہ مان کی طرف اٹھ گئی۔ مجمع میں بھن بھناہٹ سی ہوئی اور نرتکی نفرت سرائی پر دبی دبی سرگوشیاں غالب آگئیں۔ محفل کے چہرے پر بے شمار لکیریں کھنچ گئیں۔ اس نے کانپتے کو اشارہ کیا۔ کانپتے تیزی سے اٹھ کے آنے والے اشخاص کی طرف دوڑا اور اس نے آگے جا کے ہاتھ پھیلا کے محفل کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ سب سے آگے ایک گرانڈیل شخص تھا، وہ قد میں پستہ اور جسم میں بھاری تھا۔ اس نے کانپتے کا ہاتھ جھٹک دیا اور سینہ پھلائے ہوئے آگے بڑھا۔ نرتکی نے گانا روک دیا۔ ہارمونیم کی آواز سسکنے لگی اور طبلچی کے ہاتھ طبلے پر ٹھٹھر گئے۔ محفل اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور دست آگے آنے والے شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا "آؤ آؤ موجمدار! بیٹھو بیٹھو۔" اس نے اپنی نشست پر بیٹھے لوگوں کو نگاہ پھیرنے کا اشارہ کیا۔ "تم نے آنے کی خوش کردیا۔" محفل نے شادمانی سے کہا۔ میں بھی محفل کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی لمحے میری نظر موجمدار کے ساتھ آنے والے لوگوں میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے چاند میاں پر پڑی۔ میرا دماغ سنسنا گیا۔ کھڑے کھڑے میرا سر بھاری ہو گیا۔ "ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں اُستاد محفل!" موجمدار نے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔"

"کون سی لڑکی؟" محفل کے تیور بھی بدل گئے۔

"وہ لڑکی جو آج تمہارے اکھاڑے پر آئی ہے۔" اس نے تندی سے کہا۔

"موجمدار!" محفل گرج کے بولا۔ "جو آدمی محفل کی پناہ میں آتا ہے، اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔"

"دیکھو محفل! ہم تمہارے معاملے میں کبھی نہیں بولتے۔ وہ ہمارے آدمی چاند میاں کی امانت ہے، اُسے واپس کر دو اور بات مت بگاڑو۔ ایک لڑکی کے لیے ہمیں آپس میں بگاڑ نہیں کرنا چاہیے۔"

"بگاڑ؟" بگاڑ تو تم کر رہے ہو موجمدار! تم دیکھ رہے ہو کہ میں اپنے لاڈلے کی واپسی کا حسین جشن منا رہا ہوں، تمہیں آنے سے پہلے اس بات کی اطلاع کر دینی چاہیے تھی۔ ہم کبھی تمہاری خوشیوں میں اس طرح خلل نہیں دیتے۔ آؤ یہاں بیٹھ کے گانا سنو۔"

"میں گانا سننے نہیں، لڑکی لینے آیا ہوں۔" موجمدار کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

"میں تمہیں کوئی لڑکی نہیں دے سکتا۔"

"میں تمہیں سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔"

"میں تمہیں آخری جواب دے رہا ہوں۔"

"بہت خون خرابہ ہو سکتا ہے اُستاد محفل!" موجمدار قہر آلود لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو، تمہارا آدمی لڑکی کو بھگا کے لے آیا ہے۔ ہمیں اس سے چاہیے تھی مگر ہم سیدھے تمہارے پاس چلے آئے کیونکہ وہ تمہارا آدمی ہے۔"

"وہ میرا لاڈلا ہے۔" محفل میری گردن میں باہیں ڈال کے فخر سے بولا۔

"یہ ہے وہ؟" موجمدار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں بے چاند میاں!" وہ پیچھے مڑ کے بولا۔ پہچانتا ہے اسے؟" چاند میاں جھجکتا ہوا آگے آیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میرا حلیہ بدل چکا تھا اس لیے اُسے پہچاننے میں تامل ہوا۔ "بلے کیا ٹکر دیکھ رہا ہے۔" موجمدار نے اس کی گردن پکڑ کے کہا۔ "یہی تھا وہ؟"

"ہاں استاد یہی تھا۔ پر یہ تو نسترن کے ہاں ٹھہرے کے کام کاج کا ملازم تھا، گڑبڑ وہی تھا۔ تو یہ کسی چال سے وہاں نوکر بنا ہوا رہ رہا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "حرام کی اولاد! وہ میں ہی تھا اور ابھی تو نے صرف مجھے لڑکی لے جاتے دیکھا ہے، جب میں تجھے لے جاؤں گا اُس وقت دیکھنا، ابھی میرا قومندان نہیں ہوا۔ میں تیری تلاش میں تھا۔ تجھے بعد میں نمٹلوں گا۔" محفل نے میرا کاندھا دبایا۔ میری درشتی پر سب کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہر طرف کھڑی ہوئی رنڈیاں ناچنے لگی تھی۔

"اپنے آدمی کی زبان بند کرو محفل!" موجمدار غضب ناک ہو کے بولا۔

"اس سے پوچھو کہ کیا یہ لڑکی اس کے باپ کی تھی؟ میں نے استقبال میں کہا۔ "یہ کہاں کا سورما دار بن کے آگیا۔ اس سے کہو واپس چلا جائے۔"

"چلا جائے گا، چلا جائے گا لاڈلے! تو تو فاتحانہ شور مچا۔ میں اسے اور اس کے حالی موالیوں کو دیکھ لوں گا۔ تو نے میری موجودگی میں بولنا شروع کر دیا؟" محفل نے مجھے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چل اُدھر بیٹھ۔ گانا شروع کر، جبھی یہ گانا کیوں بند کرایا؟ اٹھ، وہ لا جو کتھری کو بھر گئی؟ گانا شروع کرو۔"

"گانا بعد میں شروع کرنا محفل! گانے کے لیے رات پڑی ہے، ہماری بات کا جواب دو۔ لڑکی واپس کرنی ہے کہ نہیں؟"

"موجمدار تم جانتے ہو کہ محفل کو اس انداز میں بات کرنا پسند نہیں ہے اور جب محفل کا لاڈلا درمیان میں ہو تو تمہیں سوچ سمجھ کے بولنا چاہیے، یہ جشن لاڈلے کی خاطر منایا جا رہا ہے اور اسے کم نہ سمجھنا، سات سال تک تم نے میرے آدمیوں کے ہر قسم کے ذوق پورے کیے ہیں، اسے نیلامات بھگتا۔ فولاد آدمی ہوتا تو میں تمہاری بات پر غور کرتا مگر یہ تو لاڈلے کی بات ہے۔ لاڈلا کسی کنجری کو بیکو کے نہیں لایا۔ وہ ایک بڑے خاندان کی ایک شریف لڑکی ہے لاڈلا اُسے بچا کے لایا ہے۔ سمجھے موجمدار! تم اس نتیجے پر پہنچو کہ چاند میاں کی بات سن کر ہم سے اب کوئی اُمید مت رکھنا۔ میں تمہیں کل شام تک کا وقت اور دیتا ہوں، سوچ سمجھ لینا۔ لڑکی شام تک آئی تو بہتر تمہارے علاقے کی کسی لڑکی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ہم آزاد ہوں گے۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔ تم محفل سے بات کر رہے ہو، قسم ہے لاڈلے کی جلتے کی ہر لڑکی میری بیٹی ہے، تم نے اگر ایسی کوئی نادانی کی تو کلکتے میں قیامت آجائے گی۔ بس موجمدار! تم نے بہت کہہ لیا اور ہم نے بہت سن لیا۔ گانا شروع کرو۔ نرتکی! موجمدار تمہاری دوستی کا خیال ہے ورنہ میرے علاقے میں مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے والا واپس نہیں جا تا۔"

محفل کی آواز فضا میں گرجی تو طبلے والے نے سم کے کھٹ تھپ کی اور ہارمونیم والے نے جلدی جلدی ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ نرتکی حرکت میں آگئی۔ موجمدار چند لمحے کھڑا رہا، پھر سارے مجمع کو نفرت سے گھورتا ہوا واپس جانے لگا۔ جاتے جاتے وہ دہاڑ کھڑا اور بلند آواز میں بولا۔ "کل شام تک محفل! ہم کل شام تک انتظار کریں گے۔"

کانپتے، قوالی بیلا اور سارنگے وغیرہ ہاتھوں میں کھلے چاقو لیے محفل کے گرد گھیرا کر کھڑے تھے۔ ماں کے سم اکھڑے ہوئے تھے۔ کانپتے نے ہاتھ اٹھایا تو محفل نے اُس کا بازو پکڑ کے مروڑ دیا۔ کانپتے کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا اور وہ زمین پر تین چار لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک طرف بلکنے لگا۔ واپس جاتے ہوئے آدمی پر ہاتھ اٹھاتا ہے بے غیرت!" محفل نے نفرت سے کہا اور خاموشی سے اپنی نشست پر آ کے بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

محفل میں سخت کشیدگی پائی جاتی تھی۔ محفل کو اس کا احساس شاید سب سے زیادہ تھا۔ اس نے رُکے ہوئے گانے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ محفل پر پھر بہار آگئی۔ جیسے ابھی یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ طوائفوں نے بھی جھٹکے ناچ اور گانوں سے کبیدگی دُور کرنے کا کام کیا۔ پھر ہر طرف سے روپے کی برسات ہونے لگی۔ یہ دھومیں آدھی رات تک مچتی رہیں۔ طوائفیں روپے بٹورتے بٹورتے تھک گئیں۔ نصیب میاں میرے پاس ہی بیٹھا تبصرے کرتا رہا تھا اور نرتکی کی ہر ادا پر بار بار پھڑک اُٹھتا تھا۔ "اے میاں لاڈلے! دیکھتے ہو، ایک اٹھنی نثار کرنے کو جی چاہتا ہے آہا ہا۔ کیا ستار گایا ہے، پنڈا تو دیکھو، شباب اُمڈا پڑ رہا ہے، شراب کا پیالہ ہے، رنگ تو دیکھو ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے۔ اے جانی! دیکھتے رہو، وہ تمہاری طرف آ رہی ہے۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے رکھنا۔" یہ آنکھیں جھلکا کے رکھ دیتی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہوئے سارا جسم جھلملا رہا ہے۔" نصیب میاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ میدان میں کود کے نرتکی کے ساتھ ناچنے لگے۔

باقی رات کورنشیاں مانگتے لگیں۔ سازندوں نے ساز خلاف میں لپیٹے اور طوائفوں نے پیروں سے گھنگرو کھولے۔ پھر محفل کو آداب کرتی ہوئی وہ محفل میں بیٹھے کے اپنے ٹھکانے چلی گئیں۔ کسی نے اب تک موجمدار کے سامنے محفل سے بات کرنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ سب لوگ دوبارہ رونق محفل میں مشغول ہو گئے تھے۔ صرف میں ایک ایسا شخص تھا جو وہاں نہیں بیٹھا تھا۔ میں تو چاند میاں کا تعاقب کر رہا تھا، بار بار میرا ہاتھ اس کے گریبان تک جاتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تو کورا بیٹھی تھی۔ میری تیتی رگوں میں خون اُبلنے لگا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا جو نصیب میاں کے تبصرے سن رہا تھا اور تالی بجا رہا تھا۔ وہ سمجھا چاند آدمی نہیں تھا، آدھا آدمی تھا۔

اٹھ کے پورا واپس آ کے محفل اپنے پلنگ پر ڈھے گیا۔ میں سامنے دھری کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ "کیا تو آدھا جا کے سو رہا؟" محفل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"تم کیا سمجھے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تو کاہے کو منہ لٹکائے بیٹھا ہے پیارے! اب آرام کر دن بھر میں تھک گیا ہوگا۔" وہ انگڑائی لے کے بولا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا موجمدار کا خیال آگیا ہے؟" محفل بے پروائی سے بولا۔

"میں نے یہاں آ کے بتایا کیا؟" میں نے یاسیت سے کہا۔ "میں اگر لے کے کہیں اور نکل جاتا تو یہ نوبت نہ پہنچتی۔"

وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ادھر آلا اُٹھ لے اے تو کیا بکتا ہے اور کس قسم کی بات کرنا ہے تو میرے پاس نہ آتا تو اور کہاں جاتا۔ میں نے تیرا برسوں انتظار کیا ہے۔ اب آیا ہے تو ایسی باتیں کرنے لگا۔ زبردل دکھا رہا ہے۔ تیرے لیے تو میں نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ تو سب کچھ خاک میں ملائے دے رہا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے تم غلط سمجھے۔" میں نے مات سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ ایک لڑکی کی کسی بہت بڑے سے ہنگامے کا سبب بن گئی ہے اور یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔"

"ہوگا تو کیا ہوگا۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "اے کیا دنیا کو تیری سلائی سمجھ لیا ہے۔ یہ کہتے کی دُم ہے تو نے تو میرا جی خوش کیا ہے لاڈلے! اگر تیری پروا میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ تیری غلطی میری غلطی ہے۔ بس چپ رہ اور زیادہ بات نہ کر۔"

"تم نہیں سمجھتے۔" وہ لڑکی مجھے راستے میں مل گئی تھی۔"

"ہر شخص کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی راستے ہی میں ملتا ہے۔ یہ راستہ اسی لیے ہیں لاڈلے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملا کریں۔ وہ لڑکی کہیں بھی ملی ہو، اب تو ہماری عزت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..." میں کہتے کہتے رہ گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ چڑ کے بولا۔ "لاڈلے میاں! تو جو بات کہنا چاہتا ہے، وہ مجھے معلوم ہے، یہ جو تو گھنا گھنا گھومتا ہے۔ اپنے آپ میں مگن سے صرف اس وجہ سے ہے کہ تو مل کھول کے بات نہیں کرتا۔ میں نے یہ بات جبل پور میں محسوس کر لی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لڑکی تھی، اس کے لیے تو نے اس اُجلے کریم گل کو مارا تھا؟ جیسے مُردار کرتا رہتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "یہ غلط ہے، تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکی تو مجھے راستے میں مل گئی۔"

محفل چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ "اے تو بات صاف صاف کر۔" میں نے سوچا محفل کو ساری بات بتا دوں کہ وہ لڑکی تھی لیکن

یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے اپنی زبان کی لگام تھامی اور کہا۔ میں اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ وہ ہندوستان، ایران توران کے کسی کونے میں ہو، میں تیرے لیے اُسے لا دوں گا۔"

"یہی تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"کوئی اتا پتا؟ کوئی نشانی؟" اُس نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ "کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟ تیری پسند ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔"

"وہ بہت خوب صورت تھی۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تو نے اُسے کب سے نہیں دیکھا؟"

"جب میں جیل گیا ہوں سات سال سے زیادہ ہو گئے۔" میری آواز بھیگ گئی میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

"اے لاڈلے! اے لاڈلے! اب تو تو بہت تھڑ دلا ہے، ہائیں روتا ہے، مرد ہو کے روتا ہے، اب یہاں نہ جانے کیا کیا گزر گیا۔ ہمیشہ آنکھوں کو رات دے دی۔ جب بھی آنکھوں نے کمزوری دکھائی، کسی دوسری طرف دیکھنے لگے۔ آنکھوں کو دھوکا دے دیا۔ میری جان مجھے بتاؤ وہ کون تھی؟ کہاں تھی اور کیسے تجھ سے دُور ہو گئی؟ کچھ تو نے بتایا، کچھ کریم گل کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ تیرے ساتھ ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی جس پر اُس نے بُری نظر ڈالی تھی۔ جیل میں آنے کا واقعہ تو نے دور سنایا، میرا خیال ہے تجھے جھوٹ بولتا رہا، بتا دے، اُسی لڑکی کا چکر تھا نا؟ کسی کا نام بھی جانتا ہے اُسے کون لے گیا۔"

"نہیں نہیں کچھ نہیں میں کچھ نہیں جانتا۔" اگر چاندیاں موجدار کے ساتھ یہاں نہ آتا تو شاید میں جمل کو چاندیاں کا نام بتا دیتا یا شاید پھر بھی نہ بتاتا۔

جمل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "لاڈلے اگر ایک بات تو بتا۔" تو چاندیاں کو دیکھ کے اتنا کیوں بھڑک گیا تھا؟ کبھی کسی پہ حیرت ہوئی تھی اُس پہ تیرا کون سا قرضہ ہے جو تجھے ادا کرنا ہے؟ اشارہ تو کر، اُسے ابھی اٹھوا لوں۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "وہ تو زلیں کا معاملہ تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "زلیں کے ساتھ اُس نے زیادتی کی تھی۔"

"نہیں کچھ اور بات بھی ہے۔ تو چھپا رہا ہے۔"

"میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ میری تلخی دیکھ کے جمل چپ ہو گیا اگر میں اُس سے یہ کہہ دیتا کہ چاندیاں ہی وہ شخص ہے جس نے زلیں سے کورا کاغذ سودا کرنا چاہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے تھے تو جمل اپنے قول کے مطابق صرف چند ساعتوں میں چاندیاں کو یہاں میرے قدموں میں ڈال سکتا تھا۔ چاہے بعد میں اُسے موجدار کے آدمیوں سے کتنا ہی بڑا فساد مول لینا پڑتا مگر مجھے یہ بتاتے ہوئے کچھ کڑوی محسوس ہوتی تھی، جُرم کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے میں نے کر کرا کر رسوا کر دیا ہو۔ میں ایک کمزور آدمی ثابت ہوا، کورا کا بوجھ نہیں اُٹھا سکا۔ جیسے میں ہار گیا اور میری آگ بجھنے لگی اور مجھ سے کچھ بن نہ سکا تو میں نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو بُلا لیا۔ ابھی کچھ پتہ نہیں کورا کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ اگر اُس کا نام لشت از ہام ہو جائے گا تو وہ کیا کہے گی۔ مجھے ایک ہلکا سا بن محسوس ہوتا تھا اور اگر خدانہ کرے کورا کا حال کچھ ایسا ویسا معلوم ہوا تو ایک بات طے ہے۔ پھر اُس رات اُنھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر دیا تھا۔ اس اُجلے ہوئے معاملے میں جمل اور اُس کا گروہ پڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ میں تو صورت دیکھ کر ہی جان گیا اور لوگ تماشا دیکھیں گے۔ میں نے جمل کو کچھ نہیں بتایا لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اُس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔

"تن میرے جلوے!" جمل فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "اب یہ بات کھل کے سامنے آگئی ہے کہ تو جمل کے جنگل کا جانور ہے۔ اب تو اپنے آپ کوئی قدم اُٹھانے کی نادانی نہ کرنا، موجدار کے لوگ پتا نہیں کتنے ہوں گے۔ تو کوئی ایسی ویسی بات کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا۔ اپنے پاس بھی لوگوں کی کمی نہیں ہے۔"

"اور زلیں کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اُس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ "فرض کرو موجدار کے آدمی پاگل چا کرنے لگیں؟"

"ہم وقت پر سوچتے ہیں جالو! پہلے سوچے تو یہاں تک پہنچے ہوتے؟ تمھارا بھی آدمیوں میں ہوتا۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" وہ جاہی لیتے ہوئے بولا۔ "اب سو جا۔ تو تو آتے ہی پریشان ہونے لگا۔ ابھی کچھ دن آرام کر لے تیرے پیروں کے سفیٹے میں نے دیکھے ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا رہا ہے۔" وہ چادر تان کے لیٹ گیا۔ میں کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر اُس کے برابر کے کمرے میں آگیا۔ جمل نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ میں جاؤں میرے لیے سونا اور کھانا اتنا آسان ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ میں جیسے تیسے زہر مار کر لیتا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد بھوک اور نیند غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی مالا کے دانے پرونے شروع کر دیے اور باقی رات اُسے اپنے چہرے پر رکھ کے کھینچتا رہا۔ صبح سویرے مُرغوں کی بانگ پر کسمساتا ہوا اُٹھا، جمل سویا ہوا تھا، میری ایک ذرا سی آہٹ پر وہ بیدار ہو گیا۔

"کون ہے؟" اُس نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

"میں ہوں اور کون؟" میں نے مختصر جواب دیا۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ "نیند نہیں آرہی ہے؟"

"صبح ہو گئی ہے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"ابے یہ کیسی جوانی ہے۔ جا سو جا۔" وہ کروٹ لے کے بولا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا اُس چاقو کے نزدیک پہنچا جو جمل کھا رکھا ہوا تھا جب جمل کی گہری سانسیں آرام کے ساتھ خرخر میں بدلنے لگیں تو یقین ہو گیا کہ وہ سو گیا ہے۔ میں نچلی کے بل اُس کے سرہانے کے قریب

ہو گیا پھر میں نے دھیرے دھیرے پلنگ کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کیا۔ میں نہ جانتا تھا کہ جمل کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا تو میں ایک لمحے میں چاروں ہاتھ پھالانگ کے اُس سے دُور جا پہنچتا۔ اب میرا ہاتھ چاقو پہ پڑنے لگا تھا اور میں نے اپنی سانس روکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے چاقو اُٹھایا، جمل نے کروٹ بدلی میرا دل اُچھل کے حلق میں آگیا لیکن میں ایک جست میں اُس کے پلنگ سے چند قدم کے فاصلے پر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔ نیم تاریک کمرے میں اُس کی سُرخ سُرخ آنکھیں دو چراغوں کے مانند جل رہی تھیں۔

"تیری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کیا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"نہیں میں ذرا سویرے اُٹھنے کا عادی ہوں۔"

"ہاں جیسے میں تو تیری عادتیں جانتا نہیں۔ ایک ایک بات کی خبر رکھتا تھا جب تیرے ساتھ جیل میں رہا، تو لوگوں سے پوچھا کرتا تھا۔"

"میں باہر جا رہا ہوں کچھ دیر تہل کے آجاؤں گا۔"

"اکیلے مت جانا، تھوڑی دیر میں کوئی جاگ جائے گا۔"

"تم مجھے بالکل بچہ سمجھتے ہو۔"

"تیرے لیے ابھی تک بچہ ہے۔ مجھے یاد ہے جب تیری مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اور تو ڈاڑھا سہما سہما سلاخوں کے اندر بیٹھا تھا۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں یاد ہے مگر میں ڈرا ہوا تو نہیں تھا۔"

"ہاں، اخگر شیر کا بچہ ہے۔ تو نے کانتے کو پچھاڑا، کریم گل کو چت کیا، سلاخوں کو بے بس کیا اور رات بھی تیری زور آزمائی دیکھی۔" وہ نیند سے اٹھ کے اس طرح باتیں کر رہا تھا، گویا سویا ہی نہ ہو۔ میں نے اپنی پیٹھ پر چاقو چھپا لیا تھا۔ جمل پھر اُونگھنے لگا تو میں موقع دیکھ کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ دھندلکا پھیلا تھا۔ نصیب میاں برآمدے میں سو رہا تھا اور دوسرے لوگ اِدھر اُدھر پلنگ ڈالے پڑے تھے۔ میں نے کنڈی کا جائزہ لیا تو اندازہ ہو گیا کہ اسے کھولنا آسان نہیں ہے سب جاگ جائیں گے اور شور سن کے جمل بھی اٹھ آئے گا۔ باہر دروازے پر چوکی دار بھی ہوگا۔ جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں دوبارہ جمل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ جاگ گیا تھا۔ مجھے پہنچے ہی مسکرا کے مجھے دیکھنے لگا اور اُٹھ کے باتھ روم کی طرف چل پڑا۔ میں نے اُس کا چاقو تکیے کے نیچے رکھ دیا اور دوسرے کمرے میں آکے پھر پسر گیا۔ جب باہر آوازیں آنے لگیں تو میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ جمل برآمدے میں چہل قدمی کر رہا تھا اور ایک لڑکا اُس کے جسم کی مالش کر رہا تھا۔ نصیب میاں اُس کے قریب کھانے کا بیان کھولے ہوئے بیٹھا تھا۔ چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے دیکھ کے نصیب میاں نے آواز لگائی۔ "لے چھوکرے! چائے لا، اپنا خورشید نکل آیا ہے۔"

مالش سے نمٹ کے جمل نہانے چلا گیا اور میں نے نصیب میاں کو ہم راز کی طرح ایک چاقو حاصل کر لیا۔ نصیب میاں نے مجھے پانچ روپے تھما دیے، اُس کی آنکھ اوجھل ہونے کی دیر تھی کہ میں سامنے والے دروازے سے نکل کے بھاگا۔ یہ مکان دوطرف سے کھلتا تھا۔ کچھ اور دروازے بھی تھے، لیکن جو راستہ میں نے اختیار کیا تھا، جس دروازے سے میں باہر نکلا وہاں ایک تنگ گلی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ گلی کے درمیان دوسری گلیوں میں جانے کے لیے مختصر راستے بھی بنے ہوئے تھے۔ مکان سے کچھ فاصلے تک تو میں آہستہ آہستہ چلا۔ رات کے تماشا بینوں کی بچی کھچی تراخوں نے جگہ جگہ مجھے سلام کیا لیکن اگلے چند منٹوں میں میں دوسری پھر تیسری اور پھر بڑی سڑک پر تھا۔ میں نے سوچا پہلے جا کے نصرتی کا حال کیوں نہ پوچھوں لیکن یکہ میں بیٹھتے ہی میں نے کیلا بگان کا۔ "ابا جب میاں نے اماری سے بنا اور تیز دھار والا لمبا چاقو مجھے دیا تھا، میں نے اُسے تہہ کر کے اُڑس لیا تھا۔ جمل کے گھر سے کیلا بگان کا فاصلہ زیادہ تھا۔ یکہ ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرتی ہوئی آخر کیلا بگان کے علاقے میں پہنچ گئی۔ چاندیاں جیسے لوگوں کا پتہ چائے خانوں، پان فروشوں یا حجام کی دکانوں سے اماں کے ساتھ چل جاتا ہے تین چار دکانوں پر پوچھ گچھ کے بعد مجھے اُس کے مکان تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ متوسط درجے کے فلیٹوں کا علاقہ تھا۔ کوئی عمارت بڑی تھی نہ کوئی چھوٹی، ایک ایک منزل کی عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ چاندیاں کا گھر نسبتہً پُرسکون جگہ واقع تھا۔ اچھا خاصا صاف ستھرا گلی کے کھلے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ اردگرد خاموشی اور بے نیازی طاری تھی۔ مجھے احساس تھا کہ چاندیاں اپنے پیشے کے لحاظ سے عام مکانوں سے ذرا مختلف مکان میں رہتا ہوگا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ گیٹ کے ساتھ چار فٹ اُونچی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے عمارت کے گرد ایک چکر لگایا۔ پیچھے کی گلی میں بھی ایک راستہ تھا۔ میری دستک پر مسنح چہرے کی ایک عورت نے دروازہ کھولا اور منہ بنا کے پوچھا۔ "کس کو مانگتا ہے؟"

"چاندیاں کو۔" میں نے تحمل سے جواب دیا۔

"چاندیاں کو۔" اُس نے پھر مجھے سر سے پیر تک تعجب سے دیکھا اور بولی۔ "وہ تو آج کل خالی بیٹھا ہے اُس کے پاس کیا کھانا ہے۔"

"مجھے اُس سے ملنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"کیا آپ باہر سے آیا؟" میرا لباس دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو دروازہ پٹ سے کھلا۔ "آؤ۔" میں نے تنگ آ کے جواب دیا۔ "لکھنؤ سے۔"

"کب آیا؟" وہ پُرشوق لہجے میں بولی۔

"کل رات آیا۔" میں نے تلملا کے کہا۔

اُس نے آنکھ ماری۔ "اندر آؤ۔" میں نے اُس سے دوبارہ چاندیاں کی موجودگی کے بارے میں پوچھا۔ وہ مجھے اندر لے گئی اور ایک آرائستہ کمرے میں بٹھا کے چند لمحوں بعد ایک گداز بدن کی ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لائی۔ عورت نے چور نظریں ڈالتی ہوئی آہستہ قدموں سے آگے بڑھی اور معنی خیز انداز میں بولی۔ "چاندیاں بھی اپنا عزیز ہے، ہم بھی تمھاری خاطر تواضع میں کمی نہیں کریں گے۔ جو کام تم کو چاندیاں سے لینا ہے وہ ہم سے کہہ کے دیکھو۔"

"مجھے چاندمیاں سے ملنا ہے۔" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مل لینا اُس سے بھی۔ یہاں بھی قدردان لوگ رہتے ہیں، ذرا چائے وغیرہ تو پی لو۔ ارے او چھوکرے! دو کپ چائے لاؤ۔"

"کیا چاندمیاں یہاں نہیں رہتا؟" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھالیا۔ "چاندمیاں کا مہمان اپنا مہمان ہے۔" وہ کھسک کے میرے قریب آگیا اور رازداری سے کہنے لگا کچھ لینے آئے ہو؟ میں نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مسکرانے لگا۔ "تو کچھ دینے آئے ہو؟"

اسی اثنا میں ایک نوجوان خوش شکل لڑکی اپنے حال سے بیگانہ ہانپتی ہوئی اندر آئی۔ "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں میں نے چائے کے لیے تمھیں آواز دی تھی، دیکھو، ایک مہمان آیا ہے، ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔" اُس نے تکلف سے کہا۔ لڑکی ناخن مُنہ میں لیے مجھے گھورتے کو دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ پھر عزت نے لاکھ مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میری سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔ میں نہیں رکا۔ میز سے چلتے چلتے دیکھنے لگا۔ "چاندمیاں سے بات نہ بنے تو یہ دروازہ کھلا ہے، میرا نام دینا ہے۔" میں پیر پٹختا ہوا باہر آگیا۔ وہ ساری عمارت چاندمیاں کے ہم پیشہ لوگوں سے آباد تھی۔ خوش قسمتی سے تیسرا دروازہ خود چاندمیاں نے کھولا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے سکتے میں رہ گیا۔ "تم؟" وہ رعشہ زدہ آواز میں بولا۔

"ہاں میں۔" میں نے بھرتی سے چاقو نکال کے کھردرا رنگا کر دیا۔

"تم کیوں آئے ہو؟" وہ گھگیا کے بولا۔

میں نے اُس کے مُنہ پر ایک مکا مارا۔ اُس کا سر فولاد سے لگتے لگتے بچا۔

"میں ایک پرانا حساب چکانے آیا ہوں۔" میں نے تھوک کر کہا۔

"کیسا حساب؟" اُس کی نظریں چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔

"پرانا حساب ہے۔"

"تمھیں غلطی ہوئی ہے مجھ سے، نسرین بیگم بھی کہہ رہی تھی کہ تم کسی سات سال پرانی بات کا ذکر کر رہے تھے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی اور تم بھی بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ بات تمھارے لیے پرانی ہے مگر میرے لیے بالکل نئی ہے۔ مجھے بتاؤ، وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"تم کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو؟ یہاں تو لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تمھیں سات سال پہلے کبھی دیکھا ہو۔" وہ اپنے بوکھلاہٹ و حواس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں تمھیں ساری بات یاد دلائے دیتا ہوں، اگر تمھیں آسانی سے یاد نہیں آیا تو یہ چاقو تمھارا حافظہ کریدنے کے تمھیں یاد دلانے لگے گا۔ میں تمھارے چہرے کبھی فراموش نہیں کر سکتا، یاد ہے تم نے اور اُس کمین کی بچی نسرین بی نے سات ساڑھے سات سال پہلے نسرین بیگم اور کریم گل سے سینما گھر میں ایک کم عمر لڑکی کا سودا کیا تھا۔ تمھارے، نسرین اور کریم گل کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سودا کس قیمت پر ہوا تھا۔ اب جہاں بھی آگئے تھے، ٹھیک تھا۔ ایک دروازہ عبور کر کے ہم ایک بڑے ہال میں آگئے۔ ہال کا درمیانی حصہ کھلا ہوا تھا، دائیں بائیں طرف ستونوں پر ایک بڑا پختہ سائبان بنا ہوا تھا اور اندر، سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے، جیسے ہندوؤں کی کوئی دھرم شالہ، سائبان کے اندر کونوں کے آگے اِدھر اُدھر چوکیاں پڑی تھیں اور دو تین لڑکیاں تاش کھیل رہی تھیں۔ درمیان میں ایک چوکی پر موٹا مجاور بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لڑکا اُس کی پنڈلیوں کی مالش کر رہا تھا، دوسرا کانسے سے بار بار پانی ڈال رہا تھا۔ وہ ایک دبلا اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اُس نے ایک لڑکے کو ہانک کر دوسرے کو پکڑ لانے کے لیے بھیجا اور پشت سیدھی کر کے مجھے برے برے دیکھنے لگا۔ "اُستاد جی! چاندمیاں نے اٹھتے ہوئے فریاد کی۔ "بیٹی کہاں ہے؟"

"کون بیٹی؟" مجاور نے کڑک کے پوچھا۔

"بیٹی، بیٹی، اپنا بیٹی، استاد!" چاندمیاں نے مظلوم انداز میں کہا۔

مجاور نے چند لمحے توقف کیا پھر اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے چمکنے لگے۔ "بیٹی۔ ہاں بیٹی۔ بیٹی کی تجھے کیا ضرورت پڑ گئی چاندمیاں؟ ہم سے بات کر۔"

"لاٹے کو بیٹی کی ضرورت ہے۔" چاندمیاں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہم جو یہاں بیٹھے ہیں، اِدھر آ کے بیٹھ۔"

"استاد بیٹی کا پتہ بتا دو، وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

مجاور نے اپنی دھوتی کی طرف اشارہ کر کے گالی دی اور کہنے لگا۔ "میں تو سمجھا تھا منجھل نے صبح صبح لڑکی بھیج دی ورنہ لاٹے اور منجھل سے تو شام کو بھینٹ ہوتی ہے۔"

"وہ نام بھی نہیں لے گی مجاور!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر وہ تو شام کو دیکھا جائے گا۔ ہم جو وقت بیتے ہیں اُس سے پہلے گل نے ہمارا تعاقب کیا مگر وہ ہمیں ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ میں نے تمھاری اور سچی بی کی جو مدد اک نظر میں دیکھ لی تھیں، تم نے شکست قبول نہیں کی اور ہمیں تلاش کرتے رہے اور آخر تم نے ہمارا سراغ لگا ہی لیا۔ اُس رات جب ہم تینوں مرلے کے کنارے سیر کے لیے گئے تھے تو تمھارے آدمیوں نے حملہ کر دیا۔ کچھ یاد آیا؟ یہ ایسا واقعہ نہیں ہے جو تم آسانی سے بھول سکو۔ اس میں ایک کانسٹیبل اور تمھارے دو آدمی مارے گئے تھے، باقی دو بدحواس اور تم باقی رہ گئے ہو۔ میں وہی قرعہ نکالنے آیا ہوں، افسوس ہے چاقو وہ نہیں مگر نیا ہے اور اس کی دھار بھی پہلے والے چاقو سے تیز ہے اور اب مجھے اسے برتنے کا فن بھی آتا ہے۔"

اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں، وہ خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ میں نے چاقو کی نوک اُس کی گردن پہ ٹکا دی۔ "چاندمیاں! میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تمھارے پیچھے بدحواس نہیں لگائے تھے۔"

"تمھارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں کریم گل کو ہلاک کر چکا ہوں، تم وہ آخری آدمی ہو جس کے پاس میں ہر طرح سے مطمئن ہو کے آیا ہوں۔ مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو، ورنہ اس طرح تمھاری جان چھوٹ جائے، بتا دو لڑکی مجھے صحیح و سلامت واپس مل گئی۔"

"لڑکی کہاں ہے، مجھے لڑکی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تمھاری قسم؟ چاندمیاں!" میں نے چاقو کی نوک اُس کے نرخرے میں چبھوئی۔ میں نہیں سننے آیا ہوں لڑکی کا پتہ بتا دو، باقی سب بکواس ہے۔"

"لڑکی۔ لڑکی نہیں ملی، لڑکی نہیں ملی تھی۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔

"لڑکی گئی کہاں؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"لڑکی۔ مجھے یاد آیا، بھروسے بتاتا ہوں جب دونوں آدمیوں نے کانسٹیبل کی سیٹیوں کی آواز سنی تو لڑکی کو چھوڑ کے بھاگ گئے اور رمو کی بڑے میاں کے پاس رہ گئی۔"

میری سانس رک گئی۔ کیا تم بھی اُن کے ساتھ تھے؟ اور کچھ بھی یاد کرو چاندمیاں! ذہن پر زور ڈالو۔" میں نے اُس کے پیٹ میں پوری طاقت سے گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ میرا دوسرا ہاتھ چاقو سمیت اُس کی گردن دبائے ہوئے تھا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔

"میں اُن کے ساتھ نہیں تھا لیکن انھوں نے مرنے کے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"سچ سچ بتاؤ چاندمیاں! جھوٹ کا نتیجہ بڑا ہوگا، ناک ہوگا۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی ماں۔۔۔" وہ ماں کی قسم کھانے والا تھا لیکن میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کے اُس کی زبان خشک ہو گئی۔

"ممکن ہے انھوں نے لڑکی تم سے چھپالی ہو؟"

"وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت لمحوں تک اُن کا پیچھا کیا تھا مگر ٹھیرو، ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو کیونکہ ایک آدمی نے کچھ دنوں بعد گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ وہ آگ آگ کے بولا۔

"یہ چال بازی کا وقت نہیں ہے۔" میں نے اپنے جوتے سے اُس کے پاؤں کی انگلیوں پر ضرب لگائی۔ وہ ایک ٹانگ اُٹھا کر دائیں پھینکے ہوئے تھا۔ "کون تھے وہ آدمی؟"

"وہ بہت معمولی آدمی تھے، کرائے کے آدمی۔"

"اُن کا تعلق کس گروہ سے تھا؟"

"کسی سے نہیں۔ وہ چار پانچ آدمیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ مگر ہاں ایک آدمی موٹا بمبار کے گروہ میں شامل ہے۔" اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"مجھے اُس کے پاس لے چلو، اگر بات صاف نہ ہوئی تو میں تم دونوں کو ایک ساتھ جہنم رسید کر دوں گا۔ جھوٹ اور فریب سے کام نہیں بنے گا چاندمیاں! تم مجھے نہیں جانتے۔ میں اس وقت تمھیں زندگی اُدھار دے رہا ہوں، چلو۔" میں نے اُس کی ناک پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ ناک سے خون بہنے لگا۔ چاندمیاں بُری طرح گھبرا گیا تھا۔

"میں وہاں جا کے کیا کروں گا۔" وہ تھرتھراتے ہوئے بولا۔

"تمھارے سامنے بات ہوگی چاندمیاں! آج کا دن تمھاری زندگی یا موت کا دن ہے۔ چلو۔" میں نے دروازے کی طرف اُسے دھکیلا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے پہنچا۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا۔ چاندمیاں کی حالت ایسی تھی کہ اُس کے لیے میرے ساتھ خاموشی سے چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے گھوڑے تانگوں پر لگائے تھے۔ وہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ نسیمی میں بیٹھ کے وہ میری خوشامد کرنے لگا۔ چاقو کی دھار وہ بارہ کھانے پروہ کہیں چبھ رہا۔

چاندمیاں میرے ساتھ تھا۔ کوچوان سے جدا کرنے والا شخص چاند میاں ہی تھے۔ وہ طبلچی اور سنہری رات گری اور تیرگی میں بدل دی تھی۔ اُس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں تھا جیسے جسم میں جنگل جل رہا تھا، میری آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ نسیمی کی رفتار سست تھی یا مجھے سست محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھوڑا تیز چلانے کا حکم دیا۔ چاندمیاں مجھے اُس شخص کے پاس لے جا رہا تھا جس نے کریم گل کے نازک ہاتھوں کو اذیت دینے کا جرم کیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ میں پہلے اُس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالوں گا کیونکہ وہ ہاتھ کو رابر مجھے تھے اور وہ آنکھیں نکال لوں گا جنھوں نے کوراپر بُری نگاہ ڈالی تھی۔ اگر اُسے کیا کا پتہ معلوم ہوا۔ اگر اُس نے بتا دیا کہ کورا کہاں ہے اگر اُس نے بتایا بھی تو وہ کوئی بھی جگہ نہیں ہوگی۔ میں تو وہاں جاتے جاتے راستے میں دم توڑ دوں گا۔ اسے کاش وہ انکار کر دے کہ وہ کورا اُن کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔

گاڑی تانگہ گلی کے ایک بڑے مکان کے سامنے رُک گئی۔ چاندمیاں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر میں نے نسیمی والے کو حکم دیا کہ وہ چلا جائے۔ نسیمی والا صورتِ حال بڑی حد تک سمجھ چکا تھا، خاموش رہا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں دو چار ایسے آدمی موجود تھے جن کے پیشے چہرہ پر لکھے ہوئے تھے۔ ایک سے مجھے آگے بڑھنے میں کچھ تامل ہوا کہ چاندمیاں مجھے کسی اور جگہ تو نہیں لے آیا لیکن اب میں ڈیوڑھی میں داخل ہو چکا تھا۔ چاندمیاں کو اندر بھیج کر اُس بدمعاش کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فرار کا اس سے اچھا موقع چاندمیاں کو پھر کب نصیب ہوتا۔ میں نے چاقو ہاتھ میں رکھ لیا۔ مختصر ڈیوڑھی میں تین چار آدمیوں نے درشت سے پوچھا اور حقارت سے زمین پر تھوک کے رہ گئے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور باز پرس کرتے مگر میرے ساتھ چاندمیاں تھا اور اس نے یقیناً کوئی اثر دیا تھا اسی لیے اُن کے ہماری طرف بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے جب ہم اُن کے کچھ اور قریب گئے تو وہ کچھ فاصلے کے ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے چاقو کھول لیا اور چاندمیاں کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اس کی پشت سے لگا دیا۔ چاقو کی نوک اب چاندمیاں کی نواسی غیر فطری حرکت کی تمنا نہ ہوتی، مکان منجھل کے مکان جیسا پیچیدہ نہ تھا مگر عمارت اور بہت میں اس سے کچھ کم بھی نہیں تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی میں نے آگے پیچھے، اوپر نیچے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن مجھے اپنی یہ جھجک نہیں ہو سکی میری نہیں تو مجھ سے کم، یہ اُس چاقو کی مزدور جسکی تھی جو میرے ہاتھ میں پھل رہا تھا۔ اب جہاں بھی آگئے تھے، ٹھیک تھا۔ ایک دروازہ عبور کر کے ہم ایک بڑے ہال میں آگئے۔ ہال کا درمیانی حصہ کھلا ہوا تھا، دائیں بائیں طرف ستونوں پر ایک بڑا پختہ سائبان بنا ہوا تھا اور اندر، سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے، جیسے ہندوؤں کی کوئی دھرم شالہ، سائبان کے اندر کونوں کے آگے اِدھر اُدھر چوکیاں پڑی تھیں اور دو تین لڑکیاں تاش کھیل رہی تھیں۔ درمیان میں ایک چوکی پر موٹا مجاور بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لڑکا اُس کی پنڈلیوں کی مالش کر رہا تھا، دوسرا کانسے سے بار بار پانی ڈال رہا تھا۔ وہ ایک دبلا اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اُس نے ایک لڑکے کو ہانک کر دوسرے کو پکڑ لانے کے لیے بھیجا اور پشت سیدھی کر کے مجھے برے برے دیکھنے لگا۔ "اُستاد جی! چاندمیاں نے اٹھتے ہوئے فریاد کی۔ "بیٹی کہاں ہے؟"

"کون بیٹی؟" مجاور نے کڑک کے پوچھا۔

"بیٹی، بیٹی، اپنا بیٹی استاد!" چاندمیاں نے مظلوم انداز میں کہا۔

مجاور نے چند لمحے توقف کیا پھر اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے چمکنے لگے۔ "بیٹی۔ ہاں بیٹی۔ بیٹی کی تجھے کیا ضرورت پڑ گئی چاندمیاں؟ ہم سے بات کر۔"

"لاٹے کو بیٹی کی ضرورت ہے۔" چاندمیاں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہم جو یہاں بیٹھے ہیں، اِدھر آ کے بیٹھ۔"

"استاد بیٹی کا پتہ بتا دو، وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

مجاور نے اپنی دھوتی کی طرف اشارہ کر کے گالی دی اور کہنے لگا۔ "میں تو سمجھا تھا منجھل نے صبح صبح لڑکی بھیج دی ورنہ لاٹے اور منجھل سے تو شام کو بھینٹ ہوتی ہے۔"

"وہ نام بھی نہیں لے گی مجاور!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر وہ تو شام کو دیکھا جائے گا۔ ہم جو وقت بیتے ہیں اُس سے پہلے

جتھیار اُٹھانا پاپ سمجھتے ہیں تمام تک لاڈلے سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تو بتا کیسے آیا؟ یہ بینی کا کیا معاملہ ہے؟ ذرا سمجھ میں آنے والی بات کر۔"

"استاد موہی لاڈلے کو بینی کی تلاش ہے۔"

"کیوں؟ لاڈلے کو ہمارے آدمی کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یہ اس کا اور لاڈلے کا پرانا معاملہ ہے۔" اس معاملے میں تم نہ بولو۔" چاند میاں نے مذمت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "بتا دو استاد! بینی کہاں ہے؟"

"ارے بینی بھی آجائے گا سالا! وہ کدھر جائے گا۔ لاڈلے اِدھر کے بیٹھے تو مجھل کا لاڈلا ہے تو اپنا بھی لاڈلا ہے۔"

"موجدار! اس بدمعاش کو میرے حوالے کر دو۔" غصے میں چاقو کی نوک چاند میاں کی کمر میں لگ گئی۔ وہ چیخ پڑا۔ پیچھے آنے والے آدمی درانتے پر کھڑے ہو گئے تھے جو کہیں پر تماش کھیلنے والے بھی سائبان میں کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے اپنے چاقو کھول لیے تھے۔

"یہاں تو سب بدمعاش ہیں لاڈلے! ذرا رسان سے بات کر۔" مجھل کا لاڈلا ہے۔ چاند میاں کو چھوڑ دے۔"

"چاند میاں کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک بینی کو سامنے نہ لایا جائے۔" میں نے کڑے لہجے میں کہا۔

"چھوڑ دے۔ میں بولتا ہوں اسے چھوڑ دے۔ جو بات کرنی ہے مجھ سے کر۔" موجدار نے اپنی آواز پُرسکون رکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا، پہلے بینی کو بلاؤ۔"

موجدار چوکی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آکے بولا۔ "میں پورا ماہی کھیل مت خراب کر تو جیسے آیا ہے اسی طرح تجھے عزت کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا۔ ہم تجھ سے یہاں کچھ نہیں کہیں گے ورنہ پھر مجھل کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"میں تمھارے پاس نہیں آیا، یہ حاضر مجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے۔ میں اسے لے جا رہا ہوں، معلوم ہوتا ہے تم بھی بینی کو نہیں جانتے ورنہ معاملہ اتنا نہ بڑھاتے۔"

"مگر چاند میاں ہمارے پاس کسی اُمید سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک جگہ آیا ہے اور ہمارا آدمی ہے ہم اسے تجھے کیسے واپس کر دیں؟"

"پھر تم کل رات لڑکی کو لینے ہمارے پاس کیوں آگئے تھے؟ تم جانتے تھے کہ اُسے مجھل نے پناہ دی ہے۔"

"وہ لڑکی ہمارے علاقے سے اُٹھائی گئی ہے، چاند میاں بھی ہمارا آدمی ہے۔ میں مجھل کے علاقے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جا تو ابھی بچوں سے پہلے مجھل سے پوچھ کہ بات کس طرح کی جاتی ہے۔ مجھل نے رات ضرور سوچا ہوگا اور تمام تک وہ لڑکی ہمارے حوالے کر دے گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "مجھل کبھی ایسا سنگ دل نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے آئی ہے اُسے جبراً نہیں اُٹھایا گیا۔"

"پر یہ تو شام کی بات ہے اس سے پہلے کوئی بات کر، اب کا نہیں۔"

"مجھے معلوم کرنا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بات کرنا ہے کا نہیں۔"

کہ چاند میاں اور بینی کو ضرور سزا دی جائے گی۔ ان کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔"

"میں چاند میاں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" میں نے چاقو چھوتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ "چل آگے بڑھ۔" چاند میاں کرب ناک انداز میں چیخنے لگا۔

"تو اسے نہیں لے جا سکتا۔" موجدار نے غصے سے کہا اور اپنا ہاتھ اُوپر کیا۔ اچانک ایک جانب سے اُس کی سمت چاقو پھینکا گیا۔ اُس نے مہارت سے اپنے ہاتھ میں اُس کا قبضہ لے لیا اور اُسے بار بار فضا میں اُچھال کے اُس کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "چھوڑ دے۔"

"تم اسے زندہ حاصل نہیں کر سکتے۔" میں نے بچھڑتی سے چاقو چاند میاں کے سینے پر تان لیا۔ "یہ تمھارا آدمی ہو یا کسی اور کا، اب میرے قبضے میں ہے، میں اسے مارنا نہیں چاہتا لیکن تم نے اگر ضد کی تو میں اسے وقت سے پہلے ختم کر دوں گا۔"

"اوئے پیچھے!" موجدار نے بھڑک کے کہا۔ "تو یہاں سے زندہ بچ کے نہیں جانا چاہتا۔ میں تجھے سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔"

"اوئے پیچھے تم ہو موجدار! میں یہاں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کے آیا ہوں جان کی پروا تم جیسے لوگ کرتے ہیں۔ مجھے جانے دو اور دو منٹ جاؤ۔ زیادہ دیر چاقو کھلا رکھو گے تو اسے زنگ لگ جائے گا۔"

"تو سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ میں موجدار ہوں، گلگت میں کون ہے جو موجدار کا نام نہیں جانتا؟"

"میرا اصل نام بھی تمھیں معلوم نہیں ہے اور میرے سینے میں جو آگ لگی ہے وہ تمھاری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں موجدار! مجھے پہچاننے کی کوشش کر، تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو، وقت سے پہلے تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ تمام کو تم لڑکی حاصل کر سکتے ہو نہ چاند میاں کو یہاں روک سکتے ہو اگر یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو میں اسے دہرا سکتا ہوں۔"

موجدار کا پارہ غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اپنا چاقو چاند میاں کے سینے میں اُتار دیا۔ چاند میاں نے ایک فلک شگاف لرزہ خیز چیخ ماری اُس کا جسم تڑپا، پھڑکا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اُسے موجدار کی طرف پھینک دیا۔ موجدار کے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر حیرت چھا گئی تھی، رہ سکتے میں رہ گیا۔ پورے مکان میں چاند میاں کی دم توڑتی ہوئی کراہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر موجدار کے آدمیوں نے چیخ کر اپنا گھیرا تنگ کر دیا۔ "ہٹ جاؤ استاد! ہم اس سے سمجھ لیتے ہیں۔"

ایک طویل قامت شخص آگے آیا، اُس کی ناک اور نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھ کے نیچے بھی چاقو کا ایک گہرا نشان تھا جس نے اُس کی شکل ہیبت ناک کر دی تھی۔

"اے سنجالو موجدار!" اس نے سرد آواز میں کہا۔

موجدار کو کچھ ہوش آیا۔ اُس نے تیزی سے آنکھیں پٹ پٹائیں اور اپنے آدمیوں کو دور ہٹنے کا اشارہ کیا۔ میں خود اس سے نمٹوں گا۔"

جو حکم نے ہاتھ اُٹھایا۔ "دور کھڑے رہو۔ تم اس پر کوئی نشان ڈال دو گے اور مجھے مجھل کے سامنے شرمندہ کرو گے۔" ہاں لاڈلے! ہتھیار ڈالنا ہے یا مرنے پر تیار ہے؟"

"موجدار! تم نے ابھی اس کا ہنر دیکھا ہے اور پھر تکرار کی حماقت کر رہے ہو۔ جھگڑتے کیوں ہو، ہاتھ اُٹھاؤ۔"

موجدار نے پھر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ پہلے میں وار کروں۔ ایک طرف چاند میاں کی لاش پڑی تھی۔ اُس نے ٹھوکر سے اُسے چند قدم دُور کر دیا۔ اُس کے آدمی لاش کھینچ کے سائبان میں لے گئے۔ فرشِ خون آلود ہو چکا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا کھڑا تھا۔ جب موجدار نے نعرہ لگا کے میری پسلی میں چاقو اتارنا چاہا تو میں اُس کا مہلک بھالپ کے فوراً زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ فضا میں لہرا گیا۔ میں نے حیرت انگیز پھرتی سے بھی ٹھوکر اُس کی ٹانگ میں بیٹھے بیٹھے فرش پر لوٹ گیا اور اسی سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ موجدار میرے سر پر پہنچ گیا۔ جب اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے اُس کی ٹانگ میں چاقو مار دیا۔ وہ بس ایک ثانیے کے لیے ٹھٹکا، ڈگمگایا۔ چاقو اُس کی ٹانگ میں ٹھیک سے پیوست نہیں ہوا تھا۔ اُس نے برق رفتاری سے جھک کے میری گردن پر وار کر دیا۔ چاقو میرے شانے کا گوشت کاٹتا ہوا گزر گیا۔ شانے میں درد کی ایک شدید لہر اُبھری۔ میری آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ سی آگئی۔ میں نے اپنی بینائی بحال رکھنے کے لیے سر جھٹکا۔ موجدار کا خیال ہوگا کہ ضرب شدید لگی ہے۔ اُس نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایک ہی وار میں میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن میں اس مختصر ترین عرصے میں پیچھے ہٹ کے ایک زقند میں کھڑا ہو چکا تھا۔ موجدار نے اپنی جگہ پھر کے پھر ایک بار مجھے چاقو پھینکنے کا حکم دیا۔ خود اُس کی ٹانگ سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے وار کرنے کے لیے پر تولے۔ موجدار کے جوش کا کوئی حد نہیں رہا تھا۔

ہم دونوں کھلی جگہ پر حرکت کرتے ہوئے ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ اُس کی ٹانگ سے خون رِس رہا تھا اور میرے شانے سے خون بہتا ہوا پیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے نت نئے پینترے بدل کے مجھ پر وار کیے اور میں نے مجھل کے تعلیم کیے ہوئے تمام بچنے آرٹ لے۔ دیر تک ہم دونوں کے تمام وار خالی جاتے رہے دونوں محتاط ہو گئے تھے۔ موجدار کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا مقابل کون ہے۔ کیا ہوا جو میرے جسم کی چادر پر اُس کے مقابلے کے گہرے داغ دھبے نہیں تھے۔ موجدار کے دل میں کوار انہیں بیٹھی تھی جو اُس کی طرف تیز بھری نظروں سے دیکھتی۔ موجدار کا سینہ خالی تھا مگر اُس نے کوئی یاد نہیں آباد کر رکھ

اور آخری وقت میں اُسے ایک نیکی کا خیال آگیا ہے۔ اُس کا لرزتا ہوا ہاتھ میری کمر کی جانب اٹھا اور اس نے میرا کرتا پکڑنے کی کوشش کی تو جمّل کالا ڈلا ہے۔" اس نے کراہ کر کہا کیونکہ ہی اُس کی گردن ڈھلک گئی۔

موجدار کے آدمی اُس کی لاش پر جھکے ایک ناقابلِ بیان کیفیت سے دوچار تھے۔

"اپنے ہتھیار ڈال دو۔" جمّل کی آواز نے انھیں چونکا یا۔

آن سب کا رُخ ایک آن میں جمّل اور اُس کے ساتھیوں کی طرف ہوگیا۔ کانتے شوٹل اور لالا نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ وہ اپنی آستینوں سے میرا پسینہ اور خون پونچھ رہے تھے۔ "ابھی ہم زندہ ہیں استاد جمّل! موجدار مر گیا مگر اُس کا نام لینے والے ابھی زندہ ہیں۔" وہ مونچھوں والا موجدار مرگیا مگر اُس کا نام لینے والے ابھی زندہ ہیں۔

اور آخری وقت میں یہ اُلٹا تھا؟ یہ بیٹھے بٹھائے تناسخ کی کیا سوجھ گئی تھی؟

میری کمر کی جانب نصیب میاں! اپنا مقدس ہی کھڑا ہے، میری آواز بھرا نے کا لاڈلا ہے۔" آنکھ بھر کایا۔ نصیب میاں بے قرار ہو گیا اور میری بلائیں لینے لگا۔

"لاڈلے میاں! اے سبحان اللہ! تمہارا جیسا عقیدہ بتاتے ہیں بھی نادر ہیں جیل میں برسے تو کسی نواب زادے کی طرح۔ واپس آئے تو پرچائی کے لیے ایک پلٹن موجود۔ وجاہت یہ کہ کسی کی طرف ایک بھرپور نظر دیکھ لیا تو خاک کر دیا۔ رنگ گلنار، چہرہ کتابی، لب گلابی، گفتار میں دم خم، چال میں بدیہ سینہ لڑوں کا دل شیروں کا۔ آتے ہی اِدھر اُدھر نظر کی تو ایک ہی واری اِدھر ماہ جبیں کو اسیر کیا، اُدھر ایک طلعت کو اپنے زندانِ اُلفت میں گرفتار کیا، ہتھیار ہاتھ میں لیا تو بجلی دو ڈادی تڑپ بڑھایا تو زلزلے آ گئے۔ لاڈلے میاں! یہ موجہار کا معاملہ نکلے میں کسی زنانے سے کم نہیں اور پھر تم مقدر کر کیوں؟....."

کلانتے نے گرج کے نصیب میاں کی زبان روکی۔ "بد نصیب میاں! تمہیں تو کسی کرمے پر ہونا چاہیے تھا، کہو تو لاتوں سے بات کریں؟"

"ہے کلانتے!" نصیب میاں سینے پر ہاتھ رکھے بولا۔ "کر بھلا ہی تو آباد کیا تھا کہ یہ برباد ہی سہی۔ کلانتے صاحب! یہ گھن گرج کسی اور کو دکھانا، کسی خیال میں مت رہنا۔ بخدا جو تمہیں اب بھی آتا، وہ ہم نے پہچان میں بیکھ لیا تھا، تشریف چاقو، لٹھ، تیر، تفنگ، شہد، دسی، مذر، دسی سب ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن ایک تیز نگاہ نے ڈھال کر سینے میں دل بھی لیے پھرتے تھے جو بدقسمتی سے تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ کلانتے میاں! سوچ سمجھ کے بات کیا کرو کہ کس سے مخاطب ہو اور کون سامنے موجود ہے۔"

"چپ رہو۔" کلانتے نے ڈپٹ کر کہا۔ "کچھ خیال بھی نہیں، کہ لاڈلا تھا کا ہوا ہے خون بھی کافی نکلا ہے، اُسے آنکھیں بند کر کے ایک دن استراحت لینا چاہیے، بس لٹھے پر تضحیک چل رہی ہے۔"

"پہلے سے یہی کہیں کہیں ہیں ٹوکا۔ آدمی تم بھی ہماری صحبت میں رہ کے ترقی کے بہتے جا رہے ہو کلانتے یار!" وہ کسی قدر خفت سے بولا۔ "اب ہماری زبان پر قفل لگ جائے گا۔ ہم نے اپنے ہونٹ سی لیے مگر ایک بات ضرور پوچھیں گے ورنہ ہمیں بے کلی رہے گی، اُدھر تو سب کام حسبِ منشا ہوا ہے؟"

"اب استاد خود گیا ہے تو سب ٹھیک ہی ہو جائے گا۔" کلانتے نے نصیب میاں کو آنکھ ماری، اُس کی یہ حرکت میں نے دیکھ لی پھر نصیب میاں نے اپنی تیزی و طراری برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی مگر جو لمحہ اپنے چہرے پر ٹھہرتی ہوئی یکسر نہ چھپا سکا۔ باہر کے آدمیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کلانتے بار بار اُٹھ کے اُن سے ملنے جاتا اور تھوڑی دیر بعد لوٹ کے واپس آ جاتا۔ میں نے اُن دونوں سے ایک بار کہا بھی کہ وہ مجھے کرے میں تنہا چھوڑ دیں اور میرے لیے اتنی زحمت نہ کریں مگر وہ نہیں ٹلے بلکہ کچھ اور ہم کے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں اور وہ جس کشمکش میں مبتلا تھے، میں اُسے بخوبی سمجھ رہا تھا۔

جب جھل نے گھوشی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اُسے فرش صاف کرنے اور موجہار اور چاند میاں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا تو سیرے ذہن میں ایسے کسی خدشے نے سر نہیں اُٹھایا تھا جس سے اب میں دوچار تھا۔ یہ لوگ نہ جانے درمیان میں کیوں آ گئے۔ مجھ پر جو کچھ بھی گزرتی، وہ گوارا تھا۔ جھل نے مرتے مرتے بچنے کے لیے جو پینترا بدلا تھا، اُس کا مجھے بالکل بھی گمان نہیں تھا۔ یقیناً کلانتے نصیب میاں، موتی، جھل اور اُس کے دوسرے آدمیوں کو تشویش ہو گی کہ موجہار اور چاند میاں کی لاشیں کہاں چھپائی جائیں اور لاشیں چھپانے کا مرحلہ جو خیر خیریت سے نمٹ ہی گیا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی مخبری نہیں کرے گا۔ موجہار کا گروہ خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا اور لازم نہیں تھا کہ اُس کا ہر آدمی بے چین چرواہے جھل کے حکم کی تعمیل کرے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی لمحے برہم ہو کے ساری روداد پولیس کے گوش گزار کر سکتا تھا۔ چاہے وہ آدمی جھل اور اُس کے آدمیوں کی نظروں میں کتنا ہی معتوب و مطعون قرار پاتا، یہ بعد کی بات تھی اُس وقت ایک آدمی پولیس کی توجہ موجہار اور چاند میاں کی گم شدگی پر مبذول کرا چکا ہوگا اگر پھر جھل کے بیچے ہوئے اعتماد کی مضبوطی موجود بھی مگر وہ موتی کو لے کے اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا، اس سلسلے میں صرف سوچنے اور گھٹنے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ چاند میاں کی موت کا تو مجھے دلی موجہار تھا، میں اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ موجہار نے خواہ مخواہ ضد کر کے اُس کھیسے میں جا تو پیوست کرا دیا اور پھر مجھے موجہار سے بھی کوئی سیر نہیں تھا، اُس نے خود ہی جا تو قبول کیا تھا۔

وہ آدمی جب ایک دوسرے پر چاقو لیں تو اُن میں سے کسی ایک کا یہ انجام تو ہوتا ہی ہے۔ وہ نہ مرتا تو میں مر جاتا۔ موجہار نے خود مجھے دعوت دی تھی اور کہی اس واقعے کے گواہ تھے۔ پہلا رخم کھانے کے بعد موجہار اپنی گدی پر بیٹھ جاتا تو بات آئی گئی ہو جاتی۔ چاند میاں مجھے فریب دے کے اُس کے واقعے لے گیا تھا، اُس کے پاس جانے سے پہلے میرے ذہن کے کسی گوشے میں ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ میں نے اُس کا علاج ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ میری غلطی صرف اتنی تھی کہ میں نے موجہار کے حکم پر چاند میاں کو آزاد نہیں کیا اور واپس نہیں آیا لیکن اگر مجھے یہ غلطی نہ بھی کرنا ہوتی تو میں کبھی آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور میرا مر کر کے سامنے کبھی نہیں اٹھ سکتا تھا، پھر مجھے کرا کی اُمید ترک کرنی پڑتی اور صرف اپنے آپ سے تعلق رکھنا پڑتا۔

ساری باتیں صاف تھیں کسی کی لب کشائی کی گنجائش نہیں تھی، موجہار کے آدمیوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا، استعمل ہونے کے بجائے فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ یہ عدالت خود اُن کے اُستاد نے لگائی تھی۔ جھل کو اُس وقت بھی اطمینان حاصل تھا جو ایک شخص کو اس صورتِ حال میں ہونا چاہیے مگر بعد میں کرن کی سی تیزی اس پر غالب آ گئی کہ اُس کا اطمینان منتشر ہو گیا۔ جھل کریہ آنکھ موچیاں دیکھتے ہی ایک زناٹے دار تھپڑ گیا تھا۔ موجہار کے گروہ میں ہر قسم کے آدمی موجود تھے۔ کلانتے گورے چھوٹے لمبے چوڑے مختلف تھے، سب کا طرف بھی مختلف ہو گا۔ دو ہی مرے تھے اور ایک نے انھیں مارا تھا۔ جھل کے ذہن میں گرہ لگ گئی ہو گی۔ جب یہ موجہار اور چاند میاں کا نام و نشان تک مٹ جاتا، اُس وقت تک ہر قسم کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا، موجہار کے جو دوسرے جاں نثار موقع پر موجود نہیں تھے ضروری نہیں تھا کہ وہ بھی یہی فیصلہ قبول کرتے جو وہاں موجود لوگوں نے کیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی آدمی اپنے اُستاد موجہار کی موت سے وفاداری نبھانے کے ایثار میں بہ عناد اور مبدھا قدیمہ اور شکل بنا سکتا تھا۔ میں اس قدر سوچ رہا تھا، جھل کی پریشانیوں کا احساس ہوتا جا رہا تھا اور میں کوئی واضح بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسے معاملوں میں حلمات عمراً کیا شیوع اختیار کرتے ہیں۔ میں بے بدل ترتیب ہی اخذ کر سکتا تھا۔ کلانتے اور نصیب میاں نے اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ میں اُن کا تذبذب اور اُن کے چہروں پر بتدریج بڑھتا ہوا اضطراب انسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ کاش میں رذیل کوسنے کے کہیں اور نکل جاتا اور کاش کسی اللہ وقت جھل میرے پاس آ جاتا۔ مجھ ایک شخص کے اُلجھے ہوئے مسئلے سے کتنے لوگ متاثر ہو رہے تھے جب کہ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ کرا کا فساد عام کرتا پھروں۔ میں نے اُسے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ اب بھی کوئی اُس کا نام نہیں جانتا تھا، نصیب میاں اور کلانتے پر مخبری چھائی ہوئی تھیں، چند ثانیوں کے لیے میں بھی اُن کی اس کیفیت سے متاثر ہوا لیکن پھر میرا ذہن کرا کے خیال سے قوی ہوتا گیا اور میں نے طے کیا اگر جھل پر کوئی آنچ آئی یا کسی کم ظرف نے موجہار کی موت کا اُس طرح تسلیم کی جس طرح خود اُس نے کی تھی تو میں موجود ہی رہوں گا۔ میں کہاں بھاگا جا رہا تھا۔ میں جھل کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ کہیں شام ڈھلے جھل واپس آیا۔ اب اُس کی طرف جوڑ پڑے۔ موتی مشعل لالا، گھوشی اور موجہار کے کئی دوسرے آدمی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ جھل کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے گلے لگایا۔ میرا حال پوچھا اور نصیب میاں کو گرویدہ کر دینے والا کھانا تیار کرنے کا انتظام کرنے اور سنا کہ بھی آدمی بھیج کے کنجروں کو بلانے کا اعلان پر سب پٹاخے چھوٹنے لگے۔ "استاد! آج تو دیوں میں تیل کی بجائے میں گھی ڈلوا کر دوں گا۔ سب کے کھانے کا انتظام کرو۔ ہم لوگ آج ترکھ دھرم دھڑکا ہو جانا چاہیے۔" گھوشی نے چہکتے ہوئے کہا۔

"کیوں گھوشی! تیری کیا منشا ہے؟" جھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب ان لوگوں کا بھی کچھ خیال کرو، تنکا چھوڑو۔"

"نہیں استاد!" گھوشی نے نیاز مندانہ کہا۔ "مجھے کوئی تکرار نہیں ہے۔ میں ان لوگوں کی خوشی میں پوری طرح شریک ہوں۔ رات بھر کے ہی ساتھی ہیں۔"

"پاجی کہیں کا!" موتی نے گھوشی کی کمر پر زور کا گھونسا مارتے ہوئے کہا اور پھر جھل سے بولا۔ "کیوں جھل! کیا تیرا دل لالا کھل گیا ہے؟ ننگ، ننگ، گھڑا لگوا دے۔ اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔ ناچ میں کیا خاک مزہ آئے گا۔"

"گھوڑے میں کیا مزہ دیکھا ہے موتی!" اگودی سے ایک نہر کی دلالی میم آئی ہے، مجرا کرتی ہے، کسی کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" موتی ناراضی سے بولا۔ "آج ہی تو دن آیا ہے سال کچھ عجیب ہلکا پھلکا سا بھی تھا۔ میں نے تو آسنسول میں اگتالے تین چار گھوڑے اتار دیا تھا، تمہاری قسم آپ بھی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا جیسے سب گھنے ہو گا مرگٹ ہیں ہنسے گے۔"

"کل تو اکتشر جما تھا استاد موتی!" نصیب میاں نے ہاتھ نچا کے کہا۔

سادو نواب صاحب! کیا ایسا سوکھا ہی تر خانو گے؟ ہاں آئے ہیں تو خاطر کیا تم بھی انھی جیسے ہو گئے نصیب میاں! الگا دو چٹائی۔" تو از رنگ میں بولا۔

"آج بہتے دے موتی! بات مانا کر۔" جھل نے آگے بڑھ کے کہا۔

موتی جز بز ہوا لیکن جھل کی بات مان گیا۔ وہ سب ایک بڑے کمرے میں لگنے اور بات بات پر قہقہے لگانے لگے۔ جھل نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ وہ بہر کیف اُن لوگوں نے شائبہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ نصیب میاں لالے نے بڑی گرمجوشی دکھایا کہ وہ گھنٹے کے انداز کا کھانا فراہم ہو گیا۔ رات کے اس کمرے میں آگ دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ جھل کے سامنے لکڑے بڑے طشت میں بھانی کے بھنے ہوئے پھولوں کے ہاروں کا انبار لگ گیا تھا۔ جو آتا اس سے پہلے جھل کے ہاتھ چومتا، پھر ماتھا پیش کرتا۔ اُس کے گلے میں ہار ڈال کے میرے پاس آتا اور اسی طرح ہار ڈالتا، میری پیشانی چومتا۔ جھل نے بہت سے ہار دوسروں کے گلوں میں ڈال دیے تھے۔ میں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ کھانا کھانے کے بعد کوئی رات کے دس بجے موتی نے جھل کو اُٹھایا۔ جھل کچھ آمادہ معلوم نہیں ہوتا تھا مگر موتی کے اصرار پر گھڑے باہر نکل آیا۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ کلی ٹم ٹموں کی گنبدوں سے گونجنے لگی۔ جھل نے چند آدمیوں کو اگلے پڑاؤ پر بھیجنے کی ہدایت کی اور ٹم ٹم میں سوار ہو گیا۔ اُس کے دائیں بائیں بائیں طرف موتی بیٹھا تھا سامنے کی سیٹ پر گھوشی اور کلانتے تھے۔ ہماری ٹم ٹم کے پیچھے کئی ٹم ٹمیں چل رہی تھیں۔ وہ جس راستے سے گزرتیں، باہر میں شور مچ جاتا۔ موتی جھل کی کمر سے اپنا ہاتھ گزار کے بار بار میری کمر میں گدگدیاں کرتا تھا۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر سخت بار مسکرانا پڑتا تھا۔

ایک جگہ چڑھائی پر جا کے یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ سب لوگ سڑکوں سے اُتر کے ایک جگہ اکٹھے ہوئے پھر منتشر ہو گئے۔ اُن کی باتوں سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ ناچ گانا سننے کی جگہ آئے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے اس جگہ کے متعلق سنا ہی نہیں تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی باہر ہیم طبلوں اور گھنگروؤں کی آواز نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم پانچ آدمی، کلانتے، گھوشی، موتی اور جھل ایک ساتھ چل رہے تھے، دوسرے لوگ ہم سے کچھ فاصلے پر مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ گلی عام گلیوں سے تقریباً مختلف تھی۔ یہاں گھومنے ٹہلنے والے لوگ بھی عام آدمیوں سے کچھ مختلف معلوم ہو رہے تھے۔ میری نگاہوں میں کن سنا ہٹ سی بننے لگی۔ جدھر نظر پڑتی، وہاں روشنیوں میں چمکتی دمکتی رنگیاں دکھائی دیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کی جھنجھناہٹ اور سرسراہٹ پر تالے آگ آئے ہوں۔ گلی میں جھل داخل ہوا تو لوگ دس دس قدم پیچھے ہٹ گئے یا آگے بڑھ کے، شوخ قسم کی جیسے کسی نے لگام کھینچ لی ہو، رنگ رنگ کی مرگڑیاں بنے لگیں۔ وہ اگیر اپنی نگاہوں سے جھل کو دیکھتے، کبھی کبھی ایک دوسرے کو اشارے کرتے اور مٹ جاتے۔ جھل کا سینہ کچھ آگے نکل آیا تھا اور چلتے ہوئے اُس کی مونچھوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ یہی حال کلانتے، موتی اور گھوشی کا بھی تھا۔ گلی میں ہنوڑ، ڈگی، فروش اور بجانے والوں کی صدائیں گونج رہی تھیں مگر اب ہر ایک اپنا کام دو بار چند لمحوں کے لیے معطل کر دیتا تھا۔ کوئی دوکان سے اُٹھ کر جھاگا ہوا آتا اور جھل کے گلے لگ جاتا، کوئی دور سے سلام کر کے رہ جاتا۔ ان لوگوں

نے بیڑے بنا بنا کے مشتری میں جھل کر پیش کیے۔ ایک بیڑا میں نے بھی کھایا۔ پھر منہ میں عطر گھول گیا۔ ہر جائے والے نے اصرار کیا کہ جھل اُس کی دکان پر ایک پان ضرور کھائے۔ ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ جھل اُس کی دکان پر ایک لمحے کے لیے ہی سہی مگر ٹھیرے ضرور۔ جھل ایک ایک شخص سے اُن کے سلام کا جواب دیتا اور اُن کی صلاحوں پر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ جب ہم گلی کے نکڑ سے گزرتے ہوئے دوسری گلی میں داخل ہوئے تو بے شمار سفید کرتے اور دو ٹوپی والے ایک ٹیلے پتلے پتلے ہوا ڈی سے ہمارا راستہ روک لیا۔ تین فرشی سلام کیے اور کہنے لگا۔ ایسے نہیں جانے گا راستہ ہم نے بند کر دیا ہے۔ ہماری لاش سے گزر کے آگے جائیے گا۔"

جھل نے اُسے سینے سے لگایا اور پھر بار جھل کے مبتلا۔ چھٹن صاحب! یہاں سلام کیے بغیر کون آگے جانے کی ہمت کر سکتا ہے ہم تو تھمی کر دیکھنے کے لیے ادھر آئے تھے، تمھارے ہاتھ کا پان کھائے ہوئے دن ہو گئے۔"

چھٹن پنواڑی آدھا جھک گیا۔ ابھی پیش کرتا ہوں۔ پیر سرکار نے قدم رنجہ تو فرمایا۔ گلی ویران ہو گئی تھی۔ اتنے دنوں عاشقوں کو کیوں ترسایا اور وہ بڑے نواب صاحب کہاں ہیں؟ نواب نصیب میاں؟"

"نصیب میاں کو آج ہم نے سزا دے دی۔"

"کیسی سزا؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "اللہ غارم کو نصیب نہیں آتا۔"

"چھٹن صاحب ہیں آگے بھی جانا ہے۔" جل نے کہا۔

"یہ لیجیے وہ آیا ہی چاہتا ہے۔" چھٹن نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا سنہرا خاص دان دونوں ہاتھوں سے پکڑے ادب سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ چھٹن نے خاص دان اس کے ہاتھ سے لے کر ڈھکنا کھولا۔ لڑکے نے مشتری آگے کر دی۔ چھٹن کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی اس لیے خاص قسم کے بیڑے تیار تھے۔ چھٹن نے سب کو اپنے ہاتھ سے بیڑے کھلائے۔ موتی نے اس کی انگلی کاٹ لی۔ چھٹن کھل کھلانے لگا۔ "واللہ کیا مذاق پایا ہے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ پان کھلانے کے بعد اس نے عطر کی شیشی کھولی اور ہمارے لباسوں پر توجہ سے مل بھر ایک ایک پھلیل شیشی میں ڈال کے ہمارے کانوں میں انکاری انداز کہنے لگا۔ "اب اگر اتنے دنوں میں آئیے گا تو میں ناراض سمجھیے گا۔ وعدہ کیجیے کہ جلد آئیں گے؟"

"آئیں گے جلد ہی آئیں گے چھٹن صاحب۔" جھل نے آگے بڑھنا چاہا تو چھٹن نے دوزانو ہو کے اس کا گھٹنا چھو لیا۔

"نا۔ بس ایک لمحے اور۔ بھلا لاڈلے میاں یہیں بار بار دھرا ہیں اور عرف گلوری سے سنوتی کر کے آگے بڑھ جائیں؟" اس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے میرا نام کس طرح معلوم ہوا اور نام معلوم تھا تو اس نے مجھے پہچان کیسے لیا! میں تو پہلی بار یہاں آیا تھا اور جھل کے پاس آئے ہوئے مجھے ابھی ایک ہی دن ہوا تھا۔ چھٹن نے عطر کی ایک شیشی مجھے پیش کی۔ جھل نے مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ مجھے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں نہ جانے کتنے لوگوں نے جھل سے اصرار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔ ان میں خوبرو تیں بھی شامل تھیں۔ جھل نے سب کے اصرار مسترد کر دیے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ نہیں ٹھیر رہی تھیں۔ چھتوں پر چوکیوں پر بالکونیوں پر لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ انھوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے جیسے آج گلی میں کوئی بہت بڑی شادی ہو رہی ہو۔ کچھ آگے جا کے موتی نے جھل کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور سنہ بگاڑ کے بولا۔ "کیا یہاں صرف بیڑے کھانے اور بار پہننے آیا ہے؟ اب چل کے کہیں بیٹھ۔ وقت گزر جا رہا ہے۔"

"ذرا دیر ٹھیر۔" جھل نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیا بات ہے جھل (تیرا) جی آج کچھ خراب معلوم ہوتا ہے؟" موتی حیرت سے بولا۔ "تو تو آج کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ ایسا کر موتی ذرا چل کے کہیں بیٹھ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" جھل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"کس دن کا بدلہ لے رہا ہے یار؟" موتی نے ہونٹ بسکیڑ لیے۔

"کیا بکواس کرتا ہے موتی! کہہ جو دیا۔ میں ابھی آیا۔ چل اب مت بتا آگے بڑھ۔" جھل نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"اُف ہے موتی پر جو تیرے بغیر جائے۔" موتی گرج کے بولا۔ "تجھے معلوم ہے جھل! میں یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں۔ اتنی بھی پرانی جان پہچان ہے۔ تیری سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"میں جانتا ہوں تو پہلے بھی یہیں رہا تھا۔" جھل نے اُس کے بال بکھیرے۔

"وہ اذیت بات پر جھل جاتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا تو سنسل میں اٹھا چلا آتا ہے یا گھاس کھڑا ہے گھاٹا ہے ابھی تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ ایسے بات سمجھتا نہیں، بک بک کیے جاتا ہے۔"

"ہاں ہاں میرے تو دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ تو اپنی بات کر مجھے گنتا ہے تیرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔ تو تو بوڑھا ہو گیا ہے۔ اپنا دماغ ہلا لے، ہم سے صاف صاف بات کیا کر۔ میرے بھیرے نہ کر۔"

"آؤ استاد! سنتا ہے کہ کریمن حیدرآباد سے بڑا مال دولت لے کے واپس آئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پری بھی لائی ہے۔ ہر جگہ اُس کی دھوم ہے۔" کلانتے نے خوشامد کی۔ "دیکھ گے تو تڑپ جاؤ گے۔ جب سے آئی ہے سیٹھوں اور ساہوکاروں نے ادھر ہی بتا بول دیا ہے۔"

جھل بادل ناخواستہ ایک پتلی سی گلی میں مڑنے کے لیے تیار ہوا۔ بادل اچانک ایک خیال سے لرزنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے جھرجھری آگئی اور میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ جھل اپنے خیال میں گم ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میرا ہاتھ ابھی کسی کے ہاتھ میں تھا۔ میرے بھیرنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ کو رکاوٹ پیش آئی۔ اُس نے پلٹ کے میری جانب دیکھا۔ میں گنگ کھڑا تھا۔ "لاڈلے!" اس نے مجھے کھینچ لیا۔

"رُک کیوں گیا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔

"کیا کچھ تکلیف ہو رہی ہے؟ زخم کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے جیتی دکھانے کی کوشش کی۔

"اس حلقے میں مُر جھکا کے نہیں چلتے، ذرا گردن تو ٹھیک طرح جسم پر رکھ، لوگ کیا کہیں گے، جھل کا لاڈلا تمیز نہیں ہے۔"

"میں بہت خوش ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اور آگے تیرے دل کی کلیاں کھل جائیں گی۔" کلانتے نے نیلی آواز میں کہا۔

"استاد! لاڈلے کے سامنے تو ہم سب کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔"

"جانی۔" موتی نے مجھے جھل کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "میں تو ابھی تجھ سے پوری طرح ملا بھی نہیں۔" وہ مجھے سڑک ہی پر چرکا لگانے بڑھے لا۔ تیرے لیے میں منتظر رہتا تھا۔ جھل نے مرے ایک سچ بولا ہے اور وہ تیرے بارے میں۔ میں مجھے اپنے ساتھ کنسول لے جاؤں گا۔" وہ اشتیاق سے کہتا رہا۔ "اور پھر جھل کو ٹھینگا دکھا دیں گے۔ کچھ داؤ میرے پاس ایسے ہیں کہ جھل کو بھی نہیں معلوم۔ ایمان سے شہر تو وہ چھوڑا ہے بگڑوں کے پڑے لوگ رہتے ہیں۔"

جھل نے کچھ نہیں کہا۔ کلانتے اور گھوشی، موتی کی باتوں پر بُری طرح ہنستے ہوئے ہم ایک سرائے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ پھر یوں سے روشنی دل ہی دل میں دعائیں سے رسیقی ٹپک رہی تھی۔ ایک دل کش آواز روشنی کے ساتھ پھوٹ رہی تھی۔ گھوشی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اندر سے ایک بھیٹر مرگوٹ کا چہرہ برآمد ہوا۔ گھوشی نے کہا۔ "دروازہ کھولو۔"

ہم سب اندھیرے میں کھڑے تھے۔ عورت نے گھوشی سے پوچھ کر کہا۔ "اندر کچھ معزز مہمان بیٹھے ہیں ذرا کچھ دیر بعد زحمت کرنا۔"

گھوشی نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ عورت احتجاج کرتی رہی۔ "آؤ استاد! اندر سے گھوشی کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑی۔ عورت چند لمحوں کے لیے گھبرا گئی پھر وفورِ غم کے جذبے سے بے قابو ہو گئی اور اس نے جھل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب تم اس طرح آیا کرو گے؟ زندہ خبر مجھے آئی ہوں، خبر بھی نہیں لی کریمن کو کیا ہوا پردیس میں کٹ گئی یا برباد ہو گئی۔ کہہ لیا بھی کہ اک سکھ دکھا جاؤ۔ ظالم کے جھل نے پرانا مکان لا پس نہیں کیا۔ اس ٹوٹے ہوئے مکان میں وہ رہی ہوں کہ بلند رسید تک نہیں دی۔"

"ہمیں کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔ ساتھ میں جھل نے ناراضی سے کہا۔ "حیدرآباد میں رہ کے کریمن نے گھاٹی بہت کھائی ہو گی، اخلاق بھی کھٹا ہو گیا۔"

"دیبی! بالکل وہی۔ تم نہیں بدلے گے۔" کریمن نے شفیق سے کہا۔

"اور تم بھی نہیں بدلیں۔ وہی کھنک، وہی تڑپ ہے۔"

"جاؤ بھی۔ اجڑا ہوا دیار ہوں۔" وہ جھل کا ہاتھ تھامے ہوئے اندر لے گئی۔ کمرے میں چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ جھل کا چہرہ جیسے ہی خودار ہوا، رقص تھم گیا۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے بگاڑ اطوار سے پہلے ہی پیر کریمن کو دیکھا۔ جیسے انھیں ہماری آمد نہایت ناگوار گزری ہو۔ جھل نے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک کونے میں لگے ہوئے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ جھل نے تعارف کرایا۔ کریمن نے جھل کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے نئے شہر کے سیٹھ ہیں اور یہاں کے مُدار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ سیٹھ رام سکھ اور ان کے گھٹنوں سے اوپر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے تھانیدار دھرم چند۔ تھانے دار بنیانی تنگ قمر دوں، جرمچیس سے اُوپر پُر سمجھ رہا تھا۔ شیر حالاں سو تے کے کان اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ کریمن نے اس کے آگے ہاتھ پھیرا۔ میں نہیں سمجھا کہ کیا کہنے لگی۔ "وضع دار آدمی ہیں غریبوں کے دوست فن جاتے ہیں۔ ان پر میں کلکٹر کے چندہی سیٹھ سیٹھ لکشمی داس بڑے اکھڑ لگتے ہیں۔ سیٹھ کے لیے ان کی تعریف سے کسی قسم کا تاثر نہیں ابھرا البتہ پیشانی پر کچھ شکنیں ابھریں اور آنکھیں چڑھ گئیں۔ تاہم استاد جھل۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔" کریمن نے سیٹھ کو مخاطب کیا۔

سیٹھ نے جواب دینے کے بجائے سر کی ایک خفیف جنبش سے انکار کا اظہار کرنے لگا۔ کریمن بانہار معان کرنا۔ ہمیں بھیڑ میں گانا سننے میں مزا نہیں آتا۔ جب ہم آئیں تو دروازے پر تالا لگا دیا کریں۔"

"کلنگ میں نئے نئے آئے ہو سیٹھ!" کریمن کے جواب دینے سے پہلے جھل کی کرخت آواز ابھری۔ "کریمن تم نے ابھی تعارف نہیں کرایا۔" جھل کی آواز پر سیٹھ نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں اور سر اٹھا کے اُسے گھورنے لگا۔ اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمان مضطرب ہونے لگے۔

"ہاں استاد! سیٹھ کا بڑا کاروبار احمد آباد میں ہے۔ حال ہی میں انھوں نے یہاں جوٹ کا نیا کارخانہ کھولا ہے۔ یہ یہاں رہتے تو رہے مگر تھیں چلتے۔ یہ صرف دھندے کا انہی پن ہے تم بھی انھیں نہیں جانتے، یہ بھی تمھیں نہیں جانتے۔ ہر حال جان پہچان کا اس سے اچھا موقع اور کب آئے گا۔ سیٹھ صاحب! جھل میں خوبیاں کون سی ہے جو استاد جھل سے واقف ہو۔ ہر جگہ ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ یہاں کے ساتھی ہیں ایک تو یہ کانتے ہے اور اسے بھی ہیں پھر سے بھاتی ہوں مالکوں میں کئی سال بعد مکتے واپس آئی ہوں۔" اُس نے گھوشی کی طرف اشارہ کیا اور پھر بھیجے کرنے لگی۔ "دیکھے میری سرکار بیٹھے ہیں، یہ سمجھتے ہیں میں انھیں بھول گئی ہو۔ یہ بھولتی ہیں۔"

موتی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہاں کریمن بائی! خوب پہچانا۔ میں تو سمجھا تھا سب کی طرح تم نے مجھے بھی بھلا دیا ہو گا۔"

"موتی میاں! یہ تو نظر نظر کی بات ہے۔" وہ سکرا کے میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "ماشاء اللہ چشم بد دور چشم بد میں دو زبانہ اتھیں ہیں نے نہیں پہچانا۔"

"یہ لاڈلا ہے۔" کلانتے ہوش میں بولا۔ "استاد کا لاڈلا!"

کریمن انکھیں پٹ پٹانے لگی جیسے میری صورت دیکھ کے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "اپنے سنا سیٹھ۔ یہ سب نام ور لوگ ہیں۔ جو انھیں نہیں جانتا

لئے ضرور جانا چاہیے۔ یہ کام کے لوگ ہیں اب میں آپ دونوں کو ملوانے کی رسم سے بھر پائی۔ میں نے اپنی طرف سے سارا حجاب دور کر دیا ہے۔ سیٹھ صاحب! استاد! ہاتھ ملائیے گلے ملیے۔ ہم سے کھل جاؤ یہ وقت بے پر ستی ایک آن ہے۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کرین کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ کرین بیٹھے بیٹھے کروٹیں بدلنے لگی کبھی وہ سیٹھ کی طرف دیکھتی کبھی مخمل کی طرف۔ "گانا شروع کرو کرین!" مخمل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں ہے جسے تم نے ہماری نظروں سے چھپا رکھا ہے؟"

وہ گانے گانے تھک گئی تھی۔ میں نے اُسے آرام کے لیے اندر بھیج دیا تھا پھر جیسے ہی سیٹھ صاحب آئے میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ لباس تبدیل کر کے ابھی آئی ہوگی۔ تم اس عرصے میں پری بانو کا گانا سنو۔ پری کی آواز میں بنگال کا جادو بھرا ہے۔" ایک دبلی پتلی سانولے نقش و نگار کی سنجیدہ لڑکی درمیان میں نیچے کی طرف سے بھیجی تھی۔ اپنے نام پر اس نے اپنی بوجھل پلکیں اُوپر اٹھائیں وہ پہلے ہی مخمل کو کیے بیٹھی تھی۔ اب اس نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ مرغ حنائی کم معلوم ہوتی تھی۔

"کچھ شروع کرو کرین!" موتی نے جھڑک کے کہا۔

"اجازت ہے؟" کرین نے سیٹھ سے پوچھا۔

"ہم چلتے ہیں کرین بانو! پھر آئیں گے۔ ہماری طرف سے شہ پارہ کو رخصت کر دیجیے گا۔" اس نے کل ہم سے فرمائش کی تھی۔" سیٹھ نے ایک پیکٹ کرین کی طرف بے نیازی سے کھسکا دیا۔ کرین نے پیکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آپ نہیں جائیں گے جناب! شہ پارہ کو خود دیجیے گا۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی وہ آئے گی تو خود آپ سے نمٹ لے گی۔ تمام دقت پر چھوڑ ہی تھی، میں بھی تو کہوں آج اسے کیا ہو گیا ہے کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب پتہ چلا کہ بھید خط تشریف رکھیے سیٹھ صاحب!"

"ارے شہ پارے!" اس نے اچانک آواز لگائی۔ "ارے کہاں گم ہو گئیں سنتی ہو سیٹھ صاحب واپس جا رہے ہیں۔ پھر مجھ سے کچھ مت کہنا۔"

اندر سے ایک باریک آواز آئی۔ "آئی۔ بس ابھی آئی۔"

"اب آؤ بھی نا۔" کرین سر پر ہاتھ رکھ کے بولی۔

"نہیں کرین بانو! انھیں آج آرام کرنے دو، ہم کل آئیں گے جب بھی وقت ملا۔ ضرور آئیں گے۔ اپنے مہمانوں کا خیال کرو۔"

"سیٹھ صاحب! یہ کوئی غیر نہیں ہیں ان کا خیال کیا جائے۔ آپ بھی تشریف رکھیے۔ یہیں بیٹھیے۔ دونوں مجھے عزیز ہیں۔ آج یہی سہی دیکھیے تو سہی کیسے سُر شناس ہیں۔ شہ پارہ نے ان کے سامنے گانے کی تو قیامت برپا کر دے گی۔ فن اور حسن تو گاہک کی تلاش میں رہتا ہے۔ میرے نصیب جاگے کہ آج ایسے ایسے سننے والے موجود ہیں میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ ٹھٹھکے کے انداز میں بولی۔

"کرین بانو! آج ہمیں معاف کر دیجیے۔" سیٹھ نے اٹھنے کی کوشش کی۔

کرین نے اضطراب سے مخمل کو دیکھا۔ بیٹھیے سیٹھ! کرین کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔" بیٹھ جائیے۔" مخمل کی آواز میں مختلف مفاہیم سمائے جا سکتے تھے۔

"بیٹھ جاتا ہوں مخمل! ہوتی الجھتے ہوئے بولا۔ ہم دونوں کے آنے طے نہیں تھا ہماری وجہ سے اٹھنا چاہتے ہو تو مت جاؤ۔ کرین نے تھیں یہ نہیں بتایا کہ تم کہیں آنے جانے میں رکاوٹ نہیں ہوتی، ہم کسی بھی وقت کہیں بھی جا سکتے ہیں، دوسرے پیارے تم پہلے آئے ہو اس لیے اتنی بات بھی کہی جا رہی ہے بعد میں آتے تو شکل دوسری ہوتی۔ مخمل بدلا گیا ہے میں تھوڑی دیر پہلے اس سے یہی کہہ رہا تھا۔ یہ گلگتہ ہے سیٹھ! آسنسول ہوتا تو بات اتنی لمبی نہ ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" سیٹھ نے تنک کے پوچھا۔

"مطلب جان ہے سیٹھ!" موتی نے نمکی سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

"ہم نہیں بیٹھتے۔" سیٹھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو جاؤ۔" موتی نے چنگار کر کہا۔

کرین بانو! آئندہ دو کے بنایا کرو، ایک جائے لیے ایک اپنے خاص مہمانوں کے لیے۔" وہ یہ کہتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت واپس جانے لگا۔ کرین نے ڈوٹر کے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اسی لمحے اندر سے ایک زرق برق لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اس نے دروازے پر سیٹھ کی انگلی پکڑ لی اور کچھ کہا تھیں، بس ایک نظر دیکھا۔ سیٹھ کی آنکھوں سے بے پناہ مسرت پھوٹی، وہ مسکراتا ہوا واپس لوٹا۔ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا پھر لڑکی نے ہماری جانب نظر کی اور ہم نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا۔ وہ شہ پارہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے متعلق کرین نے جو کچھ کہا تھا وہ اس سے کہیں سوا تھی لمبی سی شوخ چنچل گھنی پلکیں، لمبی سیاہ چوٹی سیٹھ نے آگے سامنے بٹھا لیا کرین سے اپنا دیا ہوا پیکٹ واپس لے لیا اور اس کے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے اور چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ اس نے جلدی جلدی پیکٹ کھولا۔ عود صوت ڈبے سے ایک چمکتا ہوا ہار نکلا۔ لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں اور بڑی ہو گئیں۔

"سیٹھ صاحب! اپنے ہاتھ سے پہنائیے۔" کرین نے درخواست کی۔

شہ پارہ نے اپنا چہرہ اُوپر کر کے آنکھیں موند لیں۔ اس کے گلابی رنگ کے ہونٹ کانپ رہے تھے، رخساروں پر شفق چھائی ہوئی تھی۔ سیٹھ نے اس کی صراحی دار گردن میں ہار ڈال دیا۔ شہ پارہ نے آنکھیں کھول دیں۔ سیٹھ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی اٹھی اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تب جھٹکے سے اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور خراماں خراماں جھومتی ہوئی درمیان میں بیٹھ گئی۔ پہلی لڑکی کرین کے پاس آ گئی تھی اور کرین دوبارہ ہارمونیم سنبھالے قریب بیٹھ گئی تھی۔ شہ پارہ نے پیروں میں گھنگرو باندھے سازندوں نے ساز سنبھالے اس نے شوخی اور ناز سے سازندوں سے کچھ کہا اور بیٹھے بیٹھے انگلیاں نچانے لگی۔ تال کے بولوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے پہلے سیٹھ کی طرف ہم مخمل کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور تان اٹھائی۔

یہ جو گرد دن جھکائے بیٹھے ہیں لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں

اُس نے اسی پر بس نہیں کیا اٹھ کے ناچنے لگی اور ایسا ناچی کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا تھا۔ کل رات زرّ بھی اسی طرح ناچی تھی مگر یہ تو زرّ سے بڑھ گئی تھی اس کے تو پورے بدن میں جیسے سنگیت بھرا ہوا تھا جیسے آگ بھری ہوئی تھی جب وہ حرکت کرتی تھی تو چنگاریاں پھٹتی تھیں۔ سب دم بخود ہو گئے۔ موتی اپنی جگہ پھڑکے اور چلنے لگا پھر استھائی تک پہنچ کے اپنی جگہ بیٹھ کے گایا پھر سیٹھ نے اُسے نوٹ دکھا کے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اٹھتی تھی تو سیٹھ ایک اور نوٹ جیب سے نکال کے اُس کے سامنے کر دیتا تھا۔ سیٹھ کی جیب میں جیسے خزانہ بھرا تھا۔ ایک نوٹ اُسے دیتا تھا، دوسرا جھٹ جیب سے نکال لیتا تھا۔ چار چھ دفعہ وہ وہیں جی بیٹھی تھی۔ اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ سیٹھ کے ساتھی بھی نوٹ لٹا رہے تھے۔ یہ ماحول یکسر حسین لڑکی، یہ آواز، یہ رقص۔ کل مجھے زرّ کو دیکھ کر بھی تعجب ہوا تھا، اتنی حسین لڑکیاں کس سے پرائی سے مڑوں سے ملتے ہی بیتی ہیں۔ میری نظریں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں رفتہ رفتہ میری سمجھ میں یہاں کے آداب آ رہے تھے۔ جب بہت پیسہ ہو گیا اور شہ پارہ سیٹھ کے سامنے سے اٹھ اٹھ کے جھکتی رہی تو کرین نے مخمل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "استاد! تو وہ لیا معلوم ہوتا ہے باقی کل کے لیے اٹھا دیتے تھوڑی دیر اور برداشت کر لو پھر میں تمھیں شہ پارہ سے گانے کی چیزیں سنواؤں گی۔" وہ آہستہ آواز میں بولی کہ ہمارے سوا کوئی نہ سن سکا۔

"ٹھیک ہے کرین! اسے جیسی خیال کر لینے دو۔"

"اور اپنی رات برباد کرتے رہو۔" موتی طیش میں بولا۔ "مخمل میں چاقو نکالتا ہوں دیکھتا ہوں دوپٹے میں زیادہ زور ہے یا چاقو میں۔"

کرین نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ "میری عزت تمھارے ہاتھ میں ہے موتی! پہلی بار تمھارے آنے کی رکت ہے کہ بارش ہو رہی ہے۔ بس میری خاطر اسی طرح خاموش بیٹھے رہو گھر تمھارا ہے، میں تمھاری ہمدرد تمھاری ہے۔"

شہ پارہ کے ماتھے پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ تھک گئی تھی۔ یہ خوب تماشا تھا۔ مجھے اس لڑکی پر ترس آنے لگا۔ اس نے اتنی نازک گڑیا سی لڑکی کو کھلونا سمجھ رکھا تھا۔ مخمل خاموش تھا۔ موتی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کرین خوشامد کر رہی تھی۔ گانتے گاتے وہ جب بے حد سرخ ہو گئے تھے مجھے اندیشہ ہوا کہ یہاں کوئی بہت بڑا فساد ہو سکتا ہے۔ مخمل کا پُرسکون چہرہ دیکھ کے بھی رُکے ہوئے تھے سیٹھ روپے لٹا رہا تھا۔ مخمل کی آنکھوں سے اب شعلے اگلنے لگے تھے، اُسے روکنا مشکل ہو گیا تھا سیٹھ نے لحاظ ہی نہیں کیا کہ یہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے اور کون بیٹھا ہے۔ وہ بھکتے میں تھا یہ بالکل نیا آیا تھا یا اُس کے پاس بہت دولت تھی یا وہ بہت بڑھ چڑھ کر دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے ہماری جانب تو توجہ ہی نہیں کی۔ وہ کوئی بڑا ہی آدمی ہو گا۔ مگر اتنا تھا کہ ایک ہی غزل میں ہیر ہو گئی سیٹھ نے اپنے دونوں ہاتھ گاؤ تکیے پر ٹیکے ہوئے تھے گاؤ تکیہ اُس کے زانوؤں پر رکھا تھا۔ وہ کمشکش بالکل غور نظروں سے شہ پارہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر شاید اُس کے پاس نوٹ ختم ہو گئے۔ اُس نے اپنی گھڑی اتار کر اپنا ہاتھ نکر کیا۔ اپنے ہاتھوں کی انگوٹھیاں نکالیں اور جب کچھ نہ رہا تو گلے کا ہار بھی نوچ کے اُس کی نذر کر دیا۔ اُس نے زنجیر اتاری تو مجھے ایک انوکھا خیال آیا۔ مالا میری نبیان کے نیچے تھی، ہر جائے لڑائی کے وقت مجھے اگر کسی بات کا خیال تھا تو اس کا تھا کہ کہیں اس کی ڈوری پر جھٹکا پڑ جائے اور موتی جائے وہاں اس کے بکھرے ہوئے دانے سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے وقت مخمل اور اُس کے آڑے آئیں نے یہ مالا بچھا لی تھی مگر اُس وقت اس کی نگاہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکیں۔ سیٹھ کی اس نے آج جتنا اور خرچ کیا تھا زیور، انگوٹھی، قلم کرنے کے علاوہ فی ٹن شیروانی کے علاوہ فی ٹن آلات کی قیمت اس مالا سے کم تھی میرے جی میں آیا کہ میں شہ پارہ کو مالا پیش کر دوں اور سیٹھ سے کہوں تمھارے پاس اس سے زیادہ قیمتی کوئی شے ہو تو پیش کرو۔ ہونٹوں تک پہنچے گے پر ہاتھ رکھ لیا کہ کہیں کرین شہ پارہ یا چلے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کی نظر پری مالا پر نہ پڑ جائے۔ سیٹھ خال ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی جیبیں اُلٹ دیں لیکن شہ پارہ کے سامنے میٹھی گاتی رہی موتی کا تھیلا آ چکا تھا۔ سیٹھ نے تحوت رفعت سے رجوع کیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب بھی شہ پارہ اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی جیسے بھی مند ہو گئی ہو۔ سیٹھ نے اپنے ٹٹولے آ چکے اور شیروانی کی اندرونی جیب سے نوٹوں کا شہ پارہ نے دیکھ کے پیچھے ہٹی۔ سیٹھ نے اپنا تبدیل کرنے کے لیے تیار کر لیا۔ پلس دینے کی دیر تھی کرین ہکا بکا رہ گئی۔ سازندوں کے ساز رُک گئے۔ طبلہ گرنے لگا۔ کانتے نے جھٹ اپنی جیب سے چاقو نکالا اور کھڑکھول لیا۔ موتی اور گھوش نے بھی یہی کیا۔ مخمل نے اُن کی یہ دہشت دیکھی تو دونوں ہاتھ بھالے کے قبضے پر رکھ لیے کرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "ہم چلتے ہیں کرین بانو! پھر آئیں گے، ہماری طرف سے شہ پارہ کو رخصت کر دیجیے گا۔" اس نے کل ہم سے فرمائش کی تھی۔" سیٹھ نے ایک پیکٹ کرین کی طرف بے نیازی سے کھسکا دیا۔ کرین نے پیکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آپ نہیں جائیں گے جناب! شہ پارہ کو خود دیجیے گا۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی وہ آئے گی تو خود آپ سے نمٹ لے گی۔ تمام دقت پر چھوڑ ہی تھی، میں بھی تو کہوں آج اسے کیا ہو گیا ہے کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب پتہ چلا کہ بھید خط تشریف رکھیے سیٹھ صاحب!"

"ارے شہ پارے!" اس نے اچانک آواز لگائی۔ "ارے کہاں گم ہو گئیں سنتی ہو سیٹھ صاحب واپس جا رہے ہیں۔ پھر مجھ سے کچھ مت کہنا۔"

اندر سے ایک باریک آواز آئی۔ "آئی۔ بس ابھی آئی۔"

"اب آؤ بھی نا۔" کرین سر پر ہاتھ رکھ کے بولی۔

"نہیں کرین بانو! انھیں آج آرام کرنے دو، ہم کل آئیں گے جب بھی وقت ملا۔ ضرور آئیں گے۔ اپنے مہمانوں کا خیال کرو۔"

"سیٹھ صاحب! یہ کوئی غیر نہیں ہیں ان کا خیال کیا جائے۔ آپ بھی تشریف رکھیے۔ یہیں بیٹھیے۔ دونوں مجھے عزیز ہیں۔ آج یہی سہی دیکھیے تو سہی کیسے سُر شناس ہیں۔ شہ پارہ نے ان کے سامنے گانے کی تو قیامت برپا کر دے گی۔ فن اور حسن تو گاہک کی تلاش میں رہتا ہے۔ میرے نصیب جاگے کہ آج ایسے ایسے سننے والے موجود ہیں میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ ٹھٹھکے کے انداز میں بولی۔

"کرین بانو! آج ہمیں معاف کر دیجیے۔" سیٹھ نے اٹھنے کی کوشش کی۔

کرین نے اضطراب سے مخمل کو دیکھا۔ بیٹھیے سیٹھ! کرین کو رات بھر نیند

ہوئی آدمی میں کیا سب تم صرف ہمارے لیے گایا گاؤ گی صرف ہمارے لیے ناچو گی صرف ہمارے دل پر راج کرو گی ہم تمہیں اپنی رانی بنائیں گے اور تمہارے قدموں میں دنیا بھر کی خوشیاں بکھیر دیں گے جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تمہارا ہے کرین بانو نے بلند آواز سے بولا۔ ہم شاہ پاؤ کر اپنے ساتھ لے جائیں گے اب وہ کسی اور کے سامنے نہیں ناچے گی۔ تو ہم کہو گی وہ ہم پیش کر دیں گے۔ بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"سیٹھ! آپ کی باتیں سن کے میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے میری محنت کا صلہ مل گیا مگر سیٹھ شہ پاؤ ہی میری اپنی بچی میری گل جانو ہے۔"

"ہم تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔"

"میں جانتی ہوں اللہ نے آپ کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ آپ کے بہت سے کارخانے ہیں میرا کارخانہ تو ایک بھی ہے۔"

"ہم شہ پاؤ کے لیے تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔ یہ باتیں ایسی تو نہیں ہیں کہ ابھی اور اسی وقت طے ہو جائیں۔ میں نے تو ایسا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا، آپ مجھے کچھ وقت دیجیے۔"

"نہیں۔ ہم تمہارا جواب اسی وقت سننا چاہتے ہیں۔"

"اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے غریب خانے پر مہمان موجود ہیں ابھی تک انھوں نے شہ پاؤ کو ٹھیک سے سنا بھی نہیں ہے۔"

"ہم اسی لیے جلد از جلد جواب چاہتے ہیں تم اگر چاہو تو شہ پاؤ سے پوچھ لو وہ انکار نہیں کرے گی۔ ہم نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب شہ پاؤ صرف ہمارے دل کی دھڑکن بنی رہے گی۔ ہم اس کا کسی اور کے سامنے ناچنا پسند نہیں کریں گے۔"

"سیٹھ صاحب! یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔" کرین نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "آپ کی بھی میرے تجربہ کارانہ مشورہ ہے کہ ذرا رات کو بستر پر لیٹ کر دل سے سوچیے گا۔ کرین ولے لفظوں میں سیٹھ کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کی ضد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم میں سے کسی شخص نے ابھی تک اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ کرین کی زبان تھک گئی مگر سیٹھ کی ضد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا تمنچہ تھا۔ کرین کو خوف ہو گا کہ بات طاقور ہی میں لے سکے اسی لیے وہ نرمی خوش اخلاقی مذمت اور خوشامد کے لہجے میں سیٹھ کو سمجھا رہا تھا۔ غالب تھی سیٹھ نے سکتے میں قائم کیا ہوا اپنا کارخانہ کرین کے نام کرنے کی پیش کش کی۔ ایک ہزار روپے ماہانہ شاہ پاؤ جیسی ہزار روپے نقد جسے بڑھا کے اس نے ایک لاکھ روپے کر دیا۔ کرین چپ ہو گئی تھی اس کی خاموشی پر سیٹھ اپنی بیش کشوں پر اضافے پر اضافے کیے جا رہا تھا۔

"ہم شہ پاؤ کو اس تنگ و تاریک جگہ سے نکال کے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں اس کی صحیح جگہ وہی ہے۔" وہ جوش میں بولا۔ "ہم اسے ہر صورت میں یہاں سے لے جائیں گے۔"

کرین جو بڑی دیر سے بیٹھی تھی سیٹھ نے شہ پاؤ سے کہا۔ "چلو ہمارے ساتھ چل کر شہ پاؤ! ہم تمہاری قدر کریں گے۔"

"مگر اس وقت؟" شہ پاؤ جھجک کے بولی۔

"ہاں اسی وقت ابھی۔ ہم کرین کے نام کاغذ لکھے دیتے ہیں جب تک ہم اپنے حلے پورے نہیں کر لیں گے اس وقت تک تمہارے قریب نہیں آئیں گے۔"

"یہ وقت مناسب نہیں سیٹھ صاحب!" شہ پاؤ نے حوصلے سے کہا۔

"ہم نے انکار سننا نہیں سیکھا ہے شہ پاؤ!"

"کنیز انکار نہیں کر رہی ہے۔ کنیز کی درخواست ہے کہ اسے اور اس کی ماں کو کچھ تر مہلت دی جائے۔ ہمیں اختیار تو حاصل ہے۔"

"گانا شروع کرو۔" اچانک مجھل نے گرج دار آواز میں حکم دیا۔ "لڑکی! گانا شروع کرو۔"

"شہ پاؤ نہیں گائے گی۔" سیٹھ نے درشتی سے کہا۔

"کیوں نہیں گائے گی؟" مجھل نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تمل سے پوچھا۔

"تم سن نہیں رہے ہو؟ ہم شہ پاؤ کا سودا کر رہے ہیں۔"

"اور اس کی ماں تیار نہیں ہے جاؤ سیٹھ جاؤ۔ کرین کے جاگنا تنظار کرو ممکن ہے کرین یہ لڑکی تمہارے سپرد کر دے پھر جو جی چاہے کرنا تمہارے پاس پیسے ختم ہو چکے ہیں اور اس جگہ اسی آدمی کی قدر ہوتی ہے جس کی جیب بھری ہوتی ہے۔ تمہاری جیب میں کچھ نہیں ہے جیب میں جب کچھ ڈال کے آؤ تو تیزی سے بات کرنا۔ گانا شروع کرا کرین! اور کس بات کی ہے۔"

"شہ پاؤ اب نہیں گائے گی۔ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے شہ پاؤ کو خرید سکتے ہیں۔ ہماری بات ہو چکی ہے، ہماری بات سونا ہے۔"

"تم سے کہہ دیا گیا ہے کہ کرین کو سوچنے کا وقت دو۔"

"تم درمیان میں مت بولو۔ یہ ہمارا اور کرین کا معاملہ ہے۔"

"تم ہمیں جانتے نہیں ہو اسی لیے ہم اب تک خاموش رہے تم نے ہمارے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ علاقہ ہمارا ہے اور یہاں ہمارا حکم چلتا ہے۔"

"یہ علاقہ انھی کا ہے سیٹھ!" کرین گھبرا کے بولی۔

"اور ہماری بات فولاد ہے۔" مجھل بولا۔ "اور ہمارا وقت قیمتی ہے یہ سودے بازی بعد میں کرنا۔ ہمیں گانا سننا ہے۔"

"تم سودے سے گانا سنو مگر وہ گانا شہ پاؤ کا نہیں ہوگا۔"

"وہ گانا شہ پاؤ ہی گائے گا ہوگا۔" مجھل نے اطمینان سے کہا۔

"ہم گانا نہیں ہونے دیں گے۔" وہ غصے میں بولا۔ "ہم شہ پاؤ کا خون کر دیں گے۔ بہتر ہے تم اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" سوتی دیکھتا ہے یہ سیٹھ کا بچہ کیا بک رہا ہے۔" مجھل نے سے کہا۔ "ہمیں زبان بند کرنے کا حکم دے رہا ہے۔"

"استاد! اس کی زبان چاقو سے کاٹ لوں؟" گھوشی نے چاقو لہرا ہوئے کہا۔ "بہت ہو گیا استاد! تم نے تو حد کر دی۔"

"مجھل! کیا ذبح کرانے لایا تھا؟ یہ کنیز اتنی دیر سے ٹرٹر کر رہا ہے بیٹھا سن رہا ہے؟" سوتی انگڑائی لے کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں سنیں۔" سیٹھ جھنجلا کے بولا۔ "میرے ہاتھ

تمنچہ ہے احمد آباد میں کئی غنڈے اس کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

سوتی نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ "مجھل! ذرا احمد آباد بھی جانا پڑے گا۔ یہ شہر بھلا لگتے سے کتنی دور ہے؟" وہ آہستہ آہستہ سیٹھ کی طرف بڑھنے لگا۔

"ہزار ڈیڑھ ہزار میل پر ہوگا۔" مجھل نے سرسری جواب دیا۔

"آگے مت بڑھو میں کہتا ہوں آگے مت بڑھو۔" سیٹھ نے تمنچہ تان کر کہا۔

"کرین! کرین بانو! تم اسے روکو ورنہ کیا اگر ایک خون ہو گیا تو پھر یہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔ ہم اب جائیں گے اور شہ پاؤ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

کرین کانپ سی رہی تھی۔ سوتی قہقہے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ شہ پاؤ چیختی ہوئی سوتی کے پاس آئی اور اس کا بازو جھنجھوڑ کے بولی۔ "رک جاؤ رک جاؤ۔ میں سیٹھ سے بات کرتی ہوں۔ میں نہیں گاؤں گی۔ نہیں ناچوں گی میں سیٹھ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ یہاں خون مت بہاؤ۔"

سوتی رکا شہ پاؤ کو غور سے دیکھنے لگا۔ "تم اتنی پیاری لڑکی ہو میں تمہیں اس پاگل کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔"

"شہ پاؤ! سامنے سے ہٹ جاؤ۔" سیٹھ نے غراتی آواز میں کہا۔ "تمہاری اس کی موت آگئی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شہ پاؤ ہذیانی انداز میں بولی۔ "میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ تمہارا خدا کھو تو تمنچہ اندر رکھ لو۔" وہ ایک سمت میں جست لگا کے سیٹھ کے پاس پہنچ گئی۔

سوتی اس کے مقابل کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا تمنچے پر سیٹھ کی گرفت سخت معلوم ہوتی تھی۔ مجھل کھڑا ہو گیا۔ شمول کانتے چند قدم آگے بڑھ گئے۔ ان کے چاقو روشنی میں چمک رہے تھے۔ کرین سیٹھ کے قدموں پر جھک کے فریاد کر رہی تھی۔ سیٹھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھے ادھر مجھل کانتے اور شمول کھلے چاقو ہاتھوں میں لیے قہر آلود نظروں سے سیٹھ کو گھور رہے تھے۔ سیٹھ کے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے کانتے سے کہا کہ لگاس کے پاس کوئی قاتل چاقو موجود ہو تو وہ میرے حوالے کر دے۔ مجھل نے سن لیا اور اپنا چاقو مجھے دے دیا۔ سیٹھ تمنچہ تانے بار بار سوتی کو سامنے سے ہٹنے کا حکم دے رہا تھا اور سوتی کسی بت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چاقو کھولے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ سوتی کا بایاں ہاتھ بجلی کی طرح سیٹھ کے ہاتھ پر جھپٹا۔ سیٹھ نے ایک چیخ ماری تمنچے سے گولی کی آواز آئی اور تمنچہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ سیٹھ کے ہاتھ سے خون بہنے لگا تھا اور سوتی کی تند سفاک انگلیاں سیٹھ کے ہاتھ کو بری طرح پکڑے ہوئے تھا۔ سوتی نے جس تیزی اور بے رحمی سے یہ کام کیا تھا وہ چاقو زنی کا کمال تھا۔ اس نے ٹھیک اسی ہاتھ پر ٹھیک اسی جگہ سے چاقو کا وار کیا تھا جس میں تمنچہ موجود تھا۔ پہلے سوتی نے بایاں ہاتھ جسم جھکا کے سیٹھ کو دکھایا اور پھر دائیں ہاتھ سے اس کے ہاتھ پر حملہ کر دیا۔ چاقو اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ تمنچے کی گولی ضائع چلی جائے ورنہ وہ عورتوں میں سے کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اپنا جسم ہٹانا اور تمنچے کا نشانہ قائم رکھنا یہ ثابت کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ سوتی کو اپنی چاقو زنی پر مکمل اعتماد ہے۔ مجھل نے اپنے سینے سے لگایا گھوشی نے تمنچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ خون بہنے کے لیے کرین نے اپنا دوپٹا سیٹھ کے ہاتھ پر باندھ دیا۔ وہ بلبلانے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں کرب کے درمیانی پردوں پر چاقو کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی تھی۔ خود اپنا ہاتھ اور گہرا چیر لینے کے بعد وہ زمین پر گر جاتے مگر سوتی کا مقصد یہ نہیں ہوگا۔ جو مقصد تھا وہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ سیٹھ کٹھی اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اس نے درد کرب بے بسی اور شرمندگی کی نگراس کی لکیروں میں نکل ہی گئیں۔ اس کے ساتھیوں دوستوں اور کرین نے اسے فرش پہ بٹھلے گھر عورتوں سے اس کی چوٹی کر دی۔ مجھل نے دوبارہ شہ پاؤ کو حکم دیا کہ وہ گانا شروع کرے۔ شہ پاؤ نے گھنگرو اتار ڈالے تھے۔ مجھل کے حکم کی کسی توقف کے بغیر تعمیل کی۔ جیسے ہی گھنگرو جھکے اور طبلے پر پہلی تھاپ پڑی شہ پاؤ کا انداز میں اٹھ گیا۔ نہیں شیدا سے آتم نہیں گاؤ گی۔ انکار کر دو بچاری۔" وہ چیخا۔

شہ پاؤ نے مصرعہ اٹھا دیا۔ وہ روتی پھرتی ہے پھولوں کو ساری رات سیٹھ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھل کی طرف بڑھنے لگا۔ "سنو سیٹھ!" کانتے کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ کانتے نے اس سے کیا کہنا چاہا تھا مگر پھر رک کے کہنے لگا۔ "جاؤ سیٹھ! آئندہ احتیاط کرنا۔"

"یہ احمد آباد نہیں ہے سیٹھ!" سوتی نے ہنس کے کہا۔ "وہاں نمکھ لینے چل گے اب جاتے کہاں ہو بیٹھ جاؤ۔ ہماری طرف سے گانا سنو۔ تم پلے جاؤ گے تو نہیں آئے گا۔ تمہیں سامنے دیکھ کے شیدا کی آواز میں کچھ اور ہی سوز پیدا ہو گا۔"

سیٹھ نے شعلہ بار نظروں کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آستین سے شہ پاؤ پر ایک نظر ڈالی اور گردن جھٹکا۔ ہاتھ دوائے سے مکمل گیا۔ کرین کی کیا رائے کانتے اور گھوشی کے قہقہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا ہوگا۔ کرین نے ایک کے دروازہ بند کر دیا اور سیدھی مجھل کے پہلو میں آ بیٹھی۔ "آج تو زبردست گھوشی استاد!" وہ خفگانی لہجے میں بولی۔ "اگر تمنچہ چل جاتا تو؟"

"تو کیا ہوتا تمہاری چاندنی غارت ہو جاتی۔" سوتی نے کہا۔

"میرا تو دل ابھی تک ہول رہا ہے۔"

"تم گھبرائے میں نہیں رہیں کرین بانو!" کانتے نے آنکھ مار کے کہا۔

"اگ لگے ایسی دولت کو سر پہ تلوار لٹک رہی تھی۔" کرین بولی۔ "وہ تو آج بچے سے اکھڑ گیا تھا۔ دیکھو میرا ہاتھ۔" اس نے مجھل کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے سے لگایا۔ "کیسا دھڑک رہا ہے۔"

"ہم بھی تھانے پرانے آشناؤں میں سے ہیں۔" سوتی نے شکایت کی۔

"یہ تو پیسے کی دھڑکن ہے کرین بانو!" گھوشی نے کانتے کو کہنی مار کی۔ "برا نہیں تھا بات اب بھی بن سکتی ہے۔"

"اے جاؤ بھی۔" وہ گھوشی کو ٹھہوکا مار کے بولی۔ "اس حیوانی کو کرن اپنی میٹھی

دے گا۔ پھر اُسے اچانک کچھ خیال آیا یا شاید وہ موضوع بدلنا چاہتی تھی اُس نے شہ پارہ کو اشارہ کر کے جوابے پاس بلا لیا۔ "میں تو بھول ہی گئی۔" وہ اٹھ کے بولی۔ "آداب نہ تسلیم، سلام نہ دعا۔ اس نامعقول نے موقع ہی نہیں دیا۔ بھول تو شاید پہلی بار شباسے کر دیکھ رہے ہیں۔"

سیٹھ کے جاتے ہی ہم لوگوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کے شہ پارہ نے نظر سرائی بند کر دی تھی۔ کرین کی طلبی پر وہ فوراً جوابے پاس آئی سب کو گردن خم کر کے ایک ہاتھ سے تسلیم کی مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگی میرا جی چاہا کہ وہ ایک بار اور تسلیم کرے۔ پہلی لوٹ کے ٹے میں چائے سجا کے لے آئی تھی، خشک میوے اور رنگ برنگ پھلیاں وغیرہ۔ شہ پارہ کو اتنے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو بہت معصوم ہے۔ یقیناً اُسے بھی کسی نسرین نے کرین کے حوالے کیا ہوگا۔ میرا دل اُس سے پوچھنے کے لیے مچلا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ رقص کی تعلیم یہ گانے کی تو اس نے اسی جگہ سیکھی ہوگی۔ سیٹھ کے طاقے سے اُس کی شوخی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ نے اسی جگہ سیکھی ہوگی۔ سیٹھ کے طاقے سے اُس کی شوخی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ جھینپ جھینپ کر مسکرا رہی تھی۔ یہ بہت اجنبی مسکراہٹ تھی۔ مرتی اُس کے حسن کی بڑھ چڑھ کر تعریف کر رہا تھا۔ وہ خراٹے مارا جاتی تھی۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں جب موتی نے اصرار کیا کہ اب رات جا رہی ہے کچھ ناچ گانا ہو رہی جائے تو وہ ایک گہری سانس لے کے اٹھی۔ میں نے چاہا کہ گانے سے منع کر دوں اور کہوں کہ وہ صرف باتیں کرتی رہے لیکن موتی گھنگھرو شی اور کانتے کا اشتیاق دیکھ کے خاموش رہا۔ شہ پارہ نے پھر گانا شروع کر دیا ؎

رو ندتی پھرتی ہے پھولوں کو سواری آپ کی
کس قدر مُنعلی ہے بادِ بہاری آپ کی

وہ اتنی دل سوز، دل کش اور دل کش آواز میں گا رہی تھی کہ سب پر محویت طاری ہو گئی۔ موتی کی جیب میں جو کچھ بھی تھا وہ اس نے نوٹ کیا۔ شہ پارہ اس کے سامنے ٹکے گانے لگی۔ میری جیب میں پیسے ہی نہیں تھے لیکن کانتے اور گھنگھرو شی نے مل دال حرکت کی جیسے کان گال اور ہونٹوں سے نوٹ لگا دیے۔ شہ پارہ انھیں میرے چہرے پر مسکراتے ہوئے سجا رہی تھی۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے اور اس کی نگاہ میرے جسم میں پیوست ہوئی جا رہی ہے۔ دیکھا استاد! میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" لاڈلے کے سامنے سلاسے کون اپنے گا۔" کانتے نے بھجل سے کہا۔ "اب ہماری کیا ضرورت ہے چلو اٹھو استاد!"

"حرام کے جنے! تیری زبان میں کیڑا لگ گیا ہے۔" بھجل نے غصے کے مارے کسی دن اسے کاٹ کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

کانتے بھی بھنا گیا۔ موتی نے اس کے سر پر دھپ مار کے اُسے خاموش کیا۔ شہ پارہ کو گاتے گاتے ہنسی آ گئی۔ اُس کے موتیوں جیسے دانت بکھر سے گئے۔ ابھی اُسے گانا گاتے ہوئے دیر نہیں گذری تھی کہ دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ شہ پارہ کی آواز میں لرزہ آ گیا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گھوشی نے سیٹھ کا تنبیہ بھجل کے حوالے کر دیا تھا۔ کرین تھوڑی دیر اور دروازے کی طرف نہ جاتی تو شاید دروازہ توڑ جاتا۔ وہ اُدھر گئی اور ادھر ہم مستعد ہو گئے جو اٹھا سکتے تھے بھجل نے انھیں مجھے دینے دیا۔ البتہ ہمارے چاقو ہماری دسترس سے دور نہیں تھے۔ سازندوں کے ہاتھ بھٹکنے لگے اور شہ پارہ اپنی آواز کی دل کشی قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی۔ کرین نے لڑتے لڑتے کنڈی کھولی۔ دروازے کا پٹ کرین کے منہ پر لگا، چوکی باہر سے اُس پر زور پڑ رہا تھا اور ضرب میں جاری تھیں جب تک پہلے ایک انسپکٹر دھماتا ہوا اندر گھسا۔ اُس کے پیچھے دو پلیس والے تھے۔ اُن کے پیچھے سیٹھ کشمی مل اور اُس کے دوست تھے۔ انسپکٹر دو چار ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ سٹ پٹا کے ٹھہر گیا۔ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی درشتی تیزی سے نرمی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "استاد بھجل موجود ہیں۔ کہو استاد! کیا حال ہے؟ کیا معاملہ ہے؟"

بھجل کھڑا ہو گیا۔ "مکرجی! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں استاد! یہ کیا؟..." اُس نے سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھا تھا کوئی اور ہوگا۔"

"سیٹھ نے تمھیں میرا نام نہیں بتایا ہوگا مگر چلو اچھا ہوا تم آ گئے۔" موتی نے سیٹھ کے چاقو لوٹا دیا۔ بھجل نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں جی انسپکٹر صاحب اور بھجل کے پاس سیٹھ کا تنبیہ ہے۔" موتی بول پڑا۔ "زیادہ کیوں بولتا ہے تُو۔" بھجل نے موتی کو جھڑک دیا۔

"میں پوری بات بتا رہا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مکرجی جانتے ہیں مکرجی! ہم حاضر ہیں، ہتھکڑی لگا دیجیے۔ موتی نے سیٹھ کے ہاتھ پہ چاقو مارا تھا۔ بچاؤ محمد کا کیس بن سکتا ہے، دفعہ لگ سکتی ہے۔ سیٹھ کا خون بھی بہہ گیا ہے۔"

انسپکٹر مکرجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کبھی بھجل کی جانب دیکھتا کبھی سیٹھ کی جانب۔ "ان غنڈوں نے تمھاری بے عزتی کی ہے انسپکٹر!" سیٹھ کشمی داس نے نقیض میں کہا اور موتی کی طرف دیکھا۔ "اسے سزا دلواؤ۔"

"ٹھیرئیے، ٹھیرئیے سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ استاد بھجل کو نہیں جانتے؟ یہ سب ان کے ساتھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک کوئی خود ان سے چھیڑ نہ کرے یہ آگے نہیں بڑھتے۔"

سیٹھ کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "انسپکٹر! ہم کیا جھوٹ بول رہے ہیں؟ تم یہ ہمارا ہاتھ نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں سیٹھ صاحب! دیکھ رہا ہوں۔ ایسے موقعوں پر اس قسم کی باتیں ہو ہی جاتی ہیں جانے دیجیے۔" انسپکٹر نے اُس کا تکدر دور کرنے کی کوشش کی۔

"انسپکٹر!" اُس نے کپکپاکے انگریزی میں کہا۔ "تم جانے بھجل کے بارے میں کتنوں کو عزت دے رہے ہو؟ ہم کیا تمھیں اسی لیے یہاں لائے تھے۔ تم کوئی کارروائی نہیں کرو گے تو ہم تمھارے افسروں کے پاس جائیں گے۔ جتنے روپے ہم نے تمھیں دیے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہم اُن پر خرچ کر سکتے ہیں۔ بدمعاشوں نے ہمیں شباسے کے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ یہ قصاص ہیں بھجل کے۔"

میرا ہاتھ اپنے چاقو پر چلنے لگا میں نے بھجل کی طرف دیکھا اُس کے لبوں پہ ایک پُرسکون مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "ادہ سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے نرمی سے انگریزی ہی میں کہا۔ "آپ نیچ لوگوں کے منہ کہاں آ رہے ہیں۔ یہ بڑے خیلطان اور سورما کے بچے ہیں یہاں ایک سے ایک جھٹما ہوا بدمعاش بیٹھا ہے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے سیٹھ صاحب! انھیں جتنا چھیڑیں گے یہ اتنا ہی منہ آئیں گے۔ بہتر ہے کہ معاملہ رفع دفع کر لیجیے۔ یہ جیل خانے اور کچہری وغیرہ سے نہیں ڈرتے۔ اور پھر آپ کا تنبیہ بھی ان کے پاس ہے۔ یہ رنڈی کا کوٹھا ہے سیٹھ صاحب! یہاں ان کے خلاف آپ کو کوئی گواہ بھی نہیں ملے گا۔ آپ کیوں ان جنگلیوں میں پھنس گئے؟ آپ ان...."

"زبان سنبھالو انسپکٹر!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اردو میں کہا۔ "اتنی گالیاں سن تو ہم بھی کچھ عزت رکھتے ہیں۔"

انسپکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا مگر منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ بھجل نے تمھارا ہے لہجے میں مجھ سے پوچھا "کیا کہہ رہے ہیں مکرجی؟ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں؟"

میں نے بھجل کو نہیں بتایا کہ انسپکٹر نے ہمیں کن القاب سے نوازا ہے اپنا اڈا بھی گنگٹ پٹ جاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب! موتی نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمھارا سیٹھ سے کچھ زیادہ ہی جھگڑا ہو گیا ہاں لاڈلے بھل! فوراً گنگٹ پٹ دکھلائے۔"

"یہ لاڈلا ہے؟ وہی لاڈلا جس نے جیل میں تعلیم حاصل کی تھی؟" انسپکٹر نے بھکلاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے افسوس ہے استاد!"

"ہاں یہ وہی لاڈلا ہے مکرجی! اچھا ہوا تم نے بھی اسے دیکھ لیا۔"

"مجھے افسوس ہے میرا مطلب سیٹھ کو کسی صورت سے مطمئن کرنا تھا استاد بھجل بات بڑھانے کی کوشش مت کرو۔ میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھتا ہوں مکرجی!" بھجل نے زہر خند سے کہا۔ "اطمینان رکھو سیٹھ کا خاصا بچاؤ تمھاری دسترس تو اپنی جگہ ہے۔"

"استاد بھجل!" انسپکٹر ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں....."

"جانے دو انسپکٹر! گالیاں ہم پر اثر نہیں کرتیں۔ کچھ کارروائی کرنا ہے تو کرو ہمیں یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں مخل کرنے نہیں آئے۔"

"تم گالی سنو بھجل! کارروائی ہو چکی۔" اُس نے سیٹھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ سیٹھ چلو۔"

"کیا کارروائی ہو چکی؟" سیٹھ بھجل کے بولا۔

"چلو سیٹھ! باہر چلو۔" انسپکٹر نے اُسے آسان کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں سیٹھ! بیٹھو۔" بھجل نے اُسے روکا۔ "گانے میں تو پانڈیا، تم بڑے نخلوئے ہو۔ کل تو خوب کیا۔ اب بھی قیمت کم ہی ہوئی۔" موتی نے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا انسپکٹر! تم کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کو سمجھانا ہوں۔" وہ سیٹھ کو کھینچتے ہوئے بولا۔ سیٹھ نے اس قدر زیادہ مزاحمت نہیں کی اُس کے دوستوں نے بھی اُسے کھینچا۔ وہ سیٹھ کی حمایت میں اس بار پہلے سے زیادہ گرم اور پُرجوش نظر آتے تھے۔ چلتے چلتے انسپکٹر نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کرین پھر میرا ہاتھ تھام کے بیٹھ گئی تھی۔ بھجل کا چہرہ چمک گیا تھا۔ "لاڈلے! لگے رہو جانی۔" وہ ٹہلتا ہوا بولا۔ "دیکھا استاد! اسے کہتے ہیں اُگتی سنی میسری بلی جگتی دیکھی؟"

"استاد! لاڈلے کو گنگٹ پٹ کرتے دیکھنے کی حسرت رہ گئی۔" انسپکٹر کا چہرہ دیکھا تھا۔ اُس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کیا گیا ہیں تم نے لاڈلے؟" کانتے نے میری پسلیوں میں ہاتھ ڈال کے پوچھا۔

وہ سب میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ موتی نے لاڈلے کا پہ پس کرین! اب ایک آخری آئٹم سنواں۔ پٹاسے سے کہدے کہ وہ ان سارا رکا ڈوتو ہو۔ اب مجھ سے نہیں گویا جائے گا۔" شہ پارہ نے اُستگی سے کہا۔

"توبہ گاؤ! بس ہمارے سامنے بیٹھی رہو۔ تمھارا سامنے اہرا ہی گانا ہے طبلہ بے یار و مزمم ہے۔" موتی نے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ جنونی پھر کسی افسر کو لے آئے گا۔ آخر اس کا بھی بہت پیسے ہیں۔" کرین نے خوف زدگی سے کہا۔

"حرام کے ہیں۔" بھجل نفرت سے بولا۔ "اچھا ہے کچھ پیسے نسرین کا بھلا ہو جائے سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ پر اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔"

"تمھیں معلوم ہے؟" کرین نے حواس باختگی سے کہا۔ "تمھیں کیسے پتہ ہے؟"

"ہاں۔" بھجل نے لاپروائی سے کہا۔ "سب وہ نہیں آئے گا۔" اب رات کو تم دروازہ کھلا رکھ کے سونا کرین!"

"رات کو میں چوکیداری کرنے کو تیار ہوں۔ کیوں کرین؟" موتی نے شوخی سے پوچھا۔ "تمھارا کیا خیال ہے؟"

"تمھارا گھر ہے۔" موتی! یہاں آج تم لوگ جتنے آرام سے کیا ہے بہت باتی وہ توجہ پھیلائے بیٹھا تھا۔ شہ پارہ کا چہرہ دیکھ کر تھکا دیا غریب کو مجھے لے پول دھوکے کا تھا۔"

گانے کی محفل تو پہلے ہی اجڑ گئی تھی ساز سمیٹے بھی نہ تھے کہ آن تیتور اپنی کے اندھیرے گئے۔ کرین حیدرآباد کے واقعات سنانے لگی اور شہ پارہ سجے سلے بیٹھے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ اُس کے سراپا سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی پہلے تو مجھے دیکھ کے آنکھیں پٹ پٹائی رہی۔ پھر اُس کے لبوں پر تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ یہی کیفیت میری تھی۔ "آپ سے آپ۔" وہ جھجک کے بولی۔ "میں سمجھ رہی تھی کہ آپ بولنا نہیں جانتے۔" میرا دماغ سن سنا گیا۔ کوئی معقول بات منہ میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی مسکرا کے کہنے لگی۔ "میرا نام شہ پارہ ہے۔"

"میں نے سن لیا ہے۔" میں بدحواسی سے بولا۔

وہ کچھ جھجکی۔ "آپ ان سے بالکل جدا معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ہے؟ دفعتہً مجھے تو اپنے آپ میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں

آتی۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "آپ ہی بتائیے آپ کو مجھ میں کیا چیز خوفناک نظر آتی ہے؟"

"ہر چیز جسے آپ آئے ہیں خاموش خاموش بیٹھے ہیں۔ زخموں پر بیٹھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو رقص و موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے اور جیسے آپ کو جبراً یہاں کھینچ کے لایا گیا ہے۔ کیسے میرا خیال درست ہے نا؟"

مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ آپ تو ان محفلوں کے عادی ہوں گے؟"

"نہیں، میں پہلی بار کسی ایسی جگہ آیا ہوں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"سچ؟" وہ تعجب سے بولی۔ "آپ بنا رہے ہیں۔"

"آپ جو سمجھیے۔" میں نے کسی قدر خفگی سے کہا۔

"واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ بھلا آپ۔۔۔" اس کی پتلیاں تھرکنے لگیں "پھر تو آپ کو یہ سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا ہوگا۔ سچ بتائیے۔ یہ ماحول آپ کو پسند آیا؟"

"سچ پوچھیے تو نہیں آیا۔ ممکن ہے بعد میں آ جائے۔"

"خدا کرے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کیوں! آپ تو خوبیاں۔۔۔" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ تو بہت خوش نخوش نظر آ رہی ہیں۔"

"ہاں بہت خوش ہوں۔" وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔

"آپ خوب گاتی ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اور خوب ناچتی ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ بھی تو کہیے۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ صرف پلکیں نظر آ رہی تھیں جو تھرتھرا رہی تھیں۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کی توجہ ہماری طرف مرکوز ہو گئی ہے۔ ہم دونوں چپ تھے اور دلگیر نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہے تھے۔ موتی کا مقبلہ اماڈا تو مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ شہزاد کے جسم کا تمام خون چہرے پر سمٹ آیا، ہماری گھبراہٹ سے سب کی نگاہیں پھوٹ پڑیں۔ میری ناراضی نگاہی نے اور ہمیر لگائی۔

"ہم کو تھدی بچہ پانے ماڑا، نجر پانے ماڑا، ماڑا، ماڑا۔" کہتے نے کولھے پر ہاتھ رکھ کے مٹکتے ہوئے کہا۔ "دیکھا استاد!"

مجھل نے آپ کو اس کی گردن پکڑ لی۔ "میں تیری کھال ادھیڑ دوں گا۔"

وہ غرا کے بولا۔ "چھوڑ مجھے اپنا شاہا جہاں پوری سب سے پہلے تیری ہی گردن پہ آزمانا پڑے گا۔"

"وہ دن کب آئے گا؟ کانتے نے چاقو کھول کے کہا۔ "اس کی حماقت بھی بہت ہانکی ہے استاد اکاٹ دو۔"

شہزاد کا داس میٹھی تھی۔ کانتے کی باتوں پر ایسے ہنسی گونجی کہ کانتے نے ایک سرد آہ بھری۔ "استاد! کبھی کبھی مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ساری بات گردن کے اوپر کھسکنے کی ہے اگر گردن ہل جایا کرتیں تو کتنا مزہ آتا۔ پھر میں کبھی کبھی للاڑے کی گردن اوھار مانگ کے دھر لایا کرتا۔ اپنی مشت بھی چند گھنٹوں کے لیے مل جایا کرتی۔"

"کوئی فرق نہ پڑتا۔" موتی نے کہا۔ "گردن سے نیچے بھی ایک چیز ہوتی ہے اُسے کہاں سے لاتا؟"

"استاد! میری مانو تو رنج لاڈلے کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ کچھ شرم دھرم تو ٹوٹے۔"

کریں۔ آہم لاڈلے کے بارے میں کیا کہتی ہو۔" کانتے نے پوچھا۔

"میرا بس چلے تو انھیں یہیں رکھ لوں۔" کریں نے فارفتگی سے کہا۔

"ہے ہے ظالم!" موتی پر جیسے گریہ طاری ہو گیا۔

دیر ہو گئی تھی۔ مجھل جھنجلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کریں نے اس سے کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا مگر مجھل ٹکر دیکھا تھا وہ دوبارہ فرش پر نہیں بیٹھا۔ اس کے اٹھتے ہی سب ٹھنڈی سانسیں بھرتے، ہائے ویلا مچاتے، انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ گئے۔ "اب کب آؤ گے؟" کریں نے مجھل کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کہا۔ "اتنا کل دو سال بعد پھیرا لگا جانا!"

"جلد ہی آؤں گا کریں۔" مجھل نے جواب دیا۔ "کوئی پریشانی ہو تو خبر کرنا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو گوگی سے کسی آدمی کو بلا لینا اپنے آدمی یہاں گھومتے رہتے ہیں۔"

"اور میرے لیے کیا حکم ہے؟" موتی نے کریں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "آنسو لاؤ گی یا لس ہیں یہیں تک بات ہے؟"

"تم دل سے بلاؤ گے تو سر کے بل آؤں گی۔" کریں کھل کھلا کے بولی۔

"اور ابھی تو تم شہر میں ٹھیرو گے جب تک یہاں ہو میرے حجرے پر روز حاضری دینا یہ میرا حکم ہے۔"

شہزاد سب سے پیچھے تھی مجھے یقین تھا کہ چلتے وقت وہ مجھ سے مخاطب کرے گی۔ اس لیے میں دانستہ ان لوگوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ دروازے پر اس نے جھک کے تسلیم کی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے جواب دیا۔ اس نے دروازے کے ایک جھلک کی طرح مجھ سے قریب ہو کے چپکے سے کہا۔ "دیکھیے آپ پھر کبھی ادھر نہ آیئے گا۔" اس نے قبل کہ کانتے ہمیں مڑ کے دیکھتا، وہ اپنا چہرہ پھیر کے مکان کے اندر واپس ہو گئی۔

جس وقت ہم یہاں داخل ہوئے تھے، یہ پورا علاقہ جگمگا رہا تھا۔ اب صرف ہوا تھا بلکہ جلی گئی ہے۔ روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ مچھیرن صاحب پنواڑی کی دکان بھی بند ہو گئی تھی لیکن ابھی کچھ راہگیر موجود تھے۔ کہیں کہیں کوئی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گلیوں میں جگہ جگہ پھولوں کی ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مجھل کی رخصت پر لگنے والے سپاہیوں کی نظر جب مجھل پر پڑی تو انھوں نے مجھل کی تعریف دریافت کی۔ واپسی میں بہت سے آدمی مخرائے مان میں شریک تھے اور مجھل آدمیوں کی بھی۔ وہ بات مجھل سے کرتے تھے اور گھور کے مجھے دیکھتے تھے۔ کسی میں اشتیاق تھا، کسی کی نظر میں تجسس، کہیں خشونت تھی کہیں عقیدت۔ دو دنوں ہی میں بہت سے لوگوں کے چہروں سے آشنا ہو چکا تھا۔ جیسے میرے میرٹھ سے آنے کے بعد مجھل کے چہرے پر مچھلیوں کا جال اور گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے اب کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ وحشی مرہٹوں کی طرح مجھل پر ٹوٹ پڑنا یا قرض خواہ کی طرح پولیس کے حوالے کر کے اقبال جرم کرا لینا کہ وہ ہمارے ساتھ مل میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ میرا مقصد اسے مارنا نہیں تھا۔ پھر بالفرض جو چاہیے فیصلہ کرنے تو بہ تین سزا موت تھی، نہ زندگی اور موت دینے کے لیے یکساں قسم کی نگرانی اس طرح میں مجھل اور اس کے ساتھیوں کو خدا سے نجات دلا سکتا تھا جو کہ صرف میری وجہ سے کسی بھی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے یا پھر میرے ارادہ میں ان کی نجات تھی۔ فرار ہونے کے میں پولیس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا۔ فرار ہونے میں کوڑا کی تلاش بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ کہیں تو ہو گی کسی جگہ، کسی وقت خود اور مولوی صاحب مجھے نظر آ ہی جائیں گے۔ ملاقات اور جو ہو گئی لیکن امید ٹوٹنے نہیں ٹوٹتی تھی۔ اسی امید میں نے چاندیاں کے گھر کا رُخ کیا تھا۔ چاندیاں کی باتوں سے یہ امید پھر ٹوٹ سی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس رات کے واقعے کے بعد میں رات کو رہا ہونے جدا سوئی تھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ بدمعاش مجھے پھنسانے کے لیے موجد کے ہاں لے گیا اور ایک فرضی خفیہ تنظیم بنی کا نام بھی لے دیا۔ بنی کا شاید کوئی وجود نہیں تھا مگر یہ امید بھی مجھ سے محبت کرا تی رہی دونوں غنڈے ان میں سے ایک بات تک ضرور موجود ہو گا۔ جس نے دریا کے کنارے اس منحوس رات میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی آخری سانس تک کوڑا کی تلاش جاری رکھنی تھی اور یہ بھی ممکن تھا جب میں یہاں سے فرار ہو جاتا۔

اور فرار کیسے ہو جاتا، باہر صحن میں مجھل کے کئی آدمی پہرا دے رہے تھے۔ دن میں اس کا امکان نہیں تھا کہ مجھل مجھے تنہا چھوڑ دے گا۔ ایک ہی واقعے میری طرف سے تماشا بننے کے لیے بہت تھا۔ مجھل کے آدمی شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس بڑے شہر میں چھپنا آسان، فرار مگر ناممکن تھا جب تک مجھل کو مجھ پر مستقل اعتماد نہ ہو جائے کہ میں ایک بار تنہا جا کے صحیح وسلامت واپس آ جاؤں گا، مجھے ایک قدم بھی قلعے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ مجھل میری طرف سے بُری طرح کھٹک گیا تھا۔ میں نے ہی اسے کل رات اشارہ بتایا تھا کہ وہ لڑکی کی زد میں ہے جس کے لیے بھرے مجمع میں چاندیاں پر جھپٹ پڑا تھا۔ اسی لیے آج صبح سے غائب ہو جانے کے بعد وہ سیدھا چاندیاں کے گھر پہنچ گیا اور جب میں وہاں نظر نہیں آیا تو اس نے موجد کے اڈے کا رُخ کیا۔ مجھل اس حقیقت سے بھی واقف ہو گا کہ چاند میاں کے مرنے کے بعد میری بے قراری میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس میں اسے مزید شدت کا یقین ہو گا۔

میرے پیر بندھے ہوئے تھے۔ ہتھکڑیوں میں ہر جگہ مجھل کی زنجیریں پڑی تھیں اور ایک زنجیر اس عمارت کے اوپر موجود تھی جس کا نام زنجیر تھا۔ زنجیر میں نے خود اپنے پیروں میں ڈال لی تھی۔ کل تمام سے میں اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ مجھل کے پیروں میں زنجیر ڈال کے خود کہیں بھاگ جاتا بھی ناممکن بات نہیں تھی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نسترن کے ہاں سے زنجیریں کھولنے کے بعد میرا مال کھڑے ہو جائیں گے تب بھی اسے نسترن کے حکم کو رد نہیں کرنا تھا۔ میرے ٹرالے کے بعد مجھل کی مرغ

کی سرکوبی کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ کریں کے اڈے میں بیٹھے ہوئے مجھل اور راہ چلتے ہوئے مجھل میں نمایاں فرق تھا۔ اب وہ اتنا خاموش نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخی بڑھ گئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا۔ آواز میں غضب اور غصہ تھا۔ جیسے وہ سب کے ناراض ہو اور جیسے کسی نے خلافِ طبع کوئی بات کہہ دی تو اس کا خون پی جائے گا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور یہ کہا جا رہا تھا کہ مجھل اور اس کے آدمیوں کی طرف آنکھ اٹھانے والے کی آنکھ نکال لی جائے گی۔ وہ کہتا تھا جس میں حوصلہ ہو وہ حسرت نکال لے کسی میں دم خم ہو تو سینہ تھونک کے سامنے آئے اور مجھل کے گریبان پر ہاتھ ڈالے، ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ اس کی بے اندازہ لاف وگزاف سے مجھے خدشہ ہوا تھا شاید مجھل ابھی تک موجد کی موت کے سلسلے میں ان اندیشوں سے پاک نہیں ہوا ہے جس کا اشارہ کانتے نے کیا تھا، اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا ہے۔ بہرحال مجھل کی شاندار واپسی لوگوں کی آمد رفت مبارک بادیں، گھوشی اور مجھل کے ساتھیوں کی ہم راہی اور سونا گاچھی میں ترانہ آمد کریں سے باتوں اور میٹھے کے واقعے میں انہماک دیکھ کے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اب پوری طرح مطمئن ہے موتی گانتے اور گھوشی نے اس دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے اندیشے میرے ذہن میں دوبارہ ابھرتے۔ مجھل کی دیکھا دیکھی موتی، کانتے اور یہاں ملنے والے مجھل کے دوسرے آدمی بھی بڑھ چڑھ کے باتیں کر رہے تھے۔ ہر چند کسی نے وہاں مجھل یا اس کے کسی آدمی کے بارے میں اپنے تعفن کا معمولی سا اظہار بھی نہیں کیا۔ وہ سب بڑے تپاک سے ملے تھے۔

ہم گھر واپس پہنچنے میں دو بج گئے۔ موتی کو ایک علیحدہ کمرے میں سُلا دیا گیا اور میں بڑے کمرے کی چاندنی پر لیٹ گیا۔ جسم سخت اور کھردری زمین پر سونے کا عادی ہو گیا تھا۔ تکیے کی عادت بھی جیل میں چھوٹ گئی تھی۔ نیند نہیں آئی۔ نیند کیسے آتی۔ نیند اس طرح آنے لگتی تو یہ دن کیوں آتے۔ نیند تو اُسی دن سے اُچٹ گئی تھی جس دن میں نے کوڑا کو دیکھا تھا۔ وہ نیند کے ساتھ سب کچھ لے گئی۔ خود میری آنکھوں کی پلکیں بھی ہو گئی۔ مجھے بھی کاٹنے جھپکنے گئی۔ برابر کے کمرے سے مجھل کی کھانسی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ میری وجہ سے کتنے لوگ جاگ رہے تھے میں نے یہاں آ کے مجھل کا سکون درہم برہم کر دیا۔ پتہ نہیں موجد کی لاش کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ مجھل نے اسے کہاں چھپایا اور شورہ پشتوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے کیا ترکیب ایجاد کی میرے دل کا دھڑکا بے وجہ نہیں تھا کہ کسی وقت بھی پولیس کی سیٹی میرے پیروں میں توبڑیاں پڑیں گی ہی، مجھل اور اس کے کئی آدمی گرفتار ہو جائیں گے۔ مجھل کو جیل میں ڈالنے کے لیے پولیس کو ایک بہانہ درکار تھا۔ مجھل کو جیل بھیجنا الزام اپنے سر لے گا۔ مجھل کے جو آدمی باہر رہ جائیں گے وہ ایک دوسرے کا خون کر دیتے پھریں گے اور اس شخص کا گھر ہی نہیں محلہ تک اجاڑ دیں گے جس کے متعلق ذرا سا شبہ ہو گا کہ اس نے موجد کی موت کی مخبری کی ہے۔ پھر ایک اور بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ درمیان میں مجھل کے چہرے پر ایک عکس کے اس گردش میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی مگر وہ سکون میری خوش فہمی تھی کہ گوشی کے ہاں سے آنے کے بعد مجھل کے چہرے پر مچھلیوں کا جال اور گہرا ہو گیا تھا۔ میرے میرٹھ سے آنے کے بعد مجھل کے اڈے پر اسے میری واپسی

اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتا مگر جمّل کی زندگی ہر لمحے خطروں کی زد پر رہتی تھی۔ ایک ہفتے آزادی دو سے ہفتے جیل اور یہ تو صرف میرا فیصلہ تھا۔ زرّیں کو بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے تھا۔ اس کی اپنی بھی تو ایک شخصیت تھی، وہ بھی تو کچھ سوچتی ہوگی۔ کچھ خواب اُس نے بھی تو دیکھے رکھے ہوں گے زرّیں کے خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے سوچا ابھی اور پڑ جاگے اُس کے فلیٹ کی کنڈی کھٹکھٹاؤں اور کہوں اب تم آزاد ہو جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ میں تمھارا اتنا خیال نہیں رکھ سکتا کیونکہ مجھے ایک شخص کی تلاش ہے، وہ زرجانے دُنیا کے کس کونے میں گم ہو گیا ہے۔

میری آہوں اور کروٹوں کی آہٹیں جمّل کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں اُس کے کان اُس کی آنکھیں میری ہی جانب لگی ہوئی تھیں، وہ کھانستا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ بتی جلائی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آکے رُک گیا۔ جاگ رہے ہو لاڈلے؟ اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ زخم میں تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر سوتا کیوں نہیں ہے؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیند تو کل رات بھی تیری آنکھوں میں نہیں تھی اب سو جا لاڈلے۔" سو جا۔"

وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمھیں بھی تو نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے تیکھے انداز سے کہا۔

"ہاں، وہ گردن ہلا کے بولا۔" میری نیند بھی روٹھ گئی ہے۔"

"کیوں تمھیں کیا ہو گیا؟" میں نے تنک کے پوچھا۔

"پتہ نہیں لاڈلے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا ہو گیا ہے؟"

"میں جانتا ہوں کیا بات ہے، میں آگیا ہوں۔"

اُس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ گھور کے مجھے دیکھا پھر تلخی سے کہنے لگا۔ "ہاں شاید یہی بات ہے۔" تو آگیا ہے۔ اُس کی تلخی پھر اور گہری ہو گئی۔ "تو جو آگیا ہے لاڈلے۔"

اُس کا لہجہ ہی ایسا تھا کہ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے یہاں آکے تمھیں سکون دینے کے بجائے اور پریشان کر دیا تم مجھ سے بہت ناراض ہو گے!"

"ہاں! میں تجھ سے بہت ناراض ہوں لاڈلے۔" وہ مضطرب ہو کے بولا۔ "تو ایسی باتیں کرتا ہے گا تو میں تجھ سے بالکل روٹھ جاؤں گا۔"

"تم بھی روٹھ جاؤ، مجھ سے سب روٹھ گئے ہیں۔"

اُس نے میرا سر اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "یہی تو آفت ہے کہ تجھ سے روٹھا نہیں جاتا۔ میں تجھ سے روٹھ نہیں سکتا۔"

"میں۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ "میں چلا جاؤں گا۔"

"چلا جائے گا۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا؟ مجھے معلوم ہے گو اتنا بزدل نہیں ہے۔"

"جب تک میں رہوں گا، ڈر کوئی مصیبت آتی رہے گی۔"

"مصیبت یہ نہیں لاڈلے جو تو سمجھتا ہے، مصیبت تو یہ ہے کہ تو کچھ سمجھتا نہیں۔" وہ پھر ترحّم سے بولا۔ "تجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے اور اس لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میرے جانے سے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"کون سے حالات! یہ تو کیا بک رہا ہے؟" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔

"حالات تمھارے سامنے ہیں، جو کچھ ہوا۔" وہ اچانک ہو گیا۔"

"کیا تو میرے سامنے صفائی پیش کر رہا ہے۔" وہ بگڑ کے بولا۔

"میں تمھیں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"لاڈلے جھوٹ مت بول، تو نے حقیقت ہی تو نہیں بتائی، دُکھ حالات کا نہیں کٹنے کا دُکھ تو یہ ہے کہ تو نے حقیقت نہیں بتائی۔ یہ حالات اپنا اور دُھنا بچھونا ہیں کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، کبھی ہاتھ اور چھڑ جاتا ہے کبھی ٹھیک جاتا ہے۔ تو مجھے حالات سمجھانے چلا ہے۔"

"لیکن اس بار تم جھوٹ بول رہے ہو، تم مجھ سے نہیں خود سے جھوٹ بول رہے ہو، تم جانتے ہوئے لوگوں کا منہ بند کرنا کتنا مشکل کام ہے اور پھر لوگ بھی جب پیسے ہوں، تمھیں حالات کی سنگینی کا پورا احساس ہے جس کا اظہار تم میرے سامنے کرنا نہیں چاہتے، تمھارا چہرہ بتا رہا ہے تمھاری آواز بتا رہی ہے۔"

"میری آواز، میرا چہرہ" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "تو نے ان میں جھانک کے ہی تو نہیں دیکھا لاڈلے۔ یہ حالات تو میں کسی طرح سنبھال ہی لوں گا، ان جرائم پیشوں سے نمٹنے کا کام مجھے آتا ہے، میں تجھے آج اس بدنام جگہ جان بچانے کے لیے گیا تھا تاکہ انھیں پتہ چل جائے کہ جمّل کے سینے میں کتنی طاقت ہے۔ اس کی ٹکر کا یہاں بہت سے کتے ہیں جو تیرے بجائے خود جیل جانے کو تیار ہو جائیں گے۔ پولیس، جیل، جن، جیلیں تو انھیں دیکھ کے ہی پگھلنے لگتا ہے، جیل تو ہماری ڈیوٹی ہے لاڈلے، اچھے لوگ ہی ہم گھر آتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے یہاں مجھے سارا شہر سنبھالا جا سکتا ہے، پر مجھے سنبھالنا اور تجھ سے نمٹنا مشکل نظر آتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ غم تو میرا ہے تیرا چہرہ کیا بتا رہا ہے، تیری آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں، تیری آواز کیا کہہ رہی ہے، تیری نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ لاڈلے لاڈلے۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "مجھے رگ رگ پٹھے اس لیے نہیں جانتے تھے کہ تو آزاد ہو کے انھیں زنجا کھسوٹنا شروع کر دے۔ اس دنیا میں آدمی کو دو سر، دس کی دکھتی رگیں نہ معلوم ہوں تو اُس کا جینا حرام ہو جاتا ہے، تو ابھی کچھ نہیں سمجھتا، تو ابھی ہاتھ دکھانے شروع کرے گا، کچھ تو تسلی کی ہوتی اور میں چلا جاتا، میری بات سن میرے سر کی قسم چاچا تو میرے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔ وہ بے قرار ہو گیا۔ "مجھے تیری چاچا بازی دیکھنے کا شوق نہیں ہے، جب آ جیل میں کتابیں پڑھتا تھا اور علم سے لکھتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔"

"مجھے کیا پتہ خود پسند ہے۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کے ناگواری سے کہا۔ "میں چاندیاں اور موجدہ کے پاس اپنی چاقو زنی کے جوہر دکھانے نہیں گیا تھا، میں تو دراصل کسی اور کام سے گیا تھا۔"

"اور کیا کام لے گیا تھا، میری آنکھیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔"

"میں اُسے اتنا مشکل کام نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے تمھیں نہیں بتایا اور بات بڑھ جاتی اور پھر مجھ سے اپنے سوا کسی کو بتایا بھی نہیں جاتا۔"

"کسی کو تو بتا دے لاڈلے! اتنا تامل خوف کر۔"

"کیا بتا دوں؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کون ہے وہ، کہاں ہے کدھر ہے؟"

"کون؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہی جو تجھے جیل لے گئی تھی، کون ہے وہ، کدھر رہتی ہے؟"

"کاش میں اُس کا پتہ جانتا، میں نے تمھیں کل ہی یہ بتا دیا تھا۔"

"چاند میاں کو اُس کا پتہ معلوم تھا؟"

میں اسی خیال سے اُس کے پاس گیا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن اُس کا پتہ نہیں چلا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "جہاں تمھارا دماغ کام کرتا ہے لاڈلے، اُدھر بھٹکنا چھوڑ دے، سات سال کا پھیرا پڑ گیا ہے۔ سات سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو، کیسی ہو، یا نہ ہو۔"

"ایسا مت کہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے ڈھونڈ رہی ہو گی۔"

"مجھے بتا دو تجھے کہاں اور کب ملی تھی؟"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُس نے میرے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تو نادانی بچے لگا۔ "ہائیں پھر بھی تو نے سالا جمّل کا لاڈلا جمّل کے بچے کے آنکھوں میں پانی لاتا ہے۔"

"مجھے جانے دو، میں اُسے تمام دُنیا میں ڈھونڈوں گا۔"

"کوئی کسی کو اس طرح سے ڈھونڈتا ہے لاڈلے۔ سات سال تو نے جیل میں بتا دیے، ذرا سا وقت لاتا تیرے بھاگنے لگا۔ آنکھ میں پانی آجانے تو چیزیں صاف نظر نہیں آتیں تیر بھاگنے میں سانس پھول جاتا ہے۔ تو نے کتابوں میں کیا پڑھا ہے رے تو تو اپنے آپ کو ادا بھلا رہا ہے وحشی۔ کام خراب کر رہا ہے۔ اس طرح وقت تجھے تھوڑی مل جائے گی۔ دیکھ! بدحواسی میں بات اور خراب ہو گی۔ یکلخت طریقے سے بھی ہو سکتا تھا میری مان جانی۔ ذرا انتظار کے حل سے محور کر۔ میں اس لیے بھروسہ دیتا ہوں کہ غور میں نے نہیں کیا تھا۔ لاڈلے تیرے پاس وقت ہے۔ جیل جب سے پیچھے کی تو تو آئی تو وقت نکل چکا تھا۔ تو جو بھی کر رہا ہے، تا جیل میں پڑا جائے گا تو اسے کیسے تلاش کرے گا۔ ایک جگہ سے بچ گیا ہے دوسری جگہ پھنس جائے گا۔ اوسان ٹھیک رکھ، پہلے اپنے آپ کو تلاش کر۔"

"تو تم کہہ رہے ہو وہ میں بھی سوچتا ہوں مگر تو مجھے بہت یاد آتی ہے تمھیں کیا پتہ ہے میں نے اُس کے لیے کن کن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اور کیا حاصل ہوا؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں جمّل کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں سفاس والی کے لیے اپنے ابا، امّی اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دیا میرے آبائی گھر کے لوگ دوسرے لوگ رہتے ہیں، میری امی مر گئی ہیں، میری کزا کو لوگوں نے بیچنے کی کوشش کی تھی ابو اعمی لوگوں نے اُسے میرے ساتھ رہنے نہیں دیا۔ جمّل کو کیا اندازہ تھا کہ میرا سینہ کیسے میرے آندر بار بار آگ لگتی ہے میرا جی چاروں سے سر پھوڑنے کو چاہتا ہے، میرا جی کرتا ہے کہ اپنے جسم پر بارود کے اتنے گولے باندھ لوں کہ کوئی باقی نہ رہے، جمّل مجھے سمجھا بجھا تا رہا اور اُس کی باتیں سمجھنے کے باوجود میں اس لمحے بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا، ہر سوچ سے بالاتر ہو کر سوچنے کی ایسی حالت میں کورا کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر "تو آج رات کے لیے اس کی بھی نہیں گیا۔" جمّل ناراضی سے بولا۔

"وقت ہی نہیں ملا۔" میں نے آہ بھر کے جواب دیا۔

"وہ کیا سوچتی ہو گی، اُسے لانے کے لیے کہہ کر، ابھی آٹھ کے ذرا واں جانا اور دیکھ میں صبح تیری یہ حالت دیکھوں سمجھ لاڈلے اس وقت میں تو اُداس ہو کے مجھے پریشان کرے گا۔ اس وقت تیرا سنبھلے رہنا ضروری ہے۔ میرا خاطر کچھ وقت اور نکالے۔ اب تو سو جا بچی لیٹ جا۔" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ اُس نے ایک تکیہ سر کے نیچے کر دیا، وہ کچھ دیر کمرے میں بھٹکتا رہا، پھر ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتا اور گہری سانسیں لیتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تک کہ رات کی سیاہی اُجلی ہونے لگی، مرغا بانگ دھوکے میں باہر گیا، نصیب میاں اور دوسرے لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ کوئی دیوار سے لگے تکیے کیے تسبیح پڑھ رہا تھا، کسی کا سر نیچے اور پیر اوپر تھے نصیب میاں بنیان پہنے ہاتھ اور ٹانگیں کھولنے کی غرض سے ورزش کر رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی اس نے ورزش ختم کر دی اور بلند آواز میں بولا۔ "آہا آفتاب عالم تاب طلوع ہو گیا۔" پھر اُس نے فلمی انداز میں مجھے مبارکباد دینے لگا۔ "ازراہ خدا اس ناہنجار کو بھی آٹھ مالٹے نہ ڈالیے گا، ہر چھ دن رگڑنے ہیں، دھر سوائی میں گزریں گے۔ غلاموں کی ہم رکابی کے بغیر باہر جانے کا قصد کیجیے، سرکار کی سواری دھوم دھام سے نکلنا چاہیے۔"

میں نے توجہ نہیں دی، وہ اپنے ساتھ لائے کی ایک پیالی پینے کی آوازیں لگاتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں زرّیں کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، تیزی کی وجہ سے میری سانس اکھڑ گئی تھی، کس نے نہایت عجلت میں دروازہ کھولا، وہ زرّیں ہی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے، وہ پائنتی پر پڑھا ہوا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں، شاید اسے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آئی کہ میں ہی اُس کے سامنے موجود ہوں پھر اُس کی آنکھیں تمتما اُٹھیں اور وہ بے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ "تو نے کل میرا انتظار کیا ہو گا۔" اُس کی شکایت سننے سے پہلے خود میں نے ہی پہل کر دی۔ "کل من بھر موضوعات پر سوچتی رہی۔" وہ کہیں بولی ہونٹ بھینچ لیے۔ "کیا حال ہے؟ جی تو چاہتا ہے گا ہو گا؟" اُسے چپ دیکھ کے میں نے جھک کے پوچھا۔ "کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی پریشانی نہیں۔"

"ناشتہ کر لیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں اور تم نے؟" اُس نے نظریں اُٹھا کے پوچھا۔

"میں نے بھی نہیں کیا ایسا تمہارے ساتھ کروں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر سرخ لہریں آ کے گزر گئی ہیں۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"ماما سے کہہ دو۔"

"میں خود لاتی ہوں۔" وہ اور اس کی بیٹی مجھے کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔" وہ فوراً باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں اندر کمرے میں آ کے اس کی سہری پر مچھ گیا۔ چادر پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ رسالے اور کتابوں کا ایک ڈھیر میز پر رکھا تھا۔ اس وقت بھی جیل جل رہی تھی مجھے اس کے بستر سے اس کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ ایسی ہی خوشبو کمرے کے سامنے آتی تھی۔ جب میں نے اس کا سر دبایا تھا تو اس کے بالوں میں یہی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار تکیہ منہ سے لگا لیا۔ نرتیں کے تنہ بوں کی چاپ سے مجھے ہوش آیا۔ اس نے ٹرے میز پر لا کے رکھ دی اور میرے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ اس دوران اس نے منہ بھی دھو لیا تھا۔ بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی، دوپٹے سے سر ڈھک لیا تھا۔ اتنی جلدی وہ ناشتے کا سامان لے آئی تھی۔ شروع کر۔ اس نے مجھے گم دیکھ کے کہا۔

"ہاں تم بھی تو شروع کرو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

اس نے پوری کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور سر جھکائے کھاتی رہی۔

میں نے کل دن بھر تمہارا انتظار کیا۔" وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔

"بس کل دن بھر الجھنیں ہی رہیں۔"

"مجھے تمہاری مصروفیت کا تھوڑا بہت علم ہو گیا ہے۔" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ گھبراؤ نہیں اب مجھے کچھ سمجھ آنے لگی ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم ہوا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی جو کل ہوا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کل کیا ہوا؟" میں نے بھینپ کے پوچھا۔

"معلوم ہوا کہ تم نے چاند میاں اور موجدار سے بدلے لیا اور بھی بہت سی باتیں مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہوئیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس معلوم ہو گیا۔ تم نے ناشتے سے ہاتھ کیوں اٹھا لیا؟"

"پہلے بتاؤ یہاں کون آیا تھا؟"

"کوئی بھی نہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "مجھے تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔" اس کا انداز شکایت کا ہو گیا۔

"ضرور یہاں کوئی آیا تھا اور تمہیں کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں؟"

"مجھے معلوم ہوا کہ تم نے ایک لمبی مدت جیل میں گزاری ہے۔" وہ سکون سے بولی۔ "تم پر قتل کا الزام تھا۔ جیل میں تم نے اعلا تعلیم حاصل کی۔"

"اور کیا کیا؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"بس ابھی اتنا ہی کچھ معلوم ہوا ہے۔"

"اور تمہیں ڈر نہیں لگا؟ تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ خرما گئی۔

"تو مجھ پر ترس آیا ہو گا؟"

"ہاں یہ کہہ سکتے ہو۔" وہ خوشی سے بولی۔

"مگر یا تمہیں اس ماحول کا صحیح اندازہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں میرے لیے یہ سب باتیں نئی ہیں جو میں نے کتابوں میں پڑھا تھا۔" اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟" وہ روانی سے بولی۔

"کچھ نہیں میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا بات؟" وہ چونک کے بولی۔

"نرتیں! اچھا ہوا تمہیں کسی ذریعے سے سہی اس ماحول کا اندازہ ہو گیا میں نے اسی سلسلے میں بات کرنے کے لیے تمہیں نسترن کے گھر سے نکلنے سے پہلے اور بعد کر میں بلایا تھا۔ بہت سوچ بچار کر تمہیں ساتھ لے کے کہاں جاؤں۔ ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ ہے اس کے سوا کوئی جگہ نظر نہیں آئی جو غار ہے یہ تمہارے لیے مستقل جگہ نہیں ہو سکتی یہ تو ایک عارضی پناہ گاہ ہے یہاں عجیب عجیب لوگ رہتے ہیں تم ایک بڑے خاندان کی جذبات لڑکی ہو۔ کچھ دنوں بعد تمہیں اس ماحول سے خوف آنے لگے گا۔ یہاں کسی کا کوئی بھروسا نہیں کہ وہ کب جیل میں چلا جائے یا قتل ہو جائے یہاں ایک دوسرے پر لگی چاپا توتے کھڑے ہیں میں جب ادھر دیکھتا ہوں اور جب تمہیں دیکھتا ہوں تو میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔"

"اتنے پریشان نہ ہو میری کوشش ہو گی کہ میں اپنے آپ کو گراں محسوس نہ ہونے دوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "اب یہی میرا خاندان ہے یہی میری تہذیب ہے۔"

"پھر بھی نرتیں تمہیں اپنے متعلق کچھ نہ کچھ سوچنا ضرور ہو گا۔" ابھی ابھی وہ خوشی سے گفتگو کر رہی تھی اتنی سی دیر میں جل گئی سجھے یا سمجھ سے دیکھنے لگی اور بے چینی سے اپنے دوپٹے کا گوٹا ادھیڑنے لگی۔ "نرتیں۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو بہت خوب صورت ہو ایک اچھی لڑکی میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب تم میں موجود ہیں یہ جگہ تمہارے رہنے کی نہیں کیونکہ یہاں کے مکین خود اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔"

"مجھے ان مکینوں سے کوئی غرض نہیں۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "یہ سب لوگ اچھے ہیں انھوں نے مجھے پناہ دی ہے اور پھر تم جو موجود ہو۔"

"میں۔ میں کہاں ہوں تم مجھے شرمندہ مت کرو۔"

"کیوں! کیا تم مجھے راستے میں چھوڑ جاؤ گے۔ اب میرا کون سا گھر ہے جہاں میں وہاں واپس جا سکتی ہوں وہ لوگ مجھے پہلے ہی کون سا گھر میں رکھے ہوئے تھے۔"

"میں تمہیں کیسے بتاؤں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے خود یہاں نہیں رہنا مجھے بہت دور جانا ہے۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"نہیں! میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" نہ جانے مجھے کہاں کہاں جانا پڑے میرا کوئی یقین نہیں ہے۔ میں اگر یہاں بھی رہوں تب بھی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔"

"آخر ماجرا کون سی بات ہے جو تمہیں اس قدر الجھائے ہوئے ہے۔"

"میں تمہیں کیا بتاؤں۔" میں نے بذیانی انداز میں کہا۔

"تمہارا غبار ہلکا ہو جائے گا۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی اپنے سینے میں محفوظ کروں گی مجھ پر اعتبار کرو۔"

"نرتیں! وہ کوئی راز نہیں ہے تم سمجھ ہی ہو۔"

"پھر کیا ہے تمہیں آخر کیا پریشانی ہے۔"

"کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "اپنے آپ پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے میں اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ میرا مستقبل دنیا میں نہیں لگتا۔" میں نے اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے سر اٹھایا۔ تم کہتی تھیں تمہاری ایک بڑی جاگیر ہے جس پر تمہارے بدبخت خالو نے قبضہ کر لیا ہے نرتیں تم اپنے گھر جا کے ایک نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں تمہارے خالو کو تمہارے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اپنا گھر بھرا پرا گھر ہوتا ہے تم کہیں بھی سکون سے نہ رہ سکو گی تم میرے ساتھ چلو اگر وہ نہ مانے تو میں تمہیں لا کے واپس چھوڑ آؤں گا۔ پھر تم کوئی اور راستہ ڈھونڈ لینا۔"

"میں ماں کیسے جا سکتی ہوں کون مجھے اتنے دنوں کی گم شدگی کے بعد قبول کرے گا۔ میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔"

"وقت اور تمہارا رویہ ہر تلخی دور کر دے گا۔"

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ تیز آواز میں بولی۔ "میں اب وہاں نہیں جا سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے تم میرا گلا گھونٹ دو۔"

"نرتیں۔ ایک بار ہاتھیں اور آزمانے کی ضرورت ہے میں تو تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ان سے بات کریں گے وہ کیسے نہیں مانیں گے۔ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جائیں گے اور برسوں میں خجالت پر آمادہ ہوں گے اب تک تم وہاں سب کے اور گھٹ کے سردار ہی تھیں اب تم ذرا ہمت اور حوصلے سے بات کرنا میں تمہاری خیریت پوچھتا رہوں گا۔ تم اپنی جاگیر کسی اور کے نام کر کے اپنے خالو کی دست برد سے محفوظ رہ سکتی ہو ہزار طریقے نکل آئیں گے۔ ہمت پیدا کرو نرتیں! میں تمہارے بھلے ہی کے لیے اصرار کر رہا ہوں۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں ورنہ میں تمہیں یہاں کیوں لاتا۔ وہاں اگر تمہیں کوئی پریشانی ہو تو مجھے خط لکھ دینا' جمیل کو تار دے دینا۔ ایک نہیں کئی کئی آدمی تمہاری مدد کو آ جائیں گے۔ مگر جب تک تم خود بے حوصلہ رہو گی کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔"

اس نے منہ پھیر لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں اسے بہتا سمجھانے کی کوشش کرتا اتنا ہی بے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میں بدحواس ہو گیا سمجھ میں نہیں آیا کس طرح اسے خاموش کروں۔ اس کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ جھجکتے جھجکتے اس کی کرسی کے پاس پہنچا۔ مجھے معلوم تھا آدمی کب ڈرتا ہے۔ عمل میں کھلبلی مچتی ہے جب ڈرتا ہے آنکھیں ملنے لگتی ہیں جب کرتا ہے۔ اس وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اسے بیٹھے بٹھائے رلا دیا۔ وہ بھی کتنی خوشی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ مجھ سے اس کی خوشی دیکھی نہیں گئی۔ میں خوش نہیں ہوں تو شاید میرا جی چاہتا ہے دنیا کا ہر آدمی ناخوش رہے۔ جی میں آیا کہہ دوں تم سیدھی طرح گھر لوٹ جاؤ۔ میں تمہاری مدد کرنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں نسترن کے پاس لے جاؤں گا کیونکہ میں تمہیں نسترن کے پاس سے لایا ہوں۔ زبان سے یہ لفظ ادا نہیں ہو سکے۔ میں نے جھنجلا کے اپنے آپ پر قابو پا کے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کی میرے ہاتھ اس کے بالوں سے مس ہوئے تو رک گئے۔ "نرتیں۔" نرتیں۔" میری گلوگیر ہوئی آواز ابھری۔ "نرتیں۔ میں نے تمہیں ایک تجویز پیش کی تم پرسکون سے سوچ سکتی ہو۔ تم کسی دوسری ترکیب پر بھی غور کر سکتے ہیں تم تو ایک بہت اچھی بات پر بسورنے لگیں۔ مت رو۔ مت رو۔" میں تمہیں چھوڑ کے کہیں چلا جاؤں گا۔ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

میری بات بے اثر نہیں ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا تو رونے نہیں گیا۔ "میں دوبارہ کر آؤں گا۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "تمہیں پریشان ہو گا۔ جب میں دوبارہ کر آؤں تو تم میرے لیے میٹھے چاول پکا رکھنا۔" مجھے میٹھے چاول کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا اور میری بات پر سکون سے سو جو رہا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ اتنی تیزی سے کہ سیڑھیوں سے پھسل گیا۔ گھٹنے لوگ گئے میں چوٹ اگلی مگر کپڑے جھاڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہیں جمیل میرا انتظار کرتا ملے۔"

*

اندر کمرے میں جہاں میں رات سویا تھا' نعش ابھی پڑی تھی۔ دو آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ موتی جمعدار کے بائیں طرف اور نصیب علی بائیں طرف تھے۔ درمیان میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جمیل براجمان تھا۔ اسے دیکھتے ہی موتی نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ جمعدار کے سامنے شیرینی مختلف حصوں کی سرگرمیوں کی روداد پیش کی جا رہی تھی۔ فلاں علاقے میں فلاں میں تیزی ہے ادھر پولیس کا دباؤ بڑھا ہے ادھر بارے کا ڈی ایس پی ہو کے بھاگلپور چلا گیا ہے تھوڑی دیر پہلے گزری تھی کہ کسی نے آ کے اطلاع دی کہ کشمی داس استاد سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

موتی چونک پڑا۔ "کاہے کو بلایا تھا کشمی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کشمی داس کے نام پر سارے کمرے میں بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ جمعدار نے ہاتھ اٹھا کے سب کو خاموش کرا دیا۔ "آ موتی۔" گھومتی نصیب علی نے کہا۔ "کشمی داس کا حکم دیا۔" کچھ پہلے ہی آگیا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "آ موتی۔" گھومتی نصیب علی نے کہا۔" جمعدار اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا اور میرا ہاتھ پکڑے باہر صحن سے ہی گزرے میں اگلا کمرہ یہاں ایک چوکی بچھی ہوئی تھی۔ ادھر اور دھر مونڈھے پڑے تھے۔ جمعدار کا حقہ اس کے سامنے رکھ کے چلا گیا۔ جمعدار نے مجھے اپنے داہنے چوکی پر بٹھا لیا۔ چند منٹ بعد سیٹھ لکشمی داس دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں آدمیوں نے بڑے بڑے خوان سر پر اٹھا رکھے تھے سیٹھ نے آ کے سب سے پہلے سب کو رام کیا۔ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ جمعدار نے اسے مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔ "کیا حال ہے سیٹھ؟"

"اُستاد رات میں نشے میں تھا' کچھ خیال نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں سیٹھ۔ رات تم اگر نشے میں نہ ہوتے اور صبح یہاں آتے تو بھی ہمارے دل کے دروازے اسی طرح کھلے ہوئے ملتے۔"

"مجھے بہت مزہ ہے استاد پر وہ مجھے پسند بہت ہے۔ وہ دبلے لمبے ہیں بلا۔
"کرنیں سے بات کرو ممکن ہے وہ مان جائے مگر وہ نتیجے نہیں مانے گی۔
تنویر اٹھانے سے پہلے یہ خیال کر لینا کہ اس کی پہنچ دور دور ہے۔"
"رات کی بات جانے دو میں نے کہہ دیا مجھے دکھ ہے" بس نتیجے میں تھا۔
سیٹھ نے تنک کے کہا "اب اس کا ذکر مت کرو۔"
"جانے دو" مچھل بے پروائی سے بولا۔ "پر سیٹھا ایک بات سن لو زیادہ نشہ ہر چیز کا برا ہوتا ہے۔ طاقت کا، دولت کا، حسن کا، شراب کا۔"
"میں سمجھتا ہوں استاد۔" سیٹھ نے نظریں جھکا کے کہا۔ "یہ خوان نذر کے لیے لایا ہوں اسے قبول کر لو۔"
"اس کی ضرورت نہیں سیٹھ" اسے واپس لے جاؤ تمھارا آنا ہی بہت ہے۔"
"نہیں استاد یہ تو تمھیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔" مچھل کے انکار پر اس کا اصرار بڑھ گیا اور اس نے خوان قبول کیے بغیر خصت ہونے سے انکار کر دیا۔ مچھل نے اُسے قبول کر لیا۔ نصیب میاں نے فوراً جانے کا اہتمام کیا۔ جب خوانوں سے سرپوش اٹھائے گئے تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مچھل نے خوان پوش ڈھک دیا اور سیٹھ سے اس کے کاروبار کی جگہ اور کام کے متعلق پوچھنے لگا۔ سیٹھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا رہ سکے ہاتھ ملا جب میری طرف آیا تو اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ "لاڈلا" وہ زیر لب مسکرا کے بولا۔ "میری خواہش ہے تم میرے ساتھ کام کرو اور اگر کبھی تمھیں میری ضرورت پڑے تو بے جھجک چلے آنا۔"
"شکریہ" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔
"استاد کبھی آپ لوگ اس طرف آئیں کیوں ایک مجرے کا انتظام کرایا جائے۔"
وہ مہذب انداز میں بولا "موقی ابھی تو آپ یہاں ہیں۔"
"ہاں۔ مگر دیکھو سیٹھ نشہ پارہ نہیں لگنے چاہئیں۔"
موقی کی بات پر کاننے کی ہنسی چھوٹ گئی، سیٹھ اور مچھل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ سیٹھ کے جانے کے بعد مچھل نے دونوں خوان نصیب میاں کے حوالے کیے کہ معاملہ اپنے اور مچھل کے آدمیوں میں تقسیم کر دے۔ مچھلی رات کا واقعہ تھا۔ سیٹھ کی اچانک آمد سے جو حیرت کی بات تھی مگر مچھل کے تبسم سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے سیٹھ کی آمد کا پہلے سے یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے سیٹھ کی آمد سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی ماں کا مطلب تھا کہ سیٹھ آج رات پھر نشہ پارہ کے پاس جائے گا اور نشہ پارہ اس کے جانے ناچے گی اور سیٹھ للچائی نظروں سے اسے دیکھتا رہے گا۔ اس کا ہاتھ پکڑے گا۔ وہ تھک جائے گی اور کرنیں دلیوں کے لالچ میں اسے سیٹھ کے حوالے کرے گی۔ مگر مجھے یہ سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔
مجھے حصہ عدد زریں کے پاس میٹھے چاول کھانے کے لیے جاتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی میں سہ پہر تک نہیں گیا پھر زریں نے مجھے ماما کے ہاتھ خود ہی بلوایا اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے کوئی اور بات نہیں کی چاول کھائے تھے مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔
اسکول سے واپسی پر اماں بطور خاص میرے لیے میٹھے چاول چھپا کے رکھ دیتی تھیں کہ انھیں کوئی اور نہ کھا جائے۔ رات کو مچھل پھر مجھے اپنے ساتھ لے کے مختلف علاقوں میں گھومنے نکل گیا۔ نئے پرانے لوگوں سے بھینٹ ہوئی۔ مچھل کی تیسری بیچے اور کئی ٹیکیاں تھیں، وہ کئی موٹروں، جوئے خانوں اور شراب کے اڈوں پر گیا اور اس نے ہر جگہ گوشتہ رات والی تاختی کا مظاہرہ کیا۔ ایک بڑے علاقے کا چکر کاٹتا ہوا مچھل آدھی رات کو اڈے پر واپس آیا۔ میں موقع کا منتظر تھا۔ رات کو جب خاموشی چھا گئی تو میں نے اس کے کمرے میں جا کے زریں کا ذکر کیا کہ وہ مجھے کہاں ملی اور کیسے ملی اور کہاں سے آئی ہے۔ میں نے اسے زریں کے متعلق سادی بات بتا دی اور اس سے اصرار کیا کہ زریں کی بہتری اسی میں ہے کہ اسے اس کے گھر فیض آباد پہنچا دیا جائے۔ اس نے میری باتیں درمیان میں کوئی دخل دیے بغیر اطمینان سے سنیں۔ "زریں کی منشا کیا ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"اس کی منشا نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔
"پھر تو اسے اس جہنم میں دوبارہ کیوں رسید کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہوئی۔" میں نے اس لڑکی کو بیچا کیا ہے۔ وہ کیا کہے گی کہ باپ نے بیٹی بنایا۔ بنا کے چھوڑ دیا۔ جا سو جا تو تو بھی کبھی بالکل بچہ بن جاتا ہے۔"
میں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور جن باتوں سے زریں کو قائل کر پایا تھا وہ اس کے سامنے دہرا دیں۔
"میں نے تو کچھ اور سوچا تھا لاڈلے زریں بہت ہی خوب صورت لڑکی ہے بہت بھولی بھالی۔ تو کیسا کٹھور بن گیا ہے۔"
"تم میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے اس کی ایک بڑی جاگیر فیض آباد میں ہے وہ ملے مل جائے تو وہ اطمینان سے رہ سکتی ہے۔"
"وہ لڑکی ہے اور جوان ہے لاڈلے لڑکی کے لیے جاگیر اس وقت تک بے کار رہتی ہے جب تک کوئی اسے سنبھالنے والا نہ ہو۔ نہیں نہیں۔ میری ضد ——— سے وہ جھنجلا گیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا۔ "لاڈلے! وہ اس چار دیواری سے تبھی باہر نکل سکتی ہے جب خود اس کی منشا ہو۔ میں تجھے اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"
اس کے بعد مچھل سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں خفا ہو کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے دوسرے دن اس سے بات بھی کم کی دوسرے دن رات کو وہ پھر مجھے گھمانے لے گیا۔ میں بجھا بجھا سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ دوسرے دن دوپہر تیز کے پاس بھی گیا اور چند لمحے بیٹھ کے واپس آ گیا۔ پر اسرار بند تھا۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں مچھل نے شاید موجدار کے اڈے کا کچھ بندوبست کر لیا تھا کیونکہ مچھل کے انداز میں اب اتنا اکھڑپن نہیں رہا تھا۔ شاید موجدار کا سودا مچھل کی مرضی کے مطابق طے ہو گیا تھا۔ گھوشی کو مستقل طور پر موجدار کے اڈے پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ ساتھ میں مچھل کے آدمی بھی تھے۔ جیل میں میں نے ان لوگوں سے یہاں کا جو حال سنا تھا وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ دن بھر یہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی، صبح والوں کی جو مچھل کے ساتھ رہتے تھے اڈے سے نکل جاتے۔ پھر وہ لوگ آتے رہتے جو یہاں نہیں رہتے تھے، کوئی سلام کرنے آتا، کوئی نذر کے جیب لڑکتا، کوئی صرف کاننے سے بات کرتا۔ کسی کا تعلق صرف شمول سے تھا۔ کوئی نقد کے پاس تک کے روپے جمع کرا دیتا تھا۔ یہ سب مال اکٹھا کر کے نصیب میاں کے حوالے کر دیا جاتا جو ایک بڑے سے رجسٹر کھولتے میں اس کا اندراج کرتا۔ زیادہ بات زبانی ہوتی تھی۔ مچھل مطمئن یا بے چین رہتا یا غصہ ہوتا یا خوش ہوتا یا گالیاں دیتا یا اگلے دلے لوگوں سے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ میں نے محسوس کیا جب میں سامنے آتا ہوں تو موضوع کچھ بدل سا جاتا ہے۔ پہلے پیسے سمیٹ لیے جاتے ہیں پھر مچھل مجھے ساتھ لے کے دوسرے کمرے میں چلا آتا ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دس دن سے زیادہ گزر چکے تھے میں یہ کہہ کے یا اس کی گالی نہیں تھا تو ڈرکے میں تنہا خاموش بیٹھا رہوں یا ان لوگوں کی باتیں سنتا رہوں، موقی اسٹیشل دلیں چلا گیا تھا۔ جب جمعیت بہت گھبراتی تو میں زریں کے پاس چلا جاتا۔ لیکن وہاں کوئی بات ہی نہ ہوتی اسے دیکھ کے مجھے کرایا یاد آنے لگتی اور میں گھڑے کے پیچھے آ جاتا اور پھر اس کے پاس چلا جاتا۔ زریں کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت بھلی لگتی تھیں۔ اب وہ عموماً سوجی ہوئی رہتی تھیں۔ جب میں واپس پہنچ آتا تو خود کو ملامت کرتا کہ اس کے سامنے مجھ سے بات کیوں نہیں کی جاتی۔ اداس کے جاتا ہوں، وہ بھول کیوں جاتا ہوں اور یاد آتا ہے تو مہرانے کی ہمت کیوں نہیں پڑتی۔ سو ایک گمان میں ارادہ کر کے گیا کہ آج اس سے ضرور بات کروں گا۔ اس نے سب معمول مجھے پہنچے پیش کی اور میرے سامنے خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے بولنے کی جرأت کی جیسے آج میں پہلی بار اس سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "زریں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
"کیا کیا بات ہے؟" وہ سٹ پٹا گئی۔ "طبیعت تو خراب نہیں ہے؟"
"زریں" میں نے اضطراب سے کہا۔ "میں مر جاؤں گا۔"
"نہیں۔" وہ سراسیمگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ "اگر تمھیں کیا غم ہے۔"
"میرا غم یہ ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ کاش یہ ایک گاؤں یا ایک شہر کے برابر ہوتی۔"
"تو پھر کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔
"پھر شاید مجھے قرار آ جاتا۔"
"مجھے بتاؤ تمھیں کس طرح قرار آ سکتا ہے؟" وہ بے چینی سے بولی۔ "میں تمھارے کسی کام آ سکتی ہوں میں تمھارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"
"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
"مطلب اس پریشانی میں تمھیں میری پریشانی بھی لاحق ہو گئی۔"
"ہاں۔ تم میری بات مان لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اس سے یہ سطلب نہیں تھا کہ میں تمھیں بار سمجھتا ہوں میں تم سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمھاری اور اس بچی کی بہتری ذہن میں رکھ کے یہ تجویز پیش کی تھی۔ میں تم سے رشتہ نہیں توڑنا چاہتا۔"
"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"کیا کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"
"یہی کہ تم جہاں کہتے ہو میں وہاں چلی جاؤں گی چاہے جدھر کچھ ہو میں تمھیں اور پریشان نہیں کروں گی۔ تم لے جہاں چاہے پہنچا سکتے ہو میں تمھارے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ میں تمھارے گھر پہنچا چاہتا ہوں تمھارا گھر۔ تمھاری ماں اور باپ کا گھر۔"
"تم چاہے جہاں پہنچا دو۔ میں تیار ہوں۔"
"زریں! میں تمھیں وہاں نہ لانے پر مجبور کے نہیں لایا میں تمھارے لیے لڑوں گا تمھیں اپنے گھر میں عزت سے بٹھا کے اس کا اصل مقصد تمھارے پاس کوئی آدمی چھوڑ کے آؤں گا۔ میں مچھل سے کہہ کے ماما اور اس کی لڑکی بھی تمھارے ہمراہ کر سکتا ہوں مچھل کے دوست اور دشمن شہروں میں ہر جگہ ہیں۔ تمھیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ میں بھی کبھی کبھار نہیں ہوں گا۔ تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک بار وہاں چلے کے صورت حال تو دیکھنی چاہیے۔"
"ٹھیک ہے تم جو چاہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے بمشکل اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے کچھ دیر اس کی واپسی کا انتظار کیا پھر کچھ سوچ کے نیچے اتر آیا۔
مچھل کو آمادہ کرنے میں تین چار دن لگ گئے اس کے باوجود اس نے خود میرے ساتھ اوپر جا کے زریں سے بات کی۔ زریں نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ مچھل نے اس سے کہا کہ فیض آباد میں کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہو تو اسے فوراً مطلع کرے۔ سیٹھ نے اس سے یہاں تک پوچھا کہ کہیں اس نے میرے دباؤ میں آ کے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اس نے اپنی مرضی سے کیا ہے مچھل اسے سمجھاتا رہا۔ زریں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی نہیں کی۔ "تم جب چاہو یہاں آ سکتی ہو اس کے لیے لاڈلے کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ تم میری بیٹی ہو۔" یہ کہتے ہوئے مچھل کی آواز بھرا گئی اور اسے نہ جانے کیا ہوا۔ وہ مجھے زریں کے پاس چھوڑ کے تیزی سے نیچے اتر گیا۔
فیض آباد میں مچھل کا کوئی دوست نہیں تھا لیکن لکھنؤ میں موقی جیسا ایک دوست کنن خاں موجود تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ مچھل نے نصیب میاں سے کنن خاں کے نام ایک مختصر خط لکھوایا کہ وہ فیض آباد جا کے اس کی بھیجی ہوئی لڑکی کی جاگیر واپس دلانے کے لیے ضروری قدم اٹھائے۔ ایسا ہی ایک خط اس نے میرے حوالے کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مچھل مجھے تنہا روانہ نہیں کرے گا اس نے قفے، ٹولی اور سائیس کو میری ہمراہی کے لیے منتخب کیا۔ قفے کو حکم دیا کہ اگر زریں ضروری سمجھے تو وہ وہاں کچھ دنوں تک قیام کر سکتا ہے۔ زمین دن کے اندر اندر زریں کے بیس جوڑے بنوا لے گئے اور کئی زیور۔ مچھل نے اسے کچھ نقدی بھی دی۔ رات کے وقت گہرے اندھیرے میں جب سارا عملہ سویا ہوا تھا۔ مچھل نے زریں کے سر پر ہاتھ رکھ کے آشیرواد دیا۔ ماما پچھلے دروازے سے زریں کو لے کے نیچے اتری اور شکریں

بیٹھ گئی۔ احتیاطاً یہ رازداری کی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ہمیں ویٹنگ گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ زرّیں کو فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس میں آئی تھی، فرسٹ کلاس میں واپس جا رہی تھی۔ ہم دوسرے کلاس کے برابر کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن شام کو گاڑی سب اُس کے برابر کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن شام کو گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی۔ طویل قامت، گرانڈیل، سرخ و سپید کپتان خاں اپنے ساتھیوں سمیت اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُس نے ہم سب کو گلے لگایا جیسے ہماری پرانی جان پہچان ہو۔ کپتان خاں کا اصرار تھا کہ ہم ایک رات لکھنؤ ہی میں گزاریں مگر ہم اُسی رات فیض آباد روانہ ہو گئے۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جامو ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں ایک بڑے مکان میں ٹھیرا دیا گیا۔ میں نے سفر میں دانستہ زرّیں کے پاس بار بار جانے سے گریز کیا تھا۔ اب بھی میں اُس سے دُور دُور رہا۔ صبح تک ہم ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے۔ میں نے کپتان خاں اور جامو کو زرّیں کی ساری کہانی سُنائی۔ انھوں نے اُس کے خالو کو کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ صلاح ٹھیری کہ اُس سے کوئی مفاہمت نہ کی جائے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہم پندرہ آدمی، کپتان خاں، جامو اُن کے ساتھی اور ہم چار، زرّیں کی وسیع و عریض حویلی میں پہنچے تو اُس کا خالو ہمیں دیکھ کے بوکھلا گیا۔ اُس سے کوئی بات ہی نہیں کی گئی۔ اُسے یہ یقین دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔ جامو نے اُسے حکم دیا کہ وہ شام تک حویلی خالی کر دے اور حویلی کے علاوہ دُوسری تمام جائداد اور زمینوں کی دستاویزیں بھی زرّیں کے حوالے کر دے۔ اس سلسلے میں کوئی پھل فریب یا کوئی قانونی اُلجھن ڈالی گئی تو انجام تباہ کن ہو گا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، اُس سے کہیں زیادہ آسانی سے بات نمٹ گئی۔ وہ ہم سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اُس نے زرّیں کے قدموں پر سر رکھ کے معافی مانگنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس کی ساری متمّنیں خوشامدیں ضائع ہو گئیں۔ چار آدمی وہاں تعینات کر کے باقی واپس آ گئے۔ حویلی میں سامان کا بیشتر حصّہ زرّیں کی ملکیت تھا۔ جامو نے ایک وکیل بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اُس نے ضروری کاغذات تیار کیے۔ شام کو میں زرّیں کو ساتھ لے کے اُس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ لرز رہی تھی اور مجھے اُسے سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اپنے آدمی پھیلا کے جامو نے اس بات کا بھی انتظام کر دیا کہ محلّے والے کوئی رخنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جامو کے وکیل نے کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد زرّیں کے خالو اور اُس کے خاندان کو حویلی سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ زرّیں کو اپنی خالہ اور بہن بھائیوں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ اُن کا سامان جامو کے آدمیوں کی نگرانی میں دن بھر ڈھلتا رہا۔

شام تک حویلی پر زرّیں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اپنے مکان میں دوبارہ آ کے اُس کی عجب حالت ہو گئی تھی۔ جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چیزیں دیکھتی تھی، پوری حویلی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ حویلی کے آبائی ملازم وہیں رہ گئے تھے۔ وہ زرّیں کی واپسی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ زرّیں ملازماؤں سے گلے مل کے روتی تھی اور ایک ایک چیز آنکھوں سے لگاتی تھی، اُس نے مجھے پوری حویلی کی سیر کرائی۔ اپنی نانی اور نانا کی قدِ آدم تصویریں دکھائیں۔ بیٹھک کھول دی گئی تھی۔ کپتان خاں، جامو اور اُن کے ساتھی وہاں بیٹھے حقّے گپیاں کر رہے تھے۔ رات کے کھانے کا انتظام جامو نے کیا تھا۔ حویلی ہی میں کھانا آ گیا تھا۔ حویلی میں کھانے پینے کا فوری انتظام ممکن نہیں تھا۔ سب کچھ ایک دن میں ہو گیا۔ مجھے خود یقین نہیں آتا تھا۔ لگتے سے لگتے میرا دل بہت پریشان رہا تھا۔ نہ معلوم فیض آباد میں کیا حالات پیش آئیں۔

کھانے کے بعد جامو نے ہم سب کو گانا سُننے کی دعوت دی۔ میں نے زرّیں کی وجہ سے انکار کیا مگر وہ نہیں مانا۔ حویلی کے اندر اور باہر جامو کے آدمی موجود تھے اس لیے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے زرّیں سے اجازت لی کہ میں جامو کے ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں، شاید رات کو دیر ہو جائے۔

فیض آباد کا بازار مختصر تھا مگر یہاں لکھنؤ سے زیادہ نفاست نظر آتی تھی۔ نخل کی طرح تو نہیں مگر جامو کی عزت بھی فیض آباد میں کچھ کم نہیں تھی۔ اُس کا ڈیل ڈول مرتی جیسا تھا۔ بہت منہ پھٹ تھا، بات بات پر گالی بکتا تھا۔ میں تھیں ایک خاص جگہ لے جا رہا ہوں۔ میں نے پہلے ہی وہاں کہلا بھیجا تھا کہ آج دس بجے کے بعد کسی وقت میں اپنے مہمانوں کے ساتھ آؤں گا۔ وہاں ایک چیز دیکھنے کی ہے، کلام زیادہ بات نہیں کرتی، کھوئی کھوئی رہتی ہے، اُس کی یہی ادا بھیما خانہ خراب کر دیتی ہے، گانی کیا ہے، دل پر چھریاں چلاتی ہے۔ یہ سارے راستے جامو اُس کی تعریف کرتا رہا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر پہنچے، دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی کی سُریلی آواز آ رہی تھی۔ یہ لرزل بے تاب ہو گیا، جامو چیخ کہا تھا۔ اُس کی آواز میں سنی ہی ہوئی تھا۔ جامو کی ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک پختہ عمر عورت نے اندازے سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس لڑکی نے ہماری آمد کی وجہ سے گانا بند کر دیا تھا۔ سر جھکائے اپنے ناخن کُرید رہی تھی جب ہم سب بیٹھ گئے تو جامو نے آہستہ سے کہا۔ "نیلم جان! بس آج جادو جگا دو، مہمان دل پھینک کے جائیں تو مات ہے۔" جامو کی آواز پر اُس نے سر اُٹھایا اور زیرِ لب مسکرا کر دیکھا جیسے ہی اُس نے سر اُٹھایا، میری نگاہیں دھندلا گئیں، دل کی دھڑکن مفقود ہو گئی، سینہ کسی نے چاقو سے چیر ڈالا۔ لگے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے یہ دھند ہٹانے کی کوشش کی۔ نیلم جان نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ چہرہ بھی کسی تیزی سے اٹھی، اُس نے جھروکے سے چھلانگ لگا دی۔

میں چیختا اور چلّاتا ہوا ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کر گیا۔ میری بہن فہمیدہ شرک پر بے حال پڑی تھی، خون سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

گلی میں جگدڑ مچ گئی۔

پہلے تو مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ دل کسی نے مٹھی میں بند کر لیا تھا۔ پھر جب خون میں نہائی ہوئی فہمیدہ میرے سینے سے لگی تو میرا رہا سہا ہوش بھی رخصت ہو گیا۔ فہمیدہ کی سانس اکھڑ گئی تھی اور اُس کی ہر کراہ میرا کلیجا کاٹ رہی تھی۔ جب گلی میں چیخ پکار شروع ہوئی اور کسی نے میرے بال پیچھے کے زور زور سے میرا سر جھٹکا تب کہیں مجھے اردگرد کا ہوش آیا۔ میں نے وحشت سے اپنے بازوؤں میں جکڑی ہوئی فہمیدہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے کیا۔ اُس کی آنکھیں پتھر گئی تھیں اور خون ہونٹوں سے نکل کے گردن پر اُتر رہا تھا۔ میں نے اُس کا لہولہان چہرہ آستین سے صاف کیا۔ اُس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، دُور ہٹو۔" جب اُس نے نظریں پھیر کے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میری چیخوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سُول اور قفے سے چاقو نکال لیے اور تماش بینوں کی طرف دوڑ پڑے۔ چند لمحوں میں جامو، کپتان اور ساتھ کے سوا سب بھوت ہو گئے۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا تو وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے فہمیدہ کا چہرہ اپنے دامن سے چھپا لیا تھا لیکن اس طرح دو میری نظروں سے چھپ گیا۔ مجھے شُبہ ہوا کہ فہمیدہ نہیں کوئی اور لڑکا ہے۔ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے میں نے چہرہ دامن کھینچ لیا۔ وہ فہمیدہ ہی تھی، میری بہن فہمیدہ ہی تھی، میری بہن، میری منّی، میری بھتیجی، وہی اُس کی گردن کی طرح کھنچی ہوئی آنکھیں، تیز وہی اُس کے منہ سے دائیں جانب ابھرا ہوا دانت، وہ فہمیدہ ہی تھی۔ "تم کہاں ہو منّی؟" میری آواز پر لرزہ طاری تھا اور میں اپنا سر اُس کے سینے پر پٹخ رہا تھا۔ "مجھے بتاؤ منّی! تمھیں کون یہاں لایا؟" میری بکتی ہوئی آواز سے اُس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مسکرا کے رہ گئی اور اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلکنے لگی۔ "نہیں منّی! نہیں۔ تم مجھے بتاؤ۔ بتاؤ تم کیسے اُن میں اور وہ سب کہاں ہیں؟" میں نے اُس کا چہرہ تھام کے کہا۔

"باہر!۔ باہر!" مشکل تمام اُس کے منہ سے یہ لفظ نکلا۔

"بولو منّی!۔ بولو۔ میں باہر ہوں، تمھارا کمینہ بھائی، تمھارا وحشی بھائی۔ میرے پر جھکی ہوئی۔" میں نے اُس کے ماتھے کے خون سے اپنی تھوتھنی رگڑتے ہوئے کہا۔

اُس کی مردہ آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی اُبھری اور معدوم ہو گئی۔ "بابر!" اُس نے سسکتے ہوئے پھر میرا نام لینے کی کوشش کی۔ "تم۔ تم۔"

"ہاں میں۔ میں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"تم۔ تم۔" اُس نے ایک گہری سانس لی اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں چیخ چیخ کر اُسے آوازیں دیں، جھنجھوڑا، صرف ایک بار اُس نے آنکھیں کھولیں، میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور میری گود میں لڑھک گئی۔ اس کے بعد وہ نہیں بولا اور اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ مری اور میں اُس کا لاشہ لیے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے شعبدے بازی کرتا رہا۔ اُسے گلی میں نچاتا رہا۔ پھر سارے خانے مجھے پکڑ کے کپتان خاں نے میری بہن کو خود سے جُدا کرنے کے لیے اُس کے جسم پر ہاتھ لگایا تو میں نے اُس کے پیٹ میں لات ماردی۔ پھر جامو اور بہت سے لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ پولیس آ گئی اور اُن سب نے فہمیدہ کو مجھے چھیننے کی خاطر مجھ پر حملہ کر کے مجھے بے قابو کر دیا۔ فہمیدہ کے جسم پر چادر ڈال دی گئی۔ میں اُس کے پاس جانے کے لیے پچھاڑیں کھا رہا تھا مگر وہ لوگ مجھے کھینچتے ہوئے ہم سے باہر لے آئے۔ سارے نے بے تحاشا میرے گالوں پر طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ لاٹے! ہوش میں آ لاٹے لے! کیوں اپنا تماشا بنا رہا ہے۔ بتا وہ تیری کون تھی؟"

"وہ منّی تھی۔" میں اپنے بال نوچتا ہوا اُس کے جسم پر گر گیا اور میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ سارے نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میں نے اُس کے کپڑے بھگو دیے۔ میرا ایک بازو کپتان خاں نے اپنے کندھے پر ڈالا اور سارے نے اپنے کندھے پر۔ وہ مجھے ایک چبوترے پر لے آئے۔ "کپتان!۔ تم لے سنبھالو۔ میں پولیس سے نمٹ کے آتا ہوں۔" جامو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اُسے لے جا رہے تھے۔

"کہاں لے جا رہے ہیں؟" میں نے بڑبڑا کے کہا۔

"بیٹھو لاٹے! ہمت رکھو۔" کپتان خاں مجھے چمٹاتے ہوئے بولا۔

"لاٹے! تجھے اپنی ماں کی قسم خاموش ہو جا، لوگ کیا کہیں گے اتنا بڑا آدمی رو رہا ہے۔" سارے نے میری کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

"سارے! مجھے اُس کے پاس جانے دو۔" میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔

"وہ کہیں نہیں جائے گی، ہلے نہ جُلے، وہیں وہ کہیں جا سکتی ہے؟" کپتان خاں نے بلند آواز میں کہا۔ "پولیس کو اپنی کارروائی کر لینے دے۔"

"پولیس۔ میں نے اپنا چہرہ چھپا کے کہا۔ "پولیس کیا کرے گی؟"

"پولیس خانہ پُری تو ضرور کرے گی لاٹے! ذرا سی دیر صبر کر لے۔" سارے آہستگی سے بولا۔ "دیکھ کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ذرا خیال کر یہ کون سی جگہ ہے۔"

گلی میں ہر طرف سُرخی سر نظر آ رہے تھے۔ پولیس والے چیخ چیخ کر مجمع منتشر کر رہے تھے۔ سیٹیاں بج رہی تھیں اور ہر طرف شور ہو رہا تھا۔ میں چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا، وہاں بھی لوگ آ گئے اور انگلیوں سے میری جانب اشارہ کرنے لگے۔ کپتان خاں اور سارے نے انھیں ڈانٹ کر بھگانا چاہا مگر میرے کانوں میں سیسہ اُنڈیل رہے تھے۔ ہر طرف نیلم جان نیلم جان کی آوازیں تھیں۔ نیلم جان اس جگہ بہت مقبول معلوم ہوتی تھی۔ نیلم جان اپنے گھر میں بھی اتنی ہی مقبول تھی۔ محلّے کی لڑکیاں ہر وقت اُسے گھیرے رکھتی تھیں۔ وہ ہر وقت مسکراتی اور شرماتی رہتی تھی۔ تیز تیز باتیں کرتی تھی، اُس کی مدھم آواز سے بھی تماشا تھے۔ یہاں بھی اُس کی آواز کا جادو چلا تھا جس کے جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے سارے مجھے کپتان خاں کے حوالے کر کے اپنا چاقو لہراتا ہوا اُن کی جانب جھپٹا اور غرّانے لگا۔

"کپتان خاں! سالے نے کور دکھ۔ ان سب کو میرا چہرہ دیکھنے دے۔" میں نے

دھاڑیں مارتے ہوئے کہا۔ کیپٹن خاں ان کے ہاتھوں میں پتھر دے دو وہ اپنی تیلم جان کا بدلہ مجھ سے لیں گے۔ میں نے تیلم جان کو مار دیا ہے۔ میں نے چلا چلا کے کہا۔ میں تیلم جان کا قاتل ہوں۔ تیلم جان کو مار دیا ہے۔ میں نے چلا چلا کے کہا۔ میں تیلم جان کا قاتل ہوں۔ میں نے کیپٹن خاں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے صدا لگائی اور مجمع کی جانب بھاگنے لگا۔ سارٹے نے درمیان میں مجھے دھکا دے دیا اور میرا ماتھا فرش کی اینٹوں سے ٹکرا گیا۔ کیپٹن خاں نے فوراً مجھے پکڑ لیا۔ اچانک ایک طرف سے ہجوم کا ریلا امڈتا ہوا آیا۔ کیپٹن خاں مجھے لیے ہوئے زمین پر لیٹ گیا۔ میں جھٹکے سے فریدہ نے چھلانگ لگائی تھی اُس میں آگ لگ گئی تھی اور لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ کیپٹن خاں مجھے سنبھالے ہوئے زمین پر پڑا رہا۔ اس تنگ جگہ پر ان گنت آدمی اُس کا جسم روندتے ہوئے گزر گئے۔ ایک سارجنٹ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ سپاہی مارے گئے۔ کیپٹن خاں اندھا دھند بھاگتے ہوئے لوگوں کی طرف بڑھنے سے روکتا رہا لیکن کیپٹن خاں اندھا دھند بھاگتے ہوئے لوگوں کی ٹانگوں اور ضربوں سے خود تو اپنے کو بچا بیٹھا اور مجھے اُس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ فریدہ کی لاش اٹھائی جا چکی تھی اور جہاں وہ گری تھی وہاں سپاہی ڈنڈے تانے ہوئے کھڑے تھے۔ فریدہ کا خون فرش پر جم گیا تھا۔ میں اتنی تیزی سے آیا تھا کہ سپاہی دیکھتے رہ گئے۔ میں نے اُن کے دائرے میں داخل ہو کے فریدہ کا خون فرش سے سمیٹ کے اپنے چہرے پر مل لیا۔ سپاہیوں نے میرے جسم پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ مجھے خبر نہیں پھر کیا ہوا۔ میں وہاں اس جلتے ہوئے مکان میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ میرے سر پر کسی سپاہی نے لاٹھی ماردی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا گھس آیا اور کانوں پر سناٹا چھا گیا۔ میں وہیں لڑکھڑا کے گر گیا۔

✱

جب میری آنکھ کھلی تو سارا منظر بدل گیا تھا۔ میں ایک پلنگ پر پڑا تھا اور میرے اطراف سفید دیواریں کھڑی تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کے اٹھنا چاہا تو درد کی ایک ٹیس میں دماغ کا سارا ہوا اور میری یہ خوشی کہ میں ایک بھیانک خواب سے دوچار تھا، ایک ٹیس میں چکنا چور ہو گئی۔ میرے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جسم اتنا بوجھل تھا کہ مجھے اٹھا نہ جا سکا۔ زرّیں میرے پاس بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار سے ٹیک لگائے سارٹے کھڑا تھا۔ میں نے دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں آنسو بہا رہے تھے۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے" مجھے اُٹھا دیکھ کے سارٹے میرے قریب تک آ کے بولا۔

"وہ کہاں ہے؟ فنی کہاں ہے؟" میں اپنی تمام طاقت سمیٹ کے بستر پر بیٹھ گیا اور میں نے سارٹے کا گریبان پکڑ کے پوچھا۔ "کہاں چھوڑ آئے؟"

"وہیں ہے پولیس نے اسے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔" سارٹے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "تیرا انتظار تھا، پر اب کیسے اُٹھے گا تیرے تو بہت چوٹیں آئی ہیں۔"

"مجھے کیا ہوا ہے، میں سہ حال میں زندہ رہوں گا سارٹے! مجھے موت نہیں آئے گی۔"

میں نے پلنگ سے جست لگانے کی کوشش کی تو زرّیں نے میرا شانہ پکڑ لیا۔ "تم نہیں جاؤ گے، میں تمہیں اُس کی صورت دکھا دیتی ہوں۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اپنے آپ کو قابو میں رکھ لاڈلے! جو قسمت کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ تو اس قابل نہیں ہے کہ باہر جا سکے۔ ہم نے تمام انتظام کر دیا ہے۔ تو اُس کی صورت دیکھ کے اُسے ہمارے سپرد کر دے۔" سارٹے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اپنا خیال نہیں ہے تو اُسی کا خیال کر۔"

"مجھے بھی مار ڈالو سارٹے! میں اب اُس کے ساتھ ہی رہوں گا۔" میں نے اُس کی گود میں گرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی اُس کے ساتھ ہی دفن کر دو۔"

"لاڈلے! سارٹے نے تحمل سے کہا۔ "مجھے کیا ہو گیا ہے تو تو بڑے جی کا آدمی ہے، استاد تو تیرے جی پر ہی مرا ہے، کیا تو اسی طرح مر جائے گا۔ وہ تمام زادی موقع پا کے فرار ہو گئی ہے، وہ سے نے اُسے بہت تلاش کیا جب وہ کہیں نہ ملی تو مکان میں آگ لگا دی، پل اُٹھ برابر کے کرے میں وہ موجود تھے، آگ بڑھ گئی! ایک دن تو اُسے گھر سے جانا ہی تھا، یہ میرا سینہ چھلنے لگا، نہ دیں گھر ٹوٹ ٹکڑے میرے پاس جانب کھڑی تھی، وہ اپنا چہرہ چھپا کے چھوٹ پڑی۔ "بہن جی! بہن جی!" سارٹے نے اضطراب سے کہا۔ "تم بھی اسے رلانے لگیں، اسے دوسرے کرے میں لے چلو، اپنا لاڈلا شیر کا بچہ ہے، شیر کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دنیا کا مقابلہ کرے گا۔"

زرّیں کو اپنے دوپٹے کا بھی خیال نہیں رہا، اُس نے بے تابی سے مجھے ہلا دے کے اٹھایا۔ میں نے اُس پر اپنا بوجھ نہیں لدنے دیا۔ پھر بھی زرّیں نے میرا ہاتھ تھامے رکھا۔ میں اپنے پیروں سے چلا۔ زرّیں میرے پہلو سے لگی ہوئی تھی اور اپنی لمبا لب آنکھیں اُٹھا کے بار بار میرا چہرہ دیکھتی تھی۔ دوسرے کرے میں سپہری پرکھن میں لپٹی ہوئی فریدہ کا جنازہ رکھا تھا۔ اس کے اردگرد حویلی کی طرزِ میں قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ ایک لونڈی ملازمہ نے سارٹے کے اشارے پر فریدہ کے چہرے کے کفن پڑا ہٹا دیا۔ اُس کے چہرے پر نور چھٹک رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو، جیسے اُس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہو اور وہ ابھی گھر کی طرح چہچہاتی ہوئی اُٹھے گی اور باورچی خانے میں جا کے سب سے پہلے ناشتہ تیار کرے گی پھر اتا کے کمرے میں بھاگ بھاگ جا کے انہیں ایک پیالی چائے دے گی اور پوچھے گی کہ اتا آج کیا پکایا جائے، پھر اتا کے کچھ بھی نہ بتانے پر ٹال کے کہے گی "اتا! آج میں آپ کے لیے فیرنی پکاؤں گی، تب مجھے جیوتی بنیے سے چاندی کے ورق منگوا دیجیے۔" میری بھتو کو سفید داس بہت پسند تھا۔ کفن میں وہ کیسی مقدس لگ رہی تھی جیسے آسمان سے اُتری ہوئی کوئی پری ہو۔ اُس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے اُس کی آنکھیں کھل ہوئی ہوں اور اُس کی نظریں میرے جسم میں پیوست ہو رہی ہوں۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ سارٹے نے آگے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "لاڈلے! آ اب چل۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں فریدہ کے پائنتی اسی طرح گنگ کھڑا رہا۔ بوڑھی عورت نے اُس کا چہرہ کفن سے ڈھانپنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "میں نے فریدہ کے بال چومے، اُس کی پیشانی چومی اور اُس کی آنکھیں چومیں۔ میرا دل کھنچا جا رہا تھا۔ میں اُس کے سرہانے بیٹھا ہوا اپنے آنسوؤں سے اُس کا چہرہ بھیگا کرتا رہا۔ پھر زرّیں نے مجھے اُس کے پاس سے ہٹایا اور سارٹے مجھے میرے کمرے میں لے جانے لگا۔ میں نے انکار کر دیا اور اُس کمرے میں چلا آیا جہاں دلی دلی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچتے ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ قفقاز شول اور کیپٹن خاں نے مجھے درمیان میں بٹھا دیا جہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں اب آنسو بھی نہیں رہے تھے کہ میں اُن کا ساتھ دے سکتا۔ میں گردن جھکا کے بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے جھکتے جھکتے مجھ سے فریدہ کا جنازہ اٹھانے کی اجازت چاہی۔ جامو اور سارٹے نے اطمینان کیا کہ میں حویلی ہی میں ٹھہر جاؤں، وہ فریدہ کو دفنا کے آ جائیں گے لیکن میں نے اُن کی بات نہیں مانی۔ میں سارٹے اور فریدہ کی ڈولی کو کرحا دیتا ہوا قبرستان تک لے گیا کسی نے کندھا دینے کی کوشش کی تو میں نے اسے اپنی جگہ نہیں لینے دی۔ قبر حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا۔ اُس کی قبر پھولوں سے ڈھانپ دی گئی۔ میں زار و زار رویا۔ میں نے کوئی آہ بکا کی، چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ مجھے اُس کی قبر سے اُٹھا کے حویلی میں لے آئے اور کب انھوں نے مجھے بستر پر لٹا دیا۔ مجھے جب ہوش آیا تو زرّیں اپنے سامنے نظر آئی۔ تو پتہ چلا میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ زرّیں نے مجھے حرارت پہنچانے کے لیے چادر ڈال دی۔

★

پھر ایسی عبرت پڑی کہ سارا جسم بھٹی کے مانند دہکنے لگا۔ زرّیں کبھی میرے ماتھے پر برف کے ٹکڑے رکھتی اور کبھی آیتیں پڑھ کے پھونکتی۔ جب بھی میری آنکھ کھلتی میں اُسے اپنے پاس بیٹھی ہوئی دیکھتا اور گردوپیش میں مجھے کوئی تبدیلی نظر نہ آتی۔ ہر ایک جیسی روشنی، ایک جیسا اندھیرا۔ گھٹن اور حبس جب کہ آنکھیں اور کان بند ہوتے، مجھے کچھ محسوس ہی نہ ہوتی لیکن جیسے ہی انھیں دیکھنے اور سننے کی تمیز آتی، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میری بوٹیاں نوچ رہا ہو اور جانوں گوشت کاٹ رہا ہو اور کوڑے مار رہا ہو۔ میں چیختا چلاتا رہتا، پھر ہیجر کا دورہ پڑ جاتا اور میں نڈھال ہو کے جیسے اپنے آپ میں گر پڑتا۔

اسی عالم میں جب مجھے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی، ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بہت دُور سے مجھے آواز دے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز اتنی قریب ہوئی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ میرے کانوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ دیکھا کہ بغل بیٹھا ہے۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں نے اُسے اس پر مگن میں مرکوز کر دیں۔ "میں آگیا ہوں لاڈلے!" اُس کی بھاری بھرکم آواز ذکر سے میں گونجنے لگی۔

یکایک میرے ہونٹوں اور میری پلکوں پر خوشہ طاری ہو گیا۔ اُس نے میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا اور میرے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "اچھا ہو جا لاڈلے! بس اب اچھا ہو جا۔" اُس نے میرے کانوں کی لویں کھینچنا شروع کر دیں۔ "اٹھ کے بیٹھ۔" اُس نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے اپنے سینے پر گرا لیا۔ "کیا پاگل ہو گیا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "دنیا میں صرف تو ہی تو نہیں رہتا اور لوگ بھی بستے ہیں۔ لاڈو زرّیں! مجھے دوا دو۔" زرّیں وہ دوا کا پیالہ لیے کھڑی تھی۔ میں نے تذبذب سے اُسے دیکھا۔ بغل نے زرّیں کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے دوا کا پیالہ چھین کے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے منہ پھیرا تو بغل نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ لی اور میرا سر ہلاتے ہوئے پیالہ میرے منہ میں لوٹ دیا۔ دوا میرے سینے پر گر گئی تھی۔ بغل نے اپنے کرتے سے میرا چہرہ اور کپڑے صاف کیے۔ "اب بس ٹھیک ہو جا پہلوان!" وہ زور زور سے میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔

"ان کا جسم دکھ رہا ہے۔" زرّیں نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔" بغل میں اسے دوا پلانے نہیں غیرت دلانے آیا ہوں۔ سات سال جیل میں گزارنے موجد جیسے موذی کو مارا، چاند ماں جیسے سورما کے بیٹے کو شکار کیا۔ اب ہاتھ پیر ہلکا بیٹھا، مرنا چاہتا ہے۔" بغل نے نفی سے کہا۔ "بہن کے پاس کس منہ سے جائے گا۔ جا مر جا۔" بغل مجھے بستر پر دھکا دیتا ہوا بولا۔

"آپ ان سے ان سے ایسی....." زرّیں بغل کی آنکھیں دیکھ کے چپ ہو گئی۔

"تم اب جاؤ زرّیں! جا کے سو جاؤ۔" بغل نے کسی قدر نرمی سے کہا۔

"اب میں آگیا ہوں لاڈلا میرے سامنے۔ یہاں نہیں رہ سکتا۔" زرّیں وہاں سے نہیں ہلی۔ بغل نے اسے دوبارہ آرام کرنے کا حکم دیا، وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ "اچھا اچھا۔" وہ ہڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "تم لاڈلے کی اجازت مانگتی ہو؟ لاڈلے! آ اس نے میری ٹھوڑی اوپر اٹھا کے کہا۔ "اپنا نہیں تو اس کا حال دیکھ۔" زرّیں نے دونوں سے آنکھ مندھ نہیں کی ہے، میرا حکم اس پر نہیں چلتا۔ اب تو اپنی زبان سے اسے نکلنے کا حکم دے۔ بتا دے کہ اب تو اچھا ہو گیا ہے بتا دے کہ اب بغل آ گیا ہے۔"

بغل کی باتوں سے میری رگوں میں کھولن ہونے لگی تھی۔ میں نے پہلو بدل کر زرّیں کی طرف مخمور سے دیکھا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا، سر پر میلا دوپٹا تھا۔ اُس نے کپڑے بھی یوں ہی بے پہن رکھے تھے۔ میں اُس کی یاس بھری نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ بغل نے ٹہوکا مار کے پھر مجھے اکسایا کہ میں اپنی زبان سے زرّیں کو آرام کرنے کی اجازت دوں۔ میں نے نقاہت سے اُسے مخاطب کیا۔ ابھی میری زبان سے اُس کا نام ہی ادا ہوا تھا کہ اُس کے کھلے ہوئے چہرے پر مسرت کی ایک لہر اُبھری اور وہ بے قرار ہو کے میرے قریب آ گئی۔ "اب تم کیسے ہو؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مجھے موت نہیں آئے گی زرّیں!" میں نے نحیف آواز میں کہا۔

"یہ مر ہی نہیں سکتا، جاؤ زریں! میں یہاں موجود ہوں۔" بتھل نے سختی سے کہا۔ "اور دیکھو سورج نکلنے سے پہلے تم یہاں نہیں آؤ گی۔"

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔"

"مگر مگر کچھ نہیں۔" بتھل تیز آواز میں بولا۔

"دوائیں۔" زریں نے جھک کر کہا۔ "دوائیں میز پر رکھی ہیں۔"

"ہاں ہاں! میں اسے ایک ساتھ ساری دوائیں پلا دوں گا۔ اب اسے دوا کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دواؤں سے ٹھیک ہو گا تو مجھے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا پڑے گا۔ دیکھ لینا بیٹا جب تم صبح آؤ گی تو لاڈلا ایک دم فٹ فاٹ ہو گا۔"

زریں نے بدبدا کر کچھ کہا جسے میں سن نہیں سکا۔ چند لمحے وہ مذبذب اور متردد وہیں کھڑی رہی۔ بتھل کے اشارے پر ماما اسے اپنے ساتھ لے گئی لیکن وہ ایک ہی لمحے بعد پلٹ آئی۔ "آپ کا بستر میں۔۔۔ میں یہیں بچھوا دیتی ہوں۔"

"میرا بستر۔" بتھل نے ہنس کر کہا۔ "میں تو خود بستر ہوں۔ دیکھا لاڈلا میرے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔" وہ مجھے اٹھا کے سینے سے لگانے لگے تو میں نے بولا۔

زریں کے جانے کے بعد میں اور بتھل کمرے میں تنہا رہ گئے میں یوں ہی بتھل کے سینے سے چپکا بیٹھا رہا۔ کمرے میں بھیانک خاموشی طاری تھی۔ مجھے یہ خاموشی زہر لگنے لگی۔ "تم کب آئے؟" بہت دیر بعد میں نے ہمت کر کے سرگوشی میں پوچھا۔

"میں شام ہی یہاں پہنچا ہوں۔ ان حرام کے جنوں نے مجھے دیر سے خبر کی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "بہرحال پھر بھی میں وقت پر آ گیا ہوں۔ لاڈلے! تو نے مجھے بہت نیچا کیا۔"

میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میں تجھ سے خفا ہوں۔"

"پھر تم یہاں کیوں آ گئے۔ تمہیں کس نے بلایا تھا؟"

"تو نے ہی بلایا لاڈلے! تو نے ہی بلایا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "چلے جاؤ۔ واپس چلے جاؤ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"چلا بھی جاؤں گا پر تجھ سے نمٹ کے جاؤں گا۔"

"چلے جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "نہیں جاؤ گے تو میں دیوار سے اپنا سر پھوڑ لوں گا۔ تم کہیں آئے ہو جاؤ۔" میں نے دھمکیانہ انداز میں اسے چنگ سے جھنجھوڑ دیا۔

"پاگل مت بن۔ چھوڑ دے مجھے اور کیا ہو گا۔" وہ فرش سے اٹھتا ہوا بولا۔

"پھوڑ لے دیوار سے سر پھوڑ لے۔" میں تیز تیز سانس لینے لگا۔ "میں تماشا دیکھ کے جاؤں گا۔"

"تو دیکھو۔" میں نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ بتھل پرسکون انداز میں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا سر دیوار کے ٹیکے سے پھوڑنا شروع کر دیا۔

"بس مجھ سے یہی ہو گا۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بستر پر پٹختے ہوئے بولا۔

"زریں کے کپڑے تیرے جسم پر فٹ تو نہیں آئیں گے پھر بھی وہ کپڑے تو دے ہی ہیں لاڈلے! اپنے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لے جھومر سجا لے ماتھے پر بندیا سجا لے میں پھیلا دیا اور سسکیاں لینے لگا۔ بتھل میرے کان کے قریب بولا۔ "کس پہ ٹائم نہیں گزرا لاڈلے! پر سب تیری طرح لونڈیا بن کے نہیں بیٹھ گئے۔ تو نے تو بستر پر لیٹ کے بتھل کا سر بھگا دیا۔ باہر وہ سب لے فیض آباد شہر کے کچھ پرے میرا منہ تک رہے تھے جب انھوں نے مجھے بتایا کہ لاڈلا دو دن سے چیخ چلا رہا ہے تو جی چاہا گاڑی سے اتر کر سب کی ٹانگیں کھینچ لوں۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کے کہا۔ "تمہیں صرف اپنی بات کی پڑی ہے تم کچھ نہیں جانتے، تمہیں جا تو چلانا، حکم دینا اور باتیں کرنا آتا ہے۔ تم کچھ نہیں سمجھتے۔"

"ہاں ہاں تو سمجھتا ہے۔" وہ زہر خند سے بولا۔ "تو سب سے زیادہ جانتا ہے تیری سمجھ اور جان پہچان دیکھ لی لاڈلے! وہ کنجر کی اولاد کنوری نکل گئی اور تو مسٹک پر ٹسوے بہاتا رہا۔ تجھے کچھ خیال بھی نہیں آیا کہ تو کیا کر رہا ہے۔"

"چپ رہو۔ چپ رہو۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔" میں نے اپنے کان بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت کمینہ، بہت ذلیل اور نیچ آدمی ہوں میں گناہ گار ہوں۔"

بتھل کچھ کہنے کے بجائے کرسی پر اپنا سر ٹکا کے بیٹھ گیا۔ میری سسکیوں کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی جب دیر گزر گئی تو مجھے بتھل کی یہ خاموشی بھی گراں گزرنے لگی اور احساس ہوا کہ میں نے اس سے کچھ زیادہ باتیں کہہ دی ہیں۔ وہ میرا حال سن کے اتنی دور سے یہاں آیا ہے اور میں نے اس کی طرف نگاہ کی تو وہ کیا کیا کہہ دیا ہے۔ شاید وہ ناراض ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی طرف نگاہ کی تو وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ کرسی کی پشت پر باہر کی طرف اس کا سر ڈھلکا ہوا تھا۔ میں نے اسے آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن ہمت نہیں پڑی۔ میرے جسم سے پسینے چھوٹ رہے تھے اور رگ رگ میں سن سن ہو رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا کرنا چاہیے تھا۔" میں کیا کہہ رہا ہوں اور مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا چاہیے۔"

بتھل چونک کے کرسی پر ٹھل پڑا۔ لاڈلے میں تیری بات کا برا نہیں مانتا۔ ان کانوں میں ایک پھلنی لگی ہوئی ہے صرف باریک باریک باتیں اندر جاتی ہیں اور ان دیدوں کر کو گھس کے اس کام کا بنایا ہے کہ پرکھ سکیں کہ کھرا کون ہے کھوٹا کون۔"

"میں بہت۔ بہت۔" مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں نے ضعف سے کہا۔ "میرا دل تالو میں نہیں ہے۔ یہ ڈوب رہا ہے اور ڈوبتا بھی نہیں ہے۔"

"کوئی نئی بات کر۔ یہ بتا کہ بہن سے کوئی بات بھی ہوئی؟" بتھل ہلکے لہجے میں بولا۔ "اب مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔"

میں نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "کیا سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ میری بہن تھی؟" میں نے اپنا کالا چہرہ دکھا کے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا اور پھر مجھے آرکی شخص کی تلاش تھی۔"

"دیالے! یہ آدمی کا بچہ بھول کے مراقبہ ہوتا ہے، تنکے سے کریدو تو نہ جانے کتنی چنگاریاں پک پڑیں۔ میں جانتا ہوں ایسی چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں ہوتی مجھے یقین تھا ایک دن تو خود ہی تنگ ہو جائے گا۔ سات سال تو بڑی بات ہے ایک لمحے میں کایا پلٹ جاتی ہے مگر تو نے سات سال اپنے آپ کو برف خانے میں رکھا۔ لاڈلے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بس دل پہ برف رکھی پڑتی ہے جیسی آدمی ٹھیک طرح سوچ سکتا ہے۔ تو نے سوچنے کا وہ نہیں کیا اور کیا کیا؟ مجھے کیا ملا، تو اپنے آپ کا اتنا دشمن کیوں ہے۔ میری بات غور سے سن، آدمی کی جون میں آیا ہے، دیوں کی دنیا ہے کمال سے بخار اور رکھے ڈھول بھاڈے، قدے، شوئی سائے، جام اور کلین خاں ہزاری بھی تیری طرح نشے میں آ گئے تھے مگر میں اسے میرے لیے ضرور تلاش کروں گا۔ اطمینان رکھ بتھل اس چٹیال کو تیرے قدموں میں ضرور ڈال دے گا جو تیری بہن کو لائی تھی، یہ بتھل کا وعدہ ہے لاڈلے میری خاطر اب اکیلا کہیں جانے کی کوشش مت کرنا، اکیلا آدمی پاگل ہو جاتا ہے، مجھے پتہ نہیں کون کون تیرا طلب گار ہے جاتی! اور کئی تجھے جس لڑکی کی تلاش ہے، وہ اسی آباد دھانی میں کبھی نہیں مل سکتی تو اس طرح اسے کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔"

بتھل رات بھر میرے جسم میں سوئیاں چبھوتا رہا۔ وہ سچ کہتا تھا۔ سچ کی پہلی کرن کے ساتھ حواس باختہ زریں جب کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ اس کی آمد پہ مجھے خیال آیا کہ رات گزر گئی ہے اور بتھل رات بھر جاگتا رہا ہے۔ زریں نے مجھے دوا کا پیالہ دیا تو بتھل نے اسے سلیچی میں ڈال دیا اور منہ کے کہنے لگا۔ "زریں! لاڈلے کو بھوک لگ رہی ہے۔"

*

جب بتھل مجھے باہر لایا تو بھک بھری ہوئی تھی مجھے اور بتھل کو دیکھتے ہی وہ سب کھڑے ہو گئے۔ ان میں جامو بھی تھا، کلین خاں بھی، قدے شوئی سائے بھی اور بھی موجود تھا۔ وہ تازہ بتھل کے ساتھ آیا تھا میرے سر پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن میری آنکھیں خشک تھیں اور میں اپنے قدموں پہ کھڑا تھا میرے چہرے پر بھی انھیں نمایاں تبدیلی نظر آئی ہو گی۔ وہ سب مجھ سے لپٹ گئے اور کلین خاں بتھل کا بازو پکڑ کے جوش میں بولا۔ "استاد! کیا جادو کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔" سائے ٹنک کے بولا۔ "اگر استاد کو پہلے سے خبر کر دیتے تو لاڈلا ہمیں اتنا پریشان نہ کرتا۔ استاد لاڈلے کی رگ رگ سے واقف ہے۔"

"تیری زبان بھی گھنٹے کی طرح چلنے لگی؟ گنگروں گا۔" جامو نے گھرک کے کہا پھر کلین خاں کو مخاطب کر کے بولا۔ "کلین خاں! کیا پتہ چلا؟"

"استاد بتھل، وہ سالی لکھنؤ میں بھی نہیں ہے۔" کلین خاں سر کھجاتے

تھی، میں نے اسے مرنے کے بعد بھی بے چین کیا، میں نے اس کا پردہ چاک کر دیا۔"

"کیسی بات کرتا ہے، تو نے گا پھاڑ کے سب کو بتا دیا ہے کہ تیرا اس سے کیا رشتہ ہے، بہت مضبوط سینہ چاہیے لاڈلے! لوہے کا بنا ہوا سینہ، تو تو ایک ہی وار برداشت نہیں کر پایا ہے زندگی میں صرف وہی چاقو نہیں چلتے جنھیں جیبوں میں رکھا جاتا ہے، ہر طرف سے چاقو چلتے ہیں میری جان! ہمیں کے پھلکے نظر نہیں آتے، یہ داؤ پیچ جو تو نے جیل میں سیکھے ہیں یہ تو معمولی چاقوؤں کے وار ہیں ڈار کرنے اور وار بچانے کے منتر کا پتہ تو زندگی میں ملتا ہے شہزادے! اتنا اکیلا ست، وہ۔ زندگی کاٹ کھائے گی، زندگی کے وار سے بچنے کے لیے کبھی تنہا کبھی مل کے، کبھی سامنے سے کبھی پیچھے سے داؤ پیچ دکھانے پڑتے ہیں۔ تو نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ کس کے تجھے لوگوں نے اتنا خوف زدہ کر دیا ہے کہ تو نے سب پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ خوف دور کر بہت اکیلا ہو جائے گا لاڈلے! میں سمجھا تھا تو کتابوں اور قلم کے داؤ پیچ سیکھ کے اور مضبوط جڑوں نکلے گا۔ تو کاہے سے ڈرتا ہے رے؟"

میں گم سم اس کی باتیں سنتا اور صورت دیکھتا رہا۔ "چلے دے۔" وہ ہاتھ جھٹک کے بے پروائی سے بولا۔ "اس بات پر خوار کر دہ ہو گئی تھی مگر وہ تھی وہی۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آ گئی۔ وہ تو بہت شہزادی جادو لیا رہی میں رہنے والی لڑکی تھی۔ کسی اجنبی آدمی نے کبھی اس کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کے مجھے ہوش ہی نہیں رہا، پتہ نہیں میں نے کیا کیا اور کیا کہا ہو گا۔ آدمی کے ہاں ہتھیار ہو تو اسے یہ خیال رہتا ہے کہ وہ قتل بھی کر سکتا ہے یا قتل بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ ان جانے راستوں پر سفر کرنے سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے، اکیلی رہ جاتیں تو سوچ سکتا ہے جو اس کے دماغ اور دل میں آتی ہیں، کوئی رات کو ان کیلے کہہ سکتا ہے۔" میری آواز پر کپکپی طاری ہو گئی۔ "بتھل بھائی تمہاری کوئی بہن ہوتی اور بہن بھی فہمیدہ جیسی ہوتی پھر میں تم سے پوچھتا۔"

بتھل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خون ابھر آیا۔ پلکیں تیزی سے جھپکنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی بری بات کہہ دی ہے یا بتھل کہیں کھو گیا ہے۔ اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ کرسی سے اٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "رات کو دن بھی کہتا ہے لاڈلے! چلتے چلتے زمین پھٹ جاتی ہے، آنکھ کھلی ہے تو سب کچھ ویسا ہی ہے۔ آنکھ بھی ایک چاقو ہے۔ دن پر موجود ہے تو کچھ بھی دکھا سکتی ہے، وہ کھا جانے والی کھنچتا ہوا سرگوشی میں بولا۔ "باقی لوگ کدھر ہیں؟"

"کیا پتہ، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو نے انھیں کہاں چھوڑا تھا؟"

"میں نے انھیں جہاں چھوڑا تھا، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ وہ نہ جانے کن گلیوں میں گم ہو گئے۔ میں نے انھیں تلاش بھی نہیں کیا، میں تو ان کے لیے اجنبی بن گیا تھا جس دن گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اب سات سال بعد میں

بولے۔ بہرحال استاد! جائے گی کہاں؟ میں اُسے پاتال سے بھی زندہ پکڑ کے لے آؤں گا۔ ذرا اُسے سانس تو لینے دو! کہیں نہ کہیں جا کے تو ٹکے گی۔ لوٹ پھر کے آجائے گی اپنی اوقات پر۔ لاٹے! اخبخت کر قسم سے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ سالا سب کچھ ایسا اُلٹا پلٹا ہو کر اُس کی طرف نظر ہی نہیں کی۔ استاد! بڑی شرمندگی ہے۔"

"نہیں کبن تُو نے تو بڑا کام کیا۔" بخل اُسے سننے سے لگے تو ہونٹ بولا۔ "استاد! یہ جامو تُو نے اسے مجھ سے پہلے نہیں ملوایا کہ کہاں چھپا کے رکھا تھا تم کو مشہر میں کیا ڈنگ جمایا ہے میرے شیر نے۔"

"استاد! بس تمھاری دعا ہے۔" جامو نے انکسار سے کہا۔ "میں تو لاٹے کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتا، نہ جانے اُس دن میرے سر پر کیا نکل گیا۔"

ملاٹو جانتا ہے کہ تیری اس میں کوئی خطا نہیں تھی جامو!"

"استاد! وہ لڑکی بہت اچھی تھی، بہت ہی اچھی۔ ان بدمعاشوں سے پوچھ لو۔" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملامت سے بولا۔ "میں ہمیشہ اُس کا ذکر کرتا تھا، لیکن کاہ نہیں اُٹھاتی تھی مگر استاد! تم جانتے ہو اپنے کام سے اور اپنے آپ سے کبھی کبھی تو بڑی گھن آتی ہے۔ یہ انھیں سب کچھ دیکھتی ہیں اور یہ ہاتھ سالے کچھ کر نہیں پاتے۔"

"رہنے دے جامو! کوئی اور بات کر۔" بخل میری آنکھوں میں اترتے ہوئے آنسو دیکھ کے بولا۔ "جامو! تُو نے تو کمال کر دیا، ایک ہی دن میں بڑیا کے لیے حویلی خالی کرا دی۔"

"استاد! کیوں شرمندہ کرتے ہو سب کھاد ہو گیا۔ میں نے کیا کیا، بڑیا کی حویلی تھی، اُسے مل گئی، کبن خاں کا حکم تھا، میں بڑیا کے لیے شہر فیض آباد کی تمام حویلیاں خالی کرا سکتا تھا، کبن خاں نے زندگی میں پہلی تو فرمائش کی تھی وہ خالو کا بچہ یہاں سے تو دُم دبا کے نکل گیا مگر بعد میں اُس نے شہر میں بڑا اُتنا چولا کیا رئیسوں اور محلے کے چودھریوں کے پاس گیا۔ اپنی بھی نوابوں رئیسوں سے صاحب سلامت ہے۔ پہلے تو سب جگڑے مگر جب میں نے انھیں ساری بات بتائی تو گھروں میں دبک گئے۔ اب بڑیا آرام سے رہ سکتی ہے اور میں تو یہاں موجود ہوں میں نے کہہ دیا ہے کسی نے حویلی پر نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو آنکھیں نکال لوں گا۔" جامو نے طیش میں کہا۔

ملاٹو نے اُسے اطلاع دی کہ ناشتہ تیار ہے، دوسرے کمرے میں فرش پر ناشتہ سجا ہوا تھا۔ زرّیں نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ فہمیدہ کے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے، تین دن سے ایک نوالہ بھی اُن کے منہ میں نہیں ہنسی تھی۔ اب بھی بھوک نہیں تھی، میری نظر ان سب کے سامنے اُٹھتی ہی نہیں تھی حالانکہ وہ بار بار میرے قریب آ کے مجھے گلے لگا کے مجھ سے اپنے لگاؤ کا اظہار کر رہے تھے، مجھ سے کچھ کھایا نہیں گیا لیکن پھر سب نے ہاتھ اُٹھایا اور کہا کہ جب تک میں نہیں کھاؤں گا وہ بھی کچھ نہیں کھائیں گے۔ مجبوراً مجھے اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ ان لوگوں سے مل کے میرا دُکھ پھر بوجھل ہونے لگا۔ انھوں نے سکون سے ناشتہ کیا۔ میں

ناشتے کے بعد کسی نے اُس رات کا ذکر پھر چھیڑ دیا۔ اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے فیض آباد کے ہر محلّے چھان مارا ہے مگر چمپا یا نگہ انھیں کہیں نہیں ملی۔ پولیس سے انھوں نے یہ بات چھپانے کی کوشش کی تھی کہ فہمیدہ میری بہن تھی لیکن پولیس کو پتہ چل ہی گیا۔ اُن کے بیان کے مطابق پولیس ملے جولی میں مجھ سے سوالات کرنے آئے تھے جامو نے انھیں میری بیماری کا عذر کر کے ٹال دیا۔ چمپا یا نگہ کے غائب ہو جانے سے پولیس کی توجہ اُس کی طرف مبذول ہو گئی تھی، پھر بھی جامو کے خیال میں انھیں ایک بار ضرور میرے پاس آنا تھا جس وقت ہم چمپا کے کوٹھے پر پہنچے تھے تو وہاں اور بھی لوگ موجود تھے اور نیلم جان گا رہی تھی۔ ہماری آمد سے نیلم جان کے گانے میں مداخلت ہوئی اُس نے گانا بند کر دیا اور پھر اُسے اچانک معلوم کیا ہو کہ وہ مجرے کے گود پڑی سب سے پہلا آدمی میں تھا جو چیختا ہوا نیچے اترا۔ "سنے فہمیدہ کو میری گود میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا میں تو اب حلق پر بھی نہیں نکل سکتی تھا۔

جامو نے نیلم جان کو تین سال قبل شہر کے بازار میں پہلی بار دیکھا تھا اور وہ اکثر اُسی کے کوٹھے پر گانا سننے جاتا تھا۔ نیلم جان بھی بازار میں نہیں بکتی تھی بس اپنے بالاخانے پر شام کو محفل سجاتی تھی اور درد بھرے نغمے گاتی تھی، وہ جانتی بھی ہو گی، فہمیدہ جانتی ہو گی، زرّیں بیگم اور شہ پارہ کی طرح، تبھی تو جامو کہتا تھا وہ بہت دُکھی نظر آتی تھی اور اپنی بستی کی دوسری طوائفوں سے کم ہی ملتی جلتی تھی وہ سب اُس سے جلتی تھیں اور اُس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتی تھیں۔ جامو نے بتایا کہ اُس نے ایک ایک طوائف کے گھر نیلم جان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ، کچھ نیلم جان نے اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں سب کو یہ بات معلوم تھی کہ نیلم جان کسی شریف خاندان کی لڑکی ہے اور مجبوراً طوائف بنا دی گئی ہے۔ اس بازار میں آنے کے بعد اُس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا، اس لیے وہ ناچتی اور گاتی رہی۔ چمپا کے سازندے کہتے تھے کہ انھوں نے پہلی بار نیلم جان کو اُس وقت دیکھا تھا جب چمپا فیض آباد میں نئے نئے ساتھ لائی تھی۔ اُس کے ساتھ جو مرد تھا وہ واپس چلا گیا تھا چمپا اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو لے کے پانچ سال پہلے فیض آباد سے گئی تھی، جب واپس آئی تو اُس کے ساتھ نیلم جان تھی اور یہاں سے جانے والی دو لڑکیاں کوٹھہ کہیں اور چھوڑ آئی تھی، چمپا کا کوٹھا اُس کی عدم موجودگی میں ایک دوسری طوائف رانی چلاتی تھی، چمپا کے آنے کے بعد رانی شاید بوریا بستر لپیٹ گئی اور نیلم جان کی محفل سجانی شروع کر دی۔ وہ نہایت احتیاط سے بخل کی مدد کے بارے میں بتا رہے تھے میں نے اپنے آپ پر بڑا ضبط کیا۔ اگر میں نہ کرتا تو مجھے کبھی ان واقعات کا علم نہ ہوتا، میں بھی نیلم جان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ شاید اُن کی گفتگو میں کوئی ایسی بات آ جائے جس سے نیلم جان کے گھر والوں کا حال معلوم ہو سکے مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ نیلم جان کو چمپا نے خریدا تھا، کس سے اور کہاں سے خریدا تھا؟ یہ کوئی نہ

جانتا تھا۔ یہ تو چمپا ہی بتا سکتی تھی یا چمپا کی کوئی رازدار۔ نیلم جان کا یہ حال ہوا تو اُن کے باقی گھر والوں کا کیا ہوا ہو گا۔ وہ بدنصیب کہاں ہوں گے میں سب جاننا چاہتا تھا۔ میں نے نسرین کو دیکھا تھا، زرّیں کو دیکھا تھا اور میں نے چاند میاں کو دیکھا تھا، جن کے گھر سے بھائی بھاگ جاتے ہیں اور جن کے باپ مر جاتے ہیں، اُن لڑکیوں کا یہی ہوتا ہے۔ وہ سب نیلم جان کا تذکرہ کرتے رہے تھے، اُس کی صفات، عادات و اطوار، شائستگی اور شرافت بیان کر کے مجھے خوش کر رہے تھے اور یہ باور کرا رہے تھے کہ انھوں نے چمپا کو تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے بخل کس کس کی زبان بند کرتا؟ میری صورت دیکھ کے ہر ایک کو نیلم جان کا چہرہ یاد آ جاتا تھا، ایک کی زبان رکتی تو دوسرے کی چلنے لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ایک دن نیلم جان گانے کے درمیان اچانک پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی پھر تین گھنٹے تک چمپا کا بالاخانہ ویران رہا اور لوگ گلی میں بھٹکتے رہے۔

بخل نے مجھے واپس اندر بھیجنا چاہا لیکن میں نے اُس کا حکم نہیں مانا، میں اُن کی ہمدردیاں سمیٹنا اور اُن کی دل جوئیاں برداشت کرتا رہا اور فرش دیکھتا رہا۔ بخل نے مجھ سے چائے بھی پینے کا تھا۔ آخر بخل کبن خاں اور جامو سے مشورہ کرتا ہوا اُٹھ گیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر چمپا کو کہیں سے برآمد کر کے میرے پیروں پہ ڈال دیں۔ بخل کے اُٹھتے ہی سب منتشر ہو گئے۔ جامو کے دو تین ساتھیوں نے مشل اور سارنگے کے سوا سب کو وہیں سے چلے گئے۔ بخل مجھے اندر لے آیا جہاں سرخ آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ زرّیں بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، وہ ہمیں حویلی کے دالان میں لے گئی جس کے آگے ایک بڑا صحن موجود تھا، صحن میں خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور مرجھی ہوئی مینڈھیوں پر پھیل گئی تھی۔ بخل دالان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے پیشوائی کے کش لینے لگا، پھر حقے کی نال اُس کے منہ سے لگ کے رہ گئی۔ وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ میں بھی اور زرّیں ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ بیٹا! ایک ساعت بعد کہیں بخل کی گمبھیر آواز نے ماحول کا سکوت توڑا۔ "اس بڑی حویلی میں تیرا جی کیسے لگے گا؟"

زرّیں خود بیٹھی ہوئی تھی۔ بخل کی آواز پر وہ چونک پڑی اور جلدی جلدی دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتی اس کے پاس گئی، تھمے سے سر ٹکا کے اُس نے جھکتے ہوئے جواب دیا۔ "بابا! میرا جی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب آپ سنبھال لیں اور میں بس آپ کی خدمت کرتی رہوں۔ اب آپ نہیں رہیں گے۔ میں آپ کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاؤں گی، آپ کا حقہ تازہ کروں گی۔ دیکھیے میری بات رد مت کیجیے گا۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، یہ سب چیزیں میرے لیے بیکار ہیں، آپ یہاں رہیں گے تو اس سے بڑھ کے میرے لیے کوئی اور خوشی نہیں ہو گی۔"

بخل اچھل کے کھڑا ہو گیا، اُس نے اپنے قریب کھڑی ہوئی زرّیں کا دوپٹا سرکایا اور اُس کا چہرہ پیچھی پیچھی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ بخل کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اُس نے زرّیں کی پیشانی چوم لی اور اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ زرّیں پر لرزہ سا طاری ہو گیا مگر بخل فوراً پیچھے ہٹ گیا اور تیزی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نا نا، نا بٹیا نا۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ کوئی نہیں کسی کے دھن پر بھی بیٹھا ہے۔ ایسی بات پھر مت کرنا، اتنا بڑا مت سمجھ بیٹا!"

زرّیں سہم گئی۔ "بابا! آپ میری بات نہیں سمجھے یا میں آپ کو سمجھا نہیں سکی میں آپ کو خواب میں بھی بُرا تصور نہیں کر سکتی۔"

"نا نا! ایسی باتیں مت کر۔" بخل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو نہیں جانتی کہ ہم کون لوگ ہیں، ہم بہت دُور رہتے ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں پھر آپ نے پوچھا ہی کیوں تھا؟"

"پوچھا تھا پر بٹیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" زرّیں مضبوط آواز میں بولی۔

"تُو ابھی بچی ہے، کچھ نہیں سمجھتی۔" بخل جھنجلا کے بولا۔

"تو پھر آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں یہاں کیسے رہوں گی، میں جیسے رہ لوں گی، زندگی تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

"اوہ نہیں نہیں۔" بخل نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "بس اب تماشہ نہ بس اب کچھ نہ کہنا، میرے کانوں میں اتنا دم نہیں ہے۔" زرّیں کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر بخل کی اضطراری حالت دیکھ کے چپ ہو گئی۔ بخل کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ میں نے اُسے اتنا مضطرب پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار اپنے بال سمیٹ رہا تھا۔ زرّیں وہاں سے چلی گئی تو بخل کچھ قرار پایا اور وہ بڑبڑانے لگا۔ "لاٹے! لاٹے! یہ کیسی لڑکی ہے تُو نے مجھے اس سے کیوں ملایا تھا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ ملامت ہوتی تھی تو میں یہی سوال تو پوچھنے کیا کرا تھا اور سوچا تھا کہ کاش بدھ گیا سے واپسی کے وقت میرے پاس گھلنے جانے کے لیے ٹکٹ کے پیسے ہوتے اور زرّیں کے ڈبے میں داخل ہوتے اور اُسے دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ میں نسرین اور چاند میاں کی طرح یقیناً ڈھونڈھتا اور کہرا کی تلاش میں برخاستہ ہوتا لیکن جب ایسا خیال آتا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا۔ زرّیں بھی کہرا کی طرح ایک لڑکی تھی کم سے کم ایک لڑکی تو اپنے گھر واپس آ گئی۔ اچھا ہوا، بد گھر گیا

بعد کہنے لگی۔ "بابا! ایک بات کہوں؟"

"کہہ بٹیا کہہ۔" بخل نے تجسس سے کہا۔

"بابا! میرا جی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب آپ سنبھال لیں اور میں بس آپ کی خدمت کرتی رہوں۔ اب آپ نہیں رہیں گے۔ میں آپ کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاؤں گی، آپ کا حقہ تازہ کروں گی۔ دیکھیے میری بات رد مت کیجیے گا۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، یہ سب چیزیں میرے لیے بیکار ہیں، آپ یہاں رہیں گے تو اس سے بڑھ کے میرے لیے کوئی اور خوشی نہیں ہو گی۔"

بخل اچھل کے کھڑا ہو گیا، اُس نے اپنے قریب کھڑی ہوئی زرّیں کا دوپٹا سرکایا اور اُس کا چہرہ پیچھی پیچھی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ بخل کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اُس نے زرّیں کی پیشانی چوم لی اور اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ زرّیں پر لرزہ سا طاری ہو گیا مگر بخل فوراً پیچھے ہٹ گیا اور تیزی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نا نا، نا بٹیا نا۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ کوئی نہیں کسی کے دھن پر بھی بیٹھا ہے۔ ایسی بات پھر مت کرنا، اتنا بڑا مت سمجھ بیٹا!"

زرّیں سہم گئی۔ "بابا! آپ میری بات نہیں سمجھے یا میں آپ کو سمجھا نہیں سکی میں آپ کو خواب میں بھی بُرا تصور نہیں کر سکتی۔"

"نا نا! ایسی باتیں مت کر۔" بخل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو نہیں جانتی کہ ہم کون لوگ ہیں، ہم بہت دُور رہتے ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں پھر آپ نے پوچھا ہی کیوں تھا؟"

"پوچھا تھا پر بٹیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" زرّیں مضبوط آواز میں بولی۔

"تُو ابھی بچی ہے، کچھ نہیں سمجھتی۔" بخل جھنجلا کے بولا۔

"تو پھر آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں یہاں کیسے رہوں گی، میں جیسے رہ لوں گی، زندگی تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

"اوہ نہیں نہیں۔" بخل نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "بس اب تماشہ نہ بس اب کچھ نہ کہنا، میرے کانوں میں اتنا دم نہیں ہے۔" زرّیں کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر بخل کی اضطراری حالت دیکھ کے چپ ہو گئی۔ بخل کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ میں نے اُسے اتنا مضطرب پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار اپنے بال سمیٹ رہا تھا۔ زرّیں وہاں سے چلی گئی تو بخل کچھ قرار پایا اور وہ بڑبڑانے لگا۔ "لاٹے! لاٹے! یہ کیسی لڑکی ہے تُو نے مجھے اس سے کیوں ملایا تھا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ ملامت ہوتی تھی تو میں یہی سوال تو پوچھنے کیا کرا تھا اور سوچا تھا کہ کاش بدھ گیا سے واپسی کے وقت میرے پاس گھلنے جانے کے لیے ٹکٹ کے پیسے ہوتے اور زرّیں کے ڈبے میں داخل ہوتے اور اُسے دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ میں نسرین اور چاند میاں کی طرح یقیناً ڈھونڈھتا اور کہرا کی تلاش میں برخاستہ ہوتا لیکن جب ایسا خیال آتا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا۔ زرّیں بھی کہرا کی طرح ایک لڑکی تھی کم سے کم ایک لڑکی تو اپنے گھر واپس آ گئی۔ اچھا ہوا، بد گھر گیا

واپسی پر میری جیب میں پیسے نہیں تھے اور میں زرّیں تک پہنچ گیا تھا۔ اگر میں اُس کے ڈبے میں داخل نہ ہوتا تو زرّیں کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ کبھی کبھی کرا کر میرے پہنچنے کا یہ حال معلوم ہوگا تو وہ بہت خوش ہوگی۔

میری خاموشی سے بخل کی اُلجھن میں اور اضافہ ہوگیا۔ دھوپ صحن میں پھیل چکی تھی مگر بخل کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ بچپن کی نال بُرین پر پڑی تھی اور بخل دہشت سے اپنا چہرہ نوچنے لگتا تھا۔ مجھے اُس کی اس کیفیت سے خوشی سی ہوئی۔ مامانے آکے اُسے چونکایا کہ باہر بیٹھک میں جامو اُس کا منتظر ہے۔ بخل کی چال میں پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیٹھک کے دروازے پر بخل نے مجھے روک دیا۔ میں نے درشتی اور ناراضی سے اُسے دیکھا مگر اُس نے مجھے جامو کی بات سننے کا موقع نہیں دیا۔ شہ سے جامو فہیدہ اور چمپا بائی کے متعلق کوئی خبر لایا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپانا چاہتے تھے۔ اب پردہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ وہ نہ جانے اندر بیٹھے کیا سوچ رہے تھے۔ میں مرطوبے کے قریب منڈلاتا رہا۔ بخل نے صبح ناشتے کے دوران میں کہنی خاں اور جامو کو حکم دیا تھا کہ وہ چمپا بائی کو ایک ہفتے کے اندر میرے قدموں میں ڈال دیں مگر اس طرح بھلا فہیدہ واپس آسکتی تھی، فہیدہ تو منوں مٹی تلے دبی ہوئی تھی۔ اُن کا خیال ہوگا کہ چمپا سے اپنی بہن کا بدلہ لے کے مجھے کوئی تسکین حاصل ہوجائے گی۔ چمپا کے نام سے میرے خون کی گردش ضرور تیز ہوجاتی تھی لیکن چمپا کا کیا تصور تھا۔ نہ چمپا کا کاروبار تھا، نہ آلو۔ مجھے خود کو دینی چاہیے تھی، ابا کہتے تھے، جس گھر کی دیواریں نچی ہوں وہاں چور گھس آتا ہے۔

ایک چمپا بائی ہی کیا، ہزاروں چمپا بائیوں کے جسموں میں پھر گھن پنپنے کے بعد بھی مجھے قرار نہ آتا۔ میں نے اپنی بہن کے پیروں میں گھنگرو بندھے دیکھے تھے اُن گھنگروؤں کی بازگشت اب تک میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔ بخل نے آکے مجھے دہرہم برہم کردیا۔ میں بستر پر پڑا تھا تو اُن لوگوں کی آنکھوں سے دُور تھا جو یہ جان گئے تھے کہ فہیدہ سے میرا کیا رشتہ تھا۔ کلکتے میں بخل نے میرے اردگرد جو پرا لگایا تھا، وہ یہاں بھی موجود تھا۔ شہر کے کتنے ہی لوگوں نے میرا چہرہ دیکھا تھا، جامو کے کہنے ہی سے ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں شہر میں جامو کے اثر و رسوخ کا شاہد ہوچکا تھا۔ مجھے بھی چمپا بائی کی تلاش تھی لیکن میں اُس سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے فہیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟ ابا اُسے کہاں ملے تھے؟ بخل سمجھتا تھا کہ فہیدہ کی موت کے بعد میری بدحواسی، بے ہوشی اور گم شدگی بے معنی کی بات ہے۔ بخل کو تمام حالات معلوم کب تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ فہیدہ کا چہرہ دیکھ کے میرے ذہن نے کیسے کیسے بھیانک خواب دیکھے تھے۔ میں بخار میں تپ رہا تھا اور اتنی میرے پاس بیٹھی تھیں، ابا میرے سرہانے کھڑے تھے مجھے اُن سے نظر ملانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور میں فرش کھنکھنے کے گر پڑتا تھا۔

بخل نے ایک کشمکش سے نجات دلا کے دوسری سے دوچار کردیا تھا۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری میں منتقل کردیا تھا۔ اُس نے مجھے زندہ رکھنے کے لیے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ باہر جانے کا راستہ بند تھا، لیکن یہ وہ چمپا بائی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں، میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو ورنہ چمپا بائی انھیں تمام ماجرا سنا دے گی کہ فہیدہ کس گھرانے کی لڑکی تھی، اُس کے باپ کا نام کیا تھا، اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا گزری۔ مجھے چمپا بائی سے صرف اپنے طور پر نمٹنا چاہیے تھا۔ یا اُس تک اُن کے پہنچنے سے پہلے اُس کی زبان کھلوا لینی چاہیے تھی اگر بخل نہ آتا تو شاید میں حویلی کی بڑی دیواریں پھاندنے میں کامیاب ہو جاتا بشرطیکہ مجھے اپنا ہوش بھی رہتا۔

بخل جلد ہی واپس آگیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ نیلم جان سے شہر کا ایک نواب خاص لگاؤ رکھتا تھا، نیلم جان اُس نواب سراج علی کی حویلی میں خاص طور پر بلائی جاتی تھی اور بند کمرے میں نواب کے سامنے ناچتی تھی۔ پہلے سازندوں نے اب تک جامو کو یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ وہ نواب سے خوف زدہ تھے۔ جب جامو نے انھیں مجبور کیا تو انھیں نواب کا نام بتانا پڑا۔ اگرچہ کوئی خاص بات نہیں بتا سکے۔ صرف اس قدر بتا سکے کہ نواب نے چمپا سے کئی بار نیلم جان کا سودا کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور چمپا نے خوش اسلوبی سے اُسے ٹال دیا تھا۔ اُس نے نواب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی نیلم جان کو بھیجے گا اُس کا گانا سننے کی فرمائش کرے گا۔ وہ اُسے اُس کی حویلی لے آئے گی۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلا تھا۔ سازندوں کا خیال تھا کہ خود نیلم جان بھی نواب سے متاثر تھی۔ نواب چمپا اور اُس کے سازندوں کو ہمیشہ انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔

جب جامو اور کہنی خاں نواب سے ملنے کے لیے اُس کی حویلی پہنچے تو انھیں پتا چلا کہ نواب ان دنوں سخت بیمار ہے اور ایسی حالت میں ملاقات کرنے سے معذور ہے۔

بخل کی زبانی یہ باتیں سُن کے میرا جسم سُن ہوگیا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ وہ یہ واقعات سپاٹ انداز میں سُنا رہا تھا اور اُس نے میری طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اُس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ نیلم جان کی زندگی کریدنے بیٹھا تھا۔ حالانکہ وہ اُسے اپنے ہاتھوں دفن کرچکے تھے۔ میں بخل کی چال سمجھ گیا تھا۔ وہ یہ سب سُنا کے مجھے یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ کہنی خاں اور جامو میرے بارے میں کتنے فکرمند ہیں اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں بھی کرسکوں کہ اپنا کام کرو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے اتنی مہلت دی کا اظہار مت کرو۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے زرّیں تک پہنچنا میرے لیے ناممکن تھا۔ اگر جنگل سے میرے پاس آئی کہ مجھے اُس کی آہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا۔ انھیں تبدیل کرنا تو اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں چھپائے کپڑے لیے کھڑی تھی۔

مجھے گھبراہٹ ہورہی ہے۔ میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ "میں جانتی ہوں تم کتنے اداس ہو گے مگر مرنے والے تو مر ہی جاتے ہیں بالبتہ اُن کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔ وہ روحانی ہوتی آوازیں بولی۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں آنے کے بعد تم اس حادثے سے دوچار ہوگے۔ میں یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو آج یہ بات نہ ہوتی۔"

"اُس کی موت اسی طرح لکھی تھی، تم کیا کرسکتی تھیں، مجھے یاد ہے، تم یہاں سے کتنی خوشی ہوئی تھیں، سوچا تھا کہ تم اپنے تمام دکھ بھول جاؤ گی اور نئے سرے سے زندگی بسر کرو گی لیکن تمھیں ایک دن بھی سکون نہ ملا۔"

"میری ایک بات مانو گے؟" وہ افسردگی اور عاجزی سے بولی۔ "گو بخل کچھ موئے مجھک ہوتی ہے لیکن تمھارا حال دیکھا نہیں جاتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو کہنے والی بات کو کون روک سکتا ہے، نہ تم نہ میں، نہ کوئی اور۔ تمھیں لگے بیتے کا کوسنے ہیں یہ گھر تمھارا ہے۔ تم..... ہم نہیں..... ہیں....." وہ پچھتانے لگی۔ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سر جھکا کے بولی۔ "جاؤ، پہلے نہا لو۔ پانی ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اُس کے لہجے میں ایسا سوز تھا کہ میں نے ایک نظر سے اوجھل ہوگئی، سامنے دسل خانے تک رہنمائی کرتی ہوئی میری گیلی کی چپڑ چپڑ کی آواز آتا رہا تھا کہ مجھے پہلی بار اپنے گھر میں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوا اور میرے دل کی حرکت جیسے بند ہونے لگی۔ میں نے دیوانگی سے اپنا سینہ ٹٹولا۔ مالا میرے گلے سے غائب تھی۔ میں اس حالت میں پہنچتا ہوا غسل خانے سے باہر نکلا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے کہ اچانک ہی چیز میرے پاس رہ گئی تھی، اُس کی بھی میں حفاظت نہیں کرسکا تھا۔ میں چیخ پکار سے حویلی کے طاقوں میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور انھوں نے بند کمرے کی کھڑکی۔ بخل کے باہر آنے سے پہلے میں خود بیٹھک میں پہنچ گیا۔ "میری مالا کہاں ہے؟" میں نے دہشت زدہ انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ "میری مالا واپس کرو۔"

"کون سی مالا؟" بخل نے تعجب سے پوچھا۔

"مالا جو تم نے میرے پاس دیکھی ہوگی، وہ کسی کی امانت تھی، وہ میرے گلے میں نہیں ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"میں نے ایک مالا کے لیے اتنی دیوانگی؟ میں کھیلنے کے لیے تجھے دو مالا لا دوں گا۔" بخل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، مجھے وہی مالا چاہیے۔ آہ کسی نے میری مالا چھین لی۔" وہ خفگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے جو چاہا ہولے لو مگر میری مالا مجھے واپس کردو۔"

"میں تجھے ویسی بہت سی مالائیں لا دوں گا۔" بخل نے ہاتھوں سے کپڑے چھین لیے۔ "پانی گرم ہوگیا ہے مگر نہانے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولا۔ "اگر طبیعت خراب ہو تو مت نہانا۔"

"مجھے گھبراہٹ ہورہی ہے۔ میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ "میں جانتی ہوں تم کتنے اداس ہو گے مگر مرنے والے تو مر ہی جاتے ہیں بالبتہ اُن کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔ وہ روحانی ہوتی آوازیں بولی۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں آنے کے بعد تم اس حادثے سے دوچار ہوگے۔ میں یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو آج یہ بات نہ ہوتی۔"

"اُس کی موت اسی طرح لکھی تھی، تم کیا کرسکتی تھیں، مجھے یاد ہے، تم یہاں سے کتنی خوشی ہوئی تھیں، سوچا تھا کہ تم اپنے تمام دکھ بھول جاؤ گی اور نئے سرے سے زندگی بسر کرو گی لیکن تمھیں ایک دن بھی سکون نہ ملا۔"

"میری ایک بات مانو گے؟" وہ افسردگی اور عاجزی سے بولی۔ "گو بخل کچھ موئے مجھک ہوتی ہے لیکن تمھارا حال دیکھا نہیں جاتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو کہنے والی بات کو کون روک سکتا ہے، نہ تم نہ میں، نہ کوئی اور۔ تمھیں لگے بیتے کا کوسنے ہیں یہ گھر تمھارا ہے۔ تم..... ہم نہیں..... ہیں....." وہ پچھتانے لگی۔ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سر جھکا کے بولی۔ "جاؤ، پہلے نہا لو۔ پانی ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اُس کے لہجے میں ایسا سوز تھا کہ میں نے ایک نظر سے اوجھل ہوگئی، سامنے دسل خانے تک رہنمائی کرتی ہوئی میری گیلی کی چپڑ چپڑ کی آواز آتا رہا تھا کہ مجھے پہلی بار اپنے گھر میں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوا اور میرے دل کی حرکت جیسے بند ہونے لگی۔ میں نے دیوانگی سے اپنا سینہ ٹٹولا۔ مالا میرے گلے سے غائب تھی۔ میں اس حالت میں پہنچتا ہوا غسل خانے سے باہر نکلا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے کہ اچانک ہی چیز میرے پاس رہ گئی تھی، اُس کی بھی میں حفاظت نہیں کرسکا تھا۔ میں چیخ پکار سے حویلی کے طاقوں میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور انھوں نے بند کمرے کی کھڑکی۔ بخل کے باہر آنے سے پہلے میں خود بیٹھک میں پہنچ گیا۔ "میری مالا کہاں ہے؟" میں نے دہشت زدہ انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ "میری مالا واپس کرو۔"

"کون سی مالا؟" بخل نے تعجب سے پوچھا۔

"مالا جو تم نے میرے پاس دیکھی ہوگی، وہ کسی کی امانت تھی، وہ میرے گلے میں نہیں ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"میں نے ایک مالا کے لیے اتنی دیوانگی؟ میں کھیلنے کے لیے تجھے دو مالا لا دوں گا۔" بخل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، مجھے وہی مالا چاہیے۔ آہ کسی نے میری مالا چھین لی۔" وہ خفگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے جو چاہا ہولے لو مگر میری مالا مجھے واپس کردو۔"

"میں تجھے ویسی بہت سی مالائیں لا دوں گا۔" بخل نے چمکار کر کہا۔ "اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"تم نہیں جانتے، تم اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ بخل بھائی! خدا کے لیے جامو، کہنی خاں اور دوسرے لوگوں سے پوچھو کہ انھوں نے میری مالا تو نہیں دیکھی؟" میں نے اُس کی منت کی۔

"تو دیکھ رہا ہے لاڈلے! سب باہر گئے ہوئے ہیں، میں اکیلا یہاں بیٹھا ہوں۔ آئیں گے تو پوچھ لوں گا۔ مالا انھوں نے دیکھی ہوگی تو جانے گی کہاں۔ تجھے اپنا دل بہلانے کی پڑی ہے۔" بخل ناگواری سے بولا۔

"مجھے اُن کے پاس لے چلو، باہر چلو، ہم انھیں کہیں نہ کہیں تلاش کرلیں گے۔" میں نے بخل کو اُن کھنکھنے ہوئے کہا۔

"لاڈلے! اپنے اوسان ٹھیک کر، بالکل پاگل ہوگیا ہے، وہ آتے ہی ہوں گے۔ کچھ تو خیال کر، ہم اُن کے مہمان ہیں۔ ذرا تسلی رکھ، انھیں واپس آنے دے۔" بخل کے لہجے میں نارضامندی اور تلخی شامل تھی۔ میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جا اور اُن کا انتظار کر۔" اُس نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"آہ آہ۔" میں اپنا ماتھا پکڑے بیٹھ گیا۔ "میں کتنا کم بخت ہوں، کتنا کم ظرف ہوں، آہ بخل بھائی! تم ٹھیک کہتے تھے۔ مجھے ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے فہیدہ سے بات بھی نہیں کی کسی حکیم، ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے میں اُس کے پاس بیٹھا اُسے موت کے منہ میں دھکیلتا رہا اور میں نے اپنی مالا بھی کھو دی۔" میں گریہ کرنے لگا کیونکہ مجھے اپنی حالت پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ بخل حیرت زدہ تھا اور مجھے خاموش کرنے کی کوشش کررہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پھر کوئی میرا عزیز مرگیا ہو۔ آہ وہ مالا جو کبھی کورا کے ہاتھ پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی تھی، جس کے لیے میں نے بدھ گیا میں ایک شخص کا خون کردیا تھا، جو کورا کی غیر حاضری میں اُس کی حاضری کی حیثیت رکھتی تھی، جو میرے دُکھ سکھ میں شریک تھی، جس سے میں راتوں کو کھیلا کرتا تھا اور جس کے دانوں پر میں کورا کے نام کا ورد کیا کرتا تھا، جیل سے واپسی کے بعد وہ میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کورا کی تلاش میں ناکامی کا احساس جتنا شدید ہوتا جاتا تھا اُتنی ہی وہ مجھے عزیز ہوگئی تھی، فہیدہ تو خود تو گئی، مجھ سے میری مالا بھی چھین لے گئی، مجھے اپنا وجود حقیر محسوس ہونے لگا، جیسے میں غریب ہوگیا ہوں، جیسے میں مفلوج ہو گیا ہوں، جیسے جسم میں کورا کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔

نہ جانے کیا ہوتا اگر اُس لمحے ماما اندر آکے بخل کو یہ اطلاع نہ دیتی کہ بی بی جی اُسے اندر بلا رہی ہیں۔ بیٹھک میں کوئی اور مرد نہیں تھا۔ اس لیے بخل نے خود جانے کے بجائے زرّیں کو وہیں بُلا لیا وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں نے اُسے حسرت و یاس کی نگاہ سے دیکھا اور بے تابی سے کہا۔ "زرّیں! میری مالا کھو گئی۔"

"کیسی مالا؟" وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔

"تم نے اُسے میری گردن میں دیکھا ہوگا، میں اُسے کرتے کے نیچے چھپا کے رکھتا تھا۔" میں نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"اس مالا میں ایسی کیا خصوصیت تھی جو تم اتنے پریشان ہو؟"

"تم نہیں جانتیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "وہ امانت تھی، وہ ایک تحفہ تھی، وہ میرے لیے سب کچھ تھی۔"

"کیا بہت قیمتی تھی؟ بھلا کتنی قیمت ہوگی اس کی؟"

"اس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"

"تمھیں کس نے دی تھی وہ؟" زرّیں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ بس دی تھی ایک شخص نے۔ اس سے تم واقف نہیں ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا پھر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ مجھے زرّیں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ "کیا؟ کیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھا۔ "کیا تم نے وہ دیکھی ہے؟"

"ہاں دیکھی تو ہے۔" زرّیں سرگوشی میں بولی۔

"کہاں؟ مجھے جلدی بتاؤ۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"پہلے انعام کا وعدہ کرو۔" زرّیں مسکرا کے بولی۔

"انعام۔" میں نے اضطراب میں کہا۔ "جو تم کہو گی۔ جو تم کہو گی زرّیں، کیا واقعی وہ تمھارے پاس محفوظ ہے؟"

"بابا! آپ گواہ رہیے یہ انعام کا وعدہ کر رہے ہیں۔" منا نما کا انعام۔" زرّیں بجّل کے قریب جا کے بولی۔

"میں نے سُن لیا ہے بٹیا! لاڈلے! زبان سے مت پھرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں میرے ارکان میں جو کچھ بھی ہوگا، میں زرّیں کو دے دوں گا۔" میں نے جھک کے کہا۔

"بابا! دیکھیے انھوں نے وعدے میں یہ شرط بھی رکھ دی۔"

"شرط نہیں زرّیں۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "میرے پاس رکھا ہی کیا ہے مگر میں تمھیں مالا نہیں لوٹا سکتا۔"

"میں اسے نہیں مانگوں گی۔" وہ شوخی سے بولی۔

"تو پھر جو بھی چاہے، مانگ لینا۔"

"وعدہ ہے؟" زرّیں نے تکرار کی۔

"ہاں اب مجھے مالا دکھاؤ، تمھارے پاس محفوظ ہے نا؟"

زرّیں نے اپنی اوڑھنی ذرا سی سرکائی۔ مالا اس کے گلے میں چمک رہی تھی۔ میرا جی چاہا میں اسے اس کی گردن سے کھینچ لوں لیکن چند قدم چل کے رک گیا۔ زرّیں نے مالا آتے کے ایک بار خود سے دیکھی، پھر میری طرف بڑھا دی۔ مالا جب میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے اسے دیوانہ وار آنکھوں سے لگایا اور چوما شروع کر دیا۔ زرّیں اور بجّل حیرت سے میری بے قراری دیکھتے رہے پھر مجھے خجل آیا میں نے تمتماتی ہوئی آواز میں زرّیں کو انعام طلب کرنے کی پیش کش کی۔ زرّیں کچھ تذبذب میں پڑ گئی اور شرمیلے لہجے میں بولی۔ "میں سوچ کے بتاؤں گی۔" کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ کئی دن کی سُرخی ایک ساتھ ابھری۔ بجّل کا قہقہہ بلند ہوا ہی تھا کہ وہ تیز قدموں کے ساتھ تیزی سے چل گئی۔ میں اپنی مالا کے

دانے گننے میں مصروف تھا اس لیے میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔

مالا کی گم شدگی اور بازیابی سے مجھے اپنی حالت میں خاصی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ کوراکی یاد سے دل و دماغ میں ایک تازگی اور توانائی محسوس ہوئی میں اپنے آپ سے پشیمان ہونے لگا کہ میں تین چار دن کوراکے پاس ایسی حاضری نہیں دے سکا جیسی حاضری کا سلسلہ اس سے پہلی ملاقات کے وقت سے جاری تھا مگر یہ کیفیت بڑی عارضی ثابت ہوئی۔ جامو اور کہن خاں کے آنے کے بعد میرے خواب پھر بکھر گئے۔ وہ آتے ہی فہمیدہ کا تذکرہ کرنے لگے کہ کن کی دن بھر کی گم شدہ کا حال سن کے میرا سر زیادت سے بوجھل ہونے لگا۔ انھیں چپا پانی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جامو نے اپنے آشنا پولیس والوں میں یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ ملیہ جان اہل میں چپا پانی کے کسی جملے سے ناراض ہو کے دل برداشتہ ہو گئی تھی اور نتیجے میں اس نے پھلانگ لگا کے خودکشی کر لی۔ جامو نے آج بھی پولیس والوں کو فہمیدہ کے بازپرس کرنے سے روکے رکھا تھا یا لوگ میرے سامنے فہمیدہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ رات کھانے پہ گفتگو ہوتی رہی لوگ آتے جاتے رہے اور جامو سے ایک سے اس کی روداد سنتے اور تبصرہ کرنے کی تکرار کرتا رہا۔ میں اٹھ کے وہاں سے چلا آیا۔ بجّل بھی میرے پیچھے چلا آیا۔

رات کو میں نے موقع پا کے حویلی کے گرد ایک چکر لگایا۔ اندھیرا تھا۔ مکانات تھے تو اُدھر دریائی باغ کے بعد حویلی کی عمارت تھی۔ حویلی کی چوبداری خاصی اونچی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے فرار مشکل تو ناممکن ہے۔ ابھی میں نے پورا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے چند سائے رینگتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹک کے ایک جگہ رک گیا۔ وہ جامو کے ساتھی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بجّل میرے ارادوں سے پوری طرح باخبر تھا اور حویلی کے ملازم میں تو اُدھر جامو کے ساتھی، بجّل کی نگاہ ہر جگہ موجود تھی۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ تیسرے دن بھی یہی۔ میرا خیال تھا کہ بجّل آخر کب تک فیض آباد میں مقیم رہے گا۔ کلکتے میں موجدار کے قتل کا واقعہ بھی تازہ تھا اور بجّل کی طویل غیر حاضری کو موجدار کے ساتھی کتنے ہی رنگ دے سکتے تھے۔ بجّل کو جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہیے تھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر حویلی میں ٹھیرا رہا۔ اسے آئے ہوئے پانچ دن گزر گئے تھے۔ جامو پہ تدریج بدلی اور بیزاری چھاتی گئی۔ میں نے اس دوران میں راتوں کے وقت کئی بار ناکامی کا منہ دیکھا۔ میں اٹھ کے حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیر کی لیکن مجھے ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جتنا وقت گزر رہا تھا، مجھ پر مایوسی کا غلبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا وقت حویلی کے اندر ہی گزارنا شروع کر دیا تھا اور لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دی تھی۔ زرّیں سے اب رسمی گفت و شنید رہ گئی تھی۔ وہ کھانے کو کہتی تو کھانا کھا لیتا، وہ سونے کو کہتی میں بستر پہ دراز ہو جاتا۔ وہ باغ میں گھومنے کو کہتی میں کسی چون و چرا کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کرتا۔ بجّل نے مجھ سے ادھر اُدھر کی بات کرنی چاہی۔ میری طرف سے کوئی معقول جواب نہ ملا تو وہ بھی خاموش رہنے لگا۔ زرّیں کی آنکھوں میں اب مجھے آتے ہوئے

تھے اس لیے میں نے اُس کی جانب نظر اُٹھانے کی بھی احتیاط شروع کر دی تھی۔

پانچویں دن شام کے وقت میں باغ کے سبزے پر لیٹا ہوا تھا کہ ایک ردّے ملازم کے ذریعہ بجّل نے مجھے بلایا۔ زرّیں نے بجّل کے رہنے کا انتظام حویلی کے اُس خاص حصّے میں کیا تھا جو ایک زمانے میں اُس کے باپ کے استعمال میں رہتا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے جب اُس کمرے میں داخل ہوا تو بجّل وہاں تنہا تھا اور ایک پلنگ پر فکرمند سا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سرہانے ایک کاغذ رکھا تھا۔

"لاڈلے!" اُس نے گمبھیر آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو تُو سب سے خفا معلوم ہوتا ہے۔"

"میں بات کیا کروں؟" میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔

"تجھے مرہم کھلانی پڑیں گی شہزادے! بات کرتا رہا کر آدمی یہ جگال کرے تو رسّا معلوم خراب ہو جاتا ہے۔ لے ذرا یہ کاغذ پڑھ۔" اُس نے کاغذ مجھے تھما دیا۔

"کیسا کاغذ؟" میں نے کمسن لڑکے کی طرح بُرے بُرے منہ بناتے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیا۔

"دیکھ اس میں کیا لکھا ہے؟" بجّل سنجیدہ لہجے میں بولا۔

میں نے اُسے کھول کے دیکھا۔ وہ کوئی فارغی و دستاویز تھی تازہ تازہ۔ بری خبیث تحریر تھی۔ میں نے اُسے پڑھنا شروع کیا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ زرّیں نے اپنی تمام جائداد حویلی، زمینیں سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ جیسے جیسے میں کاغذ پڑھتا جا رہا تھا میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ زرّیں نے غیر مشروط طور پہ اپنی تمام جائداد سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ میری عقل خبط ہو گئی اور میرے ہاتھوں میں کاغذ تھرتھرانے لگا۔

"یہ کیا ہو گیا لاڈلے؟" بجّل نے میرا شانہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" میرا منہ کھلا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے لاڈلے!" بجّل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر۔۔۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کھول نہیں جانی ان چیزوں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے۔"

"میں یہ کاغذ پھاڑ دیتا ہوں۔ میں اسے جلا دوں گا۔"

"وہ کہتی ہے کہ اس کی نقلیں اُس کے پاس موجود ہیں۔" بجّل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس نے شہر کا بڑا وکیل بلایا تھا۔ اُس نے مجھے بھی خبر نہیں بھیجی۔ بس اس نے کہلوا دیا کہ اس پہ کاغذ جھپٹنے کی تدبیر کی لیکن مجھے ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میں اٹھ کے حویلی سے باہر نکل

میری بات قبول کرلی تھی اب تم نے یہ کیا کردیا؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اس بہانے سے میں یہاں رک جاؤں گا؟ زرّیں! میں نہیں رک سکتا میں چاہے جتنے بہانے کتنے ہی پیسے لگالیں مجھے ایک دن یہاں سے جانا ہے زرّیں! میں نے تم سے کہا تھا کہ فیض آباد سے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں ضرور واپس آؤں گا کوئی میری بات نہیں سمجھتا، مجّل بھائی جانو، کپتان خان کوئی نہیں جانتا، تم ان سب سے علیحدہ ہو کم از کم تمہیں تو میری بات سمجھنی چاہیے۔"

"تم نے یہ کیسے جانا کہ میں کچھ نہیں سمجھتی؟" اس نے اپنی زبان کھولی۔

"پھر تم نے یہ حویلی میرے سر پہ کیوں لادی۔"

"اس لیے کہ میں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی خدا کے لیے تم اس سے کچھ اور مطلب نہ لینا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"مگر میں..... مجھے آگے جانا ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"تمہیں کوئی نہیں روک سکتا۔" اس نے یاسیت سے کہا۔ "تم جانا چاہو گے تو ضرور جاؤ گے میں تمہیں روک نہیں رہی ہوں تم جاؤ۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"زرّیں؟ زرّیں؟ میری اچھی زرّیں! مجھے امتا بر امت سمجھو میں مجبور ہوں روک جاؤں گا۔ تم یہ کاغذ واپس لے لو۔"

"وہ چیزیں واپس نہیں لی جاتیں۔"

"میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔

"تم یہ سب جلا دو، گرا دو، جو چاہے کرو، اسے بیچ دو، وہ اور فقیروں میں خیرات کردو۔ مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"تو تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے؟"

"میں تم سے منت کرتی ہوں۔" اس نے عاجزی سے کہا۔ "تم جہاں بھی جاؤ مجھے اپنے ساتھ لیتے چلو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی، بس تمہارے ساتھ سفر کرتی رہوں گی، میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔"

"لیکن۔ لیکن میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا۔"

"کیوں نہیں لے جاسکتے؟" وہ ناراضی سے بولی۔

"اس لیے کہ مجھے خود پتہ نہیں، مجھے کہاں جانا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"زرّیں! تم نے ایک بار پہلے بھی میری بات مان لی تھی۔ یہ حویلی تم اپنے نام پر رکھو، جب میں واپس آؤں گا تو چاہے تم مجھے دے دینا میں نہ دینا میں نے تو شروع میں ہی تم سے یہ کہنے والا تھا کہ تم مجھے کسی بہانے سے یہاں سے باہر نکلنے میں مدد دو، جتنی دیر ہو رہی ہے میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے میرے ساتھ ایک احسان کرو، میں تمہیں ضرور ساتھ لے جاتا زرّیں لیکن میں تمہیں ان مشکلوں سے دوچار کرنا نہیں چاہتا جو مجھے پیش آسکتی ہیں تم میرے لیے اس جانداد سے بہت بردار ہوسکتی ہو مگر میری خوشی کے لیے کچھ نہیں کرسکتیں۔"

اس نے نظر اٹھا کے دیکھا اس کے نتھنے اُبھر گئے تھے اور ہونٹ بُری طرح پھڑکنے لگے تھے۔ "سو تم جا ہو گے وہی ہوگا۔" اس کی آواز پھٹ گئی۔ "جاؤ میں تمہیں رات کو حویلی سے نکال دوں گی۔"

"زرّیں!" میں نے اس کی جانب لپک کے کہا۔ "اس طرح مت کہو، یوں مت مخاطب کرو، وہی کرو جو میں کہتا ہوں، پھر خوشی خوشی مجھے رخصت کرو۔" زرّیں نے اس کی خوشامد کی۔ "کیا تم واقعی مجھے باہر نکال سکتی ہو؟ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا، کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ خود تم نے مجھے باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ زرّیں پھر تم میرے لیے دعا کرتی رہنا، تمہاری دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔ امی کہتی تھیں کہ لڑکیوں کی دعائیں جلد ہی قبول ہوتی ہیں۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔" وہ ٹھیک طرح کہہ نہیں سکی۔

"زرّیں! میں ضرور رک جاتا مگر کیا کروں؟ اگر رک گیا تو میرا یہی حال ہوگا جو تم دیکھ رہی ہو، میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"تم ضرور جاؤ۔" اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں زیادہ دیر وہاں ٹھیر اتو زرّیں کی کیا حالت ہوسکتی ہے۔ میں چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

❦❦❦❦❦

شام کو حسبِ معمول فیض آباد کے تمام چاقو باز، لٹھ باز، جیب تراش، داداگیر اور پہلوان اتنا و تمّا گرو قسم کے لوگ بیٹھک میں جمع ہوگئے۔ روز بروز اُن کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ کھٹور سے کپتان خان کے کئی ساتھی بھی یہاں آگئے تھے جس جس کو معلوم ہوتا کہ استاد مجّل بھلکّے سے فیض آباد آیا ہوا ہے اور اسے ایک طوائف چاہیے تو وہ اُسے دیکھنے اور سلام کرنے ضرور آتا۔ پانچ روز گزر گئے تھے اور ابھی تک جامو نہ تو چوہدری کو تلاش کرسکا تھا اور نواب صاحب علی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ مجّل کی خدمت میں ہر وقت جامو کے ساتھی موجود رہتے تھے۔ کوئی اُس کے جسم کی مالش کرتا تھا کوئی پیر دباتا تھا اور کوئی اصرار کرتا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لگنکے لے چلے۔ مجّل کپڑے پہنا ہوا تھا اور ابھی تک جامو نہیں آیا تھا۔ شام میں نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ رات کا کھانا بھی میں نے کمرے میں اکیلے ہی کھایا تھا۔ رات گئے تک بیٹھک میں لوگ موجود رہے۔ میں زرّیں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے کئی بار اندر گیا تھا اور مجھے ہر بار مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اتنی خفا اور کھوئی ہوئی تھی کہ کوئی بھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ رات کو جب بعض ساتھی بیٹھک کی نوشی نشست پر لیٹ گئے اور باقی رخصت ہوگئے مجّل اپنے کمرے میں آگیا میرے کمرے کا دروازہ مجّل کے کمرے میں کھلتا تھا۔ مجّل کے حقّے کی آواز جاری تھی۔ رات کو زرّیں اماں کے ساتھ دودھ کے گلاس لیے ہوئے پہلے مجّل کے کمرے میں گئی پھر میرے پاس آئی۔ اماں دودھ دے کے چلی گئی تھی جیسے ہی اس نے دودھ کا گلاس میری مسہری کے قریب لکھی پر رکھا میں نے سرگوشی کی۔ "یاد ہے زرّیں؟"

اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور آہستگی سے کہا۔ "میں جاگ رہی ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں، بعد میں میرا آنا مشکل ہوگا۔"

میں دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے کمرے کی روشنی بجھی کرکے اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مجّل نے بھی مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا اور حقہ گڑگڑانے لگا میں نے کھڑکی دیکھی بارہ بج چکے تھے۔ زرّیں کے کمرے میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی، آہستہ آہستہ ہی میں دوسری طرف چلی گئی تھی میرا دل قابو میں نہیں تھا۔ زرّیں نے زینے سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا میں شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کہیں اس نے فیصلہ بدل تو نہیں دیا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے کس طرح حویلی سے باہر نکال سکتی ہے کہیں وہ مجّل سے خوف زدہ تو نہیں ہوگئی کہیں اس نے شام کو یہ دی تو نہیں کہہ دیا تھا۔ وہ الماری سے کپڑے نکال رہی تھی، یہ کپڑے اس نے ایک چرمی تھیلے میں رکھے میری آنکھیں حیرانی سے پھٹنے لگیں۔ سامان کی نگہا نگاہ ایک چھوٹا تیشہ، مضبوط کی کیشی، مسواک کسی دوا کی گولیاں یہ سب رکھ کے اس نے تھیلا بند کردیا۔ پھر وہ ایک نفیس کمبل اٹھا لائی۔ جب وہ یہ سب کام کرچکی تو اس نے ایسا اچٹتی ہوئی نظر گھڑی پر ڈالی اور کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھی رہی میں نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے خوف آتا تھا کسی دلیل اور حجت سے بچنے کے لیے میں خاموش ہی رہا۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں نے کہہ دیا تھا اب اسے بھی کچھ سننے کی خواہش نہیں ہوگی گھڑی دیکھ کے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا میں نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں توازن نہیں ہے، وہ بھی کسی بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ "زرّیں!" میں نے اندر کمرے میں ہی اسے آہستہ سے مخاطب کیا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم یہیں رک جاؤ۔"

وہ سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہوئی اور جسم جھٹک کے ٹھیر گئی اور میری جانب بھیگی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "زرّیں! تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا، نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں، میری واپسی ہو سکے یا نہیں، لیکن اگر زندہ رہا تو بہرحال دھرآؤں گا۔ تم مجھے غلط مت سمجھنا میں سارے تم سے سب کچھ کہا ہے میں تم سے جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ زرّیں! بس چپ چاپ نکل جانا میں جب آؤں تو تمہارے چہرے پر فکر کی کوئی لکیر نہ دیکھوں۔ ہنستی مسکراتی یاد آؤں گی، اپنی صحت کا خیال رکھنا اور ہمیں اس حویلی میں رہنے کا حق مل گیا ہے کہیں اور مت جانا، مجّل بھائی یقیناً کوئی اچھا انتظام کردیں گے کسی کو ناراض نہیں کیا کبھی۔" میں نے اس کے بہت قریب جا کے کہا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ نہ "ہاں" نہ "نہیں"! صرف کمبل نے اشک بار لفظوں سے کہا۔ "تم میری غیر حاضری میں خوش ہو گی۔ تمہارا حال بڑا زار و نزار ہوگا۔ تم۔ تم مجھے یاد رکھو گی۔ تم۔ تم مجھے یاد رکھو گی۔ یہ لو، نا۔" میں نے اس کے سر کو چھونے کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن میرے ہاتھ اٹھنے کے اٹھے رہ گئے۔ تھیلا اٹھایا کمبل اپنے شانوں پر ڈالا اور آگے بڑھ گئی میں آہستہ دل ہی دل میں آیۃ الکرسی پڑھتا ہوا اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے دالان میں آکے ایک نظر ادھر اُدھر کا جائزہ لیا، حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ زرّیں چند قدم آگے چل کے بائیں جانب مڑ گئی۔ ایک تنگ جگہ سے گزر کے اس نے ایک دروازے کو دھکا دیا میں نے اس کی پیروی کی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، زرّیں نے دیا سلائی جلا کے ایک گم بتی روشن کی تو کمرے کا منظر آنکھوں پر کھلا، وہ قالین پر دبے دبے قدموں سے چلتی ہوئی ایک اور دروازے سے کمرے سے باہر نکل گئی دوسرے کمرے میں قدیم کتابیں الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں اور فضا میں ایک عجیب بو پھیلی ہوئی تھی کتب خانے کا دوسرا دروازہ باغ میں کھلتا تھا، باغ میں بھینگروں کا شور غالب تھا اور جگنو چمک رہے تھے۔ ایک مختصر راستہ طے کرکے زرّیں باغ کے شمالی حصے میں آگئی اور اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا میں نے بھی تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

زرّیں نے ایک بار پھر گردوپیش کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ پھر وہ گوزنوں کی باڑھ میں گھس گئی یہ جگہ سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی، باڑھ کے اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا، صحن کے آگے ایک کوٹھری تھی۔ زرّیں نے نہایت احتیاط سے کنڈی کھول، باغ کے سکوت میں کنڈی گرنے کی ہلکی سی آواز سے ایک لمحے کے لیے خلل پیدا ہوا اور دروازہ ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا، زرّیں نے دروازہ بھیڑ دیا اور دیا سلائی روشن کرکے موم بتی جلادی۔ اس کوٹھری کے اندر ایک اور مختصر کوٹھری تھی۔ جہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا، مکڑی کے جالے دروازے اور دیواروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ زرّیں نے اس تنگ جگہ کے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے کی لکڑی موٹی اور مضبوط تھی اور زمین میں ایک بڑی بلّی کے ذریعے اسے بند کیا گیا تھا، دروازے ایک موٹی کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا دروازہ چوکور کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ زرّیں یہ دروازہ بھی خود ہی کھولنا چاہتی تھی میں نے اسے ایک طرف ہٹایا اور بلّی اٹھانے کے لیے زور کرنے لگا۔ بلّی قبضے میں پھنسی ہوئی تھی تاہم میری زور آزمائی کی جدوجہد سے ہٹ گئی۔ میں نے کنڈی کھولی اور آہستہ آہستہ دروازہ اندر کی طرف کھینچا۔ دروازے کی چولیں چٹخنے کی آواز کوٹھری میں ابھری تو کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ زرّیں کی چیخ نکل گئی۔ دروازے کا پٹ کھلنے کی امید پیدا ہوئی تو میں نے الیمنان کی گہری سانس لی اور زرّیں کی طرف دیکھنے لگا۔ زرّیں نے تھیلا آگے بڑھا دیا اور کمبل اپنے شانے سے اتار لیا۔ میں تذبذب میں پڑگیا۔ سوچا کہ واپس ہو جاؤں۔ اس اندھیری رات میں زرّیں اکیلی کیسے اپنے کمرے میں واپس جائے گی اسے نیند بھی نہیں آئے گی اور پھر نہ جانے بعد میں اس کا کیا حال ہو۔ میں نے تھیلا اور کمبل زمین پر رکھ دیا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ کبھی سُرخ ہوتا تھا کبھی زرد۔ اس کی آنکھیں کبھی روشن ہوتی تھیں کبھی بجھ جاتی تھیں۔ میں نے تھیلا اٹھا لیا۔ "میں جا رہا ہوں زرّیں!" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ۔" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"میں واپس آؤں گا زلیں! میرا دل چاہا بڑھ کے اسے دیوانہ وار گلے لگالوں۔ میرا سینہ جلنے لگا اور پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ "تم کچھ اور نہیں کہو گی؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔ ہو سکے تو خط لکھ دینا۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "یہ رکھ لو۔" اس نے ایک بندھا ہوا رومال میرے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے آگے جلدی جلدی کھولنا چاہا۔ اس کے اندر نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں اور ایک چاقو تھا۔ بڑا رقم اور پوری چاقو۔

"زلیں! اس کی ضرورت نہیں ہے یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے باہر آنے دیا۔ مجھے ترکیبوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں انھیں کہاں کھوؤں گی کیونکہ میری کوئی منزل نہیں ہے۔"

"ایسے کہہ لو صدقہ دیتے رہنا۔" اس نے رقت سے کہا۔

"زلیں! تمہیں سکتے ہوئے بولا۔ "زلیں! خوشامد کھونا۔ بس میری تم سے یہی التجا ہے۔ میں ضرور واپس آؤں گا زلیں!" میں نے سامان اٹھالیا اور زلیں کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

حویلی کے باہر ایک چوڑی گلی تھی۔ میں احتیاط سے گلی عبور کر کے دوسری جانب رینگ گیا۔ ہر سُو اندھیرا تھا اور میرے دماغ میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زلیں کی حویلی سے نکل تو آیا مگر ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دل پر طیان تھا۔ زلیں کا چہرہ اس اندھیرے میں بھی اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ باہر کی کھلی فضا بڑی جس زدہ تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کدھر جاؤں کون سا راستہ اختیار کروں کون سا راستہ کوا کی طرف جاتا ہے اور کس جاتے ہوا جان نے ڈیرا جمایا ہوا ہے میں ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا اور وہاں سے مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا کھلی سڑک پر آگیا۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنیاں اونگھ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے چلتے چلتے مجھے ایک جوڑا نظر آیا۔ دو دھندلے سے بھوتیڑی نما ہیولے کے پھونس میں سے روشنی کی کرنیں نکل رہی تھیں اور زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہاں دو تین تانگے بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں جانے کے بجائے میں ایک تانگے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں تانگے والا آگیا اور زرد مردگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کدھر جانا ہے بابو جی؟"

"کیا تم شہر کے تمام گلی کوچوں سے واقف ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی! ان سڑکوں پر تانگا چلاتے ہوئے عمر بیت گئی ہے کہو کہاں جانا ہے بابو؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھے نواب سراج علی کی حویلی جانا ہے۔" میں نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

وہ نواب کے نام پر جز بز ہونے لگا اور مجھ سے تھلے کا نام پوچھنے لگا۔ تھلے کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہوٹل میں پتہ پوچھنے کے لیے گیا۔ "چلو جناب تشریف رکھو۔ پردیسی معلوم ہوتے ہو؟" اس نے چابک اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "کون سی گاڑی سے آئے ہو جناب؟"

"کسی گاڑی سے نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "باتیں کم کرو اور تانگا زیادہ چلاؤ۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔"

اس نے پلٹ کے ترشی سے دیکھا اور کہا۔ "اتر جائیے جناب! ہم اپنی مرضی کی سواری بٹھاتے ہیں۔ میٹھے بول کے عاشق ہیں۔"

"میں نے کون سی کڑوی بات کہی ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔ "ہر وقت آدمی میٹھے بول نہیں بول سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

"تو یہ کہیے نا! کہیے تو پہلے کسی حکیم کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔"

"نہیں شکریہ! مجھے پہلے وہیں جانا ہے۔" میں نے اکتا کے کہا۔

"دولت خانہ کہاں ہے جناب کا؟" وہ گھوڑے پر چابک برساتے ہوئے بولا۔

"رنگ پور۔"

"یہ کہاں ہے جناب؟"

"بنگال میں۔ راستہ کتنی دور ہے؟"

"اطمینان سے بیٹھیے۔ پہنچا دوں گا بابو جی! تین دن سے جانور دشمن کی نظر کا شکار ہے۔ یہ نظر بھی بڑی بری چیز ہوتی ہے۔"

اس نے باتیں بھرا ایک مُکے کے لیے زبان بند نہیں کی۔ میں تند مزاجی کا نتیجہ دیکھ چکا تھا اس لیے مول ہاں کر کے اس کی باتوں کے جواب دیتا رہا۔ شاید سرتانگے والا اتنا ہی بولتا ہے۔ گیا اور مراد آباد میں بھی یہی ہوا تھا۔ دو گھنٹے بعد تانگا ایک عمارت کے سامنے رک گیا۔ یہ عمارت زلیں کی حویلی سے بڑی نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا اور پہرے دار موجود نہیں تھا۔ میں نے جیب سے روپے نکال کے تانگے والے کو دیے۔ وہ مجھے دعائیں دینے لگا اور کھڑا رہا۔

"تم اب جاؤ۔" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب! پہلے دروازہ تو کھل جائے۔ تسلی کر کے جاؤں گا خوامخواہ میں دروازہ نہیں کھلا تو آپ رات کو کہاں ٹھہریں گے۔"

"دروازہ کھل جائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ میں اس کی ہمدردی میں حویلی کی چار دیواری کا چکر نہیں لگا سکتا تھا اور جا نا ہوا نظر نہیں آتا تھا ناچار میں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ تانگے والا بھی میری مدد کو آگیا۔ سونے والے پہرے دار کو گالیاں دینے لگا خاصی دیر کی گالہ و کے بعد اندر کسی نے آواز لگائی۔ "جواب میں میں نے اپنا نام فتح علی بتایا اور خود کو نواب سراج کا عزیز ظاہر کیا۔ تانگے والے نے میری جانب سے جواب دیا۔ باہر کی گڑبڑ سے آئے میں بے خبر میاں! دروازہ کھولو ورنہ نواب صاحب کی ناراضی دروازے کے بجائے کھڑکی کھول گئی۔ اندر سے ایک معمر شخص میں چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ برآمد ہوا اور میرا سرسے پیر جائزہ لینے لگا۔ رنگ پڑھ سے؟" اس نے منہ بنا کے پوچھا۔ "بھلا آپ کو ہیں نواب صاحب کے؟"

"میں ان کے لیے اپنے چچا کا خصوصی پیغام لے کر سکتے سے آیا ہوں۔"

نے بجاری آواز میں کہا۔ "نواب صاحب کو جگا دیجیے، پیغام نہایت ضروری ہے۔"

"نواب بہادر بیمار ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "صبح آئیے۔"

"ارے گھر آئے مہمانوں سے ایسی باتیں کرتے ہو۔" تانگے والا ناراض ہو گیا۔ "نواب صاحب کو پتہ چلے گا تو کھڑے کھڑے حساب کر دیں گے۔"

"میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہرا سکتا ہوں مگر نواب بہادر سے ملاقات صبح ہی ہو سکتی ہے اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جائیے جناب آرام کیجیے۔ کچھ لیجیے گا گاڑی لیٹ ہو گئی۔" میں ان دربان میاں کی تو خیر نہیں۔ بھلا فیض آباد میں نواب سراج علی کی حویلی کے پہرے دار ان کے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔ واہ میاں واہ! باہر کی کا چھوڑ نہیں دیکھ رہے ہو، بڑے بھی کسی شہزادے سے کم نہیں۔ ان کی طبیعت بھی خراب ہے چاچا۔" تانگے والے اور پہرے دار میں تو تو میں میں ہونے لگی تو میں نے دخل دے کے معاملہ رفع کر دیا۔ "تانگے والا مجھ سے سلام دعا کر کے بڑی مشکل سے خفت ہوا۔ پہرے دار دروازہ بند کر کے بڑبڑاتا ہوا مجھے عمارت میں لے گیا۔ عمارت سے خوش سلیقگی ٹپکتی تھی۔ پہلی ہی منزل پر ایک علیحدہ حصے میں اس نے مجھے ایک آراستہ کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے اس کی خوشامد کی کہ وہ نواب صاحب کے کمرے تک چلے اور ان سے درخواست کرے کہ مجھے وہ میرا نام سن کے مزید دروازہ کھول دیں گے۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا۔ میں نے اسے لالچ دیا تو وہ کچھ مشکوک ہو گیا۔ زلیں نے مجھے جو چاقو دیا تھا، میں نے سوچا، وہی چاقو دکھا کے اس سے نواب تک رسائی کرے میں پہلے کسے اطلاع کروں، ظاہر ہے، صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا، مجھے سنہ اندھیرے ہی فیض آباد سے دُور نکل جانا چاہیے تھا۔ کسی بے محل جاگ پا ہو جانے میں تھوڑی دیر بعد سرکے کر میں گیا، جو تو اسے پتہ چلے کہ میں ابھی تک غائب ہوں۔ پہرے دار کے انکار پر مجھے غصہ آنے لگا۔ اتنی بڑی حویلی میں کسی کی مدد کے بغیر میں نواب کا کمرہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہی میری مدد کرے۔ میں نے اسے مختلف انداز میں نواب سے ملاقات کی اہمیت بتائی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجبوراً مجھے اس سے سخت لہجے میں بات کرنی پڑی۔ اس کا الٹا اثر ہوا۔ اس نے مجھے حویلی سے باہر دھکے دینے کا حکم دے دیا۔ میں نے اس کا کاندھا پکڑ لیا۔ "چلو۔" میں نے اپنی مہیب آواز نکال کے کہا۔ "مجھے نواب سے ملنے کے لیے مزید حجت کرنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر مصر رہا لیکن جب میں نے اس کے گلے پر ایک ہاتھ رسید کیا تو گھگھیانے کا آمادہ ہو گیا۔ "خاموشی سے چلے چلو۔" میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے حکم دیا۔

"جناب ہماری عمر بھر کی بنی بنائی خاک ہو جائے گی۔" وہ گڑگڑایا۔ "پھر ہمیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ ہم بال بچے دار ہیں۔ ہمارے بچے بھوکے مر جائیں گے۔"

"تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ میں نواب صاحب سے تمہاری سفارش کروں گا۔ میں کسی بُرے ارادے سے نہیں آیا بڑے صاحب! مجھے یہاں ڈاکا نہیں ڈالنا، ڈاکا ڈالنا ہوتا تو میں تمہیں پہلے ہی ختم کر چکتا۔ مجھے نواب سے ایک ضروری بات کرنی ہے سمجھے نواب صاحب مجھے دیکھیں گے تو تم سے خوش ہوں گے کہ تم نے فوراً مجھے اُن کے پاس پہنچا دیا۔"

"جناب ایسی کیا بات ہے جو آپ صبح تک نہیں رُک سکتے۔"

"مجھے جواب کے فوراً واپس جانا ہے۔"

وہ ٹھٹکا اور جھجکتا رہا اور زینے پر چڑھ کے جانے لگا۔ حویلی اندر سے بھی ہوئی تھی۔ جھاڑ فانوس سے آراستہ، دیواریں صاف و ستھری تھیں۔ ان تمام چیزوں سے نواب کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ اوپر پہنچ کے ایک کونے میں دھرا پہرے دار اٹھ اور ٹٹولتا ہوا لالٹین سرکا رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اوپر کے حصے میں بھی کوئی پہرے دار موجود ہو گا۔ ہماری آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ہڑبڑا کے لٹھ اٹھا لیا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا سنتا، میں نے اس کی لاٹھ والا ہاتھ پکڑ کے دوسرے ہاتھ کی گردن کی پشت پر اتنی تیزی سے ید ھار مارا کہ وہ فرش پر بے سُدھ گر گیا۔ اپنے ساتھی پہرے دار کا یہ انجام دیکھ کے نچلے حصے کا پہرے دار چلانے لگا۔ میں نے اسے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اوپر کے حصے کے تمام کمروں کا راستہ غالباً اسی دروازے سے گزرتا تھا۔ بڈھے پہرے دار نے چابیوں کا گچھا اٹھا کے تالا کھولا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نواب سراج علی باہر سے تالا لگوا کے سوتا ہے یقیناً اوپر کی عمارت سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہو گا مگر فی الحال اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ پچیس پچاس قدم تک رہنمائی کرتا ہوا بڑھا پہرے دار ایک خراب دار دروازے کے سامنے رُک گیا اور لرزتی ہوئی آواز میں اشارہ کرنے لگا۔ میں نے دستک سے پہلے چند لمحوں تک غور کیا، کمرے کے دروازے کی شان و شوکت سے پتہ چلتا تھا کہ پہرے دار دھوکا نہیں دے رہا ہے دوسرے ہی لمحے میں نے اسے بھی فرش پر گرا دیا۔ مجھ نے بے ضرر داؤ مجھے خاص طور پہ سکھایا تھا۔

میری معمول دستک پر آنکھیں ملتے ہوئے، سفید پاجامے اور کرتے میں ملبوس گندمی رنگ کے ایک بوڑھا قاری بردبار ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا، میرے ہاتھ میں بند چاقو چھپا ہوا تھا۔ میرا چہرہ دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا۔ "نواب سراج علی!" میری آواز بھر بھرانے لگی۔

اس نے تذبذب سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "آپ!" وہ مدھم پڑتے ہوئے بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" میں نے اپنی آواز پر قابو پایا تھا۔

"مگر، مگر اس وقت؟" اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہاں نواب صاحب! کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔"

"مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے لیکن میرے پاس یہی وقت تھا۔" میں نے اطمینان کیا کہ وہ اندر آئے تو کہے گا جب اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی گفتگو کرنا

چاہی تو میں اُسے ہٹا کے خود اندر چلا گیا۔ نواب سراج علی کو دیکھ کے چاتو پر میری انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالے رکھا جاگو اور کپتان خاں نے فیضہ کے نام کے ساتھ اُس کا نام لیا تھا تو مجھ سے اُن کے سامنے سر نہیں اٹھایا گیا تھا۔ اب نواب سراج علی میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاش میں اُس کی آنکھیں نکال سکتا ان آنکھوں نے فیضہ کو کن نظروں سے دیکھا ہوگا، وہ بظاہر ایک معقل اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔ میری جسارت پر وہ حیرت اور برہمی سے میرا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور ایک ہاتھ سے چاقو اچھال کے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ برجستہ عمل یقیناً نواب کی سمجھ سے بعید نہیں رہا ہوگا۔ نواب بوکھلا گیا تھا۔ پھر اُس نے اندر چلنے کے لیے ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا۔ "نواب صاحب! مجھے آپ سے زیادہ بات نہیں کرنی، پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ میں آپ کا مال و اسباب لوٹنے نہیں آیا ہوں، میں ڈاکو نہیں ہوں۔"

"بیٹھیے بیٹھیے۔" اُس نے اضطراب سے کہا۔

"نواب صاحب! میں نیلم جان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"نیلم جان!" اُس نے چونک کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ہاں نیلم جان، مجھے معلوم ہے کہ آپ کے اُس سے خصوصی مراسم تھے۔" میں نے مشکل تمام یہ لفظ ادا کیے۔ "میں اُسی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

نیلم جان کا اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ "وہ تو روٹھ گئی۔"

"ہاں وہ وداع ہو گئی۔" میں نے تشکر لہجے میں کہا اور کہتے کہتے کہیں کھو گیا۔ نواب کی کھسماہٹ پر مجھے ہوش آیا اور میں نے بغل کے کہا۔ "وہ مر گئی۔"

"آپ اُس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"نواب صاحب! مجھے کچھ مت پوچھیے جو کچھ آپ نیلم جان کے بارے میں جانتے ہوں سچ سچ کہہ دیجیے۔" میں نے بدحواسی انداز میں کہا۔

"آپ کون ہیں کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام پوچھ کے کیا کیجیے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے جلد ہی واپس جانا ہے، مجھے نیلم جان کے بارے میں بتائیے آپ اُسے کب سے جانتے تھے آپ اُس کے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں؟"

"یقیناً آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے نہیں۔" نواب قابو یافتہ لہجے میں بولا۔ "ازراہ نوازش سکون سے بیٹھیے اور مجھے یہ بتائیے کہ آپ اُس کے بارے میں اتنے تجسس کیوں ہیں؟"

"نواب صاحب! وقت ضائع مت کیجیے۔ میں جس طرح آپ کی حویلی میں داخل ہوا ہوں کچھ اس کا خیال کیجیے، بہتر ہے آپ ہر بات بتا دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔ میں آپ کی رسوائی کے لیے یہاں نہیں آیا، میرا کچھ اور مقصد نہیں ہے۔ بتائیے آپ اُس سے کب ملے؟" میں نے بے قراری سے کہا۔

"میری اُس سے کچھ زیادہ شناسائی نہیں تھی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ نے چمپا بائی سے متعدد بار اُس کا سودا کرنے کی پیش کش کی تھی۔"

"معذرت کیجیے۔" نواب نے بے چینی سے کہا۔ "یہ صحیح ہے کہ میں نے چمپا بائی کو اس قسم کی پیش کش کی تھی مگر میں اُسے عزت کی زندگی دینا چاہتا تھا۔"

"نواب صاحب! اللہ کچھ مت چھپائیے آپ کی غلط بیانی سے کسی کا کام بگڑ سکتا ہے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ آپ بتائیں گے وہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ آپ نیلم جان کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟"

"برادرم!" نواب گہری سانس لینے لگا۔ اُس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا اور دل سکتہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو کیا بتاؤں مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں نیلم جان ایک سربستہ راز تھی، جب سے اُسے دیکھا تھا کبھی اور طوائف سے رابطہ قائم کرنے کو جی نہیں چاہا۔ وہ سب سے مختلف تھی، خوب گاتی تھی اور ٹرٹی دل سوز باتیں کرتی تھی۔"

"کیا آپ کیا آپ اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ آپ نے اُس سے کبھی پوچھا تو ہوگا؟"

"پوچھا تھا۔" اُن گنت بار پوچھا تھا لیکن وہ سرد آہیں بھر کے رہ جاتی تھی اگر جواب" وہ جھجک کے بولا۔ "سوال یہ ہے کہ آپ کیوں اُس کے سلسلے میں کرید رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ وہ ایک پاکیزہ لڑکی تھی، نہایت حسین، نہایت نفیس عورت، اُس کی روح مجھ سے شاکی ہوگی پہلے آپ اپنے بارے میں بتائیے۔"

"جناب! آپ فضول کی بحث کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں، میں آپ کو اپنے متعلق کچھ نہیں بتا سکوں گا لیکن مجھے آپ سے نیلم جان کے سلسلے میں سب کچھ پوچھنا ہے کسی طرح بھی، میں نے چاقو اُچھالتے ہوئے پھر کہا۔ "میں نیلم جان کا ایک ہمدرد ہوں۔"

نواب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں سمجھ رہا ہوں، آپ ضرور اُس کے کوئی ہمدرد ہیں، مرنے کے بعد لوگوں کو کون پوچھتا ہے، کہیں آپ وہ شخص تو نہیں جس کی آغوش میں نیلم جان نے دم توڑا تھا۔ آپ کا چہرہ، اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ کا چہرہ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کا چہرہ نیلم جان سے شباہت ہے، آپ کی آنکھیں، آپ کی پیشانی، میں دعوا تو نہیں کر سکتا مگر کتنی شباہتیں ہیں مجھے معاف کیجیے، مجھے معاف کر دیجیے شاید میں نے دورانِ گفتگو نیلم جان کے متعلق کوئی نازیبا بات نہیں کی ہے پھر بھی آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔"

"نواب سراج علی!" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "میری بات کا جواب دیجیے نیلم جان ایک طوائف تھی، وہ کوٹھے پر بیٹھ کے اپنے طلب گاروں کا دل بہلاتی تھی، وہ اُس کے عشرت کدے میں آتی تھی اُس کے متعلق بُرا سوچنا کیا۔ وہ تو ایک طوائف ہی تھی۔"

"وہ طوائف نہیں تھی، وہ طوائف نہیں تھی۔" نواب کچھ ایک تہمت ہے، ایک گالی ہے، میں نے زندگی کے پچیس سال گزارے ہیں میں نے ایسی طوائف نہیں دیکھی، اتنی اداس، اتنی تیکھی نفیس، اُس کی اچھی خوبیوں کی وجہ سے میں اُسے اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ میری ایک بیوی تھی وہ عرصہ پہلے اولاد کے بغیر مر گئی۔ اُس کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ نیلم جان سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اُس کے لیے بڑی سے بڑی جنت لگا دی تھی۔ وہ یہاں آ کے ہمیشہ طور پر گانا چھوڑ دیتی تھی، چمپا بائی کی وجہ سے وہ تو مالے نے وقت میری باتیں سنتی اور مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی، وہ میری صحت کے بارے میں فکرمند رہتی تھی، اُس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا میں نے اُس کے بے شمار مرتبہ کسی فرمائش کے لیے کہا مگر اُس نے جواب میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہو جاتی تھی، چنانچہ میں نے اُس سے اس قسم کی باتیں کرنی ہی ترک کر دی تھیں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ مجھ سے متاثر تھی اور اُس کی موت کا واقعہ سن کے مجھ سے چلا نہیں جاتا، مجھ سے بات نہیں کی جاتی، اُس کا چہرہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے۔" نواب کی آنکھیں نم ہو گئیں، گلے میں جیسے کوئی چیز پھنس گئی۔ "اب میرا دل باہر نکلنے کو نہیں چاہتا۔" وہ کہا گئی ہے کہ سب چین قرار لے گئی۔ مجھے میں اُس کے کفن دفن میں شریک ہونے کی ہمت نہیں تھی، میں اُس کی قبر پر بھی نہیں جا سکا۔ وہ میرے لیے کھانا پکاتی تھی، میرا لباس منتخب کرتی تھی، وہ اس حویلی کی آرائش میں دلچسپی لیتی تھی۔" نواب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

مجھ پر سناٹا چھا گیا، چاقو میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا اور مجھے اُسے اٹھانے کا خیال بھی نہیں آیا، میری آنکھیں بہہ رہی تھیں، دیر تک ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی، پھر نواب نے اپنی کرسی میرے قریب کھینچی۔ "آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ کو اُس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کس گھر سے تعلق رکھتی ہے، اُس کا گھر کہاں تھا؟ اُس نے کچھ تو بتایا ہوگا یہ؟"

"نہیں، کچھ نہیں بتایا۔" میں نے اُس کا ماضی کریدنے کی بہت کوشش کی اُس کو سے دعا اُس ہو جاتی تھی اور مجھے اُس کی اداسی گوارا نہیں تھی، اتنا تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ قسمت نے اُس کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ اُس کا لہجہ وہ نہیں تھا جو بالاخانوں میں ہوتا ہے، وہ تو بڑی سادہ اور معصوم تھی، لیکن بہرحال صرف ایک بار کسی تقریب پر شاید عید کے موقع پر وہ جانے کیسے اُس کی زبان سے نکل گیا تھا کہ اُس کا بھی ایک گھر تھا جو اجڑ گیا۔ البتہ وہ اپنے ایک بھائی کو بہت یاد کرتی تھی جو گھر سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا۔"

"اور کیا کہتی تھی وہ؟" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کچھ نہیں عزیزم!" وہ افسردگی سے بولا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"میرا جی چاہا کہ اپنے گالوں پر طمانچے لگاؤں، نواب کو شاید میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ "آپ۔ آپ کچھ کھائیں پئیں گے، میں تو بھول ہی گیا۔ سگریٹ نواب صاحب....."

"نہیں نواب صاحب! مجھے جانا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی، ایک بات اور بتا دیجیے۔ کیا چمپا بائی نے آپ کو کبھی اشارۃً یہ بتایا تھا کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے حاصل کیا؟"

"نہیں، نائیکا میں ایسی باتیں نہیں بتایا کرتیں۔"

"آپ کے خیال میں چمپا اُسے کہاں سے لائی ہوگی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چمپا ایک مشاق نائکہ ہے، کہیں سے بھی نیلم جان کو براہ راست اُس کے ہاتھ آگئی ہو یا اُسے اُس نے کسی واسطے سے حاصل کیا ہو، بات یہ ہے کہ شہر میں طوائفوں اور اُن کے طلب گاروں کے درمیان ایک غیر رسمی معاہدہ ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہیں لیں گے۔ فیض آباد میں اپنی تھوڑی بہت عزت ہے، چمپا بائی نیلم جان کو چھپا کے یہاں بھیجتی تھی، ورنہ شہر میں بڑی رسوائی ہوتی۔ بالا خانے بھی زندہ درگور جانے سے خوفزدہ کرتے ہیں، میں تو اگر زیادہ تفتیش میں پڑا۔ تو چمپا بائی مجھ سے محتاط ہو جاتی اور اس طرح نیلم جان مجھ سے دور ہو سکتی تھی۔"

"چمپا بائی شہر سے فرار ہو گئی ہے، اب مجھے اُس کی تلاش ہے، نواب صاحب! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ مجھے کہاں دستیاب ہو سکتی ہے؟"

"آپ اُس سے مل کے کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں، میں اُس سے حاضری سے درخواست کروں گا کہ مجھے وہ جگہ بتا دے جہاں سے اُس نے نیلم جان کو حاصل کیا تھا۔"

"مگر کیوں، اُس کی موت کے بعد اب آپ کو کیا حاصل ہوگا؟"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے اور آپ پوچھیے بھی نہیں۔"

"میں نے آپ کو اپنی ہر بات بتا دی ہے، کیا آپ مجھ پر اتنا بھی نہیں کریں گے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم دونوں کا غم مشترکہ ہے، مجھے بتانے اور میری طرح یقین کیجیے کہ میں نیلم جان کو اُس کی موت کے بعد رسوا کرنے کی رذالت نہیں کروں گا۔"

"نہ پوچھیے آپ کچھ مت پوچھیے۔" میں نے بھلا کے کہا۔

"عزیزم! خیر آپ نہ بتائیے لیکن ایک بات تو طے ہے کہ اُن بالاخانے پر آپ نیلم جان کے سامنے موجود تھے۔ آپ کو دیکھ کے اُس کی عسرت کا یہ عالم زیر ہو گیا اور جب آپ پاگلوں کے مانند نیچے گئے تو اُس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی، نے مجھے ساری بات بتا دی ہے، مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اُس کا جنازہ کس گھر سے اٹھا اور آپ کن لوگوں کے ساتھ بالاخانے تشریف لائے تھے۔ میں نیلم جان کا چہرہ نہیں بھول سکتا، آپ کا چہرہ بھی نہیں بھولے گا، ساری کہانی خود بیان کر رہے ہیں خیر جانے دیجیے۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "میری نظر میں نیلم جان کوئی طوائف نہیں تھی اُس نے میرے بہت سے جذبات والبتہ تھے، اُس کا کوئی عزیز جیسے گئے تو مجھ پر اُس کی پرائیویٹ ڈائری ہے، وہ میرا مہمان عزیز ہے۔ آپ یہاں تشریف میرے پاس پہنچیے ہم دونوں مل کے چمپا بائی کو تلاش کریں گے۔"

"مہربانی نواب صاحب بعد کے لیے اب کچھ اور مت کہیے۔ مجھے فرمانا بتا دیجیے کہ چمپا بائی کہاں جا سکتی ہے؟"

"وہ کہاں نہیں جاسکتی۔" نواب نے بڑی مسکراہٹ سے بولا۔ "ہندوستان میں کسی جگہ بھی جاسکتی ہے۔ ہر جگہ اس کا گھر موجود ہے۔"

"پھر بھی وہ اپنے تماشاؤں کے سوا اور کہاں جائے گی؟"

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر ہے میں اس کی ایک بن موتیا رہتی ہے وہاں جاسکتی ہے زیادہ دور جانے کا تو امکان نہیں ہے وہ قریب کے شہروں میں کسی جگہ گئی ہوگی۔ ہاں وہ رام پور بھی جاسکتی ہے وہاں کے نوابوں سے اس کا تعلق ہوسکتا ہے کھٹو تو وہ نہیں گئی ہوگی۔ ریاستوں میں اس کے چھپنے کا زیادہ امکان ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔"

"مجھے اجازت دیجیے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔"

"جناب! میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا آپ یہاں قیام کریں گے آپ میرے مہمان رہیں گے اور میں آپ کے ساتھ شہر میں خود چلوں گا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں میرے لیے ایک نمود گوارا مشکل ہے میں جانے کن دیواروں کو عبور کر کے آپ کے پاس آیا ہوں صبح ہونے سے پہلے مجھے شہر سے نکل جانا ہے ورنہ میں پھر کبھی نہ جاسکوں گا۔ ازراہ عنایت میرا راستہ نہ روکیے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" نواب ناراضی سے بولا۔ "آپ کے آنے سے تو میری طبیعت سنبھل گئی ہے ہم رات کے وقت کسی دن یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ ایک آدھ دن تو سفر کی تیاری ہی میں لگ جائے گا۔ رہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔"

"نواب صاحب! ابھی آپ مجھے جانے دیجیے میں پھر فیض آباد آؤں گا اور آپ کے ہاں کئی دن قیام کروں گا۔ مجھے جانے دیجیے۔"

"دیکھیے جناب! چمپا بائی جن علاقوں میں ہوگی وہاں کچھ اچھے لوگ نہیں رہتے آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں ہے اور پھر ایسے عالم میں جب آپ کے ذہن پر غم کا بوجھ بھی ہو۔"

"نواب صاحب! میں جانتا ہوں مجھے اپنے آپ پر کتنا جبر کرنا ہوگا۔"

"تو آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے۔" نواب شکایتی انداز میں بولا۔

"اصرار مت کیجیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" نواب زچ ہو کے بولا۔ "اچھا ایک بات ہماری ضرور مانیے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کس فراغت میں سفر کر رہے ہیں میں آپ کو اپنا بھائی اپنا عزیز سمجھ کر کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں گا۔ آپ انکار نہیں کریں گے کہ میں نے یہ تسلیم نہیں کروں گا۔"

"دیکھیے میرے پاس کافی روپے ہیں۔" میں نے جیب سے نوٹوں کا رومال نکال کے اسے دکھایا۔ "اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔" اس نے اصرار کیا۔

میں نے مزید انکاریوں نہیں کیا کہ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور نواب آسانی سے ہار مانتا نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے دیوار میں نصب ایک تجوری کھول کے رومال میں نوٹ رکھے اور میری جیب میں ٹھونس دیے اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ میں نے معذرت کے ساتھ اس کے دونوں ہیبت دار ساتھ بیش آنے والا واقعہ بتایا۔ دونوں ہیبت دار بھی کمانوں پر چڑھے تھے۔ نواب نے انھیں بلایا۔ بوڑھا ہیبت دار کچھ ہوشیار ہوا اور نواب کو میرے ساتھ دیکھ کے پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور میرے پیروں پر گر گیا۔ نواب نے فی الفور معافی تلافی کرانے کا حکم دیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ اتنی رات گئے نواب مزاج علی کی بگھی سڑکوں سے گزرتی تو کئی نگاہیں اٹھتیں بڑے دوانے تک نواب خود مجھے رخصت کرنے آیا۔ ہیبت دار مہمان خانے سے میرا سامان لے آیا تھا۔ نواب نے رخصت ہوتے وقت میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھا اس کے چہرے پر بے انتہا تکدریں کھنچ گئیں اور وہ فوراً پلٹ گیا۔ گھر میں آنے کے بعد دربان کے کھڑکی بند کرنے کی آواز نے دور تک میرا تعاقب کیا۔

✱

میں اندازے سے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رفتار تیز تھی راستے میں ایک تانگا مل گیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، گاڑی چھوٹ چکی تھی اور میں علی کی روانگی میں دوسری گاڑی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ تانگے والے نے مجھے لاری کے اڈے پر پہنچا دیا۔ صبح ہونے میں ابھی لاری کے اڈے سے قریب سنسان جگہ ٹھیرا رہا، ٹھیک چھ بجے لاری روانہ ہوئی تب مجھے سکون ہوا۔ لاری رکتی تھرتی دس بجے لکھنؤ پہنچی اس وقت لکھنؤ سے کوئی گاڑی آگرے کی طرف روانہ نہیں ہوتی تھی۔ میں پھر آگرے کی سمت جانے والی لاریوں میں بیٹھتا اترتا رہا اور اس طرح فیض آباد اور لکھنؤ سے دور ہوتا گیا۔ بریلی اسٹیشن پر گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے میں شہر میں اتر گیا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ ایک ہوٹل میں سامان رکھ کے میں نے لباس تبدیل کیا اور تانگے کے ذریعے طوائفوں کے بازار پہنچ گیا۔ اس جگہ کا نام اعظم نگر تھا۔ رات کا وقت تھا، اعظم نگر میں سونا جاگتا تھا اور فیض آباد کے بازار کی طرح رونق تھی۔ پہلے تو میں چوڑی سڑک اور اس سے ملحق گلیوں میں بنے ہوئے مکانات میں جھانکتا رہا۔ پھر مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ اس طرح تو چمپا بائی کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ کچھ دروازے بند تھے اور گانے کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ کھلے ہوئے تھے اور وہاں خوب صورت لڑکیاں انتظار میں بیٹھی تھیں بجلی کے قمقموں پر میں کھلے ہوئے دروازوں میں جھانک سکتا تھا میں وہاں گھومتا رہا۔ چمپا بائی کے بارے میں کسی سے براہ راست پوچھنے میں اندیشہ تھا جب میں دو تین بار ادھر سے ادھر منڈلاتا رہا تو میں نے محسوس کیا کچھ آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ گردن میں شوخ رنگ کا رومال ڈالے ہوئے ایک شخص نے میرے قریب آکے چپکے سے کہا۔ "میرے ساتھ آئیے۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نزدیک ہی۔" وہ آنکھیں جھپکاتا ہوا بولا۔

میں نے چند لمحے سوچا، پھر اس کے ساتھ چل دیا، وہ مجھے ایک گلی میں لے گیا اور ہم کئی دہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوگئے۔ کمرہ روشن تھا اور ایک خوب صورت نوخیز لڑکی ساز و نمود سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے آتا دیکھ کے اس نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی

تھا کہ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کہنے لگا۔ "میرے لیے؟ میں اوروں سے کہتی ہوں۔"

نے گھر کے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے پاس ہی ایک ادھیڑ عورت بیٹھی تھی۔ اس نے اٹھ کے مجھے قالین پر بٹھایا۔ میرا جی ستانے لگا۔ میں یہاں گانا سننے نہیں آیا تھا لیکن اب یوں ہی واپس جاتے بڑے جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ عورت نے مجھے پان کی گلوری پیش کی لڑکی نے گانا شروع کیا۔ وہ گاتی رہی اور میں اپنے میں گم بیٹھا رہا۔ نہ میں نے اسے داد دی نہ اپنے پاس بلایا۔ پھر دیے اس نے بے دلی سے جلد ہی غزل ختم کر دی اور حیرانی سے مجھے گھورنے لگی مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اب گا نہیں رہی ہے۔ ادھیڑ عورت نے میرے نزدیک آکے پوچھا۔ "کیا سرکار کو غزل پسند نہیں آئی نصیب دشمناں مزاج کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔" میں نے کسمساہٹ سے کہا اور اٹھ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے میں نے دس روپے کا نوٹ لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ وہ شخص اب بھی میرے ساتھ تھا اور میری ناپسندیدگی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ مجھے کہیں اور چلنا تھا لیکن ضروری نہیں کہ میں گانا ہی سنوں۔ میں تو چمپا سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"چمپا سے؟" وہ تعجب سے بولا اور مسکرانے لگا۔ "اچھا میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھے؟"

"اے صاحب! آیئے میں آپ کو چمپا سے دکھاتا ہوں یہ ایک شوار الاخانوں پر لے گیا، کہیں محفل سجی ہوئی تھی، کہیں بار سنگھار کیے لڑکیاں گنگنا رہی تھیں۔ مجھے چمپا بائی کہیں بھی نظر نہیں آئی میرا صبر جواب دینے پر چڑھنے لگا تو اچھے تو سے پھلانگنے پھلانگتے تھک چکا تھا۔ میں کہیں رکتا ہی نہ تھا۔ کیا آپ کو کسی خاص لڑکی کی تلاش ہے؟"

"ہاں! پر یہاں وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "اس کا نام چمپا ہے۔"

"چمپا! اس نام کی تو کوئی لڑکی اس بازار میں ہے نہیں۔"

"سوچ کے بتاؤ۔"

"نہیں جناب! اس بازار میں کون آتا ہے کون جاتا ہے مجھے سب علم ہے۔ تسلی آپ نے خود دیکھ لیا کہ اپنی یاد اللہ سب سے ہے۔"

"یعنی تم نے چمپا نام کی کسی طوائف کا نام نہیں سنا؟"

اس نے چند لمحے سوچ کے جواب دیا۔ "نام تو سنا ہے مگر مجھے یقین ہے یہاں بہت سوں سے اس نام کی کوئی لڑکی نہیں آئی۔"

"یہ نام تم نے سنا ہے اس کا پھر حوالہ دیجیے۔"

"مجھے پھر یاد نہیں آتا۔"

میں نے لڑوں کی لگڈی میں سے بیس روپے نکال کے دیے۔ اتنی دیر میں اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کہنے لگا۔ "میرے لیے؟ میں اوروں سے کتنی طوائفیں اور ان کی نائکائیں یہاں آتی ہیں ان کے آگے چھوٹا چھپانی ہو گی تو خود پتہ چل جائے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے ٹھیریے۔" میں ایسی اچھی کے آستانوں مگر یہ آپ کی تسلی کے لیے ہے۔" وہ مجھے ایک جگہ ٹھیرا کے بولا گیا اور پندرہ بیس منٹ بعد منہ لٹکائے واپس آگیا۔ "چمپا بائی نامی ایک طوائف فیض آباد میں رہتی ہے مگر وہ تو نائکہ ہے اور صرف ایک ہی دفعہ میرے ہاں آئی ہے۔"

وہ شخص اسٹیشن تک میرے ساتھ رہا۔ اتنی مختصر ملاقات میں وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگا تھا۔ اصرار کرتا رہا کہ میں بمبئی واپس جاؤں اور پھر وہ مجھے فیض آباد لے جائے گا اور رام نگر کے طوائفوں کے منازر دکھائے گا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر وہ مجھے چائے پلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل معمولا تھا۔ گیس کی لالٹین بھڑک رہی تھی سیاہ دیگچیاں چولھوں پر رکھی ہوئی تھیں اور تین چار تپائیاں دھری بچھی پڑی تھیں۔ ہوٹل خالی تھا۔ صرف ایک مزدور میٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ چائے بنانے والا تو وہ اور اس کا دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ڈبل ڈول میں بس غنیمت تھے لیکن میرے ساتھ جو جھل کے گروہ کے آدمی لگتے تھے آتے ہی انھوں نے ایک تپائی کو ٹھوکر سے الٹ دیا اور ہوٹل والے کو گالی دیتے ہوئے ہمارے برابر تپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے چائے کی پیالی اٹھائی ہی تھی کہ ایک گال کے ساتھ میری جیب پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکا۔ پیالی سے زمین پر جا پڑا۔ دوسرے نے میرا تھیلا اپنے قبضے میں کر لیا اور کمبل نوچ پھینک بھاگتے ہی میں نے ایک قلابازی لی۔ اس طرح میری جیب اس کی دست برد سے محفوظ ہوگئی۔ میرا صبر جس کا نام رُل تھا، تیزی سے مجھے سہارا دیتے آیا لیکن اٹھنے کے بجائے اس نے میرے بازو اس انداز سے پکڑ لیے کہ مجھے ہاتھ چلانے میں دشواری ہوئی۔ اسی اثنا میں ان بدمعاشوں میں سے ایک نے میرے گال پر زور سے لگایا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے مرنے مارنے کے لیے جدوجہد کی مگر گرفت نے انھیں اور زور سے جکڑ لیا۔ اس نے میرا ہاتھ میرے منہ پر رسید کیا اور چاقو کھول کے مجھ پر تان لیا۔ رُل ان کی نشاندہی کرنے لگا کہ وہ ایک مسافر پر کیوں ظلم کر رہے ہیں لیکن اب رُل کی چالاکی ہاری سمجھ میں آچکی تھی۔ میں نے ایک نگاہ میں چاقو کی نوعیت اور چاقو بردار شخص کے تیور دیکھے۔ دوسرے کو میرے تھیلے سے رقم نکالنے پر بڑی بازی ہوئی تھی اور اس نے غلیظ گالیاں دے کے تھیلا ایک طرف پھینک دیا۔ چاقو بردار بھی اپنے ساتھی کی طرح چاقو تان کے کھڑا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں پینترا بدلے رُل کو اپنے آگے کر کے تماشوں نے میرے بازو چھوڑ دیے۔ رقم نکالنے انھوں نے چاقو کچھ آگے کر کے مجھے حکم دیا۔

"میرے پاس کچھ نہیں صرف سفر کا خرچ ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"خبردار جو ایسی ویسی حرکت کی میں تم سب کو پکڑوا دوں گا۔" میں نے سوچ سمجھ

یہ جملہ ادا کیا تھا۔ وہ تعداد میں دو تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ تیسرا بھی اُن کا ساتھی تھا۔ اُن پر یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ میں نے ساری گنی ان کے چاقوؤں کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چاقو مجھ سے دُور رکھیں گے۔ اُن کا مقصد مجھے خوف زدہ کر کے رقم حاصل کرنا ہے وہ رقم حاصل کیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔ رقم میں انھیں دے دیتا اگر مجھے ایک ہلکا سا معلوم سفر درپیش نہ ہوتا اور چونکہ مجھے آگے جانا تھا اس لیے میں اُن سے کوئی بڑا جھگڑا مول لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہوٹل کی جگہ تنگ تھی۔ یہ موجمدار کی عادت نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر ہتھیاں بھی راستہ روکے ہوئے تھیں۔ میری نظر بظاہر اُن پر مرکوز تھی لیکن تمام اطراف کا جائزہ لے رہی تھی، خون خرابے کا موقع نہیں تھا۔ مجھے جلدی سے آگے بڑھنا تھا۔

"نکالو رقم" میرے سامنے کا ایک بار پھر انھوں نے گرج کر مانگ دی۔

"جیب لوٹ دو ورنہ یہ چاقو تمھارے پیٹ میں اُتر جائے گا۔"

میں نے اپنا جسم سیکڑ لیا۔ "میں نہیں نکالوں گا۔" میں نے ضد کی اور کسی قدر خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ میرے پیلے رخسار حواس جاگے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی گردن نیچے کی طرف کر لی جیسے میں گھگھیا کے پیچھے ہٹنا چاہتا ہوں۔ میں انھیں یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ مزید خوف زدہ کرنے کے لیے چاقو والا ہاتھ کچھ اور آگے بڑھائیں، جیسے ہی انھوں نے میرے انداز کے مطابق میرے پیٹ میں چاقو گھونپنے کا خوف پیدا کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا میں نے دائیں ہاتھ والے چاقو بردار کا بچا پنجہ پکڑ کے بنی دفاری سے بائیں طرف کھینچ لیا۔ میری توقع بہت حد تک صحیح تھی کہ اُس کا ہاتھ میری پہنچ، میری دسترس میں آ جائے جیسے ہی بائیں ہاتھ والے شخص کا پنجہ میری گرفت میں آیا میں نے اُسے بائیں جانب کھینچا تو گھما ہٹ میں بائیں جانب ملنے شخص کا چاقو اپنے ساتھی کے کرتے میں پیوست ہو گیا کیونکہ دو پہلے ہی چاقو بڑھا چکا تھا میری تیزی سے نشانے پر خود اُس کا ساتھی آ گیا۔ پہلا ساتھی پیٹ مار کے زمین پر لڑھک گیا پھر دوسرے کے ہاتھ پر قبضہ جمانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اُس کے پیٹ میں لات ماری اور چاقو اپنے قبضے میں کر لیا۔ دونوں زمین پر بلبلا رہے تھے۔ مَیں بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُس کی گردن پکڑ لی اور اُسے اُس کے ساتھیوں کو دھکیل دیا۔ وہ تینوں اُٹھ کے بیٹھ گئے تھے۔ حالانکہ پہلے والا شخص تکلیف سے بلبلا رہا تھا میرے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ "استاد! استاد!" وہ تینوں یک وقت خوشامد کرنے لگے۔ "ہمیں دھوکا ہو گیا استاد!"

میں نے اپنا کیبل اور تھیلا اُٹھا لیا۔ ترتیب سامان درست کیا۔ بزدور کی صورت دیکھ کے پہلے ہی بھاگ گیا تھا، ہوٹل والا گھبرایا ہوا تھا۔ زخمی بدمعاش کو اُٹھا کے چارپائی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اُس کے کولھے سے خون بہہ رہا تھا۔ زخم گہرا نہیں تھا میں نے اس کا خاص خیال رکھا تھا مگر میں بائیں طرف دُور تک کھینچنے کے بجائے اسے اُس کے ساتھی کے سامنے کر دیتا تو چاقو پھسلتا ہوا نہ لگتا بلکہ کمر میں اندر تک گھس جاتا۔ اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کے وہ دونوں اُس کے نشانے پر میری طرف لپکے۔ "استاد! معاف کرو" وہ میرا دامن پکڑ کے بولے۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ انھیں حقارت سے دیکھتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔

مَرل کوٹ تک میں نے پیچھے آیا ہوا میں اسٹیشن کی بیچ پر بیٹھ کے گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ بریلی میں کچھ نہیں بچا تھا اور میری بے خبری کا نتیجہ اس واقعے کی صورت میں نکلا۔ دل جلتے ہوئے درمیان میں مُراد آباد کا اسٹیشن پڑا۔ دل نہیں مانا، سوچا شاید مولوی صاحب اس عرصے میں واپس آ گئے ہوں۔ ایک گھڑی کے لیے شہر جا کے دیکھا اُدھر نہیں تھے اور اُن کی بچی کو بھی دیکھ آؤں گا کوئی فیصلہ کرنے میں دِقت گئی۔ گاڑی مُراد آباد اسٹیشن پر صرف بیس منٹ ٹھیری اور چل دی۔ دلی اُتر کے میں نے دلی کے بازار میں چپا کو تلاش کرنا شروع کیا۔ چپا وہاں بھی نہیں ملی۔ چپا کا ملنا آسان نہیں تھا۔ مجھے جن لوگوں کی تلاش ہوتی ہے وہ میری نظروں کو فریب دے جاتے ہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں میں نے یہ سفر کس طرح گزارا۔ میں مسافروں کی بھیڑ میں الگ تھلگ بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ وہ مجھے باتیں نہ کر سکیں۔ مجھے کسی کی بات اچھی نہیں لگتی تھی، سب جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ ایک آدمی خاکوش رہتا ہے تو دوسرا اسے بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ مسافر، مسافروں کا اتنا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ میں گھٹنوں میں سر دے لے اپنے آپ میں گم بیٹھا رہتا تھا مگر وہ مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کہاں سے آئے ہو کیا کرتے ہو کیا حال ہے؟ میں اُن سے کیا کہتا کہ تم میں حال سننے کا حوصلہ نہیں ہے تو کیوں سُننا چاہتے ہو۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تھا میں اُتر کے مسافروں کے چہرے دیکھا کرتا تھا اور خیالوں وار اسٹیشن کے بچ لگا کرتا تھا کہ شاید کوئی مولوی صاحب نظر آ جائیں۔ مسافر مجھ پر منہ سا کرتے تھے۔

دن کے گیارہ بجے گاڑی اگرہ اسٹیشن پر ٹھیری۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہوئے میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ چپا اگر اپنی بہن موتیا کے ہاں بھی نہ ملی تو پھر میں اسے کہاں کہاں ڈھونڈوں گا؟ میں کس کس کو ڈھونڈھتا پھروں گا؟ مجھے موتیا بائی کے بالاخانے پر جا کے پہنچنا چاہیے تھا اور اس کے لیے مجھے دن وقت رات ہی کا انتظار تھا۔ میں وہ کسی اور جگہ کسی اور کمرے میں چھپی ہوئی ہو سکتی تھی لیکن رات کو فون کے دوران اُس کی موجودگی کا امکان زیادہ تھا۔ اس وقت دوسرے بالاخانے بھی آباد ہوں گے۔ کاروبار میں مصروف ہوں گے۔ دن کے وقت سب کی توجہ میری طرف مرکوز ہو سکتی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے قرار نہیں تھا لیکن میں نے رات تک خود کو کسی طرح یہ وقت گزارنے پر آمادہ کر لیا۔ بریلی میں بدمعاشوں سے جس انداز سے نمٹا تھا اُس طرح یہ وقت گزارنے پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی ضرورت اب فہمیدہ کی موت کے بعد زیادہ محسوس ہوتی تھی اس ضرورت کا احساس مجھے تھپل نے دلایا تھا۔ دل میں آتا تھا، کوئی سوال جواب کروں۔ بس کھلا چاقو لے کے پہنچوں اور جو سامنے آئے اُسے کاٹتا ہوا آگے بڑھتا رہوں۔ فہمیدہ میرا دل مسوستی رہتی تھی، کورا نے مجھے حوصلہ دیا تھا تو فہمیدہ نے وہ حوصلہ چھین لیا تھا۔

میں اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھیر گیا اور سہ پہر تک کمرے کا دروازہ بند کیے بستر پر لوٹتا رہا۔ سہ پہر کو طبیعت بہت گھبرانے لگی۔ ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ میں ہوٹل سے باہر نکل آیا اور آگرے کی سڑکوں پر بے مقصد

ملاگھومتا رہا۔ جامع مسجد، تاج محل، فتح پور سیکری، اکبر کا قلعہ، آگرے میں بہت سی دیکھنے کی چیزیں تھیں، ہوٹل کا بیرا بہت استیاق سے اُن کا تذکرہ کرتا تھا، ہوٹل میں داخل ہوتے ہی گائیڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا مگر اُن میں کوئی گائیڈ ایسا نہیں تھا جو مجھے کورا کی ایک ہتھیا سکے جو میرے ابا جان کا پتہ بتا سکے۔

رات آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ ریلوے لائن عبور کر کے میں سیدھی سڑک پر ہولیا۔ چلتے چلتے شہر کی حدود سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہو رہا تھا۔ باغات شروع ہو گئے تھے۔

ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں مگر اس طرح میری حالت میں کوئی تبدیل واقع نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے تک میں اسی جگہ بیٹھا رہا، پھر جب سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اُس وقت میں نے چلنے کا ارادہ کیا اور شہر کی طرف واپس ہو گیا۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک جگہ ٹھٹک کے رُک گیا۔ سامنے سے اپنے مخصوص لباس میں بدھ بھکشو کا ایک گروہ آہستہ روی سے میری طرف آ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کے میرا دل مچلنے لگا اور میری عقل میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انھیں کس طرح مخاطب کروں۔ میں لڑکھڑائے ہوئے انداز میں وہیں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئے۔ انھوں نے شاید میری بے چینی محسوس کر لی تھی وہ ایک لمحے کے لیے رُکے، مسکرائے اور ہاتھ ہلا کے مجھے سکون کی تلقین کی اور آگے بڑھ گئے۔ بدھ گیا میں جاگ قبیلے کا ایک شخص میرے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مجھے انھیں روکنے میں بہت سے خوف محسوس ہوئے جب وہ چلے گئے تو مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اُن کو تعاقب شروع کر دیا۔ وہ آگے آگے تھے میں خاصے فاصلے سے اُن کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ تین راہبے تھے اور ایک دوسرے کے نیاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک موڑ پر چلے کہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے رفتار تیز کر دی لیکن میں انھیں دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ اس جگہ بناوٹی قریب تھی اور علاقہ پُرسکون تھا۔ فاصلے پر سر سبز سے ڈھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے، وہ موڑ کے قریب ہی کسی مکان میں چلے گئے ہوں گے۔ مجھے نظر نہیں آئے۔ جنگلی پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی شفق پھیلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا پانی سُرخ ہو گیا ہو اور خون کا دریا بہہ رہا ہو۔ میں لمبا لمبا ڈگ بھرتا ہوا موڑ کے جانگ قبیلے کی گم شدہ کورا کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکتا تھا، شاید وہ مجھے کوئی ایسی بات بتا سکیں جس کا تعلق کورا کے ہمراہ مجھے مُہید کا کوئی سراغ مل جائے؟ اُن سے مل کے میرے دل کو تسکن ہو یا نہ ہو مگر معلوم وہاں کورا یک بات آنے میں کتنی دیر لگ جاتی اس لیے وہ جگہ ذہن میں رکھ کے واپس آ گیا۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ میں ضروری تیاری کر کے جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن تلقین کی۔ ہوٹل سے میں پھر گلی کی جانب روانہ ہوا۔ آگرے کی اس گلی میں بریلی کے بازار سے زیادہ روشنی تھی۔ یہاں بھی طوائفیں بنی ہوئی نوجوان لڑکیاں اور عمر رسیدہ رنڈیاں ہی سے نظر آتی تھیں اُوپر کے بالاخانوں کی طوائفیں جھروکوں میں بیٹھی یا کھڑی ہوئی تھیں، میلے کا سا منظر تھا۔ پان چبانے اور گل فروشوں کی دُکانوں پر لوگوں کے گروہ موجود تھے۔ جہاں گانا ہو رہا تھا، وہاں کے دروازے کھلے تھے۔ میں نے بان کا بیڑا خریدنے کے منہ میں چبایا۔ کلائی میں ہار لپیٹا تاکہ میری بدحواسی اور اجنبیت کا کسی کو احساس نہ ہو سکے۔ چپا بائی اگر یہاں موجود ہو گی تو اُس نے اپنی آمد کی خبر مشہور نہیں کی ہو گی پھر بھی ممکن ہے موتیا بائی نے اطمینان یہاں اپنے ٹھکانوں کو بانبر کر دیا ہو کہ کوئی اجنبی شخص اُسے پوچھتا ہوا آئے تو اُسے فوراً اطلاع دی جائے۔ میں چاروں طرف نظریں ڈالتا ہوا گلی میں اس انداز سے گھومتا رہا جیسے یہاں کے تمام گھروں سے واقف ہوں۔ چپا بائی کی آنکھوں میں میری شکل محفوظ ہو گی میری آنکھوں میں بھی اُس کی شبیہہ نقش ہو گئی تھی۔ چپا کی بہن موتیا بائی کا بالاخانہ بھی یہیں کہیں ہو گا۔ کسی سے پوچھنے کے بجائے میں خود ہی اُسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اس مشکل کام کا تجربہ مجھے بریلی اور دلی میں ہو چکا تھا۔ گلی میں بار بار پھیرے لگانا بھی مشکل تھا۔ اس تمام احتیاط کے باوجود مُرلی کی طرح ایک شخص میرے پاس آیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ "کوئی خدمت ہو تو بتائیے؟"

یہاں آگے میرے پیروں میں لرزش بننے لگی۔ مجھے بُرے وسوسوں نے گھیر لیا تھا، چپا بائی سے ملاقات ہونی اور اُس نے ابا جان اور گھر والوں کے متعلق کوئی اچھی خبر سنائی تو مجھے سے اُٹھا کے جایا جائے گا؟ بہتر ہے کچھ نہ سنوں اور یہیں سے واپس ہیں اور بھاگ جاؤں مجھے تذبذب میں دیکھ کے اُس شخص نے دوبارہ مجھے پیش کش کی۔ میں نے خود اُس کے سپرد کر دیا وہ مجھے مختلف بالاخانوں پر لے گیا مگر چپا بائی کہیں نظر نہیں آئی۔ جب ہم چوتھے بالاخانے سے اُتر رہے تھے تو میں نے تنگ آ کے اُس سے صاف صاف موتیا بائی کے بالاخانے پر چلنے کی فرمائش کر دی۔ "شوخی جان!" اُس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگی۔ "میں حضور کو وہیں لے جانے والا تھا۔" شوخی جان سہ تو ابھی پوری طرح جوانی بھی نہیں آئی تھی کہ دُور دُور تک اُس کی خوشبو پھیل گئی تھی مگر صاحب! بدقسمت محل سجی رہتی ہے اس لیے میں کترا رہا تھا۔ آپ پہلے ہی کہہ دیتے۔" اُس نے آنکھ مار کے کہا۔ "اگرے کا میرا بنے ایک تاج محل یہاں پہلے سے موجود ہے، دوسرا شوخی جان کا بدن ہے۔"

وہ مجھے ایک صاف ستھری کشادہ عمارت میں لے گیا۔ دگ لوبان تازہ تازہ تھا۔ "یہ موتیا بائی کا ڈیرا ہے۔" جب اُس نے یہ بتایا تو میرے دل کی حرکت معدوم ہونے لگی۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا۔ "ڈائیرٹ مجھے مالس لینے دو" میں اپنے حواس درست کر لوں۔" وہ تیزی سے تیغے چلانے لگا۔ زینے پر ہمارا کئی آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ شوخی جان گا رہی تھی اور دروازہ بند تھا لوگ مالوس واپس آ رہے تھے میرے ساتھ موجود شخص نے بیس سے شانے اُچکا کے منہ بنایا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے اُوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب بالاخانوں تک کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کنڈی لگی ہوئی تھی۔

جلدی اندر سے بھرے ہوئے جسم اور سُرمئی رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی، اُس کی عمر بھی کوئی پچیس سال ہوگی۔ موتیا بائی، نواب صاحب بہت دور سے شوخی جان کا چرچا سُن کے آئے ہیں۔ میرے رہبر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

میں نے اپنی جیب ٹٹول لی، پانو موجود تھا۔ عورت نے انگارے میں گردن ہلائی ہی تھی کہ میں آگے بڑھ گیا اور اُسے دروازے سے ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ درمیان میں چھریرے بدن کی ایک خوب صورت لڑکی دل کش آواز میں گا رہی تھی۔

اور ایک کونے میں پان دان کھولے چمپا بائی بیٹھی تھی۔

فرش پر نوٹ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔

محفل شباب پر تھی، چھریرے بدن اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تماش بینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی گا رہی تھی۔ اُس کی عمر بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ میں دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کی ایک طرف ہٹا کے اندر داخل ہوا تو لڑکی نے اپنی پلکیں اُٹھا کے ایک نظر مجھے دیکھا اور شرما کے اُس پستہ قد اور تنومند شخص کی جانب متوجہ ہوگئی جو دوں سب لوگوں سے نمایاں تھا۔ اُس نے میری آمد پر بُرا سا منہ بنایا اور کسمسا کے اپنے ساتھیوں سے ناگواری کا اظہار کیا۔ دروازہ کھولنے والی عورت نے ناچار مجھے ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کی بات پر عمل کرنے کے بجائے چند لمحوں تک وہیں کھڑا رہا۔ میں نے پہلے سرسری نظر سے محفل کا جائزہ لیا، پھر میری نگاہ چمپا بائی پر جم گئی۔ چمپا بائی پان دان کھولے گلوریاں بنانے میں مصروف تھی، اُس نے شاید مجھے دیکھا نہیں یا دیکھا ہوگا تو پہچانا نہیں تھا، لیکن میں نے اُسے خوب پہچان لیا تھا۔ اُسے دیکھ کے میرے تن بدن میں چنگاریاں اُٹھنے لگی تھیں۔ جی میں آیا، بڑھ کے اُس کا گلا گھونٹ دوں اور جب تک اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نہ نکل پڑیں اُسے نہ چھوڑوں لیکن اس طرح آناً جاناً تک پہنچنے کی یہ آخری اُمید بھی ختم ہو جاتی۔ مجھے یہاں تک لانے والا شخص میری پشت پر موجود تھا۔ اُس نے ٹھوکا مار کے مجھے آگے بڑھنے اور بیٹھ جانے کی درخواست کی اور سرگوشی میں کہا۔ یہی قتالۂ شوخی جان ہے، ذرا قریب جا کے دیکھیے پنڈا کیسا دمک رہا ہے۔"

چمپا بائی کے ساتھ ایک اور عورت بھی بیٹھی تھی۔ وہ شاید اُس کی چھوٹی بہن موتیا بائی تھی۔ دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ موتیا نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ شوخی جان کے بجائے میری نگاہیں مسلسل اُس کی بہن چمپا بائی پر مرکوز ہیں تو اُس نے سمجھے ہوئے انداز میں چمپا کے کان میں کچھ کہا۔ چمپا نے ہڑبڑا کے دروازے کی جانب دیکھا، گلوری اُس کے ہاتھ میں جیسے جم گئی۔ اُس نے بدحواسی میں موتیا سے کچھ کہا۔ دونوں بے چین ہوگئیں۔ موتیا نے پان دان جلدی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چمپا اُچھل کے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دائیں جانب کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی میں محفل عبور کرتا ہوا سیدھا اُس کمرے میں داخل ہوگیا۔

کمرے میں ایک دوسرا دروازہ بھی تھا، چمپا بائی بھاگ کے باہر جانا چاہتی تھی لیکن مجھے سرِ پہ دیکھ کے ایک کونے میں دبک گئی۔ وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے تھے۔ "تم کون ہو؟" اُس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہوگئی ہو؟" میری آواز بھی کانپ سی رہی تھی۔ "میں تمھاری تلاش میں بہت دُور سے آرہا ہوں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"گھبراؤ نہیں، میں تمھیں مارنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے نفرت سے کہا۔ مجھے صرف ایک بات بتادو کہ تم نے فہیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

"کون فہیدہ؟ میں کسی فہیدہ کو نہیں جانتی۔"

"تم فہیدہ کو نہیں جانتیں؟" میں نے چیخ کے کہا۔ "تم نیلم جان کو نہیں جانتیں چمپا بائی؟ میں تمھارا خون پی لوں گا۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے مڑ کے دیکھا، موتیا دروازے میں کھڑی ہوئی شائستگی سے کہہ رہی تھی۔ "بیٹھیے، تشریف رکھیے۔ آپ شاید کسی غلط جگہ آگئے ہیں، یہ تو بالا خانہ ہے جناب اور یہ میری بڑی بہن ہیں۔ بے شک ان کا نام چمپا فرد ہے مگر کسی نیلم جان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ کس نیلم جان کی بات کر رہے ہیں؟"

"موتیا بائی، چھلاوہ مت کرو اور درمیان میں مت دخل دو۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مجھے چمپا سے بات کرنے دو۔"

"اے میاں واہ۔" موتیا بائی ہاتھ نچا کے بولی۔ "منہ اُٹھائے گھر میں گھس آئے، پھر اس پہ دیدے دکھانے ہو، ہم بھی شرفا میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں، یہاں یہ کیسا دستور ہے کہ محفل کا خیال نہ کچھ عورت ذات کا پاس، چہرے سے تو خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہہ جو دیا تم سے کہ ہم نیلم جان کو نہیں جانتے۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"نہیں جانتیں!"

"ہاں نہیں جانتے۔" موتیا نے غصّے سے کہا۔

"موتیا بائی، تم بات بڑھا رہی ہو۔" میں نے ضبط سے کام لیا۔ "میں یہاں جھگڑا اُٹھانا نہیں آیا ہوں۔ مجھے تمھاری بہن چمپا بائی سے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے اور کن حالات میں اُٹھایا تھا۔ مجھے بس اتنا صحیح صحیح بتادو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"یہاں کوئی نیلم جان ولیم جان کو نہیں جانتا، اپنا راستہ لو۔" موتیا کا لہو گرم ہوتا گیا۔ "باہر خلق جمی ہوئی ہے عزت دار لوگ بیٹھے ہیں۔"

"چمپا بائی! میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے گرج کے کہا۔

"چمپا سے کیا بات کرتے ہو۔" موتیا نے پھر دخل دیا۔ "چمپا بائی! اندر بیٹھیں اور اے میاں! جاؤ کسی اور بالا خانے پہ جا کے دستک دو۔ تمھارا نیلم جان کا کہیں نہ کہیں ضرور پتہ چل جائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں نے اُٹھتے ہاتھ سے موتیا کے رُخسار پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ وہ پلنگ پہ جا کے گری۔ سازندوں کے سازوں، شوخی جان کے گھنگروؤں اور غدر مچائی میں موتیا کی آواز باہر نہ جا سکی۔ اُس نے آتے ہی احتیاطاً دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔ نکلتے میں مجھے شہ پاشہ کے بالا خانے پر اُس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ محفل کے وقت کوئی بھی یہ دنگا فساد پسند نہیں کرتا لیکن موتیا بائی نے خود ہی پہل کر دی تھی۔ "چمپا بائی! میں نے چند قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم فیض آباد سے بھاگ کے یہاں چلی آئیں، تم کہیں بھی جاؤ، مجھے اس سے سروکار نہیں ہے فہیدہ کی قسمت ہی خراب تھی۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا، مجھے صرف یہ بتا دو کہ وہ بدقسمت لوگ تمھیں کہاں ملے تھے؟"

چمپا بائی کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ موتیا بھی طمانچہ کھا کے خاموش ہوگئی تھی۔ میں جب چمپا کے قریب پہنچا تو موتیا تیزی سے اُٹھ کے باہر نکل گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو چمپا نے دوسرے دروازے سے بھاگنا چاہا لیکن میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔" وہ درد سے بلبلا کے چیختی ہوئی بولی۔ "میں نے نیلم جان کو میسور سے خریدا تھا۔"

"میسور سے؟"

"ہاں میسور سے۔ میں نے اُسے پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا، میں اُس کا گھر نہیں جانتی۔ میں اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتی۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ عاجزی سے بولی۔

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "میسور میں تم نے کس سے اُسے خریدا تھا اور کب خریدا تھا؟ وہ تمھیں کس حالت میں ملی تھی؟"

"میں ایک ہوٹل میں ٹھیری ہوئی تھی کہ چند اجنبی لوگوں نے مسودا کر کے اُسے میرے حوالے کر دیا۔" وہ رونے لگی۔ "لڑکی اچھی تھی۔ میں نے مول تول نہیں کیا اور زیادہ کریدا بھی نہیں۔ پھر میں نے اُسی وقت میسور چھوڑ دیا تھا۔"

"یعنی تمھیں یہ نہیں معلوم کہ تم نے پانچ ہزار روپے کن لوگوں کو دیے اور اُن کے نام کیا تھے؟ تمھیں کچھ نہیں معلوم تھا؟" چمپا بائی! سچ سچ بتاؤ۔" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں، نام تو اُن کے ضرور کچھ تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ ان کا ایک آدمی میرے ساتھ آگرے تک آیا تھا۔ اُدھی رقم میں نے اُسے یہیں دی تھی۔"

"جھوٹ تمھارے ساتھ آیا تھا، کیا تم اُسے بھی نہیں پہچانتیں؟" میں نے ہاتھ اُٹھا کے چمپا کے گال پہ تھپڑ مارنا چاہا۔

"اس کا نام بجرم تھا۔" چمپا جلدی سے بولی۔

"تم اُن کا ٹھکانا جانتی ہو؟"

"نہیں میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "پانچ سال گزر گئے۔ اس کے بعد میں میسور نہیں گئی۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"ٹھیک ہے چمپا بائی! تمھیں میرے ساتھ میسور چلنا ہوگا۔"

"میں۔۔۔ نہیں۔ نہیں۔" وہ ہکلانے لگی۔

"ہاں تم۔ تم۔ اور ابھی۔" میں نے لہجے میں کہا۔ "تیاری کرو۔"

"کیسی تیاری؟" پیچھے سے اچانک کسی مرد کی آواز آئی۔ میرے پیچھے دو آدمی کھڑے تھے، اُن کے ساتھ موتیا بائی بھی تھی۔ یہ چہرے میرے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ ان چہروں پہ جھمل اور اجرک کے آدمیوں کی چھاپ تھی۔ پچھلے سات آٹھ سات برسوں سے میں انھی چہروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ میرے تمام حواس انھیں پہچان چکے تھے۔ یہ کمال جانے کا ارادہ ہے؟ اُن میں سے ایک نے میرے سینے پہ ہاتھ رکھ کے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "دُور ہو، یہ میرا اور چمپا بائی کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے تم لوگ درمیان میں نہ پڑو۔"

"موتیا بائی! دوسرا شخص اب تک خاموش کھڑا تھا، اُس نے زبان کھولی "اے بتا دو کہ اس علاقے میں نوشے کے بغیر تماشہ نہیں چلتا۔"

موتیا بائی نے اُستعمال میں کہا۔ یہ سن لیا تم نے میاں! اب سیدھے سیدھے یہاں سے بھاگ جاؤ اور آئندہ اس طرف کا رُخ مت کرنا۔ اکیلی عورتیں دیکھ کے ہاتھ اُٹھایا تھا، ابھی نوشہ زندہ ہے۔"

"موتیا بائی! میں نے تم سے کہا تھا کہ بات مت خراب کرو۔ یہ نوشہ اور شہ بالا الگ ہی رکھو، چمپا بائی میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

"چمپا بائی کہیں نہیں جائے گی۔" نوشہ کی بھاری آواز گونجی۔ "نوشہ کے بغیر یہاں سے کوئی سواری نہیں جاتی۔ میرے معاملے بڑے نوشے نمٹا پڑتا ہے۔ ان گلیوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ نوشہ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ نوشہ کو مت جگاؤ بیٹا! جیب میں پیسے ہوں تو ٹھنڈے ٹھنڈے تماشا دیکھو۔" نوشے کے ساتھی نے استہزا سے کہا۔

"دفع کرتے ہو یا نہیں؟" نوشہ گرجا کے بولا۔

"چمپا بائی! چلو۔" میں نے نوشہ کی بات تسلیم نہ کرتے ہوئے کہا۔

"چمپا بائی نہیں جائے گی۔"

"چمپا بائی کو کوئی روک نہیں سکتا۔"

"تھو۔" نوشہ کے ساتھی نے منہ آگے کر کے فرش پہ تھوک دیا۔ "کیا کھاس کیے جا رہا ہے سالے! اتنی دیر سے ٹرٹر کیے جا رہا ہے یہاں سے نکلتا ہے یا اُٹھا کے پھینکنا پڑے گا؟" وہ گالیاں دیتا ہوا طیش میں میرے پاس آیا اور میرے جبڑے پہ اُس نے مکا مارنا چاہا۔ میں اُن کے ساتھ کوئی جھگڑا مول لینے سے گھبرا رہا تھا اس لیے جیسے ہی اُس نے ہاتھ اُٹھایا، میں نے پھرتی سے اپنا منہ ایک طرف کر لیا۔ نوشہ کے ساتھی کا پچھلتا ہوا ہاتھ میرے بازو پر پڑا۔ وہ جھٹکے میں کچھ جھکا اور سٹ پٹا گیا۔ میں نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی تاخیر کے بغیر اُس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھٹنا مارا۔ گھٹنا معدے کے منہ پہ لگا تھا۔ نوشہ کا ساتھی بلبلایا اور پیٹ پکڑے ہوئے فرش پہ لوٹنے لگا۔ میں نے اُس کے ساتھ احتیاط ہی برتی تھی کہ

نوشہ کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ایک کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے نوشہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے ایک بار پھر اسے درمیان میں دخل نہ دینے اور اس معاملے سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن نوشہ نے اپنے نیفے سے استرا نکال کے کھول لیا تھا۔ میرا ہاتھ خالی تھا اور چاقو نکالنے کا وقت نکل گیا تھا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرنیچر کی وجہ سے جگہ بھی تنگ تھی۔ نوشے نے اتنا تو جان لیا تھا کہ میں کوئی اناڑی آدمی نہیں ہوں۔ غنڈے ہتھیار اسی وقت نکالتے ہیں جب زبانی تنبیہ اور دوسرے حربے ناکام ہونے کا اندیشہ ہو۔ دونوں عورتیں باہر جانے والے دروازے کے پاس ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ موتیا کچھ دیر پہلے شستہ لہجے میں بات کر رہی تھی مگر اب گالیاں بکنے لگی تھی۔ چمپا بائی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں چمپا بائی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دوسری طرف نوشہ استرا لیے پر تول رہا تھا۔ استرے کی تیز دھار روشنی سے چمک رہی تھی۔ یکایک اس نے حملہ کرنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں تیزی سے بائیں جانب ہٹ گیا لیکن اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اس نے چشم زدن میں استرا دائیں ہاتھ سے اچھال کے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ بچتے بچتے بھی میرے ہاتھ پر استرے نے ایک لکیر کھینچ دی۔ اگر میں چند قدم پیچھے ہٹ کے اس کے اچانک حملے سے نہ بچتا تو استرا میری بائیں پسلی کاٹتا ہوا گزر جاتا۔ پیچھے ایک بڑا صندوق رکھا تھا۔ میں اس سے ٹکرا گیا۔ نوشہ نے ایک غلیظ گالی دی اور استرا تانے ہوئے دھمکیاں دیتا ہوا مجھ پر دوبارہ جھپٹنے کے لیے پر تولے۔ نوشہ کو توقع نہیں ہوگی کہ میں اتنی جلدی زمین پہ بیٹھ جاؤں گا۔ اگلا حملہ وہ بڑھا ادھر میں بیٹھا۔ نتیجے میں نوشہ خود صندوق پر گرتے گرتے رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح اس کا دوسرا حملہ میرے سر پہ ہوگا لیکن اسے علم نہیں تھا کہ میرے پاس صندوق سے ٹکرانے کے بعد اپنے بچاؤ کی ایک یہی صورت رہ گئی تھی۔ میں اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کے اتنی تیزی سے آگے کی طرف اچھالا کہ اس کا منہ صندوق پہ جا پڑا۔ اس طرح اس کی ٹھوڑی شکستہ ہو گئی ہوگی اور نیچے کے کئی دانت ٹوٹ گئے ہوں گے۔ نوشہ اپنی چیخ نہیں روک سکا اور بوکھلاہٹ میں استرے پہ قابو نہیں رکھ سکا۔ اس نے خود اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ میں نے اس کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں۔ وہ صندوق سے اچھلتا ہوا فرش پہ آ گیا اور زمین سے اس کا منہ ٹکرایا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ نوشہ کا پورا منہ مکمل چور چور ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں آزاد کرانے کی تھوڑی سی جدوجہد کی۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ مروڑ دی۔ وہ بھیانک کراہیں بلند کرنے لگا۔ میں اس سے نمٹنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے موتیا اور چمپا بائی کے بھاگنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ دونوں کمرے میں نہیں تھیں۔ نوشہ کا دوسرا ساتھی پیٹ پکڑے ہوئے فرش پہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی آواز دل میں نوشہ کی آوازوں نے شامل ہو کے اور وحشت پھیلا دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ نوشہ کچھ دیر ضرور مزاحمت کرے گا مگر وہ فوراً ہمت جلد اور ہان کھو بیٹھا۔

صرف چند منٹوں میں کمرے کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ موتیا اور چمپا ابھی دور نہیں پہنچی ہوں گی۔ میں نوشہ اور اس کے ساتھی کو چھوڑ کے باہر کی طرف لپکا۔ اندر ٹین کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک اور سجا ہوا کمرہ کھلا تھا۔ ممکن ہے کرایہ دینے والے مکانوں میں ایک ہی راستہ ہوتا ہے مجھے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چمپا اور موتیا گردو پار پھلانگ کے دوسرے مکان میں نہیں گئی ہیں تو اسی مکان میں ہوں گی۔ باورچی خانے کے قریب مجھے کوٹھری جیسا ایک کمرہ بند نظر آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے اور جھریوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ نہ کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ماں سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ دوسرے مکان میں اترنے کے پیسے کو بلا لیں۔ اندر دو آدمی کرائے دیتے تھے۔ ایک کا چہرہ لمبوترا تھا۔ میلا کوئی گاہ نہیں تھا۔ یا تو مجھے فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا یا پھر پولیس کے خطرے سے بے پروا ہو کے موتیا اور چمپا بائی کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا مگر اجی دیر کرتی ہوئی تھی۔ انھیں نیچے راستے میں پکڑ سکتا تھا لیکن جلاسے میں انھیں پکڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پوری سڑک پر ہنگامہ ہو جاتا۔ میں سائبان میں کسی دیوانے کی طرح ادھر سے اُدھر چکر لگاتا رہا۔ میرے قدم بار بار باورچی خانے سے ملحق کوٹھری کی طرف اٹھتے تھے۔ اگر دروازہ پھلانگ گئی ہیں تو اس کے لیے انھوں نے کسی چیز کی مدد ضرور لی ہوگی۔ میں نے غور سے جائزہ لیا۔ دیوار کے ساتھ کوئی کرسی یا میز لگی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے بے تحاشا کوٹھری کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ بلکوی کا دروازہ دھچکنے لگا۔ "باہر آ جاؤ چمپا بائی! باہر آ جاؤ۔" میں نے چیخ چیخ کر کہا۔

کوٹھری کے اندر ضرور کوئی موجود تھا۔ کوئی چیز گرنے کی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے زور زور سے دروازہ دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ "چمپا بائی! اگر تم باہر نہ نکلیں تو میں اس کوٹھری کو آگ لگا دوں گا۔ باہر آ جاؤ۔ میں قسم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اگر تمھیں مار بھی دوں تو نیلم جان واپس نہیں آ جائے گی۔ میں تم سے صرف اس کے گھر کا پتہ چاہتا ہوں۔" میں چیخا چلاتا رہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے چمپا لال تم ہمیشہ کے لیے اندر رہو۔ میں باہر سے کنڈی لگا کے آگ لگا رہا ہوں۔"

"نہیں، نہیں ٹھیرو۔" چمپا بائی نے چیختی چیختی آواز میں کہا۔ "میں باہر آ رہی ہوں۔" ساتھ ہی کوٹھری کا دروازہ کھل گیا اور اندر سے لرزہ براندام چمپا اور موتیا برآمد ہوئیں۔ ان کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔

"موتیا بائی! تم نے خواہ مخواہ زحمت کی وہ دونوں اندر تڑپ رہے ہیں چمپا کو معلوم تھا کہ میں فیض آباد میں اس کے بالاخانے پر کن لوگوں کے ساتھ پہنچا تھا۔ پھر بھی اس نے خیال نہیں کیا۔"

"نیلم جان تمھاری کون تھی؟" موتیا نے سہم کے پوچھا۔

"کیا کرو گی پوچھ کے۔" میری آواز بھرا گئی۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں تھا۔ "چلو چمپا بائی! دیر نہ کرو۔ میرا سینہ جل رہا ہے۔"

"ابھی؟ اسی وقت؟" چمپا بائی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"ہاں ابھی اور اسی وقت۔"

"مگر آپ سوچیے تو میاں! اس بات کو برسوں گزر چکے ہیں نہ معلوم اب یہ لوگ وہاں موجود ہوں یا نہ ہوں۔" موتیا نے نرمی سے کہا۔

"تم پھر فضول باتیں کرنے لگیں موتیا بائی! مجھے چمپا بائی کے ساتھ چاہے دنیا کے آخری سرے تک جانا پڑے مگر میں نیلم جان کے گھر کا پتہ ضرور چلاؤں گا۔"

"مگر چمپا باجی کو نیلم جان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔" موتیا بولی۔

"میاں! جذبات میں نہ آیئے ہم تو بہ کرتے ہیں، ہم نے آپ کو ورغلانے میں غلطی کی۔ ذرا ایک دو دن ٹھیر لیے، ہم یہ اطمینان کر کے کیوں نہ چلیں کہ وہاں تک جائیں اور کچھ بات بھی بنے، خواہ مخواہ طول طویل سفر کرنا پڑے اور حاصل وصول کچھ نہ ہو تو فائدہ؟ آپ چاہیں تو یہاں ٹھیریں مگر یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ یقیناً ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہوں گے۔ میں باجی کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہم کسی اور طرف نہیں نکلیں گے۔ آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔ جہاں تک بھی آپ لے جائیں۔ البتہ بالاخانے کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنے میں ایک آدھ دن کی دیر لگے گی۔"

"موتیا بائی! تم نے پھر حیل حجت شروع کر دی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمھارے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف چمپا بائی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا میں باجی کو تنہا آپ کے ساتھ بھیج دوں گی میاں! آپ شک نہ کیجیے ایک بار رنڈی کی بات کا بھی اعتبار کر کے دیکھیے۔"

"بس کرو۔" میں نے چمپا بائی کی کلائی تھام لی۔ "چلو۔"

موتیا بائی رونے لگی۔ چمپا کی حالت تو پہلے ہی ابتر تھی۔ "ہم نے نیلم جان کو اپنی بیٹی بنا کے رکھا تھا۔" موتیا سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ "اس کی موت کا جتنا دکھ تمھیں ہے، اتنا ہی ہمیں بھی ہے۔"

"چمپا بائی تو اپنی بیٹی کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئی۔ یہ کسی ہندو کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔ اگر اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو..." میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو نکال لیا۔

چاقو دیکھ کے موتیا کی زبان پر جیسے فالج گر گیا۔ وہ اپنے بال کھسوٹنے لگی۔ چمپا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "مجھے جانے دو موتیا!" چمپا نے اداسی سے کہا۔ "چلو میرا سامان نکالو۔"

موتیا دہاڑتی ہوئی اپنی بہن سے لپٹ گئی۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔ "میں تمھیں اکیلی نہیں جانے دوں گی۔"

"میں چمپا بائی کے سوا کسی کو نہیں لے جاؤں گا۔" میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "اور کان کھول کے سن لو موتیا! اگر تم نے میرے چلنے کے بعد کوئی بے وقوفی کی تو تمھاری بہن کبھی واپس نہیں آ سکے گی۔ سمجھیں؟" (باقی آئندہ ماہ)

کو بلانے کا حشر دیکھ ہی چکی ہو، جلدی کرو۔ چمپا بائی کا سامان نکالو۔" اندر ان دونوں کو تمھاری ضرورت ہے۔ اگر تم نے ان کی جلد ہی خبر نہ لی تو بالاخانے پر پولیس آ جائے گی اور تمھارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔"

موتیا نے فوراً نیچے کے ایک کمرے سے صندوق میں چمپا کا سامان بھر دیا۔ ایک مختصر بستر بھی جلد از جلد تیار کر دیا گیا۔ بستر میں بلاؤز پیٹی کوٹ اور کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موتیا، چمپا کے کپڑوں کے لیے اندر گئی تھی تو گلے ہاتھوں نوشہ اور اس کے ساتھی کی درگت بنی دیکھ آئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت ہلکورے کھاتی ہوئی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔

باہر نکلتے وقت جب ہم اس کمرے سے گزرے تو نوشہ کا چوتھا ساتھی خون میں نہایا ہوا تھا اور اس کا ساتھی ایک طرف بے ہوش پڑا تھا یا مر گیا تھا۔ نوشہ ابھی تک کھلبلا رہا تھا۔ چمپا بائی کی سسکی نکل گئی۔ میں نے چمپا اور موتیا کو آگے کیا اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ دروازہ کھلا تو سوختی جان کی آواز آئی۔ سازندے سُروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سوختی جان ابھی تک اسی شخص کے پاس بیٹھی ہوئی ستار بجا رہی تھی، گا رہی تھی۔ ہم داہنی جانب کے کمرے سے نکلے۔ موتیا نے صندوق اور چمپا نے بستر سنبھال رکھا تھا۔ اصل طے کیے کے مطابق دروازے سے جانے کے بجائے سازندوں کی نشست عبور کر کے ہم لوگ قدموں سے داہنی جانب کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں سے کہاں نے بیرونی دروازہ دیکھا تھا۔ اس طرح ہم تمام محفل کی نظروں میں آنے سے بچ گئے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے موتیا کو رقم نہیں دی کہ وہ چمپا سے کوئی بات کر کے موتیا نے اسے ایک نمونا دیا اور دونوں ایک بار پھر گلے مل کے رونے لگیں۔ "موتیا بائی! اپنی بہن کی زندگی بھر کی ہے تو اس کی واپسی کا انتظار خاموشی سے کرتا رہے میں نے تڑپنے سے آتے ہوئے موتیا کے کان میں دوبارہ یہ بات ڈالنی مناسب سمجھی۔

گلی میں کچھ دور تک ہمیں پیدل چلنا پڑا۔ سڑک کے نکڑ پہ ہمیں ایک تانگا مل گیا۔ وہ شخص جو مجھے موتیا کے بالاخانے پہ لے گیا تھا، وہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے تانگے والے کو اپنے ہوٹل کا پتہ بتایا۔ چمپا کو تنہا تانگے میں بٹھا کر ہوٹل جانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ ہوٹل کے لوگوں نے جب میرے ساتھ ایک برقع پوش عورت دیکھی تو ان کی آنکھیں نکلانے لگیں لیکن میں نے اپنے کمرے میں آ کے میرے کو فوراً بل لانے کی ہدایت کی چمپا اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی۔ بل ادا کرنے کے بعد اپنا مختصر سامان اٹھا کے میں نے اسٹیشن کا رخ کیا۔ اگلی صبح اسٹیشن پہ جب میں چمپا کا ساتھ لیے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف جا رہا تھا تو چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔ "میسور کا ٹکٹ مت لینا۔ بمبئی تک کا ٹکٹ لینا۔" میں ٹھٹک کے رک گیا۔

"چمپا بائی! صحیح صحیح بتاؤ، کہاں جانا ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اور یہ بات جان لو کہ فرار کی کسی کوشش کا نتیجہ ہوٹل تک ہوگا۔ فیض آباد

میں سب کو معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ جاؤ کو تو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ جرأت میں موتیا سے کہہ کے آیا ہوں وہی تم سے کہتا ہوں۔ نہ موتیا بھی جان سے جائے گی۔"

"میں نے تمھیں غلط بتایا تھا۔" فہمیدہ مجھے بمبئی میں ملی تھی۔ چمپا کے لہجے میں اب پہلے جیسی لرزش نہیں تھی۔

"اچھا تو بمبئی چلتے ہیں تم جہاں جہاں کہو گی میں وہاں وہاں جاؤں گا۔" میں اس پر نظر رکھے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے کھڑکی سے معلوم ہوا کہ دلی سے بمبئی جانے والی گاڑی ڈیڑھ بجے آئے گی۔ اگر وہی اسٹیشن پر انتظار کیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ بہت مشکل سے کٹا۔ نگوڑی نیند میری خواہش کے برعکس کب آتی جاتی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ بہت ہوتا ہے ڈیڑھ گھنٹے میں موتیا اپنی رائے بدل سکتی تھی۔ وہ کچھ اور غنڈے اپنی مدد کے لیے طلب کر سکتی تھی یا پولیس بلا سکتی تھی۔ چمپا کی وجہ سے میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے تاکہ وہ میری نظر میں زیادہ سے زیادہ رہے۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ میں نے چائے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ویٹنگ روم میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی درمیان میں آیا تو اسے ختم سے کم چمپا بائی زندہ نہیں ملے گی۔ میری بہن فہمیدہ کی رسوائی اور موت کا یہ بہت کم خراج تھا مگر اس کا بے غیرت مجبور بھائی یہی کچھ کر سکتا تھا۔ چمپا بائی نے نقاب چہرے سے ہٹالی تھی اور سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی میں نے فہمیدہ کے بارے میں اس سے بہت سی باتیں معلوم کرنے اور اسے سامنے کی حسرت جبراً دبا رکھی تھی۔ گاڑی آنے میں پندرہ منٹ کی اور تاخیر ہو گئی۔ یہ پندرہ منٹ بھی کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ کاش میسے پاس پتا ہوتا ہو میں چمپا کی گردن میں رومال کے اس کی زنجیر ہاتھ میں پکڑے رہتا۔ گاڑی آتے ہی اسٹیشن پر بڑی افراتفری مچ گئی۔ میں نے چمپا بائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قلی اس کا صندوق اور بستر اٹھائے ہوئے تھا۔ پلیٹ فارم میں صرف ایک مدراسی مسافر موجود تھا۔ بڈھا لکھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ اردو بہت کم جانتا تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے ہمیں آمنے سامنے والی سیٹ دے دی اور خود اوپر کی برتھ پر سونے کے لیے چلا گیا۔ میں نے چمپا بائی کو اشارہ کیا کہ وہ بستر بچھا کے آرام کرے۔ چمپا بائی دیر تک سیٹ پر بیٹھی رہی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ تم بھی سو جاؤ۔ میری طرف سے اطمینان رکھو۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ چمپا بائی! سو جاؤ۔"

وہ ایک دو گھنٹے تک کھڑکی کی طرف منہ کیے ایک پہلو سے بیٹھی رہی پھر تھک کے برتھ پر لیٹ گئی۔ گاڑی مختصر وقفوں کے لیے مختلف اسٹیشنوں پر رکتی رہی۔ میں تمام رات جاگتا رہا۔ چمپا بائی مل گئی تھی۔ وہ میرے اجڑے ہوئے گھر کی طرف جانے والا راستہ تھی۔ میری آنکھوں میں آبا اتی کے چہرے گھومتے رہے تھے۔ کفن میں رکھا ہوا فہمیدہ کا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا تھا۔ چمپا بائی کی آنکھیں بند تھیں میرے ہاتھ بار بار اس کی گردن کی طرف اٹھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ نہ معلوم ابا جان کیسے ہوں گے امی کی موت اور فہمیدہ کی جدائی نے ان کی کمر جھکا دی ہوگی۔ بس میں ایک بار وہاں پہنچ جاؤں ان کے پیروں پر گر جاؤں گا اور سب بہن بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ جب تک میرے منہ پہ تھوکیں گے مجھے سکون نہیں آئے گا۔

گاڑی آگرے سے بہت دور آ چکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے پیلے دھندلے ہو گئے تھے میں نے انھیں صاف کر کے باہر دیکھا۔ سورج نکلنے کو تھا۔ چمپا بائی بھی اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔ نیند اسے بھی نہیں آئی تھی۔ اوپر مدراسی مسافر گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح بھوپال کے اسٹیشن پر پوری ترکاری لے کے میں نے چمپا کے آگے رکھ دی۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے جھجکی "تم نہیں کرو گے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"مجھے بھی نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لو جائے پیو گی؟"

"ہاں ضرور چائے پلا دو۔" اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

میں نے چائے والے کی آواز دی۔ گاڑی کے ساتھ چلنے والا بیرا بھی سامنے آ گیا۔ میں نے اس سے ایک بڑے سے کپ چمپا کو دے دی۔ "میرے ہاتھ کی چائے پیو گے؟" اس نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچا ڈالتے ہوئے کہا۔

میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ جی میں آیا کہہ دوں "ہاں پی لوں گا۔" لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سرزنش کی "میں ابھی چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے مختصر جواب دیا اور کھڑکی میں گردن ڈال کے پلیٹ فارم پر منتشر مسافر دیکھنے لگا اچانک میں اپنی سیٹ پر اچھل گیا۔ کچھ دور ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر مولوی صاحب جیسی صورت کا ایک شخص ٹی اسٹال پہ کھڑا تھا۔ وہی قد، وہی گہرا سانولا رنگ، وہی شیروانی میں بے چین ہو گیا۔ چمپا بائی کی طرف دیکھا وہ چائے پی رہی تھی۔ دروازہ کھول کے میں نے پلیٹ فارم پہ بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی مسافر میری بوکھلاہٹ میں گرتے گرتے بچے لیکن میرے قدم کچھ فاصلے پہ جا کے منجمد ہو گئے۔ دور سے وہ مولوی صاحب کی شکل و صورت کا کوئی شخص نظر آتا تھا مگر قریب سے ان سے اتنا مختلف تھا کہ مجھے اپنے آپ سے ندامت ہوئی۔ بھلا مجھے مولوی صاحب اور کراچی کی صورت کہیں نظر آتی۔ میں تھکے ہوئے قدموں سے واپس آنے لگا۔ ابا جان تک پہنچنے کی کچھ نہ کچھ سبیل پیدا ہو گئی تھی مگر کوئی نہ جانے کہاں کس سمت میں رہتی تھی۔ مجھے ہر سمت اس کی آہٹ، اس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ آگے میں بڑھتی تھی۔ مجھے ہر سمت اس کی آہٹ، اس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ آگے میں بڑھ جھکڑوں کو دیکھ کے ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی تھی شاید انھیں جھاڑ جھلیلے سے غائب ہونے والی لڑکی کو راکا علم ہو مگر موتیا کے بالاخانے پر پیش آنے والے حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کورا کی فکر کرتا تو چمپا بائی پھر ہاتھ نہ آتی پہلے کہتی تھی کہ اس نے فہمیدہ کو میسور کے حال کیا ہے اب بمبئی کی طرف لے جا رہی تھی چمپا کی بات اور ارادے کا کیا بھروسا تھا۔ ایک بار گی مجھے گمان ہوا کہیں اس نے میری غیر حاضری سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ میں دوڑ کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ میری سانس قابو میں آئی۔ چمپا بائی اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی گاڑی بھوپال اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو چمپا بائی اپنی سیٹ سے اٹھ کے میرے برابر آ گئی۔ پہلیوں ہی کبھی کھڑکی میں جھانکتی، کبھی میری صورت تکتی رہی پھر آہستگی سے اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اگر تمھیں یہ ڈر ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی تو یہ بات دل سے نکال دو۔ میں تمھارے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔"

"تم اپنے حق میں بہتری کر رہی ہو۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "تمھیں یا تمھاری بدزبان بہن کو ڈھونڈنا میرے لیے اتنا مشکل نہیں ہو گا۔"

وہ چپ ہو گئی گاڑی چلتی رہی پھر وہ کچھ دیر بعد مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "فہمیدہ تمھاری کون ہوتی تھی؟ وہ تمھیں دیکھ کے کیوں کود گئی تھی؟ میری شکل ہی ایسی ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے ماشاء اللہ تم لاکھوں میں ایک ہو نوجوان ہو، وجیہہ ہو اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بتا دو کم از کم یہ خیال کر کے کہ فہمیدہ سے میرا بھی کچھ تعلق رہا ہے۔"

"یہی تو دکھ ہے کہ فہمیدہ سے تمھارا تعلق کیوں رہا ہے چمپا بائی! تمھاری زبان پر اس کا نام کیوں آتا ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"میاں ہم بھی تو آخر انسان ہیں قسمت قسمت کی بات ہے کون چاہتا ہے کہ وہ محفل سجائے لوگوں کی نگاہوں میں تماشا بنے ہم سے اتنی نفرت مت کرو ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔"

"مجھے شبہ ہے مجھے شبہ ہے چمپا بائی کہ تمھارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے تم فہمیدہ جیسی لڑکی کو لے آئیں فہمیدہ جس نے اپنے گھر کے مردوں کے سوا کسی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" وہ یاسیت سے بولی۔ "وہ واقعی ہی اچھی لڑکی تھی مجھے بھی یہ دنیا دیکھتے اور یہ کاروبار کرتے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے، میں نے اس جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں تم سے قسم کھا کے کہتی ہوں کہ فہمیدہ کو مجھے بردے کے بھی اتنی ہی پاک باز تھی جتنی اپنے گھر میں ہو گی۔ بڑے بڑے نوابوں رئیسوں راجے مہاراجے نے پیش کش کی لیکن اس نے سب کو ٹھکرا دیا۔ وہ بس ناچتی گاتی تھی میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ بہت دنوں بعد تو وہ ناچنے گانے پر آمادہ ہوئی تھی۔ میاں میں تمھیں خوش رکھنے یا تمھاری خوشامد کے لیے فہمیدہ کی اچھائیاں نہیں کر رہی ہوں۔"

"تم مجھے کیا یقین دلانا چاہتی ہو؟" میں نے اداسی سے کہا۔ "یہ کیا کم ہے کہ وہ کوٹھے پر بیٹھتی تھی؟ یہ کیا کم ہے چمپا بائی!"

"میاں! میں اگر اسے نہ لے آتی تو مجھ جیسی کوئی اور لے جاتی۔ وہ عمر لوگوں کے قبضے میں پہنچ گئی تھی وہاں سے واپسی نہیں ہوتی، وہاں سے لڑکیاں اپنے گھر واپس جانے کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ انھیں یاد بھی رہتا ہے تو عزت ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ فہمیدہ واپس نہیں جا سکتی تھی میں نے تو اسے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا۔"

"بس چمپا بائی! بس کرو۔ مجھ پہ یہ احسان اور کرو کہ مجھے فہمیدہ کے گھر کا پتہ بتا دو۔ تم نہیں جانتیں تو جنھے ان لوگوں سے علاوہ جن سے تم نے فہمیدہ کو حاصل کیا تھا۔ مجھے کچھ اور غرض تمھیں میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔"

"میاں! میں تمھارا دکھ محسوس کر رہی ہوں مگر مجھے تم نے بتایا نہیں کہ تم فہمیدہ کے کون ہوتے ہو؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"یہ ذکر چھوڑو چمپا بائی۔" میں نے اپنا منہ پھیرا لیا کہیں چمپا مجھے فضل کی طرح پلک جھپکنا کے ساؤ پر سے مدراسی بڑا اٹھ کے آگیا تھا۔ انگریزی میں پوچھنے لگا۔ بھوپال گزر گیا یا نہیں؟ میں نے چمپا کے سامنے انگریزی بولنے سے گریز کیا، آگے نہ معلوم کیسے واقعات پیش آئیں۔ میں نے مدراسی کو اردو میں جواب دیا کہ بھوپال گزرے دیر ہو گئی ہے اب گاڑی ذہدیا میل کے بعد پہاڑی سلسلے سے گزر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگی وہ سوچ رہا ہو گا یہ کیسے لوگ ہیں جن کا سامان تھرڈ کلاس کے مسافروں کا سا ہے انگریزی میں بات کرنا بھی نہیں جانتے۔ منہ ہاتھ دھو کے وہ فارغ ہوا تو سامنے کی نشست پر آ کر بیٹھ گیا اور ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں ہماری منزل کا پتہ پوچھنے لگا، وہ بھی ہمیں جاننا چاہتا تھا کہ یہ عورت تمھاری سسٹر ہے کہ مدر؟ چمپا بائی بھڑکی کہ وہ کیا کرتا ہے مجھے جواب دینے میں جھجکاہٹ ہوئی۔ وہ بہت جھجکی آدمی تھا۔ سمجھا کہ میں اس کا سوال نہیں سمجھا ہوں میں نے کہا یہ میری عزیز ہے۔ میں نے غلط بھی نہیں کہا تھا، وہ فہمیدہ کے رشتے سے میری بھی عزیز ہوتی تھی، فہمیدہ کو اس نے اپنی بیٹی بنایا تھا اور میں بھی فہمیدہ کا بھائی کہلاتا تھا۔

ناگپور کے اسٹیشن پر قریب ہی کسی جگہ اترنے والا ایک اور مسافر ڈبے میں سوار ہو گیا اور تھوڑی دیر میں مدراسی شخص سے گھل مل گیا، وہ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے میرا خیال درست نکلا۔ مدراسی شخص نو وارد مسافر سے اپنے ٹسک کا اظہار کر رہا تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے یا نہیں ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ مدراسی شخص مدراس میں پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر ہے۔ آنے والا شخص بھی حکومت کے محکمہ جنگلات کا بڑا افسر تھا وہ دونوں ہو کر ہمارے بارے میں تخمینے لگا رہے تھے اس لیے بار بار ہماری جانب ان کی نگاہیں اٹھ جاتی تھیں۔ چمپا بائی اداس بیٹھی تھی۔ شاید مدراسی افسر نے میرے اور چمپا کے درمیان ہونے والی گفتگو کی سن گن لے لی تھی۔ وہ پولیس افسر تھا۔ ان کو تو کریدنے کا شوق ہو گا۔

گاڑی کے شور میں اوپر آواز پہنچنا حیرت کی بات تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ نئے مسافر کے آنے سے پہلے مدراسی مجھ سے کیسی خریت کی باتیں کر رہا تھا۔ جیل میں ایک ہی جیسے لوگ رہتے ہیں مگر جیل کے باہر کی دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہیں خواہ مخواہ دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے میں نو وارد

شخص نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر اُترنے کے متعلق ٹکٹ چیکر کو ڈبے میں بھیج دے گا۔ پھر اصل بات خود بخود سامنے آجائے گی۔ میں کلس کھڑے ہوئے اگر سمجھا کہ کہیں یہ معلوم ہو جائے کہ پولیس کا ایک افسر اُس کے ساتھ سفر کر رہا ہے تو وہ کسی بھی لمحے بدل سکتی ہے۔ مدراسی افسر عورت کی بات سے اُسے بہت ہکا سکتی چالاکیوں کے بارے میں مبالغوں کا پٹارا کھول سکتی ہے اور کچھ نہیں ہو گا تو میرے قدم اور اُلجھ جائیں گے اور اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے گلکتے کی جیل میں سات سال گزارے ہیں تو کسی کو بھی میری بات کی صداقت پر یقین نہیں آئے گا اور میں بات بھی کہاں کر سکوں گا۔ کیا میں پولیس کو یہ بیان دوں گا کہ میں چمپا کو اس لیے ساتھ لیے جا رہا تھا کہ وہ میرے گھر کا پتہ جانتی ہے جو میں خود نہیں جانتا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد یہ ڈبا چھوڑ دیا جائے مگر اس طرح مدراسی شخص کو مجھ پر اور شبہ ہو جاتا۔ اب تک وہ سرافت کی مروت کر رہا تھا۔

فوراً شخص اگلے اسٹیشن پر اُتر کے ٹکٹ چیکر کو بھجوا نہیں بھولا۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ ٹکٹ چیکر کے آنے کے بعد مدراسی افسر مجھ سے کسی قدر مطمئن ہو جائے گا۔ پھر میں کوئی بہانہ کر کے دبے پاؤں چلا جاؤں گا یا پھر کوئی بھی بات نہ بنی تو زیریں کا دیا ہوا چاقو میرے پاس موجود ہی ہے۔ بات ختم کر کے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا اور دو مدھیا پل کی چاڑیوں میں گم ہو جاؤں گا۔ میں نے بہت سے منصوبے ذہن میں باندھ لیے۔

ٹکٹ چیکر نے استہزائی انداز میں ہم سے ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے جان بوجھ کے بے نیازی اختیار کی۔ ٹکٹ جیب سے نکالنے میں میرے مدراسی افسر مسکرانے لگا۔ جی میں آیا چاقو سے اُس کے موٹے سیاہ بھونڈے تراش لوں۔ ٹکٹ دیکھنے کے بعد ٹکٹ چیکر اور مدراسی دونوں کو بابو سی ہوئی۔ کیا آپ ہی کے پاس سے نکالا گیا ہے؟" ٹکٹ چیکر نے انگریزی میں پوچھا۔

"وہ جنگلات کے افسر ہیں۔" مدراسی نے کہا۔

"ہاں وہی! آپ کران سافروں سے کچھ پریشانی ہوئی جناب؟"

"نہیں۔" مدراسی نے تیزی سے کہا۔ "اصل میں ہم دونوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ٹکٹ کے بغیر سفر کر رہے ہیں۔"

"یقیناً جناب۔" ٹکٹ چیکر نے ہمیں سرتاپا گھورتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "آپ کا شبہ درست تھا مگر صاحب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو دو ہفتے چار سیتلی کھار جس کے پاس چار پیسے ہیں، اُس کا بول بالا ہے۔ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ جناب کدھر جا رہے ہیں؟" مدراسی نے اُسے بتایا کہ وہ بمبئی جا رہا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ٹکٹ چیکر سے باتیں کرتے کرتے وہ ہماری طرف دیکھ کے کچھ تجسس سا ہو جاتا ہے۔ ضرور اُس نے میری اور چمپا کی باتیں سن لی تھیں۔ اُس نے چابک اپنی اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور اُسے چیک کے ٹکٹ چیکر کو دکھایا۔ ٹکٹ چیکر کے چہرے پر حاضری اور گہری ہو گئی۔

"جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" اُس نے گردن جھکا کے کہا۔

"کیا تمہارے سامان کی تلاشی لے سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

ٹکٹ چیکر بوکھلا کر مچر مچر کرنے لگا کہ یہ اُس کا کام نہیں ہے۔ یہ تو ریلوے پولیس ہی کر سکتی ہے۔

"آپ کو ان پر کسی قسم کا شبہ ہے صاحب؟" اُس نے تشویش سے پوچھا۔

"میری پوری زندگی پولیس میں گزری ہے۔" مدراسی نے غرور سے کہا۔

"ضرور جناب! آپ تو اوتی چڑیا پہچان لیتے ہوں گے۔" ٹکٹ چیکر رشتہ خلطی ہو کے بولا۔ "اب تو مجھے بھی یہ معاملہ خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔"

"بہرحال ابھی سفر طویل ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"کوشش میں آپ کے ساتھ بمبئی تک سفر کر رہا ہوں۔" ٹکٹ چیکر حسرت سے بولا۔ "میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ان کے متعلق کیا اندازے قائم کیے ہیں؟"

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک پولیس افسر کو پہلے پوری تفتیش کرنی چاہیے اس کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔"

"بے شک جناب! کیا اچھی بات کہی ہے لیکن آپ نے کسی معیار پر ہی تفتیش شروع کی ہو گی۔" ٹکٹ چیکر نے لجلجے میں بولا۔

"تفتیش پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔" مدراسی ادھیڑ عمر ٹکٹ چیکر کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "ٹک کی بہت سی وجوہ ہیں۔ لڑکا صورت شکل سے خاندانی معلوم ہوتا ہے لیکن بے حد اکھڑ ہے۔ عورت کی آنکھ عام عورتوں کی سی نہیں۔ دونوں میں کوئی تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے ہیں۔ عورت کا لباس بھڑکیلا ہے۔ لڑکے کا بے حد سادہ۔ لڑکا بہت پریشان پریشان ہے۔ بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا ہے۔ حیران نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتا ہے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے۔ عورت بھی کھوئی ہوئی ہے مگر کچھ خوف زدہ سی ہے۔ لڑکے کے پاس صرف ایک تھیلا ہے۔ عورت کے پاس تین کا ایک بکسا ہے اور چھوٹا سا بستر ہے۔ اتنے طویل سفر میں یہ مختصر سامان۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے بہت عجلت میں سفر کا ارادہ کیا ہو۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں میں جو شائستگی، متانت اور کھردرا پن ہوتا ہے وہ ان میں مفقود ہے۔ جب لڑکا اس عورت کے ساتھ ڈبے میں داخل ہوا تھا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ایک چیز دیکھی تھی۔ وہ چیز چاقو کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ پھر سفر میں چاقو رکھنا ایسی معیوب بات نہیں مگر جس چابک دستی سے لڑکا اُسے اپنے ہاتھ میں چھپائے ہوئے تھا وہ کوئی ایسا شخص ہی پہچان سکتا ہے جس کی عمر میری طرح پولیس میں گزری ہو۔"

"غلط جناب غلط۔" ٹکٹ چیکر کا رتبہ تری سے ملنے لگا۔ "پولیس میں تو ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی نظر بھی آپ جیسی ہو۔ میں بہت حیرت زدہ ہوں صاحب!"

"اور بہت سی باتیں ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے۔"

"اب آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا جناب؟" ٹکٹ چیکر اشتیاق سے بولا۔

"میں ابھی کچھ اور تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔" لڑکا ایک لمحے کے لیے بھی عورت کے پاس سے نہیں ہٹتا۔ میں کوشش کروں گا کہ عورت کو گفتگو پر آمادہ کر سکوں۔"

"سفر میں بھی آپ گرویا ڈیوٹی پر ہیں۔ خوب صاحب خوب! اسٹیشن قریب آرہا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا مگر مجھے بھی ڈیوٹی کے لیے اُترنا ہو گا جب تک میں ساتھ ہوں، یہاں آتا رہوں گا۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو بے تکلف بلا لیجیے گا۔" ٹکٹ چیکر نیاز مندی سے بولا۔ مدراسی افسر نے اُسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ ایک اہم مشن پر اُس کا تقرر کچھ دنوں کے لیے بمبئی ہو گیا ہے۔ اگر اُس کا گزر بمبئی یا مدراس سے ہو تو وہ ضرور ملے۔ دونوں میں بڑی محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔

میں گونگے اور بہرے کی طرح سنتا رہا۔ مدراسی افسر نے ٹکٹ چیکر سے میرے اور چمپا کے بارے میں جو باتیں کی تھیں، اُن کا مجھے خود اندازہ نہیں لگانے والے لمحوں میں وہ کوئی بھی ارادہ کر سکتا تھا۔ مجھے اسی ڈبے میں سوار ہونا گوارا تھا۔ میں بظاہر تمام باتوں سے بے خبر کبھی گردن جھکائے، کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتی چاڑیاں دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ٹکٹ چیکر جلنے والا تھا۔ مدراسی افسر کی توجہ پھر ہماری طرف مبذول ہو جائے گی اور اگر مجھ سے یا چمپا سے کوئی غلطی ہو گئی تو اُس کا شبہ اور توانا ہو جائے گا۔ اب اپنی اس کوتاہی پر پشیمان ہونے سے بھی کیا ہو سکتا تھا کہ میں نے مدراسی افسر سے انگریزی کیوں نہیں بولی۔ میرا دماغ ہی خراب ہو گیا تھا، مجھے بھی یہی کہنا تھا مگر میں کیا کروں جب مجھے اُس کی یاد آتی ہے اور گھر یاد آتا ہے تو کچھ خیال ہی نہیں رہتا۔

اس موقع پر ڈٹا بدنا مناسب نہیں تھا۔ ٹکٹ چیکر چلا گیا تو میں نے اسٹیشن سے کچھ پھل خریدے اور چمپا کو تھما دیے کہ وہ انھیں کاٹ ڈالے۔ ساتھ ہی میں نے چاقو نکالا، چمپا نفاست سے امرود اور سیب کی قاشیں بنانے لگی۔ کاٹنے میں اُسے دیر ہو رہی تھی۔ میں نے جیب سے اپنا چاقو نکال لیا اور چمپا کا ہاتھ بٹانے لگا اور دانستہ مدراسی افسر کا چہرہ نہیں دیکھا۔ جانے والے بیرے کو کچھ پیسے دے کر میں نے چمپا کے لیے پان بھی منگوا لیے۔ پھر میں نے مدراسی سافر کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ چلائے پیے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میری دعوت پر وہ بہت خوش ہوا۔ پہلے اُس نے انکار کیا مگر میرے اصرار پر مجبور ہو گیا۔ میں اُس کی برتھ پر بڑے سے کے چلا گیا۔ چمپا نے اُسے چائے کے دو مگ، اُس کے حصے پر کچھ ہی دیر بعد گفتگو کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اچھا تو بہت اچھا ہے۔" اُس نے سمجھے لہجے میں کہا۔

"میرے استاد نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ سفر میں ہمیشہ چاقو اپنے ساتھ رکھو۔ آتا ہے ضرور ہو کہ آدمی مر سکے۔" میں نے مضمحل آواز میں جواب دیا۔

وہ مسکرانے لگا اور نرمی سے پوچھا۔ "تم کیا کام کرتے ہو؟"

"فی الحال تو آوارہ گردی کرتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "آوارہ گردی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔"

"چاقو بازی، مکا بازی، لٹھ بازی، ہر قسم کے داؤ پیچ اور لڑنے بھڑنے کا گشت کبھی ادھر جاتا ہوں کبھی اُدھر جاتا ہوں۔"

"اور کہیں سکون نہیں ملتا۔" وہ لیپ نوجوان ہو۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔ اصل وطن کہاں ہے؟"

"اب تو کہیں بھی نہیں، کبھی ہوا کرتا تھا۔"

"کچھ پڑھا لکھا نہیں؟" اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا۔" میں نے بادی سے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا۔؟"

"سب بھول گیا۔"

"مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں بتاؤ، سفر بھی خاصا طویل ہے، شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔ مجھے نوجوانوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا کہیں گے آپ۔" میں نے منہ سے آہ نکل گئی۔ "لمبی کہانی ہے، سفر ختم ہو جائے گا، کہانی دھری کی دھری رہ جائے گی۔" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔ "آپ بتائیے مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی اوٹ پٹانگ باتیں لے کے بیٹھ گیا۔ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"میری باتیں اتنی دلچسپ نہیں ہیں۔ اپنی سناؤ۔ تم مجھے کسی زمیندار کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔" وہ امرود کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو میں خود اپنا بیٹا، اپنا باپ ہوں، زمین پر بوجھ ہوں۔"

"کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" وہ مہذب انداز میں بولا۔

"کیا بتاؤں۔" دہراتے ہوئے اُلجھن ہوتی ہے۔"

"بمبئی کسی کام سے جا رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک شخص کی تلاش ہے۔ سنا ہے بمبئی میں رہتا ہے۔ کچھ خاندانی معاملہ ہے۔ جب معلوم ہوا تو جیسے کھڑے تھے، ڈھ ہو گئے۔ سفر کی تیاری بھی نہ کر سکے تھے۔ میں نے نجی اور خاندانی معاملہ بتلا کے ان خبر کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یقین تھا کہ مدراسی افسر کے ذہن کا غبار کچھ دور ہو گا۔ یقیناً تجسس بھی سوا ہوا ہو گا مگر تجسس کا شمع جل جانا چاہیے تھا۔

میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے بھی باتیں کرنا آتی ہیں لیکن کوئی شخص جب بات نہیں کرنا چاہتا تو اُسے بات کرنے پر کیوں آمادہ کیا جائے۔ کوئی چُپ ہے تو اُس پر شک نہ کیا جائے۔ کوئی چپ ہے تو اس کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں۔ کوئی چپ ہے تو وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اُسے تنگ کیوں کرتے ہو۔ ٹکٹ چیکر دو تین اسٹیشن بعد خبر خیر لینے آیا اور سب مجھ اُس کے ساتھ گفتگو میں مصروف دیکھ کے مُرجھاتا ہوا چلا گیا۔ تمام ڈبے مدراسی کے لب لہجہ میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ گو مجھ میں اُس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں پھر بھی اُس سے انگریزی میں بات نہیں کی۔ وہ ایک ایک کر کے امرود میں نہایت ہوشیاری

سے بات کر رہا تھا۔ شام کے وقت میں نے اپنا تھیلا اس کے سامنے کھول کے ٹٹولنا شروع کیا، مقصد صرف یہ تھا کہ وہ یہ دیکھ لے کوئی مشکوک چیز تھیلے میں نہیں ہے۔ زرین نے اس میں سامان رکھا تھا۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ سفر کی رفاقت کا ایک دن عام دنوں کی رفاقت کے سو دن کے برابر ہوتا ہے۔ میرے رویے سے چمپا کے چہرے پہ شادابی آگئی۔ اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں تھا۔ ایسے عالم میں جب اعصاب میں کھنچاؤ ہے، بھوں اور دماغ پھٹا جا رہا ہو، فہمیدہ کے خوص اور ابا جان سے ملنے کے تصور سے دل ہول رہا ہو، ایسی باتیں کوئی پڑھیں، فہمیدہ کے پیروں میں گھنگرو باندھنے والی عورت چمپا کی خاطر داری کرنا پڑے، ایک اجنبی مسافر سے غیر ضروری راہ و رسم رکھنا پڑے مگر ٹھیک ہے سات سال جیل خانے میں بھی تو گزرے ہیں، جب سے گھر سے قدم نکالا ہے یہی ہو رہا ہے۔ ساری دنیا یہی چاہتی ہے کہ آدمی چپ چاپ پٹے چلے جائے۔ جھوٹ بولتا ہے، کیا معلوم اور کہاں کہاں جانا پڑے اور کیا کیا کرنا پڑے۔

چمپا نے پورے دن ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا جب کہ وہ کسی وقت بھی ٹھنک کھڑا کر سکتی تھی۔ میری باتوں سے وہ بھی متاثر معلوم ہوتی تھی۔ مدراس بہت تیز آدمی تھا۔ سامنے جو کچھ ظاہر کر رہا تھا، کیا خبر اندر بھی وہی بھرا ہوا ہو۔ رات تک کوئی مسافر ڈبے میں نہیں آیا۔ رات کا کھانا مدراسی نے ہمیں اپنی طرف سے کھلایا تو مجھے کچھ سکون آیا۔

کھانے کے بعد وہ مدراس اور دلی کے کھانوں کے بارے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے دلچسپ واقعات سنانے لگا اور اس نے مجھے دعوت دی کہ میں بمبئی میں اس سے ضرور ملاقات کروں۔ اس کا نام راج کرشنا تھا۔ آخر وقت تک اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پولیس کا افسر ہے اور اسی بات سے مجھے تشویش ہوتی تھی۔ شاید اس نے اس کا اظہار نامناسب سمجھا ہو کیونکہ بات چیت بے تکلفی کی حد میں داخل ہو گئی تھی جہاں افسری برتری کا ذکر مناسب نہیں ہوتا۔

صرف ایک رات درمیان میں باقی رہ گئی تھی۔ علی الصباح گاڑی شہر بمبئی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے گی۔ بمبئی شہر قریب آ رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے ابا جان بھی بمبئی میں رہتے ہوں۔ جب وہ مجھے دیکھیں گے تو ان کا کیا حال ہو گا۔ دھنکار دیں گے یا گلے لگائیں گے، پچھاڑیں گے بھی یا نہیں۔ فہمیدہ نے تو انھیں وقت سے پہلے لڑھکا کر دیا ہو گا۔ کیا آفت آئی تھی کہ اچھا خاصا گھر چھوڑ دیا۔ میں چلا گیا تھا تو کون سی قیامت آ گئی تھی؟ لوگ اچانک مرتی تو جاتے ہیں۔ سمجھ لیتے کہ میں مر گیا ہوں۔ آخر میں نے بھی تو ان کے لیے یہی سوچا تھا۔

برار ٹرن سمیٹ کے جا چکا تھا۔ مدراسی مسافر راج کرشنا پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیری اور چھوٹنے والی تھی کہ ایک مسافر جھگڑتا ہوا آیا۔ اس نے ایک نظر ہم لوگوں پر ڈالی اور اجازت طلب انداز میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ "معاف کیجیے مجھے قریب ہی اترنا ہے اس نے لجاجت سے کہا۔

"ضرور ضرور آیئے بیٹھیے۔" راج کرشنا فراخ دلی سے بولا۔ مسافر سمٹ کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک چرمی تھیلا تھا۔ عمر یہی کوئی ۲۵، ۲۶ سال، ہلکے سلیقے سے کلی ہوئی انگریزی لباس پہنے ہوئے، رنگ سرمئی۔

راج کرشنا مصروف کر کے سونے کے لیے اوپر کی برتھ پہ چلا گیا۔ نووارد مسافر نے اصرار کر کے مجھے بھی لٹا دیا۔ میں نے پیر سکیڑ لیے، وہ کونے میں بیٹھا تھا۔ اوپر کی ایک اور برتھ خالی تھی مگر وہ سونے یا آرام دہ نہیں ہوا۔ سامنے کی سیٹ پر چمپا اپنے مجسم پر چادر ڈال کے لیٹ گئی تھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی، نووارد شخص نے کپاؤنڈ کا دروازہ بند کیا اور ہم لوگوں سے روشنی بند کرنے کی اجازت چاہی۔ مدراسی ابھی جاگ رہا تھا۔ اس نے اس زحمت پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ نئے مسافر نے بتی گل کر دی، کپاؤنڈ میں اب ایک ہلکا بلب روشن تھا اور گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی، ہچکولے لے رہی تھی۔ راج کرشنا کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد ایک کروٹ ساکت ہو گیا۔ چمپا بائی نے ساڑی کے پلو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا اس لیے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ نووارد شخص کسی گہری سوچ میں گم تھا، پھر وہ پشت سے سرکا کے اونگھنے لگا۔ میری آنکھیں سے نیند کوسوں دور تھی، کل بھی ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ کچھ سکون کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

بمبئی قریب آ رہا تھا۔ میرے پائنتی بیٹھے ہوئے مسافر کو آئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دفعتہً مجھے کچھ کھٹکا ہوا۔ میں نے لیٹے لیٹے نیم باز آنکھوں سے دیکھا، مسافر نے دروازے کے قریب جا کے آہستہ سے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا اور باہر جھانکا، پھر گھڑی دیکھی اور ایک گہری سانس لے کے اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ میں سمجھا شاید اس کی منزل آنے والی ہے، ساز چند لمحے ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ دو بار آہٹ ہوئی، مجھے بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کہیں چمپا کے ارادے میں بل تو نہیں آ گیا ہے۔ مسافر پھر اٹھا۔ اس نے چمپا کی طرف دیکھا، چمپا کے منہ پر ساڑی کا پلو پڑا ہوا تھا۔ مسافر نے اپنا منہ قریب لے جا کے جیسے اسے سونگھا۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ چمپا کے بعد مسافر میری طرف آیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ جیسے ہی اس کے مڑنے کی آہٹ ہوئی، میں نے اپنی آنکھوں کے پردے سے کسی قدر اوپر کیے۔ مسافر راج کرشنا کی برتھ کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے جیب سے ہاتھ نکالا تو ایک تنکا اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ سب بھپتا بانے سے پہلے اس نے تنکا راج کرشنا کے سر پر ٹان دیا تھا۔ میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا، جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس موقع پر مسافر کو چھیڑنے کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ میری ایک آہٹ بھی صورت حال سنگین بنا سکتی تھی۔ میں جس دم ساڈھے چار بجا رہا۔ نہ بلنے کا یا اذنہ آنکھ کھولنے کی مجال۔ مسافر نے راج کرشنا کے جوڑے پر ٹھوکا مارا۔ راج کرشنا کا جسم اچانک مضطرب ہوا۔ ایک ہلکی سی سسکاری کی آواز آئی۔ اس نے تنکا دیکھ لیا ہو گا۔ مسافر نے سر گوشی میں کچھ کہا۔ میں کوشش کے باوجود سن نہ سکا۔ راج کرشنا کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن اس کے جسم پر دوبارہ نحیف سا رعشہ طاری ہوا۔ اس نے کچھ کہا مگر مسافر نے اسے شاید دوبارہ دھمکی دی اور تنکے کی قدر و قیمت کیا کہ راج کرشنا بری طرح بھڑک رہا تھا۔ مسافر نے ایک بار پھر مجھ پہ نگاہ کی۔ میری آنکھیں اس طرح بند تھیں کہ وہ انھیں بھانک کے دیکھتا، تبھی اس کی گھٹنے کا پتہ چلتا۔ راج کرشنا کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت اضطراب سے پچھڑا۔ مسافر نے تنکے کی نال اس کی گردن سے لگا دی تھی۔ راج کرشنا نیچے آ گیا تھا۔ مسافر نے اسے دروازے کے قریب چلنے کا اشارہ کیا۔ میرے سارے جسم میں سرد و گرم لہریں اٹھ رہی تھیں۔ راج کرشنا نے جوتے پہننا چاہے مگر مسافر نے اسے اجازت نہیں دی۔ میں لیٹا ہوا تھا لیکن میرا ذہن جاگ رہا تھا۔ مسافر کے جسم کی ہر جنبش، ہر حرکت میری نگاہ کی زد میں تھی۔ راج کرشنا ایک سعادت مند شاگرد یا کسی معصوم بچے کی طرح مسافر کی ہدایت پر دھانے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ چمپا نے کروٹ بدلی تو مسافر نے ایک لمحے کے لیے چونک کے اس کی طرف دیکھا مگر وہ ایک لمحہ ہی تھا۔ انگوٹھے کی طرح پھنکا، بجھ گیا اور میں اپنی طاقت جسم میں گھونٹ کے رہ گیا۔ مسافر کا ارادہ حالت ظاہر تھا۔ میں بہت پہلے ہی زیر سے زبر سے اپنی جیب تک ہاتھ لے گیا تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ اسے سینے کے کھٹکا دبانے کی دیر تھی مگر مسافر کو اتنے کی مہلت بھی نہیں دے رہا تھا۔ راج کرشنا کے بارے میں بہت جلد کوئی فیصلہ کرنے والا تھا۔ مسافر نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کی چٹخنی نیچے گرا دی اب اس کا ہاتھ زنجیر کی طرف اٹھ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پوری صورت حال کو تولا۔ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے بند چاقو چمپا کے جسم پر پھینک دیا، ساتھ ہی میں کینچلی کی طرح برتھ کے نیچے گرے کے اوپر کی طرف اٹھا، چمپا پر پڑا ہوا چاقو اٹھایا اور مسافر کی طرف جھپٹا۔ میرے اندازے میں کوئی خامی نہیں تھی، ادھر میرا چاقو ہوا میں لہرایا، ادھر میں جھپٹا۔ مسافر نے پہلے چمپا کی جانب تنکا پھینکا، پھر برتھ سے بوکھلا کے نیچے کا رخ ہی کیا تھا مگر میں نے اسے درمیان ہی میں لپک کے اوپر اٹھایا۔ تنکے سے شعلہ نکلا اور دوسرے ہی لمحے میں سوراخ گردن پہ تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی پشت گاہ کو پکڑا۔ راج کرشنا موٹے موٹے سوت کھڑا تھا، وہ ایک مجسم مسافر کے جسم سے آدھے گھنٹے کا جوڑ فصل کیا تھا۔ تنکے نیچے گر گیا اور مسافر دھڑ سے پر نیچے گرنے لگا۔ تنکے نے راج کرشنا نے اٹھایا اور مسافر کی جیبوں کی تلاشی لے کے ایک لمبا چاقو برآمد کر لیا۔ میری عرصے سے مسافر کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ وہ فرش پہ بہنے لگا میں نے اسے ایک ٹھوکر لگانی چاہی لیکن راج کرشنا نے مجھے روک لیا۔ چمپا کے منہ پہ دبلے کو روشن کر دیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ راج کرشنا نے گھڑی دیکھی ۴ بج کے ۲۰ منٹ ہو گئے۔ بمبئی آنے میں ۲ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ راج کرشنا نے اپنا ہاتھ سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ میں کچھ نہیں سمجھا، وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بوسہ دینے لگا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"میں اسے نہیں جانتا مگر یہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" راج کرشنا کا چہرہ فوری مسرت سے تمتما رہا تھا۔ یقیناً یہ اس گروہ کا کوئی آدمی ہو گا جس کی تفتیش کے لیے مجھے بمبئی میں تعینات کیا گیا ہے۔ یہ لوگ مجھے بمبئی نہیں پہنچنے دینا چاہتے۔ بہت پیچیدہ معاملہ ہے پھر کسی وقت سناؤں گا مگر یہ کیلا نہیں ہو گا۔" راج کرشنا مذبذب سے بولا۔ "اس کے دوسرے ساتھی بھی کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے ہوں گے۔" راج کرشنا کا زرخیز دماغ کام کرنے لگا۔ "اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں کھڑکی سے جھانک کے دیکھوں۔ میں نے شیشہ اٹھایا تو دور سے روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں۔ گاڑی کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

"تمھارے کتنے ساتھی تھے اس کے ساتھ؟" راج کرشنا نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ مسافر کی حالت نہایت خستہ تھی، بازو جھٹکتا تھا، گردن سے خون رستا تھا، زخم سے اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا مگر کاٹھی کا مضبوط تھا۔ گردن پہ گرفت بھی زیادہ تھا اس لیے کچھ بھی نہیں گیا۔ اس نے راج کرشنا کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کراہنے لگا۔ یہ نہیں بتائے گا۔ میں نے رائے ظاہر کی۔

"یہ لوگ خاصی دور سے ہمارا تعاقب کر رہے ہوں گے جیسے ہی زنجیر کھینچی اور گاڑی اسٹیشن سے پہلے کسی سنسان مقام پر رکتی اس کے دوسرے ساتھی بھی اتر جاتے۔ جو مقام طے ہو گیا تھا، وہاں چونکہ پروگرام کے مطابق گاڑی نہیں رک پائی ہے اس لیے دوسرے ساتھی سبب جاننے کے لیے ہمارے ڈبے کا رخ ضرور کریں گے۔ ابھی سفر میں تقریباً ۲ گھنٹے باقی ہیں۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے تو کھڑکیاں، دروازے بند کر کے ڈبے میں بند ہو کر تو بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ آنے والے اسٹیشن پر دروازہ کھولنے کے لیے زیادہ ہنگامہ نہیں کریں گے اور انھیں اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے لیے کسی ویران جگہ گاڑی رکوانے کی عجلت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ممکن ہے وہ بمبئی تک خوبی اس انتظار میں رہیں کہ اچانک گاڑی رک جائے۔" راج کرشنا اس انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے آگے پیچھے سے سارا پروگرام معلوم ہو۔

اسٹیشن آ گیا تھا۔ ڈبے میں باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، شیشے پر ہاتھ مارا مگر ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شاید کوئی مسافر ہوگا۔ گاڑی کوئی سات منٹ ٹھیری ہوگی پھر اپنی منزل کی جانب رینگنے لگی اور کچھ دُور میلے کے ہوائے ہاتھی کرنے لگی۔ "آپ کب تک پہنچ جائیں گے اس طرح کھڑے رہیں گے، بیٹھ جائیے، میں اس کا انتظام کرتا ہوں، بمبئی تک یہ سو تا ہے گا۔"

"یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے عزیز دوست۔" راج کرشنا کی آواز مسرت سے عمر تھی۔ "میں اپنے ساتھ ایک تحفے لے کے اُن کی خدمت میں پہنچوں گا جس اہم کام کی ذمے داری سونپنے کے لیے انھوں نے پہلے مجھے دلی بلایا پھر بمبئی تعینات کیا اس کا آغاز ہی اتنا خوش گوار ہوا ہے، میں اسے سنبھال کے رکھنا چاہتا ہوں اور بمبئی تک چھڑنا نہیں چاہتا یہ سب تمھاری بدولت ہوا ہے، میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میں اداس کا ایک بڑا پولیس افسر ہوں۔"

میں نے رسمی تعجب کا اظہار کیا۔ کرشنا نے کہا "آپ بیٹھ جائیے، میں اسے تین چار گھنٹے تک بے سدھ کر سکتا ہوں، آپ اطمینان رکھیے، مرے گا نہیں۔" یہ کہتے ہی میں نے کرشنا کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اس کے ایک اور ہاتھ مسافر کی گردن پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ "اب آرام کیجیے۔" میں نے برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راج کرشنا گھبرا سا گیا۔ اس نے بے ہوش مسافر کو ٹٹول کے دیکھا اور آنکھوں میں ممنونیت بھر کے بولا۔ "ہاں اب میں سکون سے بیٹھ سکتا ہوں۔ وہ میرے قریب بیٹھ کے بھرپور سگریٹ ادا کرنے لگا۔ "کیا تم بھاگ رہے تھے؟" وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اُسے تفصیل سنائی۔ راج کرشنا میری پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ گاڑی جھک جھک جھجھکتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ راج کرشنا نے چمپا سے پان مانگ کر کھایا۔ اس نے چمپا سے درخواست کی کہ وہ تھوڑا پانی اور اُس کے سوٹ کیس سے نیلی گولیاں نکال کے اُسے دے۔ راج کرشنا نے گولیاں حلق سے اُتار کے ایک گھونٹ پانی پیا۔ اب تو چمپا نے بھی سُن لیا تھا کہ وہ ایک بڑا پولیس افسر ہے اور اُس کے ہاتھ میں تحفہ بھی تھا، چمپا کے ایک اشارے پر وہ مجھے بے بس کر سکتا تھا لیکن چمپا ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ میں اُسے جبراً بمبئی لیے جا رہا تھا اور میں نے موتیا بائی کے ہاں دو آدمی زخمی کر دیے تھے۔ یہ بات اتنی اہم نہیں تھی کہ ہمیشہ کے لیے میری زبان بند ہو جاتی۔ میں کبھی واپس آتا تو پھر بھی کبھی چمپا بائی موتیا بائی کو تلاش کرتا۔ میں فیض آباد کے جاسوس اور اُس کے ساتھیوں کو بھی اشارہ کر سکتا تھا۔ بات بڑھتی تو چمپا کا دھان بھی مل جاتا۔ اُس نے میری بہن فہمیدہ اور نہ جانے اور کتنی لڑکیاں خریدی ہوں گی۔ پھر چمپا، نوشہ اُس کے ساتھی اور ریل میں تمنچے والے مسافر کا انجام دیکھ چکی تھی۔

راج کرشنا نے گھڑی دیکھ کے مجھے بتایا کہ بس اب بمبئی آنے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہم نے مسافر پر چادر ڈال دی تھی۔ اُسے ہوش آ گیا تھا مگر وہ لیٹے لیٹے کراہ رہا تھا۔ بمبئی آ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار برابر ساچھا جاتا تھا، راج کرشنا بڑی شدت سے وادی اسٹیشن کا انتظار کر رہا تھا، اُس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں چمپا کے ساتھ اُس کی قیام گاہ پر ٹھہروں۔ وہ میرا کوئی عذر تسلیم نہیں کرتا تھا۔ "تم میرے ساتھ ٹھیرو گے، اب میں تمھیں کہیں اور نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ دو چار روز میں اُس کے مکان میں ضرور آ جاؤں گا، ایک خیال یہ بھی آیا کہ راج کرشنا کے توسط سے اُس غنڈوں تک پہنچا جائے چمپا فہمیدہ کے سلسلے میں جن کا حوالہ دیتی تھی لیکن یہ بات مناسب نہیں تھی۔ راج کرشنا کو پھر ساری باتیں معلوم ہوتیں۔ وہ ہمیں چھوڑنے پر بہ مشکل سے آمادہ ہوا۔

چمپا نے اُس کا اور اپنا سامان تہہ کر لیا تھا، مجھے چمپا سے یہ پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ اُسے بمبئی کے کون سے اسٹیشن پر اُترنا ہے۔ گاڑی بمبئی سینٹرل اسٹیشن تک جاتی تھی۔ وادی اسٹیشن پر پولیس افسران کی ایک بڑی تعداد نے ہمارا ڈبا گھیر لیا۔ چمپا بھی حواس باختہ ہو گئی۔ راج کرشنا سیدھا اُدھر ہی لپکا اور ڈبے سے اُترتا تمام افسر آگے بڑھے، سلوٹ کیا اور معذرت کرنے لگے۔ یہ تمام لوگ راج کرشنا کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ راج کرشنا نے سادہ لباس میں ملبوس ایک افسر سے کہا کہ وہ ڈبے میں پڑے ہوئے شخص کو پولیس کے گھیرے میں باہر نکالنے کا اہتمام کرے۔ اُس نے مجھے نہیں چھوڑا، آخر تک اصرار کرتا رہا کہ میں اُس کے ساتھ چلوں اور وہ اُس شخص کی تلاش میں اپنے اثر و رسوخ سے میری مدد کرے گا جس کے لیے مجھے بمبئی کا سفر کرنا پڑا ہے۔ اُس نے سلیوٹ کھڑی ہوئی چمپا بائی سے بھی گزارش کی چمپا نے بہت عاجزی سے وعدہ کیا کہ جاتے ہوئے ہم دونوں ضرور اُس کے پاس ٹھیریں گے۔ وہ افسر دس چند سمجھ چلے اور کہہ کے بھاری بھی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے غلط پتہ بتایا تھا کہ میری قیام گاہ وادر میں ہے۔ ہم نے اُس کی سواری کی پیش کش بھی قبول نہیں کی۔ اس اجتناب سے وہ کچھ اداس ہو گیا۔

پولیس افسران کی توجہ کے منتظر تھے، بمبئی کے متعدد سیاہی اپنے مخصوص لباس میں اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ انتظام شاید اُس کی فوری ہدایت کے تحت کیا گیا تھا، وہ جیسے ہی اُس غول میں چھپا، ہم نے اپنی راہ لی۔ اسٹیشن سے باہر نکلے میں چمپا کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ سامنے بمبئی شہر پھیلا ہوا تھا۔ جب خیال آتا تھا کہ اب ابا جان سے کسی بھی وقت ملاقات ہو سکتی ہے تو ہم میں خوف دوڑنے لگتا تھا۔ ڈبے سے اُترکے مجھے یہ محسوس ہوا تھا جیسے میں دوبارہ جیل خانے سے آزاد ہوا ہوں مگر اب یہاں پہنچ کے جب بمبئی شہر کی سڑکوں پہ نظر پڑتی اور یہ خیال آتا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سڑک مجھے جان تک جاتی ہوگی تو اضطراب تازہ دم ہو کے مچلنے لگتا۔ چمپا نے پریشان ہو کے میرا حال دریافت کیا مگر میں خاموش رہا۔ چند لمحے بنچ سے ٹیکنے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا "کہاں چلنا ہے؟"

"پہلے کسی ہوٹل میں چل کے آرام کرو۔" اُس نے ملائم لہجے میں کہا۔ اس کے بعد تلاش میں نکلیں گے۔" میری طرف سے دل صاف رکھو۔"

"کس کے پاس چلنا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اُس کا نام گھایا ہے، یہیں دادر کے علاقے میں رہتا تھا، پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے، تلاش کرنے میں دیر لگ سکتی ہے، کسی ہوٹل میں سامان رکھ کے اور کپڑے بدل کے ڈھونڈنے نکلیں گے۔"

میں نے اُس کی بات مان لی۔ چمپا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کوئی فریب نہیں کرے گی، وہ اس علاقے کے ہوٹلوں کو جانتی تھی۔ میں نے خود کو اُس کے سپرد کر دیا۔ ٹیکسی نے ہمیں ایک کئی منزلہ ہوٹل کے دروازے پر اُتار دیا۔ میرے پاس ابھی رقم کافی تھی۔ اتفاق سے ہوٹل میں ایک کشادہ، ہوادار اور روشن کمرہ خالی تھا۔ کمرے میں آ کے چمپا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں، اُسے میری طبیعت اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اُس کے کہنے پر میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا، بال سفر کی گرد سے اٹے ہوئے تھے، جسم چپ چپا رہا تھا۔ چمپا نہانے کے بال بکھرائے ہوئے واپس آئی، پھر میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ میں نے جلدی جلدی جسم پر پانی ڈالا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا۔ چمپا چائے منگوا چکی تھی، ہوٹل کا بیرا اُس کے پیروں کی نزدیک فرش پر بیٹھا تھا، چمپا نے اتنی سی دیر میں اسے نہ جانے کس طرح اپنا رام کر لیا تھا کہ بیگم صاحب، بیگم صاحب کہتے ہوئے اُس کا منہ سوکھ رہا تھا۔ چمپا اُسے اپنے معمولات کی ہدایت دے رہی تھی مثلاً ٹیکسی دروازے پر کھڑی ملے کوئی آئے تو پہلے اطلاع دی جائے وغیرہ۔

بیرا چلا گیا تو چمپا نے مجھے چائے بنا کے دی اور کچھ ٹوسٹ نکھن لینے کے لیے کہا۔ "اب چلو، اُسے تلاش کرنے نکلتے ہیں۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"جلدی مت کرو۔" اُس نے تسلیمی لہجے میں کہا۔ "جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے، آنا فانا سفر سے تلاش کرنے ہی کے لیے کیا ہے۔ ہم نے جلدی کی تو بھٹک سکتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو ایک پل گزارنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔"

"تم پس صبر کرو، باقی باتیں مجھ پہ چھوڑ دو۔ یہ سمجھ لو کہ تم ابھی بمبئی نہیں اُسے ڈھونڈنا بھی مجھے تلاش کر رہے ہو۔" وہ نرمی سے بولی۔

"مگر کب تک؟ کب تک؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے بالکل کچھ نہیں جانتے، تم فیض آباد کے لوگوں کے ساتھ بالا خانے پر آئے تھے، اُن لوگوں کے مزاج سے تو آشنا ہو گے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"وہی لوگ ہیں، اتنی جیسے کوئی بڑا کوئی چھوٹا، کوئی کمزور کوئی طاقت ور لگا دی ہیں، اس جگہ بدلی ہوئی ہے۔"

"صرف جگہ نہیں بدلتی، لوگ بھی بدلے ہوئے لگتے ہیں، سب کو ایک ترازو میں مت رکھو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "ان لوگوں سے تمھارا واسطہ پڑا ہے، لوگ صرف وہی نہیں ہوتے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ وضاحت کرنے لگی۔

"مطلب کچھ بھی ہو۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کے تلخی سے کہا۔ "ایک شخص ملنے کی آرزو میں کالی میں بنے دو سو انھیں نیلام پر چڑھا دیتا ہے، تم دونوں کو ایک ہی خانے میں رکھ دیتی ہو، چمپا بائی! ان سنبھال کے بات کیا کرو۔ تم نے صرف نوشے اور گلابے کو دیکھا ہے۔"

"تم تو بگڑ گئے، میری عقل ماری گئی ہے۔" وہ خفت سے بولی۔ "بات کچھ کہنا چاہتی ہوں کہہ کچھ جاتی ہوں، میری بات سے تمھیں تکلیف ہوئی؟"

"تکلیف؟ تکلیف کیا چمپا بائی! بس جلنے دو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"دیکھو، میں تم سے یہ کہنا چاہتی تھی۔" وہ اپنائیت سے بولی۔ "کہ ہمیں ذرا تحمل سے کام کرنا ہوگا۔ تمھارا مزاج دوسرا ہے، مجھ ایک دن میں تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی ہے۔ اول تو اتنا جیسی ڈھونڈنا پھر اُن کے مل جانے پر اُن سے فہمیدہ کا پتہ پوچھنا، انھوں نے اُسے کہاں سے مال کیا تھا، یہ ایک مشکل کام ہے، مجھے ڈر ہے کہ تم انھیں اپنے سامنے دیکھ کے گھر جائے گی اس لیے میں چاہتی ہوں کہ خود اُن کا سراغ لگائیں اور تم ہمیں ہوٹل میں رہو میں اُن کے ٹھکانے لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ فہمیدہ کا ذکر کرتے وقت تمھارا لحاظ نہیں کریں گے۔ نہ جانے کس کس طرح اُس کا ذکر کریں، تم یہ برداشت نہیں ہوگا۔"

میں فہمیدہ کو نیلم جان کے روپ میں دیکھ کے زندہ رہ گیا۔ مجھ سے زیادہ برداشت کس میں ہوگی، چمپا نے تم سے کہی ہے جو ہمارا تجربہ رکھنے لگا ہے چمپا بائی! اُس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے۔"

"میاں! خدا گواہ ہے کہ میں آج تک کسی لڑکی کو اُس کے گھر سے گھسیٹ کے بالاخانے نہیں لے گئی میں اچھی لڑکیوں کو ادھر اُدھر کے لے گئی ہوں جن کے پاس اپنے گھر واپس جانے کا راستہ نہیں رہ گیا تھا، فہمیدہ نہ جانے کس طرح گلابے اور اُس کے ساتھیوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ میں نے جب اچھی طرح پرکھ لیا کہ میں نہیں تو کوئی اور اُسے خریدے گا تب میں نے گلابے کے ہاتھ میں خیلی تھمائی۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "تمھاری کوئی غلطی نہیں، ہزاروں اچھے طلب گار موجود ہوں تو سودا اگر اپنا دامن بھی بچ لیتے ہیں، چمپا بائی چپ ہو گئی۔ چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں کھڑکے لگی، آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گالوں پر لڑھکنے لگے۔ "میں تمھارے ساتھی ہیں گا، کچھ بولوں گا نہیں، وہ سمجھیں گے کہ میں تمھارے کاروبار سے متعلق کوئی آدمی ہوں اور یہ وہ سچ ہی سمجھیں گے۔" میری آواز پگھلنے لگی۔ "تمھاری جگہ کوئی

غلطی نہیں گلابے کی بھی کوئی غلطی نہیں، غلطی تو اُن بدنصیبوں کی....."
مجھ سے آگے کچھ کہا نہیں گیا۔

"اب تم سے میں کیا کہہ سکتی ہوں، تمھارے سامنے موجود ہوں"۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"چلو اٹھو"۔ میں نے چائے کی دھار میز پر گرنے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "صبح صبح کا وقت ہے دیر ہو جائے گی تو لوگوں کا ملنا مشکل ہو گا۔ اب اٹھو"۔

"یہ بیرا کچھ کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے"۔ وہ رازدارانہ بولی۔ "میں نے اس سے ابھی بات تو نہیں کی ہے مگر میرا خیال ہے کہ گلابے کو جگہ جگہ ڈھونڈنے کے بجائے ہمیں یہاں بلائے لیتی ہوں۔ میرا نام لے کر اس کے وہ ہوٹل میں آجائے گا۔ بات آسانی سے مل ہو جائے گی"۔

"مگر۔ مگر یہ ایک لمبا طریقہ ہے"۔ میں نے اس کی رائے مسترد کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے ہوٹل والوں کو علم ہو کہ ہم لوگوں کو کس بدنام شخص کی تلاش ہے، پھر وہ یہاں آئے، تربیات اور بڑھے۔ چار و ناچار چمپا بائی آمادہ ہو گئی۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ ایک برقع پوش عورت کے ساتھ گلابے جیسے آدمی کا پتہ پوچھنا معیوب سی بات تھی۔ چمپا کے بیان کے مطابق ہوٹل کا ایک بوڑھا بیرا گلابے سے اس کے رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔ اب وہ بیرا ہوٹل چھوڑ کے اپنے شہر جا چکا تھا اسی لیے چمپا دوسرے بیرے سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہ تمام راستے مجھے سمجھاتی رہی کہ اگر گلابے کا سامنا ہو جائے تو میں اپنے آپ کو قابو میں رکھوں۔ پھر اپنا تو معلوم نہیں تھا، اتنا معلوم تھا کہ میں خود ہوا تھ بلڈنگ پہنچا ہے۔ ٹیکسی والا شاید جان بوجھ کے ٹیکسی مختلف علاقوں میں گھماتا رہا۔ آخر وہ میں ایک ایسی جگہ لے گیا، جہاں چھوٹی بڑی بلڈنگیں ایک دوسرے پہ پیسے گری پڑ رہی تھیں۔ بلڈنگوں کے درمیان گورنے والی سڑکیں تنگ تھیں۔ میں نے ٹیکسی کو ان تریسی پان فروش کی دکان پر ایک شخص خاص تیوروں سے کھڑا ہوا تھا میں نے اس کے پاس پہنچ کے جب اس کے سامنے گلابے کا نام لیا تو وہ اس طرح ہنسنے لگا جیسے میں نے کوئی بہت حماقت کی بات کہہ دی ہو۔ مجھے جواب دینے کے بجائے اس نے پنواڑی کو مخاطب کیا۔ "سنتا ہے مچھا سیٹھ! بچو کرا کس کا نام لیتا ہے گلابے کا۔ اس کچھوے کا"۔ پنواڑی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ دونوں بار بار مجھے سر سے پیر تک دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

"اے! ہنستے کیوں ہو! کیا تمھارا دماغ خراب ہے؟ میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو"۔ مجھے ان کے برتاؤ پہ غصہ آگیا۔

"اے جا"۔ اچانک اس کی ہنسی رک گئی اور آنکھیں لال ہو گئیں۔

"جا بابو! جا"۔ اپنا راستہ سنبھال"۔ پنواڑی نے کسی قدر مفاہمت سے کہا۔ "اور میں اب گلابے کا نام نہ لے، وہ ایدھر سے دکان بڑھا گیا، اب اس کا اڈی ایدھر نہیں چلتا۔ ایدھر تو بسلواشیر کا بچہ۔ اس کا اڈہ میں پر چھے تو بتائیں۔ وہ سامنے شمبھو ناتھ بلڈنگ میں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے شیر کا پنجہ بناتے ہوئے کہا۔ "گرتا ہے"۔

"گلابے اب کہاں رہتا ہے؟"

"وہ سالا کہیں نالے میں پڑا ہوئیں گا"۔ اپن کو کیا"۔ پنواڑی کے جواب دینے سے پہلے دکان پر کھڑے ہوئے شخص نے حقارت سے کہا۔

"ہم اس کی تلاش میں بہت دور سے آئے ہیں، اس کا پتہ بتا دو"۔

"اس بکھڑے کا پتہ؟۔ اے مچھا سیٹھ!"۔ وہ پنواڑی کو مخاطب کر کے پھر ہنسنے لگا۔ چھوکرے کو گلابے کا ایڈریس بتاؤ"۔ وہ آنکھ مار کے بولا۔

"سنا ہے سالا اب اُدر اندھیری میں سنخری کرتا پھرتا ہے"۔

میں اُن کے پاس سے چلا آیا۔ ٹیکسی اندھیری کے علاقے کی طرف بھاگنے لگی۔ پنواڑی اور اس کی دکان پہ کھڑے ہوئے شخص کی باتیں ظاہر کرتی تھیں کہ گلابے نے کوئی خاص نام پیدا نہیں کیا ہے۔ کبھی اس کا نام ہو گا مگر اب وہ ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ کلار بمبئی سے بڑا شہر ہے پھر بھی یہاں کا حال وہاں کے حال سے مختلف نہیں ہو گا۔ ٹیکسی اندھیری میں داخل ہو گئی۔ پان کی دکانوں، چائے کے اسٹالوں پہ میری نگاہیں اس چہرے کو ڈھونڈتی رہیں جو مجھے دور سے نظر آجاتے تھے۔ ہمیں اندھیری کی بھی سڑکوں پہ پہلے ایک چکر لگایا۔ شاید چمپا کو گلابے یا اس کا کوئی ساتھی نظر آجائے۔ ٹیکسی کی رفتار کم تھی۔ کئی جگہ میں نے ٹیکسی رکوانے کا ارادہ کیا مگر چمپا نے منع کر دیا۔ "اگر ایک آنگ چوڑا ہے پہ مجھے گلابے کا پتہ نشان پوچھنے کے لیے اترا پڑا۔ یہ جگہ گنجان اور گندی تھی۔ گھٹیا بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں نے حیرت اور تجسس سے میرا معائنہ کیا۔ میں یہی برتن ہی رہا تھا کہ کون سا آدمی بات کرنے کے لیے منتخب کروں کہ ایک شخص نے پیچھے سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا، بھول جاؤ میں اور اونچے پائنچوں کی پتلون پہنے ہوئے ایک بھیڑیے جسم اور کالے رنگ کا آدمی تیکھی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ "کیا ہے؟"۔ اس نے منہ بنا کے پوچھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے علیحدہ کیا۔ میری اس حرکت سے اس کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ "کس کو مانگتا ہے؟"۔ وہ خشونت سے بولا۔

"گلابے کو"۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔

"گلابے کو"۔ وہ ہاتھ نچا کے بولا۔ "کدے سے آیا؟"

"کلکتے سے"۔ میں نے سرسری جواب دیا۔ "گلابا کدھر ہے؟"

"وہ سالا ایدر اب ایک بنے سالا جیل میں پڑا سڑتا ہے۔ اس کا سالا کٹی کھا گیا۔ ابھی تم اپن سے بات کرو، اکھا چالی اپن دیکھتا ہے۔ بولو کیا مانگتا ہے؟"

"وہ جیل کب گیا؟"

"ابھی بہت دن ہوا"۔ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "لمبا بات ہے، تیرے کو مطلب سے وہ آنکھ مالکے بولا۔ سالا ہے"۔

"تم گلابے کے کسی ساتھی کو جانتے ہو؟"۔ میں نے نرمی سے پوچھا۔

"ابھی گلابے کی بات چھوڑو! گلابے کا دھندا ایک دم خلاب ہو گیا۔ اس کا اکھا ساتھی ایک مچھلی ایدا اودر دن ٹوتھری ہو گیا۔ گلابا سالا جیرس کھانے لگا تھا۔ اودر اپنی ماں کے گھر میں کیا تگڑم لگاتا ہو گا۔ اپن سالا یہی سوچتا رہتا ہے"۔

میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے آکے بتایا کہ بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔ بیگم صاحب کے ذکر پہ میرے مخاطب نوجوان نے آنکھ کے دیکھا، ہونٹوں سے سیٹی بجائی لیکن چہرے نقاب اٹھا رکھی تھی۔ نوجوان نے ہونٹ سکوڑ لیے۔ میں نے چمپا کے پاس آکے گلابے کے بارے میں بتایا تو اس نے کچھ سوچ کے ایک اور شخص کا نام لیا۔ لڑکے کا، میں نے نوجوان سے لڑکے کا ذکر کیا۔ وہ لڑکے نہیں جانتا تھا۔ بمبئی بہت بڑا شہر تھا، ضروری نہیں کہ نا قابل ذکر لوگوں کے نام دوسرے علاقے کے لوگوں کو زبانی ہوں مگر بمبئی میں بہت سے لوگ ہیں جو گلابے کے ساتھیوں کو جانتے ہوں گے۔ میں نے پہلے ہی اس نوجوان کی ایک جھلک دیکھ کے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی، وہ خود ہی اڑے آگیا۔

ٹیکسی اندھیری کے علاقے میں کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ نوجوان نے سیٹیاں بجانے میں دو کا چانا مگر ڈرائیور نے ٹیکسی نہیں روکی۔ سمہ پہر تک ہم لوگوں کے مختلف طرح کی باتیں سنتے، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتے ایک اچھے خاصے حلیے میں کامیاب ہو گئے جو اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزار چکا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی کا ادھیڑ آدمی ایک شخص تھا۔ آواز میں گرج تھی، رنگ کبھی گورا ہو گا، سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے۔ اب تک کئی جگہ جگہ گرا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ہر جگہ کے لفنگے نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے۔ کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ جسے دیکھو طرم باز خاں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارے لوگ کھنڈے سے بات کر رہے ہوں۔ ایک لہجہ، ایک انداز۔ اعظم خاں ان میں ایک مختلف نظر آیا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ دودھ کی دکان کے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے ٹیکسی روکوائی تھی۔ چائے کا بہت اچھا ماہر نہیں معلوم ہوتا تھا کہ نسبت سے ڈھائی چمچے چائے ڈالیے تھے۔ اعظم نے مجھے اپنے برابر کے اسٹول پہ بٹھایا۔ میں نے اس کے سامنے گلابے اور لڑکے کا نام لیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ آنکھیں اس طرح بند کر لیں جیسے وظیفہ پڑھ رہا ہو۔ پھر کاندھوں کو تیزی سے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "کیوں بادشاہ، تمھیں ان سنتوں سے کیا کام پڑ گیا؟"

"مجھے اُن سے ایک صاحب کا پتہ پوچھنا ہے"۔

"کیسا پتہ؟"۔ وہ دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ "جاؤ خلیفہ گھر جاؤ۔ ابھی سیٹھ کے بات نظر آرہے ہیں"۔ پھر وہ پچکارنے لگا۔ "گلابے اور لڑکے یہ سالا گھر چھوڑ لیں گے"۔

"آپ ہی میری مدد نہیں کریں گے"۔ میں نے شکایت کی۔ "یہ بمبئی کے گلگے ہیں، اب تو یہاں کے نہیں معلوم ہوتے۔ مذاق مت سمجھیے مجھے بلکہ صاحب کا پتہ مل کا رہے گلابے یا لڑکے! اُن کا کوئی ساتھی اگر مل جائے تو میری مصیبت دور ہو سکتی ہے"۔

وہ ایک آنکھ بند کر کے مجھے سر سے پیر تک گھورنے لگا۔ گلابے اور لڑکے جن لوگوں کا پتہ جانتے ہیں ان سے مصیبت اور پریشانی ہے تمھیں کسی نے دھوکا دیا ہے۔ میاں جی! گلابے بہت دنوں سے جیل میں ہے، بولا سنا ہے ڈر کے پونا بھاگ گیا، اب پتہ نہیں کہاں ہے۔ بہت لوگوں نے فیل بھی مچایا تھا، اور تو گت کا کیا تھا، اس طرف اجری میں بھی ادھم مچا دیا تھا، سالے کام ہی نہیں جانتے تھے۔ بک گئے تھے بہت سو لوگ کو سمجھایا کہ کچھ خیال کرو، باز آجاؤ، غنڈہ گردی کو بند نام ہے کرو مگر کم ذاتوں نے اپنی مال بیچنا شروع کر دی تھیں۔ یہ بمبئی شہر ہی بدذات ہے۔ ہے یہ کیا بات تھی شاہ جہاں آباد کی قسم اللہ کی خلیفہ اُجڑے کے بھی اپنا ادا مرالا کا تھا"۔

میں نے ناگواری سے کہا۔ "آپ بھی کچھ نہیں جانتے۔ میری بات کا جواب دیجیے۔ آپ مجھے گلابے کے کسی ساتھی کا پتہ بتا سکتے ہیں یا نہیں"۔

وہ برہم ہو گیا۔ "خلیفہ! اعظم سے بات کرتا ہے تو تمیز کا بول۔ اعظم کو کسی چھوکرے کی یہ اکڑفوں بالکل پسند نہیں ہے"۔

"آپ تو ناراض ہو گئے۔ دیکھیے ہے میں کرنیں کھڑی ہے اور ایک زنانی اندر بیٹھی ہے۔ میں نے کون سی ایسی بری بات کہہ دی ہے جو آپ کو ناگوار گزر گئی"۔

"کہاں سے آئے ہو بچہ"۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔

"میرے سوال کا جواب دینا ہے تو دیجیے۔ میں جہنم سے آرہا ہوں"۔ پھر مجھے خیال آیا، میرا لہجہ سخت ہو گیا ہے۔ اگر سے آرہا ہوں تو میں نے کسی کے کہا کچھ اور پوچھا ہو تو ایک ساتھ پوچھ لیجیے۔ خیر و خیر"۔

"میاں خلیفہ!"۔ اعظم نے دکان پر بیٹھے لڑکے کو آواز دی۔ "ذرا انڈے کو بتانا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے"۔

"اے بھیا یہ اعظم دادا ہے"۔ دودھ والے نے مجھ سے خوشامد کی۔

"ہم بھی کسی وجہ سے یہاں رکے ہیں ورنہ آگے بڑھ جاتے"۔ میں نے ترش روئی سے کہا۔ "اعظم دادا سے تو بات کیجیے، مجھے یقین ہے آپ گلابے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، میں صبح سے تھک چکا ہوں، میری باتوں کا برا مت مانیے۔ مجھے جلد تخصص کر دیجیے"۔

"خلیفہ!"۔ "تیری زبان میں بڑا اثر ہے"۔ اعظم نے پھر دودھ والے کو مخاطب کیا۔ "لونڈے کی سمجھ میں بات آگئی ہے"۔ میں نے برداشت کر لیا۔ اعظم دادا نے بیڑی کا بنڈل نکال کے ایک دو کش لیے۔ اور باقی بیڑی زمین کے جوتے کے نیچے مسل دی۔ "ہاں کیا پوچھتا ہے؟"۔ میں نے پھر ساری بات دہرائی تو اعظم دادا نے ایک اور شخص نور حیاتی کا نام لیا۔ نور حیاتی منجھلے گیا ہے مگر بہت دنوں تک گلابے کے ساتھ رہتے میں رہا۔ یہ اعظم دادا ہی تھا جس نے اپنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، جس نے اس کا نشہ ہرن کیا"۔

"نور جانی! کہاں رہتا ہے؟"۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"سنا ہے آج کل محمد علی روڈ پر دھندا کر رہا ہے۔"

"کوئی خاص پتہ۔۔۔؟"

"اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں اپنا نور جانی کہ اس کا پتہ بتانا پڑے۔" اعظم دادا کا لہجہ بپھرنے لگا۔ "مگر خلیفہ جانے سے پہلے ایک بات مغز میں ڈال لو۔ چھوکرا بازی مت کرنا ہاتھ کا پکا ہے اس نے اپنی ٹھوڑی کے نشان پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک چھوٹا سا نشان اسی کی برکت ہے۔"

"لے لیے تو بہت سے نشان ہیں کس کس کو گنو گے دادا۔" میرے منہ سے نکل گیا۔ "معلوم ہوتا ہے ساری عمر نشان ہی گنوائے ہیں۔"

اعظم دادا کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس نے اشتعال میں مجھ پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے اسے اپنے منہ کے قریب رک لیا۔ اعظم دادا اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ یہ مقصد اس کے کسی قسم کی تلخی کا نہیں تھا لیکن اس کی باتیں سن کے میری زبان سے یہ غلطی ہو گئی مجھے ایسا لگا جیسے میرے پہلو میں بچھو بیٹھا ہوا مجھے سرزنش کر رہا ہو' اگر میں اس کا ہاتھ نہ روکتا تو وہ میرا جبڑا ضرور توڑ دیتا۔ میں نے اس کے ہاتھ سمیت جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اعظم دادا دودھ والے کے اسٹولوں سے الجھ کے گرتے گرتے بچا۔ اس نے چٹکا لگتے ہوئے مجھ پہ دوبارہ حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ چمپا نے تیکسی سے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اعظم دادا اپنا جھاری سر سریر سینے پہ مارنا چاہتا تھا۔ مجھے جیسے ہی یہ اندازہ ہوا میں نے ذرا بائیں جانب پینترا بدل کے اس کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے نیچے جھکا دیا۔ وہ دُہرا ہو گیا کیونکہ اب اس کے ہاتھ بھی کام نہیں کر سکتے تھے پھر مجھے چمپا بائی نے اک کھینچا تو اعظم کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ چمپا کو اس مرحلے پہ دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔ اعظم دادا غضب میں آگے بڑھا مگر چمپا درمیان میں آ گئی۔ اعظم نے اسے بیچ میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے ہاتھ چمپا کے بدن کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ چمپا کی چیخوں سے برہنہ میں آیا۔ اس عرصے میں بہت سے راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے دودھ والا بھی اٹھ کے آگیا تھا اور اعظم دادا کو روک رہا تھا۔ اعظم مغلظات بک رہا تھا۔ راہ گیروں نے درمیان میں پڑ کے مجھے اور چمپا کو تیکسی میں بیٹھا دیا۔

چمپا منع کرتی رہی مگر میں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ تیکسی کا رُخ محمد علی روڈ کی جانب موڑ لے۔ چمپا صبح سے تیکسی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی محمد علی روڈ کے علاقے میں سڑک کے دونوں جانب فلیٹوں پر مشتمل کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی تھیں سورج ڈھلنے کو تھا۔ سڑک پر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ چمپا نے مشورہ دیا کہ تیکسی چھوڑ کے پیدل نور جانی کو تلاش کیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ شاید یہ نام اس نے پہلے بھی سنا ہے لیکن نور جانی کا چہرہ اسے یاد نہیں تھا۔ پانچ سال قبل جب وہ فہمیدہ کو بمبئی سے لے گئی تھی تو گلابے اپنے دو ساتھیوں سمیت ہوٹل میں آیا تھا۔ ایک کا نام بولا تھا، ممکن ہے تیسرا شخص نور جانی ہو۔ ہمیں دو تین جگہ تیکسی رکوانی پڑی معلوم ہوا کہ نور جانی شام کو بلیک میں بیٹھتا ہے۔ اس مرتبہ چمپا بھی میرے ساتھ تیکسی سے اتر گئی تاکہ وہ میری لگام تھامے رکھے۔ اگر نور جانی وہی شخص تھا جو گلابے کے ساتھ چمپا سے ملا تھا تو بھی اسے پہچاننے کے لیے

چمپا کا میرے ساتھ ہونا ضروری تھا۔ چند قدم چل کے چمپا ٹھٹک کے رک گئی اور نقاب سرکا کے مجھے سرگوشی میں بولی۔ "سنو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس شخص سے پہلے مل چکی ہوں۔"

میں نے نظر اٹھا کے دیکھا' ایک بینچ پر مختصر چہرے اور لمبے قد کا ایک آدمی اکیلا بیٹھا تھا۔ نیچے سبزے پہ دو لڑکے بیٹھے ہوئے اس کے پیر دبا رہے تھے۔ میں چمپا کو کچھ فاصلے پہ ٹھہرا کے آگے بڑھا۔ کیا نور جانی تھی وہ؟ میں نے دبے دبے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس نے دونوں لڑکوں کو ٹانگیں مار کے دھکیلا اور سینہ تان کے کرخت لہجے میں بولا۔ "کون ہو؟"

"تمھی ہو؟" میری آواز میرے اختیار میں نہیں رہی۔

"کیا کام ہے؟" اس نے مجھے حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ضروری کام ہے۔"

"بولو" وہ چہرہ جھٹک کے بولا۔

"یہاں نہیں۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر ہی بات کرو۔" اس نے لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔

میری عقل خبط ہو گئی کہ میں اس کی آنکھیں نکالنے سے پہلے فہمیدہ کے بارے میں کیا بات کروں' میری الجھن دیکھ کے چمپا کھنکتی ہوئی آئی اور اس نے نقاب اٹھا دیا۔ "مجھے پہچانتے ہو نور جانی؟" نور جانی نے آنکھیں پٹ پٹا کے چمپا کی طرف دیکھا اور کچھ بوکھلا سا گیا۔ وہ بینچ سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ چمپا خود ہی نور جانی کی کشمکش دُور کر دی۔ "میں چمپا ہوں۔ گھور کیا رہے ہو؟"

"چمپا!" اس نے حیرانی سے چمپا کا نام دہرایا۔

"ہاں ہاں! اے نور جانی! کیا گھاس کھانے لگے ہو' چمپا بائی کو نہیں پہچانتے؟ تو پھر تم گلابے کو اور بُرے کو بھی کہاں پہچانتے ہو گے۔"

"چمپا بائی آ" نور جانی ابھی تک اسے پہچاننے کی کیفیت سے دوچار تھا۔

"اے سب کچھ بھول گئے؟ وہ لڑکی یاد نہیں ہے؟ وہ فہمیدہ۔۔۔۔"

نور جانی کو پھر بھی چمپا کو پہچاننے میں تامل ہوا مگر جب چمپا نے اسے ہوٹل گلابے' بُرے اور فہمیدہ کے متعلق کچھ اور اشارے دیے تو اس کا منہ کھل گیا۔ "چمپا بائی۔ تم ہندوں والی چمپا بائی ہو۔ اے تم تو بالکل بدل گئی ہو۔ میں تو بالکل نہیں پہچانا۔ میں نہیں تو اور کون پہچانے گا۔ کب آئی ہو؟ کہاں ٹھیری ہو؟" نور جانی کی آواز پہ ندامت اور مسرت چھائی ہوئی تھی۔

"اب کیا یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہو گے؟ کہیں بیٹھو گے بھی یا نہیں؟ اب کے بمبئی بہت بدل ہوئی ہے نور جانی! وہ بات نہیں رہی۔"

"نہیں نہیں چمپا بائی! بتاؤ کہاں ٹھیری ہو؟"

"وہیں جہاں تم گلابے کے ساتھ آئے تھے۔"

"اسی دادر کے ایرانی ہوٹل کے پیچھے میں؟"

"ہاں ہاں وہیں۔ اور کہاں ٹھیرتی۔"

"گلابے تو سالا بہت بگڑ گیا تھا۔ ایک ہاتھ بڑا اُٹھا پڑ گیا تھا سال سے زیادہ ہو گیا۔ اُدھر ہی ہوا کھا رہا ہے۔"

"چھوڑو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" چمپا نے زور ماری سے بولی۔

"مگر۔ مگر چمپا بائی! اپن نے وہ دھندا چھوڑ دیا۔ وہ بھی سالا گلابے کے کہنے میں کچھ وقت کے لیے مغز پھر گیا تھا۔ یہ دھندا اپن کو سچا نہیں چمپا بائی۔"

"وہ بات نہیں ہے۔" چمپا سرگوشی میں بولی۔

"پھر تو کوئی بھی کام بڑھتے لیے سر حاضر ہے۔"

"تو آج رات کو آجاؤ۔"

"ٹھیک ہے چمپا بائی!" نور جانی نے نیازمندی سے کہا۔ "اپن ضرور آئیں گا۔ کھوپڑی کے بل آئیں گا۔ ذرا پان وان تیار رکھنا' تمھارے ہاتھ کا بیڑا اب کھانا پڑے گا۔"

"انتظار کروں گی۔" چمپا نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا مگر چمپا مجھے کھینچتی ہوئی تیکسی تک لے آئی۔

"تم نے اسے ابھی ساتھ کیوں نہیں لے لیا؟" میں نے تنک کے کہا۔

"رات ہونے میں میری کتنی باقی ہے۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔

"ابھی نہیں۔" چمپا نے پہلی بار مجھے رُکھائی سے جواب دیا۔ میں خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ہوٹل واپس آ کے چمپا بستر پہ لیٹ گئی اور مجھے بھی لیٹنے کی اُس کی بات بھی مناسب ہی تھی' پھر اس نے کھانا منگوایا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مجھے بھوک لگی ہو گی۔ میں نے اس کے اصرار پہ ایک دو لقمے زہر مار کر لیے۔ میری نظریں دروازے پہ لگی ہوئی تھیں۔

رات کے نو بجے کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ تو مجھ سے اپنی بے چینی برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو نور جانی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ چمپا اس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اسے دروازے سے کرسی تک لائی۔ میرا جسم کانپنے لگا۔ میں نے اپنی گردن جبڑا سینے سے چپکائی۔

اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کر کے چمپا نے نور جانی کے آگے پھلوں کی پلیٹ اور چائے کا خوان بچا دیا۔ وہ بمبئی کے حالات پوچھتی رہی' پھر خاصی دیر بعد اپنے مطلب پہ آئی۔ "نور جانی! یاد ہے تمھیں وہ لڑکی فہمیدہ' پانچ سال پہلے گلابے جس کا سودا کیا تھا۔"

"کیوں یاد نہیں۔" نور جانی ہنستے ہوئے بولا۔ "مگر چمپا بائی! تم نے کوڑیوں کے مول سودا کیا تھا۔ گلابے بعد کو بہت پچھتایا تھا۔ کہتا تھا کہ چمپا بائی من مانے دام لگنے لگے گی اگر کچھ دیر اور رُک جاتا تو پانچ کے بجائے دس پندرہ ضرور ہاتھ لگتے۔ ویسے ایمان کی بات ہے چمپا بائی! چھوکری ایک دم نئی تھی۔ پرسن بڑا کنڈیشنڈ ڈبے میں بند تھی۔ ایک دم فسٹ کلاس۔"

چمپا نے اپنا ہاتھ رکھ کے میرا بازو دبایا۔ اس لڑکی نے نور جانی میں بہت پریشان کیا۔ بہت مندی نکلی۔"

"جانور کو بھی سدھارنا پڑتا ہے تب کھونٹے پہ آتا ہے چمپا بائی' تبھی تو گھگ اچھا ہو گا تو اتنی ہی قیمت زیادہ ہو گی۔ سدھی اُس کے نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔ اگر نچلی پچھلے ہیں بند ہو کے چھپر پھاڑ کے گاتو فوراً بعد کو تو وہ خوب چمکی ہو گی۔ سونا اگلا ہو گا سالا اُس نے تھا سے بے بسی میں بند بچا سوتی لے گئی تھیں۔"

"جانے دو مت ہی پوچھو کیسا کیسا ستایا اُس نے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے ہی تم نے دل ہڑ سے کیا لیے ہوں گے چھوکری ادھر آئی۔ اُدھر تمھارے ہاتھ میں چلی گئی۔ گلابے کا دل رکھ گیا تھا۔ کہتا تھا بس یار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اسے گھر میں بٹھالوں اور پرچا کرتا رہوں۔ وہ تو درمیان میں تم ٹپک پڑیں اور گلابے کے کانوں میں سکے کھنکھنانے لگے۔ مجھے بچکر آنے لگے۔ چمپا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"وہ لڑکی مر گئی نور جانی۔" چمپا بائی نے آہستگی سے کہا۔

"مر گئی!" نور جانی کی آواز بیٹھ گئی۔ "نہیں' چمپا بائی! مذاق مت کرو!"

"ہاں تو سے۔" چمپا اُداسی سے بولی۔ "وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

"ہائے۔" نور جانی کراہ سے بولا۔ "اسی لیے سالا اپن نے یہ دھندا چھوڑ دیا۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی چمپا بائی! گلابے بھی نہیں پنپا۔ سالے کو آہ لگ گئی۔ وہ لڑکی بہت معصوم تھی چمپا بائی۔ اپن کو پتہ نہیں سالوں نے کہاں سے اٹھایا تھا۔ ورنہ جی میں آئی تھی کہ چپکے سے اس کے گھر چھوڑ آؤں۔" نور جانی کی آواز ڈوبنے لگی۔

"کیا مطلب؟ یعنی نور جانی تمھیں معلوم نہیں تھا کہ گلابے نے اسے کہاں سے اٹھایا تھا' تم تو بات کرنے یہاں اُن کے ساتھ آئے تھے؟"

"وہ چھوکری بُرے نے اٹھائی تھی چمپا بائی! جب چھوکری اٹھ کے آگئی تب انھوں نے اپن کو بُلا کے دکھایا تھا۔ پانچ سو روپے اپن نے بھی خرچ کیے تھے۔ اپن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ چھوکری اٹھانے کا کام اپن سے نہیں ہو گا۔ پر بات ایک ہی تھی چھوکری اٹھ جانے کے بعد اُن لوگوں کا ساتھ دینا بھی منہ کالا کرنا تھا۔ اپن نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا چمپا بائی۔ تم نے اپن کو بہت بُری خبر سنائی۔"

"کیا بتاؤں نور جانی' اپنے دل میں بھی پھانس لگا گئی بڑے بڑے لوگ دھن کی پوٹلیاں لے کے آئے وہ تیار نہیں ہوئی۔" آخر ہی گئی۔ نور جانی!" چمپا نے میرا ہاتھ چھوڑ کے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔ "کسی عورت سے تم اس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہو؟"

"اپن کو کیا معلوم۔" نور جانی نے بایسکل سے کہا' پھر چونک کے بولا۔ "مگر چمپا بائی! تم کو اس کے گھر سے کیا غرض ہے۔ کیا اس گھر کی اور چھوکری کو نشانہ لگانے بیٹھی ہو۔ اپن تمھارا ساتھ نہیں دے گا' صاف مان کے

دیتا ہوں۔"

"نہیں نورجانی! ایسی بات نہیں کچھ اور بات ہے۔ تم مت کرو۔ بات یہ ہے کہ مرتے وقت فہمیدہ نے ایک وصیت کی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم ہوگا، میری عقل پہ بھی پتھر پڑ گئے تھے، ہڑبڑ دھڑبڑ میں نام پتہ نہیں پوچھ سکی کسی طرح اس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہو تو ایک بھلائی کر دو۔ میرے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ میں اس کے باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

نورجانی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اسے یقین دلایا کہ اس کی نیت صاف ہے۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہے کہ میں کوئے یا گلابے سے ملنے جیل جاؤں۔ ملاقے بتانے میں بیچ بچاؤ تو بہت کریں گے مگر کسی نہ کسی طرح پوچھنے کی کوشش کروں گا۔ دو تین دن انتظار کرو مجھ پہ بھائی!"

"میں انتظار کر لوں گی، میں خود جیل چلی جاتی مگر وہ مجھے آسانی سے نہیں بتائیں گے تم اُن کے ساتھ رہ چکے ہو، شاید لحاظ مروت کر لیں۔"

رات کے گیارہ بجنے تک نورجانی بیٹھا رہا۔ میں نے تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔ چمپا بار بار میری پشت پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دیتی اور ہمت کی تلقین کرتی تھی۔ چلتے وقت نورجانی کو خیال آیا تو اس نے میرے بارے میں پوچھا۔ چمپا نے غالباً کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ نورجانی نے پھر کچھ نہیں پوچھا، چمپا اسے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ دروازے کے باہر اس نے میرے بارے میں کچھ کہہ بتایا ہوگا۔ ممکن ہے کچھ خیال کر لیا ہو، نہیں بتایا ہوگا کہ میں ایک بے حیا آدمی ہوں۔

نورجانی کو رخصت کرنے کے بعد چمپا آ کے میرے سرہانے بیٹھ گئی۔ میں نے اپنا سر نہیں اٹھایا تو اس نے کچھ دیر بعد میرے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے میرے جسم میں ابال آنے لگا۔ میں نے خود کو بہت روکا۔ چمپا نے میرا سر گود میں لے لیا تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اس کی گود میں ہچکیاں لینے لگا۔ "نہیں بیٹے! روتے نہیں۔" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولی۔ اور خود پھوٹ پڑی۔ اس نے میرے پیروں پہ سر رکھ دیا اور میرے ہاتھوں سے اپنے گالوں پہ طمانچے لگانے لگی۔

صبح ہوتے ہی میں چمپا سے کچھ کہے بغیر ہوٹل سے نکل گیا۔ جیل کے دروازے پہ سنتری نے مجھے روک لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیل میں قیدیوں سے کس طرح ملاقات کی جاتی ہے۔ جب میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا اور کوئے یا گلابے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے جیل حجت سے کام لیا۔ "دو تین دن بعد آنا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہاری درخواست پر غور کر لیا جائے گا۔"

"مگر مجھے اس سے ابھی ملنا ہے۔" میں نے التجا کی۔

"تمہیں اجازت کا انتظار کرنا ہوگا۔" وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بڑا احسان ہوگا۔" میں نے اس کی منت کی۔ "مجھے واپس مت کیجیے، مجھے کوئے یا گلابے سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"تم سے جو کہہ دیا وہ تم نے نہیں سنا۔" وہ سختی سے بولا۔

"سن لیا جناب! مگر مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"چلو کل دس بجے آ جانا، جیل میں سختی ہو گئی ہے، قیدیوں سے ملنے کی درخواستوں پر جیلر صاحب خود غور کرتے ہیں سمجھے۔"

"پھر مجھے جیلر صاحب سے ملا دیجیے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"اور تم جو تم سے کہہ رہے ہیں جاؤ کل آنا۔" اس نے دھتکارنے کے انداز میں وہیں کھڑا رہا تو اس نے مجھے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ میں پھر بھی کھڑا رہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے توجہ نہیں دی۔ میں ہوٹل واپس ہو رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں راج کرشنا کا نام کوندا۔ میں پلٹ کے سپرنٹنڈنٹ کی میز پہ لپکا۔ میں نے اس سے ایک فون کرنے کی اجازت طلب کی۔

"کیسے فون کرو گے؟" وہ بگڑے تیوروں سے بولا۔

"میں راج کرشنا صاحب کو فون کرنا چاہتا ہوں، وہ ڈپٹی کمشنر پرکل ہی دلی سے بمبئی آئے ہیں، ویسے وہ مدراس کے بہت بڑے بزنس مین ہیں۔"

"راج کرشنا؟" وہ حیرت سے بولا۔ "تم انہیں کیسے جانتے ہو؟"

"آپ ان سے فون ملا دیجیے، وہ میری سفارش کر دیں گے۔" میں نے لجاجت میں کہا۔ "وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

وہ اٹھتے پہ ہاتھ رکھ کے سوچنے لگا، پھر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے فون نمبر پوچھا تو اس نے فون اپنی طرف کھینچا اور گھنٹی بجا کے سپاہی کو طلب کیا۔ سپاہی آیا تو اس نے کوئے یا گلابے کو کسی کو بلانے کا حکم دیا اور مجھے سپاہی کے ساتھ کر دیا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ وہ صرف کوئے کو بلا لائے۔

سلاخوں کے پیچھے جب بڑھی ہوئی داڑھی اور درمیانہ قد کا ایک تباہ حال شخص برآمد ہوا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "تم کوئے ہو؟" میں نے سلاخیں پکڑ کے بے قراری سے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے زمین پہ تھوک کے جواب دیا۔

"کوئے داد! میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں، چلے میری بات سن لینا، پھر جواب دینا۔"

"بات کرو۔" وہ برگشتگی سے بولا۔

"کوئے داد! دور سے آ رہا ہوں، مایوس مت لوٹانا۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "کون ہے تو؟"

"کوئے داد! ذرا غور سے سنو۔" میں نے دھیرے سے کہا۔ "آج سے پانچ سال پہلے تم نے ایک لڑکی کو جس کا نام فہمیدہ تھا، اغوا کیا تھا۔ اس کے باپ نے پانچ ہزار روپے میں چمپا بائی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ یہ سودا داور کے ہوٹل چوکر کے ہوٹل میں ہوا تھا۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، وہ ہکلانے لگا۔ میں نے اس کی چور آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ "ان نے کسی چھوکری کو اغوا نہیں کیا، تم کو کسی نے جھوٹ بکا ہے، ان کا چھوکری کے دھندے سے کوئی ناتا نہیں۔"

"کوئے داد! تمہارا انکار دے کا رہے وہ لڑکی مرچکی ہے، تم جیل میں ہو، پانچ سال درمیان میں گزر گئے ہیں، میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ میری کون تھی لیکن وہ مجھ سے اتنی قریب ضرور تھی کہ میں تمہارا خون کر سکتا تھا، میں اب بھی تمہارے جیل سے نکلنے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا، اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا، میں یہاں تم سے صرف اتنا معلوم کرنے آیا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے گھر کا پتہ بتا کے اپنی زندگی کی ایک نیکی ضرور کر دو، میں فہمیدہ کا خون معاف کر دوں گا۔"

"ان کچھ نہیں جانتا، کچھ نہیں جانتا۔" وہ بدزبان بکنے لگا۔

"تم سب کچھ جانتے ہو کوئے! میں تم سے کوئی بڑا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔ میری جیب میں چاقو ہے اور میں اتنا حوصلہ بھی رکھتا ہوں کہ فہمیدہ کے نام پہ تمہارے جسم میں بھونک دوں، تم کسی طرف بھی بھاگو گے، میرا نشانہ خطا نہیں ہوگا۔ تمہارا انکار بے سود ہے، میں سب کچھ جان کے ہی یہاں آیا ہوں، اس بات کو نظر انداز کرنے میں تمہارا کچھ نہیں جاتا۔ کوئے داد! کسی پہ ایک احسان بھی کر دینا کسی ضرورت مند کے بڑے کام آ جاتا ہے۔" اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ "وقت نکلا جا رہا ہے۔ کوئے داد! بتا دو، اپنی ماں اور بہن کے واسطے بتا دو۔ تمہارا کوئی خدا ہے تو اس کے نام پہ بتا دو۔"

کوئے نے منہ سے دانے اگلتے ہوئے سر اٹھایا تھا۔ خاصی دیر بعد اس کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔ "وہ گوکل بلڈنگ میں رہتی تھی اور اس بلڈنگ کے ایک فلیٹ سے ملے کبھی کبھی داؤ کے پارک میں جاتی تھی۔ ان بہت دنوں سے اس کا پیچھا کر رہے تھے سیٹھ ایک رات....."

"میں صرف پتہ پوچھ رہا ہوں کوئے!" میں نے وحشت سے کہا۔

"وہ گوکل بلڈنگ کے تیسرے مالے پر رہتی تھی، بھاٹیا ریسٹورنٹ کی پچھلی والی گلی میں یہ بلڈنگ ہے۔"

"اچھا وہ لڑکی جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے؟"

"وہ اسی بلڈنگ کی کھولی میں اکیلا رہتا تھا۔ پڑھتا تھا اور کہیں کام کرتا تھا مگر اس کے بعد ان نے اسے دادر میں نہیں دیکھا۔"

"لڑکے کا نام؟"

"اب کہ نہیں معلوم۔" پھر ان نے دادر ہی چھوڑ دیا۔"

میں نے سلاخیں چھوڑ دیں۔ کوئے کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، میرے قدموں میں مایوسی ہونے لگی۔ میں تیزی سے اٹھ کے چلا آیا۔ کوئے مجھے پکارتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں ٹیکسی میں بیٹھا ہوا تھا، ٹیکسی ڈرائیور نے بھاٹیا ریسٹورنٹ پر جب گاڑی روکی تو مجھے اپنی غیر ہوئی۔ یہ جانتا تھا میں پیچھے گئے میں اسے ڈے کے سڑک پر بے تحاشا بھاگنے لگا۔ بھاٹیا ریسٹورنٹ کے پیچھے والی گلی میں ایک بیراول دوڑ دوڑ کر سنے لگا۔ پچھر آنے لگا۔ بیر جواب دے گئے۔ سامنے گوکل بلڈنگ تھی۔ سانس قابو میں نہیں تھی، آنکھیں جلن ہو رہی تھی، اور ایسا لگتا تھا جیسے ابھی دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ گوکل بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے جگہ جگہ منحوسی سے بچ لیا۔ سامنے سیڑھیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اوپر جاؤں یا واپس ہو جاؤں۔ اگر جان پہچان والے مجھے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے ان کا سامنا کس طرح کروں گا۔ کیا کہوں گا۔ گرتا پڑتا تیسرے مالے پہ پہنچا تو اپنے سامنے دروازے تھے، یہ سوچتے ہوئے دیوانگی سی کہ ادھر تک دوں یا ادھر دستک دوں، ہمت کر کے ایک دروازے پہ آہستہ آہستہ ٹوکے مارے۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میرا حلق خشک ہو گیا لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "صفدر خاں یہیں رہتے ہیں؟"

"کون اس کو مانگتا ہے؟" بوڑھی عورت نے تشفقت سے کہا۔

"صفدر خاں، وہ ایک عمر رسیدہ آدمی ہے۔ مجھے بتایا ہے وہ گوکل بلڈنگ کے تیسرے مالے پر رہتے ہیں۔ کیا برابر والے فلیٹ میں تو نہیں رہتے؟"

"گوکل بلڈنگ، تیسرا مالا، ہاں ہاں، ادھر ہی ہے پر یہاں کوئی صفدر خاں نہیں، برابر فلیٹ میں لطیف بھائی رہتا ہے، یہ فلیٹ میں داؤد بھائی بینک والا رہتا ہے تم کیا ڈھونڈتا ہے، کیا مانگتا ہے؟"

"اوپر نیچے کی کسی منزل پر صفدر خاں نہیں رہتے۔" میری زبان میں لکنت آ گئی۔

"ادھر بلڈنگ میں آٹھ فلیٹ ہے، ہم کسی صفدر خاں کو نہیں جانتا۔"

"آپ لوگ کب سے رہتے ہیں؟"

"ہم کو چار سال کے لگ بھگ ہو گیا۔"

"چار سال پہلے اس فلیٹ میں کون صاحب رہتے تھے؟" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "آپ نے یہ فلیٹ کس سے لیا تھا؟"

"ہو سکتا ہے وہ صفدر خاں ہی ہو، ہے ہم کو مالگتا ہے، بڈھی عورت سر ہلا کے بولی۔ "تم ایسا کرو، نچلے مالے پر مولوی اکرم رہتا ہے وہ ادھر کا پرانا آدمی ہے، تم اس سے بات کر کے دیکھو۔"

میں ڈگمگاتے قدموں سے نیچے اترا۔ مولوی اکرم نماز پڑھنے کے لیے گئے ہوئے تھے، ان کی نوجوان لڑکی نے مجھے باہر کے مرغاڑے کے میں بٹھانا چاہا، میں نے نہیں بیٹھ گیا۔ یہ لڑکی صفدر احمد قریشی، لیلیٰ اور فارحہ کو جانتی ہوگی مگر پانچ سال گزر گئے جب تو یہ بہت چھوٹی ہوگی، پوچھ لگتے ہوئے زیادہ عمر اور نورانی چہرے کے مولوی اکرم جلدی واپس آئے۔ سلام کے بعد جب میں نے انھیں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگے۔ "پہلے تو مجھے یہ بتاؤ تم ان کے کون ہوتے ہو؟"

"میں اُن کا عزیز ہوتا ہوں۔" میں نے لگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"وہ تو چلے گئے میاں! اُن کو گئے ہوئے زمانہ ہو گیا۔" چیپ چپاتے فلیٹ کی چابیاں گھما میں نے گئے۔ میں ہر جمعرات کو شاہ صاحب کے مزار پہ جاتا ہوں رات گزار کے واپس آیا تو جیا میاں موجود تھیں اور گھر میں کوئی نہیں تھا، رات ہی رات تمام بچوں کو لے گئے، ضروری سامان کے سوا باقی تمام سامان بھی چھوڑ گئے۔ فلیٹ کو پگڑی پر بھی نہیں دیا۔ گھر آیا تو ایک پرچی اور تحریر نامہ۔ تحریر نامہ ہی اسے کہہ لو۔ رکھا تھا۔ میں نے ایک سال انتظار کیا، سامان ایک کمرے میں بند کر کے فلیٹ کو پگڑی پر اٹھا دیا، اُوپر داؤد بھائی رہتے ہیں، شریف آدمی ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ جب صفدر خاں واپس آئیں گے تو یہ اپنی دی ہوئی پگڑی واپس لے کے فلیٹ خالی کر دیں گے پگڑی کی رقم میرے پاس امانت رکھی ہے۔"

"وہ اچانک کیوں چلے گئے؟"

"بس چلے گئے، عبرت مند آدمی تھے۔ چلے گئے۔" مولوی اکرم اداسی سے بولے۔ "آئے بھی دیر نہیں ہوئی تھی کہ چلے گئے اور ظالم تبلکے بھی نہیں گئے۔ مجھ سے بھی نہیں کہا جس سے روز بات کرتے تھے۔ بلڈنگ میں ایک صرف میں تھا جس سے ملنا پسند کرتے تھے۔"

"وہ یہاں کیا کرتے تھے؟ آپ نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کے یہ بمبئی کیوں آ گئے تھے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کرتے تھے، دن بھر گھر میں رہتے تھے کبھی باہر نکلتے تو لائبریری جا کے بیٹھ جاتے تھے، موٹی موٹی کتابیں پڑھتے تھے اور وہ تھے۔"

"موٹی موٹی کتابیں؟ لائبریری۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انھیں مطالعے کا ایسا شوق تو نہیں تھا۔"

"کیا بتائیں میاں! بس کچھ مت پوچھو۔" مولوی اکرم رونما سے ہو گئے۔

"تہاسے میں بہت دور سے انھی کی تلاش میں آیا ہوں، آپ ان کے بارے میں جو کچھ جانتے ہوں خدا کے لیے ہر بات بتا دیجیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر آپ کون ہوتے ہیں اُن کے؟" مولوی اکرم نے تشویش سے پوچھا

"آپ اُن کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے اتنے مضطرب کیوں ہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ وہ میرے عزیز ہوتے ہیں۔ رشتے داروں سے کہے بغیر چلے آتے تھے۔ بڑی مشکل سے مجھے اُن کا پتہ چلا تو میں یہاں آیا ہوں۔"

"آپ ان کے کیا لگتے ہیں بھلا؟" مولوی اکرم نے کریدنی نظروں سے اِدھر اُدھر کی رشتے داری بتا کے اُنھیں ٹالنا چاہا۔ وہ مطمئن نہیں ہوئے اُن کے اطمینان کے بعد ہی ممکن تھا کہ وہ مجھے اپنے دوست کے بارے میں کچھ حالات بتاتیں۔ باتیں کرتے کرتے اچانک انھیں نہ جانے اس رازداری کا خیال کیوں آ گیا تھا۔

"اُن کے بچے تو سب ٹھیک تھے؟"

"ہاں سبھی ٹھیک تھے۔" مولوی اکرم آزردگی سے بولے۔ میں نے ایک ایک کا نام لے کے پوچھا تو وہ مجھے نظروں میں تولنے لگے۔ کہیں کہیں۔ وہ بوکھلا کے بولے۔ "تمھاری ناک اور آنکھیں اُن سے کتنی مشابہ ہیں۔ کہیں تم اُن کے بچھڑے ہوئے بیٹے یا بہار زماں تو نہیں ہو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

"میں وہ نہیں ہوں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

مولوی صاحب اداس ہو گئے۔ "تم چھپا رہے ہو۔ شیر میاں مجھ سے چھپانے سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ اپنے بیٹے بہار زماں کو بہت یاد کرتے تھے۔ میرا خیال ہے مجھے اب انھیں سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمھارے لیے کچھ خاشتہ پانی منگاتا ہوں۔" انھوں نے اپنی لڑکی ریحانہ کو آواز دے کے چائے وغیرہ کے لیے کہا۔ مولوی اکرم کے لہجے میں سرگرمی آ گئی تھی۔

"آپ کچھ بتا رہے تھے؟" میں نے انھیں ٹوکا۔

"ہاں! بتاتا تھا میاں، کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں، وہ چلے گئے تو اتنے دنوں بعد انھیں کوئی پوچھنے آیا ہے۔ صفدر اپنے ساتھ بہت سے دکھ لائے تھے۔ اُن کا بیٹا گھر سے جا چکا تھا۔ ان کی بیوی سرچکی تھی اور انھیں کچھ فکر نہیں تھی۔ دن بھر کمرے میں بند ہو کے کاغذات میں گھرے رہتے تھے، نہ گھر کا ہوش تھا نہ دنیا کی خبر۔ جو جمع پونجی بچی تھی اسی پر گزارا کر رہے تھے۔ بچے تیک تھے۔ یوں کہو انھیں نبھانے تھے اسی پر گزارا کر رہے تھے۔ بچے تیک تھے۔ یوں کہو انھیں نبھانے تھے۔ مگر اُن کے پاس کیسے کاغذات تھے، جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں ــــ؟"

"نہ جانے کہاں سے ردی کی دکان سے کچھ کرم خوردہ کاغذات لے آئے تھے، نامعلوم زبان میں ان پر آڑے ترچھے نشان بنے ہوئے تھے۔ جنھیں سمجھنے کے لیے وہ موٹی موٹی لغات استعمال کرتے تھے۔ صبح و شام بس ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ کاغذات سیاہ کرتے رہیں یہاں پہ چھکے رہیں۔ جیسے ان میں کوئی خزانہ چھپا ہو۔ پہلے تو میں سمجھا کیا بتاتے کا کوئی نسخہ اُن کے ہاتھ آ گیا ہے۔ بار بار پوچھتا تھا۔ "برادر عزیز کبھی باہر نکل کے دیکھا کرو۔ یہ کیا ہر وقت ان بوسیدہ کاغذ دل میں گھسے رہتے ہو۔" سنتے تھے اور مسکرا کے خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک دن میں نے اُن کے آگے سے کاغذات اُٹھا لیے۔ خاصے ناراض ہو گئے۔ میں نے انھیں جلد ہی واپس کر دیا۔ بعد کو میں نے احتیاط رکھی ہر ایک دن کچھ مزاج خوش گوار تھا، شاید کوئی نکتہ ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا جوش میں کہنے لگے۔ میاں مولوی اکرم! یہ خزانہ ہے، یہ کاغذات کی قدر میں ہی جانتا ہوں۔ ان میں دنیا بھر کی دولت چھپی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ ہٹائیے بھی صفدر میاں، آپ نے اپنی زندگی کے بیس ان کاغذوں کے پیچھے برباد کی ہوئی ہے۔ بچوں کو دیکھیے، فہمیدہ بڑی ہو گئی ہے اور فرخ بھی اب بہت سیانا ہو گیا ہے۔ ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ کچھ کام دھام کیجیے۔ باہر نکلیے، رشتے ایسے تھوڑی آ جائیں گے۔ کہتے تھے بس میں فارغ ہونے ہی والا ہوں۔ پھر رشتے گھر آیا کریں گے۔ تم دیکھنا میاں مولوی اکرم، میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ہم بمبئی چھوڑ دیں گے۔ ایک محل بنائیں گے۔ بہت بڑی زمینیں لیں گے۔ ہر طرف کھیت ہی کھیت اور باغات ہی باغات ہوں گے۔ گھوڑے، ہاتھی اور خدام کی فوج، جب سواری نکلا کرے گی تو لوگ سر جھکا لیا کریں گے۔ میں اُن کا دل رکھنے کے لیے ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ مجھے اُن پر بڑا ترس آتا تھا۔ دن بھر یہی حواب دیکھتے رہتے تھے۔"

"کیسے کاغذات تھے وہ؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"کسی کیڑے نے دیے ہوں گے۔ مومی کاغذ میں لپٹے ہوئے" میں نے انھیں بار بار دیکھا تھا۔ ایک ہی چیز مجھے ان میں صاف نظر آتی تھی اور وہ بھی مہاتما بدھ کی تصویر۔"

"مہاتما بدھ کی تصویر!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہی بدھ کا خاص بیٹھنے کا انداز، دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھے ہوئے، آنکھیں بند، چہرہ پُرسکون، دنیا کے ہر غم سے بے نیاز۔"

"کیا ان کاغذات کی رنگت زرد تھی اور وہ سنہرے رنگ کی عرفوں سے لکھے ہوئے تھے؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔

"ہاں! کچھ ایسا ہی تھا۔" صفدر خاں نے سیاہ روشنائی میں ان کی انکھیں تاریک تھیں۔ بس انھیں دنیا کی کوئی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ کاغذات تھے اور وہ تھے۔ پیسے ویسے کی طرف سے بے نیاز تھے۔ اچھا خاصا خرچ تھا یہ فلیٹ اس وقت انھوں نے پچیس ہزار روپے میں لیا تھا، اب زمانہ بڑھ گیا ہے۔ کیا تم ان کاغذات کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" انھوں نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

میں دم بخود تھا۔ ان کے سوال پر چونک گیا۔ "ہاں مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ میں نے یہ کاغذات ان کے گھر میں دیکھے تھے۔" میں نے جھک کر کہا۔

جھوٹ نہ ہوں، یہ وہی کاغذات تھے جو کورا بدھ گیا سے زائر بھتے وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ ان کے ساتھ میرے جواہرات کی ایک بالی بھی تھی۔

"اُس کے بعد ایک حادثہ پیش آیا۔" مولوی اکرم کی آنکھیں بھر آئیں۔ "بس اُس کے بعد وہ اکھڑ گئے، بات ہی نہیں کر پاتے تھے۔ بس گم سم پڑے رہتے تھے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ مولوی اکرم اب کیا کہنا چاہتے ہیں میں نے گردن جھکا لی۔ "اُن کی بڑی لڑکی فہمیدہ ایک رات گھر سے غائب ہو گئی۔" مولوی اکرم کے گلے میں آواز پھنس گئی۔ اور وہ ہم سب سے منہ چھپا کے چلے گئے۔" انھوں نے اپنے آنسو پونچھ کے کہا۔ "فہمیدہ بڑی سمجھدار بچی تھی، نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ نیچے کھولی میں رہنے والا ایک نوجوان صورت شکل سے تو شریف ہی معلوم ہوتا تھا۔ اوپر صفدر میاں کے پاس آتا جاتا تھا۔ فہمیدہ کے غائب ہونے کے بعد وہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ اللہ جانے کیا بیتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ کے خیال میں صفدر صاحب اب کہاں ہوں گے؟" میں نے حماقت کی بات پوچھی۔ مولوی اکرم نے اس سوال کا وہی جواب دیا جو انھیں دینا چاہیے تھا۔ مولوی اکرم آتا جاتا اور گھر کے حالات بتاتے رہے اور میں گنگ بیٹھا سنتا رہا۔ وہ اپنی آواز کا درد میرے کانوں میں منتقل کرتے رہے اور میں نے ایک آہ بھی نہیں بھری۔ رکھے رکھے چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر اُن کی بچی نے آواز دے کے بتایا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اٹھ کے چلنے لگا تو انھوں نے میرا دامن پکڑ لیا۔ بہت روکا، گلے لگایا۔ کہاں، کہاں جاؤ گے۔ مگر میں انھیں سلام کر کے چلا آیا۔

واپس آتے ہوئے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سر و چشم پر کوئی بوجھ تھا نہ سینے میں آگ لگ رہی تھی، ٹانگوں میں تھکن کا احساس تھا۔ جدھر منہ اٹھا اُدھر چلتا رہا، چلتا رہا۔ اسی طرح رات ہو گئی مگر میرے قدم نہیں رُکے۔ کسی جگہ ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ گالیاں دیں جھڑکیاں دیں، میں نے کچھ نہیں کہا تو اُس نے ملامت سے پوچھا۔ "کدھر رہتا ہے؟" میں نے پتہ نہیں کیا جواب دیا کہ وہ بری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ "بائیں چاقو! تلاشی! مجھے تھانے جانا ہوگا۔" میں نے کچھ نہیں کہا۔ مگر جب اُس نے میرا جسم ٹٹولا اور اُس کے ہاتھ مالا کے دانوں سے ٹکرائے تب مجھے ہوش آیا۔ وہ میری مالا آتا ہے ہی والا تھا کہ میں نے چیخ کے اُسے دور دھکیل دیا۔ اُس نے سیٹی بجائی۔ چاقو اور تلاشی اُس کے پاس رہ گئی۔ میں بھاگتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا اور راستوں راستوں ہوتا ہوا رانی جو کر کے ہوٹل پہنچ گیا۔

چھپا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں کمرے میں پہنچ کے اُس کے بازوؤں میں گر گیا پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو چھپا میرا سر اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھی اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ جھنجھوڑ رہی تھی پوچھ رہی تھی کہ میں کہاں غائب تھا۔ میری خاموشی سے گھبرا کے اُس نے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر نے میرے سوئیاں چبھو نکیں اور سُلا کے چلا گیا۔ میں شام تک بے سُدھ رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے گھبرا کے چھپا کو دیکھا۔ وہ ایک پہلو سے لگی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اطراف میں نظریں گھمائیں۔ "تم ابھی تک یہیں ہو؟" میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"میں کہاں جاؤں گی؟" وہ بلکتی ہوئی بولی۔

"تم واپس چلی جاؤ۔"

"کیسے چلی جاؤں؟"

"نہیں اب تم جاؤ۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی، مجھے معاف کردو۔ اب تمھاری ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔

"تم کہاں گئے تھے اور کیا پوچھے کے آئے ہو مجھے نہیں بتاؤ گے بالیقین تم جیل گئے ہوگے۔ کیا پتہ چلا؟" اُس نے میرا بازو زور سے تھام لیا۔

"کچھ نہیں، وہ لوگ اب وہاں نہیں ہیں۔"

"کیا معلوم ہوا۔ کچھ کہہ کے تو گئے ہوں گے۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ پھپا پر سکتہ طاری ہوگیا۔

"اب تم چلی جاؤ۔ میں تمھیں اسٹیشن چھوڑ آتا ہوں۔"

"اور تم....." وہ متوحش لہجے میں بولی۔

"میرا کیا ہے، میں بھی کہیں جا مروں گا۔"

"میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" اُس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "میں تمام گناہوں سے توبہ کرتی ہوں۔ میں اگر بے واپس نہیں جانا چاہتی۔ اب میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے اپنے گھر کے کسی کونے میں ڈال دینا۔"

"نہیں ۔۔۔نہیں، تم جاؤ۔" میں نے چیخ کے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی، میں تمھاری ماں تو نہیں بن سکتی، ہاں اپنی خادمہ سمجھ لینا، باندی سمجھ لینا۔ میرے آخری دن تو یہیں گزر جائیں گے۔"

"چھپا بائی! تو بہ کی زندگی تم میرے لیے کبھی بسر کر سکتی ہو۔ مجھے چھوڑو، تنگ مت کرو۔ میں کسی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔"

"پھر بھی میں اس حال میں تمھیں چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔ میری خطائیں معاف کردو۔ میں تمھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے میرے پاس گزر بسر کے لیے خاصی رقم جمع ہے، میں تم پر بار نہیں بنوں گی اور اگر تم کہو گے تو اپنی ساری دولت کو تمھارے سامنے آگ لگا دوں گی لیکن مجھے جانے مت دو۔ اُس جہنم میں مجھے مت لوٹاؤ۔"

"چھپا بائی! چلی جاؤ۔ تم نہ بھی اپنی زندگی بدل سکتی ہو، میرا کوئی بھروسا نہیں ہے، میں اگر زندہ رہا تو کبھی موتیا بائی سے تمھارا پتہ پوچھ کے ضرور تمھارے پاس آؤں گا۔"

چھپا بائی زار و قطار رو رہی تھی۔ میری جیب کے تمام پیسے سپاہی نے چھین لیے تھے۔ تھیلے میں تھوڑے سے پیسے تھے۔ میں نے ہوٹل کا بل ادا کرنا چاہا مگر چھپا بائی نے پہلے ہی ہوٹل والوں کو منع کر دیا تھا۔ ہم دونوں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور میں چھپا کو اگر لے جانے والی گاڑی میں سوار کرا آیا۔ وہ واپس جانے کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھی لیکن جب میں نے یہ کہا کہ میں کسی وقت بھی اُسے چھوڑ کے کہیں نکل جاؤں گا تو بڑی مشکل سے تیار ہوئی۔ چلتے وقت اس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا، میری جیب میں کچھ روپے ٹھونسے اور آنسوؤں سے میرا چہرہ بھگو دیا۔

اسٹیشن پر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کوئی دو گاڑیاں روانہ ہو رہی تھیں کوئی چلنے جانے والی میں ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کنڈکٹر ٹکٹ کے پیسے مانگنے آیا تو میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اُس نے مجھے گاڑی سے اتار دیا۔ میں پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اب کسی کو تلاش کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک رات زندگی کا دیا ٹمٹما بھی کوئی لے گیا۔ جو کپڑے تن پر تھے وہ ایک ہفتے میں خاک اور دھوئیں سے سیاہ ہوگئے۔ بکھرے ہوئے بال الجھ گئے۔ نہ جانے کتنے دن گزر گئے۔ سڑکوں پر گرنے والے آدمیوں کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ ہزاروں لڑکیاں ادھر سے اُدھر جاتی تھیں مگر اُن میں کوئی کوڑا نہیں تھی۔ مجھے نہ اُس کا چہرہ نظر آیا نہ مولوی صاحب کا۔ نہ آپا جان ملے اور نہ گھر کا کوئی اور فرد۔ میں رات کو کہیں بھی پڑ رہتا۔ دن بھی کسی نہ کسی طرح گزر جاتا۔ کئی بار دل میں آیا کہ نذریں انتظار کر رہی ہوگی۔ اُس کے پاس چلا جاؤں یا بھلّن کے پاس چلا جاؤں لیکن کسی کو بے آرام کرنے کے لیے کیا حاصل تھا۔ اپنے بیٹے کے بھلا ہی دیں گے۔ نذریں کے پاس جائداد تھی، بھلّن کے پاس چاقو تھا مگر وہ دونوں میرے لیے کوڑا اور آپا جان کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ اپنے لیے ہر جگہ یکساں ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی زمین ہے۔ صرف کبھی بھوک بہت ستاتی تو چھابڑی اُٹھا کے اِدھر کا رُخ اُدھر پہنچا دیتا اور پیٹ کی آگ بجھا لیتا۔ بدن پر اتنے چیتھڑے ضرور محفوظ تھے کہ میری ماں لوگوں کی نظروں سے چھپی رہے۔ دن گزر گئے۔

پھر ایک شام جب میں جوہو کے ساحل پر پڑا ہوا سمندر میں اُٹھنے والی لہریں دیکھ رہا تھا، مجھے کسی شخص کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کوئی پولیس والا ہوگا۔ یہ لوگ مجھے ایک جگہ سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ اسی طرح تنگ کرتے رہتے تھے۔ وہ پولیس والا بھی تھا مگر سادہ لباس میں۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا۔

میں نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

"جی بھائی! اپنا کام کرو۔"

راج کرشنا اکڑوں بیٹھ کے بہ غور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "ظہیر خاں! یہ میں ہوں راج کرشنا۔ میں تمھارا چہرہ کبھی بھول سکتا۔ میں اپنے محسن کا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں۔" اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا اور میرے دونوں بازو زور سے پکڑ لیے۔

"کون ظہیر خاں؟ کیوں تنگ کرتے ہو بھائی! جاؤ، ظہیر خاں کو کہیں جا کے ڈھونڈو۔" میں نے نقاہت سے کہا۔ "میرا نام ظہیر خاں نہیں ہے۔"

"وہ تو نہیں تھا ظہیر خاں! تم راج کرشنا بن گیا۔ تم ہی تو ہو یقیناً تم ہی ہو مگر تم نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا ہے میرے دوست! میں تمھاری تلاش میں تمام دادر میں مارا مارا پھرا۔ میرے مخبروں نے پتہ لگایا تھا کہ تم کسی ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہو لیکن تم ہوٹل چھوڑ چکے تھے۔ میں تمھاری طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ اُٹھو اُٹھو۔" اُس نے مجھے اُٹھانے کی کوشش کی۔

"میں وہ نہیں ہوں۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "تمھیں دھوکا ہوا ہے صاب! مجھے کہیں مت لے جاؤ۔ میں ہیں ٹھیک ہوں۔"

"اوہ نہیں۔" وہ کرب سے بولا۔ "تمھارے ساتھ ضرور کسی نے کوئی بہت بڑا دھوکا کیا ہے تم تو بہت بہادر ہو میرے دوست! بہادر بھی بھلا اس طرح زندگی سے گھبراتے ہیں؟ اُٹھو اُٹھو گھر چلو۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"اور میں تمھیں ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ سمجھے۔"

"نہیں۔" میں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے اور چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"تم بہت ناراض معلوم ہوتے ہو۔" وہ میری کمر تھپکنے لگا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آؤ ڈارلنگ! تم چاہے ناراض ہی رہنا اور کوئی بات مت کرنا مگر یہاں سے تو اُٹھو دیکھو کتنے لوگ میرے ساتھ ہیں یہ سب کیا کہیں گے۔ راج کرشنا گاؤ دوست اس حال میں ہو اور وہ اُسے چھوڑ جائے؟"

"میں تمھارا دوست نہیں ہوں۔" میں نے جھجکے کے کہا۔ "یہ خیال نہیں ہیں میرا کوئی ہم نہیں ہے میرا کوئی دوست نہیں ہے۔"

"اُوہ خدایا!" وہ نرمی سے بولا۔ "دیکھو، میں تمھیں زبردستی بھی لے جا سکتا ہوں۔" اُس نے میری کمر کے گرد حلقہ تنگ کر لیا۔ اُس کے ساتھی حیرت اور تعجب سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے۔

"تم اپنے اُن ساتھیوں کو راج کرشنا صاحب کی بات مان لینے۔" اُن میں سے کوئی بولا۔ راج کرشنا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

"گاڑی قریب لاؤ۔" راج کرشنا نے حکم دیا۔ ایک شخص فوراً سڑک کی جانب بھاگنے لگا۔ راج کرشنا اعلیٰ درجے کا لباس پہنے ہوئے تھا، میرے جسم پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے اور وہ بھی سیاہ ہو چکے تھے۔ کرشنا کی جھک کے میرے اردگرد میری کمر میں حمائل بنے ہوئے تھا اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ جتنا میرا انکار بڑھ رہا تھا، اتنا ہی کرشنا اور میرے برابر تیلی زمین پر بیٹھ گیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "ٹھیک ہے تمھیں چلنا تو ہم بھی یہیں بیٹھیں گے۔"

"مجھے چھوڑ دو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میری خطا معاف کر دو۔" کرشنا نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ راج کرشنا نہیں مانا۔ اُس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ اُس کے منتظر تھے۔ سب نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میرے دونوں بازو پکڑ کے مجھے زمین سے اُٹھا دیا۔ میں نے اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے، بہت چیخ پکار کی مگر ناچار گاڑی میں سوار کرنی پڑی۔ راج کرشنا نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ میری کوئی بات نہیں سنے گا۔ اِدھر میں نے مزاحمت ترک کی اُدھر راج کرشنا کے تمام رویے میں یکسر تبدیلی آ گئی۔ اُس کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ راج کرشنا نیز نیز قدموں سے گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ کار کا دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔ جو ہو پر بہت سے تماش بین سواری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے پچھلی نشست پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور راستے بھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں زور سے دبائے رہا۔

گھر ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں واقع ہوئی۔ راج کرشنا نے تمام ملازموں کو اکٹھا کر لیا اور کسی کو چائے کسی کو کھانے کسی کو کپڑے لانے اور کسی کو گرم پانی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اُس کے باقی تمام ساتھی راستے ہی میں رخصت ہو گئے تھے۔ وہ شاید دوسری گاڑی میں ہوں گے۔ میں مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ راج کرشنا میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ یہاں گر تم نے کسی قسم کا تکلف کیا تو اب میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا اور سنو، میں ایک پولیس افسر ضرور ہوں مگر اسے ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ یہاں تم ہر طرح آزاد ہو۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم کو آواز دے دینا۔" وہ میری گردن سہلانے لگا۔

میرے ہونٹوں کو چپ لگ گئی تھی۔ نہ جانے راج کرشنا کیا کیا کہتا رہا پھر ایک ملازم نے آ کے اطلاع دی کہ گرم پانی تیار ہے۔ راج کرشنا نے مجھے غسل خانے میں دھکا دے دیا۔ وہاں باس پہلے ہی تیار رکھا تھا۔ میں نے اپنے چیتھڑے کپڑے اُتارے تو میرے جسم پر صرف مالا دیکھ کے افتیار میری آنکھیں بہنے لگیں۔ میں غسل خانے کے فرش پر دیر تک بیٹھا آنکھوں سے لگائے روتا رہا۔ پھر جب بہت دیر ہو گئی تو راج کرشنا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے بمشکل کہہ کے اسے اپنے زندہ ہونے کی تسلی دلائی اور کپڑوں کی سیاہی جسم سے کھرچنے لگا اور خوب نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہن کے باہر نکلا۔ راج کرشنا بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گلے سے لپٹ گیا۔ "اب بتاؤ تم کون ہو؟ دیکھا ہم نے کیسا پہچانا۔" اُس کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔ میں نے ندامت سے نگاہیں اُوپر نہیں اٹھائیں۔ "فٹ دم سے پیسہ کمرے کی میز پر کھانوں کی سرپوش ڈشیں اور چھل لگے ہوئے تھے مگر میں کیا کرتا۔" جھک ہی اُڑی ہوئی تھی۔ صبح پینے کھانے کے میں ہو کی ریت پر پڑ گیا تھا۔ کل رات بھی کھایا تھا! نہیں یاد نہیں شاید۔ راج کرشنا نے سرپوش ہٹائے تو گرم کھانوں کی خوشبو میں نتھنے چیرنے لگیں۔ "کھاؤ۔" اُس نے میری پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول اور شوربا ڈال کے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اب کھاؤ۔" مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ راج کرشنا کتنا ہٹ دھرم آدمی ہے اس لیے میں نے کوئی حجت نہیں کی۔ چپ چاپ کھانا شروع کر دیا۔ یہ لذیذ کھانے بہت دنوں بعد پیٹ میں گئے تھے۔ اس لیے ایک لمحے کو تو مجھے چکر آ گیا۔ معدہ جلنے لگا بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں بہت بھوکا تھا۔ میرے ساتھ راج کرشنا بھی کھاتا رہا اور بار بار کھانا میری پلیٹ میں ڈالتا رہا۔

چلنے کے بعد راج کرشنا مجھے ڈرائنگ روم میں واپس لے آیا۔ کھانے کے دوران میں اُس نے میرے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ صرف اپنے بارے میں بتاتا رہا تھا کہ کس طرح اُس نے ریل میں اُس آدمی کے پیچھے سے جان لیوا حملہ کیا تھا۔ وہ اُس کے لیے مہم میں کامیابی کی کلید ثابت ہوا۔ اُس شخص نے راج

میں آکے اپنے تمام گروہ کا راز فاش کر دیا اور اس طرح بمبئی پولیس ایک ایسے گروہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی جو ایک عرصے سے اس کے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ اج کرشنا کو اسی گروہ کے لیے بمبئی بلایا گیا تھا۔ وہ گروہ ہیروئن مال کی اسمگلنگ تجارت میں ملوث تھا۔" اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ زندگی صرف تمھارے سبب سے ہے۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "بعد میں اس کیس میں کامیابی کی بنیاد پر مجھے یہیں روک لیا گیا۔ اس شہر میں اس قدر جرائم ہوتے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ بمبئی کے پولیس والے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں۔ دماغ تو کام ہی میں نہیں لاتے۔ آج بھی جو ہو رہا ہے میں ایک کیس کے سلسلے میں گیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اوہ میں نے تمھیں کس قدر تلاش کیا، نہ جانے تم کہاں چھپ گئے تھے اور ملے بھی تو کس حلیے میں ملے۔ وہ عورت کہاں ہے جو تمھارے ساتھ سفر میں تھی؟"

"وہ چلی گئی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"وہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

میری اکتاہٹ اس نے نظر انداز کر دی۔ "اور اس شخص کا کیا بنا جس کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے؟" اس نے کریدا۔

"وہ بھی نہیں..... نہیں ملا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"خیر سفر کے دوران میں کیں نے قیاساً اتنا تو جان لیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو اس عمر میں ایک نوجوان کو ہونا چاہیے۔ میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے شبہ ہے کہ جوانی نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تم مناسب سمجھو تو مجھے کچھ بتاؤ۔ اس طرح تمھارا بھی جی ہلکا ہو جائے گا اور اگر میں تمھارے کسی کام آسکتا ہوں تو میری طرف سے ہر خدمت حاضر ہے۔ تم میرے بارے میں جانتے ہو، میں پولیس کا ایک خاصا اور بڑا افسر ہوں۔ بمبئی میں میری حیثیت ایک ایڈوانزر کی ہے لیکن میں ان لوگوں پر بھروسا نہیں کرتا، اپنی اسکیموں پر خود عمل کرتا ہوں، جو میرے ساتھ تھے، سب کے سب بمبئی پولیس کے بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ تمھارے ساتھ اگر کسی نے زیادتی کی ہو تو مجھے بتاؤ۔ وہ شخص کہیں بھی ہو، میں اسے ہندوستان بھر میں تلاش کراؤں گا۔" وہ خود ہی سب کچھ کہتا گیا پھر اسے خیال آیا تو وہ جھینپ کے بولا۔ "میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا ہوں۔ ہاں تو تمھارے ساتھ کیا پیش آیا میرے دوست! کچھ بتاؤ؟" اس نے اشتیاق سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں، بس وہ مجھے نہیں ملا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اس کے چہرے پر الجھن عیاں ہوئی۔

"بہرحال تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کبھی کبھی آدمی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور کسی سے کچھ کہنا سننا نہیں چاہتا۔ اب یہ بتاؤ، تمھیں آرام کرنے کی خواہش ہے یا تمھیں بمبئی گھماؤں؟"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اب تم گرفتار ہو گئے۔ تم میری مرضی سے جاؤ گے اور سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے کسی معاملے میں حارج نہیں ہوں گا لیکن تم بغیر مجھ سے ملے، میں ایک بالکل تنہا آدمی ہوں، میری ماں مدراس میں رہتی ہیں۔ اگر یہاں بمبئی میں دیر ہو گئی تو میں انھیں بلا لوں گا۔ وہ تمھیں دیکھ کے بہت خوش ہوں گی کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے ان کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں اس وقت یہاں اکیلا ہوں، تمھیں کوئی ڈسٹرب نہیں ہوگا۔ میں تمھیں بالکل نہیں چھیڑوں گا، پھر تمھیں یہاں رہنے میں کیا عذر ہے۔ میری مانو، جانے کا ارادہ ملتوی کر دو۔" نہیں، نہیں، وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

میں نے سر ڈال دی۔ میری آمادگی دیکھ کے اج کرشنا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے سامنے شیونگ کا سامان رکھ دیا۔ وہ مجھے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسے میری اور اس کی برسوں سے شناسائی ہو۔ مجھے اس کے اس رویے سے شرم آنے لگی۔

میں نے شیو بنا لیا تو اس نے آئینہ میرے چہرے کے مقابل کر دیا۔ "اب ذرا اپنا چہرہ خوب غور سے دیکھ لو۔ پہچاننے کی کوشش کرو اور بتاؤ کہ کیا اتنے دل کش چہرے والے نوجوان کو زندگی سے اس قدر مایوس ہونا چاہیے؟ جمع میرے ساتھی تمھیں دیکھیں گے تو پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ کہیں گے کہ میں نے رات بھر میں کوئی جادو کر دیا ہے، وہ مجھے کوئی دیوتا سمجھیں گے۔" وہ شگفتگی سے بولا۔ "حلیہ ٹھیک تھا، یا تھا یا یہ؟"

"کرشنا بابو!" میں نے اپنی آواز سنبھالنے کی کوشش کی۔ "میرا حلیہ بنانے، اندر کا حلیہ نہیں بگاڑنا۔" میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ اندر تو شیشہ ہوتا ہے نہ غسل نہ لباس تبدیل کیا جاتا ہے نہ اس پر صابن لگتا ہے، نہ پاؤڈر۔

"وہ بھی ضرور سنبھلے گا۔" کرشنا پراُمید لہجے میں بولا۔ "وہ بھی سنبھلے گا لیکن دونوں حلیے ایک ساتھ غارت ہو جائیں تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہے بلکہ بُری بات ہے۔"

رات کو سونے کے لیے راج کرشنا نے اپنا شب خوابی کا لباس پہنا۔ اس کمرے میں ریڈیو بھی تھا اور گراموفون ریکارڈ بھی۔ کتابیں بھی تھیں اور رسالے بھی تھے۔ میں نے کوئی چیز نہیں چھوئی۔ پھر راج کرشنا اپنے کمرے میں چلا گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چپلا کے جانے کے بعد اب جا کے کہیں مجھے بستر نصیب ہوا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے سونا چاہی، آنکھیں بند کر لیں، راج کرشنا نے تھوڑی غذا میں کھلا کے اور نرم بستر دے کے مجھے پھر پہلے کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ چیزیں مجھے راس نہیں آئیں۔ صبح آٹھ کے راج کرشنا مجھے میرے جسم میں تنکے چبھوئے گا۔ کوئی آدمی کسی آدمی کو اس طرح قبول نہیں کرتا جیسا وہ نظر آتا ہے۔ اس کی اصلی کارکردگی کا شجرہ اس کا نام، عہدہ اور پتہ جاننے کی خواہ مخواہ فکر لگی رہتی ہے۔ کام کچھ نہیں ہوتا، اس کا نام اور پتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اسے پھر کام کے لیے یہ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے تو لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟

مگر صبح آٹھ کے اج کرشنا نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کے بازار لے گیا۔ بازار سے اس نے میرے ناپ کے بہتیرے جوڑے مل کے، خود بیلے۔ باقی تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ پھر اس نے میرے لیے جوتے، چپل اور دوسرا سامان خریدا۔ "آپ پیسے ضائع کر رہے ہیں۔" اس نے بیرے کے ہاتھ کی بوتل اور شیونگ کا سامان خریدا تو میں نے احتجاج کیا۔

"یہ تمھارے لیے نہیں ہے۔ سب کچھ ایک بالکل نئے آدمی کے لیے ہے جس کی صرف شکل و صورت اور قد و قیم تم سے ملتا جلتا ہے۔ وہ ہنس کے بولا۔ "تم نے سنا ہوگا کہ ہندوؤں میں آدمی مرکے دوسرا جنم لے لیتا ہے بس یہ سمجھ لو کہ تم نے بھی دوسرا جنم لیا ہے اور پچھلی کوئی بات تمھیں یاد ہی نہیں ہے۔"

"کرشنا بابو!..... مگر اس نے مجھے کچھ نہیں کہنے دیا۔ گھر کے اس نے مجھے اپنے سامنے نیا لباس پہنوایا اور دور کھڑا کر کے دیر تک مختلف زاویوں سے مجھے ناپتا تولتا رہا۔

"بالکل بمبئی کا بابو۔ اب تم دیکھنا، اندر کا حلیہ خود بخود تمھیں جلا جلا نفر آئے گا۔ لوگ بس اب آتے ہی ہوں گے۔ آج یہاں ایک بہت خاص میٹنگ ہونا ہے۔" میں تمھیں ان سے اپنے دوست کے بیٹے یا بھائی کی حیثیت سے لوائل گا دیں گے تم قطعاً آزاد ہو اگر کہیں جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمھارا انتظار کروں گا۔ مکان کا نمبر، فون کا نمبر اور پتہ نوٹ کر لو۔ یہ باندرہ بنے گا راستہ نہ ملے تو کسی بھی قریبی پولیس اسٹیشن سے راستہ پوچھ لینا۔"

میں کہاں جاتا؟ تمام راستے ایک جیسے تھے، تمام شہر ایک جیسے تھے۔ اج کرشنا سمجھ رہا تھا کہ اب میری طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی ہے لیکن طبیعت دوبارہ خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کل شام تک مجھے کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ اعصاب پھر چڑی اڑنے لگا۔ وہی آہٹوں پر چونک پڑنا، وہی اپنے آپ کر لپٹ لگنے کی خواہش۔ جسم پر کپڑے بھاری لگتے تھے اور آنکھوں میں انھیں کھولے رکھنے کی بڑی مشکل ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں اج کرشنا کے ساتھی آگئے۔ ان میں کچھ لوگ وہ تھے جنھوں نے کل رات مجھے جو ہوسے اٹھایا تھا۔ ان کی آنکھوں کو مجھے پہچاننے میں دیر لگی، پھر وہ حیرت سے کبھی اج کرشنا کو کبھی مجھے دیکھنے لگے۔ اج کرشنا پُراطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھے ان سے اپنے ایک مرحوم دوست کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ملوایا، سب نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کسی نے انگریزی میں اور کسی نے اردو میں میری خیریت پوچھی۔ میں نے سنبھل کر اج کرشنا سے انگریزی میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر سب لوگ ایک دوسرے کرسی میں بیٹھ گئے اور اج کرشنا نے میٹنگ شروع کرنے کی معذرت کر کے اندر چلا گیا تو میں کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا، پھر اٹھ کے بیٹھک سے باہر آگیا۔ نئے چہروں نے پھر کاٹنے میں مگن گیلوں، سڑکوں پر کاروں کی گزرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ نیلے ٹیکریں اور سفید قمیصیں پہنے بستے بغلوں میں دبائے ہوئے اسکول جا رہے تھے۔ میرے اندر نہ جانے کیا مایوسیاں تھی کہ کوئی راگوں نے مڑ مڑ کے اور گھور گھور کے مجھے دیکھا جیسے میرے ڈریسنگ سینس پر ہنسی ہوں۔ شاید میں انھیں کوئی نیا یا عجیب آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ یہ میری آنکھوں کی غلط بینی تھی مگر آگے جا کے کالج کی لڑکیوں کے ایک گروپ میں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے میری طرف متوجہ کیا، پھر کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔ مجھے ان پر سخت غصہ آیا۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا تو وہ سہم گئیں۔ لگا ہر شخص مجھے ایسے دیکھتا ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی ہوں۔ میں نے واپس کا ارادہ کیا اور گردن جھکائے ہوئے اج کرشنا کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔

درمیان میں میرے جی میں آئی کہ یہیں سے بھاگ نکلوں کیونکہ اس لائق ہی نہیں ہوں کہ انسانوں کے درمیان رہوں۔ میری وجہ سے راج کرشنا کو فضول تکلیف ہوگی۔ سان پڑھے لکھے لوگوں میں میری ایسی بدتمیزی بھی جھائیں گی اور آدمی اپنی ہمت سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اری توبات کرنے کو جی چاہتا ہی نہیں تھا۔ اچھا ہے کہ راج کرشنا کے آگے اور گھر سے دھکے دے کے نکالنے سے پہلے میں خود ہی اس گھر، اپنی خاک اور دھول کی بوری سے پاک کر دوں۔ ابھی موقع ہے راج کرشنا کا گھر دور ہے اور بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ راج کرشنا مجھے تلاش کرتے کرتے خود ہی تھک جائے گا اور پھر میں اسی شہر میں کیوں رہوں۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی ہے۔ میں بمبئی ہی چھوڑ دوں گا۔ میں نے راستہ بدل دیا لیکن کچھ دور پہنچ کے مجھے آگے نہیں چلا گیا۔ میرے جسم پر راج کرشنا کے خریدے ہوئے کپڑے تھے۔ صبح کس ذوق و شوق سے میرا لباس خریدنے کے لیے بازار گیا تھا۔ میں چلا جاؤں گا تو وہ بہت پریشان ہوگا اور اگر اس نے کہیں مجھے ڈھونڈ نکالا تو میں اس کے سامنے آنکھ بھی نہیں اٹھا سکوں گا۔ میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہوا واپسی کے راستے پر چل پڑا اور آخر دوپہر کو ہوا، راج کرشنا کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ مجھے راستے میں ملا۔ مجھے دیکھ کر ہوا کہ تم کہیں باہر کا راستہ نہ بھول گئے ہو۔" اس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اوہ لنچ پر تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ میٹنگ لمبی ہو گئی تھی اس لیے میں نے آن ہی روک دیا ہے۔ تم گھبرا گئے تو نہیں؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم ہجوم کے درمیان جیسی تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "سڑکوں پر بھی ہجوم ہی ہے۔"

"آدمی کو ہجوم میں رہنے کا عادی بننا چاہیے۔ انسان اس سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔"

گھر قریب ہی تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ مجھے چھری اور کانٹے سے کھانے کی تمیز نہیں تھی۔ پہلے میں نے ان لوگوں کو دیکھا اور صرف روٹیاں کھانے پر اکتفا کی۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں تھی البتہ اج کرشنا کی عزت کا خیال ضرور تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں اتنے بڑے افسر کا مہمان اس

بدلیقگی سے کہا کھانا ہے مگر راج کرشنا کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی، فکر ہوتی تو وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے مجھے پہچانتا ہی نہیں اور اس ہتک آمیز ادائی میں مجھے اپنے گھر لاتا ہی نہیں چنانچہ میں نے آزادی سے کھانا شروع کر دیا۔ شاید راج کرشنا نے میری عدم موجودگی میں ان سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی پرانی بات پوچھنے کی غلطی نہ کریں اس لیے ان سب کا برتاؤ بہت لحاظ و مروّت کا تھا پھر بھی مجھے اپنی جانب اٹھی ہوئی ان کی دلچسپ اور طرح طرح کی نظریں زہر لگ رہی تھیں۔ راج کرشنا غالباً یہ کہنا بھول گیا تھا کہ وہ مجھے ان آنکھوں سے بھی نہ دیکھیں۔

سہ پہر کو راج کرشنا اپنے کسی کام کے سلسلے میں گھر سے چلا گیا تو بنگلے کے ملازم میرے اطراف اس طرح منڈلانے لگے جیسے میں ہی ان کا مالک ہوں۔ وہ میری زبان سے کوئی حکم سننے کے منتظر تھے۔ نوعمر مجھ پر بطور خاص مہربان تھا اور راج کرشنا کی تعریف میں مرنے مٹنے جا رہا تھا کہ ایسا صاحب اسے پہلے کبھی نہیں ملا، وہ پہلے ملازموں کو کھلاتا ہے، پھر خود کھاتا ہے۔ بھگوان کرے وہ مستقل طور پر یہیں ہی میں رہے۔ مجھے کچھ ذرا کھلا تو مجھ سے نوازش انداز میں پوچھنے لگا "صاب! ایک بات بتاؤ۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے ادھر اُدھر تاک کے پوچھا "یہ اپنے صاب نے شادی کیوں نہیں بنائی؟"

"مجھے کیا معلوم۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ وہ ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اپنے لہجے کی سختی کا فوراً احساس ہوا میں نے نرمی سے کہا "یہ بات صاحب ہی سے پوچھنا۔"

اس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی اور وہ پوچھنے لگا "اور صاب آپ نے....؟ آپ کی شادی ہو گئی؟ بیگم صاب کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

بیگم صاحب! شادی! مجھے ہنسی آ گئی، وہ یہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔ میری ہنسی پر وہ بڑا حیران ہوا۔ "جا اپنا کام کر۔" میری تلخ آواز سے وہ گھبرا کے بھاگ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور بند کمرے میں کہ نہ جانے کس طرف سے اٹھی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا، وہ شکایتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی میں نے اپنا چہرہ بستر میں چھپا لیا پھر بہت دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پتہ نہیں کس وقت دبے قدموں سے راج کرشنا اندر آیا۔ وہ میری کمر آہستہ آہستہ تھپکیاں مار رہا تھا میں نے ہڑبڑا کے سر اٹھایا تو اس نے پیار سے مال آگے کر دیا میں اسی لیے یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا، کلکتے میں میں نے غزل کو بنگا کیا تھا، فیض آباد میں زرین جامو اور کنتن خاں کو اور یہاں کرشنا میرا نشانہ بن رہا تھا۔ آخر کرشنا کے اٹھانے سے پہلے میں خود ہی اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ کرشنا نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن اس کے ان کے سوال سیکڑوں کانوں کے پڑے پھاڑ رہے تھے "میرے دماغ میں مچھر ہے تھے کرشنا نے جب یہ کہا کہ وہ مجھے سیر کے لیے لے جانا چاہتا ہے تو میں نے انکار نہیں کیا، جسم دھلوں کپڑے بدل کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ مجھے بمبئی کی سڑکوں پر گھماتا رہا، ان میں سے بہت سی سڑکیں بہت سے فٹ پاتھ میرے جانے پہچانے تھے، کرشنا ایک طویل سفر کے دہانے کے علاقے میں آ گیا۔ اسی ریستوراں کے قریب جس کی پچھلی گلی میں راجا ان رہتے تھے اور جہاں اب صرف ان کا سامان ایک کوٹھری میں بند پڑا تھا۔ میں نے سوچا، راج کرشنا سے چند لمحوں کی اجازت لے کے مولوی اکرم کے پاس جاؤں اور ان سے کوٹھری کی چابی لے کے ابا جان کا سامان سمیٹوں، شاید کسی کی تصویر مل جائے تصویر بھی ملی تو وہ چیزیں تو ہوں گی جنہیں گھر کے لوگوں نے بار بار استعمال کیا ہوگا، ممکن ہے کوئی کام کی چیز مل جائے۔ پرانی کاپیاں کتابیں تو ہوں گی جن پر وہ سب لکھتے ہوں گے نگاہوں نے اس افراتفری میں بھلا کیا پڑھا لکھا ہوگا۔ آج یہاں کل جہاں آباد جان پر بھی کرایا کا اثر پڑا۔ نروہ اپنے سامان میں یہ کتابیں لاتی، منا ابا جان یوں دربدر مارے مارے پھرتے۔

کرشنا مجھے ایک بہت اچھے ریستوراں میں لے گیا۔ وہاں دھیمی دھیمی روشنی میں ہلکی انگریزی موسیقی تیر رہی تھی۔ سب مال دار لوگ سوٹ ٹائی لگا کے بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور مردوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں ایک طرف غیر ملکی موجود تھے۔ ریستوراں میں خاصی بھیڑ تھی، ہمارے داخل ہوتے ہی ایک باادب بیرے نے ہمیں ایک میز پر بٹھا دیا۔ یہاں بہت سکون تھا کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی تھی راج کرشنا نے مجھ سے سرگوشی میں پوچھا۔ "بھی لگ رہا ہو تو منگائیں اور کھائیں؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہے یہ جگہ بہت پرسکون ہے۔"

"کیا کھاؤ گے؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"کچھ کھانا کیا فروری ہے؟" میں نے تند ہے سے جواب دیا۔ سیاحوں میرے لیے بالکل نیا تھا۔ مجھے یہاں کے طور طریقے معلوم نہیں تھے ممکن ہے یہاں آنے کے بعد کھانا ضروری ہوتا ہو۔

"نہیں ہم یہاں کچھ پی بھی سکتے ہیں بھوک لگ رہی ہو تو کچھ منگائیں؟" وہ غیر رسمی انداز میں بولا۔ میں اس کے خیال سے خاموش ہی رہا کہ ہلکے سے انگلی کے اشارے سے منتظر بیرے کو قریب بلا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری میز طرح طرح کی چیزوں سے بھر گئی تھی لیکن میری نظریں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں ہر جگہ یہی ہوتا تھا ہر چہرے پر مجھے یہ گمان ہوتا جیسے وہاں مجھے مرلی صاحب یا کوئی ابا جان، امی گھر کا کوئی اور آدمی نظر آ جائے گا یہ کیا دیکھ رہے ہو؟" کرشنا نے اپنے لہجے کو تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔ "لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ اس شہر کا بہت مشہور ریسٹورنٹ ہے۔ یہاں تمام بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ اصل میں اس کی حیثیت ایک کلب جیسی ہے دولت میں اور اضافہ کرتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ دولت حسن کا سنگھار ہے۔ تم نے دیکھا ہر چہرے کا سامان ہے دولت کے بغیر حسن آدھا رہ جاتا ہے۔ تم نے دیکھا ہر چہرے کے بدن پہ قیمتی ساڑی ہے اور زیور بھی کچھ کم قیمت کا نہیں ہے۔"

زیور کے ذکر پہ مجھے فوراً اپنی مالا کا خیال آیا اور میرا ہاتھ خود بخود گریبان پر چلا گیا۔ مالا میری گردن میں موجود تھی۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ راج کرشنا کی باریک بین آنکھوں سے میرا یہ لمحاتی اضطراب چھپا نہ رہ سکا۔ میں کسی چور کی طرح اس سے نظریں چرانے لگا۔ "ان لوگوں کی دنیا مختلف ہے۔" کرشنا نے اپنی بات جاری رکھی "یہ غم کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ دکھ دور کرنے کے انھوں نے بہت سے علاج دریافت کر لیے ہیں سب سے بڑا علاج خود دولت ہے چنانچہ یہ دن بھر دولت کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور شام ہوتی ہے تو اسی دولت سے دکھوں کی دوا خریدتے ہیں۔ یہ ریستوراں بھی ایک شفاخانہ ہے۔ یہ میز ہسپتال کے بیڈ سمجھو یہ میرے ڈاکٹر اور یہ غذائیں دوائیں ہیں موسیقی غذا ہے۔ اچھا لباس پہننا گانا، ناچنا، سیر سپاٹا یہ سب دکھ کی دوائیں ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو پہلے دولت کا دامن پکڑنا چاہیے لیکن یہاں بہت سے لیے بھی ہیں جنہیں صرف دولت کمانا آتا ہے اسے خرچ کرنا نہیں آتا جس طرح بیمار کو اچھے ڈاکٹر کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح دولت کو اچھے متاثل کی ورنہ دولت بہت بڑا دکھ بن جاتی ہے۔ ناصور۔ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہو؟" اس نے تنک کے میری آنکھوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "آپ بہت اچھی باتیں کر رہے ہیں۔"

"اگر تم نے سننے کا یہی اشتیاق ظاہر کیا تو میں آئندہ اور اچھی باتیں کروں گا۔" وہ ہنس کے بولا۔ "باتیں اچھی باتیں ایک اسکول ایک کتاب کا درجہ رکھتی ہیں۔"

"جی ہاں....." میں نے مستعدی سے کہا لیکن ابھی میں نے اپنا جملہ بھی نہیں کیا تھا کہ گندمی رنگت کا ایک موٹا تازہ شخص اسی رنگ کی ایک دبلی پتلی چشمے والی عورت اور ادھیڑ عمر کی ایک نوجوان سرخ و سفید لڑکی کے ساتھ ہماری میز پر آیا۔ کرشنا نے اپنی نشست سے اٹھ کے اس سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ "تم بمبئی کے ایک معزز شخص معزز ترین اور ان کی بیٹی نورین رستم۔" کرشنا نے مجھ سے ان کا تعارف کرایا اور مجھے ان سے متعارف کرایا۔

رستم جی نے ملائم لہجے میں کرشنا سے پہلے مجھ سے میری خیریت پوچھی پھر میں نے وقت ضائع کیا۔ مجھ سے بارے میں کچھ بتانے لگے تھے کرشنا نے درمیان میں ہی دخل دے کے تمام باتیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور میری طرف سے بتانے لگا کہ میں ایک زمیں دار کا بیٹا ہوں میرا مرحوم بڑا بھائی ان کا ہم جماعت تھا۔ اس نے میرے سلسلے میں ادھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے موضوع ہی بدل دیا اور وہ سب کسی کلب کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ روز ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں اور کسی کی وجہ سے کلب بند ہے اس لیے ان کو بڑی دقت ہو رہی ہے۔ راج کرشنا کہتا تھا "وہ دنیا کے کسی دکھ میں گرفتار نہیں ہے۔ بات بات پر ہنسنے لگتے تھے جیسے ہنسی کے لیے تیار ہی بیٹھے ہوں۔ رستم جی کی بیوی مجھے چپ دیکھ کے حیران ہوئیں اور مہذب لہجے میں پوچھنے لگیں۔ "آپ کچھ بول نہیں رہے؟"

"جی۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "میں کیا بولوں؟"

"بیٹی میں سنتے ہیں۔" راج کرشنا نے پھر قریب سے کہا۔ "دیکھو مت سمجھے کہ انھیں برا نہیں آتا۔ جب باتوں پر آئیں گے تو سب کو ہرا دیں گے۔"

"آپ انھیں ہمارے ہاں لائیے۔" نورین رستم نے کہا۔ اس کی آواز نرگس کی آواز کی طرح بہت بھلی تھی۔ میرا خیال بنے آپ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔" اس نے اپنے باپ کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ رستم جی اور ان کی بیوی نے بھی اصرار کیا تو کرشنا نے اپنی مصروفیت کا عذر کر کے معذرت کر لی۔

"آپ ٹال رہے ہیں کرشنا جی!" نورین نے شوخی سے کہا۔

"کرشنا جی بہت مصروف آدمی ہیں نورین! تمہیں دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ ان کی آمد کے شہر میں بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے کرشنا جی تمام شخص کی زبان پر ہے تم ان کا وقت ضائع نہیں کرو گے انھیں ملنے ملانے والے تم سے زیادہ ضروری کام ہیں۔"

"مگر کرشنا جی تو ڈنر کلب آتے ہیں پاپا! کیوں نہ ہم کل کلب ہی میں اپنی طرف سے کرشنا جی کی دعوت کریں۔ ہم ان کو فیل کریں گے۔"

"کرشنا جی! یہ ایک بچی ہے اسے کچھ نہیں معلوم۔ رستم معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ اس کی باتیں محسوس مت کیجیے گا۔ وہ تمہیں دیکھ کر نورین سے کہا تھا۔ تم جان سکو کرشنا جی اس شہر کے لیے کتنی بڑی دولت ہیں۔"

"وہ نہیں۔" راج کرشنا نے لہجہ سے کہا۔ "میں ضرور آؤں گا۔"

"اور اکیلے نہیں۔" نورین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بھی جناب! آپ آئیں گے؟ آئیں گے نا؟" وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں۔" میں نے اس سے کہا۔ "ضرور آؤں گا۔" اس نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور مجھ سے اس قدر قریب ہو گئی کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "میں نے کبھی کھیت نہیں دیکھے۔ میں آپ سے کہنیوں اور کھلیانوں کے قصے سنوں گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بہت دنوں تک کسی گاؤں میں رہوں، شہر کا رُخ نہ کروں۔ وہ خواب آخر میں بولی۔ "آپ زمیں دار ہیں نا؟"

"جی۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں اسے کیا جواب دوں۔

اُس کے بال سنہرے دانت سفید چھوٹے چھوٹے اور نقش و نگار تیکھے تھے۔ باتوں میں شوخی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو دانتوں کے ساتھ موتیوں کا سا شیریں گوشت بھی ذرا سا نظر آجاتا تھا لیکن مجھے اُس کی بے تکان باتوں اور اس قدر قربت سے الجھن ہونے لگی۔ رستم ہی سے گفتگو کے دوران میں راج کرشنا بار بار میری طرف دیکھ لیتا تھا پھر اچانک اُس نے گھڑی دیکھی۔ اُس لمحے رستم ہی میرے اُٹھنے سے پہلے اُٹھ گئے۔ کرشنا نے انھیں مزید روکنا چاہا مگر رستم نہیں رکے۔ وہ تینوں دوست کی ایک میز پر جا کے بیٹھ گئے۔ نوین چلتے چلتے مجھے کہہ گیا کہ کرشنا کو ہمارا وعدہ یاد دلانا نہیں بھولوں۔

ریستوراں سے باہر آکے کرشنا نے کسی بچے کی طرح میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میں بھیڑ میں کہیں کھو جاؤں گا۔ بمبئی شہر روشنیوں سے جگ مگا رہا تھا۔ موٹریں، وکٹوریا ہر طرف شور مچا رہی تھیں۔ ہماری گاڑی پھر سڑکوں پر چکر کاٹنے لگی۔ مجھے یہ شہر نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ رات کے وقت کرشنا مجھے ساحل پر لے گیا۔ وہاں کی سیر سے ہم رات گئے گھر واپس پہنچے تو کرشنا کے چہرے سے تھکن صاف نظر آرہی تھی۔ اُس نے دو ایک فون کر کے بمبئی کے پولیس افسروں سے رابطہ قائم کیا دوسری طرف سے کی جانے والی باتیں تو میں سن نہیں سکا لیکن کرشنا کی ناراضی سے اندازہ ہوا کہ آج اُس کے ماتحتوں نے اُسے کوئی تسلی بخش روداد نہیں سنائی ہے اُس کے ماتھے پر بتدریج شکنیں پڑتی گئیں اور وہ فون ہی پر چیخنے چلانے لگا۔ "ایڈیٹ! یو آر آل فول"۔ اُس کے لہجے میں کسی قسم کی لچک نہیں تھی اور وہ اپنے مخاطب کو بہت تیز انگریزی میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ فون پٹخ کے وہ تقریباً ہانپنے لگا۔ میں نے اُس کے سامنے سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میری موجودگی اُس کے غصّے کے بہاؤ میں رکاوٹ بن سکتی تھی اور مجھے یہ خوف بھی محسوس ہوا کہ اب یہ مجھ پر غصّے ہو گا لیکن ہے یہ مجھے اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم دے دے لیکن میں نے جیسے ہی اُٹھ کے کمرے سے جانا چاہا اُس کی بدلی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی میرے جھجکتے ہوئے قدم رُک گئے۔ "کہاں چلے؟" میں نے اندر کمرے کی جانب نگاہ کی۔ وہ تاسف سے بولا "معاف کرنا مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ یہاں تم بھی بیٹھے ہو۔ بات یہ ہے ڈارلنگ کہ اس شہر میں سب گدھے بستے ہیں۔ پولیس کا آدھا کام ان نالائقوں کی وجہ سے اُلٹا ہو جاتا ہے۔ پولیس میں ایک آپریشن آدمی بھرتی کرنے چاہئیں۔ بہرحال چھوڑو۔ یہ بتاؤ کچھ حال وغیرہ ٹھیک ہے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

- بہت اچھا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"اچھا ہوا تم آگئے۔ میں بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔" وہ غنودہ لہجے میں بڑبڑایا۔ "میں تمھیں صاف صاف بتا دوں۔ ویل میں تم مجھے بہت اپنے لڑکے حالانکہ تمھارے بارے میں میری پہلی نظر کی رائے یکسر مختلف تھی۔ بعد میں وہ رائے بدلتی گئی اور اسٹیشن پر تم سے جدا ہونے کے بعد مجھے یہ ملال رہا کہ میں نے تمھیں جانے ہی کیوں دیا تھا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بہت پریشان تھے مجھے ایسی حالت میں تمھیں روکنا چاہیے تھا وہ عورت بھی تمھاری کوئی عزیزہ نہیں تھی مجھے اندیشہ تھا کہ تمھارے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے تمھارا لہجہ برہم تھا اور بمبئی میں قدم قدم پر میٹرھے تر مجھے آدمی بستے ہیں تم اگر کچھ بتانا نہیں چاہتے تو میں تم سے کچھ پوچھنے پر اصرار نہیں کروں گا لیکن ایک درخواست ہے کہ تم یہاں سے کہیں نہ جانا اور اگر گئے تو سمجھ لو مجھے عمر بھر افسوس رہے گا دوسری درخواست ہے کہ تم مجھ سے کسی قسم کی اجنبیت نہیں برتو گے سمجھے میں اس بات کی تکرار اس لیے کر رہا ہوں کہ یہاں تمھیں کوئی گھلنا ملنا محسوس ہو۔ اگر تم مجھ سے کسی فرمائش کا اظہار کرو گے اور مجھے اپنے دکھ درد میں شریک کرو گے تو مجھے خوشی ہو گی۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میرا مدعا ہے کہ تم جب تک خود نہیں کہو گے میں تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گا"

- کرشنا جی آپ میری آنکھوں سے بڑا شت نہیں ہوا۔" میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں میرا خیال ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو آپ مجھ سے عاجز آجائیں گے مگر آپ نے آج کچھ بھی نہیں کیا کہ میں نے ریستوراں میں آپ کے مخالفتوں کے سامنے چپ رہنے کے آپ کو کتنا شرمندہ کیا ہے میرے کانوں اور منہ میں جلن ہی نہیں ہے میں نہ کچھ سننا چاہتا ہوں نہ بولنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمھیں سُننے اور بولنے پر مجبور نہیں کروں گا خاموشی کے لیے یہ جگہ بہت مناسب ہے لیکن دوست! تم نے اس دُنیا کا مشاہدہ چالیس برس سے کیا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے ستائے ہوئے لوگ دیکھے ہیں جو ڈھے جاتے ہیں مگر پھر ہمت کرتے ہیں۔ میں تم پر ترس نہیں کھا رہا ہوں یہ مت سمجھنا کہ میں تمھیں بھیک دے رہا ہوں۔ میری تو یہ زندگی ہی تمھارے سہارے قائم رہی ہے سو میرے پاس جو کچھ بھی ہے اُس پر تمھارا حق ہے لیکن گھر کی ہر چیز تمھاری ہے۔"

"وہ محض ایک اتفاق تھا کرشنا جی! اس ذکر سے مجھے خفت ہوتی ہے۔ میں نے خاص آپ کے لیے بھلا کیا کیا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں یہی کرتا۔"

"مگر اُس جگہ کوئی اور نہیں تھا میں تھا تم مجبور نہیں تھے تم اُس دہشت خیز وقت میں آنکھیں میچے ہوئے لیٹے بھی رہ سکتے تھے لیکن تم نے اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔" آف وہ بہت تکلیف دہ منظر ہے لیکن اس واقعے سے پہلے ہی میری خواہش تھی کہ میں تمھاری کوئی مدد کروں تھا! یہاں آنا" یہاں رہنا اُس احسان کا معاوضہ نہیں ہے۔ اُس عظیم احسان کا معاوضہ تو میں ساری عمر ادا نہیں کر سکتا یہ کچھ اور بات ہے۔ ہاں کہو کہ تم نے میری باتیں توجہ سے سن لی ہیں اور تم مجھے مایوس نہیں کرو گے؟"

"کرشنا جی آپ میں آپ کو کیا بتاؤں۔" میں نے زور سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور خطرات سے کہا۔ "سمجھ نہیں گھلتا، موت بھی نہیں آتی مجھے اتنی بھدردی مت کیجیے میں بہت احسان فراموش ہوں ہے غیرت آدمی ہوں"

میں بہت بُرا ہوں بہت ذلیل ہوں" میری آواز بھرانے لگی۔

"اوہ آئی ایم سارری" وہ بے چینی سے میرے قریب آگیا "مائی ڈیئر میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم....." وہ شرمساری سے بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ بھی وہی کرنا جو اب تک کرتے آئے ہو بگڑ گیا کیا ہے؟ اَیں!"

"یہ ہی تو ہے کرشنا جی!" میری گھٹی گھٹی ہوئی آواز نکلی۔

"جانتے ہو تمھاری عمر کیا ہو گی؟ تم چوبیس سال سے کم کے نہیں ہو گے۔ پچیس سال کے آدمی کی آنکھ میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اُسے تو دنیا کو رُلانا چاہیے اُسے تو حالات سے پنجہ آزمائی کرنی چاہیے خیر کیا ہونا چاہیے کیا نہیں۔ اگر دُنیا کا راشتہ ہر آدمی سے کیساں ہو تو آدمی کے فرائض کا سوال بھی اُٹھے۔" وہ جھنجلا سا گیا۔ "میں تم سے کیا کہوں بس اتنا کہنا ہوں کہ یہ جگہ جو ہے کے ساحل اور فٹ پاتھوں سے بہتر ہے تم یہاں جس طرح چاہو رہو۔ مجھے اس مکان سے گھاٹے کے رہو۔ مجھے محض فٹ پاتھ سے گزرنے والا کوئی شخص سمجھ لو۔" وہ اُٹھ گیا۔ اُس نے مجھ سے کھانے کو پوچھا، میں نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں پہنچا کے چند لمحے ٹھہرا، پھر شب بخیر کہتا ہوا مجھے رخصت ہو گیا۔

راج کرشنا نے اپنی بات کا عملی ثبوت دیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تین روز گزر گئے تھے۔ ان تین دنوں میں وہ بہت مصروف رہا۔ گھر آتا تو مجھ سے مسئلے کا حال دریافت کرتا پھر کتابوں میں مصروف ہو جاتا یا فون کرتا یا کسی بڑے افسر سے رازدارانہ باتیں کرتا یا خفیہ میٹنگیں ہوتیں میں اُس کی عدم موجودگی میں ہانڈے سے دُور نکل جاتا۔ راج کرشنا نے میرے کوٹ میں چند روپے ڈال دیے تھے میں دن بھر یوں ہی گھومتا رہتا۔ مولوی اکرم کے گھر کے نیچے سے میں کئی بار گزرا اور سیڑھیوں تک گیا مگر وہاں سے لوٹ آیا۔ کیا فائدہ پہنچیں لوگوں کا بدل تو نہیں ہو سکتیں۔ چوتھے دن دوپہر کو میں جلد ہی گھر واپس آگیا۔ سٹرانگ روم میں ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ میں داخل ہوا تو کمرے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ راج کرشنا اپنی نشست چھوڑ کے کھڑا ہو گیا میرے پاس آیا۔ "آج جلدی آگئے؟ کیا حال ہے؟"

"آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا اور سب کو باری باری سلام کیا صرف دو ایک روز میں ان میں سے بہت سے افسروں سے میری صاحب سلامت ہو گئی تھی۔

"ہاں ہم ایک بہت سنگین مسئلے پر بات کر رہے ہیں اگر تم نے کھانا نہیں کھایا ہو تو کھانا منگوا لیں کچھ دیر لگے گی۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"آپ کا انتظار کر لوں گا۔" میں نے نیچی نظروں سے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ڈرائنگ روم کی آوازیں اندر آرہی تھیں۔ وہ اچانک تیز ہوتی تھیں راج کرشنا کی آواز سب سے اونچی تھی وہ شدت سے کسی نکتے پر اصرار کر رہا تھا۔ میں نے ان کی آوازیں سمجھ نہ آنے کی کوشش کی لیکن یکلخت جیسے کچھ ایسی بات نہیں تھی کہ آدمی اُسے سُن کے کسی اور طرف متوجہ ہو جائے

وہ راج کرشنا سے متعلق بات تھی۔ اُس کے ماتحت افسر اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے اور مشورے دے رہے تھے کہ اُسے براہِ راست مداخلت نہیں کرنا چاہیے شاید راج کرشنا نے اُن کی بات مان لی میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔

وہ لوگ چلے گئے تو راج کرشنا میرے پاس آگیا۔ اُس کے ہاتھ پر سوئیں پڑی ہوئی تھیں میں نے گزشتہ تین روز میں اُسے اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا اُس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ میں اپنی باتیں اُسے کب بتاتا تھا پھر بھی میں نے دبی زبان میں اُس سے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ ہلکے پھلکے پرانی سے بولا۔ "کہتے ہیں کہ یہ بمبئی ہے۔"

"لیکن بمبئی ہے تو کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ بہت بڑے ہوئے لوگ ہیں۔ اونہہ" وہ پھر کچھ خیال آیا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے وہی پرانے قصّے ہیں۔ انھیں چھوڑو تم اپنی سناؤ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے چہرے پر پہلے سے زیادہ رونق ہے خوشی ہوئی۔"

"یہ آپ ہی کی دی ہوئی رونق ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دن بھر خیال پکڑ رہتا ہوں مجھے بھی تو کوئی کام بتائیے۔"

وہ اچھل پڑا۔ اُس کے گال تمتمانے لگے۔ "کام! اس دُنیا میں کام کی کیا کمی ہے لیکن تمھیں پیسہ کمانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام صرف لینے کے لیے کرنا چاہیے۔ پیسے تو میں خوب کما رہا ہوں ٹھیک ٹھاک حالات ہیں۔ پھر بھی اگر واقعی سنجیدہ ہو تو میں تمھیں بہت سے کام بتا سکتا ہوں۔"

"بہت سے کام نہیں مجھے تو آپ اپنا کوئی کام بتائیے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"اگر تم نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو میں آج سے سوچنا شروع کر دوں گا۔ آج اس خوشی میں ہم شام کو پھر سیر کریں گے۔ اس شہر میں ایک سے ایک تماشا دیکھنے جلد ہے۔ دُنیا ہر طرح دیکھنی چاہیے۔"

شام ہونے میں کچھ دیر نہیں تھی مگر راج کرشنا ایک فون آنے سے اچانک مکدر ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے معذرت کی اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کے کہیں روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اُس نے یہ عذر کر دیا تھا کہ وہ ایک بہت اہم میٹنگ میں جا رہا ہے۔ فون کی تمام گفتگو میں نے سُنی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر یوں ہی خاموش بیٹھا رہا، پھر میں نے کوٹ اُتارا، پتلون کی جگہ رات کے سوئے پاجامہ پہنا اور اُس کے ساتھ قمیص پہن کے بنگلے سے باہر آگیا، دروازے پر کھڑا ہوا ایک رکشا ہی مجھے اس جیسے میں دیکھ کے چیں بجبیں ہوا۔ میں ایک بس میں بیٹھ کے بائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا اور سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ یہاں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اس لیے میں لبستہ ایک گنجان علاقے میں آگیا۔ ایک چھوٹے سے چائے کے اسٹال پر میں نے چائے پی اور سفید خانہ سی پان کا ایک بیڑا منہ میں رکھا اور کمر پر ایک ہاتھ ٹکا کے کھڑا ہو گیا۔ ابھی مجھے

اس طرح کھڑے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دم بہت سی نظریں مجھے اپنے اطراف منڈلاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یہ بہت کم بالوں والا ایک نوجوان تھا جو قریب آیا اور اوپر سے نیچے تک میرے حسب کا اندازہ لینے لگا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی عمل کیا اور اس کے سینے پر کرختگی سے ہاتھ مار کے اسے خود سے دور کیا۔ وہ گرنے لگا مگر گرتے گرتے سنبھل گیا اور فوراً مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر پڑا ہوا تھا۔ لمبی لمبی راہ گیر اکٹھے ہونے میں دقت نہیں لگتا اور پھر ایسے شخص کے لیے جس کا چہرا اس علاقے میں اتنا سا ہو۔ چائے کے اسٹال اور پان والا دونوں اپنے تھڑے سے اٹھ کے اس کی مدد کو دوڑے۔ ادھر سے ایک تنومند ادھیڑ عمر شخص تیزی سے نوجوان کی طرف بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "کیا ہوا ماسٹر تارا! یہ سالا تم فٹ ہاتھ پر کیا ڈانس کر رہا ہے؟"

"ابھی ہم بتاتا ہے۔" ماسٹر تارا نے آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے غصے سے کہا اور کسی تاخیر کے بغیر دوبارہ مجھ پر لپکا۔ میں نہ صرف اس کا بلکہ اس کے ساتھیوں کا بھی منتظر تھا مگر وہ نہ جانے کیوں دیر کر رہے تھے۔ ماسٹر تارا نے تیسری بار پینترا بدل کے میری ٹانگ میں اپنی ٹانگ اڑا کے مجھے گرانے کی کوشش کی مگر وہ غضب میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ موقع و محل بھول گیا۔ یہ موقع اس داؤ کا نہیں تھا۔ اس کے لیے دونوں فریقوں کے درمیان فاصلہ کم ہونا چاہیے۔ میں نے کچھ پیچھے ہٹ کے اپنے دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ وہ میرے ہاتھوں پر آیا اور اب کے میں نے اسے سر کے بل زمین پر ٹرخ دیا۔ ماسٹر تارا کے سر میں گہری چوٹ آئی ہوگی۔ اس بار اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ بائیں سے اٹھا نہیں جا سکا۔ مجمع خاصا بڑھ گیا تھا اور ماسٹر تارا کے گرتے ہی لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے پکڑنا چاہا۔ کچھ ماسٹر تارا کا حال دیکھنے کے لیے اس پر جھک گئے۔ میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کو دور رہنے کی تنبیہ کی۔

"ابے او ہٹو!" ایک دوسرا شخص مجمع چیرتا ہوا تیزی سے میری طرف آیا۔ وہ پہلے شخص سے ماسٹر تارا کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے آتا فاتا میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ "اے چل۔" اس نے ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑے دوسرے ہاتھ سے مکا تان لیا اور مجھے گھسیٹتا ہوا گرجنے لگا۔ "اے چل۔" میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے اس کا پہلا مکا اپنے گال پر برداشت کر لیا لیکن دوسرے مکے سے پہلے میں دونوں اطراف اس کی کمر مضبوطی کے ساتھ پکڑ چکا تھا اور میری انگلیاں اس کی کھال میں پیوست ہو چکی تھیں۔ یہ صورت دیکھ کے وہ گڑبڑا گیا اور اس کا دور سر مکا فضا ہی میں معلق رہ گیا کیونکہ اب وہ اپنی کمر کی رہائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ سانس اندر دبا کے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے زمین سے چند انچ اوپر اٹھایا مگر اس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ذرا سی نظر کی غلطی ہو گئی تھی۔ اس کا وزن میری توقع سے زیادہ نکلا۔ میں نے اس کی کمر فوراً چھوڑ دی اور صرف ایک ثانیے کی سرعت میں اس کے دونوں کانوں پر ہتھیلیاں ماریں۔ وہ بلبلا اٹھا پھر جیسے ہی اس نے میرے بال چھوڑے میں نے اس کی گردن پر ٹیڑھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب بے حد کارگر ثابت ہوئی کردہ ایک چیخ مار کے پیچھے ہٹا اور کسی شخص سے جا ٹکرایا۔ پھر کسی اور آدمی کو میرے نزدیک آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ایک کانسٹیبل بھی سیٹی بجاتا ہوا ادھر آ نکلا تھا اس لیے مجمع منتشر ہونے لگا۔ پنواڑی کو کے دوبارہ دکان پر چلا گیا اور چائے کے اسٹال والا اپنے اسٹال کی طرف بھاگا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔

کانسٹیبل نے ماسٹر تارا کی گردن پکڑ لی۔ "ابے او طارا! خیر مناؤ تم پھر ایدر سنوری کرتا پھرتا ہے؟ بہت سختی ہو گئی ہے پھوکرا! ابھی تمہارا بہت خراب ہے بابا! بھاگ جاؤ۔ وہ سالا ایدر ہی راؤنڈ مپہ ہے۔" کانسٹیبل تیزی سے بولا۔

ماسٹر تارا ابھی مجھے گھور رہا تھا اور وہ شخص بھی جس کی گردن پر میں نے ضرب لگائی تھی لیکن انھوں نے کانسٹیبل کے لیے میری جانب کئی اضافہ نہیں کیا البتہ کانسٹیبل نے خود ان کی نگاہیں تاڑ لیں۔ وہ میری طرف پلٹ پڑا اور مجھے دھکا دے کے چند قدم پیچھے ہٹا دیا۔ میں نے اس سے کوئی شکی مول لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ گیا تو میں دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا اور چائے کے اسٹال پر جا کے میں نے چائے کا آرڈر دیا۔ ایک منٹ سے زیادہ نہیں گزرا تھا کہ میرے سامنے پیالی رکھ دی گئی۔ پورا اسٹال خالی ہو چکا تھا۔ اس گلی نما لمبی دکان میں ایک لمبی بنچ اور اس کے سامنے ایک لمبی میز رکھی ہوئی تھی۔ ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ حلق سے اتارا تھا کہ دو لوگ اور ان کے مزید دو ساتھی میرے سر پر آ گئے۔ "ابھی اپن تم کو دباؤ ایدر نہیں دیکھے، ہم بولے دیتا ہے ہاں۔" ایک شخص نے مجھے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ اس کے گلے میں میلا مفلر لٹکا ہوا تھا۔

"کیا تم مجھ سے بول رہے ہو؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"اور کس سے بولتا ہے۔ ابھی تم ایدر سے جاؤ۔ علاقے کا یہ حصہ استاد مستانہ نے ماسٹر تارا کو دیا ہے۔ تم سالا کس نشے میں ہے۔ یہ بائی کتا ہے یہاں آدمی تڑی دکھاتا ہے تو اس کا کھوپڑی پھیر دیا جاتا ہے۔"

"یہ علاقہ اب میرا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اے!" وہ اچھل کے بولا۔ "سالا تم کیا پاگل ہے ایک دم؟" پھر اس نے مصنوعی تفکر لگا کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم نے سنا یہ بولدا کی جگہ کیا کرتا ہے۔"

"میں ادھر سے نہیں جاؤں گا۔ میں دل سے آ گے کیا یہاں خالی پھروں گا؟ ماسٹر تارا! اٹھ لے اندر دم ہو تو نکال کے دکھا دے نہیں ادھر سے ورنہ ہاتھ جوڑ بھاؤ اب اس ادھر ہی بیٹھوں گا۔" میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"تم ایدر کیسے بیٹھے گا؟" ماسٹر تارا کا ترجمان شعلہ بار آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میں کہتا ہوں تم سالا بہت چربا پن کر رہا ہے ابھی اپن نرمی گرمی سے سمجھتا ہے۔ بعد کو تم مکل جائیں گا۔ تم سالا بہت پچھتائیں گا۔"

"دیکھ لیں گے۔" میں بھی کچھ سمجھ کے ہی ادھر بیٹھا ہوں۔ تم کیسے آدمی ہو۔ آدمی نہیں پہچانتے؟" اسے نظر انداز کر کے میں نے چائے والے کو پکارا۔ "اے چائے والا سیٹھ! کل ادھر کے تمام لوگوں سے کہہ دو کہ اب ہم کو بھتا نہ چکائیں۔ استاد مستانہ آئے گا تو میں خود بات کروں گا۔ کیا انھیں کچھ اور سننا ہے؟"

ان چاروں نے یکے بعد دیگرے مجھے دھمکیاں دیں۔ استاد مستانے کی شخصیت سے خوف زدہ کرنا چاہا مگر میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بات بڑھی تو یہی کسی کے منہ پہ توڑ دوں گا مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ مجھے اس وقت چاقو کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن مجبوری تھی سب کچھ چھن گیا تھا۔ صرف میں باقی رہ گیا تھا۔ ماسٹر تارا اور اس کے ساتھی ڈھیٹ پنے سے میرے سر پر کھڑے رہے۔ وہ معمول دیہے کے لوگ تھے اس لیے مجھے ان کی طرف سے خطرہ نہ تھا۔ وہ کوئی بھی اوچھا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اور کچھ تو نہیں ہوتا مگر بھل کتا تھا کہ اوچھا ہاتھ ڈالنے والے کو اس کا خمیازہ بری طرح بھگتنا پڑتا ہے اور اسے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ہمیشہ کے لیے جسم پر داغ پڑ جاتا ہے اور جو اپنے حلے کو ہمیشہ ملال رہتا ہے کہ اسے ایک نااہل آدمی کو ایسا جواب دینا پڑا۔ اس نے پہلے ہی مرحلے پر انھیں اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی کہ یہ سمجھ کے بات آگے بڑھائیں۔ بھل نے ایک بات اور کہی تھی کہ ہاتھ پاؤں کی بہ نسبت آدمی کی آنکھ کا پھر نیلا ہونا چاہیے۔ آنکھ ایک کھلا ایک خورد بین کی حیثیت رکھتی ہے اگر اس میں مقابل کو پڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ان میں سے ایک نے بھنا کے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اس کے ساتھی نے اسے جھڑک کے باز رہنے دیا۔ اسٹال کی لمبی میز کو کئی چھوٹی چھوٹی میزوں سے ملا کے ایک بڑی میز کی شکل دی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی نچلی سطح پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ پیالے کو بھی نچلی نظروں سے بار بار چھت دیکھتا تھا۔ "ابا! ابے بھائی! ایدر کا کیا کرتا ہے؟" اس نے عاجزی سے کہا۔ "ابھی سالا ادھر صبح صبح نہ جانے کدھر دیکھا تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں سر جھٹکنے لگا۔

"تم لوگ ادھر وقت خراب کر رہے ہو۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "تمہارے سے کوئی نہیں اٹھ سکتا اور سن لو اگر اب تم نے کوئی حرکت کی تو بہت برا ہوگا۔"

"اپن تم سے سمجھیں گا۔" سالا ایدر کرش کا ٹائم ہے ورنہ اپن تم کو بتاتا کہ اپن کون ہے۔ تمہارا سارا ہیکڑی دیکھ لیتا اور تم کو بائی کتا میں بات رکھنے کے قابل نہیں رکھتا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بھل کو بھی جواب نہیں دیا۔ ایک اور بنا رسی پان بنانے کے لیے کہا۔ "ابھی تم اس سے پیدا ہوا ہے تو ایدر ہی بیٹھا رہنا۔ اپن واپس آتا ہے۔"

"تم جاتے ہی کیوں ہو۔" میں نے زہر خند جواب دیا۔

"اپن بتائیں گا کہ اپن کیوں جاتا ہے۔ ایدر منتا ہو گیں گا تو ہی منہ بنائیں گا۔ استاد مستانہ نے ہاتھ باؤں باندھ لو کے بن پھوکرا! بم پھوکرا! بم جاؤ جاؤ۔" میں نے دھتکارنے کے انداز میں کہا۔

وہ چند لمحے ٹھیرے پھر گرجتے برستے گالیاں دیتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اسٹال والا میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور بغیر میاں سے فوراً بھاگ جانے کے مشورے دینے لگا۔ وہ استاد مستانہ کے قہر و غضب کا ذکر بہت خوف زدہ انداز میں کر رہا تھا۔ پان والے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ دونوں اصرار کرنے لگے کہ اگر مجھے اپنی جان عزیز ہے تو ایک لمحے کی بھی دیر نہ کروں بس میں بیٹھیں اور بائی کتا کا علاقہ فوراً چھوڑ دوں میں نے ان کی مخلصانہ تجویز شکریہ کے ساتھ رد کر دی۔ آخر پان والے نے میرے سر پر کھڑے رہنے کے بجائے وہاں سے نہیں ہلا۔ "استاد مستانہ بہت بڑا پاوا ہے تم بھی ساتھ رکھتا ہے۔" ادھر اس کے سب لڑکے گھومتے پھرتے ہیں اور وہ خود ان کی نگرانی کرتا ہے۔" ہر بات ٹھیک تھی مگر مجھے زندگی کی ایسی کون سی فکر تھی۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ اس درمیان چائے کے اسٹال پر بہت سے لوگ چائے پینے کے لیے آئے اور اپنے اپنے راستے پر لگ گئے۔ ماسٹر تارا کسی کو ہدایت دے گیا تھا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے۔ ایک شخص کو میں نے کئی بار چائے کے اسٹال کے نزدیک پھیرے کرتے ہوئے دیکھا پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ماسٹر تارا کے ساتھ سات آٹھ آدمیوں کا ایک گروہ اسٹال پر آیا۔ وہ سب خاص قسم کے لوگ تھے۔ ان کے چہروں پر درشت یکسانیت کے چھٹے نشانات نمایاں تھے۔ آنکھوں میں سرخیاں پک رہی تھیں۔ ان کے درمیان سانولے رنگ گٹھے ہوئے جسم اور اوسط قد کا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط لگتا ہوتا تھا اور وہی شخص تھا جس کی آنکھوں میں شعلوں کے بجائے شعلوں کی چمک تھی۔ ہونٹوں کا ایک کنارہ مسکراہٹ میں دور تک کھنچ جاتا تھا۔ بال بے اور بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی پر چاقو کا ایک ترچھا نشان تھا۔ ایسا ہی ایک نشان پیشانی پر بھی تھا۔ کان کی ایک لو کٹی ہوئی تھی۔ گلے میں زنجیر کے ساتھ گنڈے اور گلاب کے پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ گلا ایک ہری چنر یا سے ڈھکا ہوا تھا۔ بڑے کے تلوے سینے پر بالوں کی دو چوٹیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ وہ استاد مستانے کے سوا کوئی اور

جنبش ہوئی، بھویں تھرتھرائیں۔ اب ایک آن کے لیے کیا پائے، پھر اُس کی نیلی آنکھوں کا نشہ بڑھ گیا۔ وہ دھوپ کے رُخ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح چمکنے لگیں۔ اُس نے اُن پر پلکوں کا آدھا غلاف چڑھا لیا، یعنی بازو آنکھیں کچھ ادا اثر انگیز ہوئیں وہ مجھے کسی اتنا دے زیادہ جادو گر معلوم ہوا۔ اُس کے ساتھی پَرے تو لے کھڑے تھے۔ اُس کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ میں نے نیز مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ضرورت کے وقت برچھ آدھی کر کے اس سے چاقو کا کام لوں گا۔ چائے والا سیٹھ اشتمال سے باہر آ گیا تھا۔

متانے نے اپنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ایک شخص کو ابرو کا اشارہ کیا۔ وہ قد و قامت میں میرے برابر ہوگا، عمر میں مجھ سے زیادہ تھا، اُس کے اعضا میں لچک نہیں تھی، چہرہ بھی بے رحمی کا غماز تھا۔ صرف ایک لمحے میں وہ میرے روبرو موجود تھا۔ میں نے میز ایک طرف دھکیل دی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اپنے ساتھیوں کی طرف اچھال دیا کیونکہ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے بھی برچھ پھینک دی اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کا اور میرا فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس نے اپنا اُٹھا ہاتھ تیزی سے اٹھایا تاکہ میرے کاندھے پر ضرب لگانے کے پہلے ہی وار میں مجھے زمین پر بٹھا دے۔ میں اُس کی ضرب کمزور کرنے کے لیے خود ہی نیچے جھک گیا چنانچہ جب اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر پڑا تو اُس میں اتنا زور نہیں تھا، جتنے زور کی توقع میں اُس نے اُسے اٹھایا تھا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ میں نے پیچھے جھک کے گویا ایک طرح کو فاصی انداز اختیار کر لیا ہے لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اُوپر سے میرے کندھے پر ضرب لگائے اور میں نیچے جھک کے اُس کی بغل پر ضرب لگاؤں۔ بغل کی ضرب سے بہت سے لوگ اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ یہی ہوا جب بالکل غیر متوقع طور پر میں نے زمین سے اچک کر اُس کی بغل نشانہ بنائی تو وہ گھبرا کر اُٹھا اور اُچھل کے ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ قدم پیچھے کرنے کی مہلت میں اگر عملاً نہ کیا جائے تو فریق کو سنبھلنے کا زیادہ بہتر موقع مل جاتا ہے۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں اُس کے ساتھ ہی آگے بڑھا اور میں نے اُس کا وار اُسی پر آزمایا، البتہ فرق یہ تھا کہ وہ صرف کندھے پر ضرب لگا کے مجھے جھکانا چاہتا تھا، میں نے اُس کی گردن کے جوڑ پر ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑاہٹ میں اوندھے سیدھے ہاتھ چلانے لگا۔ جو چھلتے ہوئے میرے سر اور پسلیوں میں لگے۔ بچنے نصیحت کی تھی کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے سے بہتر ہے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں کھائے جائیں اور ایسے نشانے کی تاک میں رہا جائے کہ جہاں ضرب لگانی مقصود ہو وہاں سے مقابل کا ہاتھ فاصلے پر ہو۔ وہ کہتا تھا کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے والا دیر تک محاط نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ مقابل کا آدمی جان بوجھ کے اُس کے حملے برداشت کر رہا ہو اور مناسب موقع کی تاک میں ہو ورنہ معاملہ اُلٹا ہو جاتا ہے۔ آدھی لڑائی تو نفس اختیاط اور کوشش سے جیتی جاتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں مکمل طور پر اپنی ذات کے حلقے میں رہنا چاہیے اور مقابل کو اپنی آنکھ کے حصار میں رکھنا چاہیے۔ میں اِدھر اُدھر پنجے سے بدل بدل کے اُس کی ضربیں ناکام کرتا رہا۔ پھر بھی اُس کی ضربیں پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوئی تھیں کہ آخر مجھے ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ میرا بھرا ہوا پنجہ اُس کی ناک پہ پڑا۔ اُس نے تلملا کے برق رفتاری کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اب اُس کی یہی خواہش ہونی چاہیے تھی کہ وہ جوابی حملے کے کسی حصے پہ خون کی یکبیر اُبھارے جیسی اُس کے چہرے پہ اُبھر آئی تھی۔ اپنا خون دیکھ کے آدمی پریشانی طاری ہو جاتی ہے۔ اُس کے گردن پکڑنے کی دیر تھی۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا سر اُس کی کھوپڑی کے نچلے حصے پر مارا۔ اُس کے گھٹنے آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں گے۔ ایک بلند کراہ کے ساتھ ہی اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے کسی توقف کے بغیر اُس کے پیٹ میں رکابی مار کے پنجے تو اپنی گردن آزاد کرائی اور اُسے پھر سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

اگرچہ میں نوشہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر اُس کی کھوپڑی سیدھے سر کے بجائے موتیا باغی کے صندوق سے چکنا چور ہوئی تھی وہ ضرب اس ضرب سے زیادہ شدید تھی۔ مارشر فرش پر بیٹھنے لگا تھا۔ یہاں متانہ کے آدمی کی کھوپڑی مخدوش ہو جانے کے باوجود مجھے پے در پے ضربیں لگانی پڑیں تب کہیں اُس کے حواس بجا طور پر باختہ ہوئے۔ وہ گرنے لگا۔ نوشہ کے مقابلے میں یہ شخص ہر پہلو سے دگنا تھا، داؤ پیچ بھی اچھے خاصے جانتا تھا، متانے کی وجہ سے یہاں پھر بھی زیادہ اکھاڑ نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے آدمیوں نے بیچ بچاؤ تھی نہیں کی۔ نئے دنگل اشتمال کی کئی میزیں ٹوٹ گئیں۔ پانی کا حلقہ بھی لوٹ گیا۔ تقریباً سارا اشتمال چند منٹوں میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ شخص ابھی تک اکھڑے سیدھے ہاتھ چلا رہا تھا اس لیے اچانک متانہ کے اشارے پر اُس کے دو آدمی اُسے بازوؤں سے پکڑ کے اپنی جانب کھینچنے لگے۔ میری لاج رہ گئی نصیب میاں ہوتے رہتے کیا برجستہ اور بے ساختہ وار تھے۔ جب میں نے میز میں کاٹتے کرتے ایا تھا تو وہاں میرا ایک وار فی الدیہہ وار سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہاں متانہ کے سامنے بھی اتنی ہی جلدی اور تیزی سے فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ اُس کا آدمی باگی ہو جانا تھا اور اپنے ساتھیوں کے قبضے سے آزاد ہو کے دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا مگر انھوں نے اُسے پٹخ کر تمام لڑکے رکھا اور اشتمال والے کی میلی توریا سے اُس کا خون آلود چہرہ صاف کرنا شروع کر دیا مگر خون نہیں تھما تو اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور اُسے کلیاں کرائی جانے لگیں۔ پانی اُس کے منہ سے سرخ ہو کے واپس آتا رہا۔

متانہ کی آنکھوں کی نیلی چمک گہری ہو گئی تھی اور اب اُس کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے تھے۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرف متوجہ نہیں تھا مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا، پھر وہ آہستہ قدموں سے میرے بائیں جانب آیا۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک نعرہ لگا کے بے تحاشا دیوانہ وار بائیں بازو کو بوسہ دیا اور اپنے گلے سے چنگھاڑ اتار کے میرے گلے میں ڈال دی۔

☆

وہ جگہ گراؤنڈ فلور کے تین چار فلیٹوں پر مشتمل تھی جہاں متانہ اپنے آدمیوں کی معیت میں مجھے لے گیا۔ مجھے اُس نے چوکی پر اپنے برابر کی جگہ دی پھر لڈوؤں کا ایک تشت آ گیا۔ لڈوؤں پر پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک بڑی موم بتی جل رہی تھی۔ ایک بڑا گلاس اور دودھ کی بالٹی بھی پاس ہی رکھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے دودھ کا بھرا ہوا گلاس مجھے پینے کے لیے دیا۔ ابھی میں نے صرف ایک گھونٹ لیا تھا کہ اُس نے گلاس مجھ سے واپس لے لیا۔ پھر وہ گلاس باری باری تمام لوگوں میں گھوما رہا اور سب اُس سے ایک ایک گھونٹ پیتے رہے۔ ساتھ ہی دو دو لڈو تقسیم کیے جانے لگے۔ متانہ مگرمیٹھ کے بجائے کسی لگا رہا تھا۔ وہ بات کم کرتا تھا اشارے زیادہ کرتا تھا۔ "تالسے" ایک دفعہ اُس کی آواز گونجی۔ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تالسے! کاشی! باٹلی! دودھ پی لیا؟"

"پی لیا" وہ تینوں مُرجھائی ہوئی آوازوں میں بولے۔

"پی لیا؟" متانہ نے اپنی کھنک دار آواز میں دوبارہ پوچھا۔

"پی لیا استاد" اس بار تینوں بیک وقت بولے۔

"پی لیا؟" متانہ نے تسبتہ اونچی آواز میں پھر للکارا کی۔

"جی استاد" اُن تینوں نے پھر سر جھکا لیے۔

متانہ نے ایک لمبی ہُوں کی اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا "بول کون سا لڈو کھانا چاہیے؟" اُس کی آواز میں لچک اور کھنک بھی جیسے پتلی کا متی بول رہا ہو۔

"یہ تمھاری مرضی پر ہے استاد! میں نے خود کو تمھارے ساتھ باندھ دیا ہے۔ میں نے لے پرائی سے کہا تھا۔ میں اس شہر میں نیا ہوں، ممبئی میں تمھارا ذکر سنا تھا سو چا ٹرائی کروں، سو ادھر چلا آیا۔"

"اپن کا ذکر ممبئی میں کیدر نہیں ہے۔ تو نے اچھا کیا ادیدر آ گیا پر تجھے یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی، سیدھا اپن کے پاس آتا" متانہ شرابی لہجے میں بولا۔

میں نے سوچا، جان پہچان میں ٹائم لگے گا۔ پہلے ہی استاد کو کانٹے بھلکے کے بتا دوں تو اچھا ہے۔ یہ شہر بہت ظالم ہے کئی دن سے میں اِدھر اُدھر ہوں پر شرافت یہاں چھو کے نہیں گئی۔ کوئی ہمارے شہر میں ہمکے دیکھے تو آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں یہاں تو تارا جیسا کھوٹ نظریں ٹیڑھی کرنے لگا تھا۔"

"تارا حرامی ہے" متانہ برہمی سے بولا "تو نے ایدر کے دیکھا ہوتا" متانہ کی آنکھ اُٹھا دیتے پر اپن نے بھی سوچا، ان سالوں کی تسلی ہو جائے۔ خیر جیسا سب کچھ "اب یہ سب تیرے بھائی ہیں!"

"اپن نے ایسے کچھ نہیں بولا تھا استاد" تارا سٹر نے احتجاج کیا۔

"چپ رہ" متانہ نے اپنی سُرخ آنکھیں تارا سٹر پر جما کے تنبیہ کی۔

"دلی سے نہ زادہ آیا ہے اب اگر زبان کھولی تو نیفے سے کترُوں گا۔"

نرمان ماسٹر تالے بڑھ کے اُستاد کے پاؤں پکڑ لیے اور مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اُسے پاس ہی بٹھا لیا۔ پھر سب نے ماسٹر تارا کی تقلید کی۔ سب سے آخر میں پہلے اُستاد کے پاؤں چھوتا پھر مجھ سے مصافحہ کرتا۔ میں نے متانہ کو اپنا نام سکندر بتایا تھا۔ ماحول میں اجنبیت کا جو غبار چھایا ہوا تھا "وہ رفتہ رفتہ چھٹ رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی، مجھے ڈر تھا کہ کہیں راج کرشنا گھر واپس نہ آ گیا ہو۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں صرف قمیص پاجامے میں گرے نکل گیا ہوں تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ میں متانہ سے کہہ چکا تھا کہ بمبئی میں میرا کوئی شناسا کوئی گھر نہیں ہے۔ اب اگر میں جانے کی جلدی کرتا تو سب بنی بنائی خاک ہو جاتی لیکن ظاہر تھا کہ وہ کب تک اس طرح بیٹھے رہتے۔ متانہ نے مجھ سے بائی کلا کا کوئی بھی علاقہ مانگ لینے کی پیشکش کی تھی، مجھے اس سلسلے میں کوئی واقفیت ہی نہیں تھی اور نہ میرا مقصد کوئی علاقہ حاصل کرنا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا کہ پہلے میں سارے علاقے کا جائزہ لوں گا پھر اُسے بتاؤں گا۔ متانے کی بھی شاید یہی خواہش تھی کہ میں اُس کے ساتھ رہوں اور علاقے میں اُس کا فائدہ بن کے اُن کی نگرانی کرتا رہوں۔ وہ ابھی روپے پیسے کا کوئی اعتبار مجھ پر نہیں کرانا چاہتا ہوگا۔ وہ ابھی مجھے اور پرکھنا چاہتا ہوگا۔ میری بات سے وہ خوش ہوا پھر اُس نے سب کو اپنے اپنے کام پر جانے کا حکم دیا اور مجھے دلی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کلکتے کی جو معلومات یقیں وہ میں نے دلی پر منطبق کر دیں۔ میں سات سال جیل میں رہ کے ہر طرح کی بات سے واقف ہو ہی چکا تھا اس لیے متانہ نے مجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔ جس شخص کے میں نے دانت توڑے تھے اور ناک پھوڑی تھی، وہ مرہم پٹی کرا کے آ گیا تھا۔ متانہ نے باقی دودھ اُسے پلا دیا۔ اُس کا نام دلیرا تھا۔ دلیرا کا چہرہ بجھا ہوا تھا مگر وہ متانہ کے اشارے پر مجھ سے گلے مل گیا۔

رات کافی بیت گئی میں نے متانہ اور اُس کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ایک اُن نے اُسے دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا، متانہ فوراً اُٹھ گیا۔ میں نے کچھ دیر اُس کا انتظار کیا پھر باہر چلا آیا اور جو پہلی بس نظر آئی اُس میں سوار ہو گیا۔ میں نے یہ احتیاط کر لی تھی کہ کوئی برا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ جب بس خاصی دُور آ گئی اور میرے خیال کے مطابق باٹلی کلا کا علاقہ دُور رہ گیا تو میں نے اُتر کے نیچے تلے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ جگہ بہت گنجان تھی۔ ایک بڑا میٹریکل اسٹور ابھی تک کھلا ہوا تھا میں نے اُس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ اسٹور کے مالک نے مجھے آسانی سے فون نہیں کرنے دیا لیکن جب میں نے ایک روپیہ اُس کے سامنے رکھا تو آنے کا ٹاسک اتنی کم آنے اُس نے میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ میری زندگی کا پہلا ٹیلی فون تھا۔ راج کرشنا نے میری آواز سنتے

ہی ڈھیروں سوال شروع کر دیے۔ میں نے سرگوشی میں کہا کہ میں آج رات شاید گھر نہ آسکوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ راج کرشنا تفصیل پوچھتا، میں نے فون بند کر دیا۔

میں دوسرے دن بھی راج کرشنا کے پاس نہیں جا سکا اور فون بھی نہیں کر سکا۔ متانہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میرا اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنا ضروری تھا۔ اس طرح ایک تو میں زیادہ محفوظ تھا کیونکہ ممکن تھا متانہ کے آدمیوں کے دلوں میں اب بھی کوئی پھانس رہ گئی ہو۔ دوسرے میں اپنے آپ پر جبر کر کے جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اس کی تکمیل جتنی جلدی ہو جاتی اچھا تھا۔ مخمل اور موجدار کی طرح متانہ کے پاس داؤ پیچ سکھانے کے لیے بڑی جگہ نہیں تھی۔ ویسے بھی متانہ ممبئی کے ایک پچھڑے سے علاقے کا مختار تھا، مخمل اور موجدار کے پاس جتنا بڑا علاقہ تھا یہ اس کا عشیر بھی نہیں تھا۔ ویسے متانہ چاقو چلانے میں بہت پھرتیلا تھا۔ یہ تمام اس نے چاقو زنی ہی کا جوہر دکھا کے حاصل کیا ہوگا۔ دوسرے یہ اس کا وہ ہر دلعزیز جو خواہ مخواہ اس کے آدمیوں پر دہشت طاری کیے ہوئے تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا، متانہ کی آنکھ میں رحم بالکل مفقود تھا۔ وہ کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی ہوگا۔ تیسرے دن صبح جب اس نے اپنے کئی آدمیوں کے سامنے داؤ پیچ کی مشق کی اور ان کے چاقو گرا دیے تو میرا جی چاہا کہ میں بھی اس سے دو دو ہاتھ کروں مگر میں دور ہی کھڑا رہا۔ البتہ میں نے اس کے آدمیوں سے پنجہ آزمائی اور چاقو زنی ضرور کی اور ہاتھ خوب خوب کیے۔ اس کے باوجود متانہ عش عش کر اٹھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی موجودگی میں مجھے اپنے ساتھ چاقو آزمائی کے لیے للکارا۔ اس کی للکار میں تمسخر تھا، غصہ نہیں تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور پہلی بار متانہ کا قہقہہ سنا۔ وہ گھڑا گھڑا سا قہقہہ جس کا کوئی سر تھا نہ پیر تو بھی سکندر شاہ سکندر رہتا ہے۔ اس کے سینہ پھلا کے کہا کہ اس کے سامنے ایک متانہ کھڑا ہے۔ یہ کہتے ہوئے متانہ نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانے اور نعرہ نما آواز میں بولا "مالک! راجا ہی رکھیو" پھر ڈھاڑ اچانک دیوار سے سر پھوڑنے لگا اور اس نے اپنا گریبان چاک کر کے تار تار کر دیا۔ اس کے آدمیوں نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے ان دونوں کو جھٹکا دے کے فرش بوس کر دیا اور پھر دیر تک آنکھیں بند کیے گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جیب سے چاقو نکالا اور سامنے کی دیوار پر ایک نظر کی۔ چاقو جھٹک جھٹک کے سر پر لگا۔ چھپکلی دو ٹکڑے ہو کے زمین پر گری۔ اس نے دونوں ٹکڑوں کو چاقو کی نوک سے اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ میری زبان سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ زہریلی چھپکلی کھانے کا موقع آئے بھی تو کوئی نشانہ لگا سکتا ہے۔

تیسرے دن دوپہر کو مجھے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ میں وہاں دیر تک بیمار۔ راج کرشنا موجود نہیں تھا۔ مجھے جلد واپس پہنچنا تھا۔ اس لیے میں نے کوئی حاضری نوٹ کرائے چلا آیا۔ متانہ نے مجھے کچھ پیسے دیے تھے تاکہ میں نئے کپڑے خرید لوں۔ میں نے انہی لوگوں کے رنگ ڈھنگ کے مطابق کپڑے خریدے اور دن دن بھر بائی کلا کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ دو دن اور گزر گئے۔ ان دو دنوں میں مجھے متانہ سے کچھ اور قریب ہونے کا وقت مل گیا۔ خوشامد متانہ کو بہت پسند تھی۔ میری زبان سے خوشامد کا ایک لفظ بھی نہیں چھوٹتا تھا اس لیے میں زیادہ تر خاموش ہی رہتا تھا۔ اس خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے آدمی میری عزت کرنے لگے بلکہ خود متانہ نے اسے میرے عجز پر محمول کیا۔ متانہ کی زبان کچھ صاف تھی۔ دو سی پی کے کسی گاؤں سے ممبئی آیا تھا۔ رات گئے اس کے پاس بھانت بھانت کی عورتیں آجاتی تھیں جنہیں لے کے وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ کمرے سے رات بھر ناچ گانے، راگ رنگ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اس کمرے میں اس کے وہ چہیتے آدمیوں کو اندر آنے کی اجازت تھی اور وہ روانے کے ارد گرد ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ کوئی عورت باہر نکلتی تو وہ اسے بری طرح دبوچ لیتے۔ وہ بھی اتنی بے غیرت ہوتیں کہ کوئی مزاحمت نہ کرتیں بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور چپٹ جاتی۔ میں آنکھیں پھیر لیتا۔ شام اور صبح دونوں وقت جھنگ گھوٹی جاتی تھی۔ ایک بار انھوں نے میری طرف بھی پیالے بڑھائے۔ میں نے کہا ماں نے قسم دلا دی ہے۔ رات گئے متانہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلتا تو اس کے آدمی اندر گھس کے عورتوں پر جھپٹ پڑتے اور انھیں اپنے ساتھ کمروں میں لے جاتے۔ اگر کسی کی آج باری نہ آتی تو وہ دوسرے دن بازی لے جانے کی کوشش کرتا۔

ان عجیب تماش بینوں کے علاقے کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے لوگ متانہ کے سامنے جیبیں خالی کرتے اور پولیس والوں کی مٹھی گرم کرتے کبھی کسی دکان دار کا دل ٹوٹتا۔ متانہ کے خاص خاص آدمی آتے تو متانہ اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں ابھی تک میری پہنچ نہیں ہوئی تھی۔ متانہ کے اڈے پر باہر کے لوگ بھی ملنے کے لیے آتے۔ میرے آنے سے قبل دو کانسٹیبلوں کا قتل ہو چکا تھا اور متانہ کے کئی آدمی جیل میں بند ہو چکے تھے مگر کسی نے قبول کر کے نہیں دیا تھا اس لیے بائی کلا میں پولیس کی نفری بڑھا دی گئی تھی اور متانہ انھیں کچھ دنوں سنبھلے رہنے کی ہدایت دیتا رہتا تھا۔ پولیس کی سختی کی زیادہ شکایتیں سن کے اس کی آنکھیں شراب کے بجائے خون اگلنے لگتیں اور وہ چھنکارا بھر کہتا "ابھی دو چار دن اور جائیں گے۔ مالک ابھی دو چار دن اور اپنے پاس بلانے کی نکر میں ہے، بھیجوں گا مالک آئیر اکم نپٹا بھیجنا ہی پڑے گا۔"

متانہ کو پولیس کی کام سے عار نہیں تھا، کام کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ اپنے علاقے کے لوگ جب اس سے ملنے آتے تو وہ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتا اور جب اپنے کسی آدمی کو سزا دینے پہ آتا تو اس کی انگلی کا کوئی پور کاٹ لیتا یا کان کی لو کتر لیتا یا کہیں سے ذرا سی کھال اتار لیتا یا پھر ہلکی سی قسم کی ٹھکائی سے اس کی کمر میں داغ ڈالے جاتے مگر ایسا کم ہوتا تھا۔ اس کے آدمی غلطیاں کم ہی کرتے تھے اور کرتے تھے تو سزا میں ہمیشہ رعایت بھی نہیں کی جاتی تھی۔

چونکہ بائی کلا میں پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور افسروں کا گشت جاری تھا اس لیے میں نے باہر نکلنا اور کم کر دیا تھا۔ راج کرشنا کے کئی ماتحت افسران مجھے اس کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔ مجھے متانہ کے ہاں اپنے دن کھینچتے ہوئے دو ہفتے گزر گئے۔ یہ دو ہفتے میں نے کسی جیل میں گزارے تھے۔ کبھی میرے خون کی گردش اتنی تیز ہو جاتی اور کبھی دماغ اتنا پھک جاتا کہ میرا ہاتھ خود اپنا گلا گھونٹنے لگتے۔ ایک ایک دن گنتا تھا۔ ایک ایک گھڑی بتاتا مشکل تھا۔ سولھویں دن ہی میں وہاں سے چلا آتا کیونکہ وہاں مزید بیٹھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور میرا سینہ پک رہا تھا اور ویسے بھی مجھے جلد سے جلد ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اب متانہ مجھے اپنے خاص آدمی کا سا رتبہ دینے لگا تھا اور کوئی اہم کام سونپنے ہی والا تھا۔ وہ کام کسی کا خون کرنے کا بھی ہو سکتا تھا۔ سولھویں دن دوپہر کے وقت متانہ نے مجھے اپنے مخصوص کمرے میں بلوایا۔ وہاں دیواروں پر عریاں اور نیم عریاں عورتوں کی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بالوں کی ایک بڑی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ متانہ کے کچھ خاص آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ متانہ نے دروازہ بند کروا دیا اور بھیں سرگوشیوں میں ہدایت دینے لگا۔ اس کی ہدایت سنتے ہی میرے ہوش اڑنے لگے۔ رگیں پھٹنے لگیں۔ متانہ نے میری طرف غضب سے دیکھا اور درشتی سے بولا "کیوں سکندر! تو نے اپن کی بات دھیان سے نہیں سنی؟"

میں نے بوکھلا کے کہا "سن لی ہے استاد!"

"تو پھر تیرے منہ کو سیل کیوں لگ گئی۔ تیرے لیے یہ کام نیا ہوگا۔ وہ مجھے ہوئے تو دوں سے بولا۔ یہ پر تجھے کسی بڑے کام سے تو لگانا ہوگا۔ تو نے اچھا کیا، جلدی نہیں کی۔ علاقہ نہیں لیا۔ نہیں تو ٹھوکریں کھاتا رہتا سالا! اب خوش ہو جا، آگے مال ہی مال ہے۔" میری زبان کو سکتہ ہو گیا تھا۔ "سن لیا؟" وہ چیخ کے بولا۔

"سن لیا۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔

میں وہاں سے جلد چلا آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بار بار برف ہو جاتے تھے۔ بار بار آئینہ میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ شام کو متانہ نے اس بات کا اشارہ دکھا کہ کوئی آدمی اس سے دور نہ رہے حالانکہ بظاہر وہ بہت مگن سا دکھائی دیتا تھا۔ جیسے اس کا معمول ہو، میرے داغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اپنی نیند یاد آگئی۔ میری جان میری جنو میرا کلیجا لینے لگا۔ چراغ جلنے کے خاصی دیر بعد مجھے بھاگ جانے کا ایک موقع ملا لیکن میرے قدم متانہ کے خلیفوں کے تنگ باندھتے میں زمین نے جکڑ لیے۔ اگر متانہ کو فوراً خبر ہو جاتی کہ میں اڈے پر موجود نہیں ہوں تو وہ میری تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دیتا اور اگر مجھے وقت پر کوئی سواری نہ ملی تو میں بائی کلا کے علاقے میں کسی بھی جگہ پکڑا جاؤں گا۔ میں چند لمحے رکا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ پیدل ہی اڈے کی طرف چلا۔ میرا ذہن یکسر درست تھا۔ متانہ کے آدمی دروازے سے باہر آگئے تھے مگر مجھے واپس آتا دیکھ کے لوٹ گئے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا گچھا نہیں کیونکہ میں چند ہی لمحوں میں واپس آگیا تھا۔ متانہ نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

رات کے بارہ بجے ہم لوگ ہم آٹھ آدمی دو گاڑیوں میں اڈے سے روانہ ہوئے۔ ایک گاڑی میں تھی، دوسری چھوٹی۔ میں چھوٹی میں تھا۔ پون گھنٹے بعد ہم اپنے مقررہ مقام پر پہنچے۔ دونوں گاڑیاں کچھ کچھ فاصلے پر ٹھہرائی گئی تھیں۔ میرا کام باہر ہی کھڑے رہنا تھا۔ متانہ کے تین آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے آپس میں کچھ اشارے کیے۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہوگا۔ موسمی دھیمی روشنی تھی۔ بنگلوں کا علاقہ تھا۔ چار آدمی ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی کانسٹیبل ادھر نکل آیا تو آپس میں دنگا کر کے اسے الجھا لیا جائے گا۔ میں گاڑی چلانا نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا ہوتا تو چپکے سے گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا۔ کل گیارہ آدمی تھے۔ گیارہ میں سے ایک کو مارنے کا ارادہ پہلے کے بھی قصد عامل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ ہی ایک آدمی اور کھڑا تھا۔ چار آدمی کچھ فاصلے پر ٹہل رہے تھے۔ چوتھے آدمی نے بنگلے کی دیوار کود لی تھی۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد بنگلہ میرے سامنے میں ڈوب گیا۔

کوئی دس منٹ بعد ادھر ادھر سے شٹ شٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ تین آدمی بھاگتے ہوئے فٹ پاتھ پر آئے۔ ایک کے کندھے پر چادر میں لپٹی ہوئی بے ہوش لڑکی تھی۔ گاڑیوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لڑکی بغل کی تیسری سے بڑی گاڑی میں ڈال دی گئی اور دو آدمی بھی پیچھے پیچھے اندر گھس گئے۔ اگلی نشست پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی آدمی چھوٹی گاڑی میں ٹھنس گئے۔ اس بار چھوٹی گاڑی آگے تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کچھ فاصلے سے چل رہی تھیں۔ بائی کلا کے علاقے میں چھوٹی گاڑی اڈے کے قریب روک دی گئی اور تمام لوگ باہر اتر پڑے۔ دو آدمی ایک دوسرے سے الجھ گئے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شور مچنے لگا۔ دو کانسٹیبل سیٹیاں بجاتے بھاگتے ہوئے آئے اور لڑنے والوں کو ڈانٹنے ہٹکانے لگے۔ دونوں فسادی ننگی ننگی گالیوں کا آزادانہ تبادلہ کر رہے تھے۔ باقی آدمیوں نے کانسٹیبلوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اس اثنا میں بڑی گاڑی یہ احوال دیکھے بغیر آگے نکل گئی اور جب تک وہ اڈے کی گلی سے واپس نہیں چل گئی، لڑائی جاری رہی اور پھر کچھ تو "میں میں" کے بعد بات صلح صفائی پر آگئی، کانسٹیبل دونوں جھگڑالو آدمیوں کو تھانے لے جانے پر مصر تھے مگر ان کے باقی ساتھیوں نے معافی تلافی کرالی۔ دو آدمیوں کے سوا باقی گاڑی میں سوار ہوئے۔ غیر آہستہ آہستہ پیدل ہی اڈے کی طرف

چل پڑے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو اڈے پر بھیڑ نہیں تھی ہم لوگوں کو علیحدہ کر کے مستانہ کے ساتھ تین آدمی تھے۔ مستانہ نے سب کے بازوؤں کا بوسہ لیا اور میرا کندھا خاص طور پر تھپتھپایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ کے سبھی کو پہلے سے تیار کیے ہوئے جھنگ کے پیالے پیش کیے گئے۔ بھنی ہوئی مرغیاں تھے اور کباب تیار تھے۔ مستانہ کی یہ مستانہ روی دیکھ کے کسی نے خوشامدانہ آواز میں کہا۔ "استاد! ذرا دیدار تو کرا دو۔" اس کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔

"یہ اپن لوگوں کے لیے نہیں ہے اس سے سوہنائی جائیں گی تو۔ یہ تو کیشن ہے۔" مستانہ معمول سے زیادہ چہک رہا تھا۔ اس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"استاد! بس ذرا ایک سیکنڈ درشن۔"

"اوئے۔" مستانہ نے ہاتھ پھیلا کے تلخی سے کہا۔ "آواُ آواُ سالا! تم بھی کیا یاد کرو گے مر جائیں گا تو سالا! یاد کرو گے۔ روؤ گے۔" وہ چیخ کے بولا۔

ہم سب اندر کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکی چوکی پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے بدن پر ایک چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ مستانہ ڈگمگاتا ہوا اس کے پاس گیا۔ "بتی جلاؤ۔" اس نے منہ پر انگلی رکھ کے ہولے سے کہا۔ روشن کرہ مزید روشن ہو گیا۔ مستانہ نے لڑکی کے پہلو میں بیٹھ کے دھیرے دھیرے چادر ہٹانی شروع کی۔ پھر دفعتہً ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ کندنی رنگ کی ایک پری رُو لڑکی تھی۔ اس کی عمر ۱۶، ۱۷ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کا چہرہ شنگرف کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور پورا بدن کسی مجسمے کی طرح تراشا ہوا تھا۔ پلکیں لمبی آنکھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی، بال سیاہ اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے۔ وہ شب خوابی کا جدید لباس پہنے ہوئے تھی۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس کی صرف سب ایک ٹک دیکھتے رہے۔ سب کی آنکھیں گنگ اور زبانیں دنگ تھیں۔ مستانہ نے انگلیوں سے اس کے رخسار سہلائے اور پھونکوں سے اس کے گیسو اڑائے۔ پھر پورے بدن پر سر سے پیر تک احتیاط سے ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں کسی نے منہ سے سیٹی بجا دی۔ مستانہ نے پلٹ کے ہم سب کی طرف غصے سے دیکھا اور جھٹ چادر سے لڑکی کا بدن ڈھانپ دیا۔ یہ چغد وہ ناگواری سے بولا۔

"ماسٹر قسم سے گرینڈ ماسٹر نے چھوکری اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔" ماسٹر قسم کی جھلاہٹ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماسٹر! دل گھبرا رہا ہے اسے اُوپر پہنچا دو ورنہ....."

"چپ رہ۔" مستانہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس اسے اُوپر پہنچا دو چھوکری تمہاری ماں کی طرح اُس وقت تک یہاں رہے گی جب تک....." مستانہ بولتے بولتے کہیں گم ہو گیا۔

"استاد! چھوکری اپن اُوپر پہنچاؤں گا۔"

"نئی استاد! یہ لوتھڑی کا بچہ دس سیر کا بوجھ بھی نہیں اُٹھا سکتا، چھوکری کو اپن پریم سے اوپر پہنچاؤں گا۔ استاد! ایک چانس دو۔"

"استاد! اپن پہنچاؤں گا۔ ایک دم فس کلاس....."

"آئیں آئیں۔" مستانہ کی گرج دار آواز سے وہ سب خاموش ہو گئے۔ لفنگے اپنے تئیں سالار رنڈ چھوکریاں دیکھتا ہے۔ ایک چھوکری بچا نہیں سکتا، دھندا کریں گا، تم سالا سب کچے ماس کا بنا ہے۔" مستانہ باری باری سب پر غصے کی نگاہیں پھینکنے لگا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر ٹک گئی۔ میں الگ تھلگ خاموش کھڑا تھا۔ "ادھر آ سکندرا!" اس کی آواز میرے جسم میں سنسنا گئی۔ میری جھجکچاہٹ پر اس نے کرخت لہجے میں مجھے اپنے پاس بلایا۔ "اسے تو اوپر لے جائے گا اور تو....." تو اس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ساتھ جائے گا سلما پہ سے پرے ہے گا۔ روم نمبر ۲ میں سمجھا۔ اب تم سب میرے ساتھ آؤ۔ ڈھائی بج رہا ہے اور دو گھنٹے بجوڑیاں تھک کے سو گئی ہوں گی۔ آج اپن نے تم لوگ کے لیے خاص انتظام کیا ہے۔"

اس کے اشارے پر میں نے لڑکی کو کندھے پر ڈال لیا۔ بچھوں کی نسی چبھ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش اُٹھائے ہوئے ہوں۔ فہیدہ کی لاش۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ میرے پیر لرز رہے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے کپڑوں سے خشک کیا۔ اُوپر کا راستہ ایک الماری سے گزر کے جاتا تھا۔ وہ صرف بظاہر الماری تھی اور کمرہ کیا تھا؟ ایک بڑا چوکور تھا جھیں نیچی ہوئی کے لیے فرش پر بنا ہوا چھوٹا سا سلاخوں والا روشن دان۔ لڑکی اگر چیختی تو اس کی آواز نیچے کمرے تک نہ جاتی۔ لڑکی سے رابطے کا واحد ذریعہ یہ روشن دان تھا۔ وہاں ایک بستر کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک طرف غسل خانے کا تنگ حصہ تھا۔ سلما باہر کھڑا رہا۔ میں نے لڑکی کو بستر پر ڈالا اور اس کے بازو کی چٹکی لے کے اسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ یہ لڑکی ویسے نہیں بھیج سکتا تھا۔ میں نے اس کے بال درست کیے، کمرے کے نیچے کر رکھا اور گردن تک چادر ڈال دی۔ وہ ہوش ہی میں نہیں آئی کہ میں اس سے کچھ کہہ سکتا۔ میرا ہاتھ خود بخود چاقو پر پہنچ گیا۔ میں اس کے سینے میں چاقو گھونپ سکتا تھا لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ میرے ساتھ آنے والے آدمی نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ ہم نیچے آ گئے۔ سلما نیچے کمرے ہی میں رہ گیا۔ یہ کمرہ چھوٹے سے صحن میں کھلتا تھا اور صحن باہر جانے والے راستے سے دُور تھا۔ ایک عقبی راستہ بھی تھا مگر وہ عموماً بند رہتا تھا جس کی میں سلما رہ گیا تھا اس کے بعد بھی کئی کمرے تھے۔

صحن میں شور مچا ہوا تھا۔ رنڈیوں کی کھلکھلاہٹیں مستانہ کے آدمیوں کے قہقہے ہم دونوں جا کے اُن کے درمیان بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پیالے لگے ہوئے تھے۔ مستانہ کے پہلو میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ جتنے آدمی تھے اتنی عورتیں نہیں تھیں۔ کوئی تین تین آدمیوں کے پاس ایک ایک عورت تھی۔ مستانہ نے مجھے دیکھ کے ایک مستانہ نعرہ لگایا۔ پھر اس کے حکم پر میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنے گلاس کا پیالہ لے لیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا مگر میری اس بات پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ "استاد! اسے نوشانتی کے پاس پہنچا دو۔ وہ اسے ٹھیک کر لے گی۔" اس نے زخموں کی طرح نقل اتارتے ہوئے کہا۔ میں یہ سب سنتا اور دیکھتا رہا، وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ نڈھال ہونے لگے اور عورتوں کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ ایک ایک عورت کے پیچھے تین تین چار چار مرد دوڑے اور واپس نہیں آئے پھر سب چلے گئے۔ مستانہ بھی چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اندازاً ساڑھے چار بجے ہوں گے۔ کمرے میں مچھوڑی ہوئی بدبودار بوتلیں، ادھ کھائی بوٹیاں اور پرسالن کے دھبے اور پیالے تتر بتر پڑے ہوئے تھے۔ پھولوں کی کچلی ہوئی پتیاں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ میرا جسم ایک پہاڑ بنا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کسی دوسرے کے اعضا معلوم ہوتے تھے۔ میں اٹھ کے باہر آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ میں بے آواز چاپوں سے جنھیں صرف میں سن سکتا تھا۔ سلما کے کمرے میں گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے غرغرا رہا تھا۔ میں نے صحن کے ایک اندھیرے گوشے میں چھپ کے ایک بار پھر تمام کمروں کا جائزہ لیا اور دبے پاؤں سانس روکے کھڑا رہا۔ پھر جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں باہر جانے والے تنگ راستے میں آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے قریب کٹھریا میں چوکیدار رہتا ہے، راستہ روشن تھا۔ چوکیدار کے کمرے میں ایک رسی تھی۔ وہ رسی کھینچنے سے اندر چند کوئلوں میں ٹن ٹن گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ گھنٹیاں میری موجودی میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ دروازہ ایک زنجیر سے بند کیا گیا تھا۔ کنڈے میں لوہے کی بڑی میخ ڈال دی گئی تھی۔ میخ نکالنے اور وزنی کنڈا کھولنے کی آواز سے پہرے دار جاگ سکتا تھا۔ وہ اگر اندر جاگ رہا تھا اور میں گردن مروڑ کے جھانک کے دیکھتا تو کام بگڑ جاتا چنانچہ میں نے اتنے آواز دی، وہ شاید اونگھ رہا تھا۔ سٹ پٹا کے بولا۔ "کون ہے؟"

پھر اس نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ میں نے اسے پھینکنے کی مہلت نہیں دی۔ میری پہلی ہی ضرب سے وہ اپنے پیروں پر قائم نہیں رہ سکا۔ لڑکھڑا کر اندر گرا۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کی گردن میں اپنے ہاتھ کا شکنجہ کس دیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں نے اس کی گردن کو اور زور سے دبایا۔ اس کی زبان باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ میں نے اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اس میں ایک چابی دروازے کے کنڈے کی میخ نکالنے کی تھی۔ میں نے میخ نکالی۔ کنڈا کھولا۔ دروازہ کھلا۔ باہر سناٹا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ چابیاں اس کی جیب میں رکھ دیں۔ اس کی لاش کو گھسیٹ کے کوٹھری کے اندر لے گیا۔ اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ میں نے اس کی گردن سیدھی کر دی۔ اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیے۔ اس کے بعد میں نے کیا کرنا چاہیے۔ وہاں کھڑے رہنے سے بہتر خاکہ بھاگے۔ راہ میں ایک چوراہے پر دو کنوئیاں اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ٹیکسی والے مستانہ کو جانتے ہوں گے مگر میرے پاس پیسے تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو جگایا۔ "نہیں جائیں گا۔" وہ حقارت سے بولا۔

"جتنا روپیہ کہو گے دیں گا۔" میں نے اسی کے لہجے میں تیزی سے کہا۔ "باندرے تک جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ایک شخص بیمار ہے ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

اس نے منہ بنایا۔ "کتنا روپیہ دے گا؟"

"بیس روپیہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"مجھ بالو! میں اس کے برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چاقو میں نے ہاتھ ہی میں دبا رکھا تھا۔ ٹیکسی والے نے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ تیز رفتاری سے مجھے باندرے لے گیا۔ میری جیب میں بیس روپے نہیں تھے اس لیے مجبوراً ٹیکسی راج کرشنا کے بنگلے پر ٹھیرانی پڑی۔ بنگلے کے دو محافظ سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔ انھوں نے بندوقیں کندھوں سے اتار لیں لیکن جب مجھ پر نظر پڑی تو تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے ان کے قریب جا کے سرگوشی کی۔ ٹیکسی والا جانے نہ پائے۔" ایک سپاہی احتیاطاً میرے ساتھ آیا۔ اسے میری نیت پہ بھی شبہ ہو گیا۔ اس کی گھنٹی کی ٹرر پر راج کرشنا گاؤن پہنے ہوئے اندر سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تمنچہ تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اس نے تمنچہ دُور پھینک دیا اور بے قرار ہو کے میرے سینے سے لپٹ گیا۔

سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی کہ مستانہ کے اڈے پر جتنے لوگ موجود تھے سب منتقل کر لیے گئے۔ ادھر سے فون کر کے راج کرشنا رانا ہوا۔ اُدھر سے پولیس کی بھاری جمعیت پہنچی۔ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور دروازہ کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ راج کرشنا نے مجھے اپنے ساتھ ہی لے لیا تھا۔ جب میں دو سپاہیوں کی رہنمائی میں لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈال کے لا رہا تھا تو میرے پیر بار بار زمین سے لگ جاتے تھے۔ میں نے کسی کو اس کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا۔ اب وہ ہوش میں آ گئی تھی اور اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ روؤ نہیں تم اپنے گھر واپس جا رہی ہو۔ پولیس افسران تفتیش کے لیے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر میں نے ضد کی کہ وہ سیدھی گھر جائے گی اس سے پہلے کہ پاس پڑوس والوں کو خبر ہو۔ میں نے کسی کو اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ دو سپاہی پولیس کی گاڑی میں بٹھایا۔ اسے گھر پہنچاتے وقت میں اس کے گھر کے اندر بھی نہیں گیا، مجھ سے اس کے گھر والوں کے چہرے نہ دیکھے جاتے۔

راج کرشنا کی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ خود راج کرشنا اپنی کار ہی میں رہ گیا کیونکہ ابھی اسے وہاں موقع پر مزید گرفتاریاں کرنے اور کئی امور سر انجام دینے کا حکم دینا تھا اور یہ کام خاص طور پر اپنی نگرانی میں انجام دلوانا تھا۔

راج کرشنا جلد سے جلد میرے پاس آنے کے لیے بے تاب ہوگا مگر بعد کی کلا میں متانہ کے اڈے کے بعد جو کام اُسے کرنا تھا' وہ اس سے زیادہ اضطراب کا تھا اسی لیے وہ وہاں ٹھیر گیا اور مجھے اُس نے گھر روانہ کر دیا۔ گھر آکے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے راج کرشنا کے دلوائے ہوئے کپڑے پہنے' کپڑے بدل کے کچھ سکون ہوا' جیسے کپڑے پہنے نہ ہوں بکتر بند لیے ہوں۔ پھر میں نے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا لگائی تھی کہ مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔

راج کرشنا تمام سے پہلے گھر نہیں آسکا اور جب آیا تو اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میرے پاس آکے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں اندر ہی اندر دعا کرتا رہا' کاش کرشنا وہ لفظ خود تک محدود رکھے جن کی ادائی کے لیے اُس کے سینے پر بوجھ ہوگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ نہ اُس نے کچھ بات کی' نہ میں نے۔ ہم دونوں بس ایک دوسرے کی سانسیں سنتے رہے اور میں اپنی انگلیوں سے مختلف چیزوں پر مختلف جانوروں کی شکلیں بناتا رہا۔ پھر میں نے ہی ابتدا کی کیونکہ سکوت ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ میں نے بہت ہلکی آواز میں اُس سے پوچھا "سب کام ٹھیک تو ہوا؟"

"ہاں" وہ ایک لمبی آہ بھر کے بولا۔ "سب ٹھیک ہوگیا۔"

"اب۔ اب تو کہیں نہیں جانا؟" میں نے تشنگی سے پوچھا۔

"نہیں' اب شاید نہ جانا پڑے یا شاید جانا پڑ جائے۔" اُس نے گھوئے گھوئے لہجے میں جواب دیا پھر چپ ہوگیا۔

"کپڑے بدل لیجیے۔" میں نے ڈریسر کے زیرِ لب کہا۔

"ہونہہ۔" وہ اپنے گال رگڑتے ہوئے بولا۔ "تمیں تو اب کہیں نہیں جانا؟" اُس کے لہجے میں نہ تشکی تھی' نہ طنز تھا۔ البتہ شکایت تھی۔

"نہیں اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے جلے جلے لفظوں میں کہا۔

مجھ پر صبح سے گھبراہٹ طاری تھی کہ وہ گھر آنے کے بعد بہت سی باتیں کرے گا' بہت سی باتیں پوچھے گا اور میں اسے ساری باتیں کس منہ سے بتاؤں گا۔ میں نے تو خود ہی ان باتوں کا دروازہ کھولا ہے اب اسے بند کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں اچانک ڈارد براتا تو میں نے اُسے یہ سب کچھ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ اُس وقت وقت بھی کم تھا' ہمیں روانہ ہونے کی جلدی تھی کیونکہ لمحوں میں اندھیرے کا پردہ چاک ہوجاتا۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان صرف رسمی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اس واقعے کے بعد وہ میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ وہ ایک با اصول شخص تھا۔ پورے سفر دل اچانک غائب رہنا اور آنا تو اس انداز سے آنا' یہ سب کچھ اُس جیسے ذہین شخص کے سوچنے کے لیے بہت کافی تھا مگر اب کچھ بھی ہو' متانہ کے ہاں خلاف توقع دیر ہو گئی تھی' مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ واقعات اس طرح پیش آئیں گے۔

میں سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں واپس آجاؤں گا اور اُسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ معاملات کسی اور طرح اُس کے گوش گزار کر دوں گا۔

"آپ نے میری بات کا خیال رکھا۔" میں نے اُس سے گلا ہی ملنے کی ناکام کوشش کی۔ صبح میں نے اُس سے درخواست کی تھی کہ وہ میرا نام کہیں استعمال نہ کرے۔

اُس نے بے یقینی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ سب کیا ہے؟" آخر اُس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ دہشت سے بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں بہت ڈسٹرب ہوں ڈارلنگ! میں پاگل ہوسکتا ہوں۔" وہ تقریباً چیختا ہوا بولا۔ "یہ میری مدد کرو' میرے دماغ پر پانی ڈالو۔"

"دیکھیے۔" میں نے جھکتے جھکتے التماس کی۔ "اب آپ کچھ نہ پوچھیں اور کسی قسم کا تردد نہ کریں تو اچھا ہے' میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"ڈارلنگ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

"جانتے ہو اب تک کیا کچھ ہوچکا ہے؟ آج کے دن پر مجھے یقین نہیں آتا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا' وہ حیران ہو ہو کے مجھ سے پوچھتے تھے کرشنا جی! یہ کیا ہوا؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے ابھی وہاں اور ٹھیرنا چاہیے تھا مگر میں اُن کی نگاہوں سے بچ کے یہاں بھاگ آیا۔ شہر بھر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ وہ سب اندر چلے گئے ہیں اور اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں جو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ہم نے تھانے جاتے ہوئے تمام ٹھکانے آزمائے۔ ہم نے کسی کو بھی سنبھلنے اور بھاگنے کی فرصت نہیں دی۔ شہر کے معزز ترین لوگ اس میں شامل ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم یہاں سکون سے کیسے بیٹھے ہوئے ہو۔ میرا دماغ معطل ہوچکا ہے تمیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنا سنگین معاملہ تھا اور اب کس قدر اہم ہوگیا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کا خون ہوچکا تھا۔ یقیناً پولیس کا ایک گروہ بھی اُن کی پشت پناہی کر رہا ہوگا۔ بعض دولت سازی زیرِ زمین فیکٹریاں کا بہت بڑا ذخیرہ۔" اُس نے انہماک پکڑ لیا۔ "نہ جانے ابھی اور کیا کیا انکشافات ہوں۔ وہ پھر گورنر نے ذاتی طور پر مجھے مبارک باد دی ہے۔ مجھ سے شکریے کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں کہا گیا۔ رات ہی پولیس افسران سے اس معاملے میں میری بات ہو رہی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ جعلی کرنسی باغی کلا کے علاقے سے آرہی ہے مگر کہاں سے' ہمارے اُس علاقے کی چند ممتاز ہستیوں کے ناموں پر مشرح دائرہ بنا دیا تھا مگر شاید ناکافی تھے اس لیے اُن پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔" میں اپنے ساتھی افسران سے بار بار بھاگ دوڑ کرتا تھا کہ ہمیں کسی کا لحاظ کیے بغیر اچانک چھاپا مارنا چاہیے مگر وہ ڈرتے تھے۔ مجھے فون پہ دھمکیاں دی جارہی تھیں اور کہا جا رہا تھا کہ فوراً بمبئی سے نکل جاؤ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اوپر سے سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہی معاملے نمٹانے کے لیے بمبئی میں میرے قیام کی مدت بڑھائی

گئی تھی حالانکہ شہر کے کئی پولیس افسر ایک باہر کے آدمی کی مداخلت پر کسی محسوس کرتے تھے مگر اچانک ۔۔۔ اچانک صبح تم آگئے۔ اس سے پہلے شہر کا ایک اور گروہ ختم کرنے میں ہم شامل تھے' اب بھی تھی تھے۔ میری رہبری کرو۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "ورنہ میرا ذہن بھٹکتا رہے گا۔ پولیس والے کا ذہن بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمھارے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا مگر ڈارلنگ! میں عہد شکنی کرتا ہوں' مجھے معاف کر دو۔" اُس نے شدت سے کہا اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

"کچھ بھی نہیں' ذرا سی بات ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے وچار وافو پیچھے لگے تھے' آپ نے ریل میں خود اس کا مظاہرہ دیکھا ہے۔ انھیں ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ میں سولہ دن وہیں اُن کے ساتھ رہا اور واپس آگیا۔ ممکن ہے میں اُن کے ساتھ دو چار روز اور گزارتا۔ اگر وہ لڑکی لے کے نہ آجاتے۔ اس طرح میرا فوراً نکلنا ضروری ہوگیا۔ اُس وقت تک میں آپ کو بتانے کے لیے اُن کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم وہاں گئے کیوں؟" وہ جز بز ہو کے بولا۔

"آپ پریشان جو تھے۔" میں نے فون پر آپ کی گفتگو سن لی تھی۔ اُس دن میٹنگ میں آپ لوگ اس معاملے پہ بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا' ایک کوشش کر دیکھوں مگر وہاں دن زیادہ لگ گئے۔ ویسے بھی میں ایک بے کار آدمی تھا۔ خالی بیٹھے رہنے سے کوئی کام کر لینا ہی ٹھیک تھا۔"

"مگر یہ کام!" وہ دہشت سے بولا۔ "تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ میں سولہ دن پریشان ہوتا رہا۔ ایک آدھ بار کے بعد تمھاری کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔"

"مجبوری تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر تم۔۔۔ تم اتنی جلدی وہاں قبول کیسے کر لیے گئے؟"

"شاید میری صورت ہی ایسی ہے۔" میں نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "میں انھیں اپنی ہی برادری کا کوئی آدمی نظر آیا ہوں گا۔ خود میں نے بھی انھیں یہی جتانے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے اُن کے دو چار آدمیوں کو زمین پر بچھا دیا تو انھیں میری ضرورت کا احساس ہوا لیکن اب میں یہاں آگیا ہوں۔ راج کرشنا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑکتے رہ گئے۔ مجھے لمحے بھر پر خرسندگی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔" میرے اصرار پہ وہ تھکے ہوئے انداز میں اٹھ گیا اور ادھر اُدھر کے کسی قدر تر و تازہ نظر آنے لگا' پھر بھی اُس کی جھوروں کے حلقے کی جگہ سکوتی ہالی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس افسران آگئے۔ اُن سب کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ اصل میں صبح مجھے راج کرشنا کے ساتھ متانہ کے اڈے پر سرگرم دیکھتا ہے۔ اس لڑکی کو اُن کے سامنے اٹھا کے نیچے لایا تھا۔ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی لیکن ہے متانہ اور اُس کے ساتھیوں نے باڑ پس کے دوران میں مجھے بڑا بھلا کہا تھا۔ ہو سکتا ہے چند راج کرشنا نے متانہ اور اُس کے ساتھیوں کو یہ "اقرار دینے کی احتیاط کی تھی جیسے میں بھی اُن کے ساتھ پھنس گیا ہوں۔ حالات میں بھی انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ میری خواہش پر سب سے پہلے لڑکی باز یاب کی گئی تھی' تاکہ اُسے کسی قسم کی زک پہنچنے کا احتمال نہ رہے مگر راج کرشنا کی "احتیاط" بے معنی تھی۔ متانہ اور اُس کے آدمیوں کو جلد یا بدیر اس نتیجے پہ پہنچنا ہی تھا کہ وہ بے وفا کون شخص ہو سکتا ہے اور پولیس افسران کو بھی معلوم ہونا تھا کہ راج کرشنا کی معلومات کا ذریعہ کون تھا۔ وہ سب میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ اُن کی خواہش راج کرشنا کی توقع سے مختلف نہیں تھی کہ میں انھیں بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا۔ مگر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی اور راج کرشنا کے بنگلے پر رات کو تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر نہیں ہے کوتوالی ہے۔

نہاتے کی نیز پر صبح کے اخبارات رکھے ہوئے تھے تمام کے تمام انگریزی کے تھے۔ میں نے جان بوجھ کے ہاتھ نہیں لگایا۔ راج کرشنا سر جھکائے انھیں پڑھتا رہا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے اخبارات دیکھنے شروع کیے۔ اخبارات نے جو کہانیاں لکھی تھیں' اُن میں بہت سی میرے لیے بھی نئی تھیں۔ اخبارات نے شہر کی اُن شخصیتوں کے نام چھاپنے سے گریز کیا تھا جنھیں آگے لے جھے گرفتار کیا گیا تھا لیکن روداد پوری چھاپی تھی۔ کہاں کہاں کیا کیا ملا۔ سکوں کی ڈھلائی' نوٹوں کی چھپائی' شراب اور دیگر منشیات کا ذخیرہ۔ جہاں جہاں یہ ذکر تھا "وہاں ہر جگہ راج کرشنا کا نام موجود تھا۔ اُس کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں لکھی گئی تھیں۔ اُس نے اب تک کتنے گروہوں کو عریاں کیا اور پولیس میں اُس کی خدمات کا کتنا بڑا ریکارڈ ہے۔ ایک اخبار نے "ایک سچا پولیس مین" کے عنوان سے راج کرشنا پر مختصر مضمون بھی چھاپا تھا۔

اُس کے بارے میں اگلے پچھلے اتنے بہت سے واقعات پڑھ کے مجھے کمرے میں حبس سا محسوس ہوا۔ یہ تو وہ واقعات تھے جو میرے سامنے پیش آئے۔ اس سے پہلے راج کرشنا کی پوری زندگی جرم کشی میں گزری تھی۔ مجرموں کے لیے اُس کا نام "نازیانہ" تھا۔ اگر کسی موقع پر راج کرشنا کو یہ معلوم ہوگیا کہ اُس کے ساتھ رہنے والا آدمی بھی تین قتل کرنے کے الزام میں سات سال جیل میں گزار کے آیا ہے اور یہ سزا کاٹنے کے بعد بھی اُس نے بس نہیں کیا بلکہ بڑھ گیا میں ایک شخص کو پھڑ مار کے ختم کر دیا۔ سلگتے میں چاندیاں اور موہجار جیسے بدمعاشوں کو چاقو مار کے ہلاک کر دیا اور اُس کا تعلق سلگتے کے مشہور آدمی مجل سے رہا ہے' اُس کی بہن کو ٹھے پہ بیٹھا کرتی تھی اور اُس کے گھر کے باقی آدمیوں کا کچھ اتا پتہ نہیں ہے' وہ سولہ سترہ

سال کی عمر میں ایک کم سن لڑکی کو گھر سے لے کے فرار ہو گیا تھا۔ اگر راج کرشنا کو یہ ساری باتیں یا ان میں سے کوئی ایک بات معلوم ہو جائے تو اُس کے ذہن پہ کیا اثر ہو گا؟ اگر وہ میرا خیال کرے گا تو اُس کے اُصول مجروح ہوں گے۔ اتنی عمر تنہائی کی گزارنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنا، جھوٹ سننا پڑے گا۔ میں نے پہلے ٹھیک فیصلہ کیا تھا "مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیئے اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے" میں خود وضاحت بھی نہیں کر سکوں گا کہ یہ سب مجھ سے کیوں ہو گیا۔ مجھ سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ میں نے آپا جان اور اماں پر شبہ کیا کہ وہ کورا کو کہیں باہر نہ نکال دیں اس لیے میں کورا کو وہاں سے لے کے چلا آیا تھا۔ اگر میں وہیں بیٹھا اُن سے لڑتا رہتا تو شاید وہ میری بات مان لیتے اور کورا کو گھر میں رکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتے مگر وہ کیسے رکھتے اور میں نے کیا غلطی کی۔ جب تک کورا رہی اُسے اُوپر چھت پہ بنے ہوئے ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا تاکہ محلے والے اُسے نہ دیکھ سکیں، اُسے رشتے دار ہوں اور محلے والوں سے کب تک چھپا کے رکھا جا سکتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اُس کا راز فاش ہو ہی جاتا۔ میں اسے غلطی نہیں کہتا کہ مجھے کورا کا خیال ترک کر دینا چاہیے تھا میں نے اُسے چھوڑ گیا چھوڑ آیا یا آپا جان کی خواہش پہ تھانے میں رپورٹ درج کرا دی جاتی۔ میں مر جاتا مگر مجھ سے یہ کبھی نہ ہوتا۔ سو جو کچھ ہوا، اُس میں میری مرضی کہاں شامل تھی۔

میں نے قلم اُٹھایا اور کاغذ پہ راج کرشنا کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ کوئی لقب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں قلم ہاتھ میں رکھے لکھے سوچتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ الٹی ترچھی لکیریں کھینچ کے نیچے اپنا نام لکھ دوں مگر کون سا نام؟ بابر لکھوں، ظہیر خاں لکھوں، لاڈلا لکھوں، فقیرا لکھوں، سکندر اکھوں، شہزادہ لکھوں کیا لکھوں اور جاؤں گا کہاں؟ زرین کے پاس کہ وہ میرے رابطے میں تقریباً سب کچھ جانتی ہے اور میرے لیے دعائیں کر رہی ہو گی۔ میری زرین، پتہ نہیں وہ اکیلی رہ گئی ہے یا نجمل ابھی تک اُس کے پاس موجود ہے۔ میں زرین کے پاس جا کے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاؤں گا مگر وہ جب سامنے آتی ہے تو کورا کی یاد آتی ہے اور دل ہولنے لگتا ہے۔ تو جب تک بن رہی ہے راج کرشنا کے پاس ہی کیوں نہ ٹھیرا رہوں۔ فہمیدہ کے پیروں میں گھنگرو دیکھ لینے اُس کے حسن کے بارے میں تمام شبہوں کے تجربے سن لینے تو اب راج کرشنا کی آنکھیں دیکھنے اور باتیں سننے سے کیا اثر پڑتا ہے۔

تمام گھر واپس آ کے راج کرشنا اُس کی معذرت کرنے لگا کہ مجھے دن بھر تنہا گھر میں رہنا پڑا اور وہ مجھے خیریت کا فون بھی نہ کر سکا۔ وہ کچھ مطمئن مطمئن کوشش کوشش لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے خیال سے اپنے چہرے پہ جبری خوش حالی طاری کی۔ اُس نے مجھے فی الفور لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی وہ میرے لیے نئے سوٹ لے کے آیا تھا جس کے ناپ پہلے دن درزی نے لیے تھے۔ میری ٹالی کی گرہ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے درست کی۔ جدید وضع کے اُس لباس میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ "ایک دم فرسٹ کلاس۔" وہ مجھے سراپا گھورتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ "اے جنٹلمین پرفارمنس۔" وہ گفتگو میں بار بار انگریزی بولنے لگتا تھا۔ پھر اُسے میرا خیال آتا تھا تو فوراً زبان بدل دیتا تھا۔

ہماری گاڑی جس دروازے سے اندر داخل ہوئی، اُس کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ قاصی دُور جلے کے شاہی محلات کے طرز کی ایک شان دار عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے راج کرشنا کے ساتھ قدم ملانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایک قدم آپ تول کے اٹھا رہا تھا میں نے بھی اُس کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ پگڑی والے ایک دربان نے جھک کے راج کرشنا کو سلام کیا، مجھے بھی کیا۔ میرے ہاتھ خود بخود مصافحے کے لیے اُٹھ گئے پھر جھک کے رہ گئے۔ راج کرشنا لے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا میں بھی تیز قدموں سے اُس کے برابر ہو گیا۔ ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں دھیما دھیما سا شور تھا۔ قریب مردوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ راج کرشنا کی آمد پہ ہال میں ایک سناٹا چھا گیا پھر کئی لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے اور زور زور سے مصافحے کرنے لگے۔ کسی نے اُس کا بازو پکڑا اور کسی نے اُسے گلے لگایا۔ راج کرشنا مہذب انداز میں سب کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ میں بھی اس ہجوم میں اُس کے ساتھ تھا۔ "میرا چچا زاد بھائی ظہیر خاں۔" اُس نے لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرائی۔ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت اُبل پڑی۔ "آپ کا بھائی؟" کسی نے تعجب سے پوچھا۔ راج کرشنا نے سَر ہلا کے کہا۔ "ہاں میرا بھائی، میرا دوست، میرا بیٹا۔" لوگ مسکرا کے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ پھر اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا میرے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا، رستم جی تھے۔ وہی رستم جی جو پہلے دن رستوران میں ملے تھے، اُن کے ساتھ اُن کی بیٹی بھی تھی۔ "میں نوین ہوں۔" اُس نے شوخی سے کہا۔

"مجھے..... مجھے آپ کا نام معلوم ہے۔" میں نے سٹ پٹا کے جواب دیا۔

"ہائیں۔" وہ جھلملاتی ہوئی نظروں سے بولی۔ "میں سمجھی کہ آپ میرا نام بھول گئے ہوں گے۔ آپ دونوں کو اُس دن کے بعد سے آج دیکھا ہے۔"

"فرصت ہی نہیں مل۔" میں نے لفظ چبا چبا کے کہا۔

"پاپا بتا رہے تھے کہ کل آپ لوگوں نے بہت بڑے بڑے جوہر پکڑے ہیں۔ دیر جیسے۔ مجھے تو لگ پکی اگئی۔ پاپا نے مجھے اخبار بھی دیا تھا مگر مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔"

"میں نے نہیں، کرشنا جی نے پکڑے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"وہ باتیں ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔

"چلیئے دو سہی۔" اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت کھل کھلا پڑے۔

راج کرشنا لوگوں کے درمیان اس قدر گھر چکا تھا کہ میری طرف توجہ نہیں دے سکا۔ وہاں زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ میں وہاں کے طور طریق سے بالکل ناآشنا تھا۔ جب نوین نے مجھے اپنی میز پہ لے جانے کے لیے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان کسی اجنبی لڑکی کا ہاتھ تھام کے گھومنا پھرنا میرے لیے عجیب سی بات تھی مگر وہاں مردوں اور عورتوں میں ایسا کوئی تکلف نظر نہیں آ رہا تھا، مجھے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ میں نے جھٹ اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے ساتھ چلا کے ایک خالی میز پہ بیٹھ گیا۔ "کچھ کھیلیں گے؟" اُس نے مجھے متجسس نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو پھر کن چیزوں سے دلچسپی ہے آپ کو؟"

میں اُس کے سوال کا جواب فوراً نہیں دے سکا۔ "کسی چیز سے نہیں۔"

"کسی نہ کسی چیز سے تو ہو گی؟"

"نہیں۔"

"یعنی دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز سے نہیں۔"

"حیرت ہے۔" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"آپ کو کھانے کون کون سے پسند ہیں؟"

"جو مل جائیں۔ ویسے مجھے میٹھے چاول بہت پسند ہیں۔"

"میٹھے چاول۔" وہ ہنس پڑی۔ "اور لباس کون سا؟"

"سبھی۔" میں نے اُکتا کے کہا۔ "آپ ایسے سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

"پھر ہم کیا باتیں کریں؟" وہ چونک کے بولی۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے اپنے شانے اچکائے۔ "کیا میں اچھی باتیں نہیں کرتی؟"

"نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ باتیں بھی اچھی کرتی ہیں مگر..... مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے؟" اُس نے اپنے ہاتھ سے میری کلائی چھو لی۔ "بہت گرم ہو رہا ہے تو آپ کو ہلکا بخار ہے۔ اوہ، تو اُس کے چہرے سے گھبراہٹ دُور ہوئی۔ "آپ کو اپنی زمینیں یاد آ رہی ہوں گی؟ سب کھلا ہی کھلا، ہریالی ہی ہریالی۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے سَر ہلا کے کہا۔

"اور آپ کو کرشنا جی روکے ہوئے ہوں گے۔ اچھا ہے مجھ سے ملیں گے تو میں کہاں گئی، آپ کو ابھی اور روکیں۔"

"کھیل؟ آپ کو کیا مزہ آئے گا؟"

"پھر آپ بہت دنوں بعد جب اپنے گھر جائیں گے تو آپ کو اپنی پرانی چیزیں نئی معلوم ہوں گی اور آپ پہلے سے زیادہ سکون محسوس کریں گے۔"

"ہاں!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"آپ کچھ اُداس اُداس لگتے ہیں۔"

"نہیں تو۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"ہائیں بھی کم کرتے ہیں حالانکہ اُس دن کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ آپ جب باتوں پہ آتے ہیں تو سب کو خاموش کر دیتے ہیں، آپ کا موڈ بھی کب ایسا ہوتا ہے؟"

"موڈ کا پتہ کیسے ہوتا ہے۔"

"اگر آپ کا ہی گھبرایا کرے تو آپ ہماری طرف آ جایا کیجیے۔ پاپا کی کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں، اُن کے دو جہاز بھی ہیں، جب اِدھر ساحل پر ہوتے ہیں تو ہم چند روز وہیں رہتے ہیں۔ اب بھائی آنے ہی والا ہے، اس بار آپ بھی ساتھ چلیئے گا۔ ہم ساحل سے بہت دُور رہیں گے۔ ہیں تالا کیسا پروگرام رہے گا۔"

"بہت اچھا رہے گا۔" میں نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ راج کرشنا ہماری طرف آ گیا۔ اُس نے مجھے نوین کے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کے میرے متعلق کیا خیال کیا ہو گا، یہ سوچ کے مجھے جھینپ آنے لگی۔

"شکریہ نوین کہ تم نے ان کا خیال رکھا۔" کرشنا نے کہا۔ اُس کی آواز موسیقی کے شور میں دب گئی۔ ہال کے ایک کونے میں بینڈ باجے والوں نے ساز بجانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اور مرد ہال کی خالی جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ناچنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے کنکھیوں میں پڑھا تو نوین کہہ رہی تھی۔ "آیئے میرے ساتھ رقص کیجیئے۔" نوین نے اشتیاق سے کہا۔

"تم آج کیوں رقص کر رہی ہو؟ رقص تو روز ہوتا ہے اور تم گم سم بیٹھی دیکھتی رہتی ہو۔ آج کیا بات ہے؟" کرشنا نے شگفتگی سے پوچھا۔

"آج۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "بس آج جی چاہ رہا ہے، آؤ۔"

اُس نے میری جانب ہاتھ پھیلایا۔ میں نے بے چارگی سے راج کرشنا کو دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" کرشنا نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر تھرکنے لگے۔ میری آنکھیں گھلی کی گھلی رہ گئیں۔ وہ یقیناً میرے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ ساز تھمے دھن بدلتے تو کبھی رقص میں تیزی آ جاتی کبھی مندی۔ مرد عورتیں بدل لیتے اور عورتیں مرد بدل دیتیں لیکن وہ سب سنجیدہ تھے۔ بہت شائستہ۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی اوچھی بات نہیں کی، نہ کوئی فقرہ کسا، نہ سیٹی بجائی۔ شوخی جان اور شرارہ وغیرہ کے رقص کے دوران میں جو باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ بھی میں نے سنی تھیں۔ رقص کے بعد کھانے کی میزوں پہ کھانا چن دیا گیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، ایک خوش پوش ادھیڑ عمر شخص نے کھانے سے پہلے انگریزی میں اعلان کیا کہ کلب کے معزز ارکان کی خواہش کے مطابق آج کی رات کلب کے ریکارڈ میں مسٹر راج کرشنا کی رات کے طور پر درج کی جائے گی۔ کلب کے معزز ارکان کی درخواست ہے کہ مسٹر راج کرشنا شہر کراچی پر تشریف لائیں۔ اعلان کرنے والے نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ مسٹر راج کرشنا نے اس شہر کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، یہ کلب کی طرف سے

اُن کے اعتراف کا ایک حقیر اظہار ہے۔ اِس سلسلے میں کلب مسٹر راج کرشنا کے اعزاز میں ایک رسمی تقریب منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تقریب کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔ تمام بہترین خواہشات راج کرشنا صاحب کے لیے بمبئی کے معززین انھیں خلوصِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔" ایک بار پھر ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

نورین میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولی: "کلب میں یہ اعزاز بہت دنوں بعد کسی کو ملا ہے۔" راج کرشنا آنکھیں بند کیے، سر جھکائے جانے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نورین نے آہستہ سے اُسے ٹوکا کہ اُس کے لیے شہر کرسی خالی پڑی ہے اور سب لوگ منتظر ہیں۔ واقعی سب لوگ منتظر تھے۔ راج کرشنا سے دوبارہ بہ آوازِ بلند درخواست کی گئی۔ راج کرشنا جھجکتا ہوا اٹھا اور آہستہ قدموں سے شہر کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ کھڑے ہو کے تالیاں بجاؤں۔ میں کھڑا ہو گیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ میں اکیلا کھڑا تھا اور پشیمانی سے بیٹھنے ہی والا تھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ راج کرشنا کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ تالیاں ختم ہوئیں تو وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اُٹھا اور چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اُس نے چاروں طرف سر گھمایا۔ پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ اُس نے انگریزی میں کہنا شروع کیا: "خواتین و حضرات! اِس اعزاز کا شکریہ بہت بہت شکریہ۔" اُس کی آواز بہک رہی تھی۔ "یہی باتیں ہیں احساسات کام کرنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں مگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے کبھی ستائش کے خیال سے اپنا فرض ادا نہیں کیا ہے بلکہ میں نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنایا تھا، مجھے خوشی ہے کہ اُسی پہ کاربند ہوں۔ ایک یہی مقصد ہے جو ہر میری رہبری کرتا رہا ہے۔ آج کے واقعات کے بارے میں آپ میری زبانی کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے مگر یہ ایک مناسب موقع نہیں ہے۔ میں..." اُس کا گلا رُندھنے لگا اور آواز لرز کر رہ گئی۔ "آج کے واقعات کے لیے آپ نے مجھے جس اعزاز سے نوازا ہے، میں اصل میں اُس کا مستحق نہیں ہوں۔" یہ کہہ کے وہ رُک گیا۔ ہال میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ سب مٹھیاں باندھے راج کرشنا کو دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں خون جم گیا تھا۔ "کل کے واقعے کے تمام اعزاز کا مستحق میرا عزیز ظہیر خاں ہے۔ وہ دجیہہ اور دل کش نوجوان جو پہلی قطار میں منہ پھیلائے بیٹھا ہے، یہ سب اُسی کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتاؤں گا اور نہ آپ براہِ مہربانی تفصیل پوچھنے کے لیے اصرار کریں۔ اِس شہر کرسی پر بیٹھنے کا سزاوار ظہیر خاں ہی ہے، میں اُس کے لیے اپنی نشست خالی کرتا ہوں۔"

پہلے تو ہال میں جیسے سارے لوگ آوازوں سے محروم ہو گئے پھر دفعتاً ایک شور گونجا۔ نورین بے طرح مجھے جھنجوڑنے لگی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ سب سے بڑی مشکل مجھے اپنا رویہ متعین کرنے میں پیش آئی۔ بقول راب دینے لگی کہ اس موقع پر کس تاثر کا اظہار کرنا چاہیے۔ اصولاً راج کرشنا کو یہ تاثر دینا چاہیے تھا کہ اُس نے میرے بارے میں جو کہا ہے، وہ میں نے انگریزی میں نا واقفیت کے سبب نہیں سنا ہے اور اگر میں اسی طرح بُت بنا بیٹھا رہتا تو ان پڑھے لکھے معزز لوگوں کے سامنے راج کرشنا کی توہین ہوتی کہ وہ اپنے جس عزیز کو اتنی عزت دے رہا ہے وہ ایک جاہل شخص ہے۔ میرا دل جھٹکے کھانے لگا اور جسم کی تمام طاقت خاک ہونے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مٹی کا پتلا ہوں اور ابھی ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے میری یہ سنگ کیفیت انکسار پر محمول کی گئی۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ پھر راج کرشنا ہی نے میرے اوسان بحال کیے۔ اُس نے اردو میں مجھے آواز دی: "ظہیر خاں! اِدھر آؤ اور یہ کرسی سنبھالو۔"

سب لوگوں کی نگاہیں مجھی پر جمی ہوئی تھیں، میری ایک ایک حرکت ایک ایک جنبش پر۔ نورین نے مجھے زبردستی اٹھا دیا اور میں اٹھنے کو تو اُٹھ گیا مگر راج کرشنا تک پہنچنے کا گزوں کا فاصلہ میلوں برابر ہو گیا۔ ہر قدم پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا لپکتا رہا۔ بجلی کی طرح حتمی ایک خیال سے نکلنے کے کئی اندازے تھے: 'یک بارگی میرے جی میں آیا کہ بس یہاں سے فوراً بھاگ نکلوں۔ راج کرشنا کا یہ مذاق بہت ستم ناک ہے۔' کرسی کے قریب راج کرشنا مجھے لینے آگیا۔ اُس نے جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے کسی قدر توانائی محسوس ہوئی لیکن شہر کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جب میں اُن سب کے سامنے کھڑا ہوا تو مجھے کسی کی شکل صاف نظر نہیں آئی۔ وہاں ہر چیز بیٹھے بیٹھے تھے اور سارا ہال لرز رہا تھا۔ دیواریں مجھ پر گری پڑ رہی تھیں اور میں فرش میں دھنسا جا رہا تھا۔ میرے سارے حواس منتشر منتشر ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود میرے برابر بیٹھ گیا۔

یقیناً لوگ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ اب میں اپنی زبان سے کچھ کہوں گا مگر کسی کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ کچھ کہتا بھی۔ میری زبان پر تو قفل گر گیا تھا۔ راج کرشنا خود اُٹھ کھڑا ہوا: "خواتین و حضرات مجھے اندازہ ہے کہ آپ ظہیر خاں کی زبانی کچھ سننے کے مشتاق ہوں گے۔ میری بھی یہی خواہش ہے مگر میں آپ سے درخواست کروں گا۔" اُس نے شستہ انگریزی میں کہا۔ "کہ یہ ایک موزوں وقت نہیں ہے یہ گفتنی ناگفتنی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔" اُس نے میرا بازو دبا کے مجھے جلدی سے اٹھایا۔ "میں اپنی اور ظہیر خاں کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آیئے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" راج کرشنا نے سب کے سامنے سر جھکایا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی اور جب اُس نے آخری مرتبہ شکریہ ادا کیا تو میں نے اُس کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش بھی کی۔ میری آواز تالیوں میں ڈوب گئی۔ میرے حواس کچھ کچھ درست ہونے لگے تھے اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میرے دل میں کچھ بولنے کی خواہش ابھری لیکن ہمت نہیں پڑی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنی نشستوں سے اُٹھ گئے تھے اور میرے اردگرد اژدہام ہو گیا تھا۔ راج کرشنا پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آج کے واقعے کے بارے میں اُس سے کسی قسم کی تفصیل طلب نہ کی جائے چنانچہ لوگ پُراسرار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ نورین کے ضدی پن پر ہنسی دیکھ کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے کوئی ایسی نمایاں بدتمیزی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ میں شہر کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جو کچھ اپنے اندر، اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا شکر ہے کہ اُس کی خبر لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ راج کرشنا نے بہت خوش اسلوبی سے بات نبھائی تھی اور وہی تھا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک بُرا وقت ٹل گیا۔

سب لوگ کھانے کی میزوں پر آ گئے۔ لوگوں کی ہمت افزا باتیں سُن کے اور تجسس شناس نگاہیں دیکھ کے میری حالت کہیں معمول پر آئی۔ نورین اب بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اُس بڑی میز کے اطراف بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد اُس ماحول سے میری اجنبیت کسی حد تک دور دور ہو گئی۔ لوگ مشروبات پی رہے تھے اور پورے ہال میں جشن کی سی فضا ہو گئی تھی۔

سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے تھے۔ کئی عورتیں اور کئی مرد ناچنے لگے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے فرش پر رینگ رہے ہوں یا کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔ راج کرشنا نے مجھ سے پوچھا: "کیا تم رقص کرو گے؟"

"ہاں۔" میں نے تیزی سے کہا: "چلیے، وقت بھی بہت ہو گیا ہے۔"

اپنے پاس بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں سے راج کرشنا نے مصروفیت کا عذر کر کے جانے کی اجازت چاہی۔ نورین کہنے لگی کہ مجھے وہ یہیں چھوڑ جائے پھر رات کو کسی وقت وہ مجھے گھر پہنچا دے گی۔ راج کرشنا نے اُس کی فرمائش مسترد کر دی۔ نورین کا چہرہ بجھ گیا اور وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئی۔ جن جن میزوں کے درمیان سے ہم گزرے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے مگر آخری میز سے پہلے والی میز سے گزرتے وقت کوئی ہم سے آگے نہیں بڑھا۔ وہ ۳۰، ۳۵ سال کی ایک صحت مند خوبصورت اور پُرکشش نباس عورت تھی جو اپنی کرسی سے اُٹھ کے ہمیں وداع کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے راج کرشنا کو پرنام کیا پھر مجھے۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی جانب میری نگاہ کے اٹھنے سے اُس کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اُس نے جلدی سے اپنی ساڑی درست کی۔ اُس کا بدن سٹنے لگا مگر میری نگاہ متزلزل نہیں ہوئی۔ راج کرشنا نے بھی میرا یہ انہماک دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھنے کے بجائے اُس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اِس طرح عورت راج کرشنا کی جانب متوجہ ہو گئی اور مجھے اُس کی طرف غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ تبھی نورین نے مجھے آگے کی طرف کھینچا تو مجھے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا اور میں ندامت سے آگے بڑھ گیا۔ میرے چلتے ہی راج کرشنا نے بھی اُس عورت سے باتیں بند کر دیں اور ہمارے پاس آ گیا۔ دروازے پر ایک بار پھر میں نے گھوم کے اُسے دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ میں لوٹ پڑا گیا۔ نورین نے ہمیں رخصت کرتے وقت بہت سے دعوے لیے، نہ جانے میں نے کیا کیا کہا۔ وہ واپس اندر چلی گئی اور ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں نے سوچا، میں راج کرشنا سے اُس عورت کے بارے میں پوچھوں جو آخری زینے سے پہلے والی میز پر بیٹھی تھی۔ راج کرشنا جیسے میرے دل میں بیٹھا تھا، گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا: "کیا تم اُس عورت کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے بے قراری سے جواب دیا: "وہ کون ہیں؟"

"وہ ایک سمرسیدہ عورت ہے، بہت مال دار۔ ابھی ایک سال ہوا اُس کا شوہر ایک حادثے میں مارا گیا مگر تم اُسے اس طرح کیوں گھور رہے تھے؟" اُس نے بے یقینی سے پوچھا: "کیا تمھیں وہ عورت اچھی لگی؟"

"نہیں۔" میں نے جھینپ کر کہا: "ایسی بات نہیں ہے، بات کچھ اور تھی۔" میں نے ایک بار پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا کے پھول کے دیکھی۔ "مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"میں۔۔۔۔ میں۔" میری زبان ہکلانے لگی: "کیا آپ اُس عورت سے کوئی بات پوچھ سکتے ہیں؟ ہر مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے کہیں یہ بُری بات تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں۔" اُس نے مسکرا کے کہا: "پولیس والے ہر قسم کا سوال کر لیتے ہیں۔ میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ اُسے بتاؤں یا خاموش رہوں۔ میں نے سوچا، ایک بار یک میں آدمی ہے، بات سے بات نکال لے گا لیکن تسلی کیے بغیر میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے مدھم آواز میں کہا: "اُس عورت کے گلے میں جو مالا ہے، میں اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"بارا!" وہ حیرت سے بولا: "مگر۔۔۔ مگر وہ کیا بار ہے؟"

"کیا آپ اُس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ اُس نے کہاں سے خریدا ہے؟ بس آپ اتنی بات پوچھ لیجیے۔" میں نے اُس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا: "یہ تو بہت معمولی بات ہے میں اُس سے ابھی پوچھے لیتا ہوں لیکن اگر اُس نے کوئی اور سوال کیا؟"

"کیا آپ اُسے ٹیلی فون کر کے میں نہیں بلا سکتے؟"

"میں اُسے کہیں بھی بلا سکتا ہوں۔"

"تو بلا لیجیے۔"

"اچھا۔" وہ کچھ دیر ٹہلتا رہا، پھر واپس عمارت کی طرف چل پڑا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ دروازے پر پہنچ کے وہ کچھ جھجکا اور اُس نے دربان کو

حکم دیا کہ وہ مسز روپ پنیل کو باہر بھیج دے۔ ہم دروازے سے سٹ کے کھڑے ہو گئے۔" دربان فوراً واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ روپ بھی تھی۔ اس کا چہرہ فق تھا۔ راج کرشنا نے اس سے اس زحمت کے لیے معافی چاہی تو اس کا رنگ واپس آ گیا۔ "مسز روپ! کیا آپ مجھ سے کچھ سلوک کریں گی؟" راج کرشنا نے شرم سار لہجے میں پوچھا۔

"ضرور، آپ کہیے، میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"میرا دوست ظہیر خاں یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ نے یہ ہار جو آپ کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے کس طرح حاصل کیا ہے؟ کس طرح سے مراد یہ ہے" راج کرشنا نے وضاحت کی "کہ کب اور کہاں سے حاصل کیا تھا؟ شبکے آپ جواب دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بے حد نجی بات ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ہم نے اسے کوئی تین سال ہوئے خریدا تھا۔ یہ چار موتی اور یہ ہیرا۔ مجھے ان کی قیمت کا تو پتہ نہیں ہے مگر یہ ایک بہت قیمتی ہار ہے اور پٹیل صاحب نے ہماری شادی کی تیسری سال گرہ پر مجھے پہنایا تھا۔ یہ ہار میں نے ہی پسند کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے اسے خرید بھی لیا ہے، سال گرہ آئی تو میں اسے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔"

"بہت شکریہ۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اسے کہاں پسند کیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔ میں نے بیشتر جواہر نما بھائی کے ہاں سے خریدے ہیں یہ ہار انھی کے ہاں سے خریدا تھا۔ وہ اسے عام نمائش کے لیے نہیں رکھتے تھے۔"

"کیا انھوں نے اس ہار کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا تھا؟"

"کچھ ایسا یاد پڑتا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "انھوں نے کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دُنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند نے اُن کے ہاتھ بیچ دیا ہے مگر ایسی باتیں تو تمام جوہری کرتے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ کیا اس ہار سے کوئی انوکھی بات وابستہ ہے؟"

"ہو سکتی ہے۔" راج کرشنا نے کہا۔ "مگر نانا بھائی سے تصدیق کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی انوکھی بات ہوئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

"آپ چاہیں تو یہ ہار لے جائیں، اس طرح آپ کا کام اور آسان ہو جائے گا۔ پھر میں آپ سے واپس لے لوں گی۔" روپ نے ہار اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے آنکھوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔" راج کرشنا نے کہا۔

"کیا آپ ہار مجھے دکھائیں گی؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

مسز روپ نے ہار میرے سپرد کر دیا۔ میں نے غور سے وہ ہیرا اور موتی دیکھے اور ہار میری انگلیوں میں کانپنے لگا۔ بالکل وہی، یہ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے گئے تھے اور یہ ہیرا، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں وہی جسامت، وہی نیلا رنگ، وہی چمک دمک، اسے میں نے سب سے پہلے

بدھ گیا میں اجنبی کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں داخل ہوا تھا تو اس نے اسے مجھ سے چھپا لیا تھا، پھر یہ ہیرا کورا کی اس پوٹلی میں بھی موجود تھا۔ جسے وہ اجنبی کی موت کے بعد بُھگت گیا تھا۔ ہمارے گھر لائی تھی اور جب ابا جان نے وہ پوٹلی کھول کے دیکھی تھی تو اس میں دوسرے ہیروں کے ساتھ یہ ہیرا بھی دمک رہا تھا۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ ان جواہر میں میری مالا کے لیے چند موتی بھی تھے۔ ابا جان نے پوٹلی فوراً بند کر دی تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد کچھ دنوں تک تو مکان کی رقم سے اُن کا گزارا ہوا ہو گا پھر زمینوں کی رقم سے، پھر ابا جان کو یہ جواہر بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہو گی۔ انھوں نے یہ قدم سب سے آخر میں مجبوراً اٹھایا ہو گا۔ شبہے کی بس یہی گنجائش تھی کہ ممکن ہے مسز روپ کے ہار میں یہ ہیرا اُس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہیرا ہو اور موتی بھی میرے موتیوں سے اس حد تک محض مشابہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ دُنیا میں صرف ہی ہیرا اور موتی ہوں۔ اس شکل و صورت کے اور بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ شہر اس شہر میں ابا جان کا قیام، مولوی اکرم کی زبانی سنے ہوئے اُن کے حالات اس شہر میں ہیرے کی فروخت، نانا بھائی کا یہ کہنا کہ اسے ایک ضرورت مند بیچ گیا ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے میرے سینے میں جلن پیدا کر دی تھی۔ میں نے ہار واپس کر دیا۔ مجھ سے اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جا سکا۔

"کیا آپ کی اس ہار سے کوئی وابستگی ہے؟" مسز روپ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے دہشت سے کہا۔ "آپ کا شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں، جب بھی آپ کو اس ہار کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لیجیے گا۔" اُس نے خندہ پیشانی سے کہا۔ اور کرشنا جی! آپ نے ظہیر خاں صاحب کی آتشی تعریفیں کی ہیں، کبھی انھیں ہمارے گھر لائیے۔"

"ضرور مسز روپ۔" راج کرشنا نے یہ کہتے ہوئے میری کمر تھپکی "ضرور۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راج کرشنا تمام راستے خاموش رہا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ ایک عورت ڈرائنگ روم میں شام سے راج کرشنا کی منتظر ہے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر گئے۔

وہاں چمپا بائی بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

مگر وہاں سفید ساڑھی میں ملبوس چمپا بائی ہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا جو میرا تھا۔ وہ بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس نے میری طرف بڑھنا چاہا۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا اور راج کرشنا کی اوٹ میں ہو کر پھُرتی سے چاقو جیب سے نکال لیا لیکن مجھے پھلا کھانے کی مہلت نہیں ملی۔ چمپا جلد ہی سنبھل گئی۔ اُس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں راج کرشنا کو سلام کیا۔ "آپ کب آئیں؟" راج کرشنا نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد پُرتپاک لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"مجھے آئے ہوئے دیر ہو گئی۔" چمپا نے خفت سے جواب دیا۔

"بیٹھیے، بیٹھیے اور تو سب خیریت ہے؟"

"جی ہاں۔" اُس نے نظریں جھکا کے کہا۔ "میں دوبارہ بمبئی آئی ہوں۔ آپ سے آنے کا وعدہ کیا تھا، سوچا آج اسے نبھا دوں۔"

"بہت اچھا کیا۔" وہ بولا۔ "مگر آپ ٹھیری کہاں ہیں؟"

"ایک ہوٹل میں۔" اُس نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل میں کیوں؟" راج کرشنا نے کاٹتی نظر سے بولا۔ "یہ گھر خالی پڑا ہے، آپ یہیں اِدھر آ جاتیں، ظہیر بھی میرے ساتھ ہی ہے کیوں ظہیر؟"

"جی جی ہاں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بس۔ وہ جھینپ کے بولی۔ "ناحق آپ کو زحمت ہوتی، آپ مل گئے اور دعوتیں روا داری کی کرلیں یہی بہت ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ظہیر بھی یہیں ہوں گے۔"

"تو پھر کیا آپ نہیں ٹھہریں گی؟" راج کرشنا نے مسکرا کے پوچھا۔

"نہ۔ تو میں شام کو پھر چلے آتی ہوں۔"

راج کرشنا ہنسنے لگا۔ "آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔" وہ تردد سے بولا۔ "ہم لوگ تو کلب میں کھا کے آئے ہیں۔" اُس نے بھنو کو آواز دی۔

"نہیں نہیں، اس تکلف کی ضرورت نہیں میں کھانا کھا کے آئی ہوں۔" چمپا بائی جلدی سے بولی۔ "بس چائے پی لوں گی۔"

"غلط۔ آپ کھانا کھائیں گی پھر چائے پئیں گی اور ہاں اس کے بعد پان بھی کھائیں گی۔ پھر آرام سے بیٹھ کے باتیں ہوں گی۔ مجھے آپ کا پان اب تک یاد ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو رات کو یہاں قیام بھی کریں، مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں لباس تبدیل کر لوں، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چمپا کا جواب سنے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اور چمپا اکیلے رہ گئے۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور تیز نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ چمپا کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اُسے کس لہجے میں مخاطب کروں۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے جب وہ راج کرشنا سے بات کر رہی تھی۔ تو اس کے ہر لفظ پر میرا دل ہول جاتا تھا۔ نہ جانے اُس کی زبان سے اب کیا نکل جائے۔ یہ میرا گھر بھی نہیں تھا کہ میں اُسے دھکے دے کے نکال دیتا۔ "تم یہاں کیسے آئیں؟" اچانک اُس کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں ٹھیک ہوں مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن آواز نہ نکلی۔ راج کرشنا کے خون سے گھُٹ کے رہ گئی۔ "بتاؤ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"میں اب وہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں نہیں رہ سکتیں؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔

"مجھے اب وہاں نہیں رہا جاتا۔ تمھاری بات مان کے میں وہاں چلی گئی تھی لیکن میں نے یہ دن کانٹوں پر کاٹے۔"

"کیوں آخر کیوں؟" "تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں اس حالت میں تھیں چھوڑ کے گئی تھی۔ اُس نے مجھے یہیں لینے نہیں دیا۔ ان دو ہفتوں میں، میں نے یہاں کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی، ہر گلی کوچے میں تمھیں ڈھونڈتی رہی۔ دیکھو میرے پاؤں، جب ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو کرشنا جی سے رہنمائی کے لیے یہاں آ گئی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"کیسی معافی؟" میں نے تلملا کے کہا۔ "کیا وہ واپس آ جائے گی؟"

"وہ تو واپس نہیں آ سکتی۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا لیکن جب تک تم سچے دل سے معاف نہیں کرو گے، مجھے سکون سے موت تک نہیں آئے گی، خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں نے تمھیں معاف کیا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "اُس کی قسمت تھی۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور دیکھو یہاں اپنی زبان مت کھولنا۔ کرشنا جی اگر تم سے میری قرابت کے بارے میں کریدیں تو کچھ بھی بات بنا دینا مگر کوئی اور بات زبان پر مت لانا، سمجھ گئیں؟"

"سمجھ گئی۔ تم مجھے اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہو، مجھے تمھاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم اگر یہاں نہ ملتے تب بھی میں اُسے کچھ نہیں کہتی۔ بہرحال اچھا ہوا تم ان کے پاس چلے آئے، خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔"

مجھے کچھ سکون ہوا۔ "مگر تم، ..... تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کیا سوچوں گی۔" وہ سانس بھر کے بولی۔ "میری تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن تمھاری خدمت کرتے ہوئے گزار دوں، یہی سوچ کے بمبئی آئی تھی کہ تمھیں ڈھونڈ کے، جہاں تم رہو گے، وہاں میں بھی کسی کونے میں پڑ رہوں گی، تم مجھے اپنے گھر میں اتنی جگہ تو دے دو گے کہ میں اپنا یہ سیاہ چہرہ چھپا سکوں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہوں۔ تم مجھے ایک ملازم سمجھ کے قبول کر لو گے۔ میں اب اُن لوگوں میں واپس جانا نہیں چاہتی اور نہ تمھیں پریشان کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"تم یہ باتیں پہلے بھی کر چکی ہو اور میں ان کا جواب دے چکا ہوں۔ میں تمھیں کیا بتا سکتا ہوں، میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے چمپا بائی۔ تمھیں میری حالت معلوم ہے۔ میں یہاں خود کرشنا جی کے جہاں بھٹکا ہوا ہوں۔ میری مانو تم کہیں اور کہیں اور چلی جاؤ۔ دُنیا بہت بڑی ہے۔ اگر تم نے اچھی زندگی گزارنے کا عہد کر لیا ہے تو تمھیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"مگر مجھے ہر جگہ تمھارا خیال ستائے گا۔"

"میری بات چھوڑو۔" میری آواز بھرا گئی۔ "میں کوئی یقینی نہیں ہے جب تک بات چل رہی ہے چل رہی ہے۔ پتہ نہیں کل میں کہاں ہوں، کیا ہو جائے۔"

"نہیں تم رہو گے۔" وہ دہشت سے بولی۔ "اور تمھارے لب پھڑپھڑائے جا رہے ہیں گے۔ تم تو اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔"

"اتنی جلدی" میں نے تحمل سے کہا۔ "تمہیں کیا معلوم"۔

"ہاں مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن اتنا تو میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری عمر کیا ہے خانے تمہیں دماغ بھی دیا ہے، حوصلہ بھی تم ایک مرد ہو"۔

"بس چمپا بائی" میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ راج کرشنا لباس تبدیل کر کے واپس آ گیا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ چمپا بھی سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ وہ ہم دونوں کو سکرا کے دیکھنے لگا لیکن ابھی ٹھیک طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے خیال آیا، بھجو نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ اس نے چمپا سے مدد کی اور بھجو کو دیکھنے کے لیے خود ہی اٹھ کے اندر جانے لگا۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی جیسے ہی وہ اوجھل ہوا میں نے پیچھے سے کہا۔ "میں کل صبح تمہارے پاس آؤں گا تم اسی ہوٹل میں تھیرے ہوئے ہو نا؟"

"ہاں!" اس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

راج کرشنا بھجو پر نارائن ہوتا ہوا فوراً ہی واپس آ گیا اور کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کے یوں ہی سستاتا رہا۔ وہ صرف ایک بار ریل میں سفر کے دوران چمپا سے ملا تھا لیکن ایک دن کی اس ملاقات کا نقش اتنا گہرا تھا کہ راج کرشنا سے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کا آدمی تھا اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو رائے کرتے ہوئے دیر لگتی ہے۔ چمپا نے مجھے محتاط رہنے کا یقین دلا دیا تھا مگر میرا دل مطمئن نہیں تھا، نجانے راج کرشنا کیا کمال کر بیٹھے اور چمپا سے بات بنائے نہ بنے۔ چمپا کی آمد کے بعد خود میری خاموشی اور سکوں آمیز اضطراب سے راج کرشنا کا ذہن کسی طرف بھی جا سکتا تھا۔ ایک بات سے پردہ اٹھتا تو بہت سے پردے اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ راج کرشنا پولیس افسر تھا اور شاید یہی ایسا اس کے حواس عام آدمیوں سے کئی گنا تیز تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں بظاہر دلوار کی سمت دیکھ رہی ہیں مگر وہ ہم دونوں کو تول رہی ہوں گی۔ چند لمحے سکوت رہا پھر وہ بھجو کے بولا اور اور سنائیے کیسے مزاج ہیں آپ کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

"جی" چمپا سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ظہیر کو یہاں دیکھ کے آپ کو خاصا اچنبھا ہوا ہوگا۔ یہ مجھے ملے تو میں انھیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ ایک آپ کی کمی محسوس ہوتی تھی اب آپ بھی آ گئیں۔ بمبئی میں میرا گھر ہو اور آپ ہوٹل میں ٹھیریں۔ یہ ایک بہت نامناسب بات ہے ویسے بھی یہاں کسی کرے خالی پڑے ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میری ماں یہاں ہوتی تو مجھے بہت برا بھلا کہتی کہ میں آپ جیسے محسنوں کو اسٹیشن ہی سے اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا۔ بعد میں میں آپ دونوں کو کئی دنوں تک ڈھونڈتا رہا۔

"شرمندہ مت کیجیے، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" چمپا ہلکے سے ہنسی کے بولی۔ "ہاں ظہیر نے لے تک اس وقت اپنے حواس بجا رکھے تھے، اگر آپ اسے احسان سمجھتے ہیں تو وہ ظہیر خاں نے کیا ہے۔ میں تو ایک تماشائی بن کی طرح سب کچھ دیکھتی رہی تھی"۔

"نہیں آپ بھی میری وجہ سے ایک نازک وقت سے دوچار ہو گئی تھیں۔ آپ نے میرے ساتھ بہت سلوک کیا۔ مجھے سب باتیں یاد ہیں میں نے ظہیر خاں کو یہاں لانے کا کہا تھا کہ یہ احسان کا معاوضہ نہیں جس کا معاوضہ ادا کیا جائے وہ احسان نہیں ہوتا۔ آپ یہاں ٹھیریں گے مجھے خوشی ہوگی۔ ظہیر بھی اکیلا رہتا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے آپ یہاں رہیے۔ کسی بات کا تکلف مت کیجیے"۔

"شکریہ" چمپا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گی، ہوٹل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے"۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کل صبح میں ڈرائیور سے کہوں گا وہ آپ کا سامان لے آئے گا۔" راج کرشنا نے افسرانہ انداز میں فیصلہ سنا دیا۔ میں سنتا اور دیکھتا رہ گیا۔ چمپا بہت جز بز ہوئی۔ دونوں نے میری طرف دیکھا میں درمیان میں دخل دینے والا کون تھا۔ یہ راج کرشنا کا گھر تھا، وہ اپنے گھر میں کسی کو بھی مہمان رکھ سکتا ہے۔ میں نے نگاہیں چرا لیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ عورت کون ہے تم ایک پولیس افسر ہو سب سے پہلے ہی تمہارے گھر میں ایک مشتبہ آدمی پر چھاپہ مارا گیا ہے۔ اب دوسرے کو دعوت دے رہے ہو۔ اپنے عہدے کا خیال کرو کبھی بات کھل گئی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے ہی لوگ تمہارے دشمن ہیں ہر جگہ کتے چھوڑیں گے کہ راج کرشنا جیسے مشہور پولیس افسر کے ہاں فیشن ایبل عورتوں کی محفلیں جمتی ہیں۔ ایک طوائف چمپا بائی ٹھیری ہوئی ہے اور ایک نوجوان جس نے قتل کے الزام میں سات سال جیل میں گزارے ہیں مجھے حیرت تھی کہ راج کرشنا کی باریک بیں نگاہیں چمپا کے چہرے، اس کی باتوں اور انداز و اطوار کو جانچ کیوں نہیں لے رہی ہیں۔ گو چمپا کے چہرے اور لہجے میں بہت سادگی تھی کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ایک طوائف ہوگی مگر وہ تو راج کرشنا تھا نظر پرکھتا ہوا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اسے جاننا چاہیے تھا کہ ایک عورت یکہ و تنہا ہوٹل میں ٹھیری ہوئی ہے۔ وہ رات کو اس وقت یہاں موجود ہے۔ کوئی عورت کسی وجہ سے بار بار اس شہر کا رخ کرتی ہے اور ہوٹل میں ٹھیرتی ہے۔ راج کرشنا کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیے تھا کہ میں نے اس کے سامنے چمپا سے کوئی بات نہیں کی ہے اور نہ اس کی طرح میرے چہرے پر بھی چھاپا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو اس نے چمپا کے بارے میں پوچھا تھا وہ کہاں چلی گئی ہیں۔ میں نے سرسری طور پر اس کا ذکر کیا تھا کہ کس وہ چل گئی ساج کرشنا کو اگر یہ خیال تھا تو یہ باتیں محسوس کرنی چاہیے تھیں۔ شاید وہ سفر کے دوران جاسے بارے میں اپنے لگائے ہوئے اندازوں پر پریشاں تھا اور اب ہمارے متعلق کوئی غلط بات سوچنے کے لیے اس کا ذہن آمادہ نہیں ہوتا ہوگا، چمپا کی آمد پر میری خاموشی اور گھبراہٹ، اس نے میری کسر نفسی پر محمول کی ہوگی مگر میرے پاس خاموش بیٹھنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چمپا اچانک یہاں دیکھ کے جھوٹ موٹ کی خوشی کا اظہار مجھ سے کبھی دیکھا جاتا اور نہ میں ناراضی کا اظہار ہی کر سکتا تھا کہ چمپا کی برہمی کا اندیشہ بھی تھا

بھجو نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔ چمپا کی وجہ سے ہم دونوں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ چمپا چند ہی لقمے منہ میں ڈال سکی، اس اثنا میں راج کرشنا بل ادا کر کے والے آدمی اور اس کے گروہ کے متعلق دلچسپ باتیں سناتا رہا۔ چمپا گردن جھکائے سنتی رہی۔ کھانے کے بعد راج کرشنا نے اسے آرام کا مشورہ دیا۔ وقت بھی کافی ہو چکا تھا، وہ واپس جانے کی درخواست کرتی اس سے پہلے راج کرشنا نے اس کی ایک رسمی سی کرسی کھول کے صاف کیا اور جب تک چمپا اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو گئی، وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔

میں خاموشی سے اپنے بستر پر چلا آیا۔ اس وقت تو اور باتوں میں وقت گزر گیا مگر کل صبح کل دوپہر کل شام، چمپا نہ جانے کب تک ٹھیری رہے۔ اسے سفر اور کون سا گرشمہ اسے میسر آئے گا۔ میں اپنے بستر پر لوٹتا رہا۔ خیر چمپا یہاں رہے اور راج کرشنا اپنی محسنہ کی خاطر داری کرتا رہے۔ میں درمیان میں کہاں رک پاتا ہوں کہیں اور نکل جاؤں گا جب تک چمپا رہے گی مجھے فنی کی یاد آتی رہے گی اور میں خود یہاں کب تک ہوں گا۔ کب میں اسٹریپ کے گلے میں پڑا ہوا ہار دیکھ کے میسے دل کو قرار نہیں تھا۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ نانا بھائی جوہری کی دکان بند ہو گئی ہوگی اور اس کے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں کلب سے سیدھا اس کی طرف جاتا اور اس سے التجا کرتا۔ "تجھے تیری اولاد اپنے خدا کی قسم، مجھے صحیح صحیح بتا دے کہ یہ ہار تو نے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔" اور ظہیر کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ جائے گھر لائی تھی۔ اور موتی۔ میں نے خود انھیں تحفے کے دیکھا تھا۔ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے ہوئے تھے۔ انھیں نانا بھائی نے ایک مالا بنا کے مجھے دی تھی۔ راستے میں مجھے خیال بھی آیا تھا کہ راج کرشنا سے اسی وقت نانا بھائی کے ہاں چلنے کی استدعا کروں۔ شاید وہ آسانی سے اس شخص کا نام بتا دیتا جس سے اس نے یہ بیش قیمتی چیزوں کی خرید و فروخت میں تو بڑی رازداری برتی جاتی ملاقات کا تمی یوں بھی مشکل تھی کہ چمپا بائی آ گئی۔

میں صبح جلد ہی اٹھ کے باہر آ گیا مگر چمپا بائی اور راج کرشنا مجھ سے پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ ناشتے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں نے تر اخبار بینی میں ڈوبا رہا اور چمپا گھر میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ میں لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو راج کرشنا بھی باہر جانے کے لیے کھڑا تھا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں" میں نے اسے اطلاعی مناسب سمجھی۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ جیسے اسے شبہ ہو گیا ہو کہ اب میں کہوں گا۔ میں نے نہ انکار کیا، نہ اقرار۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچنے لگا۔ چمپا کیاری سے پھول توڑ رہی تھی۔ اس نے گلاب کا ایک پھول مجھے اور راج کرشنا کو پیش کیا۔ راج کرشنا نے اسے کوٹ میں لگا کے چمپا کا شکریہ ادا کیا۔ "آج وہ پھر تو آپ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلائیں گی۔ یہاں گوشت وغیرہ سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ آپ جو بھی تیار کریں گی بڑے شوق سے کھائوں گا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ ہوٹل سے آپ کا سامان لے آئے"۔

چمپا نے کچھ کہنے کے لیے مونہہ کھولے مگر راج کرشنا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک مصروف بازار سے گزر رہے تھے۔ راج کرشنا ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ سامنے نانا بھائی جوہری کی شان دار دکان تھی۔ میں ساکر گیا۔ نہ معلوم نانا بھائی ابا جان کے بارے میں کیا بتائے؟ شاید اسے ان کا پتہ بھی معلوم نہ ہو۔ اگر سب باتیں راج کرشنا کے سامنے ہوئیں تو میں اس سے کیوں کر گاڑی سے اتر کے میسے لیے اپنے ہیروں پر چلنا دوبھر ہو۔ ہاتھ پکڑ کر راج کرشنا مجھے گھسیٹتا ہوا دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دکان کے ایک باادب ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں دو اطراف نشیمنے لگے ہوئے تھے اور ایک تن درست گول مٹول زرد رنگت کا شخص اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہوگی میرے جسم میں خون تھم گیا تھا۔ نانا بھائی نے قامت سے ہمارا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

"آپ کو ایک تکلیف دینی ہے" راج کرشنا نے مجھک کے کہا۔

"حضور، حکم؟" وہ آنکھیں جھپکا کے بولا۔

"آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن کچھ ایسا ہی ضروری کام ہے۔" راج کرشنا نے آدھی انگریزی اور آدھی شستہ اردو میں نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "آپ مسٹر اسٹیپل سے تو خوب واقف ہوں گے۔ وہی اسٹیپل صاحب جن کا ایک حادثے میں گزشتہ سال انتقال ہو گیا تھا"۔

"ہاں ہاں" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "وہ بہت مہربان آدمی تھے۔ میرے اچھے دوستوں میں تھے، بہت خوش ذوق لیکن آپ....."

راج کرشنا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "ان کی بیوہ مسز روپ اسٹیپل کے پاس ایک نادر ہار ہے۔ وہ ہار ان جاپانی اسٹیپل صاحب نے آپ کے ہاں سے خریدا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہو، غور یاد ہو گا کیونکہ اس میں ایک منفرد قسم کا میرا اور چار بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ میراث میں چھوٹا اور نیلے رنگ کا تھا۔" نانا بھائی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مسز روپ اسٹیپل نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے وہ ہار سپرد کرتے وقت ان سے اس کے ہیرے کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اس میرے کا شمار دنیا کے چند نادر میروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند سے آپ کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ کیسے آپ کو کچھ یاد آیا؟" نانا بھائی نے تجسس انداز میں گردن ہلائی۔ راج کرشنا نے تیزی سے کہا۔ "وہ ایسا ہیرا نہیں تھا جسے آپ کی جوہر شناس نگاہ بھول سکے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے وہ میرا کس مندرجہ ذیل

سے خریدا تھا؟ وہ کون صاحب تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے؟"

نانا بھائی نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا، اُس کے ماتھے پر سوٹیں پڑ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا، میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ "بتاؤ!" اُس نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ "مسز روپ پٹیل نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک نادر ہیرا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو فروخت کرنے والے کا نام نہیں بتا سکتا۔"

"دو باتیں ہو سکتی ہیں یا تو آپ بتانا نہیں چاہتے، یا آپ بھول گئے ہیں، ہماری یہ درخواست بے جا ضرور ہے مگر معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمارے کرم فرما مدیحہ ہم بڑی اُمید سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی نیک نامی اور ساکھ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"مگر جناب! یہ بات میرے کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک بات سمجھ لیجیے معاف کیجیے کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے۔" وہ رُکھائی سے بولا۔

"نانا بھائی! ہم مسز روپ پٹیل کی سفارش بھی لا سکتے ہیں، آپ چاہیں تو انھیں فون کر لیجیے۔" راج کرشنا نے نرمی سے کہا۔ "میری گزارش ہے۔ کہ آپ ہم پر ہر طرح کا اعتماد کر سکتے ہیں۔"

"سفارش اور اعتماد کی بات نہیں ہے جناب! اصول اپنی جگہ ہے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، مجھے وہ ہیرا اور موتی خریدے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ اسے مسز پٹیل نے تین سال پہلے مجھ سے خریدا تھا۔ یہاں نہ جانے کتنے ہیرے روز آتے ہیں۔ آپ فرد سے پیچھے کون یاد رکھ سکتا ہے۔"

"وہ ہیرا ایسا نہیں تھا جس کے فروخت کرنے والے کا چہرہ آپ کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ ایسے سودوں میں ہر طرح کی احتیاط کرنی پڑتی ہے آپ نے اپنی تسلی کے لیے ہر احتیاط کی ہوگی۔ رسید دی ہوگی، اسٹامپ لکھا ہوگا۔ اُس شخص کا نام پتہ آپ کے ریکارڈ میں ضرور موجود ہوگا۔"

"فرض کیجیے، یہ سب محفوظ ہے بھی تو میں بتانے پر آمادہ نہیں ہوں۔" وہ کبیدہ ہو کے بولا۔ "آپ مجھے مجبور مت کیجیے۔"

"دیکھیے اگر آپ نے قبول کر لیا کہ اُس شخص کا نام آپ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔" راج کرشنا نے اُسے چمکیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ وہ ہیرا چوری کیا گیا تھا تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟" اُس کے لہجے میں نمایاں طور پر سختی آگئی تھی۔

"میرا جواب آپ کو معلوم ہے لیکن میں ہر شخص کے سامنے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نانا بھائی بیزاری سے بولا۔ "میرا وقت خاصا قیمتی ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے۔"

راج کرشنا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ اُس کے سامنے پیش کر دیا۔ "یقیناً آپ کو اب کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ آپ نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس ہیرے کی خرید کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا تھا۔"

نانا بھائی نے کارڈ اُٹھا کے اُس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور چند ثانیوں میں اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اچانک چوکنا کھڑا ہو گیا اور اُس نے تیزی سے فرش پر اُتر کے راج کرشنا کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "آپ نے کمال کر دیا۔ آپ پہلے ہی بتا دیتے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔" اُس کا لہجہ اور طور طریق یکسر بدل گیا۔ اُس نے ملازم کو آواز دے کے کافی لانے کے لیے کہا۔ "حد ہو گئی جناب! اب بتائیے۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سامنے آپ بیٹھے ہیں۔ دیکھیے نا، یہ سودے بڑی رازداری کے ہوتے ہیں، مجھے افسوس ہے۔" وہ بار بار معذرت کرنے لگا۔ "کل اور آج کے اخبارات آپ کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آج صبح صبح آپ کے وارد ہو جائیں گے۔ میں نے توجہ ہی نہیں دی حالانکہ کل اور آج دونوں دنوں کے اخبارات میں آپ کے فوٹو چھپے ہیں۔ کاش آپ مجھے پہلے بتا دیتے۔"

"ہر جگہ یہ حوالہ دیتے ہوئے اچھا معلوم نہیں ہوتا، میرا خیال تھا، ہمارے چہرے بھروسے کے قابل ضرور ہیں، یہ کارڈ میں مجبوراً استعمال کرتا ہوں۔"

"پتھروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھی پتھر ہو گئی ہیں۔"

"پھر تو اور قیمتی ہو گئی ہوں گی۔" راج کرشنا مسکرانے لگا۔

"آپ اشارہ کر دیتے۔" وہ پشیمانی سے بولا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب اس کی تلافی کس صورت میں ہو سکتی ہے؟ مجھے آپ کا وقت ضائع کرنے کا افسوس ہے۔"

"تلافی کیا؟" راج کرشنا نے بے پروائی سے کہا۔ "اب آپ اپنی یادداشت پر زور دینے کے بعد ہمیں اُس شخص کے بارے میں بتا دیجیے جس کے لیے ہم نے آپ کو زحمت دی ہے۔"

"زحمت کیسی جناب! میں بتاتا ہوں۔" نانا بھائی نے ندامت سے اپنی پیشانی پر کھجلی کی۔ "میں نے وہ ہیرا اور موتی ایک نہایت معزز شخص سے خریدے تھے۔" یہ سنتے ہی کانوں میں جیسے صور پھونکے گئے۔ میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "وہ ایک مسلمان تھے۔ مجھے تو کوئی جاگیردار اور نواب معلوم ہوتے تھے۔ اُن پر بُرا وقت آگیا تھا ایسے لوگوں کو ہماری ضرورت پڑتی ہی ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی چند موتی اور ایک ہیرا میرے پاس فروخت کیا تھا مگر وہ ہیرا اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے رازداری کا عہد لیا تھا۔ اگر آپ کے بجائے کوئی اور یہ سوال کرتا تو میں جواب دیتا، زندگی بھر اپنا عہد نبھاتا۔ وہ ادھر کئی برسوں سے مجھے نظر نہیں آئے۔ البتہ میں ہر مہینے دو مہینے ضرور آتے ہیں انھیں اپنے پاس وہ بیٹھا تا تھا کیونکہ وہ مجھے ایک اچھے آدمی نظر آتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں یہ ہیرا کسی صاحب ذوق ہی کو فروخت کروں۔ میں نے مسٹر پٹیل کو منتخب کیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس سودے میں کوئی بہت بڑا منافع نہیں ہوا تھا۔"

"اُن کا نام؟" نانا بھائی سوچتے ہوئے بولا۔ "ولاور خاں تھا شاید۔"

"شاید نہیں سوچ کے بتائیے۔"

"جی ہاں کچھ یہی نام تھا۔" وہ جھجک کے بولا۔

راج کرشنا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلی بار درمیان میں دخل دیا۔ "اُن کی عمر کیا ہوگی؟ وہ کس حلیے کے آدمی تھے؟" میں نے مضطراب سے پوچھا۔ میری آواز کپکپا رہی تھی۔

نانا بھائی کے چہرے پر کشمکش کے آثار ہویدا ہوئے۔ "اُن کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ قد اوسط درجے کا تھا، رنگ گھلتا ہوا تھا، مونچھیں نمایاں تھیں۔ بہت چھوٹی سی داڑھی تھی۔ بہت باوقار چہرہ تھا۔ ہمیشہ شیروانی میں آتے تھے، صاف ستھرے لباس میں لیکن وہ کچھ مجھے الجھے ہوئے لگتے تھے۔"

وہ آہ جان ہی کا حلیہ بیان کر رہا تھا۔ آہ جان نے اپنا صحیح نام نہیں بتایا ہوگا اور پھر پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا۔

راج کرشنا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ تحمل و تصنع سے نانا بھائی سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ مجھے ریکارڈ دکھا سکتے ہیں؟"

نانا بھائی نے خندہ پیشانی سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پشت کی دیوار میں نصب الماری کھول کے فائلیں ٹٹولنے لگا۔ اُس نے چند منٹ کی چھان بین کے بعد کاغذ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ راج کرشنا نے پڑھ لیا۔ دستخط دلاور خاں کے تھے مگر تحریر آہ جان کی تھی، وہی شکستہ تحریر۔

"شکریہ۔" راج کرشنا نے اُسے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو اس پتے کی تصدیق کرنی تھی؟"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، مجھے اُن کی بات پر اعتماد تھا۔ ہاں کبھی ان کی توہین ہوتی کہ میں اُن کے پتے کی تصدیق کرتا۔"

نانا بھائی نے کافی پلائے بغیر ہمیں اپنی دُکان سے نہیں جانے دیا۔ ہم نے چند گھونٹ لے کے کافی یوں ہی چھوڑ دی۔ نانا بھائی ہمیں گاڑی تک رخصت کرنے آیا اور چلتے چلتے اُس نے اپنے رویّے کی کئی بار معافی چاہی۔ راج کرشنا نے ڈرائیور کو نانا بھائی سے حاصل کیے ہوئے پتے پر چلنے کی ہدایت کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا وقت خراب کر رہا ہے۔ نام کا آہ جان نے پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا مگر میں نے اُسے منع نہیں کیا۔ ہم بعد ہم اُس چار منزلہ عمارت میں داخل ہوئے تھے جس کا نام نانا بھائی نے اپنے پتے میں لکھوایا تھا۔ وہاں بھی وہی نتیجہ نکلا۔ اس نام کے کسی سے کوئی واقف ہی نہیں تھا۔ راج کرشنا نے حلیہ بیان کیا مگر بلڈنگ کے پتے والے فلیٹ نمبر میں دس سال سے ایک ہی خاندان رہ رہا تھا۔ راج کرشنا مایوس قدموں سے لوٹ آیا۔ مجھے کوئی خاص دُکھ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کھوئے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ آہ جان نے فہیمہ کے غائب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد ہی بمبئی شہر چھوڑ دیا تھا۔ نانا بھائی کی باتوں سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی وہ عرصے سے اُس کے پاس نہیں آئے تھے۔ اگر بمبئی میں ہوتے تو ضرورت کے وقت کسی اور زیور کے پاس جاتے۔ اب کسی اور شہر میں کسی نئے جوہری سے دوستی کر رہے ہوں گے۔ پرانی کسب گاہیں چھوٹ جائیں گی۔ پوٹلی خالی ہو جائے گی تو کیا کریں گے۔ شاید پھر بھیک مانگیں گے۔ ایک لڑکی کو بلا اٹھا لے گئے تھے۔ اگر ابھی چار اور باقی ہیں۔ وہ بیچے بھی ہیں جب تراشی اور نقب زنی کے فن میں ماہر ہو گئے ہوں گے۔ تب آہ جان کا اُس خزانہ لوٹنے کا منصوبہ کامیاب ہو گیا ہوگا۔ دونوں خزانے کی تلاش میں تھے۔ ایک نے مردہ ہو کر خزانے کی دوسرا ایک لڑکی کے خزانے کی۔ وہ کاغذات کی سیاہ لکیروں اور لفظوں میں اپنی قسمت ڈھونڈ رہے تھے ادھر میں بیتابی سے مچھلیوں اور اپنی کے بچے کاٹ رہا تھا۔

سب لے کا رہے، وہ خزانہ ہی کیا جو آسانی سے مل جائے۔ موٹر ہمارے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ میں شیشے کے پار لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ راج کرشنا کسی سوچ میں گم تھا، آہ جان اگر صحیح نام اور پتہ لکھوائے تب بھی تھے نہیں مگر وہی بات ہوتی جس کا پیچھا کرنے کے بعد غیر متوقع طور پر ہو گیا تھا۔ راج کرشنا مولوی اکبر کے پاس جاتا اور مولوی اکبر ساری کہانی بتا دیتے۔ موٹر دادر کے اُس ہوٹل کے سامنے ٹھیر گئی۔ جہاں ہم اور چمپا عزیز تھے۔ پھر ڈرائیور گیا اور ناکام واپس آگیا۔ ہوٹل والوں نے اُسے چمپا کا سامان نہیں دیا۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں راج کرشنا خود نادر چھپا جائے۔ ہوٹل والوں کو معلوم ہوگا کہ چمپا کس قماش کی عورت ہے۔ ہوٹل کے کئی بیرے بھی اُسے جانتے تھے۔ راج کرشنا کی زبانی چمپا بائی کا نام سن کے وہ مسکرائیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ راج کرشنا صاحب اُس کا سامان ہوٹل سے لے گئے تھے۔ میں نے سوچا، میں اُتر کے جاؤں گا مگر ہوٹل والے مجھے جانتے ہیں لیکن اگر انھوں نے منع کر دیا تو؟ کسی کو کسی کا سامان سپرد کر دینا ہوٹل کے اصول کے خلاف تھا۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ راج کرشنا ایک ٹیکسی موٹر سے اُتر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اُسے واپس آتے چند ہی منٹ لگے۔ معلوم نہیں ہوٹل والوں نے اُس سے کیا کہا۔ اور کن نظروں سے دیکھا۔ میں نے اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ مجھے تناؤ کا ہوئی۔ گھر کے قریب وہ اپنی نشست سے کھسک کے میرے نزدیک آگیا اور میرا ہاتھ دباتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔" میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا کہ وہ کس بات کا افسوس کر رہا ہے۔ مگر اتنے کی بات نہیں۔ اُس نے مضبوط آواز میں کہا۔ "ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اسی ہمت کا ثبوت دیتے رہو۔"

میں اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے میری گردن سہلائی، خرخراہٹ کر دی۔ گھر آگیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں چمپا موجود تھی۔ راج کرشنا چند قدم ہلا اور ٹھٹک

کے رنگ گیا۔ "خیریت! تم کسی دوسرے گھر میں تو نہیں آ گئے؟" وہ ہنس کے بولا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ کرسیوں صوفوں کے غلاف اور کھڑکیوں کے پردے بدلے ہوئے تھے۔ راج کرشنا نے ممنونیت کا اظہار کیا تو چمپا دبہری ہو گئی اور نظریں نیچی کر کے بدحواسی سے کہنے لگی۔ "ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی لوگ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔"

راج کرشنا کا منہ بن گیا۔ جھنجلاہٹ سے اس نے فون اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ فون پر وہ انگریزی میں کسی سے مخاطب تھا۔ "کے آج دفتر جانا چاہیے تھا۔ یہ ستانہ اس کے ساتھیوں اور اس کے سرپرستوں بانی کلا کی کئی معتبر تخصیتوں کی گرفتاری کا تسلسل ان تھا اور وہ چمپا کا تذکرہ ادا کرنے اور میرا حال درست کرنے کی اُلجھن میں پڑا ہوا تھا۔ فون پر اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ اور گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں اور شہر کے دو سکے علاقوں میں خاطتی انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔ راج کرشنا کے چہرے پر تشویش کی لکیریں بڑھتی گئیں اور اچانک اس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ ہاتھ ملنے اور زانو پر گھونسے مارنے لگا۔ "میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔" اس نے غیض میں کہا۔ "اس کے بجائے میں استعفا دینا زیادہ پسند کروں گا۔ تو پھر مجھے یہاں بلایا کیوں گیا ہے؟ نہیں۔ ایک بھی آدمی نہیں چھوڑا جائے گا۔ ستانہ کے آدمیوں کو دم نمبر ۳ میں لے جاؤ اور جلد از جلد کارروائی مکمل کر کے انھیں عدالت میں پیش کر دو۔ کس نے کچھ کہا ہو گا۔ راج کرشنا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے چیخ کر انکار کیا پھر فون بند کر کے اس نے فوراً دوسرا نمبر ملایا اور مخاطب کو ہدایت کی کہ وہ ملزموں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے ضرور رابطہ قائم کرے ورنہ وہ سیشنز سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس نے مختلف جگہوں پر یکے بعد دیگرے کئی فون کیے اور وہ بہت تھکا تھکا نظر آنے لگا۔ فون رکھنے کے بعد وہ کئی لمحوں تک سر جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ "مجھے جانا ہو گا۔" اس نے بے قرار ہو کے خود سے سرگوشی کی۔ پھر شاید اسے احساس ہوا کہ کمرے میں وہ تنہا نہیں ہے، ہم دونوں بھی موجود ہیں۔ اس نے انتظاری حالت میں ہمیں دیکھا اور اپنے چہرے کا کھنچاؤ دور کرنے کی کوشش کی۔ تم نے سنا ظہیر؟" وہ میرے پاس آ کر مسکرا کے بولا۔ "کیا دلچسپ بات ہے پولیس پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ان معززین کو آزاد کرنے میں ہمیں ناجائز کرسی اور منیشیات کے ذخیرے وغیرہ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی تو بات ہنسنے کو جی چاہتا ہے اگر دباؤ کا یہی سلسلہ جاری رہا تو پولیس کا محکمہ کسی دن علاً ختم ہو جائے گا یا کوئی دوسری ہیئت اختیار کر لے گا۔ بالکل اُلٹ کام کرے گا۔ اسے جرائم کی ڈھال اور پردے کے طور پر استعمال کیا جانے گا۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ کپڑے بدل کے باہر جانے کے لیے تیار تھا کہ چمپا نے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا کھانا یہاں نہ کھائیے گا؟" راج کرشنا نے ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے ہدایت کی کہ کوئی فون آئے تو اب کے میں رسیور اٹھاؤں اور صاف منع کر دوں کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ کھانے کے دوران میں اس کی طبیعت کچھ خوش گوار ہو گئی۔ کھانا بھی بہت خوش ذائقہ تھا۔ چمپا نے اس کی فرمائش کے مطابق نہایت لذیذ پکوان بنائے تھے۔ بس مرچیں کسی قدر زیادہ تھیں وہ سُوں سُوں کرتے ہوئے بولا۔

"آئندہ خیال رکھوں گی۔" چمپا نے محتاط لہجے میں کہا۔

"نہیں اب کھانا پکانے کی تکلیف آپ نہیں کریں گی۔ باورچی کس لیے ہے۔ آپ تو آرام کیجیے اور شہر کی سیر کیجیے جس چیز کی ضرورت ہو نوکر سے کہہ دیجیے۔"

"عورت گھر میں موجود ہو اور کھانا باورچی پکائے۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں اس طرح مصروف بھی رہوں گی۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟"

"ارے نہیں۔" جلدی کی بنا پر نوالہ راج کرشنا کے منہ میں اٹک گیا۔ "بہت زیادہ آیا۔ میں گزشتہ برسوں میں زیادہ تر سفر میں رہتا ہوں۔ گھر کا کھانا کھائے ہوئے مدتیں ہو جاتا ہے۔ کھانا باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہو تو "ہوٹل کا" برابر ہوتا ہے۔ عورت کے ہاتھ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے اب سوچیے اگر آپ نے اس لذیذ کھانے کا "سوا" آج آپ نے تیار کیا ہے ملی بنا دیا تو پھر کہیں مزہ نہیں آئے گا۔"

چمپا کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی ٹرخنے والی نہیں ہے اور اب تو اس کو سامان بھی آ گیا تھا۔ اس نے پورے گھر کا جائزہ لے کے انتظامات درست کرنے شروع کر دیے تھے۔ نوکروں کو حکم دے رہی تھی۔ لڑکی کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ راج کرشنا کھانے کے بعد دفتر جا چکا تھا اور چمپا گھر علیحدگی کاموں میں اس طرح مصروف ہو گئی تھی جیسے یہ اس کے گھر ہو۔ میں اپنے کمرے میں جا کے چھپ گیا۔ وہ شام کے وقت چمپا کی کشتی لے کے کمرے میں آ گئی۔ اس کے ساتھ زیادہ ضد بحث مناسب نہیں تھی۔ میں نے چپ چاپ چائے پی لی اور منہ پھیر کے لیٹ گیا۔ "طبیعت خراب ہے؟" اس کا ہاتھ میری کلائی ٹٹولنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "نہیں میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چپ ہو گئی۔ کچھ دیر وقفے کے بعد بولی۔ "رات تم کہہ رہے تھے کہ میں کل ہوٹل جاؤں گا۔ کیا بات کرنا چاہتے تھے؟"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے احساس تھا کہ تم بہت خفا ہو گے مگر تھی بتاؤ میں کیا کرتی۔"

"میں تم سے کچھ کہہ تا ہوں کیا؟"

"ہاں زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہو لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تیرے کان سن رہے ہیں۔ یقین کرو میں چلی جاؤں گی مگر چند دن ذرا اپنے پاس رہنے دو۔"

"میں نے کب منع کیا ہے۔ میں منع کرنے والا ہوتا کون ہوں۔"

"میرے لیے تم سب کچھ ہو چاہے میں تمھارے لیے کچھ بھی نہیں ہوں میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں، تمھیں اپنی مری ہوئی بہن کی قسم۔ تم....."

"چپ رہو۔" میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "خدارا، اب تو اسے بھول جاؤ بار بار اس کا ذکر کر کے کیوں مجھے تنگ کرتی ہو۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں دل چاہے کوسو مجھے گالیاں دو، مارو پیٹو میری آنکھیں پھوڑ دو مجھ پر چھرے چلاؤ مگر میری ایک بات سن لو مجھے یہاں سے میری وجہ سے مت جانا اور ہو سکے تو کبھی مت بلانا کہ شادی تمھارا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"لحاظ و مروت کا پتہ اس وقت چلے گا جب انھیں معلوم ہو گا کہ میری بہن کا بھائی ہوں۔ بی بی جی! مجھے مشورے مت دو۔"

"یہ مشورہ نہیں ہے التجا ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔ "اور کرشنا بھی ہماری آنکھوں اور کچے کانوں کے نہیں ہیں ورنہ پھر خیال رکھنا کسے کہتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں لیکن تمھیں اچانک یہاں دیکھ کے سب کچھ بھول گئی جیسے جیسے یاد آتی رہیں گی کہتی رہوں گی اگر تم نے کچھ بننے کا موقع دیا۔" اس کی آواز بہت کمزور تھی، اندھی اور کھوئی آواز۔ میں مضطرب ہو گیا۔ وہ مجھ سے اور کیا بات کرنے والی تھی؟ وہ کیا باتیں ہو سکتیں؟ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ احتجاج سا ہونے لگا۔ جی چاہا کہ اس کے ساتھ دل کے میں بھی دو آنسو گرا دوں مگر نے نقصان تو اس کا بھی ہوا تھا۔ اس نے تو خمیدہ کو اطمینان دے کے خریدا تھا۔ میں نے تو اس کا کوئی بھی حق ادا نہیں کیا تھا بلکہ اس سے خدمت لیتا تھا۔ اس پر غصہ آتا تھا۔ مجھے اپنے رویے پہ ندامت ہونے لگی۔

"تم کیا باتیں کرنا چاہتی تھیں؟" میں نے خفیف لہجے میں پوچھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ "پاس بیٹھو میاں! یقین کرو میرا وہاں دل نہیں لگتا۔ تمھارا چہرہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا اور یہاں یاد آیا۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "ہاں تمھارے جانے کے تیسرے دن موتیا کے پاس فیض آباد کا استاد جامو آیا تھا۔"

"جامو؟" میں اچھل کے بیٹھ گیا۔

"اس کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ انھوں نے بالا خانے پر ہلڑ مچا دیا۔ کہا کہ موتیا کو بھی یہی معلوم تھا کہ میں تمھارے ساتھ مسورہ گئی ہوں۔ ہاں زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہو لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تیرے کان سن رہے ہیں۔ یقین کرو میں چلی جاؤں گی مگر چند دن ذرا اپنے پاس رہنے دو۔"

اس طرح بالا خانہ بند ہو گیا پھر میں نہیں جانتی اور دو اگر سے ہی میں تھے اور استاد علاقے کے آدمیوں سے موتیا کی باتوں کی تصدیق کرتے پھر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی بہت مارا۔ میں نے سچ بتا دیا کہ میں تمھارے ساتھ مسورہ کے بجائے بمبئی گئی تھی بمبئی میں تمھارے گھر والے اپنی لڑکی کا غائب ہو جانے کے بعد بدنامی کے ڈر سے چپ چپاتے کہیں نکل گئے تھے۔ تم نے مجھے آگرے واپس کر دیا اور خود جانے کس طرف چلے گئے۔"

"کیا..... کیا تم نے سب کچھ بتا دیا؟ یہ بھی کہ اب میں بمبئی میں ہوں گی تم نے کرشنا جی کے بارے میں بھی بتا دیا ہو گا؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"نہیں میں نے انھیں کرشنا جی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ان کا ذکر میں کس طرح کر سکتی تھی میں جو سچ بتا سکتی تھی وہ بتا دیا۔ میں نے کہا میں تمھارے ساتھ کوٹلے اور بلوا لے حامل گیا تھا۔ وہ دونوں جیل میں ہیں۔ ابھی میں نے ان کے ایک ساتھی نور جہانی کی منت کر کے کوٹلے اور بلوا لے جیل میں ملنے کے لیے آمادہ کیا تھا کہ شاید تم خود جیل پہنچ گئے اور وہاں سے اپنے گھر کا پتہ حاصل کر لیا جب تم واپس آئے تو تم نے نہ آگرے کو سنا نہ محکمہ۔ بس اتنی سی بات میں نے بتائی تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ اب تم کہاں ہو گے میں نے تمھاری حالت بتائی اور کہا کہ میں نے تمھیں اسٹیشن پر چھوڑا تھا۔ شاید تم کسی اور شہر کی طرف نکل گئے۔ میں انھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تم بمبئی میں ہو کیونکہ میں نے تمھیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ تم ان کے ساتھ آنے پر ضرور تھے مگر تم ان میں سے تھے نہیں اور میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ تم ان لوگوں میں واپس جاؤ اسی لیے میں خود تمھارے پاس آ گئی۔"

"مگر..... مگر انھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں تمھارے پاس آگرے آیا ہوں گا یا تم بھاگ کے آگرے گئی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

"انھیں کسی نہ کسی طرح ضرور پتہ چل گیا ہو گا اسی لیے وہ یہ سمجھ کے آگرے گئے۔ شاید تم بھول رہے ہو تم نے کسی کو بتا بھی ہو گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ شہر بڑا ہے اور دور بھی بہت ہے اور انھیں میری بات کا یقین بھی آ گیا تھا۔ جبھی تو وہ واپس چلے گئے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے سردی سی لگنے لگی۔ ایک ایک چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ یہ سے آنے کے بعد جمل کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اس نے تو طوفان مچا دیا ہو گا۔ ایک ایک کو حاضر ہونے کا حکم دیا ہو گا کہ لاٹھی لا جمال لے اُسے پکڑ کے میرے پاس لاؤ ورنہ۔ جامو اور کبن کے سر جمل کے سامنے شرمندگی سے اُٹھے نہ ہوں گے۔ زریں نے تو ضبط کر لیا ہو گا میری واپسی اور عافیت کے لیے دعائیں کر رہی ہو گی اور جمل نے تسلیاں دے دیا ہو گا کہ مجھے جلد ہی تلاش کر لیا جائے گا۔ ادھر کھلکتے میں جمل کے اڈے کا کاروبار اس کی عدم موجودگی میں چوپٹ پڑا ہو گا۔ موجمدار کے مرنے کے بعد وہاں اس کے ہونے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اِدھر اُدھر جہاں جہاں تک اس کی پہنچ

بدگی مجھے ڈھونڈتے رہیں گے لیکن ہے نہ بھی ڈھونڈیں تک جائیں مجھے یاد آیا میرے غائب ہو جانے کے بعد انھوں نے سیدھے نواب سراج علی کی حویلی کا رخ کیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چچا باقی کے پاس پہنچ گئے۔ نہ معلوم انھوں نے اگر سے میں میرے بارے میں کیا کیا باتیں کی ہوں۔ چچا کو پھر میرا نام ڈالا بھی معلوم ہوگا۔ انھوں نے لاڈلے کے نام ہی سے مجھے پوچھا ہوگا۔ اگر چچا کی زبان سے راج کرشنا کے سامنے کسی وقت لاڈلا نکل گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میرا خون خشک کے گردش کرنے لگا اور رگوں میں مروڑ سی ہونے لگی۔

"میاں" مجھے مبہوت دیکھ کے اس نے سہمی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی "میں اسی لیے تو تم سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی کہ تمھیں پرانی باتیں یاد آجائیں گی مگر تمھیں یہ بتانا بھی ضروری تھا تاکہ تم خبردار رہو۔ چھاؤں ڈھل گئی ہے تو کہیں پھر دھوپ میں نہ نکل جاؤ۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پیالیاں اٹھا کے کمرے سے نکل گئی۔ میں سر پھینک کے رہا تھا۔ میں نے سوچا "میں چلا جاؤں۔ بہت دور چلا جاؤں، جہاں کوئی نہ مجھے جانتا ہو نہ لاڈلا سے واقف ہو۔ دفعتی سے نہ اسے یہ معلوم ہو کہ میں نے جیل کاٹی ہے اور نہ کوئی میرے ساتھ وہاں ہمدردی کرے۔ اب کے میں گونگا اور بہرا بن جاؤں گا اور جنگل میں نکل جاؤں گا، جہاں کوئی آدمی نہیں ہوگا اور ہوگا تو میں اس سے بات ہی نہیں کروں گا۔ اب کوئی مٹھیں طے گا کر اکر مٹا ہوگا تو خود مجھے ڈھونڈتی ہوئی آجائے گی۔ میں نے بہت ڈھونڈ لیا۔ اب میں کسی سنسان جگہ جا کے بس اس کے خیال میں گم رہوں گا اور دنیا کا کوئی شخص میری خوبیت میں رخنہ نہیں ڈالے گا۔ میں اپنی یادداشت سے اس کا ایک مجسمہ بناؤں گا اور بس اسے دیکھتا رہوں گا۔ کہیں کوئی آدمی نظر آیا تو میں وہ جگہ چھوڑ کے دوسری جگہ نکل جاؤں گا۔ میں اپنے سامنے کی دیوار پر اس کی تصویر بناتا رہا۔

کسی نے کمرے کی بتی جلا کے میری آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ راج کرشنا مجھے اٹھا کے باہر لے آیا۔ اس نے میرے شانے زور زور سے ہلا کے میری سستی دور کرنے کی کوشش کی۔ جب میں تھا تو خیر ہے کیا کرتا تھا؟ وہ متعجب لہجے میں بولا۔ میں نے پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ میں جاگا، کھسیانا سا گا، کھانا اور دیواروں پر گھورتے مارتا رہتا تھا۔" وہ میری پیٹھ اور سینے پر گھونسے مارتے ہوئے بولا۔ "بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ آئین شن! بالکل پولیس والوں کی طرح سینہ باہر نکالو۔ ہاں یہ بات اب ٹھیک ہے۔ ایک جوان اور وجیہہ آدمی۔ پولیس کی وردی تم پر کتنی جچے گی۔ چچا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے چچا ولی!" وہ چچا سے مخاطب ہو کے عاجزی سے بولا۔ چچا جیسے منتظر کھڑی تھی، ادھر اس کے منہ سے بات نکلی ادھر وہ باورچی خانے کی طرف لپکی۔ آج بہت کام کرنا پڑا۔ آخر جیت میری ہی ہوئی۔ میں نے کسی کی ضمانت نہیں ہونے دی۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا

کرسی پر بیٹھ گیا۔" اور ہاں — آج دفتر میں رستم جی کا فون آیا تھا، یہاں آنا چاہتے تھے، کہہ رہے تھے، فورین بہت مندہ کر رہی ہے۔ میں نے کہا ان دنوں مصروفیت ہے، آپ کو پھر کسی دن بلاؤں گا۔ کہہ رہے تھے، کل کلب میں ہمارے آنے کے بعد لوگ ہمارا تذکرہ کرتے رہے۔ تمھارے بارے میں سب متجسس تھے۔"

اس نے اتنی باتیں کہہ ڈالی تھیں مگر میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹا تھا۔ مجھے پھر نیند سے وہی احساس ہوا، اپنی بدتمیزی کا احساس۔ اس احساس کی وجہ سے میرا جسم کسی مجرم کی طرح اپنے آپ کو چھپانے لگا۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے، پھر میں نے سٹ پٹا کے پوچھا "متانہ! کیا ہوا؟"

"متانہ!" اس نے اچانک جیسے ایک نعرہ بلند کیا۔ "متانہ حوالات میں مستی کر رہا ہے، ڈنڈے پر ناچ رہا ہے۔ بس سزا اپنی ہو گی یا شاید گالیں پڑ جائے۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا گندے کا ہار بھی سوکھ گیا ہے۔ عجیب عجیب انکشاف ہو رہے ہیں۔ آج اسے میرے سامنے لایا گیا تھا۔ متانا دلچسپ آدمی ہے۔ پہلی کی پولیس کا اسے پہلی بار ذرا اجنبی انداز میں گھورا، اس لیے بہت ناراض نظر آتا تھا۔ دیکھو گے اسے؟"

"نہیں۔ میں نے اسے بہت دیکھ لیا ہے۔"

"پولیس کے کئی نوجوان افسر جو میری عزت کرتے ہیں، تم سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے انھیں ٹال دیا ہے۔ سب کو حیرانی ہے کہ ایک دم اچانک کرشنا جی نے یہ کیا جادو کر دیا۔"

کھانے کے بعد وہ مجھے اور چچا کو موٹر میں بٹھا کے چوپاٹی لے گیا۔ میں اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا، چچا پچھلی نشست پر۔ ہم سمندر کے کنارے جا کے ریت پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لہریں چنگھاڑتی ہوئی ہمارے پاؤں بھگوتیں اور سمندر کی پہنائیوں میں گم ہو جاتیں۔ راج کرشنا کہنے لگا "یہ آدمی بھی سمندر کی ایک لہر کے مانند ہے، اٹھتا ہے، گرجتا ہے، کنارے پر آ کے ہانپنے لگتا ہے، زمین کو بوسہ دیتا ہے اور نڈھال لوٹ جاتا ہے۔ پھر پرانی لہروں کے غیر سے نئی لہریں اٹھتی ہیں مگر انجام یہی لہر کا یہی ہوتا ہے۔" وہ میرے ساتھ کنارے کنارے دور تک چلا گیا۔ میں چپ بیٹھی رہی۔ راستے میں اس نے پوچھا "ظہیر خاں! تمھاری رائے میں قابل کیا آدمی ہوں؟"

میں اس کے سوال پر حیران رہ گیا۔ "جی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا، مجھے ڈر لگا کہ چچا نے ضرور اسے کچھ بتا دیا ہے۔

"نہیں، میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں، اچھی بری جو کچھ بھی ہو، میں خفا نہ ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آ..... آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"میرا مطلب صاف ہے؟"

"مگر کیوں؟ آپ کو اس کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"مجھے اپنے آپ پر شبہ ہونے لگا ہے۔"

"نہیں" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "شبہ نکال دیجیے۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ "ظہیر مجھے تمھارا جواب معلوم ہے، تم مجھے بھروسے کے قابل آدمی سمجھتے ہو تو پھر مجھ پر بھروسا کرو۔ ممکن ہے تمھاری سمجھ میں کوئی بات نہ آ رہی ہو، ایسا ہے تو میری عقل پر انحصار کرو۔ اپنا ہر کام آدمی خود نہیں کر سکتا، اسے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تمھارے لیے اچھا ہی سوچ سکتا ہوں، مجھے ایسا کرنے کا موقع دو۔"

"مگر میں..... میں تو آپ کے پاس ہی موجود ہوں۔"

"لیکن کہاں؟" وہ ہنسی سے بولا۔ "تم تو علیحدہ رہتے ہو۔"

"میں ایسا نہیں چاہتا لیکن نہ جانے مجھے کیا ہوتا ہے اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے معاف کر دیا کیجیے۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن جب ایسا ہو تو خود کو دوسروں کے تاثر میں دے دیا کیجیے، تجربہ کر کے دیکھ لو، اگر کوئی فرق نہ پڑا تو دوسرے خود ندامت سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ پھر وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"جی" میں نے جلی آواز میں کہا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چچا تک پہنچ گئے۔ اس نے بال کھول دیے تھے۔ سمندر کی ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے، جب ہم گھر واپس چلنے کی بات ہو چکی تھی۔ میں منع کرتا رہا مگر چچا میرا سر دباتی رہی، میری آنکھ لگ گئی۔

[illegible] دن سر پہر راج کرشنا دفتر سے واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس کا رنگ صندلیں تھا، نقش دلکش اور بھرے بھرے جیسے انھیں ڈھالا گیا ہو۔ شکل و صورت سے وہ بہت سنجیدہ اور [illegible] حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں سیاہ اور روشن [illegible] بڑے اور بہت لمبے تھے۔ ایک سادہ سی ساڑی پہنے ہوئی تھی۔ [illegible] وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ تیرہ مس جولین ہیں۔" اس نے شائستہ [illegible] انھوں نے کم عمری ہی میں اچھا خاصا پڑھ لکھ لیا ہے اور اب [illegible] نے زحمت دی ہے کہ یہ اپنے علم سے کچھ تمھیں بھی فائدہ پہنچائیں۔ [illegible] تمھیں انگریزی پڑھائیں گی۔ مس جولین! یہ ظہیر ہے، مجھے یقین ہے [illegible] لیے ایک اچھا شاگرد ثابت ہوگا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ زبان [illegible] عورت سے سیکھی جائے۔"

"جی..... میں میرے حلق میں لفظ پھنس گئے۔

"کیا؟ یعنی کیا تم پڑھنا نہیں چاہتے؟ علم کے سامنے آدمی کی حیثیت [illegible] ہے اور ایک سعادت مند بچے کی طرح اس سے

پیش آنا چاہیے۔"

"علم کے لیے عمر مقرر نہیں ہوتی۔" پہلی بار جولین اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر آپ نے محنت کی تو صرف چند مہینوں میں آپ بہت سے سال کراس کر لیں گے۔"

"بس اب ادھر ادھر کی کوئی بات نہیں۔" راج کرشنا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مس جولین! آپ اپنے تانگہ کو لے کے دائیں جانب سے کرکے میں چلی جائیے۔"

"آئیے۔" جولین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آئیے۔"

"جاؤ۔" راج کرشنا نے پرجوش دیکھ کے مجھے ڈانٹا۔

میں بھاری قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ کہوں اس کی ضرورت نہیں ہے مگر بات زبان تک آ آ کے رہ گئی۔ مس جولین راج کرشنا کے کمرے میں آ گئی اور ہم دونوں اس کے گرد آ کے سامنے بیٹھ گئے۔ "یہ بتائیے کہ آپ نے پہلے کتنا پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کچھ نہیں پڑھا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"کچھ نہیں؟" اس کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ "یعنی آپ نے بالکل نہیں پڑھا؟ کچھ بھی نہیں؟ آپ حزن نیں پہچانتے؟"

"تھوڑے بہت۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے سکون سے سادہ کاغذ کا ایک پیڈ اٹھایا اور پنسل آگے کر دی۔ "ذرا اپنا نام لکھیے۔" میں جھجکتے لڑکھڑاتے ہاتھوں سے کچھ ایسا کچھ بھی آپ جانتے ہیں لکھ دیجیے۔ بہت خراب لکھ دیجیے۔" میں نے الٹے سیدھے لفظوں میں ظہیر خاں کو لکھا۔ اس نے بڑے غور سے میری تحریر کا معائنہ کیا۔ "ہونہہ" وہ فکرمندی سے بولی۔ "ابتدا سے کام کرنا پڑے گا، خیر کوئی بات نہیں۔ میں کل آپ کے لیے کاپیاں اور کتابوں کا سیٹ لے آؤں گی۔ دیکھیے، ساری بات شوق کی ہے۔ شوق نہیں ہوگا تو میں کیا کوئی بھی آپ کو کچھ نہیں سکھا سکے گا۔ بس اپنے اندر شوق پیدا کیجیے اور یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ آپ اب تک کچھ نہیں پڑھ سکے لوگ پڑھ کے بھی تو بھول جاتے ہیں۔ آپ کو جو بھی پریشانی ہو ہمارے نوٹ پوچھ لیجیے۔" وہ مجھے سمجھاتی رہی۔ میں سر لٹکائے سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ راج کرشنا کو کس طرح بھگاؤں؟ اتنی اچھی لڑکی کو پڑھانے کے لیے مامور کرنے پر اس نے کتنا روپیہ خرچ کیا ہوگا؟ بالکل فضول۔ مس جولین نہ جانے کہاں رہتی ہوگی، روز آئے گی، جائے گی۔ میں نے طے کیا، میں راج کرشنا کو منع کر دوں گا کہ میں پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ میں کچھ نہیں چاہتا مگر پھر وہ بہت ناراض ہوگا۔ میں اسی کش مکش میں تھا کہ جولین نے اپنی شستہ اور مہذب آواز میں مجھے پکارا۔

"مسٹر ظہیر! کیا آپ میری باتیں توجہ سے سن رہے ہیں؟"

"جی" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ "جی سن رہا ہوں۔"

"صرف سننا نہیں، ان کے دماغ میں کیا ابھی ہے۔"

"جی۔" میں نے مختصر سے کہا۔

"آپ محنت مند آدمی ہیں۔ نوجوان ہیں۔ بس صرف ایک چیز کی کمی ہے آپ میں۔ جب یہ کمی دُور ہو جائے گی تو دیکھیے کیسی تبدیلی آئے گی۔ لوگ ہر جانب سے آپ کے قریب ہونے کی کوشش کیا کریں گے۔ آپ کی بات میں وزن پیدا ہو جائے گا۔ لوگ آپ سے مشورے لیا کریں گے۔ آپ کی عزت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ بڑے بڑے لوگوں سے آپ کے تعلقات ہوں گے۔ بس یہ سب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنی یہ کمی کتنی تیزی سے دُور کرتے ہیں۔ میں آپ کے شوق میں ہر لمحے، ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیتی رہوں گی۔"

مس جولین اُس دن جلد واپس چلی گئی۔ میں دن بھر راج کرشنا سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا، حالانکہ رات کو وہ مجھے گھمانے بھی لے گیا، پھر بھی ساتھ نہیں تھی مگر راج کرشنا نے اپنی طرف سے جولین کا کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ وہ مجھے دن بھر کی روداد سناتا رہا کہ کتنا بڑا جلسہ ہوا تھا، کتنے لوگ آئے تھے، کیا کیا باتیں ہوئی تھیں

بڑا وقت پڑا ہوگا۔ چلیں گے نا؟"

"جی شکر کرشنا جی....."

"کرشنا جی کیسے نہیں جائیں گے اُن کے ہاتھوں میں ہم ہتھکڑی ڈال کے لے جائیں گے۔ وہ دوسروں کو بہت ہتھکڑیاں لگاتے ہیں۔ وہ بھلا اتنی اچھی سیر نہیں کریں گے، اتنا کام کرنے کے بعد انہیں کچھ آرام ملنا چاہئے۔"

ہم جب تک کلب میں موجود رہے وہ میرے ہی پاس بیٹھی رہی اور مجھے مس جولین کا خیال آتا رہا۔ کاش اُس کا باپ ٹھیک ہو۔ راج کرشنا لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ پھر جب ناچ شروع ہوا تو وہ سنرو ڈپ پٹیل کے ساتھ ناچنے لگا اور نورین ناچ کی دھن پر اپنے پاؤں تھرکاتی رہی اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں بھی اُس کے ساتھ راج کرشنا اور دوسرے لوگوں کی طرح ناچوں۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ "مجھے ناچ نہیں آتا۔"

"میں آپ کو ناچ سکھاؤں گی۔" وہ مچلتی ہوئی بولی۔ "دیکھ لیجئے پھر آپ کو ایک عجیب لطف آئے گا۔ آپ بے خود ہو جائیں گے جیسے آپ نے کوئی نشیلی چیز پی لی ہو۔"

نورین اور میں تنہا ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں کئی لڑکیاں اور عورتیں بھی آ کے وہاں بیٹھ گئیں۔ مجھے جس محسوس ہونے لگا۔ میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر نورین نے میز کے نیچے سے میرے گھٹنے پر ٹھوکا مارا اور اپنا پیر میرے پیر پر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کے آنے کے بعد اس طرح اچانک اُٹھنا مناسب نہیں ہے۔ اُن سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ سب مسکرا رہی تھیں۔ مجھے ان کی مسکراہٹ زہر لگی۔ اسی اثنا میں ناچ ختم ہو گیا اور راج کرشنا سنرو ڈپ پٹیل کے ساتھ بھاری میز پر آ گیا۔ سب کھڑے ہو گئے اور اس افراتفری میں مجھے راج کرشنا کے قریب پہنچنے کا موقع مل گیا۔ پھر میں، نورین راج کرشنا اور سنرو ڈپ چاروں ایک دوسری میز پر بیٹھ گئے۔ سنرو ڈپ کے گلے میں وہی ہار لٹک رہا تھا۔ کورا کی امانت جس کا ابا جان نے خیال نہیں کیا۔ میری نظریں اُس کے گلے سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس دوران میں نورین نے جو باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔ میں اس فکر میں تھا کہ سنرو ڈپ پٹیل کے گلے سے یہ ہار کس طرح چھینوں۔ کہ اسی وقت راج کرشنا میرے کان میں چپکے سے بولا۔ "چلیں؟"

"ہاں چلیں۔" میں نے دفعتہً اُٹھتے ہوئے کہا۔

سب یہیں رُکتے ہیں۔ نورین پہلے کی طرح کلب کی عمارت کے خاص دروازے تک ہمیں پہنچانے آئی۔ اس بار اُس کے ساتھ کلب کے بہت سے سرخ اور عورتیں تھیں۔ راج کرشنا نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ سب واپس ہو گئے مگر نورین واپس نہیں گئی۔ وہ ہمارے ساتھ دروازے سے باہر آ گئی اور اُس نے اُس وقت تک راج کرشنا کو آگے نہیں بڑھنے دیا جب تک اپنے گھر آنے کا وعدہ نہ لے لیا۔

عمارت سے باہر نکل کے ہم کلب کے وسیع سبزہ زار میں آ گئے۔ دُور لان اور درختوں کے پرلی طرف پختہ فرش پر گاڑیاں کھڑی تھیں جسے کلب سے جانا ہوتا، وہ دربان کے ذریعے موٹر پورچ کی طلب کر لیتا۔ ہم نے دربان کو یہ زحمت نہیں دی کیونکہ ہمارے ساتھ ڈرائیور ہی نہیں تھا۔ باہر آ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں۔ سبزے پر چاندنی سورہی تھی۔ ہلکی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اونچے اور گھنے درختوں کے نیچے کہیں کہیں گہرا اندھیرا تھا، ہوا نرم اور ٹھنڈی تھی۔ سوئمنگ پول کا پانی دُور سے چمک رہا تھا۔ سامنے اچھا موسم اور منظر چھوڑ کے یہ لوگ عمارت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا، میں یہیں سبزے پر لیٹ جاؤں۔ ہم آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی ہم درمیان ہی میں تھے اور ایک درخت کے سائے میں گویا سے تھے کہ مجھے کچھ آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کے ادھر اُدھر نظر ڈالی مگر چونکنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ ایک سایہ بجلی کی طرح درخت کی اوٹ سے نکلا اور راج کرشنا پر جھپٹا۔ میں نے ایک چاک راج کرشنا کو زور سے دھکا دے دیا۔ وہ شخص جھونک میں مجھ سے آگے بڑھا مگر ایک لمحے میں پلٹ کے مجھ پر لپکا۔ میں اچھل کے پیچھے ہٹ گیا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور کسی نوشتہ کی طرح اِدھر اُدھر تھرکنا شروع کر دیا۔ اُس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر مجھ پر حملہ کر دیا۔ کوئی ہتھیار ہوتا تو چاقو اُس کے شانے اور سینے پر کئی انچ کی لکیر کھینچتا ہوا گزر جاتا مگر اُس کا ہاتھ جیسے ہی اُٹھا،

فون پر کبھی بااشتیاق اسے دوپہر کا کھانا کھانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ ڈائننگ روم سے پہرک پولیس کے اور دوسرے محکموں کے افسروں اور بمبئی کے شہریوں سے بھرا رہا۔ بنگلے کے باہر موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ پولیس کے اعلیٰ حکام کے حکم سے بنگلے پر پہرے داروں کی تعداد میں فوراً اضافہ کر دیا گیا تھا۔ کل رات اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ راج کرشنا درمیان میں کود پڑے گا تو مجھے چین نہ پڑتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ راج کرشنا کو باوقار طریقے سے مجبور کرنے کے لیے مجھے آوازیں لگانی پڑی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چند منٹ کی بات تھی کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

سہ پہر کو مجھے جولین کا انتظار ہی رہا۔ وہ وقت کی بڑی پابند تھی مگر وقت گزر رہا تھا اور جولین نہیں آئی تھی۔ یقیناً اس کے باپ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہوگی۔ میرے دل میں ہزار وسوسے اٹھنے لگے۔ میں نے بنگلے کے باہر گلی میں جا کے بھی دیکھا۔ اس کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور وہ نہیں آئی۔ مجھ سے ایک جگہ نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ جب اس کے آنے کا امید بالکل ختم ہو گئی تو میں نے راج کرشنا سے پوچھا کہ کیا کہیں جانا تو نہیں ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا میں کچھ دیر کے لیے موٹر لے جا رہا ہوں، وہ بگڑنے لگا کہ تم پوچھ کیوں رہے ہو؟

ڈرائیور کو جولین کے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ میں نے اُسے ساتھ لیا، موٹر شہر کی وسیع سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک گنجان اور تنگ تاریک علاقے میں داخل ہو گئی۔ یعنی جولین اس قدر دُور سے روز مجھے پڑھانے آتی تھی۔ ڈرائیور نے کار ایک نسبتہً کشادہ جگہ کھڑی کر دی اور مجھے ساتھ لیے ہوئے تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ دونوں اطراف چھوٹی بڑی بلڈنگیں کھڑی ہوئی تھیں، کائی لگی اور سر گرگر پڑتی ہوئی عمارتیں، یہ آبادی اینگلو انڈین لوگوں پر مشتمل تھی۔ نچلی منزلوں کے کمروں میں سامان کم تھا، صفائی زیادہ نظر آتی تھی۔ اکثر پہنے ہوئے بوڑھی رنگ برنگی عورتیں ہاتھوں میں کڑھائیاں لٹکائے گلی میں متحرک بتیاں، نعلبندوں کے باہر بوڑھے کرسی بچھائے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ گلی میں زور دار دشنام چلنے لگی تھیں۔ میں نے حیرانی کے ساتھ ڈرائیور سے پوچھا کہ کہیں وہ پتہ تو نہیں بھول گیا؟ اس نے انکار میں سر ہلایا اور بڑی گلی سے دائیں جانب کی ایک اور تنگ گلی میں مڑ گیا۔ ہمارے سامنے لکڑی کی بالکونیوں سے بنی ہوئی ایک تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے وہیں سڑک کے ایک نعلبند کی طرف اشارہ کیا۔ کیا اس جولین ہیمیں رہتی ہیں؟" میں نے شبہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں! وہ تیسرے مالے کے کونے والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔"

مجھے عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجک ہوئی۔ میں کئی لمحوں تک کش مکش میں گھرا رہا پھر ایک ارادے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈرائیور گلی میں رہ گیا۔ سب سے اوپر والی منزل پر پہنچ کے میں نے اندازے کے مطابق دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ جولین ہی نے کھولا۔ "آپ!"

اُس کی پتلیاں لرز کے ساکت ہو گئیں اور وہ پتھر کی سی بن گئی۔

"آپ کے ڈیڈی کیسے ہیں؟" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ بدبدانے لگے۔ "وہ پہلے سے بہتر ہیں لیکن انھیں اپنی سدھ بدھ نہیں ہے۔" اُس نے نقاہت سے کہا۔

"میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر... مگر آپ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔"

"میں پروا نہیں کرتا۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

اُس نے مراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "ٹھیر لیے۔" یہ کہہ کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ "آئیے۔" اُس نے سر لیے میں کہا۔ وہ مجھے ایک مختصر کمرے میں لے گئی۔ وہاں چارپائی پر ایک بوڑھا شخص منہ کھولے پڑا تھا۔ اُس کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا۔ بس ہڈیوں کا پنجر تھا جس میں سانس باقی تھی۔ کمرے میں دواؤں کی بُو بسی ہوئی تھی اور میز پر کئی شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمرہ صاف ستھرا اور روشن تھا مگر جا بجا پرانی چیزوں سے پٹا ہوا تھا۔ پرانی میز، کرسیاں، الماریاں، در و دیوار پر عجب اُداسی طاری تھی۔ میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ جولین مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس بڑے کمرے میں بستر بھی تھا، کرسیاں بھی تھیں۔ ایک کونے میں چھوٹی سی گول ڈائننگ ٹیبل تھی۔ ایک کونے میں سوئی ہوئی گھتیاوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ایک طرف صندوق کے اوپر صندوق رکھے ہوئے تھے۔ فرش صاف تھا اور دیوار پر شیشے کے فریموں میں مختلف مناظر کی رنگین تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ایک جانب ستار رکھا ہوا تھا، درمیان میں دیوار پر لکڑی کی ایک بڑی صلیب نصب تھی۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جولین بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آ کے غلطی کی ہے لیکن اب فرار کا کوئی سوال نہیں تھا۔ نہ کرشنا جی اور چمپا دیدی کے کیا حال ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں اور آپ کی ممی کدھر ہیں؟"

"وہ ابھی آتی ہیں۔" جولین نے آہستہ سے جواب دیا۔ "یہ گھر بہت مختصر ہے۔ جب ڈیڈی بیمار پڑے تو ہم یہاں آ گئے۔ پہلے ہم باندرے میں رہتے تھے۔ یہاں ڈیڈی کے کئی پرانے دوست ہیں، آتے رہتے ہیں، اس طرح اُن کی صحبت بہل رہتی ہے۔"

"مگر مختصر ہے مگر آپ نے اسے بڑے سلیقے سے سجا رکھا ہے۔ ہر چیز آپ ہی آپ نظر آتی ہے۔ آج آپ نہیں آ سکی تھیں، اس لیے مجھے الجھن ہونے لگی اور میں یہاں چلا آیا۔"

"مجھے فون کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس گھر میں کسی کو بلاتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" وہ کمزور آواز میں بولی۔ "ڈیڈی کی بیماری سے سبھی کچھ اپ سیٹ ہو گیا ہے۔"

"میں تو آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے اور آپ سے ملنے آیا ہوں، گھر دیکھنے نہیں آیا۔ گھر تو مکینوں سے ہوتے ہیں۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ ایک اُجلی زرد ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ صرف ایک دن میں وہ کچھ اور لمبی ہو گئی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے اس شکل میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میری نظریں بار بار اُس کی جانب اُٹھتی تھیں اور ٹھہر کے جھک جاتی تھیں۔ "آپ گھبرائیے نہیں۔" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

"حوصلہ رکھیے۔" مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ "میں... میں سے ابھی کوئی کام ہو تو بتائیے۔ دوائی وغیرہ لانی ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو بتائیے۔ میرے جسم میں بہت خون ہے، اگر خون کی ضرورت پڑے تو میں..."

"کسک پڑی میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی اب میں اس سے کیا کہوں؟ مجھے کس طرح چپ کراؤں؟ میں آپ کے بہت کام آ سکتا ہوں میں مجھے دُنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ اگر آپ نے مجھے کوئی کام سونپا تو میرا جی خوش ہو گا۔"

وہ اور سسکنے لگی۔ "نہیں۔" اُس نے دہشت سے کہا۔ "آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ آپ میرے ڈیڈی کو دیکھنے آ گئے۔ بس اُن کے لیے دعا کیجیے۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں کیا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "میں آپ کے ڈیڈی کے لیے کوئی دعا نہیں کروں گا۔"

وہ اُٹھ کے مجھے لرزتی ہوئی پلکوں سے دیکھنے لگی۔ "آپ چلے جائیے۔ آپ چلے جائیے۔ یہ گھر آفت زدہ ہے، یہاں کی ہوا خراب ہے، یہ گھر بہت خراب ہے اور آپ کے لیے نہیں ہے، آپ چلے جائیے۔"

"میرے لیے۔" میری آواز بھاری ہو گئی۔ "یہاں آپ اور آپ کی ممی رہتی ہیں۔ پڑوس کے فلیٹ میں بھی لوگ رہتے ہیں اور آپ کو کیا معلوم کہ میں کس گھر میں رہتا تھا۔" میں نے سوچا، میں اُسے جیل کا حال بتا دوں۔ مجھے کرشنا جی اپنے پاس لے آئے تھے ورنہ میرے پاس تو سر کے اوپر چھت نہیں ہے۔ آپ یہ خراب اور اچھے کی بات کیا لے بیٹھیں۔"

اُس کی آنکھیں بجھنے اور پگھلنے لگیں، شاید اُسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ "آپ..... آپ" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اندر دروازے سے ایک لمبی تڑنگی ملیالی عورت برآمد ہوئی۔ اُس نے آہٹ سے چائے کا سامان میز پر رکھ دیا۔ میں نے اُٹھ کے اُسے سلام کیا۔ اُس نے مجھے انگریزی میں دعائیں دیں پھر ملیالی اُردو میں بات کرنے لگی۔ چائے کے دوران میں وہ اپنے شوہر کا حلیہ بیان کرتی رہی۔ وہ ایک خوش گفتار اور سنجیدہ عورت تھی۔ میں ہاں نہیں کہہ سکا۔ میں نے جولین سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دنوں تک مجھے بلا لے نہ آئے۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلتے وقت اُس نے سکرا کے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کرشنا جی اور چمپا دیدی کو میرا سلام کہیے گا۔" میں زینے پر اُترتے اُترتے رک گیا۔ وہ بھی لکڑی کے جنگلے پر جھک گئی تھی۔ "کیا... کیا آپ کچھ بھول گئے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "مس جولین! آپ کو کوئی بھی پریشانی ہو تو مجھے لکھیے گا نہیں مجھ سے خرد کیجیے گا۔ آپ نہیں کہیں گی تو میرے دل پر بوجھ رہے گا۔" میں نے اُسے مڑ کے نہیں دیکھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

رات کو میری آنکھیں کھلی رہیں۔ راج کرشنا نے سیر کے لیے پوچھا مگر میں نے منع کر دیا۔ مس جولین کے فلیٹ میں لی ہوئی دواؤں کی بو رہ رہ کے میرے دماغ پر چھائی رہی۔ اسی طرح صبح ہو گئی۔ راج کرشنا دفتر چلا گیا اور چمپا گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اب وہ اپنے کام میں مگن رہتی تھی۔ تمام ملازم اُس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اُس نے وعدے کے مطابق اپنی زبان پر تالا ڈال لیا تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے یا مجھ سے اُس کے ماضی کے متعلق کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اُس کے ساتھ اس طرح پیش آتا تھا جیسے دونوں برسوں کے شناسا ہوں اور جیسے چمپا اُس کی بہن ہو۔ یا ماں ہر وقت اُس کا مزاج پوچھتا رہتا تھا اور چمپا بھی نظروں سے ہی اوچھا کتنا ہوتی تھی۔ وہ میرے کپڑے نکال کے دیتی، دن میں کئی بار مجھے کبھی پھلوں کا شربت کبھی بادام کا اور کبھی گرم دودھ پلاتی تھی۔ چمپا نے مجھ سے جانا پہچانا ہونے کا ناٹک بھی شروع کر دی تھی۔ وہ سب سے پہلے جاگ جاتی اور جب ہم لوگ اُٹھتے تو ہمیں بہت کم نکلتی تھی۔ صرف چند دنوں میں چمپا کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ باہر گئی تھی۔ بس ایک یا دو بار ڈرائیور کے ہمراہ گھر کی چند چیزیں خریدنے گئی تھی۔

منح ہوئی، دوپہر ہوئی۔ میں بنگلے کے مختلف کمروں میں گھومتا، اخبار پڑھتا، یا راج کرشنا کی کتابیں الٹ پلٹ کرتا رہا۔ جولین کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں بار بار گھڑی دیکھنے لگا حالانکہ آج مجھے اُس کے آنے کی اُمید نہیں تھی کیونکہ میں خود اُسے منع کر آیا تھا مگر جولین عین وقت پر مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ بہت تازہ نظر آ رہی تھی۔ چائے اُسی نکھرے ہوئے لباس میں آپ پھر آ گئیں؟" میں نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

"ڈیڈی کی طبیعت رات سے کچھ بہتر ہو گئی ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور بات بھی کی۔ میں اطمینان کر کے آئی ہوں، آئیے اپنا کام شروع کریں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کا حرج ہو گیا۔"

چمپا سے چند باتیں کر کے وہ کمرے میں آ گئی اور کتابیں کھول کے بیٹھ گئی، پھر جھجک کے کہنے لگی۔ "کل آپ کے جانے کے بعد ممی کو حیرت رہیں کہ وہ آپ کی کچھ خاطر نہیں کر سکیں۔ آپ ممی کو بہت پسند آئے۔"

"مجھے بھی وہ بہت اچھی لگیں۔"

"اور میں آپ کو دیکھ کے بہت حیران ہوئی تھی۔ دیر تک تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ آپ آئے ہیں یا آپ آ سکتے ہیں۔ پھر بعد میں مجھے یہ

احساس ہوا کہ آپ کو میری کوئی بات گراں نہ گزری ہو؟"

"یہ احساس مجھے بھی ہوا۔ ویسے بھی میں اطلاع کے بغیر پہنچ گیا تھا۔ ایسے مرحلوں پر بات کس طرح کی جاتی ہے یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"آپ نے بہت عجیب باتیں کیں۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "میں تمام وقت یہی سوچتی رہی کہ آپ کی باتوں میں کوئی ایسی بات کیوں ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ میں نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ کرشنا جی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں اور میں اس ہدایت پر پوری طرح کاربند ہوں مگر کیا آپ خود کچھ نہیں بتائیں گے؟"

"کیا بتاؤں۔" میں نے اضطراری آواز میں کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ بھی۔"

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر مجھے دیجیے کسی اور وقت سہی۔ یہ بتائیے کہ آپ نے کام کتنا کیا؟ کل کی غیر حاضری کا مجھے افسوس ہے بہرحال ہم کل کی کسر آج پوری کرلیں گے۔"

"آج پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اچھا!" اس نے تعجب سے کہا۔ "مگر کیوں؟"

"بس آپ باتیں کیجیے۔"

اس کی تیلیاں پارہ بن گئیں۔ "کیا باتیں کریں؟" وہ کچھ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی مگر فوراً اس کی آواز پرسکون ہوگئی۔ "آئیے میں آپ کو بڑے لوگوں کے اقوال سناؤں۔ یہ اقوال زندگی میں بہت کام آتے ہیں۔"

"خاک کام آتے ہیں۔" میں نے تڑپ کر کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ آپ ہی بتائیے کیا آپ کے ڈیڈی کسی قول سے ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"ہاں۔" وہ آہ بھر کے بولی۔

وہ اچھی خاصی آئی تھی مگر میری باتوں سے اداس ہوگئی اور پڑھانا لکھانا بھول گئی۔ کہیں کھوسی گئی، ساڑی کا پلو اس کے کندھے سے ڈھلک گیا لیکن اسے خیال ہی نہیں رہا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "مس! آپ نے کرشنا جی کے ریکارڈ سنے ہیں؟ آئیے میں آپ کو سناؤں۔"

وہ ہچکچائی مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھا لیا۔ "آئیے مس!"

"سنیے۔" آپ مجھے مس نہ کہا کیجیے۔" اس نے کرب سے کہا۔

"کیوں مس؟" میری زبان سے نکل گیا۔ "پھر کیا کہوں؟"

"جولین کہا کیجیے۔ گھر میں سب مجھے جولین کہتے ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ راج کرشنا نے میک کے میں گراموفون اور ریکارڈ رکھ دیے تھے مگر میں نے گراموفون کبھی نہیں بجایا تھا جب وہ آتا تھا تو خود کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ اسے صرف دھنوں کا شوق تھا جلکی ہم دھنیں جیسے چیٹر بیتا ہو۔ میں نے گراموفون پر اس کا پسندیدہ ریکارڈ رکھ دیا۔ کمرے میں موسیقی گھل گئی۔ پھر جولین خود ریکارڈ منتخب کر کے سننے لگی اس طرح اس کی طبیعت کچھ بہل گئی۔ جب وہ جانے لگی تو میرا جی چاہا اسے اور روکوں مگر شام ہو رہی تھی۔ راج کرشنا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی موٹر ہوتی تو میں ڈرائیور سے کہہ کے جولین کو اس کے گھر پہنچوا دیتا۔ گیٹ سے باہر میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ روز ہی جاتی ہوں۔"

"میں چلتا ہوں۔" میں نے ضد کی۔

"واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا۔ میں آجاؤں گا۔"

وہ منع کرتی رہی مگر میں اس کے ساتھ ساتھ بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ ہم دونوں ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ بس نے ہمیں اس کے گھر سے کچھ دور اتار دیا۔ آگے جانے سے پہلے میں نے اسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے کپڑے والے کی دوکان تھی۔ میری جیب میں راج کرشنا روز کچھ روپے ڈال دیتا تھا۔ میں نے بہت سے چھل خریدے۔ یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ کے ڈیڈی کے لیے ہیں۔ میری طرف سے۔"

"اوہ نہیں۔ یہ بہت زیادتی ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا میں انھیں کوئی پیشکش نہیں کرسکتا؟"

وہ کسی کے چپ ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو بے اس کے باپ کی طبیعت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مس جولین نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چند منٹ بیٹھ کے واپس آگیا۔

جولین کے باپ کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا مگر وہ روز مجھے پڑھانے آتی رہی اور میں روز اس کے ساتھ اس کے گھر جاتا رہا اور ایک دن ایک ڈاکٹر کو بھی لے گیا۔ ڈاکٹر نے کوئی خاص امید ظاہر نہیں کی چند دوائیں لکھ کے دے دیں۔ میں نے نسخہ جولین کو نہیں دیا بلکہ خود دوائیں خرید کے لایا مگر بوڑھے نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اس کی حالت روز بروز گرتی گئی میں چونکہ جولین کے ساتھ روز شام کو وہاں جانے لگا تھا اس لیے گلی کے بعض آدمی ہماری جانب نگاہیں اٹھانے لگے تھے۔ ہمارے گزرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ میں نے ان کی پروا نہیں کی نتیجہ ہوٹل بوائے نے ہمیشہ آگے کی طرف بیٹھے رہتے تھے۔ انھوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ پھر کھانس کھنکار ہونے لگی، ایک دوسرے سے اشارے کیے جانے لگے، جولین بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور سہم سہم جاتی تھی۔ آخر ایک روز اس نے مجھ سے کہہ ہی دیا کہ "یہ بہت برے لوگ ہیں بہتر ہے کہ آپ ادھر نہ آیا کریں۔ ان کی یہی عادت ہے۔"

"ہونے دیجیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

"ان کی طرف توجہ ہی مت دیا کیجیے۔"

"مگر آپ کو پتہ نہیں ہے ان سے پورا محلہ نالاں ہے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں یہ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ بسا اوقات ناقابل برداشت ہوتا ہے۔"

"ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں ان کا بس ایک ہی علاج ہے کہ ان کی طرف دیکھا ہی نہ جائے۔ نظر چرانا بھی توجہ دینا ہے یا پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔"

"یہ ہمیشہ چاقو رکھتے ہیں اور غلے میں آئے دن لڑتے رہتے ہیں۔"

جولین روز صبح ایک اسکول میں پڑھانے جاتی تھی اور سہ پہر کو مجھے پڑھانے آتی تھی پھر شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی تھی۔ میں نے راج کرشنا کی نظر میں اس کی وقعت بڑھانے کے لیے انگریزی کی پہلی کتاب صرف پندرہ دن میں ختم کرلی۔ راج کرشنا نے خوش ہو کے اسے کافی کا ایک سیٹ پیش کیا۔ گیارھویں یا بارھویں روز کی بات تھی مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے چند ہی دن ہوئے ہوں گے گیارھویں بارھویں دن حسب معمول شام کو میں اس کے ہمراہ جانے کے لیے بس اسٹینڈ پر گیا تو اس نے مجھے میں میں نہیں بیٹھنے دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے خوف زدہ لہجے میں بتایا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے لڑکوں نے مجھ پر جملے کسے تھے کہ شام کو آپ میرے ساتھ اس علاقے میں نظر آئیں ورنہ برا ہوگا۔ انھوں نے اور بھی بہت گندی گندی باتیں کی تھیں۔ "کمینے کہیں کے۔" میں غصے سے چیخا۔ "آج میں ان کی خبر لیتا ہوں۔"

"نہیں پلیز۔" وہ میرا بازو پکڑ کے بولی۔ "ان کے منہ لگنے سے کیا فائدہ۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ آپ کو میری قسم۔ آپ کچھ نہیں کہیں گے۔"

"اچھا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔ "مگر کل سے میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"میں چلتا ہوں۔" میں نے ضد کی۔

"واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا۔ میں آجاؤں گا۔"

وہ منع کرتی رہی مگر میں اس کے ساتھ ساتھ بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ ہم دونوں ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ بس نے ہمیں اس کے گھر سے کچھ دور اتار دیا۔ آگے جانے سے پہلے میں نے اسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے کپڑے والے کی دوکان تھی۔ میری جیب میں راج کرشنا روز کچھ روپے ڈال دیتا تھا۔ میں نے بہت سے چھل خریدے۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ کے ڈیڈی کے لیے ہیں۔ میری طرف سے۔"

"اوہ نہیں۔ یہ بہت زیادتی ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا میں انھیں کوئی پیشکش نہیں کرسکتا؟"

وہ کسی کے چپ ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو بے اس کے باپ کی طبیعت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مس جولین نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چند منٹ بیٹھ کے واپس آگیا۔

جولین کے باپ کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا مگر وہ روز مجھے پڑھانے آتی رہی اور میں روز اس کے ساتھ اس کے گھر جاتا رہا اور ایک دن ایک ڈاکٹر کو بھی لے گیا۔ ڈاکٹر نے کوئی خاص امید ظاہر نہیں کی چند دوائیں لکھ کے دے دیں۔ میں نے نسخہ جولین کو نہیں دیا بلکہ خود دوائیں خرید کے لایا مگر بوڑھے نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اس کی حالت روز بروز گرتی گئی میں چونکہ جولین کے ساتھ روز شام کو وہاں جانے لگا تھا اس لیے گلی کے بعض آدمی ہماری جانب نگاہیں اٹھانے لگے تھے۔ ہمارے گزرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ میں نے ان کی پروا نہیں کی نتیجہ ہوٹل بوائے نے ہمیشہ آگے کی طرف بیٹھے رہتے تھے۔ انھوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ پھر کھانس کھنکار ہونے لگی، ایک دوسرے سے اشارے کیے جانے لگے، جولین بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور سہم سہم جاتی تھی۔ آخر ایک روز اس نے مجھ سے کہہ ہی دیا کہ "یہ بہت برے لوگ ہیں بہتر ہے کہ آپ ادھر نہ آیا کریں۔ ان کی یہی عادت ہے۔"

"ہونے دیجیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

بٹ جوفی از نمبر ون۔ اف یو۔۔۔۔"

میں نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی جس ہاتھ سے اُس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، میں نے اُس پر تڑپتے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ ماسٹر کا ہاتھ پیچھے جھول گیا۔ میں کئی دن سے انھیں دیکھ رہا تھا اور اس لیے الجھنے سے گریزاں تھا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ضرر رساں نظر نہیں آتے تھے۔ وہ شہد سے تھے، آپچکے۔ ماسٹر کی گردن پر جب دوسرا ہاتھ پڑا تو وہ نیچے بیٹھ گیا۔

"کیوں ماسٹر!" میں نے ہاتھ روک لیا۔ "ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ ماسٹر جواب دیتا، اُن میں سے ایک لپک کے دائیں جانب سے میرے شانے کو دھکا دیا، اُس کا نام پتی تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ماسٹر کے فرش بوس ہونے کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس سے پیشتر کہ پتی کے ساتھ کوئی دوسرا مجھ پر پہلے اور خواہ مخواہ معاملہ مزید الجھے میں نے مشتعل انداز میں اُلٹے ہاتھ سے ایک سوچی سمجھی ضرب لگائی۔ پتی بوکل کے جبوترے سے جا ٹکرایا۔ اُس کا ماتھا کھل گیا۔ یہ سب چشم زدن میں ہو گیا۔ اس طرح اُتی، تین سورماؤں کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے دانستہ اُن کی طرف دعوتی نگاہ سے دیکھا۔ اُدھر ماسٹر نے چاقو نکال لیا تھا۔ جولین بے تحاشا چیخنے لگی۔ لمحوں میں اُس نے ماسٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماسٹر نے اُسے دُور دھکیل دیا اور چاقو ہاتھ میں لیے ہوئے میرے سامنے ناچنے لگا جب کہ میں ایک جگہ جما کھڑا تھا۔ عین میری آنکھیں جمی ہوئی نہیں تھیں، ماسٹر کے ہاتھ میں چاقو کی گرفت اور اُس کا انداز دیکھ کے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں نے آواز لگائی۔ "جولی! بچے ہٹو۔" ماسٹر نے غیر اختیاری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ میرے قبضے میں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ ماسٹر کی آنکھیں بھٹ گئیں، دوسری ضرب پر چاقو پہ اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور تیسری ضرب پر وہ نیچے گر گیا، فرش پر گرتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے اُسے اُٹھا لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے ساتھی دُور ہو گئے۔ وہ ماسٹر کا اشارہ پانے کے لیے پہلے ہی تلے کھڑے تھے اور پتی کے انجام سے محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے پھکارتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور آہستہ سے اُسے بند کر کے ماسٹر کی طرف اُچھال دیا۔ ماسٹر سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے جولین کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ میں جولین کا بازو زور سے پکڑے ہوئے اچانک پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اُچکے ماسٹر سے ایسا اوچھا پن بعید نہیں ہے۔ میرے کان اور آنکھیں پیچھے کی طرف لگی ہوئی تھیں جیسے ہی ماسٹر کے چاقو کھولنے کی آہٹ اور اُس کے اُٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی، میں اُس کے نشانے سے ہٹ گیا۔ ماسٹر غضب میں آگے نکل گیا۔ میں نے جولین کو چھوڑ کے اُس کی پشت پر جست لگائی۔ اسٹریچ نے مجھے بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہنے دیا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ میں نے انتہائی تندی سے مروڑا کہ اُس کی درد ناک کراہیں گلی میں سرسبز گونجنے لگیں۔ چاقو گرنے کے بعد بھی میں نے اُسے چھوڑا نہیں۔ مجھ سے جتنی ضربیں لگ سکتی تھیں، میں نے اُس پہ لگائیں اور جتنی وہ برداشت کر سکتا تھا، اُس نے برداشت کیں۔ میں نے اُس کے بالوں، بازوؤں اور گدی سے پکڑ پکڑ کے اُٹھاتا اور فرش پر پھینکتا رہا۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے چھل گیا۔ درمیان میں اُس کے ایک ساتھی نے پیچھے سے اچک کے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے ماسٹر پر لوٹ دیا۔ پھر اُس کا کوئی ساتھی نہیں بڑھا۔ یا تو وہ کہیں چھپ گئے ہوں گے یا دوسروں کو خبر کرنے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ جولین نے میرے بازو سے لپٹ کے مجھے روک لیا۔ ماسٹر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جولین کی منت پر اُسے دوبارہ نہیں اٹھایا۔ ماسٹر کا چاقو اُس کے پاس ہی نہیں پڑا تھا مگر اُس میں اُسے اٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گلی میں سناٹا طاری تھا، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ عورتیں اور مرد اب گلی میں نکل آئے تھے۔ میں جولین کو لے کے اُس کے گھر کی جانب چلنے لگا۔ فلیٹ پر پہنچ کے میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

♥

یہ معاملہ شروع ہونے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی۔ وہ ایک تنگ گلی تھی، اُس کے نکڑ سے ذرا اندر ہوٹل تھا، گلی موڑ کاٹ کے دوسری گلی سے مل جاتی تھی، میں محلِ وقوع کا جائزہ لے کے ہوٹل سے چند قدم ادھر اندر کو گلی میں کھسک آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ سب سے پہلے ماسٹر آگے بڑھے، تاکہ فیصلہ فوراً ہو جائے اسی لیے میں نے ماسٹر کو اکسایا تھا۔ میری خواہش کے مطابق ماسٹر ہی نے پہل کی مگر اُسے پہلے ہی مرحلے پر خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ حملے عام طور پر اُسی وقت علاقے کے مکینوں کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں جب انھیں اپنی طاقت پر اعتماد ہو، بصورتِ دیگر معاملہ ٹل جاتے ہیں۔ میں نے ماسٹر کو یہ موقع دیا تھا مگر اُس نے توجہ نہیں دی۔ یہ اُس کی گلی تھی اور یہاں کے مکین اس منظر کے گواہ تھے، اُسے کچھ خیال تو آنا چاہیے تھا مگر خیال تو اُسے ہوتا جسے کسی نے یہ باتیں ذہن میں رکھنے کی تربیت دی ہوتی، اُسے تو چاقو پکڑنا بھی نہیں آتا تھا، نتیجتاً جس بات سے میں بچنا چاہتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ فضول مجمعت کریں گے۔ ماسٹر کے بعد پتی کا آنا اور پتی کے بعد ایک دوسرے شخص کا میری گردن میں ہاتھ ڈالنا بہت چھوٹے پن کی بات تھی۔ تحمل ہوتا تو مجھ پہ بہت نادم ہوتا کہ اس موقع پر تیرا ہاتھ کیوں اٹھا ہی کیوں؟ تیری بات ہی نے انھیں کیوں نہ روکے رکھا مگر میں نے انھیں باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اُن کے بیچ نہیں پڑی تو میں کیا کرتا۔

جولین بہت حواس باختہ تھی، اُس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ مجھے انتہائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اب وہ بالکل مطمئن رہے، اطمینان سے گلی میں نکلا کرے، اب کسی جانب سے کوئی دقت نہیں ہو گی۔ اُس نے سر ہلا دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ ماسٹر کے فرش بوس ہونے کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس سے پیشتر کہ پتی کے ساتھ کوئی دوسرا مجھ پر پہلے اور خواہ مخواہ معاملہ مزید الجھے میں نے مشتعل انداز میں اُلٹے ہاتھ سے ایک سوچی سمجھی ضرب لگائی۔ پتی بوکل کے جبوترے سے جا ٹکرایا۔ اُس کا ماتھا کھل گیا۔ یہ سب چشم زدن میں ہو گیا۔ اس طرح اُتی، تین سورماؤں کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے دانستہ اُن کی طرف دعوتی نگاہ سے دیکھا۔ اُدھر ماسٹر نے چاقو نکال لیا تھا۔ جولین بے تحاشا چیخنے لگی۔ لمحوں میں اُس نے ماسٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماسٹر نے اُسے دُور دھکیل دیا اور چاقو ہاتھ میں لیے ہوئے میرے سامنے ناچنے لگا جب کہ میں ایک جگہ جما کھڑا تھا۔ عین میری آنکھیں جمی ہوئی نہیں تھیں، ماسٹر کے ہاتھ میں چاقو کی گرفت اور اُس کا انداز دیکھ کے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں نے آواز لگائی۔ "جولی! بچے ہٹو۔" ماسٹر نے غیر اختیاری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ میرے قبضے میں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ ماسٹر کی آنکھیں بھٹ گئیں، دوسری ضرب پر چاقو پہ اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور تیسری ضرب پر وہ نیچے گر گیا، فرش پر گرتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے اُسے اُٹھا لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے ساتھی دُور ہو گئے۔ وہ ماسٹر کا اشارہ پانے کے لیے پہلے ہی تلے کھڑے تھے اور پتی کے انجام سے محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے پھکارتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور آہستہ سے اُسے بند کر کے ماسٹر کی طرف اُچھال دیا۔ ماسٹر سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے جولین کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ میں جولین کا بازو زور سے پکڑے ہوئے اچانک پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اُچکے ماسٹر سے ایسا اوچھا پن بعید نہیں ہے۔ میرے کان اور آنکھیں پیچھے کی طرف لگی ہوئی تھیں جیسے ہی ماسٹر کے چاقو کھولنے کی آہٹ اور اُس کے اُٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی، میں اُس کے نشانے سے ہٹ گیا۔ ماسٹر غضب میں آگے نکل گیا۔ میں نے جولین کو چھوڑ کے اُس کی پشت پر جست لگائی۔ اسٹریچ نے مجھے بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہنے دیا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ میں نے انتہائی تندی سے مروڑا کہ اُس کی درد ناک کراہیں گلی میں سرسبز گونجنے لگیں۔ چاقو گرنے کے بعد بھی میں نے اُسے چھوڑا

نہیں۔ مجھ سے جتنی ضربیں لگ سکتی تھیں، میں نے اُس پہ لگائیں اور جتنی وہ برداشت کر سکتا تھا، اُس نے برداشت کیں۔ میں نے اُسے بالوں، بازوؤں اور گدی سے پکڑ پکڑ کے اُٹھاتا اور فرش پر پھینکتا رہا۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے چھل گیا۔ درمیان میں اُس کے ایک ساتھی نے پیچھے سے اچک کے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے ماسٹر پر لوٹ دیا۔ پھر اُس کا کوئی ساتھی نہیں بڑھا۔ یا تو وہ کہیں چھپ گئے ہوں گے یا دوسروں کو خبر کرنے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ جولین نے میرے بازو سے لپٹ کے مجھے روک لیا۔ ماسٹر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جولین کی منت پر اُسے دوبارہ نہیں اٹھایا۔ ماسٹر کا چاقو اُس کے پاس ہی نہیں پڑا تھا مگر اُس میں اُسے اٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گلی میں سناٹا طاری تھا، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ عورتیں اور مرد اب گلی میں نکل آئے تھے۔ میں جولین کو لے کے اُس کے گھر کی جانب چلنے لگا۔ فلیٹ پر پہنچ کے میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

♥

یہ معاملہ شروع ہونے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی۔ وہ ایک تنگ گلی تھی، اُس کے نکڑ سے ذرا اندر ہوٹل تھا، گلی موڑ کاٹ کے دوسری گلی سے مل جاتی تھی، میں محلِ وقوع کا جائزہ لے کے ہوٹل سے چند قدم ادھر اندر کو گلی میں کھسک آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ سب سے پہلے ماسٹر آگے بڑھے، تاکہ فیصلہ فوراً ہو جائے اسی لیے میں نے ماسٹر کو اکسایا تھا۔ میری خواہش کے مطابق ماسٹر ہی نے پہل کی مگر اُسے پہلے ہی مرحلے پر خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ حملے عام طور پر اُسی وقت علاقے کے مکینوں کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں جب انھیں اپنی طاقت پر اعتماد ہو، بصورتِ دیگر معاملہ ٹل جاتے ہیں۔ میں نے ماسٹر کو یہ موقع دیا تھا مگر اُس نے توجہ نہیں دی۔ یہ اُس کی گلی تھی اور یہاں کے مکین اس منظر کے گواہ تھے، اُسے کچھ خیال تو آنا چاہیے تھا مگر خیال تو اُسے ہوتا جسے کسی نے یہ باتیں ذہن میں رکھنے کی تربیت دی ہوتی، اُسے تو چاقو پکڑنا بھی نہیں آتا تھا، نتیجتاً جس بات سے میں بچنا چاہتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ فضول مجمعت کریں گے۔ ماسٹر کے بعد پتی کا آنا اور پتی کے بعد ایک دوسرے شخص کا میری گردن میں ہاتھ ڈالنا بہت چھوٹے پن کی بات تھی۔ تحمل ہوتا تو مجھ پہ بہت نادم ہوتا کہ اس موقع پر تیرا ہاتھ کیوں اٹھا ہی کیوں؟ تیری بات ہی نے انھیں کیوں نہ روکے رکھا مگر میں نے انھیں باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اُن کے بیچ نہیں پڑی تو میں کیا کرتا۔

جولین بہت حواس باختہ تھی، اُس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ مجھے انتہائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اب وہ بالکل مطمئن رہے، اطمینان سے گلی میں نکلا کرے، اب کسی جانب سے کوئی

یک آواز اُس کے کان زخمی نہیں کرے گا مگر جولین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہیں۔ وہ مجھے کمرے میں بٹھا کے دوسرے کمرے میں چلی گئی، شاید اُسے سکون کی ضرورت تھی، اُس کی ماں نے مجھے سنگترے کا عرق پلایا اور آئے دن گلی کے غنڈوں کے کرتوت سنانے لگی۔ جولین جب کمرے میں آئی تو اُس کے چہرے پہ پہلے جیسا اضطراب نہیں تھا، میں نے اُس کی طرف سے مطمئن ہو کے واپس ہو جانا چاہا لیکن جولین نے مجھے روک لیا۔ اُس کی آنکھیں ہانپ رہی تھیں، تھے پھڑک رہے تھے اور نچلا ہونٹ بھی اُبھر آیا تھا، کبھی چھپ جاتا تھا، گال دب جاتے تھے۔ سُرخ اور سفید رنگ جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ "آپ ابھی سوچ رہی ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں، یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"بھول جائیے جیسے..... جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"اور اگر..... اگر آپ کو کچھ ہو جاتا؟"

"تو کیا ہوتا! میرا رونے والا کون ہے۔"

اُسی لمحے جولین کی ممی دہشت زدہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے گلی میں پولیس کی آمد کی خبر سُنائی۔ یہ بالکل غیر متوقع خبر تھی، میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے کرسی چھوڑ دی۔ جولین نے مجھے روکا اور خود بالکونی سے نیچے جھانک کے دیکھا۔ وہ بدحواسی سے واپس آئی۔ "نیچے پولیس موجود ہے۔"

"مجھے نیچے جا کے دیکھنا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔ ابھی ٹھیریے، مکرشنا جی آتے ہی ہوں گے۔"

"مکرشنا جی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ بات اور بگڑ جائے۔ "آپ کو یہاں سے راستے سے گزرنا ہے، آپ نے دیکھ ہی لیا، پولیس آ گئی۔ ابھی پچھ دیر پہلے میں نے نچلے مالے کی ایک لڑکی مارتھا سے کہا تھا کہ وہ کہیں سے نون پر مکرشنا جی کو مطلع کر دے۔ بس وہ آ ہی رہے ہوں گے۔"

"اوہ آپ نے یہ کیا کیا؟" میں نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ جولین نے مجھے منع کیا۔ میں نے آگے بڑھ کے کنڈی کھول دی، ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ "مس جولین کا فلیٹ یہی ہے؟" اُس نے نیم گرم نیم نرم لہجے میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور درشتی سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

انسپکٹر نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ اُسے شاید میرا لہجہ ناگوار گزرا کہ کھلی ہو گئی۔ راج کرشنا کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ کیا ہوا؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں جولین کی طرف ناراضی سے دیکھا۔ وہ راج کرشنا کو گھورنے لگی۔ انسپکٹر باہر ہی کھڑا رہا۔ جولین جب تک راج کرشنا کو رُوداد سناتی رہی، میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر انسپکٹر نے اُس کے ڈیڈی کو دیکھے گیا۔ اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، میں بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ گلی میں سپاہی منتشر تھے اور مرد اور عورتیں مجمعوں، بالکونیوں پر ہر طرف لوگ موجود تھے۔ پولیس سے کچھ دُور ایک بڑا ہجوم دائرہ بنائے کھڑا تھا۔ سب کی نظریں جولین کی بلڈنگ پر مرکوز تھیں، میں بالکونی میں نمودار ہوا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ راج کرشنا جولین کو تسلی دے رہا تھا۔ نیچے اُترنے سے پہلے میں نے جولین سے کہا، باہر اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہ اُس کی حالت دیکھ کے گنگ رہ گیا۔

ہمارے ساتھ جولین بھی نیچے اُتری، سپاہیوں نے بوٹوں کی گرج کے ساتھ راج کرشنا کو سیلوٹ کیا، گلی میں چند لمحوں کے لیے ایسا سکوت چھا گیا تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ ہر طرف پتھر کے آدمی نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر اور سپاہی مؤدبانہ راج کرشنا کے نزدیک کھڑے تھے۔ راج کرشنا نے جولین کی کمر تھپتھپائی اور انسپکٹر سے آہستہ لہجے میں کچھ کہا اور میرا ہاتھ تھام کے واپس ہونے لگا۔ گلی کے موڑ پر میں نے پلٹ کے دیکھا۔ جولین الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ راج کرشنا نے مسکرا کے جواباً ہاتھ ہلایا۔ ہم گلی میں آگے اور انسپکٹر ہوٹل کے پاس پہنچ گئے جہاں ماسٹر نے میرا گریبان پکڑا تھا۔ نہ جانے وہاں کے لوگوں کو کیا ہوا؟ ہمارے گزرتے وقت آہ و بکا میں بدلنے لگے۔ ایک ستر اسی سالہ خمیدہ کمر سُرخ و سپید بوڑھا چلا چلا کے کہنے لگا۔ "ہیرو ہے، ہیرو ہے۔" وہ انگریزی میں بولا۔ اُس نے میری کلائی پکڑ کے کھینچا میں آگے جھک گیا تو اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اُس نے بڑی پیشانی کو بوسہ دیا۔ جہاں جہاں لوگ کھڑے تھے وہ دیوانہ وار تالیاں بجاتے گئے۔ ہمیں کار تک پہنچنے تک ہمارے ساتھ رہا۔

راج کرشنا کے آنے کی ضرورت نہیں تھی، ماسٹر اور اُس کے ساتھیوں کا دو بارہ ہوٹل میں بیٹھنا اور گلی میں دندناتا نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ جولین نے خواہ مخواہ ایک تماشا بنا دیا۔ بہرحال اُس کی تشفی ہو گئی اور غنڈے کے لوگوں کی ہمت بھی بندھی کیونکہ پولیس کا حکمہ لیے ہی موقعوں اور لیے ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے اور کچھ نہ سہی راج کرشنا کے سامنے جولین اُٹھا ہی پڑھ گیا۔

راج کرشنا نے دوسرے دن جولین کے باپ کرسٹی وریم میں دخل کرا دیا۔ جب وہ مقررہ وقت پر مجھے پڑھانے آئی تو ایک بدل ہوئی لڑکی نظر آئی تھی۔ وہ ہماری واپسی کے بعد گلی میں ہونے والا چرچا سنانے لگی۔ محلے کی عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم اُس کے گھر اُمڈ پڑا تھا جیسے ماسٹر کے ہاتھ سے چاقو اُسی نے چھینا ہو۔ باتیں کرتے وقت جولین کو خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے استاد کے سامنے گفت گو کر رہی ہے۔ وہ سارا وقار رول گئی تھی اور کسی الھڑ لڑکی کی طرح آنکھیں پٹ پٹا کے تیز تیز باتیں کر رہی تھی، میں نے اُسے ٹوکا۔ "آج آپ پڑھائیں گی نہیں؟"

وہ خفا کے چُپ ہو گئی۔ "اوہ ہاں، میں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"یہ کیسی بات کی آپ نے؟" میں نے شکایتاً کہا۔

"اچھا جی! معاف کر دیجیے غلطی ہو گئی۔"

"کوئی استاد اپنے شاگرد سے معافی مانگتا ہے؟"

"اچھا استاد وہی ہے جو اپنی غلطی کا اقرار کر لے۔ لوگ تو لوگوں کو چھپا کر ستم کہتے ہیں، میں آپ کو کہوں گی کہ آپ مجھے استاد ہیں اور آپ سے درخواست کروں گی کہ مجھے شاگردی میں لے لیجیے۔"

"مجھے آتا ہی کیا ہے؟"

"آپ کو۔" وہ بھرجھری لے کے بولی۔ "آپ کو وہ آتا ہے جو کسی کو نہیں آتا۔ بتائیے آپ مجھے شاگرد بنائیں گے؟"

"کس بات کی شاگرد؟"

"کتابوں نے مجھے ڈرپوک بنا دیا ہے، آپ مجھے حوصلے کی تعلیم دیجیے۔"

"حوصلہ۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ "لوگ تو خود مجھے بار بار حوصلے کی تلقین کرتے ہیں، احساس دلاتے ہیں کہ تم ایک مرد ہو۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟"

"بہت سے لوگ ہیں۔"

"تعجب ہے۔"

"ہاں مجھے خود تعجب ہے۔" میں نے اداس سے کہا۔ "میرا خیال ہے، زندہ رہنا ہی ایک حوصلہ ہے۔ حوصلہ کہیں بے خیرتی کو تو نہیں کہتے؟"

"ہاں۔" وہ بھی افسردہ ہو گئی۔ اس کی بلکیں سمٹ گئیں کورا کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی، کورا۔ جولین کی بلکیں کورا کی پلکوں سے بہت مشابہ تھیں، اُنھی کی طرح گھنی اور گھنی ہوئی۔ اب تو اور گھنی ہو گئی ہوں گی میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی، پھر جولین نے بے وقت موسیقی سننے کا اشتیاق ظاہر کر دیا۔ گو اس نے کتاب کھول کے مجھے پڑھانا شروع کر دیا تھا لیکن آج اس کے پڑھانے میں ہمیشہ والی روانی اور سنجیدگی نہیں تھی۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ ریکارڈ سنتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی پھر معمول کے مطابق میں اسے پہنچانے کے لیے اس کے گھر گیا حالانکہ اس کے ڈیڈی سینی ٹوریم میں داخل ہو گئے تھے۔ ہونل سنسان پڑا تھا۔ گلی میں سکراتی ہوئی آنکھوں سے میرا استقبال کیا گیا۔ لوگ مجھے اور جولین کو ساتھ دیکھ کے اثبات کرنے لگے لیکن یہ اثبات ویسے نہیں تھے جیسے ماسٹر اور اس کے ساتھی کرتے تھے۔

راج کرشنا نے ایک ہفتے کے اندر جولین کے لیے اپنے علاقے ہی میں ایک مختصر اور تھرا مکان کرائے پر لے کے اسے منتقل کر دیا۔ جولین اس پر تیار نہیں ہوتی تھی، اس کی صورت راج کرشنا نے یہ نکالی کہ اپنے اثر سے جولین کی موجودہ ملازمت چھڑوا کے اسے انگرزیاں کے اسکول میں ملازمت دلوا دی، جہاں سینئر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں پہلے سے دگنی تنخواہ تھی جولین قریب آ گئی تو اس نے میری پڑھائی کے لیے زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ ہم جب سیر کے لیے جاتے تو جولین کو ساتھ لے لیتے۔ چپا کی اس سے بہت گھنٹی تھی۔ سینی ٹوریم میں اس کے باپ کی حالت نسبتہً بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن وہ نہیں ملی جس کی مجھے تلاش تھی۔ جب میری طبیعت بہت گھبراتی تو میں سڑکوں پر نکل جاتا اور ایک ایک چہرہ گھور کے دیکھتا رہتا اور ایک ایک آدمی کا جائزہ لیتا رہتا۔ میں گھنٹوں کسی چوراہے پر کھڑا رہتا اور راہ گیروں کی شکلیں تکتا رہتا۔ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ہر آدمی کا چہرہ مختلف تھا۔ مولوی صاحب جیسی شکل کا کوئی آدمی ملا، نہ کورا جیسی شکل کی کوئی لڑکی دکھائی دی۔ ننا آپا جان نظر آئے نہ گھر کا کوئی دوسرا فرد۔ رات کو کمرے میں اپنی مالا کے دانے چپرے پر کھینچ لیتا تھا۔ اس سے بہت بے قراری ہوتی تھی مگر یہ بے قراری ہی تو میرا سکون تھی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے کورا کو ایک خط لکھ دیا ہے اور بس اب اس کا جواب آتا ہی ہو گا۔ مالا کے دانے میری آنکھوں سے مس ہوتے تو مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی۔

راج کرشنا کی مصروفیت بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ رات گئے گھر واپس آتا۔ چپا اس کا انتظار کرتی رہتی جب تک وہ نہ آ جاتا ہم دونوں میں سے کوئی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ آ کے ہمیں ڈانٹتا تھا۔ راج کرشنا کے تبادلے کی بہت سی کوششیں ہوئیں مگر کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی کیونکہ مرکزی حکومت نے اسے بمبئی شہر کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کے مدِ نظر اسے خاص طور پر یہاں بھیجا تھا۔ ساڑھے تین سو کے قریب آدمی ایک ڈیڑھ مہینے کی جیل کے بعد چھوٹ گئے تھے۔ ان کا تعلق اندرونی گروہ سے نہیں تھا۔ ستانہ کا تقدیر پل رہا تھا اور شہر کے رئیسوں کے تعلقات بند کمروں میں جاری تھے۔ اخبالات راج کرشنا کے ساتھ تھے وہ جہاں جاتا اسے عزت دی جاتی، لوگ اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ پولیس کے پرانے اصلاحات اس کے اچانک فیصلوں سے خائف رہتے تھے مگر جب ان پر عمل درآمد کے بعد کامیابی ہو جاتی تو راج کرشنا کو مبارک باد دینے کے لیے گھر آتے تھے۔ بعض اہم چھاپوں اور کارروائیوں میں راج کرشنا بذاتِ خود شریک ہوتا تھا، وہ ایک بے باک اور صاف گو شخص تھا۔ چپا کی وجہ سے گھر پر ہونے والی ٹینگوں میں کی ہو گئی تھی لیکن پولیس افسران سے مشورے کرنے کے لیے روز آتے تھے۔

مجھے اس کے ساتھ رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ ان چار مہینوں میں کئی بار میں نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا مگر راج کرشنا کے خلوص سے میرے قدم خود بخود مجھے اس کے گھر واپس لے گئے۔ میں نے زیادہ پریشان نہیں کیا یا ایسا تھا کہ وہ میری پریشانی کا عادی ہو گیا تھا۔ کئی مرتبہ جیسے ہی میں آئی کہ میں نرسوں کو اپنی غیریت کا خط لکھ دوں، وہ مطمئن ہو جائے گی کہ میں زندہ ہوں، مجھے کوئی قرار آ جائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے مگر میں نے کوئی خط نہیں لکھا کیونکہ اس طرح وہ اور پریشان ہو سکتی تھی۔ راج کرشنا کہتا تھا کہ زندگی میں مایوسی زندگی کی عملی موت ہے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ تو میں ہوں ہی نہیں، یہ تو کوئی اور شخص ہے جو راج کرشنا کے پاس رہتا ہے، اسے دنیا کا کوئی کام نہیں ہے۔ اگر راج کرشنا اس شخص سے خوش ہوتا ہے تو میرا کیا حرج ہے۔ مجھے اور کہاں جانا ہے؟ کس کے پاس جاؤں گا؟ ہر جگہ یکساں ہے۔ کسی بھی جگہ چلا جاؤں، وہاں کورا تو نہیں ہو گی۔

نورین کئی بار گھر آئی اور دیر تک مجھے ریجھتی رہی، اس نے مجھے تھیٹر لے جانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر ایک دن ہم اس کے گھر گئے۔ چپا بھی ہمارے ساتھ تھی، رستم جی نے انواع و اقسام کے تکلفات میز پر چن دیے تھے۔ ایک دن مسز روپ چٹیل نے بھی ہمیں مدعو کیا۔ اس کا گھر کیا تھا ایک محل تھا۔ مسز روپ نے ہیرے ہی ہار پہنا۔ شاید وہ مجھے چڑانا چاہتی تھی۔ مجھے وہاں اچھا نہیں لگا۔ میں گھر آ کے دو سے دن تک کمرے میں بند رہا۔ جولین نے مجھے بہتیرے آواز دیے، جولین کی آنکھوں میں ایک عجیب بات آ گئی تھی۔ پہلے ایسی بات نہیں تھی اب وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی تو مجھ پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں پر مجھے اپنی کورا کی آنکھوں کا گمان ہوتا جیسے جولین کی آنکھیں ہمل رہی ہوں۔ گھبرا کے میں نے اس کی طرف دیکھنا ہی کم کر دیا۔

ایک دن شام کی بات ہے۔ جولین مجھے پڑھا کے واپس جا چکی تھی۔ ہوم ڈی پولیس افسر راج کرشنا سے ملنے کے لیے جمگلے آئے۔ میں ان میں سے ایک کو خوب جانتا تھا۔ وہ بھی مجھے جانتا تھا۔ اس کا نام جسونت راؤ تھا۔ میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کے ان کے لیے اناناس پانی منگوایا اور خود ڈرائنگ کے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ انگریزی میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے گفتگو کا موضوع وہی تھا، شہر کے جرائم۔ نئے پولیس افسر نے جسونت راؤ سے مرگوشی میں کسی متعلق پوچھا۔ جسونت راؤ نے انگریزی میں اسے مختصر سا جواب دیا کہ یہ راج کرشنا صاحب کی پتنی ہے، پتہ نہیں کون تھی ہے راج کرشنا اس کا بڑا خیال رکھتا ہے، مشہور ہے کہ ستانہ کیس میں اسی نے اس کے اغوا میں گمشدگی کے راج کرشنا کے لیے خبری کی تھی اس نے ایک موقع پر اس کی جان بھی بچائی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔" سب کی طرح جسونت راؤ بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں انگریزی سے نابلد ہوں اس لیے وہ اطمینان سے بات کرتا رہا۔ وہ راج کرشنا سے ملنے آیا تھا اور اس کے انتظار میں بیٹھا تھا پھر بھی راج کرشنا کے متعلق اس کا لہجہ بہت گستاخانہ اور طنزیہ تھا۔ میں سلگ اٹھا کرتا رہا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دونوں راج کرشنا کو ایک پولیس افسر کا خطاب دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کسی دن اس کے متعلق کوئی بہت بری خبر آ سکتی ہے کیونکہ مقامی پولیس کے تمام بڑے افسر اس کی یہاں موجودگی اپنی توہین سمجھتے ہیں اور راج کرشنا نے ان کی توہین کی ہے۔ میں بت بنا بیٹھا رہا۔ میں نے کسی طور پہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں گفتگو سمجھ رہا ہوں۔ تب تک منتقل ہو رہی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر راج کرشنا کا تبادلہ نہ کیا گیا تو میں جلدی اس کا سوگ منانا پڑے گا۔ شہر بہت بیمار ہے۔ وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اور شہر کو ہوم گروپ کے وسائل سے بچانا ہے۔ ایک حملہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے! مجھے شبہ ہے کہ راج کرشنا کو زندہ مدراس واپس جانے دیں گے۔ بمبئی کی پولیس کا ایک بڑا سرکٹ

بھی سکون کی سانس لے گا۔ یہ تو مدراس سے زیادہ دہشت ناک ہے، کہتے ہیں یہ بمبئی ہے، راج کرشنا اسے ایک معمولی شہر کی طرح سر کرتا ہے۔"

جسونت کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ اس کے دل میں راج کرشنا کے متعلق بڑا کینہ بھرا ہوا تھا۔ بدنیاہ ہی اس انداز میں باتیں کرتے تھے میں ان کے سامنے وہ جھگی بلی بنا رہتا تھا۔ ان کی باتیں ان کے سینے میں انگارے سے بھر گئے۔ اتنی وحشت ہوئی کہ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کمینے کو راج کرشنا سے برطرف ہوا کر اڑوں گا۔ اس کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ خاصی دیر سے آیا مگر جسونت اس کے انتظار میں بیٹھا رہا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے وہ گرگٹ کی طرح بل گیا۔ مجھے ضبط نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کھانا بھی میں نے اپنی سرسری کیا، جیسے ہی چپا مجھے دودھ کا گلاس پلا کے اپنے کمرے میں گئی میں نے بیگ کرتا کے دروازے پر دستک دی وہ غلیظ تانے بہ عادہ مجھے دیکھ کے اس نے ٹلپنے جیب میں رکھ لیا۔ "کیا بات ہے نصیر؟" وہ بولے تانی سے بولا۔

"آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"آؤ، آؤ، اندر آؤ، مگر دیکھو اچھی بات کرنا۔"

"آپ بمبئی چھوڑ دیں، اپنا تبادلہ کرا لیں۔"

"کیوں؟" وہ چونک کے بولا۔ "کیا تمھیں یہ شہر پسند نہیں ہے؟"

"میرے لیے ہر شہر یکساں ہے۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں آپ اس چلے جائیے یا کسی اور شہر میں تبادلہ کرا لیجیے یہاں مت رہیے۔"

"مگر کیوں؟ ایسی بھی کیا بات ہے۔" وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

"میں اپنا تبادلہ کبھی خود نہیں کراتا، اوپر سے حکم آتا ہے تو میں ٹالنے کی کوشش بھی نہیں کرتا مگر بتاؤ تم آخر کس سبب سے یہ مشورہ دے رہے ہو۔"

"بس میری بات مان لیجیے۔"

"ضرور مانوں گا، یقیناً کوئی خطرناک قسم کا فون آیا ہو گا۔" وہ میری بات سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ بس کے کہنے لگا۔ "پولیس کی ملازمت میں ایسی دھمکیاں اور کوششیں عام ہوتی ہیں۔"

"لیکن آپ انھیں محض دھمکیاں کہہ کے ٹال سکتے، ابھی کچھ ہوئے بغیر اس دھمکی کو حقیقت میں بدلنے کے لیے پورا زور لگایا جائے گا، آپ کو کلب کا واقعہ یاد نہیں رہا۔"

"میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا اور تم جانتے ہو میں پہلے سے خاصا محتاط ہو گیا ہوں، ضروری کاموں کے سوا باقی تمام مصروفیات میں نے تقریباً ختم کر دی ہیں، غیر ضروری ہوئی چیزیں درست کرتا، اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پولیس والے اگر ان دھمکیوں سے متاثر ہونے لگے تو پولیس نے کاروبار کیا۔ میری زندگی کئی مرتبہ ال بال بچی ہے تو کیا مجھے پولیس کی ملازمت ترک کر دینی چاہیے؟"

"مگر میں ملازمت چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا ہوں، تبادلے کے لیے

کر رہا ہوں اور شہروں میں بھی بہت سے بگڑے ہوئے معاملے ہیں آپ ہاں جا کے کام کیجیے جہاں کام کی قدر ہو جہاں آستین میں سانپ نہ پلتے ہوں جہاں اپنے ہی لوگ جڑ کاٹنے کی فکر میں لگے ہوں، وہاں سے دست برداری ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے ہی لوگ!" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں وہی ہیں آپ کے ساتھی۔"

"اوہ، وہ جیسے میری ساری بات سمجھ گیا منس کے بولا۔ "ظہیر ہر جگہ ایسا ہوتا ہے کوئی آوارہ اس برائی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ ابھی لوگوں میں کام کرنا پڑے گا تمہیں ضرور کہیں میری برائی سننی پڑی ہے۔"

"برائی ہوتی تو ٹھیک تھا مگر آپ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ لوگ آپ کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے، وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں۔" میں نے سمجھانے کے انداز سے کہا۔

"بے شک۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے اس کا احساس ہے لیکن مجھے ابھی لوگوں سے کام لینا ہے انھیں نظر انداز کر کے کام کرتے رہنا چاہیے۔"

"بہر حال میں نے بات آپ کے گوش گزار کر دی ہے۔"

"اوہ نہیں، اس نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا۔" میں اور احتیاط برتوں گا۔ کچھ ایسے ضروری کام نمٹانے ہیں کہ میری موجودی لازم ہے۔ تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ خود تم نے کیا دیکھ لیا۔"

"ابھی ابھی جو لوگ آئے تھے آپ سے ملنے۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"وہ آپ کے سامنے تو بہت سُرور کر رہے تھے لیکن وہ آپ سے خوش نہیں ہیں، خوش کیا، وہ بہت برے لوگ ہیں ان میں ایک، جسونت تو بہت کمینہ ہے۔"

"کیا انھوں نے تم سے کچھ کہا؟" وہ برہمی سے بولا۔

"کاش وہ مجھ سے کچھ کہہ دیتے۔"

"پھر۔۔۔؟"

"وہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔" میں نے اسے وہ تمام باتیں بتا دیں جو جسونت اور اس کے ساتھ آنے والے افسر کے درمیان ہوئی تھیں۔

لیکن کرشنا کا چہرہ بجھ گیا۔ "مگر، مگر کیا وہ یہیں یہ سب کہہ رہے تھے؟" وہ تھتھاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں!"

"تمہارے سامنے؟"

"ہاں میرے سامنے۔" میں نے تندی سے کہا۔ میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اپنی ہی بات سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"مگر، مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ بذیانی انداز میں بولا۔

ایک لمحے کے لیے میرا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اسے کیا بتاؤں کہ وہ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اتنے بے وقوف تھے کہ ہمارے گھر اور ہم لوگوں کی موجودی میں شد و مد سے ہماری برائیاں کر رہے تھے وہ گویا پاگل ہو گئے تھے۔ ہر چند میں نے اسے چمپا والی بات بتانے سے گریز کی تھی جسونت کو معلوم تھا کہ چمپا ایک طوائف ہے جسے راج کرشنا نے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ راج کرشنا کی بے احتیاطی کا یہی انجام ہونا تھا۔ میں پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ بالواسطہ اس کا ایرانی تاجر کے ہوٹل میں چمپا کا سامان لینے کے لیے جانا مناسب نہیں ہے مگر میں نے جسونت سے سنی ہوئی باتیں تمام باتیں اسے بتا دی تھیں اور اس کا یہ سوال کرنا بالکل جائز تھا کہ جسونت کو میری موجودی میں اس ہرزہ سرائی کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ میری زبان پتھر ہو گئی کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ کوئی معمولی بات ہوتی تو میں کچھ بھی بہانہ کر دیتا لیکن اس کا تعلق راج کرشنا کی زندگی سے تھا، اسے یقین آنا چاہیے تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے کانوں کا بھیانک خواب نہیں ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور مجھے جسونت سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے دل کڑا کر کے دو ٹوک انگریزی میں بات کر دینے کا فیصلہ کیا۔

"انگریزی میں؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

"میں نے آپ سے چھپایا تھا، میں انگریزی جانتا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ اچھل کے بولا۔

"میں اسی لیے آپ سے کہتا تھا کہ آپ مس جولین پر سپیشل ضائع کر رہے ہیں۔ بس وہ باتیں کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

اس نے مجھے دبوچ لیا۔ "ظہیر ظہیر کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔" میں نے گردن جھکا کے کہا۔

"اوہ! تم نے دو متضاد خبریں سنائی ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں بتا نہیں سکتا۔" وہ بہکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنا چونکایا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ سے بہت چھپایا۔"

"مجھے حیرت تھی کہ تم کتابوں کے بغیر اتنی عجیب باتیں کیسے کر لیتے ہو۔ تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"بی ایم اے کیا ہے۔"

"اور یقیناً فرسٹ کلاس لی ہو گی؟" میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ "اوہ میری جان" اس نے کھڑے ہو کے مجھے گلے لگا لیا۔ "تم نے مجھ پر احسان کیا ہے مجھے بتا دیا۔"

"اب آپ کچھ اور مت پوچھیے۔"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں، میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے یقین ہے ایک دن تم سب کچھ مجھے بتا دو گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر آپ تبادلہ کرا لیجیے۔" میں نے اچھی باتیں نہیں سنی ہیں۔"

"میں اپنا کام جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا۔" بے فکر ہو

ابھی میں کچھ اور زندہ رہوں گا، ابھی مجھے تمہارے ساتھ بہت سی سیر کرنی ہے۔"

میں اس کی اور بہت سی باتوں سے بچنے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا۔ میں نے غلطی کی تھی اس کا احساس مجھے فوراً ہی ہو گیا۔ میں نے ظہیر خاں کے نام سے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ دگری بھی ابھی جیل میں پڑی تھی۔ راج کرشنا کے لیے ہندوستان کی گنتی کی چند یونیورسٹیوں سے یہ پتہ چلا لینا کون سا مشکل تھا کہ ظہیر خاں نامی طالب علم نے کب ایم اے کیا ہے اور جب اسے پتہ چلتا کہ میں نے جیل سے امتحان دیا تھا اور میں قتل کے الزام میں سات سال کی سزا کاٹ رہا تھا اور پھل نامی مخبر میرا کفیل تھا مگر اب پھلنے سے کیا ہوتا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے گناہ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی مالا گلے سے اتار کے جیب میں ڈال لی تب کہیں مجھے کچھ سکون ہوا۔

صبح میں اس سے آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ناشتے کی میز پر وہ بہت خوش تھا جیسے میرے امتحان کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے وہ انگریزی میں مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ آج سے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرے گا۔ "میں ایک لمبی چھٹی کی درخواست دوں گا اور ہم گھومتے رہیں گے۔" میں حیران تھی کہ آج وہ مجھ سے دوسری زبان میں کیوں مخاطب ہے، میں کوئی جواب دیے بغیر ناشتے کی میز سے جلد ہی اٹھ گیا۔ اس کی ہنسی نے کہا "کب میرا تعاقب کیا، جب وہ چلا گیا تو میں نے چمپا سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ باورچی خانے میں موجود تھی۔ میں نے سوچا وہ باہر آئے تو اس سے کہوں کہ وہ کہیں اور چلی جائے کیونکہ اس کی موجودی راج کرشنا کی گمراہی کا سبب بن رہی ہے۔ وہ باہر کے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اس نے پہلے خلاف بدلے، چادریں تبدیل کیں، ڈریسنگ روم کی میز پر تازہ پھول سجائے۔ راج کرشنا کے کمرے میں جا کر اس کا بستر درست کیا، میں سوچتا ہی رہا اور بنگلے سے باہر چلا آیا۔ شہر کی سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ آج بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ جب میں گھر آیا تو خلافِ معمول جوہن کی وجود تھی۔ ہری جھاڑی میں اس کا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے ساتھ سینی فورم چلو۔ میں نے کہا، چلو مجھے کیا کام ہے۔ واپس آ کے بھی وہ یہ تکا لگا رہی اور کہیں رات کو واپس گئی۔

رات بہت ہو گئی، راج کرشنا گھر نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے کے قریب موٹر کے رکنے کا آواز آئی۔ میں بھاگا مگر وہ راج کرشنا کی موٹر نہیں تھی۔ ایک پولیس افسر جیپ سے اترا میں اسے جانتا تھا، وہ ایس پی شکلا تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ، کرشنا جی کے پاس۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ سیچن اسپتال میں ہیں، زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے، جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" وہ مجھے ونڈ سکرین سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے، آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"کرشنا جی زخمی ہو گئے ہیں۔"

"زخمی! کہاں کیسے؟" میری آواز دہل گئی۔

"ان پر حملہ کیا گیا ہے۔" شکلا نے مختصر جواب دیا۔

میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اسپتال میں پولیس افسران کا ہجوم تھا۔ مجھے فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سامنے راج کرشنا بیٹھا تھا، اس کے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور راج کرشنا کی آنکھیں کھول کے دیکھنے لگا پھر مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں بے جان قدموں سے اس کے پاس گیا اور راج کرشنا کے جسم سے لپٹ گیا۔ میری آہ و بکا سے اس کے جسم میں جنبش ہوئی، اس نے کراہ کے میرا نام لیا۔ اپنی لرزتی ہوئی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور لکھڑی ہوئی ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وقت کم ہے لاڈلے، تم، تم سچ کہتے تھے، مجھے افسوس ہے میں تمہارے کام نہ آ سکا، میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے، بابا صفدر زماں خاں کو تلاش کرنے کے لیے ہر جگہ سرکلر بھیج دیا ہے۔ میں خود تمہیں ان کے پاس بھی لے چلتا مگر۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، ہمت رکھنا لاڈلے!" اس کی آواز بیٹھنے لگی۔

وہ مجھے لاڈلے کے نام سے پکار رہا تھا لیکن مجھے اس کی عزت نہیں ہوئی۔ راج کرشنا کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کا ہر عضو پر گیا تھا میں اس کے سینے سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے بتائیے وہ کون تھے؟ کون لوگ تھے وہ؟" لیکن اس نے مجھے پھر بات نہیں کی۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے اس کے پاس سے ہٹا دیا۔ میں بکتا رہا مگر انھوں نے میری ایک نہیں سنی۔ کمرے سے باہر پولیس افسران نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مجھ سے راج کرشنا کا حال دریافت کر رہے تھے مگر مجھ میں انھیں کچھ بتانے کی طاقت نہیں تھی، آخر میری حالت دیکھ کے وہ خود فاموش ہو گئے۔ ایس پی شکلا میری کمر تھپکنے لگا۔ اس نے مجھے دلاسا دیا۔ ایک گھونٹ پانی پلایا اور تسلی دینے لگا۔ میں نے راج کرشنا کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میری نظریں اس کے کمرے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تیزی سے اندر جا رہے تھے اور باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر اطمینان کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اسپتال کی راہ داری پولیس افسروں کی تیز آوازوں سے بھن بھنا رہی تھی، سب کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ مجھے گھومنے کے مرض نے خوف زدہ کر رہے تھے۔

"ظہیر نہیں تو رونی چاہیے ظہیر خاں!" ایس پی شکلا نے ڈرتے ہوئے لہجے میں پھر مجھے صبر کی تلقین کی۔

"یہ سب کیسے ہوا شکلا جی؟" میری سسکیاں نکل گئیں۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ بچ کے کہاں جائیں گے۔"

"مجھے بتائیے وہ کون کمینے تھے؟ مجھ سے مت چھپائیے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "شکلا جی! مجھے بتائیے یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے اس کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔

"اطمینان رکھو ظہیر خاں! سب کھل کے سامنے آجائے گا۔ اس وقت تو تمہیں دعا کرنی چاہیے کہ کرشنا جی ٹھیک ہوجائیں۔" وہ تنبیہی انداز میں آہستگی سے بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ راہ داری میں میری آواز دُور دُور تک پہنچ رہی ہوگی سب لوگ میری طرف متوجہ تھے۔ شکلا جی کہتا تھا مجھے کرشنا جی کے لیے دعا کرنی چاہیے تھی۔ وہ وقت دعا ہی کا تھا مگر میری دعاؤں میں اثر کہاں تھا۔ میں نے بہت سی دعائیں کرکے دیکھ لی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا تاہم میں نے اپنے دل میں دعا کی۔ "اے خدا؟ کرشنا جی کو بچالے چاہے اُن کے بدلے میری جان لے لے۔ ویسے بھی میں فالتو ہوں۔" شکلا میرے پاس خاموش کھڑا رہا پھر پولیس افسر اسپتال سے چلے گئے۔ کچھ اور آگئے۔ پھر شہر کے معززین آنے لگے۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی خبر نہیں آئی میں رات بھر ڈاکٹروں سے پوچھتا رہا مگر انھوں نے مایوسی سے سر ہلانے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا۔

صبح ہونے والی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ مجھ کو کمرے کے برابر چھپا ہوا کھلا ہوئی راہ داری میں آتی دکھائی دی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ میری طرف لپکی اس کا چہرہ آنسوؤں سے شرابور تھا۔ بکھرے ہوئے بال اور سوجی ہوئی آنکھیں بھی سُرخ تھیں۔ وہ دونوں میرے پاس آکے چپ چاپ کھڑے ہوگئے اور میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں مگر مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ چھپا نے مجھے گلے لگایا اور خود پھر کہنے لگی۔ پوری رات گزر گئی تھی، راہ داری میں لوگ بے چینی سے ٹہلتے رہے تھے۔ نرسیں دوڑتی بھاگتی رہی تھیں۔ راہ داری کے اس پاس سنگین بردار سپاہیوں کا پہرا تھا۔ صبح ہوتے ہی راج کرشنا کا ٹیسٹوں میں لیا ہوا جسم اسٹریچر پر اس کے کمرے سے باہر نکالا گیا اور فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کردیا گیا۔ آدھا گھنٹا گزرا، ایک گھنٹا گزرا۔ پھر کچھ اور وقت گزر گیا لیکن آپریشن ختم نہیں ہوا۔ کوئی دو گھنٹے بعد راج کرشنا کو دوبارہ اس کے کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ ڈاکٹر اب بھی کچھ نہیں بتاتے تھے۔ کسی کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بہت منتیں کیں مگر ڈاکٹروں نے مجھے اُسے دوبارہ دیکھنے کی اجازت نہیں دی، معلوم ہوا کہ اُسے نلکیوں سے آکسیجن دی جارہی ہے۔ چھپا ساڑی کے پلّو سے سر ڈھانپ کے ایک کرنے میں سمٹی ہوئی دُعائیں کر رہی تھی۔ ایس پی شکلا نے مجھے گھر جانے، ناشتہ کرنے اور لباس تبدیل کرکے اسپتال واپس آنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ ایک ایک پل بتاتا وہ بھرپور ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ڈاکٹر کیا کام پھر سائل کررہے ہیں۔ نہ کسی سے کچھ بولتے ہیں نہ کسی کی سنتے ہیں بس اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی باہر نکلتا تو میرا دل ہَولنے لگتا۔

راج کرشنا میری محبوبہ اُسے بھی لگ گئی۔ مجھے اُس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی ساتھ ہی ہوا جس کے خوف سے کلیجہ کٹنے لگتا تھا۔ صبح کوئی گیارہ بجے اسپتال کا بڑا انگریز ڈاکٹر راج کرشنا کے کمرے سے برآمد ہوا تو اس کی آنکھیں نم تھیں میں اُس کی طرف دوڑ پڑا۔ اُس نے میرا ہاتھ دبا کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے ایک طرف دھکیل کے راج کرشنا کے کمرے میں گھس گیا۔ اُس کے منہ پر چادر پڑی ہوئی تھی اور اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کے سرہانے کھڑی ہوئی نرس نے چادر اُٹھا کے مجھے اُس کا چہرہ دکھایا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ میری آنکھیں پتھرا کی پتلی رہ گئیں۔ پھر پستہ سا طاری ہوگیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے تھام کے باہر پہنچایا۔ دروازے کے پاس چھپا موجود تھی وہ میرا بازو اپنے کندھے پر رکھ کے اور میری کمر پکڑ کے مجھے ہجوم سے دُور لے گئی۔

راج کرشنا کی ارتھی اُٹھنے سے پہلے اُس کی ماں کا انتظار ہوتا رہا۔ بنگلے پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میرا جی کرتا تھا کہ میں کسی کمرے میں بند ہوجاؤں کیونکہ جو شخص بھی آتا تھا مجھے رُلا تھا۔ وہ پھر جولین بھی آگئی تھی۔ اُس کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چھپا نے اُسے سنبھالا اور وہ دونوں تعزیت کرنے والوں کی پزیرائی میں مصروف ہوگئیں۔ میں کرشنا جی کی پائنتی پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے دن سویرے سویرے راج کرشنا کی دھان پان بوڑھی ماں گھر میں داخل ہوئی تو اُسے اپنے بیٹے کی لاش کے پاس پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی گنگ کھڑی رہی نہ رُوئی، نہ چلائی پھر اُس کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی آہ نکلی وہ دھڑام سے راج کرشنا کے مُردہ جسم پر گر گئی اور دیر ہوگئی مگر وہ نہیں اُٹھی۔ لوگوں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی تو انھیں پتہ چلا کہ وہ کب کی اپنے بیٹے کے پاس پہنچ چکی ہے۔

میں نہیں مرا۔ اُس کی ماں مجھ سے زیادہ اُس سے محبت کرتی تھی۔ میں بے غیرت تو فہمیدہ کی موت پر بھی زندہ رہا تھا۔ میں نے تو اُس کی موت کی خبر مضم کرلی تھی۔ میں کرن کے بغیر اب تک زندہ تھا۔ دونوں ارتھیاں ایک ساتھ اُٹھیں۔ ممبئی میں کرشنا جی کا کوئی عزیز نہیں تھا مگر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ایس پی شکلا اور دوسرے پولیس افسر لواحقین سے لگے ہوئے رہے۔ جولین میرے سینے سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ رستم جی نوریں کے ساتھ آگئے تھے مسز دیپ بھی موجود تھیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا تھا میں آواب رو بھی نہیں رہا تھا اور وہ سب میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ نوریں بار بار میرا بازو پکڑ لیتی تھی۔ جولین آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی اور منہ بھوتی رہی، سڑک پر ٹریفک رُکنے کی جگہ نہیں تھی۔ شمشان گھاٹ میں بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔ اُن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عام لوگ سڑک پر چلتے چلتے لوگ مرنے والوں کو دیکھ کر رُک جاتے ہیں۔ وہ بھی راج کرشنا نے بدمعاشوں کے مظالم سے بچایا تھا۔ دونوں ارتھیاں پورے اعزاز کے ساتھ سنہری چتاؤں کے سپرد کردی گئیں اور آگ لگادی گئی۔ کرشنا جی اور اُن کی ماں جلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے وہاں راکھ بن گئے۔ سہ پہر کے قریب ہم واپس ہوئے تو گھر پر ویرانی مسلط تھی۔ جولین اور چھپا سرخ آنکھوں کے ساتھ واپس آنے والوں کی منتظر تھیں۔ میں نے کمرے میں بند ہو کے اندر سے کنڈی لگالی۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ جولین اور چھپا دروازہ کھٹ کھٹاتی رہیں مگر میں نے نہیں کھولا اور نہ مجھ میں دروازے تک جانے کی ہمت تھی۔ میری آنکھوں میں کمرہ گردش کررہا تھا۔

راج کرشنا کا قاتل گرفتار نہیں ہوا۔ نہ اُس کے گرفتار ہونے کی کوئی اُمید تھی۔ وہ بمبئی پولیس کے ایک بہت بڑے افسر لکشمی کانت کے گھر سے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرکے واپس آرہا تھا کہ ہائیڈے کے قریب ایک سنسان مقام پر اس کی گاڑی روک لی گئی۔ اُس رات ڈرائیور بھی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ انھوں نے چاقوؤں سے اُس کا جسم چھلنی کردیا اور ہجوم جمع ہونے سے پہلے بھاگ گئے۔ راج کرشنا سڑک پر تڑپتا رہا۔ جب راہ گیر اُدھر سے گزرے تو انھوں نے گشتی پولیس والوں کو ڈھونڈ کے اس حادثے کی خبر دی۔ ایک دن پہلے ہی میں نے اُسے پولیس افسر جیونت کی باتیں بتا کے متنبہ کیا تھا اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے کام جلد نمٹانے کی کوشش کرے گا۔ کام نمٹ گیا۔ جیونت کے بقول شمو گروپ نے اُسے زندہ مدّاس واپس نہیں جانے دیا۔ اخبارات راج کرشنا کی موت کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے اور مطالبہ کررہے تھے کہ قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ بڑے لوگوں کے تعزیتی بیانات چھپ رہے تھے۔ بمبئی پولیس کو کھلی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ کسی بھی مشکوک شخص کو پکڑ سکتی ہے۔ ہائی کلاس کے لوگوں کا ایک گروہ تھانے کے آگے دھرنا دے کے بیٹھ گیا تھا کہ جب تک قاتل نہیں پکڑے جائیں گے، وہ وہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ پولیس نے چھ آدمی گرفتار بھی کیے تھے مگر ظاہر ہے اُن میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہوگا۔

جولین اپنے گھر واپس نہیں گئی۔ اُسے بھی چپ لگ گئی تھی۔ وہ اور کسی چیز میں آنکھیں بھگوتی رہتی تھی۔ تین دن تک گھر میں صرف رات کو ہم تنہا رہے۔ وہ تو روز دن بھر لوگ آتے رہے اور خواہ مخواہ کی باتیں کرکے ہمیں تنگ کرتے رہے۔ نوریں بھی روز گھنٹوں میرے پاس خاموش بیٹھ کے چلی جاتی تھی۔ ایس پی شکلا اور دوسرے افسر زیادہ تر گھر ہی میں رہے جب بھی کوئی آتا تھا کرشنا کی تعریف کرتا تھا مگر مرنے والے آدمی کی تعریف کرنے سے کیا حاصل۔ اس طرح لوگ مرنے والے کے وارثوں کو ڈھنگ ملنے کا کام کرتے ہیں اور انھیں اُن کے بچھڑنے والے آدمی کے نقصان کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ وہ شاید بچھڑنے یا ملنسر کرنے آتے ہیں میرا بس چلتا تو میں گھر کے دروازے بند کرکے کہتا کیسا تماشا ہوا تھا۔ اچھی میں۔ مجھے جسونت بھی نظر آیا اور وہ شخص بھی جو اُس کے ساتھ راج کرشنا سے ملنے گھر آیا تھا۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کے میرے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔

قاتلوں کو معلوم تھا کہ اُس رات راج کرشنا کہاں گیا ہے اور کس وقت کشمی کانت کے گھر سے واپس ہوگا اور کس راستے سے آسکتا ہے انھیں سب باتیں معلوم تھیں مگر کون پوچھ سکتا تھا کہ انھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوگیا۔ شمو گروپ کے نام سے مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میں نے کئی بار گھر سے نکلنے کا خیال کیا مگر میں کس کا گریبان پکڑتا اور کہاں جاتا۔ اتنے بہت سے لوگ میرے موجود اثاثہ بن چکے تھے۔ مہینے ڈیڑھ کی بات اور تھی اُس وقت مجھے کسی کی نہیں جانا تھا۔ تین دن گزرنے کے بعد گھر میں لوگوں کی آمد رفت بڑی حد تک کم ہوگئی۔ جولین روز نہ سہی مگر ہر دوسرے تیسرے دن آجاتی تھی۔ سلاج کرشنا کی خبروں کا زور اب کم ہوگیا تھا۔ اخبارات نے عوض میں گرفتاری میں پولیس کی ناکامی پر مایوسی ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ راج کرشنا کی موت کسی بڑی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، اگر اس سانحے پر توجہ نہ دی گئی تو پھر کسی پولیس افسر کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی اور یہاں غنڈوں اور بدمعاشوں کا راج ہوگا۔ اخبارات سے معلوم ہوتا تھا کہ راج کرشنا کی موت کا چرچا پورے شہر میں ہو رہا ہے اور پولیس اپنی ناکامی پر پریشان ہے۔ لکشمی کانت بھی چھپا تھا کہ پولیس اپنے تمام وسائل بروئے کار لا رہی ہے لیکن پانچ دن گزر گئے تھے اور قاتلوں کی کوئی سُن گن نہیں ملی تھی۔ ڈاکی کلا کے تھانے پر پیٹھا ہوا گروہ بھی پولیس افسروں کے وعدوں پر منتشر ہوگیا تھا۔

پانچویں دن ایس پی شکلا نے تین چار پولیس افسروں کے ہمراہ آکے مجھے حکومت کے احکام سنائے۔ میں مزید تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ بہ مدت ہماری درخواست پر بڑھائی بھی جاسکتی تھی۔ محکمہ پولیس نے راج کرشنا کی خدمات کے عوض پچیس ہزار روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا اور مجھے پیش کش کی تھی کہ میں جب چاہوں مجھے پولیس کی ملازمت میں لیا جاسکتا ہے گورنر کی طرف سے دس ہزار روپے کی ایک خصوصی رقم بھی۔ راج کرشنا کے پس ماندگان کے لیے منظور کی گئی تھی۔ راج کرشنا کے پس ماندگان میں اب رہ گیا تھا بس پی شکلا نے ایک وصیت میرے سپرد کی تھی۔ اس کی رُو سے میں مدہال میں راج کرشنا کی تمام جائداد اور نقدی کا تنہا وارث نامزد کیا گیا تھا۔ میں یہ سن کر دنگ رہ

یا کہ راج کرشنا نے اسپتال میں میرے پہنچنے سے پہلے جسٹریٹ کو بلا کے وصیت کروی تھی؟ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے مگر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ اس نے حادثے کے متعلق کوئی بیان لکھوایا ہوگا۔ میں تو وصیت تک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس آخری وقت میں مجھے اس قدر یاد رکھے گا جب کہ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی تشکلا یہ نوشتہ سنا رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ایک جائداد کا وارث مجھے زیتی نے بنایا تھا، ایک جائداد کا وارث مجھے راج کرشنا نے بنا دیا تھا۔ وہ ثنا یہ فہمیدہ کی موت کا معاوضہ تھا، یہ راج کرشنا کی موت کا۔ میں نے تمام دولت و جائیداد تشکلا کو واپس کر دیں۔ تشکلا جی! مذاق مت کیجیے۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھے کسی جائداد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ روپے پیسے کے لیے بے کار ہیں۔ آپ حکومت کی عطا کی ہوئی رقم بھی لوٹا دیجیے اور کرشنا جی کی جائداد کا کوئی اور مناسب انتظام کر دیجیے۔"

کرشنا جی کی آتما تھانے فیصلے سے ناخوش ہوگی۔" تشکلا گلوگیر آواز میں بولا۔ "اور میں تمہیں مشورہ نہیں دوں گا کہ تم حکومت کی طرف سے دی ہوئی رقمیں واپس کر دو تم اس کا جو چاہے استعمال کرو۔ نامنگر انھیں واپس مت کرو۔ یہ تمہیں نہیں کرشنا جی کی آتما کی شان و اوقات کے عوض دی گئی ہیں۔ یہ بہت کم ہے۔ سنا ہے حکومت کرشنا جی جیسے دیانت دار اور فرض شناس پولیس افسر کی یادگار قائم کرنے کے لیے اور ان کی زندگی پولیس افسروں کے لیے ایک مثال بنانے کے لیے میں بہت کچھ سوچ رہی ہے۔ تم نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ گورنر نے انھیں کتنا زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔"

مگر لوگوں نے انھیں مار دیا، اب خراج تحسین پیش کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان انعامات کا اعلان سن کے کیا وہ واپس آجائیں گے۔ یہ رقم واپس کر دیجیے۔ میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔"

"تمھی اس کے مستحق ہو کیونکہ تمھی کو کرشنا جی نے اپنا وارث تقرر کیا ہے۔ سب کو موت آنی ہے ظہیر خاں! سب مر جائیں گے۔ آدمی کے پاس دوسرے آدمی کو یاد کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جو قاتل ہیں، کیا وہ زندہ رہیں گے؟ وہ بھی مر جائیں گے مگر ان کے مرنے پر کوئی انھیں یاد نہیں کرے گا۔ کرشنا جی مجھ سے تمھاری بہت سی باتیں کرتے تھے، وہ تمھاری بڑی عزت کرتے تھے۔ آخری دن وہ بہت دیر تک تمھارے بارے میں باتیں کرتے رہے۔"

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

"وہ تم سے بہت متاثر تھے۔ کہتے تھے کہ میری یہ زندگی ظہیر خاں کے سبب ہے۔" اس نے دوبارہ مجھے، بچا لیے وہ ایک ہمت والا اور ذہین نوجوان۔"

"لیکن وہ چلے گئے اور میں دیکھتا رہ گیا۔"

"اب تمھارا فرض ہے کہ تم ان کی کہانی ہر فرد تک جمیع طریقے سے استعمال کرو۔ اگر تم نے اس کے ساتھ غیروں کا سلوک کیا تو یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ دیکھو ظہیر! تم نے غور نہیں کیا جسے کوئی اپنا سمجھتا ہے۔ اسی کے لیے ایسا کر سکتا ہے۔ کون کسی کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ کیا تم ان کی خواہش کی بجا آوری سے انکار کر دو گے؟" تشکلا نے نرمی سے کہا۔

"تشکلا جی! میں تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر یہ اچھا نہیں لگتا۔ کرشنا جی کی خواہش کر انھوں نے پڑھ لے مجھ سے جان بھی طلب کرتے تو میں انکار نہ کرتا مگر یہ سب کچھ ....." میں نے دوبارہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"تشکلا جی کرشنا جی کی روح کا اگر آپ کو اتنا ہی لحاظ ہے تو ان کے قاتلوں کو بھی پکڑنے کی کوشش کیجیے یا مجھے صرف ایک بار بتا دیجیے وہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو کرشنا جی کی قسم!"

"پوری کوشش کی جا رہی ہے۔" تشکلا افسردگی سے بولا۔ انھوں نے بہت منظم منصوبہ بنایا تھا۔ بہر حال ہم سرے تک پہنچ ہی جائیں گے اور یقین کرو، کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔"

"رعایت کرنے کا معاملہ تو بعد میں آتا ہے، پہلے آپ وہاں تک پہنچ تو جائیں۔ آپ کبھی ان کا سراغ نہیں لگا سکتے اس لیے کہ آپ ....."

تشکلا نے میری بات کاٹ دی اور اپنے ساتھی پولیس افسروں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے تھانے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہوں ظہیر خاں! بہتر یہ رکھو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو کے رہے گا۔" وہ ترشی سے بولا۔ غالباً اسے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں میرے منہ سے کوئی نازیبا بات نکل جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ اس نے کاغذات دیں پھر ملے اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے سوچا، چلتے چلتے اس نے تشکلا کے کانوں میں ایک بات ڈال دوں۔ اس سے کہہ دوں کہ تم بھی کسی دن کرشنا جی کی طرح کسی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے کیونکہ تم میں بھی وہی نامیاں ہیں جو کرشنا جی میں تھیں۔ کرشنا جی کی موت کے بعد کسی پولیس افسر نے ہمارا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا تشکلا نے کیا۔ اس نے اپنا بیشتر وقت ہمارے ساتھ گھر پر ہی گزارا۔ وہ موجود ہوتا تو وہی آنے جانے والوں سے ڈھنگ کی بات کرتا۔ ایرا تو کسی سے ملنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب بھی کرشنا جی کا نام، احترام سے لیتا تھا جیسے کرشنا جی اس کے قریب بیٹھے ہوں۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مجھے جولین اور چھپا کو مار مار کے کھانا کھلائے۔ جب بھی آتا تھا، صبر ضبط کی تلقین کرتا رہتا تھا۔

راج کرشنا کی وصیت کی خبر اخبارات کو بھی ہو گئی۔ کئی نوٹو گرافر اور نمائندے میرا فوٹو لینے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے گھر آئے۔ میں ان سے نہیں ملا۔ یقیناً شہر میں اس خبر، حیرت کا اظہار کیا جا رہا ہوگا کہ آخر راج کرشنا نے ظہیر خاں نامی ایک اجنبی نوجوان کو اپنی کل جائداد کا وارث کیوں بنایا۔ میں نے کاغذات میز کی دراز میں ڈال دیے تھے۔ پھر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کچھ دن تک ہر روز شہر کے مختلف علاقوں اور تھانوں میں راج کرشنا کی موت پر تعزیتی جلسے ہوتے رہے۔ ان میں مجھے بھی بلایا جاتا تھا۔ میں کسی جلسے میں شریک نہیں ہوا۔ ایک دن نوین نے مجھے فون کر کے اطلاع دی کہ کلب کی جانب سے کرشنا جی کی موت پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ میں بھی ہوں گا۔ میں وہاں بھی نہیں گیا۔ آخر لوگ تھوڑی تھک گئے۔ دس دن بعد لوگوں کی آمد و رفت میں بے حد کمی ہو گئی۔ ایس پی تشکلا اور دو ایک افسروں کے سوا تقریباً سبھی نے آنا بند کر دیا۔

دس ڈرز سے اوپر ہو گئے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی گھر آجائیں گے۔ وہ دوست کمرے میں موجود ہیں اور ابھی کچھ کہہ کر برا بھلا کہتے ہوئے باہر نکلیں گے۔ سڑک پر کسی گاڑی کا ہارن بجتا تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑتا تھا کہ کرشنا جی آئے ہیں اور کھانے کی میز خالی پڑی ہے۔ چھپا نے ابھی تک کھانے کا انتظام نہیں کیا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے، شاید کوئی کرشنا جی کو پوچھے گا کہ وہ گھر میں موجود ہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ان کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ بعض اوقات ایسا لگتا تھا جیسے کرشنا جی کہہ رہے ہیں۔ ظہیر تم مجھے بھول تو نہیں گئے۔ میں انھیں کیسے بھول سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ انھیں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں۔ جولین نے ابھی تک اپنے گھر کا رخ نہیں کیا تھا، دس دنوں تک تو مجھے کوئی احساس ہی نہیں ہوا کہ اسے اپنے گھر بھی جانا چاہیے۔ اس عرصے میں ایک بار بھی نہیں لوٹی۔ میں وہ اپنے باپ کو دیکھنے نہیں گئی تھی۔ خود میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ گھر کی تمام دیکھ بھال جولین اور چھپا ہی کرتی رہی تھیں۔ میں تو زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ جولین کی ماں پورے گھر میں تنہا تھی اور اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لیے خود ہی وہاں آجاتی تھی۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے شاید ۱۲ دن ہوئے تھے کہ میں نے جولین سے کہا کہ وہ اب اپنے اسکول جائے اور اپنے گھر میں جا کے رہے۔ وہ کب تک یہاں رہے گی۔ میں تو ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ ایک بات اور سنی حکومت نے تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی ہے مگر کرشنا جی کے بغیر یہاں ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ در و دیوار پر ان کی پرچھائیاں لرزتی رہتی ہیں۔ ہر گوشے میں ان کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب سے وہ گئے ہیں ان کا کمرہ بند پڑا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے اور ان کی چیزیں چھوتے ہوئے ہول آتا ہے۔ اب کسی نہ کسی دن یہاں سے جانا ہی ہے۔ حکومت قبضہ کرے گی تو میں کچھ اور تو نہیں کر سکتا۔ ہاں توسیع کر دے تو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی چلے جائیں۔ میری بات سن کے جولین کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ چھپا جس نے اب تک بہت ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا، اس کا بند بھی ٹوٹ گیا۔

"مگر تم نے کیا سوچا ہے؟" جولین نے اضطراب سے پوچھا۔

"میں کسی بھی جگہ چلا جاؤں گا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"میرا کیا ہے۔ میں تو پہلے بھی کہیں چلا جاتا تھا۔" کرشنا جی نے پیروں میں بیڑی ڈال رکھی تھی۔" پھر میں نے چھپا سے مخاطب ہو کے کہا۔" اب تمھیں بھی اپنا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لینا چاہیے۔" مجھے بعد میں خیال آیا کہ جولین کے سامنے مجھے چھپا سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن بات منہ سے نکل گئی۔ چھپا کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکائے روتی رہی۔

جولین نے ہم دونوں کو میری بہت دیکھا اور تنہا ہے بولی۔" میرے ذہن میں ایک تدبیر آرہی ہے۔ کیوں نہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ کرشنا جی نے مجھے جو مکان دلایا تھا، اس میں تمام کی گنجائش ہے۔ وہیں پہلے ہی ضرورت سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ ہم سب وہاں رہ سکتے ہیں۔ اگر تنگی محسوس ہوئی تو ہم کوئی دوسرا مکان لے لیں گے۔"

"نہیں جولین۔" ان دنوں ساتھ رہنے کے بعد دفعتاً آپ کہنا بھول گئی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ درمیان تکلف کا حجاب ختم ہو چکا تھا۔ پہلے بھی وہ کنارہ گیا تھا۔" وہاں گھر میں گھر کی ایک فرد کی طرح رہتی تھی۔ میں نے انکار کیا تو اس کی آنکھوں میں اداسی اور حیرانی سمٹ آئی۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے جولین کو اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے اس نے کبھی چھپا سے کریدا ہو اور چھپا نے راج کرشنا کی طرح اسے بھی کچھ بتا دیا ہو۔ نہیں چھپا سے مجھے بعد میں پوچھنا تھا کہ اس نے وہ غلط فہمی کیوں کی۔

"میں تم سے کچھ کہہ تو نہیں سکتی۔" جولین نے مایوسی سے کہا۔ "لیکن اگر تم مجھے اجازت دو تو میں ابھی کچھ دن یہاں ٹھیرنے کی درخواست کروں گی۔ مجھے امید ہے تم میری بات نہ ٹھکرا سکو گے۔"

"لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟" میں نے جھنجلا ہٹ سے کہا۔

"تو پھر تم میرے گھر چلو۔ تمھارا دل بھی بہل جائے گا۔ ہم دونوں ماں بیٹی اکیلے ہیں۔ تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ ہمارے پاس دھن دولت بھی نہیں اور پھر تم بھول گئے۔ یاد کرو۔ کرشنا جی کی یہ خواہش تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ تم بہت پڑھ لکھ جاؤ۔ وہ تمھارے لیے اپنے دل میں بڑی آرزوئیں رکھتے تھے۔ تم میرے ساتھ رہو گے تو میں تمھیں ان کی خواہش کے مطابق خوب پڑھاؤں گی۔ تمھیں ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ گھر بھی تمھارا ہوگا۔"

"مجھ سے اصرار مت کرو جولین۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اب اس شہر میں رہنا نہیں چاہتا۔ میں کسی گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔ تم بھی ایک دن مجھ سے تنگ آجاؤ گی۔ تم..... تم نہیں جانتیں کہ میں کیسے ہو گیا ہوں۔ تم نہیں رہ سکتیں۔" میں وہاں سے اٹھ گیا۔ بہتر یہی تھا کہ میں بے گفتگو ہی نہ کروں۔ مجھے اندازہ تھا جولین اسی طرح مذکر تی رہے گی۔ وہ ایک بہت نفیس لڑکی تھی۔ کرشنا جی بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے بھی

ہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن کرشنا جی کی بات اور تھی' وہ تو اس طرح بات کرتے تھے کہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر ہر مرتبہ جیسے انھیں پتہ چل جاتا تھا اور وہ ایسی بات کرتے تھے کہ زیادتی کے سوا کچھ بن نہیں پڑتا تھا۔

جولین نہیں گئی۔ اس کی اس روز آتی رہی اور میرے سر پر کرشنا جی کا غذات کا جو بوجھ ڈال گئے تھے' وہ بتدریج بڑھتا گیا۔ ایس پی شکلا شور مچا دیتا تھا کہ مجھے مدراس جا کے کرشنا جی کی جائداد کا کوئی مناسب انتظام کرنا چاہیئے اسے اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس گھر میں بھی ان کا خاصا سامان تھا۔ میں یہ سب کہاں رکھتا اور کس کے سپرد کرتا؟ حکومت کی طرف سے دونوں چیک بھی آ گئے تھے۔ مجھے کرشنا جی نے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ مدراس جا کے ان کی جائداد کی دیکھ بھال کروں' مجھے یہ سب کچھ ایک ناٹک نظر آتا تھا اور یوں ہی سب کچھ چھوڑ کے چلا آؤں جیسے کرشنا جی چلے گئے تھے، اس کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا تھا، ان کے خفا ہونے کا اندیشہ رہتا تھا، انھیں معلوم تھا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، وہ سب جان گئے تھے پھر بھی انھوں نے احتیاط نہیں کی وہ چپکے چپکے آیا جان اور گھر والوں کا پتہ چلا لیے تھے۔ اتنی رازداری سے کہ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ نہ جانے انھیں کب میرے رویے میں اتنی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان کے طرزِ عمل میں ایک بال کا بھی فرق نہیں آیا تھا' وہ جانتے تھے کہ میں یہ سمجھے نہیں کر سکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بھی کوئی کام نہیں کر پاتا تھا۔ دن بھر گھر بیٹھا رہتا تھا یا بازاروں میں سرگشت کرتا رہتا تھا، شاید انھوں نے مجھے ایک کھونٹے سے باندھنے کے لیے یہ ذمے داری سونپ دی ہو' انھوں نے بُرا کیا، کاش وہ یہ وصیت میرے سامنے کرتے تو میں ان کے پیر پکڑ کے معذرت کر لیتا مگر انھوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ چمپا نے انھیں اتنا ہی بتایا ہوگا کہ مجھ سے ابا جان اور گھر والے بچھڑ گئے ہیں ممکن ہے اس نے فیجہ والی بات بھی بتا دی ہو اور انھیں میرے حال پر ترس آ گیا ہو۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ گھر والوں کو تو میں نے خود چھوڑا تھا' سات سال جیل میں رہنے کے بعد میں نے پلٹ کے گھر کی خبر نہیں لی تھی۔ میں جیل سے چھوٹ کے سیدھا ان کی تلاش میں نکلا تھا جو نہ جانے کس تہہ خانے میں روپوش ہو گئی تھی۔ کرشنا جی ایک صرف گھر والوں کی گم شدگی سے واقف تھے

میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں نے ان کے متعلق بدگمانی کیوں کی ان کا جذبہ ترس پر عمل کیا۔ ترس کیسا' چمپا کے آنے سے پہلے جب وہ میرے رویے میں کچھ نہیں جانتے تھے تب بھی وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ چمپا تو بہت بعد میں آئی تھی اور آنے کے بعد اس نے فوراً تمام باتیں نہیں بتا دی ہوں گی۔ میں نے تو ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی' وہ بات کرنا چاہتے تھے تو میں اُن سے بچھا بچھا رہتا تھا۔ اب وہ مجھ سے چھپ گئے۔ میرے دماغ میں کوئی معقول بات نہیں آ رہی تھی اگر میں مدراس جا کے ان کی جائداد بیچ کے نقدی وصول کر لیتا ہوں تو میں اس کا کیا کروں گا' میں گھر بناؤں گا؟ سامان اکٹھا کروں گا اور پھر لوگ میرے گھر آیا کریں گے؟ وہاں کھانے پکا کریں گے؟ اگر یہی کرنا تھا تو پھر زری اور جمل کے پاس رہنے میں کیا حرج تھا۔ زری نے بھی اپنی تمام جائداد میرے نام کر دی تھی۔ نیا گھر بناؤں گا۔ ہیں! مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی کہ ابا کو بھلا دوں گا اور اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محفوظ کر لوں گا کیونکہ روپیہ پیسہ اکٹھا کرنا مشکل ہوتا ہے' اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہے تو مجھے کوڑی قیمت سمجھ کے اسے استعمال کرنا چاہیے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو چمپا اور جولین سے بھی کچھ نہیں کیا جبکہ میں نے صاف طور پر ان سے کہہ دیا تھا کہ چمپا اپنا کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈ لے اور جولین اپنے گھر چلی جائے۔ وہ دونوں سائے کی طرح میرے پیچھے لگی رہتی تھیں۔ میں سامنے نہیں ہوتا تھا تو مجھے ان کی نگاہیں تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ کبھی جولین میرے سامنے کھانا لا کر رکھ دیتی' کبھی چمپا اور وہ دونوں عموماً چپ ہی رہتیں' جب سے میں نے جولین سے انکار کیا تھا وہ ہر وقت نڈھال نڈھال سی رہتی تھی۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرف سے بھی بے فکر ہو گئی تھی' میں جانتا تھا کہ وہ میرے انکار سے ناخوش ہے مگر کیا میں اس سے اقرار کر لیتا؟ ان دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے میں نے گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ میں روز صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتا اور رات کو گھوم پھر کے واپس آتا تو وہ دونوں ڈبڈبائی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے مجھے دروازے کے قریب ان میں تلتی ہوئی ملتیں۔ میں کہہ دیتا کہ بھوک نہیں ہے تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کھاتیں پھر میں نے ان کی وجہ سے یہ کہنا ہی بند کر دیا۔ کھانے کی میز پر بھی خاموشی طاری رہتی تھی' بکھری تیزی و طراری بھی کرشنا جی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

پولیس نے بہت سے لوگوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا مگر جو لوگ کرشنا کے مجرم محفوظ رہے۔ اخبارات بھی چپ ہو گئے تھے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے ان کے قاتلوں کو عبرت ناک سزائیں دلوانے کے لیے جلسے اور مظاہرے کیے تھے لیکن میرے ذہن میں ابھی تک پولیس افسر جسونت کی باتیں محفوظ تھیں' شمبھو گروپ! جب بھی کوئی کرشنا جی کا ذکر کرتا' یا میں ان کی تصویر دیکھتا' شمبھو گروپ کا نام میرے دماغ میں چبھنے لگتا۔ میں نے ایک دن اشارۃً ایس پی شکلا کے سامنے یہ نام لیا تھا تو وہ چونک پڑا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ شمبھو تو اس بمبئی کا ایک بہت بڑا آدمی ہے اس کے کئی کارخانے ہیں۔ اور بھی کئی قسم کے کاروبار ہیں اس کی جائداد کا کوئی شمار ہی نہیں' وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں شمبھو سیٹھ کے بارے میں کیا تجسس کیوں رکھتا ہوں۔ میں نے اسے جسونت کی زبانی سنی ہوئی باتیں نہیں بتائیں اور کہا کہ یونہی میں نے اس کا ذکر بہت سنا ہے' ایس پی شکلا میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور اس نے چلتے چلتے شمبھو سیٹھ اس کی امارت اور اثر و رسوخ کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا۔ میں سنتا رہا۔ ایس پی شکلا کے جانے کے بعد میں نے بہت غور کیا مگر کوئی مناسب صورت ذہن میں نہیں آئی' شمبھو گروپ کے لوگ مجھے ضرور واقف ہوں گے کہ میں کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا، ممکن ہے کہ ان سے تعلق ہو سکتا ہے۔ کرشنا جی پر وار کرنے سے پہلے انھوں نے ان کے متعلق ہر بات جان لی ہوگی کہ وہ کہاں بستے ہیں' ان کی مصروفیات کیا ہیں اور ان کے ساتھ کون کون رہتا ہے اور یہ بات بھی ان سے چھپی نہ رہی ہوگی کہ کرشنا جی بھی کبھی کبھی کلب گئے تھے۔ کلب میں ان پر ہونے والا حملہ ناکام ہونے والا بھی میں تھا۔ کاش وہ کرشنا جی کے بجائے مجھے نشانہ بنا دیتے کیونکہ میری اس دنیا میں کوئی ضرورت نہیں تھی اور میری موت کے بعد ممکن تھا کرشنا جی سنبھل سنبھل کے قدم اٹھانے اور میرے رکنے کے مطالبے پر شہر ہی چھوڑ دیتے۔ کرشنا جی کی ابھی دنیا کو بہت ضرورت تھی۔ ان کی پوری زندگی ہی لوگوں کی خدمت کرتے بیتی تھی' زندہ رہتے تو لوگوں کے کام ہی آتے۔ کرشنا جی میرے دشمنوں کی صرف جائداد ہی نہیں چھوڑ گئے تھے' ایک اور بلا بھی ٹال گئے تھے میں سوچتا تھا اگر ان کے قاتلوں کو دار و گیر کے بعد سزا ہو جاتی تو مجھے کہیں چین نہیں ملنا تھا اور کرشنا جی کی روح بھی مجھ سے سوال کرتی رہتی۔ جمل کہتے گا تو طانچے مارے گا لیکن اگر مجھے کوئی بتا دیتا کہ وہ فلاں شخص ہے تو میں کبھی کا اس کے سینے میں چاقو اتار چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ سیٹھ شمبھو کے دھکوں سے آدمی تھے جو اس حلقے میں سوال تھے۔ ستانہ کے بھی کئی آدمی آزاد ہو گئے تھے۔ وہ بھی میری طرف سے اپنے دل میں خار لیے پھر رہے ہوں گے۔ کرشنا جی کی وجہ سے پولیس کے کئی افسر میری صورت اتنا ہو چکے تھے ایسی صورت میں انھی طرح پہلے ادھر اُدھر کا جائزہ لے لینا چاہیے تھا۔ جس طرح انھوں نے موقع محل کا خیال رکھا تھا مجھے بھی کرشنا جی کی طرف سے اسی قسم ضبط کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ ستانہ کے اڈے کی طرح یوں ہی گھستا چلا جاتا تو بعد میں میرے حوالے سے کرشنا جی کی رسوائی ہوتی۔

مجھے اس تاخیر سے بہت گھٹن ہو رہی تھی لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے سے تھے میں نے اعتماد کیا' شاید پولیس ہی کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے اب اتنی دیر گزر جانے کے بعد پولیس سے توقع رکھنا بے کار تھا۔ میں نے بہت سوچا اور سوچتے سوچتے میرا ذہن شمبھو سیٹھ کے نام پہ جا کے ٹھیر گیا۔ اسی شخص کی ایما پر سب کچھ ہوا ہوگا۔ اس کی اجازت کے بغیر اس کے آدمی کرشنا جی جیسے بڑے پولیس افسر کو ختم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے کسی طرح اسے تلاش کرنا چاہیے تھا لیکن شمبھو سیٹھ تک رسائی آسان بات نہیں ہوگی' اس تک پہنچنے میں قدم قدم پہ رکاوٹیں پیش آ سکتی ہیں اور درمیان میں بات غلط بھی ہو سکتی ہے بہتر یہی نظر آتا تھا کہ مناسب وقت کا انتظار کیا جائے جب تک لوگ کرشنا جی کا واقعہ بھول نہ جائیں اور میری صورت لوگوں کی نظروں سے معدوم نہ ہو جائے۔

دیر ہو رہی تھی' کرشنا جی کی موت کو ایک مہینے سے زیادہ گزر چکا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا' تمام کاغذات جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ جولین نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا مگر وہ رہتی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ وہ کچھ دبلی اور زرد ہو گئی تھی۔ ایک دن اس نے بہت دنوں بعد اپنا خوب صورت لباس پہنا اور مجھے اطلاع کر کے اپنے ہمراہ سینما لے گئی۔ اس کے باپ کی حالت پھر غلاب ہو چلی تھی' واپسی کے راستے میں جب ہم ایک ہوٹل کے ساتھ بس میں برابر بیٹھے ہوئے تھے' اس نے خواہش ظاہر کی کسی ریستوراں میں چل کے چائے پینی چاہیے۔ ہم درمیان میں اتر گئے اور ایک بہت اونچے قسم کے ریستوراں کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ریستوراں کا ماحول پُرسکون تھا۔ کرشنا جی بھی ایک بار مجھے ایسے ہی ایک ریستوراں میں لے گئے تھے۔ میں گم سم بیٹھا تھا' جولین نے میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی کی۔ "میں بھی کچھ بولنا چاہیئے"

"ہاں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "مگر تمھی باتیں کرو' میں سنتا رہوں گا۔"

"خیر!" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے بے شک تمھیں کرشنا جی کی موت کا بہت صدمہ ہوگا مگر اس سے کچھ کم مجھے بھی ہوگا' میں نے ان کی موت قبول کر لی ہے کیونکہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسے تو قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ تمھیں بھی ایسا کرنا چاہیئے میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم زندگی سے کب تک اتنے بے گانہ رہو گے۔ اگر تم مجھے اپنا ایک ہم درد سمجھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میں تمھارے متعلق اچھی باتیں سوچ سکتی ہوں تو مجھے کچھ بتاؤ' آخر تم اتنے روٹھے ہوئے کیوں ہو؟"

میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ سوال مجھ سے بہت لوگ کرتے ہیں اور مجھ سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ ایک کرشنا جی جدا نہیں ہوئے جولین! میری آواز بھرا گئی۔ "مت پوچھو۔"

"مجھے کچھ کچھ معلوم ہوا ہے اور اتنا تو میں خود اندازہ کر سکتی ہوں کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے تم جیسے آدمی کو گھن لگا دیا ہے۔ اب تو خیر سے کرشنا جی کی موت کا سبب کہا جا سکتا ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ تم ان کی موجودگی میں کس طرح رہتے تھے۔ تم سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور کرشنا جی نے بھی تاکید کر دی تھی' مجھے یقین ہے کہ مجھے بتانے سے کچھ نہیں ہوگا اور نہ تم بتاتے ہو اور ظاہر ہے میری حیثیت ہی کیا ہے میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتی لیکن میں تمھارا دکھ ضرور بانٹ سکتی ہوں مجھ پر اتنے اعتماد کا اظہار ضرور کرو۔"

"اعتماد کی بات نہیں ہے جولین!" میں نے بیزاری سے کہا۔ "مجھے تم پر پورا اعتماد ہے لیکن میں تمھیں کیا بتاؤں۔ شاید تم سے چمپا نے کچھ کہا ہو۔"

"چمپا دیدی نے صرف اتنی بات بتائی ہے کہ تم سے تمھارے کچھ عزیز

بچڑ گئے ہیں مگر اتنی بات تو تم سے قریب رہنے والا کوئی بھی شخص جان سکتا ہے۔ تم نے خود بھی کئی بار اس قسم کی باتیں کی ہیں کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے تمہارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے تم پڑھنا نہیں چاہتے، دوسرے نوجوانوں کی طرح تمہاری کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے بمبئی جیسے شہر میں پلتے بڑھتے تم گھر میں گھسے رہتے ہو، تم اپنی اس عمر میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ کرشنا جی کے اور تمہارے ناموں کا فرق اتنا واضح ہے کہ کوئی بھی تمہارے بارے میں آسانی سے چند رائیں قائم کر سکتا ہے۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کے جی بہت کڑھتا ہے۔ بہت رونا آتا ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور خاموش ہو گئی۔

"میرے متعلق اتنا مت سوچو جولین! تمہاری اپنی پریشانیاں کچھ کم نہیں ہیں، تمہارے پاپ بیمار ہیں، ماں اکیلی رہتی ہیں، اب تمہیں ان کے پاس چلے جانا چاہیے۔"

"تمہیں اس طرح چھوڑ کے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے اور نہ مجھے کچھ ہوگا۔ میری فکر مت کرو، مجھے آسانی سے موت نہیں آئے گی یہ تو میری زندگی کا معمول ہے میں اسی طرح لوگوں کو ستاتا رہوں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے اتنی زور سے کہا کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ اسے احساس ہوا تو وہ سٹ پٹا سی گئی اور سر جھکا کے ندامت سے بولی۔ "مجھے افسوس ہے لیکن خدا کے لیے تمہیں اپنے متعلق سوچنا چاہیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، مان جاؤ خدا کے لیے میرے ساتھ گھر چلو۔" میں تمہارے کسی معاملے میں حارج نہیں ہوں گی، مجھے تم سے کچھ درکار نہیں ہے، میری صرف اتنی آرزو ہے کہ تمہارے کچھ دکھ کم ہو جائیں، تمہارا تم تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک بری لڑکی نہیں ہوں میرے ساتھ رہ کے تمہیں کچھ برا محسوس نہیں ہوگا۔"

میرا سر جھٹکنے لگا اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ بیرے نے میز پر چائے لا کے رکھ دی تھی، جولین چائے بنانے لگی پھر جب اس نے چائے کی پیالی آگے کر کے مجھے ہولے سے آواز دی تو میں نے سر اٹھایا۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا اور اس کی بڑی بڑی اور گہری آنکھیں بھی پنکی ہوئی تھیں۔ اس کی ان آنکھوں سے میرا جسم لرزنے لگتا تھا۔ وہ کورا کی آنکھوں سے کسی قدر متاثر ضرور تھیں۔ پہلے البتہ ایسی نہیں لگتی تھیں میں نے بوکھلا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ریستوراں میں بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں کی نظریں جولین پر مرکوز تھیں اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی ہے جو حسن و جمال میں ہزاروں میں ایک ہے اور آج اس نے جو لباس پہنا ہے حالانکہ سادہ ہے مگر وہ اس میں اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ میں

انڈیلی اور اس سے کہا "اب چلو" وہ کچھ دیر مذبذب رہی مگر دوسرے لمحے اس نے ایک گری سائس لے کے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا۔ بل ادا کرتے ہی ہم اٹھ گئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلیٹ کے دیکھا، سب ہماری طرف متوجہ تھے۔ ریستوراں سے باہر نکل کے ہم کچھ دور تک پیدل چلتے رہے۔ سڑکوں پر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اس نے ایک دکان کے قریب رک کے اچانک مجھ سے پوچھا "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں" میں نے حیرانی سے کہا۔ "مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی؟"

"کسی بھی چیز کی۔ آدمی کی بیکڑوں ضروریات ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہوتی تو ہیں مگر..... مگر مجھے کوئی چیز یاد نہیں آ رہی ہے۔" میں نے جھجک کے کہا۔ "تمہیں تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟ مجھے معاف کرنا، میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "چلو تمہیں کچھ خیال تو آیا۔"

"بتاؤ تم کیا خریدنا چاہتی ہو؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "پھر کبھی آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے ضد نہیں کی۔ ہم دونوں بس میں سوار ہونے کے بجائے پیدل ہی راستہ طے کرتے لمبے بازاروں میں گھرتے ہوئے میری نظریں ہمیشہ بھٹکی رہتی تھیں۔ میں آنے جانے والوں کے چہرے دیکھتا رہتا تھا، شاید کسی دن تقدیر پھر جائے اور وہ کہیں مل جائے۔ سنا تھا آدمی کی قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ایک جگہ کچھ آگے فٹ پاتھ پر زیادہ بھیڑ تھی ہم آگے بڑھے تو ہمیں چیخ پکار سنائی دی۔ غالباً کوئی جھگڑا وغیرہ ہو گیا تھا۔ ہم نے راستہ بدلنے کا ارادہ کیا مگر دفعتہً سامنے سے آدمیوں کا ایک ریلا ہماری جانب بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے جولین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تیزی سے کھینچ کے اپنے پیچھے کر لیا۔ وہ سہم کے میری کمر سے چپک گئی پھر بھاگتے ہوئے لوگ ہمارے پاس سے گزر گئے تو جولین نے مجھے ٹہوکا مارا۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔ ایک نوجوان کچھ دور جا کے رک گیا تھا اور ہمیں حیرت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے جولین کی گلی میں میرا راستہ بند کرنے کی کوشش کی تھی مجھے اس کا نام یاد نہیں تھا۔ اس کے ساتھی اسے ماسٹر کہہ کے پکارتے تھے۔ میں نے اس کی نیت بھانپنے کا عمل کیا، اس کے ارادے بُرے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا، ادھر جمع بھی چھٹ گیا تھا، پولیس آ گئی تھی چوراہے چلنے سے پہلے ماسٹر نے جھجکتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ میں نے منہ پھیر لیا لیکن ماسٹر تیزی سے میرے پاس آ گیا اور میرے آگے گردن جھکا کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ "کیا مرضی ہے ماسٹر؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر این نہیں بولے ماسٹر تم ہے، این تو ڈکی ہے۔" اس نے میری پنڈلیاں پکڑ لیں اور عاجزی سے بولا۔ "این کو ایکس کیوز کر دو ماسٹر! سالا اس دن این کا مغز پھر گیا تھا۔"

"میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"این کو معلوم ہے لو آر گریٹ مین۔ این نے اس سالا فنٹاسٹک سٹی میں بہت سے فنٹوشوں کو بوم مارتے دیکھا پر این نے تمہارا جیسا ہاتھ نہیں دیکھا۔ اب بھی این کی کمر میں کبھی کبھی پین اٹھتا ہے۔" پھر وہ جولین سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا۔ "این کو مین سے بھی ایکس کیوز کرتا ہے۔ کوئن این پلیز سٹرے۔ این کو معلوم ہوتا کوئن اودر سے چلا گیا ہے، ماں تم این پھر اودر نہیں گیا۔"

"ٹھیک ہے، میں اب تم سے کوئی تکلیف نہیں ہے ہمنے اس دن حساب صاف کر لیا تھا، حساب صاف کرنے کے بعد ہم کچھ یاد نہیں رکھتے۔" میں نے سرد ی انداز سے کہا۔ "آگے سنبھل کے رہنا۔"

اس نے سر ہلا کے اقرار کیا۔ "این پرامس کرتا ہے ماسٹر! اس دن کے بعد سے این نے تم کو بہت کھوج کیا۔ آج اتنے دن بعد تم دکھائی دیا ہے۔ این کا لک ہے کہ کوئن بھی تمہارے ساتھ ہے۔ این بے بارٹیسپیٹ کانگری پلیشن۔ وہ جونی سالا ایک نمبر ڈفر ہے، این پہلے ہی ٹو بکلر کر دیا تھا کہ کوئن اکوئی لوگ ہی لے جا سکتا ہے۔ کوئن از سپرب۔ بہت سا چوکری لوگ اودر رہتا ہے پر کوئن جیسا چوکری بائی چانس پیدا ہوتا ہے۔ کوئن سب ڈفرینٹ تھا اور سب سے ڈفرینٹ آدمی کے پاس گیا۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"آئی ایم سارری ماسٹر!" وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

"ابھی تم کو اپنی زبان ٹھیک کرنی چاہیے۔"

"ویری ٹرو ماسٹر! یہ سالا زبان بہت چلتا ہے، ماسٹر! لوا سے اپنے ہاتھ سے کاٹ دو، نہ سالا یہ ہوگا، نہ چلے گا۔ این کو ہاتھ سے زیادہ زبان اچھا ہے۔"

"ٹھکانے پر بیٹھنا ہے تو پہلے ہاتھ چلانا سیکھو پھر زبان چلتی ہوئی بھی اچھی معلوم ہوتی ہے ورنہ پھری لگاؤ۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر! اس لیے تو رائے سٹی میں تمہارا کھوج لگاتا پھرتا تھا۔ آج این کو پایا ہے تو این تم سے ایک ریکوسٹ کرے گا۔ ماسٹر! انکار مت کرنا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں ماسٹر!" وہ لجاجت سے بولا۔ "پر این کا لائف بن جائے گا۔ این کو اپنی سروس میں لے لو ماسٹر! این بالکل صفیع ہو جائے گا، جو تم بولے گا ویسا کرے گا، این ڈے اینڈ نائٹ تمہارا چمچی کرے گا۔ تم چلانا سکھا دو ماسٹر!" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ "آدمی بنا دو ماسٹر!"

جولین نے میرا بازو نوچ کے چلنے کے لیے کہا لیکن ماسٹر بری طرح مچل رہا تھا۔ تم پھر بچانے میں غلطی کر رہے ہو، ماسٹر! میرا کوئی اڈا نہیں ہے اور نہ میں استادی شاگردی کا کام کرتا ہوں لیکن میں تمہیں رائے دوں گا تم کوئی اور دھندا کرو تو بہتر ہے۔ ان کاموں میں کچھ نہیں رکھا اور یہ تمہارے بس کا روگ بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

"ماسٹر! این کو ماسٹر مت بولو، این کو جنگلی بلڈ آلو کہا، پٹاخا لوفر این کا نام مارٹن ہے۔ ایدر سب لوگ باگ مارٹی بولتا ہے، مارٹی اس نام پہچاننے کا مسٹیک نہیں کرے گا۔ مارٹی نے تمہارے پیچھے بہت دھکا کھایا، این جانتا ہے ایدر تمہارا کوئی اڈا نہیں، ایدر سٹی میں این سارا لوگ کو جانتا ہے پر تم استاد ہے، ایک دم ٹرو استاد۔ این اڈا نہیں استاد مانگتا ہے۔ تم نے اڈا کھول لیا تو ایدر سالا بمبئی میں سب کا اڈا فنش ہو جائے گا، اب کا بزنس ٹھپ ہو جائے گا۔ این بولتا ہے ماسٹر! ایدر بمبئی میں بہت سالا گڑبڑ ہے، این کا۔"

وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "بہت جلتا ہے، پر یہ بولو کیا کر سکتا ہے ایک بار ٹرائی کرنے دو ماسٹر! نہیں چلا تو مارنی یہ دھندا چھوڑ دے گا، سالا پان بیڑی سگریٹ بیچا کرے گا، اس سٹی سے فٹ پاتھ پر جائے گا۔ ماسٹر! مارٹی گاریکوسٹ ایکسیپٹ کرو، مارٹی کے گلے میں اپنا پٹا ڈال دو ماسٹر!"

میں سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔ انکار کی صورت میں یہ اور راستہ کھوٹا کرتا ہے گا۔ جولین بار بار مجھے اشارے کر رہی تھی اور ماسٹر کبھی میری پنڈلیاں پکڑتا تھا، کبھی میرے ہاتھوں کو چاپ کرتا تھا، اسے اتنا بھی خیال نہیں تھا کہ یہ ایک لڑکی ہے اور میرے ساتھ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اتنا مجھے ضرور یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے دل میں کوئی کینہ نہیں ہے۔ میں نے اسے نرمی سے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟" کچھ سوچنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ بتایا اللہ میرا پتہ پوچھنے لگا، میں نے نہیں بتایا۔ اس نے بھی ضد نہیں کی۔ "میں کسی وقت خود تمہارے پاس آؤں گا۔" میں نے ملامت سے کہا۔

"آنے کی بات مت کرو ماسٹر! این کو ابھی ساتھ لے چلو، اپنے ڈور پر باندھ دینا۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "این بہت نڈر ہو گیا ہے، ٹرسٹ کرو ماسٹر! ملٹی ایک دم ڈاگ کے مافک پروو کرے گا۔"

میں نے اسے ترشی سے بھگایا تو وہ کسمسا کے مان گیا۔ اس نے جولین سے ایک بار پھر معافی مانگی اور مجھ سے کہنے لگا کہ وہ میرا انتظار کرتا رہے گا اور میں نے آنے میں دیر کی یا نہ آیا تو وہ میری تلاش میں سڑکوں پر نکل آئے گا اور جب تک میں اسے ساتھ لے نہیں جاؤں گا، وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ چاہے میری ناراضی کی صورت میں اسے جان کا خطرہ مول لینا پڑے۔ مجھے اس کے دیوانے پن پر بہت تعجب ہوا مگر وہ بے حد سنجیدہ تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے رگ پٹھوں میں ابھی تک میری کوئی ضرب لگی ہوئی تھی۔ وہ پریشان

پریشان بھی نظر آرہا تھا۔ آخر جب تک اُس نے مجھ سے وعدہ نہیں لے لیا، میرے سامنے سے نہیں ٹلا پھر ہم آگے بڑھ گئے۔ جولین نے پیچھے مڑ کے یہ اطمینان کیا کہ وہ ہمارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ اُس کے چہرے کی شگفتگی بحال ہوئی، وہ کچھ دیر تک چپ چاپ چلتی رہی پھر اُس نے مدھم ہوتی آواز میں پوچھا: "یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم اُس سے اتنی کیوں ڈر رہی تھیں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں بھر جیا تو نہ نکال لے اُس کا کیا بھروسا" میں اُس دن کا منظر کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ بھرّ بھری لے کے بولی۔

"چاقو نکالنا ایسا آسان نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب اُس کی طرف سے کوئی اندیشہ دل میں مت لانا۔"

"یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ ایک خبر لفنگا ہے۔ اُس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ اُس کا دل کالا ہے۔" پھر وہ خود اپنی بات کی تردید کرنے لگی۔ "مگر..... مگر وہ کیا کہہ رہا تھا؟ یہ میں کیا سُن رہی تھی؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ آج مادھی مجھے بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔"

"ہاں وہ خاصا بدل گیا ہے۔"

"مگر تم نے اُس سے وعدہ کیوں کیا کہ تم دوبارہ اُس کے پاس جاؤ گے؟ ایسے لوگوں سے دُور ہی رہنا ٹھیک ہے۔ تم اُس کے پاس مت جانا۔"

"دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو اُس سے نجات مل گئی۔"

"اُس کا ذکر ہی چھوڑ دو۔ مجھے اُس کے تصور سے متلی ہونے لگتی ہے۔ ہم نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔" وہ اُلجھتی ہوئی بولی۔ "تمھیں کچھ یاد آرہا ہے؟"

"نہیں، مجھے تو کچھ یاد نہیں آرہا۔"

"کچھ بھی نہیں؟" وہ شکایتی آواز میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

اِس کے بعد اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم ایک مختصر فاصلہ طے کر کے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ بس ہچکولے کھاتی ہوئی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ جولین تمام راستے نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ بہت دیر ہو گئی، نہ اُس نے میری طرف دیکھا، نہ بات کی۔ آخر میں اُس نے ہلکی آواز میں پوچھا۔ "کیا تم میری کسی بات سے ناراض ہو گئیں؟"

اُس نے چونک کے پہلو بدلا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ "کیا مجھے تم سے ناراض ہونے کا حق حاصل ہے؟" اُس نے ارزیدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں۔ میری کوئی بات تمھیں بُری لگ سکتی ہے لیکن تم مجھے معاف کر دیا کرو۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے۔ اسی لیے میں لوگوں کے ساتھ رہتے اور اُن سے بات کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"اوہ نہیں۔" اُس نے بے قرار ہو کے کہا۔ "تم ایسی باتیں مت کرو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ کوئی تم سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ شاید تم مجھ سے خفا ہو شاید میرے ساتھ رہنے پر، شاید میرے زیادہ مل جُل جانے پر یا کسی اور بات پر۔ تمھیں اس طرح گم سُم دیکھ کے عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔"

"اور میں یہ سوچتا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں دُکھ ہو رہا ہے تم نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو گی۔ تم میرے ساتھ رہتی ہو، میرا خیال کرتی ہو اور میں کبھی بھی نہیں کر پاتا۔ مجھے یہ احساس اور پریشان کر دیتا ہے۔"

"تم اپنے دل میں ایسا گمان کبھی مت کرنا۔ ضروری نہیں ہے کہ آدمی تنہائے میں ایک دوسرے کا خیال رکھے۔ کچھ چیزوں میں یہ سماجی تبادلہ نہیں ہوتا۔ ہر گھر دکان نہیں ہوتا اور اُس کے مکین سودے باز نہیں ہوتے۔ بتاؤ کیا ماں کا حق ادا ہوتا ہے؟ اُن اپنے بیٹے کی پرورش میں بہت دُکھ جھیلتی ہے مگر کیا ماں کو اس انداز سے سوچنا چاہیے کہ اُس کا بیٹا اُس کی مشقت کا معاوضہ ادا نہیں کر رہا ہے؟ کچھ لوگ اب بھی اس بری دُنیا میں ایسے ہیں جو لین دین سے بلند ہو کے سوچتے ہیں۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہو۔"

"تم بھی کچھ کم اچھے نہیں ہو۔ بعض اوقات تو مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ میں تمھاری طرح کیوں نہیں ہوں۔" وہ مسکرا پڑی اور ہونٹ بھینچ کے بولی۔ "خیر، کوشش کرنے کی کوشش کیا کرو۔ دکھوں کا علاج یہ نہیں ہے کہ آدمی خوشیوں سے کنارہ کر کے اپنے دُکھ اور بڑھا لے۔ ہمت سے کام لینا چاہیے۔ پتہ نہیں۔" وہ ہکلا ہکلا کے بولی۔ "میں تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں۔"

"تم اچھی لگ رہی ہو۔"

ایک اسٹاپ پر کچھ اور مسافر بس میں سوار ہو گئے۔ بس کھچا کھچ بھر گئی۔ ہم نے باتیں بند کر دیں اس لیے کہ ہمارے نزدیک بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور ہم گھرے جا رہے تھے۔ جب بھی بس میں بیٹھا تھا میرا ذہن بھی بس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ بس تیز چلتے پر چڑتی تھی اور میرے خیالوں کا کوئی راستہ طے نہیں تھا۔ بس ٹرک پر چلتی تھی اور میرا ذہن ہوائی جہازوں کی طرح آسمانوں میں اُڑتا تھا۔ میں خواب دیکھتا رہتا تھا کہ اگلے اسٹاپ پر اُتروں گا تو مجھے کوئی راستہ نظر آجائے گا۔ میں اُسے دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہو گا؟ اُس کا کیا حال ہو گا؟ وہ مجھے پہچاننے گی یا نہیں؟ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اُس میں اور مجھ میں بہت فرق آگیا ہو گا۔ شاید مجھے زمین پر کھڑا نہ رہا جائے۔ میں تو بے ہوش ہو جاؤں گا۔ بس میں سفر کرتے ہوئے مجھے بہت سکون ملتا تھا کیونکہ میں اُسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جب کنڈکٹر سفر ختم ہونے کا اعلان کرتا تو میرے خوابوں کا غبارہ بھر جاتا تھا۔

اسٹاپ آنے سے پہلے جولین نے مجھے بلایا کیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے راستہ بناتا ہوا اپنے آخری اُترا۔ چمپا گھر میں اکیلی نہیں تھی، ایلس پی شکلا بھی وہیں تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو سکتے کے عالم میں رہ گئی۔ "آج تو کچھ مزاج ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ نے کیا کیا؟" میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ "کوئی سُراغ ملا بھی تک آپ آنکھ مچولی ہی کھیل رہے ہیں۔"

"دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے خلیر خاں!" وہ شگفتگی سے بولا۔ "اب تک بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ جو لوگ کرشنا جی سے لگاؤ رکھتے تھے اور جنھیں کرشنا جی اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی طرح مشورے دیتے تھے، وہ شاید ہمیشہ شرمندہ رہیں گے۔ فیڈل گورنمنٹ کی طرف سے سختی کے ساتھ احکام آئے ہیں کہ جرم جلد از جلد گرفت کیے جائیں مگر ایک عام فیڈرل گورنمنٹ بھی تھک کے خاموش ہو جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے شکلا جی! ایسا نہیں ہو گا۔" میری آواز کانپنے لگی۔ شکلا میرے پاس آکے میری کرتب تھپتھپانے لگا۔ "تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تم مدراس بھی نہیں گئے۔ وہاں سے کرشنا جی کے معتمم کا خط آیا تھا۔ تمھیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ہائیں۔" وہ حیرت سے بولا۔ "تمھیں کرشنا جی کے معاملوں سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا شکلا جی کہ میں کیا کروں۔"

"تمھیں وہاں جانا چاہیے۔ اگر تم کہو تو تمھارے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کرشنا جی نے ایک بڑی جائداد چھوڑی ہے، بیالیس لاکھ سے زیادہ۔ وہ مدراس کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس کی ملازمت تو انھوں نے شوق اور لوگوں کی خدمت کے لیے اختیار کی تھی، تم چاہو تو چمپا دیدی اور مس جولین کو بھی ساتھ لے لو۔"

"یہاں کون رہے گا؟" چمپا نے جلدی سے کہا۔ "جولین کو لے جاؤ۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے تمھیر کے لیے شکلا جی کا ساتھ کافی ہے۔ میں گئی تو یہاں چمپا دیدی اکیلی رہ جائیں گی۔ کام نمٹا کے لوگ جلدی آجائیے گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میرا جانا مناسب ہوتا مگر اس موقع پر جانا..." جولین چُپ ہو گئی۔

میں نے ٹالنے کا انداز اختیار کیا۔ "شکلا نے دوسرے دن مجھے مدراس چلنے کا حکم سُنایا۔ میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ ظاہر ہے کرشنا جی کی خاطر میں نے جس اُلجھن میں ڈال دیا تھا، اُس سے کسی نہ کسی صورت تو نکلنا تھا۔

دوسرے دن شکلا مقررہ وقت پر آگیا۔ چمپا اور جولین نے میرا سامان تیار کر لیا تھا۔ چمپا نے میرے بازو میں امام ضامن باندھا اور جولین نے اپنے ہاتھ سے سینڈوچ بنا کے دیے، وہ بہت لذیذ سینڈوچ بناتی تھی۔ میں نے کھانے کی تعریف کر دی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہر سفر سے پہلے ایسا ہی ہوتا تھا۔ دل میں بیٹھے کے میں راستے بھر کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا جاگتا رہا۔ ہر اسٹیشن پر اُتر کے میں پلیٹ فارم کا ایک چکر لگا کے واپس آجاتا۔ اسٹیشن پہ اسٹیشن گزرتے رہے اور مدراس آگیا۔ کرشنا جی کا

نعیم اور دوسرے کارندے ہمیں اسٹیشن پر لینے کے لیے آئے تھے۔ جب شکلا نے اُن سے میرا تعارف کرایا تو اُن کی آنکھوں میں بے یقینی ہویدا ہوئی۔ نعیم نے فوراً میرے ہاتھ چومے اور گلے لگ کے میری تھکن کو پرسہ دیا اور باقی کارندوں نے پیر چھوئے۔ وہ ہمیں کرشنا جی کے گھر لے گئے۔ کرشنا جی کا سامان اُن کی تصویریں اور عمارت کے آگے نیچے محبوں دیکھ کے میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نعیم نے جائداد کی تمام تفصیلات ہمیں بتانی شروع کیں۔ شہر میں کرشنا جی کے کئی اور مکانات بھی تھے اور نواح میں چند زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال اُن کی ماں کرتی تھیں۔ نعیم نے کرشنا جی کے متعلق ہمیں بہت سی باتیں بتائیں کہ وہ اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے تھے۔ اُن کی ایک بہن نوجوانی میں مر گئی تھی۔ یہ ساری جائداد اُن کے باپ کی تھی جو کرشنا جی کی شادی کی آرزو میں مر گئے۔ نعیم کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے خاندان والوں سے بالکل مختلف تھے۔ باہر رہتے رہتے اُن کی گھر سے ایک پیسہ نہیں منگاتے تھے۔ گھر آتے تو ایک ایک آدمی سے اُس کا حال پوچھتے، سب کی خیریت دریافت کرتے اور ہر بار اُس کی کوئی نہ کوئی مدد کرتے۔

بوڑھا نعیم کرشنا جی کے واقعات بتاتے ہوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ اُن کی عادات، اُن کے مشاغل اور اُن کی ایک ایک بات بتاتا تھا اور آہیں بھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ کرشنا جی نے ولایت جا کے تعلیم حاصل کی تھی مگر ہمیشہ کُرتا پاجامہ میں گھومتے تھے۔ موٹا جھوٹا لیکن صاف ستھرا پہنتے تھے۔ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتے تھے۔ سادہ اور اچھا کھانا کھاتے تھے۔ تمام ملازم اُن کے مدراس واپس آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت تھی اور ماں کو اُن سے۔ ابھی تک مگر سوگ طاری تھا جو طارسہ کرشنا جی کی ماں کے ساتھ بھیجی گئی تھی وہ تیسرے کے فوراً بعد واپس آگئی تھی۔ اُس نے دونوں ماں بیٹوں کی موت کی تصدیقات نائس تو کنی روڈ تک کے راستے کے گھروں میں پوچھ لیں جلا، ہم دونوں سر جھکائے اُن کی باتیں سنتے رہے پھر شکلا اور نعیم کے ساتھ جائداد کا جائزہ لینے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں اور نواح میں پھرتے رہے۔ دوسرے دن کہیں شام کو ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ میری حیثیت تو ایک تماشائی کی سی تھی۔ شکلا ہر جگہ لوگوں کے نعیم سے سوالات کرتا اور کاغذ پر کچھ لکھتا جاتا، پھر میرا چہرہ دیکھتا اور میری رائے پوچھتا۔ میں اُسے کیا بتاتا۔ دیوتا کرشنا جی نے نہ جانے کیا سمجھ کے یہ سب کچھ میرے نام کیا تھا۔ رات کو نعیم وغیرہ وہیں کمرے میں چھوڑ کے چلے گئے تو شکلا میرے سر ہانے آگیا۔ اُس نے متوحش لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"کس بات کا ارادہ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم نے کل اور آج تمام جائداد دیکھ لی ہے۔ یہ ایک خاصا بڑا کام ہے۔ یقیناً تمھارے ذہن میں کوئی..." وہ فکرمندی سے بولا۔

"میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے شکلا جی! میں تو حیران ہوں کہ کرشنا

مجھ نے یہ کیا۔ میں تو انھیں پریشان کرتا رہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان کاموں کا تجربہ ہے نہ ان سے دلچسپی ہے۔ آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے؟"

"ظہیر خاں! یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ تم سرسری گزر جاؤ۔ اب تمھیں ہر حال اس سے نمٹنا ہے۔ کرشنا جی نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی تمھیں اس کا وارث مقرر کیا ہے، وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی تھے۔"

"لیکن انھوں نے کوئی اچھا فیصلہ نہیں کیا۔" انھوں نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ اب میں کیا کروں گا؟ کیا میں حساب کتاب رکھتا پھروں گا؟" میں نے تلملا کے کہا۔

"حساب کتاب تمھارا اپنا ہوگا ظہیر خاں کسی اور کا نہیں، اس طرح مت سوچو۔ یہ دیکھو کہ ایک شخص نے تمھیں کس قدر عزیز سمجھا، آہ، وہ جب بھی تمھارا تذکرہ کرتے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ کرشنا جی مہلقے سے کام لے رہے ہیں لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے آخری کرب ناک لمحوں میں بھی ایک برمحل اور موزوں فیصلہ کیا ہے۔"

"آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ظہیر خاں! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ ہر حال انھوں نے غلط کیا یا اچھا کیا، مسئلہ یہ نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ اب اُن کی خواہش کی تکمیل کس طرح کی جائے۔"

"میرا خیال ہے یہ سب جائداد وغیرہ میں تقسیم کر دی جائے۔"

"یہ کام تو خود کرشنا جی بھی کر سکتے تھے بے فکر اب تم اس کے مالک ہو مگر جب انھوں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا ہوگا تو تمھاری کوشش حالی اور تمھاری ایک اچھی زندگی اُن کے مدِ نظر ہوگی۔ موت کے روز وہ تم سے بہت خوش تھے، کہہ رہے تھے، میں ظہیر کو مدراس لے جاؤں گا، یہاں ماں جی بھی اکیلی رہتی ہیں اور بہت بوڑھی ہو گئی ہیں، کرشنا جی جب موڈ میں ہوتے تھے تو مجھ سے بہت سی باتیں کرتے تھے، میں تمھارے انکار اور دکھ کی کچھ کچھ وجہ جانتا ہوں۔ فکر مت کرو ظہیر! سب چیزیں درست ہو جائیں گی۔" کرشنا جی نے جو مکر یہ رانہ کیے ہیں ممکن ہے اُن کا جواب آ جائے اور تمھاری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔"

"سرکر؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے ایسا کوئی سرکلر روانہ کیا تھا؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا۔ ابھی تک کسی جگہ سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ آئے گا تو سب سے پہلے مجھے معلوم ہوگا۔" شکلا نے تاسف سے کہا۔

"اور انھوں نے آپ کو میرے بارے میں کیا کیا بتایا تھا؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔ "مجھے ایک ایک بات بتائیے۔"

"اور کچھ نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہ خط وہ کس سلسلے میں لکھ رہے ہیں کرشنا جی کی موت کے بعد جب تم سے قریب ہونے کا موقع ملا تو مجھے یہ قیاس کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اتنی شدید اور ذاتی دلچسپی وہ صرف ایک شخص میں لے سکتے ہیں، گو وہ ہر کیس میں پورے انہماک سے کام کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ پولیس کے ریکارڈ میں کوئی ایسا کیس بھی نہیں تھا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ کا اندازہ درست ہے" دکھ کرشنا جی نے میرے کھوئے ہوئے عزیزوں کے سلسلے میں لکھا تھا اور انھوں نے مجھے بھی آخری لمحوں میں بتایا تھا مگر شکلا جی! میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یہ بات آپ ہی تک محدود رہے تو مجھ پر آپ کا احسان ہوگا۔"

"نہیں ظہیر خاں! یہ راز میرے سینے میں امانت کے طور پر محفوظ رہے گا اور میں کوشش کروں گا کہ تمھے میں کسی اور کو اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ پر لوگ کرشنا جی کے نام اور پیسے پر آئے گی، اُن کے نام اور اُن سے قریب ہونے کے باعث بہت سپر تھے۔ اب بھی کوئی نہ کوئی کو اگراں بنا یا گیا ہے لیکن ظہیر خاں! کیا اس سلسلے میں تم مجھے کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

"پھر سہی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"خیر پھر سہی میری دلی تمنا ہے کہ تمھاری تمام الجھنیں دور ہو جائیں۔"

"ہاں شکلا جی! تمنا تو سبھی کی ہوتی ہے لیکن بر نہیں آتی۔"

"امید رکھو۔" اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا۔ شکلا بھی یہی کہہ رہا تھا۔ کرشنا جی، جگل، زرین، چمپا اور جولین سب ہی کہتے تھے مگر اُمید بر آنے کا وقت کوئی نہیں بتاتا تھا۔ سب جھوٹ بولتے تھے مجھے بچہ سمجھ کے بہلاتے تھے۔ جب کوئی اُمید کی بات کرتا تھا تو مجھے اور گھٹن ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد شکلا پھر جائداد کے موضوع پر بات کرنے لگا۔ "کیا تم مدراس میں رہ سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں شکلا جی! میرے لیے یہ بہت مشکل ہے آپ جائداد کا کوئی اور انتظام کر دیجیے۔ آپ ہی کوئی بہتر تدبیر سوچیے، میرا دماغ کام نہیں کرتا۔"

"ایک صورت میرے ذہن میں آ رہی ہے بشرطیکہ تم اس پر آمادہ ہو جاؤ۔" شکلا نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میں بھی اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ان حالات میں تم مناسب طور پر فرائض انجام نہیں دے سکو گے۔"

"مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"ایسے نہیں، سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ ممکن ہے میں اپنی جگہ ٹھیک نہ ہوں۔ میری رائے ہے کہ تم یہ جائداد بیچ دو اور ساری رقم بینک میں محفوظ کرا دو جب حالات کسی قدر درست ہو جائیں تو اس رقم سے تم کسی وقت بھی نئی جائداد خرید سکتے ہو اور کوئی بھی کام شروع کر سکتے ہو میرے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے سے کم یہ اثاثہ کیا ہوگا۔"

"لاکھوں روپے؟"

"ہاں لاکھوں روپے۔" وہ تشویش سے بولا۔ "کئی لاکھ روپے تم نے آج اور کل پھر کیا دیکھا؟ ان کی فروخت میں میں دیر لگتی ہے مگر اچھا ہے کہ ہم یہ کام نمٹا کے ہی واپس چلیں۔"

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کسی مکان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ شکلا نے ٹوٹل بک نکال کے مجھے تفصیل بتانے لگا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور گھبرا ہٹ کے آثار تشویش میں، باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی سن نہ رہا ہو۔ اس کی آواز میں تیزی اور تعداد بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے زرین یاد آنے لگی۔ اُس کی جائداد کی مالیت بھی اچھی خاصی ہوگی۔ اُدھر فیض آباد میں بھی جیسے نام ایک بڑی حویلی اور دو تین مکانات، باغات اور زمینیں تھیں۔ ادھر کرشنا جی مدارس میں یہ انتظامات کر گئے تھے۔ شکلا کہہ رہا تھا: "تم اس دولت سے ایک بہترین زندگی شروع کر سکتے ہو، تمام چیزیں خرید سکتے ہو۔" میں نے سوچا کہ وہ دولت کس کام کی جس سے ایک شخص کو واپس نہیں لا سکتا، اُسے خرید نہیں سکتا۔ میں نے شکلا سے کہا: "کیا اس کی رائے ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی میں نے حامی بھر لی لیکن شکلا اُس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کرتا رہا۔ کرشنا جی کی آبائی جائداد بیچنے کے فیصلے سے وہ بھی مطمئن نظر آ رہا تھا اور مجھے بھی اس فیصلے سے خوشی نہیں تھی۔ ہم دونوں دیر تک متذبذب رہے۔ پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہے۔ نیم ہمارا یہ فیصلہ سن کے پھٹ پھوٹ کے رونے لگا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی کہ میں کرشنا جی کی ماں کی طرح وہاں بیٹھ کے آمدنی کا حساب کتاب رکھوں ورنہ پھر میں نے زرین کو کیوں روکا تھا۔ وہ تو اب تک مایوس نہیں ہوئی ہوگی۔

آئی فونوں میں شکلا بے مصروف رہا۔ کچہری، وکیل، گاہک، اس مکان کے بقایات، اُس زمین کی دستاویزات۔ ہمیں مدراس آئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ گزر گئے تھے۔ شکلا پیش کشیں قبول کرتا اور مسترد کرتا رہا۔ باہر وقت بدلتے لوگوں کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ اس درمیان ایک دن جولین کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی، خیریت کی کوئی اطلاع بھی نہیں دی، بہت تشویش ہے اور لکھا تھا کہ یہاں ہر وقت تمھارا تذکرہ رہتا ہے تمھاری یاد شدت سے ہے، اپنی صحت کا خیال رکھنا مدراسی کھانے زیادہ مت کھانا۔ پراٹھے روز جلتے رہتا، چمپا دیدی تمھیں بہت دعائیں دے رہی ہیں۔ مدراس سے تمھارے لیے کیا لاؤ گے، وہ سوچ کر بتا سکتے۔ آتے آتے خراب ہو جائے گا، پھر اس نے اپنے باپ کے بارے میں لکھا تھا کہ اُن کی حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ اُس نے یہ مختصر خط انگریزی میں لکھا تھا۔ میں نے اسے کئی بار پڑھا اور جواب دینے کا ارادہ کیا لیکن سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا لکھوں۔ کیا یہ لکھوں کہ کرشنا جی انتظامات اور انتظار سمیٹ رہا ہوں۔ اسی کام سے فرصت نہیں ہے، کسی اور طرف دھیان دوں۔ یہاں ایک دکان پر بیٹھا ہوں، ہر طرف سے گاہک آ رہے ہیں، مول تول ہو رہا ہے، پھر جلد ہی جولین کا دوسرا خط آ گیا۔ اس نے میرے جواب نہ بھیجنے کی شکایت کی تھی اور لکھا تھا۔ مجھے جلد سے جلد آنے کا پروگرام بنانا چاہیے۔ انتظامات نے گھر دیکھ لیا ہے۔ وہ تمھارا پتہ جاننے کے لیے مضطرب ہے، میں نے اسے بتایا کہ تم مدراس میں ہو، اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ صبح و شام کئی بار آتا ہے اور میری خوشامد کرتا رہتا ہے۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر راستے میں اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا، مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ میرا پیچھا کرتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے تنگ بالکل نہیں کیا ہے لیکن تم نہیں ہنستے ہو تو مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے، بتاؤ میں اُس سے کیا کہوں؟

خط کے آخر میں اُس نے پچھلے خط کے مانند باتیں کہی تھیں اور درخواست کی تھی کہ میں اس بار اُس کے خط کا جواب ضرور دوں، ہماری اچھی جوگی۔ میں نے شکلا سے اصرار کیا کہ وہ مجھے عیسیٰ جانے کی اجازت دے دے، یہ معاملات جلد جلدی ختم کرے۔ شکلا کچھ پریشان ہونے لگا کہ وہ سب کام اسی کے ذمہ ہیں۔ میری موجودگی ضروری ہے کیونکہ تمام اثاثات پر محتاط عملی کو کرنے ہیں۔ میں نے کہا: میں مختار نامہ لکھ دیتا ہوں، آپ جو مناسب سمجھیں کرتے رہیے گا۔ شکلا نے انکار کر دیا پھر مجھے انتہائی سے خود مختاری ہوئی۔ شکلا بچارہ اپنے گھر اور دفتر سے چھٹی لے کے محض کرشنا جی کی محبت میں یہ تمام کام کر رہا تھا۔ اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے اُس سے اپنے رویے کی فوراً معافی مانگ لی اور گزارش کی کہ وہ جولین کو تسلی کے دو لفظ لکھ دے۔ شکلا نے اس پر تعجب ظاہر کیا کہ میں وہ دو لفظ خود کیوں نہیں لکھتا۔ میں نے کہا۔ مجھے خط لکھنے کی عادت نہیں ہے۔ میں نے آج تک کسی کو خط نہیں لکھا۔ اس جواب پر شکلا نے میری طرف سے جولین کو جواب بھیج دیا۔ جولین سمجھی ہو گی کہ ابھی میں نے اتنا کہاں پڑھا ہے کہ کسی کو خط لکھ سکوں، مجھے یقین تھا کہ ماسٹر مارٹی جولین کو زیادہ پریشان نہیں کرے گا اور یہاں کام نمٹ ہی جائے گا۔ میں جلد وہاں پہنچ جاؤں گا اور مارٹی کو سمجھا بجھا دوں گا کہ کہیں میں ایک سے ایک اُستاد پڑھا ہے، وہ کوئی اور ڈھونڈ لے۔

ڈیڑھ مہینے کی مدت میں شکلا، کرشنا جی کی تمام جائداد اُس کے بقول مناسب قیمت پر فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمام روپیہ میرے دستخطوں سے بینک میں جمع ہوتا رہا۔ کرشنا جی کی تصویریں، اسٹاک، خطوط کتابیں اور ذاتی سامان وغیرہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہم نے صندوقوں میں بند کر دیا اور باقی سارا سامان بیچ دیا۔ بینک میں کرشنا جی کی ایک بڑی رقم جمع تھی اور گھر کی تجوری میں بھی جس بنگلے میں ہم مقیم تھے، اُس کا بھی سودا ہو گیا۔ ہم آخری کارروائیوں کی تکمیل کے لیے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ اس عرصے میں جب بھی موقع ملا، میں مدراس کی گلی گلی پھرا۔ تمام پرانے مسلمانوں کی ہر پرانے اور ہر نئے ہوٹل کے باہر دیر تک کھڑا ہوا کہ میں مسافروں کو دیکھوں، شاید کوئی ظاہر بھولے بھٹکے کوئی نظر آ جائے۔ بے بے کار کی عجلت تھی میرے کانوں کے بجنے، دل کی آوازیں سننے کی صلاحیت کھو چکے تھے یا میری پتلیاں وہ چہرے دیکھنے کی اہلیت کھو چکی تھیں ہر آدمی نظر آتا تھا، بس وہی لوگ نظر نہیں آتے تھے۔

آخر مدراس سے کوچ کا دن آ پہنچا۔ آخری رات تھی۔ اثاثہ، شکلا رات گئے تک حساب کتاب کرتا رہا۔ میں بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کہ دیر بعد شکلا میری مسہری پر آ گیا۔ گمبھیر آواز میں اُس نے مجھے پکارا۔ "ظہیر خاں!" میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ اُس کی پکار پر اُٹھ بیٹھا۔ "میں نے تمام فائلیں مکمل کر دی ہیں۔ اُن

کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "اب تم انھیں سمجھ لو اور سنبھال لو۔"

"شکلا جی! ایسی بھی کیا جلدی ہے اب ہم چل ہی رہے ہیں۔ یہیں یہاں ان فائلوں کا کیا کروں گا۔" میں نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

"تم انھیں جتنی جلدی اپنی تحویل میں لے لو گے میرا بوجھ ہو جائے گا۔ وہاں شاید فرصت نہ ہو اور موقع نہ ملے۔ یہاں صرف ہم موجود ہیں۔ بہتر ہے کہ تم تمام فائلیں خوب سمجھ لو اور جو بات بھی مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو۔ اس وقت میرے ذہن میں سب کچھ تازہ ہے۔"

"میں کیا پوچھوں گا۔ آپ نے سب کچھ دیکھ لیا ہے تو ٹھیک ہے۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"آپ مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ نام کر رہے ہیں۔"

"بات بہت بڑی رقم کی ہے خلیر خاں! ایسے معاملات یوں بے پروائی سے نہیں برتے جاتے۔ تمام جزئیات سے تمھارا واقف ہونا ضروری ہے۔ تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ کتنی رقم بینک میں جمع کرائی گئی ہے؟" اس نے رازدارانہ انداز سے پوچھا۔

"کتنی ہی بڑی رقم ہو، میں نے اس کی خواہش تو کی نہیں تھی۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اور مجھے کچھ جاننے کی جستجو ہے، یہ فائلیں آپ اپنے ہی پاس رکھیے۔ میں گھر جا کے انھیں آپ سے لے لوں گا۔"

خلیر خاں نے ایک لمبی سانس لی اور تھکاوٹ کے انداز میں مسہری کے سرہانے سے اپنا سر ٹکا لیا۔ "خاصی معقول رقم کی بات ہے تمھارے نام سے بینک میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپے جمع کرائے گئے ہیں، سمجھے؟ ساڑھے آٹھ لاکھ روپے۔"

"جی!" میرے ہونٹ لرزنے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ میں شکلا جی کی تیز سانسیں صاف سن سکتا تھا۔ "مگر میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے منتشر آواز میں کہا۔

"اب سب کچھ تمھاری لیاقت اور ظرف پر منحصر ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کے استعمال میں محتاط ہو گے اور کرشنا جی کی توقعات پر پورے اترو گے۔" شکلا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میرے کانوں میں جلن ہونے لگی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ شکلا مجھے چپ دیکھ کے اپنے بستر پہ چلا گیا۔ یک بارگی میرے جی میں آئی کہ میں تمام فائلیں اس کے سر پہ مار دوں یا اس کے سامنے جلا دوں۔ وہ میرے ظرف کی بات کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس کی نظر میں ایک عمدہ حاضب ثابت ہو سکوں اور کورا کی نظریں خود کو گرا لوں۔ کرشنا جی نے مجھے سونے کی زنجیر میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ انھیں اپنی باریک بیں نگاہ سے یہ نظر نہیں آیا تھا کہ میز تو وہاں رال بند حا ہوئے۔ وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ اگر وہ کسی کو عزیز سمجھتے ہیں تو اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں مگر وہ یہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ ان کی طرح دوسرا بھی کسی کو عزیز رکھ سکتا ہے اور اس کے لیے ان سے بھی زیادہ سوچ سکتا ہے۔

انھوں نے اپنی محبت میں مجھ پر سکے بچھا دیے تھے تاکہ میں دنیا کی بھیڑ سے محفوظ رہوں حالانکہ وہ خود کہتے تھے کہ سکے دکھوں کی تلافی نہیں کرتے۔ وہ خود بھی سکوں سے دور لیٹتے تھے، پھر کرشنا جی نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ بے ہنر آدمی پہ سونے کے چھپر کیوں پھینکے؟ کیا اس لیے کہ میں خود تو کچھ کر نہیں سکتا میرے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہیں، ان کا یہ سوچنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر واقعی فالج گر گیا تھا۔ جب سے کورا جدا ہوئی تھی، میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو کتنے دن کھایا تھا۔ پہلے میل میں کھاتا رہا، پھر ادھر ادھر لوگ مجھے بھیک دیتے رہے۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ پکنے لگا۔

صبح ہوتے ہی شکلا نے تیاری شروع کر دی۔ کرشنا جی کے کارندے بھی رخصت کرنے کے لیے ہوٹل میں جمع ہو گئے تھے۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے شکلا نے مجھے ایک گوشے میں لیجا کے کہا کہ کرشنا جی کے ملازموں کے لیے مجھے کچھ رقم کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں نے کہا "جو آپ مناسب سمجھیں کہہ دیں۔" شکلا کے ذہن میں اس بات کا خیال شاید پہلے سے تھا۔ اس نے عجمی طور پہ ۲۰ ہزار روپے کا رندوں میں چیکوں کے ذریعے تقسیم کیے۔ کارندے ہاتھ پھیلا پھیلا کے دعائیں دینے لگے اور چیکوں سے رشک کرنے لگے۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں نے شکلا جی سے کہا کہ انھیں اور رقم دی جائے مگر انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔

ہماری گاڑی گھر کے دروازے پر رکی۔ جولین اور چمپا بھاگی ہوئی آئیں، دونوں ہمیں دیکھ کے دنگ رہ گئیں اور میرے بازوؤں سے لپٹ گئیں۔ چمپا نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور بڑے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کوئی آیت پڑھ کے میرے سر اور سینے پہ پھونکی۔ کرشنا جی کا سامان اس کے کمرے میں رکھ دیا گیا۔ شکلا نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے چمپا اور جولین کے لیے مدراس سے کپڑے خریدے ہیں۔ بھتو ملازم بھی ڈرائنگ روم میں ناچتا پھر رہا تھا۔ چمپا اور جولین صوفے پہ میرے آزو بازو دبکی ہوئی تھیں اور شکلا سامنے کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ جولین شکایت کرنے لگی کہ ہم نے اپنے پہنچنے کی پیشگی اطلاع کیوں نہیں دی۔ انھوں نے ہنس لینے کے لیے اسٹیشن آنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ گھر آ کے چمپا اور جولین کو دیکھ کے مجھے پھر کچھ ہولا پھر دیر ٹھیرنے کے بعد شکلا نے ہم سے رخصت مانگنے کی اجازت چاہی۔ مجھے شکلا کے ساتھ رہنے کی بہت عادت ہو گئی تھی اس لیے میں جھجھکا مگر اب وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ میں نے اس سے چند منٹ اور ٹھیرنے کی درخواست کی۔ کرشنا جی کے کسی ملازم کو ابھی تک علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔ کل ہوائی اڈے سے ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ سب ادھر ادھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ کوئی میز صاف کرتا تھا، کوئی مجھے سلام کرنے کا منتظر تھا۔ شکلا نے جولین سے معذرت کر کے مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور تمام فائلیں میز پر رکھتے ہوئے ان کی تفصیل سمجھانے لگا۔ یہ بینک کے کاغذات ہیں، یہ جائیدادوں کی رسیدیں ہیں، یہ مکانوں اور زمینوں کے بیع ناموں کی نقلیں ہیں، یہ متفرق پرزے ہیں، وصیت کا فائل یہ ہے۔ میں نے سب کچھ دراز میں نکال دیا اور شکلا سے معافی مانگی کہ سفر کے دوران میں میرے منہ سے بیجا باتیں نکل گئی ہوں گی۔ شکلا نے مجھے خوب زور سے بھینچ لیا اور مسکرا کے اس کا سارا چھپر بھیگ گیا۔ "تمھیں جب بھی میری ضرورت پڑے، مجھے یاد کرنا۔ رقم کے کھوں کر کرشنا جی کی رقم میں سے آپ بھی کچھ لے لیجیے گا اچھا ہوا کہ یہ بات میری زبان سے ادا نہیں ہوئی ورنہ وہ بہت بُری لگتا۔ اس کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جاتی کہ میں اسے گھر سے چل کر رخصت کر رہا ہوں جب کہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اس رقم میں سے جس قدر چاہے، کسی گرنر کے بغیر لے لے۔ میرے لیے اس کے بغیر واپس جانا اور یہ کام جھٹلانا ناممکن تھا۔ شکلا چلا گیا اور جولین چمپا میرا سامان کھولنے لگیں۔ انھوں نے میری عدم موجودگی میں میرے بہت سے کپڑے نکال لیے تھے۔ میرا کمرہ بھی آئینہ بنا ہوا تھا، نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ دونوں مجھ سے باتیں کرنے کے لیے منتظر تھیں۔ میں نے جولین سے اس کے باپ کی خیریت و ریاضت کی۔ اس کی حالت کبھی بہت گر جاتی تھی کبھی سنبھل جاتی تھی۔ جولین اداس ہو گئی۔ چمپا نے فوراً موضوع بدل دیا اور مجھ سے مدراس میں کرشنا جی کے خاندان والوں اور ملازموں کا حال پوچھنے لگی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے ان کی جائداد کا معاملہ کس نہج پہ کیا۔ نہ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس ساڑھے آٹھ لاکھ روپے بینک میں موجود ہے اور اب میں ایک لکھ پتی آدمی ہوں۔ لکھ پتی تو خیر میں پہلے بھی تھا مگر اب میرے پاس نقد رقم موجود تھی اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ یہ رقم کس طرح صرف کر رہا ہوں، وہاں شرمندہ کرنے کے لیے کورا موجود تھی۔ مجھے ہر وقت احساس رہتا کہ یہ دولت اس کی عطا کی ہوئی ہے۔ کرشنا جی نے کہے تھے کہ اب ان کی واپسی کا قطعی امکان نہیں تھا۔ میں نے سرسری طور پر چمپا اور جولین کو کرشنا جی کے گھر کا حال بتایا۔ انھوں نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ مجھے جائداد سے کتنی رقم حاصل ہوئی۔ انھوں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ جولین کو دیکھ کے سب سے پہلے میرے ذہن میں مسٹر مارٹی کا خیال آیا تھا لیکن ابھی تک جولین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ نورین اور رستم جی میری عدم موجودگی میں دو تین بار گھر آئے اور نورین فون کر کے بار بار یہ پوچھتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ہوں اور جیسے ہی میں آؤں اسے مطلع کر دیا جائے۔ وہ نورین اور رستم جی کی تعریف کر رہی تھی۔ انھوں نے کئی بار پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

"اور وہ مسٹر مارٹی؟ تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ "اس نے تمھیں پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں اور حرتین چار دن سے تو وہ بالکل نہیں آ رہا ہے، اڑا شاید کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ تم شہر میں نہیں ہو، حالانکہ میں نے ہر ملاقاتی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تمھارے بارے میں اس سے کچھ اچھے تو لاعلمی ظاہر کریں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ مجھے خط میں اس کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ تم وہاں پریشان ہو جاؤ گے۔ اب جیسے ہی اسے معلوم ہو گا کہ تم لوٹ آئے ہو وہ پھر آ جائے گا۔ وہ عجیب آدمی ہے، کچھ کہا نہیں، بس دروازے پر بیٹھا رہتا ہے مجھے بلواتا ہے اور منتیں کرتا ہے، کبھی کبھی تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے، میں اسے بُرا بھلا کہتی ہوں، کبھی متبع کرا دیتی ہوں کہ گھر میں موجود نہیں ہوں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ عجیب قسم کا آدمی ہے۔ میں تو اسے پہلے سے دیکھ رہی ہوں پہلے تو وہ ایسا نہیں تھا۔ اب اس کا حال بہت شکستہ ہے۔"

"میں اس کے پاس ہو آؤں گا۔"

"تم وہاں مت جانا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا، کچھ دیر تک گھر میں جولین اور چمپا کی باتیں سنتے ہوئے گزر گیا لیکن جیسے ہی رات آئی، مجھے بے چینی ہونے لگی۔ چمپا اور جولین اس گھر میں موجود تھیں اور وہ مجھے اس طرح برت رہی تھیں جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں اور میں بھی یہاں آنے کے بعد دو پہر کے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا جیسے اپنے گھر میں آیا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نیل اور تریں کرے میں آ گئے ہیں اور کہہ رہے ہوں کہ میں نے انھیں کس بیماری میں بھلا دیا۔ انھوں نے کیا بُرائی کی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے جیسے تو یہاں تک کہتا تھا کہ مجھے مستقل طور پر فیض آباد میں زمین کے اس ٹکڑے کو کیوں نہ دے دیا گیا، نہ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس ساڑھے آٹھ لاکھ روپے بینک میں موجود ہے اور اب میں ایک لکھ پتی آدمی ہوں۔ لکھ پتی تو خیر میں پہلے بھی تھا مگر اب میرے پاس نقد رقم موجود تھی اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ یہ رقم کس طرح صرف کر رہا ہوں، وہاں شرمندہ کرنے کے لیے کورا موجود تھی۔ مجھے ہر وقت احساس رہتا کہ یہ دولت اس کی عطا کی ہوئی ہے۔ کرشنا جی نے کہے تھے کہ اب ان کی واپسی کا قطعی امکان نہیں تھا۔ میں نے سرسری طور پر چمپا اور جولین کو کرشنا جی کے گھر کا حال بتایا۔ انھوں نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ مجھے جائداد سے کتنی رقم حاصل ہوئی۔ انھوں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ جولین کو دیکھ کے سب سے پہلے میرے ذہن میں مسٹر مارٹی کا خیال آیا تھا لیکن ابھی تک جولین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ نورین اور رستم جی میری عدم موجودگی میں دو تین بار گھر آئے اور نورین فون کر کے بار بار یہ پوچھتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ہوں اور جیسے ہی میں آؤں اسے مطلع کر دیا جائے۔ وہ نورین اور رستم جی کی تعریف کر رہی تھی۔ انھوں نے کئی بار پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

"اور وہ مسٹر مارٹی؟ تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے

اخبار میں کرشنا جی کی کوئی خبر تلاش کر رہا تھا کہ چمپا نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "پیارے میاں! تین مہینے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب ہمیں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔"

"ہاں!" میں نے نرمی سے کہا۔ "چھوڑنا تو پڑے گا۔ تم نے کیا انتظام کیا ہے؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا، وہ بت بنی بیٹھی تھی۔ "تمہیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہوگا۔ اب کرشنا جی نہیں ہیں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"یہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"لیکن مجھے کسی گھر کی ضرورت نہیں ہے، بات وہی ہے جو پہلے تھی۔ تم اپنا کوئی انتظام کر لو۔ میں اس شہر میں شاید زیادہ دنوں تک نہ رہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" اس نے وحشت سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"پھر وہی ضد۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھرو گی۔ اپنی ضد چھوڑ دو۔" میں نے التجا کی۔ "تجھے معلوم ہے اب تمہارے لیے اگرے یا فیض آباد جانا ممکن نہیں ہے۔ تم نے وہ زندگی ترک کر دی ہے لیکن تم کہیں بھی جا سکتی ہو۔ تمہیں روپوں کی ضرورت ہو تو میں فراہم کر سکتا ہوں۔"

"روپے پیسے کا میں کیا کروں گی، تمہارے سوا میرا اور کون ہے۔"

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ چمپا سے التجا کرنا، اس کے ساتھ مغز ماری فضول ہے، وہ مانے گی نہیں۔ مجھے خود اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔ پھر اس نے پہلے کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیا تھا۔ "میں تمہارے لیے کیا کروں؟ کون سی ایسی دعا ہے جو میں نے نہیں کی خدا نے بھی مجھ گنہ گار کو معاف نہیں کیا ہے مگر وہ میری سنے گا ضرور۔" وہ بین کرنے لگی۔ "آہ! ایک کرشنا جی کا سہارا ہو گیا تھا، وہ بھی چلے گئے۔ وہ رہتے تو زیادہ تم اتنے پاپوں نہ ہوتے۔"

"اور ہاں! تم نے تمام باتیں کرشنا جی کو بتا دیں۔" میں نے تیکھے کہنے مجھے اس کی بات سے خیال آیا کہ یہ وہی تھی جس نے کرشنا جی کو میرے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔ "تمہیں کچھ احساس نہیں ہوا کہ وہ مجھے کتنا عزیز سمجھتے تھے اور میں نے ان سے ہر بات چھپائی تھی؟ میں نے تمہیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی زبان مت کھولنا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا مگر تم اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکیں۔ نہ جانے تم نے ان سے کیا کیا کہا ہوگا۔"

"میں نے کرشنا جی کو فریدہ کی بات نہیں بتائی تھی۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "جانتا میں نے انہیں اس بابت کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر کرشنا جی مجھے تسلی نہ دلاتے اور تقویٰ اور استطاعت نہ دیتے تو میں اپنی زبان ہرگز نہ کھولتی۔ انھوں نے خدا کا واسطہ دیا تھا، تب میری زبان سے اتنا نکلا کہ تمہارے گھر والے تمہیں چھوڑ گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمہارے اور جانا جان کا نام بتاؤں، وہ انھیں اپنے ذرائع سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ بات میری سمجھ میں آ گئی، وہ تمہارے لیے بے حد فکر مند رہتے تھے اس لیے مجھے بتانا پڑا کہ تمہارے ابا جان پہلے بمبئی کے کسی علاقے میں رہتے تھے جب میں دوبارہ بمبئی آئی تھی تو نورجہاں کو بلا کے میں نے تمہارے ابا جان کا پتہ پوچھ لیا تھا، وہ جیل میں بولا کی منت سماجت کر کے پتہ پوچھ آیا تھا۔ میں نہاں گئی کہ شاید آڈیسیوں پڑوسیوں سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔ میں محلوی اکرم سے بھی ملی تھی۔ میں نے کرشنا جی کو بتا دیا۔ وہ وہاں گئے اور انھوں نے مولوی اکرم کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ تمہارے ابا جان کا سامان دھلانے پر تیار ہو گئے۔ ممکن ہے کرشنا جی کو سامان میں کوئی ایسی کاپی یا کوئی چیز نظر آ گئی ہو کہ جب وہ گھر واپس آئے تو مطمئن تھے کہ میں انھیں ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں نہیں پوچھا، پوچھتے تو مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔ انھوں نے مجھے جھوٹ بولنے سے بچا لیا۔ پیارے میاں! اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن یقین کرو میں نے ان سے فریدہ کے سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اور ایک بات بتا دوں، مجھے بہت سے مردوں سے واسطہ پڑا ہے، طرح طرح کے مردوں سے، مگر میں انھیں سمجھ سکتی ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے، کرشنا جی ایسے آدمی نہیں تھے کہ انھیں فریدہ والا حادثہ معلوم ہوتا تو وہ تم سے نفرت کرنے لگتے۔ ان کی طبیعت تو سب سے جدا تھی۔ آہ۔" وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ "وہ چلے گئے۔ خدا نے مجھے کیوں نہیں اٹھا لیا۔"

چمپا نے کچھ اس انداز میں کرشنا جی کا ذکر کیا کہ میرا سینہ بھی ٹیسیں مارنے لگا۔ آنکھوں کا بند ٹوٹ پڑا اور میں چمپا سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دوپہر کو شنکا کا فون آیا۔ میلا دل بولنے لگا۔ شنکا بہت دنوں بعد دفتر گیا تھا۔ ممکن ہے کہ کرشنا جی کے بھیجے ہوئے خطوط کا جواب آ گیا ہو اور ابا جان کا پتہ مل گیا ہو لیکن شنکا میرا حال پوچھتا رہا۔ اس نے تو میرا کسی سے کوئی ذکر نہیں کیا، پتہ نہیں مجھے کیوں تسلی سی ہوئی۔ شاید مجھے شنکا کی زبانی ابا جان کا پتہ جاننا پسند نہیں تھا، میری سانسیں نالوں میں آئیں تو میں نے اس سے کرشنا جی کے معاملے کی تفتیش کے متعلق معلوم کیا۔ شنکا کے جواب کا مجھے پہلے سے علم تھا، تفتیش کرنے والی ٹیم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر کے فائل حکومت کو بھیج دی تھی۔ صبح کے اخبار میں بھی کرشنا جی کی کوئی خبر نہیں تھی جیسے وہ اس شہر میں لوگوں کے درمیان کبھی موجود نہ رہے ہوں۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ اچانک فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن مجھے اس انقطاع کی اس وقت خبر ہوئی جب شنکا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اس کے کہہ رہا تھا کہ کسی طرح مجھے کوئی اتا پتہ بتا دو، کوئی اشارہ دے دو، میں خود انھیں تلاش کر کے حکومت کے حوالے کر دوں گا یا اپنے آپ ان سے نمٹ لوں گا۔

میں نے طے کیا کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وقت خاصا گزر گیا ہے اس لیے اب مجھے باہر نکلنا چاہیے اور خود کوئی صورت نکالنی چاہیے ورنہ اپنے آپ سے ہمیشہ شکست ہی ہوگی۔ دل میں ایک چور بیٹھا ہوا تھا کہ کرشنا جی کے نام پر ندامت سی محسوس ہوگی۔ انھیں معلوم ہوتا چاہیے

کہ کرشنا جی کا پوچھنے والا بھی کوئی موجود ہے۔ میں اس ادھیڑبن میں گم تھا کہ جولین اسکول سے واپس آ گئی اور آتے ہی چہکنے لگی کہ آج اسے پرنسپل نے کلب کی کارکردگی پر شاباشی دی ہے۔ چمپا نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ شام ہونے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پہلے کسی اور مکان کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ حکومت کی طرف سے کسی وقت بھی نوٹس آ سکتا ہے، مرے ہوئے گلی کو کون اتنا یاد رکھتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایسا کوئی حکم آنے سے پہلے اپنا انتظام کر لیا جائے۔ جولین تو اپنے گھر جا سکتی تھی مگر چمپا؟ چمپا کسی صورت بھی نہیں آدمی تھی میرے ذہن میں آیا کہ میں کرشنا جی کی رقم میں سے کچھ نیلم نگر کے ایک مناسب مکان خریدے جولین اور چمپا کو اس میں بسا دوں۔ یہی بھلے اس شہر میں کچھ عرصے اور رہنا پڑے گا۔ پھر شاید نئے مکان اور نئے محلے میں چمپا اپنا ارادہ بدل دے۔ میں یہ رقم کرشنا جی کی رقم میں سے قرض کے طور پر نکالوں گا اور جب کبھی توفیق ہوئی، واپس رکھ دوں گا حالانکہ ہمارے بھی میرے ذہن کا ایک والا سا ہے۔ میں یہ رقم خرچ نہ کروں تب بھی اس کا بوجھ میرے سینے پر رہے گا اور میرے سوا اسے کون ہاتھ لگائے گا۔ چمپا کی آمد نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ فی الحال جولین کے مکان میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ اس کی اور چمپا کی صحبت بھی بہت ہے، جولین کی موجودگی میں چمپا اور چمپا کی موجودگی میں جولین کا دل بہلا رہے گا۔ میں نے جولین سے اسی وقت کہہ دیا کہ وہ سامان منتقل کرانے کے لیے بکھیو سے کہہ دے کچھ مزدوروں کو پیکنگ وغیرہ کر دے کیونکہ ہم زیادہ اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جولین کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگی اور پھر چہچہانے لگی۔ "کیا ہوا، میری طرف پیٹھ کیے اور سر دونوں بازو بچوں کے پکیانے لگے مجھے عجیب سا ایک مطلب کے لیے تو میں سن ہو گیا۔ جولین کی جھلاتی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں سے بہت قریب تھیں۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ متعجب آواز میں بولی۔

میں نے تیزی سے اثبات میں گردن ہلائی اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔ "ہاں" وہ میرے بازو چھوڑ کے فوراً چمپا کی طرف بھاگی اور اس سے لپٹ گئی۔ اس کے چہرے پر اچانک خون ہی خون سمٹ آیا تھا، وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً بکھیو کو بلایا اور کرشنا جی کے کمرے کا سامان بہت حفاظت سے پیک کرنے کا حکم دیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ میرے تیور دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا اور میرا دل باہر نکلنے کو چاہا۔ میں ان دونوں سے کہے بغیر سڑک پر آ گیا اور سوچنے لگا کہ کس طرف جاؤں؟ میرے ذہن میں دیر سے ماسٹر مارٹی کا نام گونج رہا تھا، مجھے اس کا پتہ یاد تھا۔ میں بس میں بیٹھ گیا اور پوچھتا پاچھتا اس کے فلیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری دستک پر ایک ٹنا سا لیسہ قد نوجوان برآمد ہوا۔ اس کا نام فانی مٹھا تھا۔ فانی میری شکل دیکھتے ہی اچھل پڑا اور دروازے سے ہی چلایا۔ "ماسٹر! ماسٹر! کم ہیئر کم ہیئر کم! ایدر کون آیا ہے؟"

اندر سے ایک کرخت سی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"اوے! ادھر اپنا کوئی والا استاد آیا ہے۔" فانی نے زور سے صدا لگائی اور پھر خفیف لہجے میں کہنے لگا۔ "ماسٹر جی برا مت ماننا، ہم نے تمہیں کوئی دوسرا سمجھا تھا۔"

"ان جرنہ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"ابھی ان کا پارٹنر" وہ اپنا مطلب سمجھانے لگا۔ "ماسٹر ایک مہینہ ٹاپ ہو گیا ہے، اوہ داس ان تم نے ہاتھ کیا کیا یا، ماسٹر! ماسٹر! اٹھو ہم آ گیا ہے۔"

تب سے اس کی گردن ہلانے سے ہلانے سے مجھے یہ ایک ننگ سا فلیٹ تھا۔ درمیان میں ایک مختصر سی بیٹھک تھی، ماسٹر مارٹی ٹھگنا سا آدمی تھا۔ کمرے سے باہر آیا، اس کا ہاتھ گردن میں لٹکی ہوئی پٹی میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "او ویری گنگ!" اس نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا۔ "ان کو فی ڈرم دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ "مارٹی! یہ کیا ہو گیا؟"

مارٹی گردن جھٹک گئی۔ میں نے مجھے جھوٹا تو وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "بس کریٹڈ ماسٹر ان کا اسٹارس بیڈ لک ہو گیا ہے۔" وہ اپنے ایک ہاتھ سے میری پنڈلی چھونے لگا۔ "پر تم کاں تھا؟ ان ڈیڈ او مڈ لگتا تھا۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میں شہر میں نہیں تھا۔"

"ان کو ڈاؤٹ تھا کہ تم ایدر سمی میں نہیں ہو۔"

"پھر یہ کیا ہوا؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"ایکسیڈنٹ ہو گیا استاد! اسٹراو تلی آن ہائی اوور اسٹریٹ میں ہم مارتا پھرتا تھا، ہر ٹیک تھا۔ جب سے اپن کنڑی سے آؤٹ آن باؤنڈ ہوا، اپن کا ہاتھ ایک ڈل ہو گیا۔ اپن نے تم کو ساری بات پہلے بھی بتایا تھا۔ اپن ایدر آپریٹ کرتا تھا یا اوور کوٹ کے پاس ہاؤنڈ لگتا تھا۔ اپن نے وی جن لے لیا تھا کہ جب تک..."

"بات کرو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"اوہ ماسٹر! آئی ایم ساری۔" وہ جھینپ کے بولا۔ "اپن ہیر یا ہے ایک دم..." اس نے اپنے آپ کو گالی دی اور دفعتہً میری چھاتی سے اپنا سر رگڑنا شروع کر دیا۔ "ماسٹر! ماسٹر!" وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں بے اختیار کنٹرول ہو گیا۔ اپن کا ہمت اسٹلٹ ہو گیا ہے ماسٹر! ان اٹھو کو کاٹ دو یا ان میں جان ڈال دو۔ ریجوئسٹ ایکسیپٹ کرو ماسٹر! اپن فالو سلیو ہے۔ اوپر سے نیچے تک نوکر۔ کالنی ڈیٹس کرو ماسٹر! یہ قدا بھی اوور کنڑی کا سارا جھوٹ کرا تھا، اڑ کر ہے۔"

"تم کیا بات کر رہے ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "ہاتھ دکھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کیا ضرورت تھی تمہیں کوئی دوسرا سمجھنے کی؟"

"غلطی ہمت فلا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "پر ان کا ہیرٹ نہیں مانتا۔ اپن اوور کنڑی میں آزاد رہتا تھا اور کسی حکم کو اندر گھسنے نہیں دیتا تھا، سالا استاد لوگ بھی کچھ سوچ کے وہ دور رہتا تھا۔ اوپر اڑ ملاتے میں

کسی کا مغز پھرا تھا کہ تمام کل کرتا۔ بستی میں ایک سے ایک خفتوش علاقہ پڑا ہے۔ اپن اُودر کا گنگ تھا ماسٹرا ابھی اپن اُودر کیسے جائے۔ اپن ابسر آگیا۔ اپن نے اُسی منٹ ڈیسائڈ کر لیا تھا کہ یا تو تھارا سلیوری کرے گا یا پھر سرنڈر کھائے گا اور اپن کو بالی چانس اُس دن قتم مل گیا۔ تم مل گیا تو اپن کا ڈیڈ پاڈی میں پھر سے جان آیا....." وہ بولتا رہا اور میں نے اُسے بولنے دیا۔ مارٹی پہلے سے بہت ہی زیادہ عاجزی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے عہدے پر مکمل طور پر بحال ہو چکا تھا اور اُس کی جو حالت بن رہی ہوگی وہ اس جگہ سے ظاہر تھی، اس کا "یہی پچھلے سے بہت ابتر تھا فلیٹ میں بڑی بے ترتیبی تھی۔ سیاہ برتن ایک طرف منتشر پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانے سے فلیٹ میں جھاڑو نہیں ہوئی ہے۔ پلاسٹر اُدھڑا ہوا تھا اور جگہ جگہ جالے تنے ہوئے تھے جس کمرے سے مارٹی گزرتا ہوا نکلا تھا، وہ بھی کسی نجس سے کم نہیں تھا۔

"مگر یہ کیا کر لیا؟" میں نے اُس کے زخمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ضرور پھر زبان چلائی ہوگی۔ یہ کیا حال کر لیا؟"

"بس اُدی ہو گیا" ایڈ سلاتے کا چند لوگ اپن کو جانتا تھا اور ایڈ اپن کا گھونسا پھر نا پسند نہیں کرتا تھا۔ سالا گھونسا مارتا رہتا تھا۔ اپن نے اُن سے کوئی پھیٹر نہیں کیا تھا، پر ایک دن جب بالکل سُونکھ گیا۔ سالا سارا اچھو کرا لوگ پہلے ہی ایک ایک کو کے بھاگ گیا تھا۔ اُودر تم بھی نہیں ملا تو اپن نیچے اترا۔ اپن نیٹیو اپن کا پیٹ نیچے اترا اور اپن نے ایک ٹاپ کیپر سے بھڑنا مانگا۔ ٹاپ کیپر نے اپن کی بات مان لی۔ پر بعد میں علاقے کے آدمی لوگ سے کمپلینٹ کر دی۔ وہ سالا گالیاں بکتا ہوا ایڈ آگیا اور اپن سے سارا پیسہ مانگا۔ اپن سب پیسہ خلاص کر چکا تھا۔ اُنھوں نے اپن کو باہر نکال دیا اور....." باقی اپن کیا بولیں، اپن کا یہ ہینڈ بیج ہل رہا ہے۔ پھر علاقے کا آدمی ایڈ آیا اور تومی مارا کہ اپن کو علاقے کے اُستاذ چھنگا اُستاد کے پاس جا کے معافی مانگنی چاہیے۔ اپن نے ہی جیکٹ کر دیا۔ سالا سب اینگری بینگ مین ہو گیا اور علاقے سے دفع ہونے کا آرڈر دیا۔ اپن نے ریکوئسٹ کی کہ اپن دو دو یک کے اندر اندر چلا جائے گا پھر ایڈ نہیں آئے گا سالا تھوڑا آدمی کا بچہ تھا، مان گیا۔"

"مارٹی کو بہت مارا استاد!" مُنڈا پہلی بار درمیان میں بولا۔ "ابھی تو کچھ ٹھیک ہے سالا دو دن تک تو فینٹ پڑا رہا۔ اپن تو سمجھا مارٹی گلٹی ہو گیا۔ تم کو یہ بہت یاد کرتا تھا۔"

مُنڈے نے مجھے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا تھا میرے جواب نہ دینے پر وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔ یہ اُستاد چھنگا کون ہے؟ کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"یہاں کا دادا ہے سالا اولڈ مین!" مُنڈے نے نفرت سے کہا۔

"کب سے اس طرف ہے؟"

"بہت دنوں سے اپن نے جب سے آنکھ کان کھولا ہے، اُسے ایسا دیکھا سُنا ہے۔ سالا بوڑھا ہو گیا ہے پر ابھی بہت جان ہے۔ ایک اِبجار کے مالک ہے۔"

"یہاں بمبئی میں تم لوگ کتنے اُستادوں کو جانتے ہو؟"

اپن کو زیادہ میل جول رکھنے کا مانگ نہیں مانگتا۔ بستی بہت بڑا ہے اُستاد، کچھ کو پرسنل جانتا ہے، کچھ کا نام سُنا ہے۔ اپن جو بھی تھا، چھوٹا موٹا اپنے کنٹری کا گنگ تھا۔ اپن کو دیس سے مانگ مانگتا تھا۔" مارٹی نے تحقیر سے کہا۔ "تمھارے باقی چھوکرا لوگ کدھر ہیں؟"

"تھی بولو" وہ کب تک مارٹی کا ساتھ دیتا۔ بھروسا مارٹی پر ہی تھا۔ ٹھوکتے ہوئے بولا۔ "سب ایڈ اُودر خوار ہوا ہے۔ مارٹی کیا کر سکتا تھا۔ سیڈیم، گوآن بس فنش۔ ابھی ایڈ اوتی مقامہ گیا ہے۔"

"کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ چل سکو؟" میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"تم اپن کو بیل میں لے چلو۔" وہ بچل کے بولا۔

"میرے ساتھ نیچے آؤ۔"

مارٹی کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ مُنڈا میرے بازو سے چپک گیا۔ دونوں میرے پیچھے لڑکھتے پھڑکتے سیڑھیوں سے اُترے اور باہر آگئے۔ یہ کوئی فیشن ایبل علاقہ نہیں تھا، ہاں ہم آبادی گنجان تھی۔ سڑک بہت چوڑی نہیں تھی۔ اور اُس کے دونوں طرف کئی منزلہ اسکونٹی بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ مارٹی زخمی ہونے کے باوجود سینہ پھلائے میرے دائیں طرف اور مُنڈا بائیں طرف چل رہا تھا۔ کچھ آگے چل کے مُنڈے نے مجھے کچھ کہا۔ میں نے بائیں سمت دیکھا۔ دو آدمی فٹ پاتھ پر ایک کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ میں نے مُنڈے سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اُن کے چہروں کے تاثرات سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اُجلے اور معقول کپڑوں میں تھا۔ ہم اُن دونوں آدمیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ سڑک آگے جا کے مُڑ جاتی تھی۔ ادھر اُدھر تنگ گلیاں تھیں۔ گلیوں میں بڑی بھیڑ تھی۔ ہم دوسری سڑک پر آئے تو مُنڈے نے پھر کہنی ماری میں نے نگاہ اُٹھا کے دیکھا۔ تین آدمی ایک جنرل اسٹور کے پاس کھڑے ہمارے جانب اشارہ کر رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی وہ ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے ہم سے غافل ہوں۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرتے رہے اور کبھی مُنڈا کبھی مارٹی مجھے کہنیاں مارتا، کھنکارتا اور آنکھیں چلاتا رہا۔ میں کہیں ٹھیرے نہیں۔ جب سڑکیں پوری طرح روشنیوں سے جگ مگا گئی تھیں تو ہم علاقے کے بڑے حصے سے گزر چکے تھے اور راستے میں ہمیں مختلف لوگ ملے تھے۔ اکّا دکّا پولیس والے بھی گشت کرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ہر ایک کے زخمی کا خیال تھا۔ اس حالت میں اُسے زیادہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔ میں نے پورا علاقہ گھم لینا مناسب سمجھا۔ شاید وہ تھے ہوں گے۔ بڑی سڑکیں ہم نے تقریباً تمام ملے کر لی تھیں۔ ہم چوک میں واپس آگئے۔ اس وقت نے اچک کے میرے کان میں سرگوشی کی کہ ہمارے آگے پیچھے کئی دو

ہوئے ہیں۔ مُنڈے کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری نظریں [illegible] کچھ دیکھ رہی تھیں۔" وہ اُودر گلی میں پھنگا استاد کا پاڑا ہے۔" مارٹی نے کچھ قدرے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم چوک میں واپس آ کے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی میں بکثرت گلی کوچوں میں تھیں، اُن سے تین چار دکانوں کے بعد پان والے کی دکان تھی اور اُس سے ایک چھوٹا سا ہوٹل ملحق تھا۔ میں دو پیالی چائے مُنڈے کو پیسے دے کے پان لانے کے لیے کہا۔ مارٹی اپنا چہرہ پھیلائے ہوئے تھا۔ "استاد! دیکھ لیے ہو؟" اُس نے میری طرف منہ کر کے کہا میں خاموش رہا۔ سات آٹھ آدمی چاروں طرف سے آ کے ایک میں نے کہا یا ایک مارٹی کو دیا۔ اپن چاہتا ہوا میں کئی ایک کھڑے سوچا رہا۔ وہ لوگ میرے نزدیک نہیں آئے لیکن وہ [illegible] کھڑے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا پھر چوک میں آگیا۔ وہ لوگ بھی آگے [illegible] میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے، جس گلی کی طرف مارٹی نے اشارہ کیا تھا [illegible] استاد کا پاڑا ہے" وہ چوک سے قریب ہی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ اُسی گلی کے دہانے پر پہنچ گئے لیکن اندر جانے کے بجائے نکڑ پر [illegible] میں نے دیکھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے آدمی بھی ادھر اُدھر تنگ گلیوں میں پھیل گئے ہیں۔ پاڑے والی گلی زیادہ روشن نہیں تھی اور گنجان بھی کم تھی۔ [illegible] میں ہاتھ ڈال کے چاقو ٹٹولا، پھر میں نے مارٹی کو دیکھا۔ وہ [illegible] کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔ میں نے مُنڈے کو دیکھا۔ اُس کی [illegible] ہو چکی تھی۔ وہ بالکل ساکت میرے پہلو میں دُبکا کھڑا تھا۔ میں نے [illegible] اُٹھا کے اپنے نزدیک ترین کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ [illegible] میں نے پھر اشارہ کیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف بے تابی [illegible] اور سینے پر ہاتھ رکھ کے اشارے سے تائید چاہی کہ میں اُسی کو [illegible] یا کسی اور کو۔ وہ آتے ہوئے جھجکا یا سگر اُس کے ساتھیوں نے [illegible] کے حرکت کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے پاس آیا تو [illegible] بائیں اور بائیں سے دو آدمی پھرتی کے ساتھ آ کے اُس کے [illegible] گئے تھے۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "مجھے چھنگا استاد کے [illegible] چلو۔"

چھنگا استاد!" اُنھوں نے مذبذب ایک دوسرے کو دیکھا۔ "تم کون ہے؟" میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔

"تم کون ہے؟" ایک نے سختی سے پوچھا۔

"میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ میں ایک پردیسی ہوں، چھنگا استاد کی بہت شہرت سُنی ہے، وہ مجھے نہیں جانتا، میں اُس سے ملنے آیا ہوں۔"

میری بات سے مطمئن نہیں ہوئے اور اُن میں سے ایک نے بگڑ کے جھڑکتے ہوئے تیور سے کہا۔ "سگر تم کیوں اُس سے ملنا چاہتا ہے؟"

"میں اُسے دیکھنا اور اُس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ میرے بیکائے مارٹی سے مخاطب ہوا۔ "یہ کیا لفڑا ہے تم سالا باز نہیں آیا۔" پھر مجھ سے بولا۔ "اے بالو! جاؤ! ابھی بات اپن نے خلاص کر دی ہے۔ مارٹی نے کر دیا ہے کہ وہ لونڈا اپن نہ کرے۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں تم سے کہہ رہا ہوں، مجھے چھنگا اُستاد کے پاس لے چلو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"چھنگا اُستاد اس ٹیم پہ کسی سے نہیں ملتا، سو یہ سے ایڈ، آؤ اپن تم کو چھنگا کے پاس لے چلے گا۔ پر بات مارٹی کی ہے تو تمھارا اُودر جا کے بکا ہوگا۔ بات نہ بڑھاؤ۔" مارٹی سے کہہ دو کہ وہ آگے یہ حرامی پن نہ کرے۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "مجھے چھنگا اُستاد سے مارٹی کی بات بھی کرنی ہے اور اپنی بھی۔ سو یہ اگر نہ دیکھا ہے، تم ضمانت دے سکتے ہو کہ سو یہ تک چھنگا استاد زندہ رہے گا یا میں زندہ رہوں گا۔ تم اُسے جا کے بتاؤ، ایک پردیسی اُس سے ملنا چاہتا ہے۔"

مارٹی کی بات کرنا ہے بالو تو اپن سے کر دو چھنگا اُستاد سے ملنا ہے تو سو یہ سے آؤ۔ اُستاد سالا کوئی زنانہ نہیں ہے کہ پردے میں چھپا بیٹھا ہے، تم اُس سے ضرور ملا اور وہ بھی تم سے ضرور ملے گا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اُن کی یہ تھوڑی بہت گریز میری سنجیدگی کے سبب ہے۔ وہ مجھے دیکھ کے سادہ لباس والے کے لک میں بتلا ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ میں ہوا۔ اس اثنا میں اُن کے دو ساتھی تاش میتیوں کی طرح ہمارے پاس آ گئے تھے۔ میں اُستاد سے صرف چند باتیں کرنا چاہتا ہوں سو یہ کی بات مت کرو۔ اُستاد سے جا کے کہو کہ ایک پردیسی آیا ہے، وہ منع کرے گا تو میں واپس چلا جاؤں گا لیکن اُس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میرے ساتھ ایک زخمی آدمی ہے، ایک آدھا آدمی ہے اور ایک میں ہوں اور میں اُس سے تنہائی میں بات کرنا نہیں چاہتا۔"

میری بات اُن کے اُن سب نے تکلا کے ایک دوسرے پر دوبارہ نظر کی۔ میں نے اُن کے اشاروں کنایوں کی طرف سے عمداً منہ موڑ لیا۔ کیوں مارٹی! "جو آدمی سب سے آگے تھا۔ اُس نے مارٹی سے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

"مارٹی سے کچھ مت پوچھو کوئی چکر نہیں ہے۔ دو اور دو چار کی بات ہے۔ تم دیر لگا رہے ہو اور میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔

"دیکھو بالو! ابھی چھنگا اُستاد نے مارٹی کو بھیجا ہے اُستاد اس علاقے کا راجا ہے، وہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اُس کے علاقے کے باسیوں کو تنگ کرے۔ مارٹی نے جو کچھ کیا، اُس کی سزا اُسے مل گئی۔"

"میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔ تم خیال نہیں کرتے ہو کہ میں چھنگا استاد سے ملنے کی اجازت چاہ رہا ہوں۔ تم خود باتیں نہ بناؤ، اپنا آدمی اس کے پاس بھیجو۔ اگر وہ اجازت نہیں دے گا تو میں زبردستی اس کے پاس نہیں چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ چھنگا استاد منع نہیں کرے گا۔" میں نے جان بوجھ کے اپنا مطالبہ دُہرایا۔

"تم کوئی لاٹ صاحب ہو کہ چھنگا اسی وقت تم سے ملے۔"

"اس کا فیصلہ بھی چھنگا ہی کرے گا۔"

"فیصلہ اس کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔" پیچھے کھڑے ہوئے کسی آدمی نے درشتی سے کہا۔ "جاؤ، جاؤ بابو! سویرے آنا۔ اپن کا بھیجا مت پلپلی کر اپن۔۔۔۔"

ابھی اس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک آدمی گلی سے لپکتا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ "استاد بُلا رہا ہے۔"

"بلا رہا ہے!" کتنی حیرت بھری آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

میں نے مارٹی اور ٹھے کے بال بچوں کے انھیں آگے کی طرف دھکیلا۔ چھنگا کے آدمی ہمارے آگے پیچھے چلنے لگے۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ چھنگا کا پاڑا کوئی سو قدم پر تھا۔ پاڑے کے پاس پختہ اور نیم پختہ عمارتیں تھیں۔ جس عمارت میں ہم داخل ہوئے وہ اوسط درجے کی دو منزلہ پختہ عمارت تھی۔ باہر کی روشنیاں مدھم تھیں لیکن اندر خاصی روشنی تھی۔ دروازہ مضبوط تھا۔ ایک ڈیوڑھی جیسی جگہ سے گزر کے ہم ایک کمرے میں پہنچے تھے۔ یہ ایک درمیان سا بڑا کمرہ تھا۔ صرف دو چار پائیاں دیوار سے لگی ہوئی تھیں اور کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ عمارت کا کوئی دوسرا راستہ بھی ضرور ہوگا، ہماری رفتار تیز نہیں تھی، ٹھے کا چہرہ فق پڑا تھا۔ مارٹی بالکل خاموش تھا۔ ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک پھٹا پرانا ہال تھا۔ بڑے بڑے ٹمٹمے جل رہے تھے۔ آمنے سامنے دری بچھی ہوئی تھی اور سامنے فرش سے کچھ اونچی پختہ جگہ پر چوکی جیسا ایک بڑا چبوترا تھا۔ چبوترے پر بیک وقت کئی آدمی بیٹھ سکتے تھے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دری پر تھے۔ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ دیوار پر بہت کے قریب چند روشن دان تھے اور اطراف میں کئی دروازے تھے، وہ کھلے ہوئے نہیں تھے۔ چبوترے پر فربہ جسم کا ایک سانولا سا شخص مختلف عمروں کے آدمیوں کے درمیان سب سے نمایاں تھا۔ اس کی داڑھی صاف تھی اور باریک نوک دار مونچھیں اوپر کی طرف چلی گئی تھیں، بال کڑھے ہوئے، پیشانی چوڑی، ناک بیٹھی ہوئی اور چہرے پر چاقو کے کئی نشان اور ناک پر ایک کالا مسا تھا۔ عمر پینتالیس سے کچھ اوپر ہوگی لیکن جسم اور چہرے سے وہ زیادہ عمر کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد درمیانہ لگ رہا تھا، آنکھوں میں تیزی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر اس کے سارے سب چونکے، وہ ساکت بیٹھا رہا۔ میں اور مارٹی اور ٹھے کمرے تک جا کے رُک گئے۔ ہمارے اردگرد اس کے آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ چھنگا نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور انگلی کی خفیف سی جنبش سے انھیں ہمارے پاس سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں اور ہاتھ پر بھی دو ایک گہرے نشانات تھے۔ میں نے اس کے بولنے کا انتظار کیا مگر وہ اپنی زبان بند کیے ہوئے مجھے گھورتا رہا۔

"چھنگا استاد!" میں نے معتدل لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اس نے منہ کھولے بغیر اقرار میں گردن ہلائی۔ میں چاہتا تھا کہ زبان وہ کھولے۔ جبل نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ زبان بھی سن لی جائے تو بہتر ہے کیونکہ کبھی کبھی زبان آدمی کا سم ہوتی ہے۔ میں اس شہر کا آدمی نہیں ہوں، چھنگا استاد! میں نے اپنی آواز اُونچی کر کے کہا۔ "سنا تھا، بمبئی میں ایک چھنگا استاد ہے ایک علاقے پر بہت دنوں سے راج کرتا ہے پر اُنا آدمی ہے، بات سمجھتا ہے، یہ تھا اس نے اپنے بل پر سنبھال کیا ہے، چاقو چلانا اسے خوب آتا ہے اور وہ اپنے علاقے تک محدود رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔"

اس کی باچھیں لشکریں، پھر پھیل گئیں اور تیلیاں مختصر ہو گئیں۔

"کیا بات ہے؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔ اس کی آواز بھدی تھی کسی قدر غیر متوازن تحرّاس میں ایک گرج ضرور تھی۔

"میں تمھارے پاس تمھاری شہرت سن کے آیا ہوں اور تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میری آواز میرے قابو میں تھی۔

"بولو، بولو۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "کیا کام ہے؟"

"چھنگا استاد! ابھی تھانے ایک آدمی نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا، میں نے کہا تھا کہ میں اس سوال کا جواب چھنگا استاد کے سامنے دوں گا۔ میں اسے ضرور جواب دوں گا لیکن استاد! میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم ان لوگوں کے درمیان اس اونچی جگہ کیوں بیٹھے ہو؟"

"کام کیا ہے؟" وہ گرجا۔ "بولا نا مارو۔"

"مخول نہیں چھنگا استاد! میری بات کا جواب دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "چلو تمھاری طرف سے میں جواب دے دیتا ہوں۔ تم ان سب کے بیچ اپنی قوت سے اور اپنے بل پر بیٹھے ہو، تم نے کئی بار ان پر ثابت کیا ہے کہ تم ان سب سے برتر ہو جسم کے طور پر بھی دماغ کے طور پر بھی۔ کیا یہی بات نہیں ہے؟"

اس کی گردن آگے نکل آئی تھی۔ "کام کی بات کرو۔" اس نے گرج کے کہا۔ "صاف صاف بولو، بوم مت مارو۔"

"میں کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کی مستقل فاتحانہ برقرار رکھی اور اس پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "آج میں بہت کام کی بات کرنے آیا ہوں۔"

"آگے بولو۔"

تمھاری پشت پر تمھارے سامنے اور تمھارے آزو بازو جو آدمی بیٹھے ہیں یہ سب جانتے ہیں کہ تم ان کا جوڑ نہیں ہو۔ اگر تمھارے کسی آدمی کو کبھی یہ احساس ہو جائے کہ استاد کی انگلیوں میں دم نہیں رہا، اس کا ہاتھ کپکپانے لگا ہے، اس کے جسم میں پہلے جیسی پھرتی اور اس کے دماغ میں پہلے جیسی

تیزی نہیں رہی تو یہ تمھیں چبوترے سے نیچے اُتار دیں گے اور جب تم خود یہ محسوس کرنے لگو گے تو تمھارے لیے عزت اسی میں ہوگی کہ تم ان کے درمیان سے اُٹھ جاؤ۔"

چھنگا کے تمام آدمی بے حسی سے کبھی مجھے کبھی اسے دیکھنے لگے۔ چھنگا کی آنکھیں چڑھی ہو گئی تھیں۔ "ٹے نے میری پتلون پھاڑ دی تھی۔ مارٹی کھسک کے میرے پاس آ گیا تھا۔ قریب ہو گیا۔ چند لمحوں تک سکوت طاری رہا، پھر چھنگا کی گرجتی ہوئی آواز گونجی۔ "تمھارا کوئی چُول ضرور ہلا ہوا ہے۔ ابھی پہلے اپن تم کو دھکے دے کے باہر نکالنے کو بولے تھے، تم ایدم ایک دم کلٹی ہو جاؤ۔ اے! یو تم کس کو پکڑ لایا۔" اپنے ساتھیوں پر ناراض ہونے لگا۔

تمام آدمیوں میں بھن بھناہٹ ہوئی لیکن میری اونچی آواز سب پر غالب آ گئی۔ "چھنگا استاد! مارٹی میرا آدمی ہے، تمھارے آدمیوں نے میرے آدمی کو اکیلا سمجھ کے مارا۔"

مارٹی نے جاسنتی کی تھی۔ وہ طیش میں بولا۔

"اور تمھارے آدمیوں نے اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ مارٹی انھی جیسا ایک آدمی ہے۔ اسے بھی بھوک لگ سکتی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"مارٹی نے بے اصولی کیا۔"

"میں اسی بے اصولی کی بات تم سے کرنے آیا ہوں۔ سب سے بڑے بے اصولی تم ہو کہ تم اب علاقہ سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے پھر بھی یہاں دھونی رمائے بیٹھے ہو۔" چھنگا کی لعنت چبوترے سے اُٹھ گیا۔ اس کے تمام آدمی بھی کھڑے ہو گئے۔ چھنگا اٹھا تھا اپنے آدمیوں کی طرح مارٹی کو بھی ایک اُلّو سمجھا اور اب وہ اس علاقے میں آ گیا ہے۔ اصولی اور بے اصولی کا پتہ نہیں ابھی پل جائے گا۔ تم چبوترے سے نیچے اُترو۔ میں تم پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ تمھارے دن چلے گئے۔ اگر تم عزت کے ساتھ اُترنا نہیں چاہتے تو تمھاری مرضی۔"

میں نے چاقو اچھالتے ہوئے کہا۔ "میں آ گیا ہوں اور مجھے تم سے یہ علاقہ حاصل کرنا آتا ہے۔"

ایک ساتھ کئی چاقو ہوا میں لہرا گئے۔ کچھ لوگ میری طرف جھپٹے میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "چھنگا! منظور ہے؟" میں نے چاقو کی دھار پہ انگلی پھیری۔

ایک سیاہ فام کے چوٹے چکلے آدمی نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہی تھا۔ دوسروں نے فوراً اس کی تقلید کی۔ میں اپنے قدم مضبوطی سے زمین پر جما چکا تھا۔ میں نے اپنا گریبان اور بازو آزاد کرانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ میری توقع کے مطابق اسی لمحے چھنگا کی آواز گرجی۔ "ہٹ جاؤ۔" اس کے آدمیوں کو اس کا حکم سننے میں تامل ہوا۔ چھنگا نے دوبارہ بازو کے کہا۔ "ہٹ جاؤ۔"

تمام آدمی کسمساتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئے لیکن وہ میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ چھنگا نے جھک کر کے پھر انھیں دھتکارا۔ انھوں نے گھیرا توڑ دیا اور کمرے کی دیواروں تک ہٹ گئے۔ یہ حکم دینے کے بعد چھنگا میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔

اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "چھوکرا! ابھی جاتس ہے تم ایسے چلے جاؤ۔" اس نے اپنی آواز پر ضبط کیا۔ "جو کچھ سنبھالو، یہ لال سندر مکھڑا سفید ہو جائے گا اور یہ سفید کپڑا لال ہو جائے گا۔"

ابھی جاؤ، چھوکری لوگ کو بلا کے دکھانا تم پھپا کو بھی کرا! تمھارا ٹیم اسک آسکی (عشق و عاشقی) کا ہے، ابھی تم ایدم کہاں سے آیا۔ چھنگا نہیں چاہتا کہ وہ تم پر ہاتھ اُٹھائے۔"

"چھنگا!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ابھی تمھاری کوئی آخری خواہش ہو تو بولو۔ چھوکرا اپنے بڑے کو ضرور عزت دے گا۔"

چھنگا گہری سانس لینے لگا۔ "تم نہیں مانیں گا۔" اس نے ایک سمت منہ اُٹھایا۔ دوسرے کرسی پر ایک چاقو اُچھلتا ہوا چھنگا کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے اسے بڑی چابکی سے پکڑا تھا۔ چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد چھنگا نے اس کی دھار کا جائزہ لیا اور تمسخرانہ انداز میں بولا۔ "چھوکرا! اپنے اوپر ترس کھاؤ۔"

"تم بہت مکم چلا سچے چھنگا! اب تم بوڑھے ہو چکے ہو، مجھے تمھاری عمر کا خیال آتا ہے۔ تمھیں ایک بھوکا اور تجربہ کار آدمی کی طرح سے حق ہیں دست بردار ہو جانا چاہیے۔ یہ جتنے آدمی کھڑے ہیں، ان میں انھیں جتنی اچھی طرح استعمال کر سکتا ہوں، تمھارا زیادہ میں ان کا خیال کر سکتا ہوں، تم نہیں کر سکتے۔ اچھا ہے کہ یہ سب لوگ یہاں موجود ہیں، میرا مل بھی تم پر ہاتھ اُٹھانے کو نہیں چاہتا لیکن تم خود اپنی عزت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں، تم سے التجا کرتا ہوں، سوچ لو۔"

"ہوا او۔۔۔۔" چھنگا نے غضب میں پھنکارا۔ مارٹی اس کا ترنجی سے گردکشن کرنے لگا تھا اور جسم میں جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اور پیر جھٹکے اور ہوا میں اچھلا۔ اس کا سر میری ٹھوڑی سے ٹکرایا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کے پیر میرے سینے پر پڑے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سر کے اوپر سے گھما کر پیچھے پھینک

کوئی دلچسپی نہیں کیا تھا۔ درمیان میں کئی موقعے ایسے آئے کہ میں اُس کی کلائی پہ ہاتھ ڈال سکتا تھا مگر نہ میں نے اپنے چاقو سے ناک لگائی، نہ اُس کے حملے کا جواب حملے سے دیا۔ میں اِدھر اُدھر اُس کے وار دیں، حسنی اور جھپٹوں سے بچتا ہی بچاتا کافی گئی موقعوں پر یہ ممکن تھا کہ جب وہ پلٹ کے وار کرنے کے مرحلے میں ہوتو میں درمیان میں حملہ کر کے اُسے گرد بڑا دوں۔ میں نے یہ گریز اس لیے کی کہ چھنگا کے آدمی پیش آنے والا کوئی معاملہ اتفاق نہ سمجھیں اور ہر بات کے شاہد ہیں انھیں یہ یقین بتدریج ہی آسکتا تھا۔ کوئی اچانک سانحہ اُن کے لیے ناقابلِ قبول ہوتا۔ میں نے یہ گریز اس لیے بھی کی کہ جلدی میں خواہ مخواہ کام نہ بگڑ جائے۔ مناسب ہوگا کہ چھنگا کو میرے بارے میں رائے ملنے اور تحائف ہونے کا موقع مل جائے۔ اُس کی یہ احتیاط اُس کے پائے ثبات میں لرزش اور غضب میں تزلزل کا سبب بن سکتی تھی۔ ہر امکان پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا۔ بہرحال یہ موجمار جیسا معاملہ نہیں تھا۔ موجمار کے وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس وقت میں اپنے حواس میں تھا اور چھنگا کی ایک ایک جنبش میری نگاہ کے دائرے میں تھی۔

شروع شروع میں چھنگا استاد نے جس سُستی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اب بھی موجود تھی مگر اب اُس میں ایک ہوشمندی شامل ہوگئی تھی اور وہ غالباً اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ قوت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اسے محفوظ رکھا جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چھنگا چند داؤں میں فیصلے کا خواہش مند ہوگا کیونکہ وہ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی مشاقی اور برتری ثابت کرسکتا تھا۔ اس کے برعکس میرے لیے طوالت مناسب تھی۔ میں طوالت ہی سے اُس کے ساتھیوں کے سامنے اپنی اہلیت ثابت کرسکتا تھا اور وہ میرے لیے میں کوئی مستقل بنائے قائم کرسکتے تھے۔ یہ میرے لیے میرے ہاتھ کی آزمائش کا وقت تھا اور اُس کے لیے اُس کی بقا کا۔ اس لیے میں نے معاملے کو طول دیا۔ میں سارے کمرے میں گھرکر ناچا اور چھنگا چاقو لیے میرے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ کئی منٹ اسی آنکھ مچولی میں گزر گئے۔ ننگے چاقوؤں کی موجودگی میں یہ آنکھ مچولی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی اور ایسی صورت میں چند منٹ گزرنا ایک طویل مدت کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دوبارہ جیل میں آگیا ہوں اور قریب ہی شعل کھڑا ہوا مجھ پہ نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میرے مقابل کو اکسا رہا ہے کہ وہ اس طرح وار کرے اور پھر مجھ سے کہہ رہا ہے "لاڈلے! اس داؤ سے بچ کے دکھا" چھنگا نے داؤ پہ داؤ آزمائے۔ میں طرح دیتا اور درگزر کرتا رہا۔ بتدریج میرے بدلتا رہا۔ اس میں موجمار جیسی ہنرمندی نہیں تھی تاہم وہ اپنی صلاحیتیں خوب آزما رہا تھا کیونکہ وہاں جتنے لوگ موجود تھے، وہ اُن سب میں ممتاز تھا۔ فرہی کے باوجود اُس کے جسم میں بلا کی تیزی اور چمک تھی مگر شاید اُس کی نگاہ پر چربی بڑھ گئی تھی۔ جو بات میں نے اس کے اندر دیکھی تھی اور اپنے لیے میں ترمیم کرلی تھی، وہ میرے اندازے نے دیکھنا گوارا نہیں کی۔ یہ غرور بہت دنوں بعد میرے ہاتھ آیا ہے۔

شعل کا کہنا تھا کہ ہمیشہ یہ غرور یہ نشہ جھنگ کے میدان میں اُترنا چاہیے۔ نگاہ چلے بہک گئی یا دھوکا کھا گئی یا اُس نے وہ توجہ نہیں دی جو لمحے دینی چاہیے تو بعد میں نگاہ کا فیصلہ بدلنے کا وقت نہیں ملتا۔ شعل کا کہنا تھا کہ نگاہ کا فیصلہ بدلنے کے لیے ذہن کھلا رکھنا چاہیے۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو میں نے چیخ کر کہا۔ "چھنگا! اب بھی موقع ہے، تم کہو تو میں چاقو پھینک دیتا ہوں۔ مناسب ہے کہ اب کسی کو ٹھوکر میں بند ہو کے پرانے دن یاد کیا کرو۔ ہم بھی تمھاری خدمت کریں گے۔"

جیسا کہ مجھے یقین تھا، چھنگا کے غیظ و غضب کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ کسی پاگل کی طرح مجنونانہ میری طرف بڑھا۔ میں اس بار بھاگا نہیں بلکہ میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ بڑھا کے اچانک اپنا چاقو اُس پہ تان لیا۔ اس طرح کہ اگر وہ اپنی جھونک میں آگے آتا تو چاقو اُس پر اُلٹ ہوتا۔ مگر اُس نے یہ ماجرا دیکھ کے عین وقت پہ پینترا بدل دیا اور چونکہ بہت قریب آکے اُس نے رکنے اور مڑنے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ اگر وہ اُسی لمحے زمین پہ جھک جاتا تو میرا وار بے اثر ہو جاتا۔ اُس نے میرے چاقو والے ہاتھ کے نشانے سے بچنے کی کوشش میں رُخ بدلا تو میری اٹھی ہوئی ٹانگ ٹھیک اُس کی بغل میں لگی۔ وہ ڈگمگا گیا اور کہیں ایک ثانیے کے بعد اُسے ہوش آیا کہ اُسے فرش پر لڑھکتے ہوئے دُور ہو جانا چاہیے۔ چاقو کے سامنے ایسے مرحلے بار بار آنے میں گردن جھکنے "میں برس ہونے اور نچلے دست برداری ہونے سے عزت نہیں گھٹتی" بعد میں اُس نے ایسا ہی کہا، وہ دو زمین لڑھکنیاں کھاتا ہوا میری توقع کے خلاف فرش سے حیرت انگیز طور پر اُٹھ گیا، اُس لمحے مجھ سے اندازے کی ایک معمولی چوک ہوگئی جب وہ فرش سے اُٹھ کے کھڑا ہوا تھا تو مجھے اُس کی طرف جھپٹنا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اپنی جگہ رُک کے اُس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ نسبتہً کشائش کی جگہ پر تھا۔ میں بڑھا تو وہ بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کر گیا اور جو داؤ میں نے اُس پہ صرف کیا تھا، اُس نے اسی کا ہدف مجھے بنایا، البتہ میں اُس کی ٹھوکر کی ضرب کھانے سے پہلے فرش پر جھکتا ہوا آگے نکل گیا تھا میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ مجھے اُس کے جسم کو اسی حد تک نشانہ بنانا تھا جس حد تک وہ برداشت کر سکے۔ اُس کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہ اُس کا پاڑا تھا اور اُس کے آدمی منٹوں میں میری لاش ٹھکانے لگا سکتے تھے۔

شعل نے مجھے ایک اور بات بتائی تھی کہ بالکل اچانک، بہت قریب جا کے ہی ارادہ بدلنا چاہیے۔ ظاہر کچھ کرنے اور عمل کچھ کرنے کا منظر بھی کرتے ہیں، بات اتنی ہی ہوتی ہے کہ ارادہ کس لمحے بدلا جائے۔ اگر پہلے بدل دیا تو عمل پہلے اثر ہو جاتا ہے۔ اگر سر پہ پہنچ کے بدلا تو مقابل کے پاس گریز لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا مگر میں شعل کے اس مشورے پہ اسی وقت عمل کرتا جب مجھے فیصلہ کرنے کی جلدی ہوتی۔

جب ہم دونوں پھر اُلجھنے آئے تو میں نے ہاتھ اٹھا کے اُسے روکا

وہ میرا ہاتھ آسانی سے پکڑ لے۔ اُس نے یہ موقع جانے نہیں دیا۔ جب اُس نے میرا چاقو والا پنجہ پکڑا تو تماش بینوں میں کھسبلی چلی۔ میں نے مڑے کی ایک چیخ سُنی کسی نے اُس کے سر پہ زور سے دھپ مارے کہ اُسے زمین پر بٹھانے کی سستی تھی۔ چھنگا دوسرے ہاتھ سے میرے جسم پر وار نہیں چاہتا تھا۔ میں گتھم گتھا ہونے کے بجائے جھٹکے سے اُس کی مخالف سمت کھنچ گیا اور ایک پل میں یہ صورت ہوگئی کہ وہ اُس طرف میں اس طرف اور ہم دونوں کے کھنچے ہوئے، بندھے ہوئے ہاتھ درمیان کے ناملے پر حاوی آگئے۔ میں نے اُس کے پنجے سے ہاتھ چھڑانے کی صد نہیں کی بلکہ گھومنے لگا۔ نتیجے میں اُسے بھی میرے ساتھ گھومنے پر مجبور ہونا پڑا اور اُس کی میرے قریب آنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ میں نے اُسے پانچ چھ تیز چکر دلائے۔ ہم دونوں جیسے اسکول کے بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گھومے اور اپنے جسم ہاتھوں کی درازی کے برابر دھری پر رکھے جھکے فرش پر اچھل کود سے بھلے لگتے ہوئے چکر کھا رہے تھے، چھٹا چکر تھا کہ بالکل اچانک ایک جھٹکا دے کے میں اُس کے قریب ہوگیا، اُس کا چاقو والا ہاتھ اٹھا مگر میں اپنا سر اُس کے سینے پر مار چکا تھا۔ اس کے پنجے سے میرا ہاتھ تو چھوٹا ہی تھا، اُس کے قدم اس طرح لڑکھڑائے لیکن میں نے اُس کے بہکے ہوئے قدموں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اُسے سنبھلنے کی مہلت دی۔ وہ تیزی سے اوسان بحال کر کے میری طرف بڑھا اور اُس نے میرے ہاتھ، گال اور شانے پر وار کرنے کے لیے کئی داؤ آزمائے۔ میں سمٹتا اور بچاؤ کرتا رہا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھا اور جھنجلایا ہوا تھا۔ اسی عالم میں میں نے اُس کی چھاتی پر ایک بھرپور ہاتھ مار کے اُسے دُور دھکیل دیا۔

جب ہم دونوں پھر آمنے سامنے ہوئے تو میں نے اُس کی پیشانی بھیگی ہوئی دیکھی۔ تیز روشنی میں اُس کا پسینہ چمک رہا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اب خاصی دیر ہوگئی تھی۔ میں نے بے تحاشا ہانپنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ اِدھر اُدھر مٹکا تھرکتا رہا۔ میں نے اُسے ایک پل چین نہیں لینے دیا۔ کئی بار ایسے امکان ہوئے کہ میں اُس کا جسم لہولہان کرسکتا تھا لیکن میں نے مجبوراً اپنے ہاتھ کھینچ لیے جب کہ وہ میرا جسم اُدھیڑ ڈالنے کی فکر میں تھا۔ لیکن سینے اُس کے ساتھیوں نے میری گریز میرے کسی اندرونی خوف پر محمول کی ہوگی وہ میری مہارت پر حیران ہوں مگر میرا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ سب جان کار لوگ تھے، اپنے نشانے لگنے اور مرکنے کی نوعیت ناک کام تھا۔ جب میں نے انھیں طرح طرح کی مہارت کا مظاہرہ کیا تو پہلی مرتبہ میں نے اُس کا بایاں بازو ناک کے وار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ سمجھ گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا بازو یہ بدل لیا لیکن چشم زدن میں چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اُس کے دائیں بازو پر ایک کھیرا کھینچ دی جو اُس کا گوشت چھاتی ہوئی کہنی تک چل گئی۔ کرتے پر خون کی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ وہ اچھلا اور گھبرا کے پیچھے ہٹا۔ میں نے کسی تذبذب خیال ظاہر کیے بغیر اُس کی حالت پر تعجب ہوں، میرا چاقو والا ہاتھ گرا ہوا تھا اور میں مجہول انداز میں کھڑا تھا۔ چھنگا میرے رستے ہوئے چاقو والے ہاتھ ہی پر جھپٹا۔ میں نے

ملے فوراً بلند کر لیا۔ چھنگا کا ہاتھ میری بغل سے گزر گیا لیکن واپس نہیں آیا۔ میں نے اپنا بازو تیزی سے نیچے کر کے اُسے دبا لیا تھا۔ اُس لمحے میں نے اپنا چاقو اچھالا اور اُسے مارنی کی طرف پھینک دیا اور دوسرے ہی سمے میں نے چھنگا کا ہاتھ دبائے جانے اُس کی گردن پر ضرب لگائی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے میری گردن پکڑ رکھی تھی۔ ضرب معمولی نہیں تھی۔ چھنگا کی کسمساہٹ مشکل گئی۔ اُس نے بوکھلاہٹ میں میری گردن چھوڑ دی۔ میں اسی امر کا منتظر تھا۔ میں نے نیچے جھک کے دھنتہ اپنی پوری طاقت سے اُس کے جسم پر مکّہ ماری۔ میری مٹھی میں دبا ہوا اس کا پنجہ پچک گیا تھا۔ اُس کی ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ فرش پر چاقو گرنے کی آواز آئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ آزاد کر دیا اور اُس کے کندھے کے اُس کی پسلیوں پر تین چار شدید ضربیں لگائیں۔ چھنگا فرش پہ ڈھے گیا اور اپنے پاؤں مارنے لگا، پھر میں نے اُس کا چاقو فرش سے اُٹھا لیا اور اُس کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے نظریں جھکا لیں۔ مُنڈا مارنی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا اور مارنی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ تیز سانسوں اور چھنگا کی کراہوں کے سوا کوئی اور آواز کمرے میں نہیں تھی۔ میں چاقو تانے ہوئے چھنگا کے پاس آیا۔ وہ فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے کھڑا کیا اور اُس کا چاقو اُس کے آگے کر دیا۔ چھنگا نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا، اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے اور اُس نے دبنگ طور پر پیچھے ہٹنے لگے میں اپنے بازو ڈال دیے۔ کمرے میں جیسے کسی نے شور کا بٹن دبا دیا۔ مارنی اور مُنڈا میری کمر سے چمٹ گئے، چھنگا کے آدمیوں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا۔

m

مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ جولیا اور چچا دروازے پر کھڑی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور انھوں نے مجھ کو میری تلاش میں داد کر دیا ہوگا لیکن یہاں سے جلدی نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اشارے پر چھنگا کے خون آلود کپڑے فوراً بدلوا دیے گئے۔ اُس کے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اُس کے پنجے پر اٹس کی جا رہی تھی، میں خود چھنگا کو چبوترے پر لے آیا تھا اور وہ میری گردن میں ہاتھ ڈالے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر میں چھنگا کے آدمی قریبی چوک کے گل فروشوں کے ہاں سے ہاروں اور پھولوں کے ٹوکرے لے کے آگئے اور چھنگا نے اپنے ہاتھ سے میری گردن ہاروں سے بھر دی۔ میں نے آدھے ہار اُتار کے چھنگا کے گلے میں ڈال دیے، اُس نے انھیں فوراً اُتار دیا۔ پھر وہاں جتنے آدمی موجود تھے، وہ ایک ایک کر کے آتے اور میرے گلے میں ہار ڈالتے رہے۔ میں قریب رکھی ہوئی سینی سے ایک ایک دس گلاب اُن کے منہ میں ڈالتا رہا، مارنی میرے دائیں طرف اور چھنگا بائیں طرف بیٹھا تھا اور مُنڈا میری کمر سے چپکا ہوا تھا۔ کوئی وقت تھا یہ جنگجو ہتھیار بند تھے اور میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ چھنگا نے مجھے روک لیا اور گمبھیر آواز میں بولا "کہاں جاتا ہے؟ اب اس جگہ تمھی بیٹھے گا۔ اپن سورے چلا جائے گا۔"

"نہیں چھنگا! تم وہیں رہو گے، اسی چبوترے پر بیٹھے رہو گے،

میں اب چلتا ہوں۔ تم بے شک اس علاقے کے راجا ہو۔ تمھارے ہاتھ میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ تم جوان ہو اور کشتی جوانوں پر بھاری ہو۔ تم حوصلے کے آدمی ہو۔"

"نہیں راجا! راجا تو تم ہو۔ اپن کو اتنا مت گراؤ۔" اپن اب یہاں نہیں رہے گا۔ یہ جگہ تمھارے تھی اب کا مالک ہے اور یہ سب تمھاری پرجا ہے۔ اپن دو ایک دن میں اپنے گاؤں چلا جائے گا؟"

میں نے اس سے بہت اصرار کیا چھوڑ نہیں مانا۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ میرا نائب بن کے علاقے میں موجود رہے مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہیں ہوا وہ ایک دو دن ٹھہرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوا۔ مجھے خود اور اس کا انتظام کرنا تھا۔ مارٹی میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن یہ موقع اس کا نام لینے کا نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور ایک دراز قد، بُرد بدلا اور توانا آدمی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے پاڑے کی گلی کے نکڑ پر مجھ سے کہا تھا کہ فیصلہ چھنگا کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ میرے پاس آگیا۔ میں نے بلند آواز میں کہا: "یہ علاقہ تم دیکھو گے جب تک میں مستقل طور پر یہاں نہ آجاؤں۔" پھر میں نے ادھر اُدھر دیکھ کے پوچھا: "کیا کسی کو اعتراض ہے؟"

❤

مارٹی اور منّا مجھے گھر تک پہنچانے آئے۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ جولین اور چمپا دروازے کے قریب ہی گیلے لان پر بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں دیوانہ وار میری طرف دوڑیں۔ میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی معذرت کر لی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ چھنگا کے خون سے میری قمیص تر ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے وہیں ایک آدمی سے اُسے بدل لیا تھا۔ میرے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جب تک جولین اور چمپا نے میرے ہاتھ پاؤں ٹٹول کے نہ دیکھ لیے اُن کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ میں نے مارٹی اور منّا سے کہ بھی اندر بُلا لیا۔ اُن کا ہنسی رات گئے واپس جانا ٹھیک نہیں تھا، دونوں جھجکتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور دونوں نے چمپا کے پیر چھوئے۔ جولین کو سلام کیا۔ جولین اور چمپا نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک نہیں لگ رہی تھی مگر ان کے خیال سے میں میز پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر اُجڑا ہوا تھا۔ اتنے مختصر وقت میں تقریباً تمام سامان باندھ دیا گیا تھا۔ مارٹی اور منّا نے مچھلی کے کھانے سے پہلے اپنے کپڑے بدلنے کے لیے دیے۔ پھر میں نے اس کے زخم کھول کے دیکھے۔ زخم معمولی تھے۔ چمپا نے اس کی پٹی بدل دی۔ مارٹی کی آنکھیں برسنے لگیں اور وہ بیٹھے بیٹھے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے ان دونوں کو اپنے کمرے میں سُلا دیا اور خود ڈرائنگ روم میں آکے لیٹ گیا۔ چمپا میرے جانے کے بعد بیٹھ گئی اور مجھے پر چھے بغیر میرا سر دبانے لگی۔

صبح دس بجے تک ہم نے مکان بدل لیا۔ حکومت کی طرف سے جو ملازم وہاں تعینات تھے، وہ وہیں رہ گئے۔ بجٹو کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جولین نے فون پر ٹسکالا کو مکان بھجوانے کی اطلاع دے دی تھی۔ منّا اور مارٹی سامان اُٹھانے رہے۔ جولین کا گھر کرشنا جی کے سرکاری مکان سے زیادہ دُور نہیں تھا جیسے ہی ہم اس کام سے فارغ ہوئے، میں منّا، مارٹی کو لے کے وہاں سے روانہ ہو گیا اور جھنگا کے علاقے میں پہنچ گیا۔ علاقے میں گشت کرنے والے آدمی سڑک ہی پر مل گئے اور ہمیں اپنی معیت میں پاڑے لے گئے۔ جھنگا وہاں سے جا چکا تھا اور جو تو بے پردہ آدمی موجود تھا جسے میں نے گزشتہ رات چھنگا کی جگہ مقرر کیا تھا۔ اس کا نام زوالا تھا۔ میرے پہنچتے ہی زوالا جھومتے سے اُتر گیا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ علاقے کے تمام آدمیوں کو پاڑے میں بلایا جائے۔ پھر میں اس دلیر اور زوالا سے علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ دو پہر تک پاڑے کے بڑے کمرے میں علاقے کے تمام آدمی جمع ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر نے رات کا واقعہ نہیں دیکھا تھا مگر اپنے ساتھیوں سے تمام روداد سُن لی ہو گی۔ میں نے کوئی زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ میں نے کہا کہ مجھے دعوتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایک تو لڑکیوں کا اغوا دوسرے طرفہ بازی، تیسرے پردہ نوچیاں۔ میں اُن سے کہہ دیا چاہتا ہوں کہ اگر کسی دستہ علاقے میں پکڑی جائیں یا انھیں گزند پہنچے کے لیے اُس وقت تک جتھے سے پیچھے رہنا پڑے جب تک وہ کسی کام وام پر نہ لگ جائیں۔ علاقے سے کوئی لڑکی اغوا نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اعلان کیا کہ آیندہ سے وصول ہونے والا بھتا مرتب کے اعتبار سے تمام آدمیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ استاد کا کوئی حصّا نہیں ہو گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے علاقے میں زیادہ دنوں تک نہیں رہنا ہے۔ جب بھی ان میں سے کوئی آدمی میری یا جھنگا استاد کی جگہ لینے کے قابل ہو گا، علاقہ اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جب بھی کوئی آدمی یہ سمجھے کہ وہ موجودہ استاد سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے، اُسے کسی قاتل کے بغیر استاد کو چیلنج کر دینا چاہیے۔ پاڑے میں باقاعدہ ورزش ہوا کریں گی اور ہر قسم کے ہتھیر کی مشق کی جائے گی۔ آپس میں کوئی اختلاف ہو تو اسے استاد کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

میں دن بھر وہیں رہا تھا پھر میں نے مارٹی اور منّا کو پاڑے میں چھوڑ دیا تھا۔ اُس رات بھی مجھے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ چمپا اور جولین نے کھانا تو کھا لیا تھا مگر ان کا نہ کھانا بھی سب کچھ کہتا تھا۔ اسی طرح کوئی بیس پچیس منٹ گزر گئے ساری کے دھم مندل ہو گئے تھے۔ میں نے پاڑے ہی میں اُسے چاقو بازی کے داؤ پیچ بتانے شروع کر دیے تھے اور یہ سلسلہ صرف مارٹی تک محدود نہیں تھا، دوسرے بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ پاڑے کی عمارت میں ڈنگ روغن کرا دیا گیا تھا صرف ایک مہینے میں علاقے کے سارے آدمی جھنگا کا نام بھول چکے تھے۔ وہ میرے اردگرد بیٹھے رہتے تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن علاقے کا گشت کرتا تھا اور واپس آکے اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایتیں دیتا تھا۔ شہر کے دوسرے اڈوں کی سرگرمیاں بھی مجھے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جولین اور چمپا نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ رات گئے جب میں گھر واپس لوٹتا تو وہ مجھے جاگتی اور تملاتی ہوئی ملتیں حالانکہ میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ ویسے اب انھیں مجھ سے بات چیت کا وقت ہی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ آتے ہی میں اپنے

کمرے میں بند ہو جاتا اور اپنی مالا کے دانے منہ پر بکھیر لیتا۔ کوراپچکے سے میری آنکھوں میں آکے بیٹھ جاتی۔ میں اُسے اپنی آنکھوں میں بند کیے سو جاتا اور صبح ہوتے ہی ناشتے کے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ پھر ایک رات ایسا ہوا کہ مجھے پاڑے میں رہنا پڑا۔ اُس رات علاقے کے ایک آدمی بسنتا کا پڑوسی علاقے کے ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا چنانچہ مجھے پہل بار استاد بالم خاں کے پاڑے میں داخل ہونا پڑا۔ بالم خاں نے میرا ذکر خاصا سُنا ہو گا۔ مارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ علاقے کے آدمی میرے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ میں پولیس کا آدمی ہوں، کبھی کہتے ہیں کہ میں اُن میں سے نہیں ہوں، مجھ پر کسی بھوت یا جن کا سایہ ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ میں نے اُنتا دُستانہ کے اڈے میں گھس کے پولیس کو رپورٹ کر دی تھی اور سارے اڈے کو پکڑوا دیا تھا اور میری ایک بڑے پولیس افسر سے دوستی تھی۔ مارٹی اپنے طور پر ان کی تردید کرتا رہتا تھا۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ کسی تردید یا تائید میں اپنا وقت ضائع نہ کرے لوگ جو کہتے ہیں، انھیں کہنے دے۔ اگر لوگ زیادہ تنگ کریں تو اُن سے کہہ دے کہ تسانا نے ایک نوجوان لڑکی اغوا کی تھی، وہ غلط نہیں تھا اس لیے پولیس کو رپورٹ کر دی گئی۔ اسی طرح طرح کی افواہیں اور کہانیوں کے باوجود دوسرے علاقے کے لوگ چھنگا کے مقابلے میں میری کہیں زیادہ عزت کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے قریب رہنا چاہتے تھے۔

اُس رات جب زخمی بسنتا پاڑے میں واپس آیا تو مجھے بالم خاں کے پاس جانا پڑا۔ بالم خاں میری شکل دیکھتے ہی میرا مذاق اُڑانے لگا اور مجھ پر آوازیں بردشت فقرے کسنے لگا حالانکہ اس کے آدمیوں نے اس کی زبان روکنے کی بھی کوشش کی مگر بالم خاں، جو گندمی رنگ کا ایک لمبا چوڑا آدمی تھا اور جس کی آواز میں کھنک تھی، اُس نے میری بات پر کان نہیں دھرے نتیجۃً بات بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ بالم خاں چاقو تان کے کمربستہ ہو گیا۔ میں نے لڑائی کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے دل میں میرے لیے کوئی بڑی نفرت لیے بیٹھا تھا، مختصر یہ کہ مجھے اُس سے مقابلہ کرنا پڑا اور اُس رات بالم خاں کا علاقہ بھی میرے علاقے میں شامل ہو گیا۔ بالم خاں زخمی ہونے کے بعد علاقہ چھوڑ کے بھاگ گیا۔

بالم خاں کا علاقہ بہت چھوٹا تھا۔ وہ صرف چند گلیوں اور ایک لمبی سڑک پر مشتمل تھا۔ آمدنی بھی معمولی تھی۔ شاید وہ چھنگا کے علاقے پر قدرت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے دیکھا تو اُسے اپنا پلّا خراب فرمنڈہ تصویر ہوتا نظر آیا مگر بالم خاں صرف دیکھنے کا آدمی تھا۔ محض تین چار داؤں میں گرے زخم لگوا لیے اور چلتا بنا۔ میں اُس رات گھر نہیں جا سکا۔

دوسرے دن کوئی بارہ بجے مارٹی ہانپتا کانپتا ہوا پاڑے میں آیا اور اُس نے خوف زدہ آواز سے میرے کانوں میں سرگوشی کی کہ کوئن علاقے میں آئی ہوئی ہے۔

"کوئن!" میں اُچھل پڑا۔ "جولین؟"

"ہاں راجا ڈارلنگ!" اُس نے گھر کے کمرے میں میرا نام خود بخود راجا پڑ گیا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"اپن نے اُسے پاڑے سے دُور ہی رکھا ہے۔ وہ اپن کا ایڈریس پوچھتی ہوئی پُرانے فلیٹ گئی تھی جہاں تم فرسٹ نائم آیا تھا۔ اُدھر لوگوں نے ایدریس بھیجا۔ اب اپن کو علاقے کا سارا لوگ جانتا ہے۔ اپن نے فون پر بھی بولا جا!"

"تُو نے کیا پتہ کیسے معلوم ہوا؟" مگر فوراً مجھے یاد آیا کہ جب مارٹی مجھے اپنا پتہ بتا رہا تھا" وہ میرے ساتھ تھی۔ میں مارٹی کے ساتھ بھاگا بھاگا علاقے کے چکر میں پہنچا۔ منّا نے ایک جگہ روک رکھا تھا۔ میں اُسے اُسی وقت علاقے سے باہر لے گیا۔ مگر آگے میں نے اُسے تنہا کی کہ وہ وہاں کیوں گئی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ منہ پھلا کے روٹھنے لگی رات کو بھی گھر نہیں آیا تھا اس لیے وہ میری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں اس طن گھر ہی رہا کیونکہ جولین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن دوسرے دن وہاں نہیں رُک سکتا تھا اب وہ لمحہ قریب آرہا تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے جولین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ آیندہ بھی کبھی رات گھر سے غائب رہ سکتا ہوں۔ وہ کام کی نوعیت پوچھنے لگی۔ میں نے کام کی نوعیت کیسے بتا سکتا تھا۔ خود میرا دل علاقے میں کہاں لگتا تھا، میں تو وہاں مجبوراً ٹھیرا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ایک تو دن بھر سر کھپنا رہنا پڑتا تھا، دوسرے گھر آتے ہی چمپا اور جولین کی آنکھیں سہمی پڑتی تھیں۔ چمپا بھی تک چپ تھی مگر ایک رات جب میں دوسرے پاڑے کے بعد واپس آیا تو وہ بھی تنبیہ کرنے لگی کہ میں پھریرے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا ہوں اور کرشنا جی کی تحمل پیچ کا ہوں۔ "بُرے کام کا بُرا انجام ہوتا ہے پیارے میاں!" وہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے التجا کرنے لگی کہ میں منّا اور مارٹی کا ساتھ چھوڑ دوں۔ مجھے اپنے عزیزوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں جلد ہی اپنا کام ختم کر دوں گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

بعد کے دنوں میں میری مصروفیت اور بڑھ گئی۔ اب میں تین تین چار چار دن بعد گھر واپس آتا۔ میرے کپڑے میلے ہوتے اور میں اپنی عورت کو مکھے کے بالکل رات سو کے صبح واپس چلا جاتا۔ جولین کو گھر فون نہیں تھا مگر چمپا بتاتی رہتی تھی کہ ٹسکالا بھی آئے تھے مجھے پوچھ رہے تھے۔ میں نے منّا کو کہیں سے فون نہیں کیا کہ کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کا کہیں سے کوئی جواب آیا یا نہیں۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ کسی جانب سے کوئی جواب آسکتا ہے۔ اگر آتا تو شکا جو سے ملنے کے لیے ضرور لے چین ہوتا۔ میں مسلسل دو مہینے چھنگا کے پاڑے میں خوفناک تماشا بنا رہا پھر مٹی کے کئی استاد مجھ سے ملنے کے لیے آئے لیکن میں زیادہ تر اپنے ہی علاقے میں محدود رہتا، بہت کم کسی سے ملتا جلتا تھا۔ زوالا، بھیدا، مارٹی اور منّا ہر وقت مجھے خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بالم خاں کا علاقہ ناں ہونے کے بعد یہ علاقہ خاصا بڑا ہو گیا تھا اس کے باوجود زوالا اور مارٹی کی خواہش تھی کہ اسے اور وسیع کیا جائے کیونکہ یہ لمبی کے اور بہت سے علاقوں کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے میں نے اُن کی بات پر توجہ

نہیں دی وہ چاروں مجھے قریب بٹھنے کیلئے ہوئے تھے۔

تین مہینے گزر گئے، بمبئی کا ثابت یہی کوئی اڈا ایسا ہو جس کے بارے میں مجھے تمام تفصیلات معلوم نہ ہوں، آخر وہ لمحہ آ گیا جب میں نے زورا اور مارٹی کو بلا کے اپنی ایک خواہش ظاہر کی۔ میں نے انھی کے ذریعے تمام معلومات اکٹھی کی تھیں اور یہ کام اس وقت تک ناممکن نظر آتا تھا جب تک میرے ساتھ کچھ اور لوگ شریک نہ ہوں۔ میں پوری طرح اصل چہروں سے واقف نہ ہو جاؤں۔ میرے متعلق لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور متعلق لوگوں کی نشان دہی کے لیے خاص قسم کے لوگوں کا ساتھ ضروری تھا۔ میرا رہنا علاقے کے لوگوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ انھیں پاٹے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ وہاں سبزی بھی گھوٹی جاتی تھی اور روز طرح طرح کے کھانوں کی محفل جمتی تھی۔ جھینگے کے دور میں ہر دوسرے تیسرے روز مجرا ہوتا تھا، چنانچہ مجھے بھی مجبوراً پاٹے میں گانا سننے کے لیے طوائفیں لانے کی اجازت دینی پڑی جس رات رقص و سرود کا یہ ہنگامہ گرم ہوتا میں وہاں نہیں رہتا تھا۔ مارٹی اور مٹھے کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کسی میں جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ میرا تعاقب کرتے۔ میں نے زورا، مارٹی، چھیلا اور دوسرے قریبی آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ وہ زیادہ آمدنی والے علاقوں پر نظر رکھیں اور معلوم کریں کہ کون سا علاقہ کن لوگوں سے متعلق ہے۔ یہ کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بمبئی کے دوسرے علاقوں میں ہر ایک کے اپنے شناسا اور ہم پیشہ آدمی موجود تھے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ مارٹی، زورا اور مٹھے کی زبانی ہر چھوٹی موٹی بات میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ کس علاقے میں میرے متعلق کیا باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ پھر میں نے انھیں تیواری داد کے علاقے کے آدمیوں سے رابطہ بڑھانے کی ہدایت کی۔ وہ تیواری کے چند آدمیوں کو اپنے ہاں لے بھی آئے تھے اور انھیں رات بھر حیدرآباد سے آئی ہوئی طوائف گل نام کا گانا سنواتے اور انگریزی شراب پلاتے رہے۔ میں اس محفل میں موجود نہیں تھا لیکن تھا پاٹے ہی میں۔

میں نے زورا اور مارٹی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو صرف چند لمحوں کے لیے ان پر سکتہ طاری ہوا پھر انھوں نے میرے ہاتھ چوم کے کہا: "راجا جی تم بولو تو اپن سرکٹ دے۔"

تیسرے دن شام کو رات بسر وہ علیحدہ علیحدہ پاٹے سے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے وہ کئی بار محفل وقوع کا جائزہ لے آئے تھے۔ زورا اور مارٹی کے ہاتھوں میں اب خاصی چھری آ گئی تھی۔ مٹھا اور چھیلا بھی ان کے ساتھ تھے۔ رات ہوتے ہوتے وہ امیروں کی اس سبز زار آبادی میں مختلف مقامات پر چھپ گئے تھے۔ مٹھا کوٹے کے ڈرم میں گھس گیا تھا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے وہ یکے بعد دیگرے اپنی اپنی جگہوں سے نکلے اور ایک متعینہ مقام پر ایک دوسرے سے مل گئے۔ چھیلا اور زورا کے کندھوں پر چڑھ کے سب سے پہلے مارٹی نے باؤنڈری عبور کی۔ وہ اپنے ساتھ ضروری سامان بھی لے گئے تھے۔ مٹھا باہر ہی رہ گیا۔ زورا، چھیلا اور مارٹی نے باؤنڈری اتر کے سب سے پہلے دروازے کا رُخ کیا اور لپٹ سے چوکی دار کے سر پر پہنچ کے اُسے کچھ دیر کے لیے حرکت اور آواز سے معذور کر دیا۔ پھر وہ کوٹھی کی طرف بڑھے۔

صبح کے اخباروں میں خبر آنا ممکن نہیں تھا لیکن دوپہر تک سیٹھ شمبھو نواس اور اس کے داماد گردھاری لال کے قتل کی خبر شہر میں پھیل چکی تھی۔ میں گھر سے چار دنوں سے غائب تھا، اس دن سرِشام ہی گھر پہنچ گیا۔ جولین بہار تھی۔ میں چھپاکے ساتھ اس کے کمرے میں گیا تو اس نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ میں نے لاتعلقی سے اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی اور میرے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں حیران رہ گیا۔ چھپا نے مجھے بتایا کہ تین دن پہلے اس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا سر چٹخنے لگا۔ جولین نے میرے ہاتھ جگر دیے تھے، پتہ نہیں کس وقت چھپا مجھے اٹھا کے میرے کمرے میں لے گئی۔ مجھے رات بھر کی سدھ بدھ نہ تھی۔ صبح ہوئی تو چھپا نے مجھے جگایا۔ دھوپ چڑھ آئی تھی۔ مجھے فوراً پاٹے جانے کا خیال آیا۔ ابھی سمبھو گروپ کا پردہ تیواری داد موجود تھا۔ میرا پاٹے جانا ضروری تھا۔ چھپا نے میرا مذبذب دیکھ کے جھجکتے ہوئے کہا: "ایک آدمی باہر بیٹھا ہوا تھا، انتظار کر رہا ہے۔"

"میرا انتظار؟ کون ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"باہر کے دیکھ لو۔" چھپا ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے چادر ایک طرف پھینک دی اور بستر سے اچھل کے نیچے آیا۔ جب میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھل میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں سمجھا یہ قریب نظر ہے" میں ابھی تک سو رہا ہوں مگر اس کا دبلا قامت سراپا میری آنکھوں سے دور نہیں ہوا۔ وہ دیا کمرے کے وسط میں سلیب کے نیچے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور سرد نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ چوکھٹ پر میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ میں دروازے ہی پر ٹھٹکا ہوا آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ پھر مجھے اس وقت خبر ہوئی جب میں اس کے سینے سے بھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے زور سے بھینچ رکھا تھا۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لی تھیں مگر آنسو چھوٹ پڑے اور میرا سر اس کے کندھے پر ٹپنے لگا۔ مجھل نے یک لخت مجھے اپنی چھاتی سے ہٹایا اور میرے بازو پکڑ کے مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے میں نے دوبارہ اس کے سینے میں سر چھپانا چاہا مگر اچانک ایک دھماکا سا ہوا، قدم زمین سے اکھڑ گئے اور میں ایک طرف جھک گیا۔ مجھل نے اٹھے ہاتھ میرے گال پر مارا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اس نے دوسرا طمانچہ لگا دیا۔ میں نے مضبوطی سے اپنے پیر زمین پر جمانے کی کوشش کی تاکہ اگلے تھپڑ کے لیے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں نے اس کا ہاتھ نہیں روکا۔ وہ خود ہی تھم کے ہانپنے لگا اور اس نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

"اڑے جانی!" اس کی کراہتی ہوئی آواز ابھری "روتا بھی ہے کمبخت ہی ہے۔"

"ہاتھ کیوں روک لیے مجھل بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"تُو نے ہاتھ پیر چھلا دیے۔" وہ منہ پھیر کے بولا۔

میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ہاتھ مت روکو۔ مارو، خوب مارو۔" میں نے چیخ کر کہا: "میری سانس نکال دو۔"

"ہاتھوں میں جان ہوتی تو اتنی دیر نہ لگتی لاڑلے!" وہ میرے سر کے جھٹکے دیتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا: "تیرا دل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے نوچ کے پھینک دوں۔"

"تو نوچ لو نا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا: "دیر کیوں کرتے ہو؟ ایک ذرا سی ہمت کر لو، پھر یہ آزار ہی ختم ہو جائے گا۔ مجھ سے بھی اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں اپنا ہی گریبان پھاڑنے کے لیے لوگوں سے دور رہتا ہوں۔"

"چپ رہ۔" وہ شکستہ آواز میں چلایا۔ "دنیا میں آدمی اکیلا نہیں جیتا لاڑلے! اس کی آواز ڈوبنے لگی۔ "سب کچھ تجھی پر نہیں ہے کہ تو کیا چاہتا ہے، دوسروں پر بھی ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں، تو نے کیا پڑھا لکھا ہے۔ کتابوں میں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔"

"میں نے کچھ نہیں پڑھا لکھا۔ میں بالکل جاہل ہوں، جنگلی ہوں، کتا ہوں۔ ہاں! مجھے اس دنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔"

مجھل کے طمانچوں اور آواز کی گرج سن کے بیمار جولین بھی چادر اوڑھے ہوئے بستر سے اٹھ آئی تھی اور چھپا کے پہلو میں سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "اگر آپ لوگ بیٹھ جائیں۔" اس نے لرزیدہ آواز میں ہمیں کہا۔

مجھل چونک کے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے میرے بازو چھوڑ دیے اور میری گردن میں بانہیں ڈال کے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ تو نے پٹ کے خبر بھی نہیں لی بلوخاہ!" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ منٹ گزر گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ "تم یہاں کیسے آ گئے؟" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں نرمی سے پوچھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ مجھل اس گھر میں آیا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ یہ میرا گھر تو نہیں مگر مجھل نہ جانے کتنی دور سے چل کے میرے پاس آیا ہے۔ اُسے دیکھ کے میری زبان گنگ ہو گئی تھی اور اس کے بعد اس نے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

"آ گیا۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا: "آخر پہنچ ہی گیا۔"

"لیکن تم..... تم کیوں آ گئے؟"

"چلا جاؤں گا لاڑلے!"

"نہیں نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا: "میرا مطلب....."

"تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے پژمردگی سے بولا۔ "میں تجھے دیکھنے آیا ہوں، خود کو تجھے دکھانے نہیں آیا۔ تو کہے تو چلا جاؤں گا۔"

"نہیں مجھل بھائی!" میں نے اضطراب سے کہا: "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تم اپنی پریشانیاں بڑھانے یہاں کیوں آ گئے؟ میں نے پہلے ہی تمھیں کون سا خوش رکھا تھا۔"

"جانے دے۔" وہ ہاتھ جھٹک کے بولا: "طعنہ مت دے۔ تو تو بالکل نہیں بدلا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا: "تو تو وہی ہے، وہی لاڑلا راجا۔ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ تو اپنے آنے کے بعد یہاں موجود نہیں ہوگا۔ تو تو ہر وقت وہیں تھا۔ تیری پیچھائیں تو وہیں رگڑی تھی کتورے! اُسے بھی ساتھ لیتا آتا۔" وہ میرے بال کھینچنے لگا: "تو بولے کہ کے بھی آ سکتا تھا، میں نے تیری کون سی بات ٹالی تھی۔ برس نکلنے کو آ رہا ہے۔"

"مجھے جانا تھا۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"جانا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھے جانا ہے۔ تیرے پیروں میں زنجیر پڑی ہے۔ پر تُو کچھ دیر بعد جا سکتا تھا اور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ مجھے صرف اپنے پیروں کی زنجیر کیوں دکھائی دیتی ہے۔ تو نے تو..... چھپا کو سامنے کھڑا دیکھ کے اس کی زبان لڑکھڑاتے ہوئے سر پر گئی۔ چھپا کے پیچھے جولین دبکی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔

"آیئے، ناشتہ کر لیجیے۔" چھپا نے جھکتے ہوئے مداخلت کی۔

"ناشتہ۔" مجھل سٹ پٹا کے بولا: "نہیں، نہیں۔ ہم ہوٹل سے نٹ کے آئے ہیں، ناشتہ نہیں۔ پرماں لاڈلا تو ناشتہ کرے۔ چل اٹھ۔" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولا: "کچھ کھا لے۔"

"مگر آپ..... آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ سیدھے اسٹیشن سے یہاں آئے ہیں۔" چھپا نے ہلکی آواز میں کہا: "آیئے۔"

کھانے پینے کا یہ بکھیڑ ہے بائی! اپنا ناشتہ تو اسے دیکھ کے ہی ہو گیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا: "اس سے پوچھو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ کھاتا پیتا ہی نہیں ہے۔ کیسا دبلا ہو گیا ہے۔"

باہر جو لوگ کھڑے ہیں، انھیں بھی بلا لیجیے۔" جولین نے جھجکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "گھر طویل ہی کا ہے۔" جولین کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔

"باہر کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ۔ وہ تیرے دو ایک جاننے والے ہیں۔" مجھل بے پروائی سے بولا: "انھیں باہر ہی رہنے دے۔ یہ گھر ہے، بلڈا نہیں ہے۔"

"کون کون ہے؟" میں نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا اور مجھل کے جواب دینے سے پہلے دروازے کی جانب بھاگا۔ کان کے باہر کرسیاں ڈالے

گردن جھکائے فیض آباد کے استاد جامو اور کالو بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا دونوں مجھ پر جھپٹ پڑے۔ جامو نے مجھے اوپر اُٹھا لیا۔ کالو نے اپنا سر میرے سینے پر مارنے لگا۔ انھوں نے راہ گیروں کی پروا بھی نہیں کی۔ "چلو، چلو! مدھ چلو۔" میں نے انھیں کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکے مگر میں انھیں اندر جولین کے گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ دونوں مجھل کے پاس مبارک باد کا شور مچاتے ہوئے آئے۔ انھوں نے مجھے پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ کبھی مجھے گھونسے مارتے، کبھی مسکراتے۔ یہ دیکھ کے جولین کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ ہم سب کو بھل بھلاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب کوئی پردہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جولین نے بہت کچھ سُن لیا تھا۔ مجھل، جامو اور کالو نے کے جیسے لیے نہیں تھے جنھیں اتنی عمر کی لڑکی نہ پہچانتی ہو۔ اُسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ تاہم وہ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی جیسے اُس کے عزیز، رشتے دار آ گئے ہوں اور وہ اپنے باپ کے مرنے کا غم بھول گئی ہو۔ وہ بار بار اندر جاتی تھی اور چند لمحے بھی نہیں گزرتے تھے کہ واپس آ جاتی تھی۔ اندر اُس کی ماں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اُس کے اصرار پر ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میز پر وہ اپنے پرانے گھر سے ساتھ لائی تھی اور چار ہی آدمی اس کے اطراف بیٹھ سکتے تھے۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ اتنی سی دیر میں یہ سب چیزیں تیار ہو گئی تھیں۔ بھاجی بھی تھی، پوریاں بھی تھیں، مٹھائی بھی تھی، بسکٹ، ٹوسٹ اور مکھن بھی کچھ موجود تھا۔ جب چمچا چائے دانی لے کے آئی تو جامو نے آہستگی سے پوچھا۔ "کیسی ہو چمپا بائی؟"

"ٹھیک ہوں۔" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تم تو بالکل بدل گئی ہو۔" وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا۔

"چپ رہو جامو!" مجھل نے تلخی سے کہا۔ "فضول باتیں مت کرو۔"

جامو نے تملا کے گردن جھکا لی۔ ناشتے کے دوران میں خاموشی رہی۔ کسی نے کچھ کھایا نہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ انڈیلے اور ڈائننگ روم میں بیسن گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ مجھل نے مجھے اپنے قریب بٹھایا تھا میرے آنسو تھم گئے تھے لیکن چرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر مجھل کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بمبئی میں ہوں اور اس جگہ رہ رہا ہوں؟ اسے میرا پتہ کس نے بتایا؟ مجھے اندازہ تھا کہ اب کیا ہوگا۔ مجھل میری انگلیاں مٹول رہا تھا اور بار بار مجھے دلچسپ لیتا تھا۔ جامو اور کالو نے کچھ بولنا چاہا تو مجھل نے پھر انھیں جھڑک دیا۔ استاد نے تو زبان پر تالا لگا لیا ہے۔ تو ہی کچھ بول لاڈلے! تجھ پہ کیا بیتی؟ تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

"کانتے!" مجھل نے مشتعل ہو کے کہا۔ "لاڈلے کو پریشان نہ کریں، جانتا ہوں، یہ تجھے کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ بڑا کنجوس ہے سب کچھ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ اسے مت چھیڑ۔"

لیکن یہ زباں بندی کتنی دیر کی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُن کے ذہنوں میں بے شمار سوال اُٹھ رہے ہوں گے۔ یہ فیض آباد کی چمپا بائی ہے جس کے کوٹھے پر میری بہن ناچتی تھی اور جو میرے خوف سے فیض آباد سے بھاگ کے اپنی بہن موتیا بائی کے پاس آگرے چلی گئی تھی۔ میں اُسی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ اور یہ خوب صورت لڑکی کون ہے جو اتنی بے تابی سے ان لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ یہ گھر کیسا ہے جہاں میں بیٹھا ہوں اور اگر مجھے گھر ہی بنانا تھا تو مجھل اور زریں نے کیا بگاڑا تھا۔ جلد یا بدیر مجھے بہت سے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ مجھے بتانا تھا کہ میں نے زریں کے ہاں سے آنے کے بعد کیا حاصل کیا اور جب میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تو واپس کیوں نہیں آیا؟ وہی سوال و جواب، وہی کیوں اور کیسے۔ میرے پاس اُن کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مجھ سے تو آئینے کے سامنے بھی نہیں جایا جاتا۔ میں ان کے سامنے اپنے زندہ رہنے کی کیا وضاحتیں پیش کر سکوں گا۔ میں انھیں کیا بتاؤں گا کہ جو کچھ ہوتا رہا، وہ میرے ارادے کے بغیر ہوتا رہا۔ کاڑی میں کرشنا جی مل گئے حالانکہ ساری گاڑی میں آدمیوں سے بھری ہوئی تھی اور اب جب اس شہر سے نکلنے میں چند ہی روز یا چند ہی ہفتے کا کام باقی رہ گیا تھا تو وہ آ گئے۔ مجھے یہاں کون سا ہمیشہ رہنا تھا۔ مجھے تو آگے جانا تھا کیونکہ جب بھی میں کہیں کچھ دیر کے لیے ٹھیرتا، جی گھبرانے لگتا تھا۔ اسی لیے میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کوئی کرشنا جی ملے یا کوئی زریں یا کوئی جولین نظر آتی تو میں فوراً راستہ بدل دوں گا لیکن اب وہ آ چکے تھے۔ مجھل آ گیا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں میں زنجیریں پہنانے آ گیا تھا۔

"آپ لوگ بتائیں تو..... آپ کا سامان کدھر ہے؟" جولین نے مذبذب آمیز شائستگی سے پوچھا۔

مجھل نے سر اُٹھا کے شاید پہلی بار جولین کو غور سے دیکھا۔ وہ میری ہو گئی تھی۔ یہ کون ہے لے؟" وہ سرگوشی میں بولا۔

"یہ جولین ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جولین!" اُس نے تجسس سے دُہرایا۔

"ہنہ۔" وہ کھٹکے رہ گیا اور جولین سے مخاطب ہو کے نرمی سے بولا۔ "ہمارے پاس کوئی سامان وامان نہیں ہے تم ہماری فکر مت کرو، اپنے گھر کا کام کرو۔"

"مگر آپ یہیں رہیں گے۔" وہ نیچی نظروں سے بولی۔

مجھل چپ رہا۔ جولین اُس کے جواب کی منتظر تھی کہ معاً دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مارٹی اور ٹڈا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت اُن کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری کے قتل کی خبر جمع کے اخباروں میں شائع ہو چکی ہوگی۔ ایک ساتھ بہت سے وسوسوں نے میرے دماغ پر یورش کی۔ میں نے مجھل کے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑائی اور اُچھل کے دروازے پر جا پہنچا۔ وہ مارٹی اور ٹڈا ہی تھے۔ دونوں حواس باختہ تھے۔ انھیں اندر آنے سے روکنے کے لیے میں خود باہر چلا گیا۔ "راجا ڈارلنگ! اصلاتے پولیس لیفٹ رائٹ کر رہا ہے۔ وہ اپن کے اڈے کا بھی مبلغین سیچ کے لے گیا ہے۔" ٹڈا خوف زدہ آواز میں بولا۔

"زورا اور چھیدا کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں ابھی باہر ہے۔" مارٹی نے آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا۔ "پولو اور دوسرے اڈے کا بھی کئی لوگ پکڑا گیا ہے۔ راجا جی۔ امی جی پکی پڑے پر چلے۔ زورا اور چھیدا بولتا ہے کہ اس ٹائم استاد کو پاڑے میں ہونا مانگتا۔"

"مگر میں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "میں ابھی نہیں جا سکتا مارٹی! جولین کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چھیدا اور زورا سے بولو کہ وہ اڈے ہی پر رہیں، باہر نہ نکلیں۔ جیسے ہی موقع ملا میں اُدھر آتا ہوں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مارٹی!"

"گیسٹ سے کام کاکمہ کے تھوڑا ٹائم کے لیے اُدھر چلو راجا! پاڑے کا آدمی چھڑانے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"مجبوری ہے مارٹی! وہ اپنے مہمان نہیں ہیں۔"

"کون لوگ آ گیا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کچھ پرانے لوگ آ گئے ہیں۔ میں نے اسی لیے آج تمھیں اندر نہیں بلایا۔" میں نے دروازے کی جانب دیکھ کے کہا۔ "مارٹی! تم اس وقت چلے جاؤ۔ میں زیادہ دیر تمھارے پاس ٹھیر گیا تو ان میں سے کوئی بھی باہر آ سکتا ہے۔"

"تم آج کیسا بات بولتا ہے راجا ڈارلنگ!" مارٹی نے تجسس سے بھنچ کے کہا۔ "ایسا کون لوگ ہے؟ ابھی تم سمجھا کر دو راجا! وہ سالا تو اڈے کا لوگ بھی ٹھنڈا پوچٹ ہو گیا ہے۔ شک پڑا تو وہ ادھر آ کے گڑبڑ کر سکتا ہے۔ سالا ہر ملاقاتی میں جا کے ٹوٹلے کا کہ کون مائی کا لال نے ان کا گرینڈ فادر کا قتل کر دیا۔ ابھی تھانہ ہونا اور کپل سری ہے۔ تم شام سے چلا گیا تھا اور ابھی ہوٹل نائٹ فائٹ ہا۔ اب تم اُدھر نہیں جائیں گا تو زورا اور چھیدا بھی....."

مارٹی نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ دفعتہً کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ میں کھڑے کھڑے ڈگمگا گیا۔ "ٹڈا اچھل پڑا۔" ہلکی سی آواز گلے میں پھنس گئی۔ مجھل باہر آ گیا تھا۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟" اُس نے کچھ آواز سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جھینپ کے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ مسٹر مارٹی اور ٹڈا ہیں۔"

"کیا چکر ہے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"کوئی چکر نہیں ہے۔" میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

اُس نے مارٹی کی گردن دبوچ لی۔ "کیا ڈراما ہے ماسٹر؟"

مارٹی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "راجا استاد! اُس کی گھٹی ہوئی آواز نکلی۔ اُس کا سارا جسم پھیر کرنے لگا تھا۔

"راجا استاد!" مجھل نے برگشتگی سے دُہرایا اور مجھ سے پوچھا۔ "لاڈلے! یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ اڈے کے لوگ ہیں۔"

"کون سے اڈے کے؟ تیرا ان سے کیا ناتا ہے؟ یہ تجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" مجھل کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اُس نے ہماری کچھ باتیں سُن لی ہیں۔

"اڈے پر۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے، تم اندر جا کے بیٹھو، اس بیچ میں نہ پڑو۔"

"لاڈلے! وہ یکا یک گرج کے بولا۔" زبان سنبھال کے بات کر۔"

"کوئی بات نہیں ہے تم خواہ مخواہ....." میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "یہ میرے ساتھی ہیں۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے تو تم کیوں....."

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" وہ بلند آواز سے بولا۔

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ معمولی بات ہے۔ میں ابھی تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم اندر جاؤ۔"

"کدھر ہے تیرا پارا؟" مجھل نے مارٹی کے گلے پر گرفت سخت کرتے ہوئے پوچھا۔ اپنی چیخیں چلاتے لگا۔ "راجا جی!۔ راجا استاد! ابھی اپن کا بولے۔"

"تیری ماں کی۔" مارٹی سے لپٹ گیا تھا۔ "اسے چھوڑ دو مجھل بھائی! میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اسے چھوڑ دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"قصور کس کا ہے، یہ تو میں تجھے بعد میں بتاؤں گا جب تیری نگلیاں پھونک دوں گا۔" وہ غرایا۔ "میں نے سنا تھا تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ بتا یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "تم نے کیا سُنا تھا؟"

"میں اگر کچھ اور سُنتا تو تیرے پاس کبھی نہ آتا مگر میں..... میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"تمھیں پوری بات معلوم نہیں ہے۔"

"وہی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تمھیں ہر بات بتا دوں گا۔" میں نے لہجے کو سنبھالا۔ "انھیں جانے دو، انھیں کیوں روکتے ہو؟"

"تجھ ان کے سامنے منہ کھولتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟"

"کچھ نہیں دادا! اپن کا راجا بہت اچھا ہے۔ واہ! ایک خبر ہے دادا!"

مارٹی تڑپتے ہوئے بولا۔ "تم اس کے بارے میں بُری بات مت سوچو۔"

نجمل نے غضب ناک انداز میں مارٹی کے منہ پر پنجہ مارا۔ وہ بلبلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ نجمل کا مقصد کیا ہے۔ وہ مارٹی اور ٹنڈے کو اس لیے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ انھی کی موجودگی میں اُسے اصل بات کا پتہ چل سکتا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد میں اُسے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ نجمل کی خواہش ظاہر کرتی تھی کہ اُس نے میرے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ مارٹی اور ٹنڈے سے بہلا پھسلا کر اس بات کا پتہ چل سکتا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد میں اُسے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ نجمل کی خواہش ظاہر کرتی تھی کہ اُس نے میرے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ مارٹی اور ٹنڈے سے بہلا پھسلا کر اس بات کا پتہ چل سکتا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد میں اُسے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔

نجمل کی آواز میں میری اور مارٹی کی باتیں سُن لی تھیں تو وہ ایسی نہیں تھیں کہ نجمل انھیں درگزر کر دیتا۔ میں اُسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میرے نام سے ایک اڈا شہر میں موجود ہے۔ مارٹی اور ٹنڈا اس وقت نہ آتے تو شاید بات اتنی نہ بڑھتی مگر انھیں بھی اسی وقت آنا رہ گیا تھا۔ اب اسے کھل کے سب کچھ بتائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ "میرا اڈے میں جانا ضروری ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کس کا باڑا؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"ہم لوگوں کا۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "یہ لوگ مجھے بُلانے آئے ہیں۔ باڑے کے کئی آدمی گرفتار ہو گئے ہیں۔ علاقے میں پولیس گشت کر رہی ہے۔ میری وہاں موجودی ضروری ہے۔ علاقے میں کشیدگی کا اندیشہ ہے۔"

"تو ایک باڑا بھی چلاتا ہے؟" اُس نے وحشت سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی ضرورت تھی۔"

"مگر کس لیے؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "تم یہاں ٹھیرو۔ میں کچھ دیر بعد واپس آ جاؤں گا۔ جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں! وہاں تمھارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں ٹھیک نہیں ہے؟" اُس کی آواز کھنک گئی۔

"بس تم وہاں مت جاؤ، اچھا نہیں لگتا۔"

"بھلا کیوں لاڈلے!" اُس کا ماتھا سکڑ گیا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تُو نے اتنی چھوٹی عمر میں کتنی ترقی کی ہے۔ میں یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے وہاں نہیں جاؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟" مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے چاقو میرے کان کے بیحد قریب لے جا کر چلایا ہو۔ پھر میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے جامو اور کانتے کو آواز دے کے باہر بُلا لیا۔ جامو اور کانتے کے پیچھے پیچھے جولین اور چیپا بھی گھر سے باہر نکل آئی تھیں۔

جولین کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ نجمل نے اُن سے کیا کہا۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں بس کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ..

ہم سب ڈنڈا پکڑ کے کھڑے ہو گئے۔ بس تیز رفتاری سے سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ نجمل آگے چلا گیا تھا۔ جامو اور کانتے میرے پاس ہی تھے میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی۔ کانتے جیسے میرے کانوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ وہ چپکے چپکے مجھے بتا رہا تھا کہ نجمل میری وہ سے کتنا پریشان تھا۔ کتنے میں اڈے کا بھی وہ حال نہیں ہوا جو شمالی نے غداری کی اور موجمدار کے اڈے کا مالک بن بیٹھا۔ نجمل چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اُس نے شمالی کو نہیں چھیڑا بلکہ کسی نے شمالی کے منہ لگنے کی کوشش بھی کی تو نجمل نے اُس کی ہمت نہیں بڑھائی۔ میرے جانے کے بعد اڈے کے کاموں سے نجمل کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ "اُستاد کی وہ بات ہی نہیں رہی لاڈلے!" کانتے کہہ رہا تھا۔ "اُستاد بہت چڑچڑا اور سرکھا ہو گیا ہے۔ کبھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتا ہے اور کبھی بہت بڑی بات بھی ہو جائے تو خاموش رہتا ہے۔ اُس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات پر خفا ہو گا، کس بات پر خوش۔ کئی موٹے کے بچے شمالی سے مل گئے۔ بولتے ہیں استاد نجمل بڈھا ہو گیا ہے۔ تم سے لاڈلے! یہ سن کے خون کھول جاتا ہے۔ استاد کے خیال سے ہاتھ نہیں اُٹھتا ورنہ۔ ..." کانتے کا منہ لال ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اپنا زیادہ ٹیم اُستاد کے ساتھ ہی بتاتا ہوں۔ اپنا دھندا بھی سالا آدھا رہ گیا ہے۔ ہر مہینہ کر کے دیکھ لیا۔ اُستاد واپس نہیں آیا۔ جب اُس کا جی بہت گھبراتا تھا تو فیض آباد میں زرّیں بی بی کے پاس چلا جاتا تھا۔ ادھر اڈے کی آمدنی بھی گھٹ گئی ہے۔"

کانتے میرے کان ڈس رہا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ میں بھاگتی ہوئی بس سے چھلانگ لگا دوں۔ سب کی پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ نجمل کو بھی قرار آ جائے گا کہ میں مر گیا ہوں۔ کبھی کبھی زندہ آدمی مرے ہوئے آدمی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی موت بھی دوسروں کے سکھ کا باعث ہوتی ہے۔ میری زندگی خود مجھے بھی کون سا سکھ پہنچاتی تھی۔ کانتے اور جامو نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ میں نے کچھ سُنا، کچھ نہیں سُنا۔ ادھر نجمل کو جھٹکے پر جھٹکا لگ رہا تھا۔ اُس نے بھری بس میں انھیں لتاڑ دیا۔ پھر وہ دونوں نہیں بولے۔

بس چلتی رہی۔ مسافر کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شاید ہمارے چہرے ان سب کے چہروں سے مختلف تھے۔ وہی کپڑے پہنے اور کھینچے ہوئے چہرے۔ اُلجھا ہوا لباس اور گٹھے ہوئے جسم۔ مارٹی اور ٹنڈا ہم سے پیچھے دبکے کھڑے تھے۔ کوئی مسافر راستے میں اُترا تو مارٹی اچھلتا ہوا نجمل کے پاس پہنچا اور گھگیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دادا! دادا! اُدھر کا سیٹ خالی پڑا ہے۔"

نجمل بھر گیا۔ جیسے ٹنڈے نے اُسے چٹکی بھر لی ہو۔ اُس نے پیش کش تیکھی ہیں آتے تو بہتر تھا۔ اُٹھاتے ہیں بلنے والے لوگوں سے نجات مل جاتی۔ میں نظریں نیچی کیے آگے بڑھتا رہا تاکہ کم سے کم لوگوں سے سامنا ہو۔ لوگ خود مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیتے تھے۔ کانتے نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ نجمل خاموشی سے میرے برابر چل رہا تھا۔ جامو ہوا سے پیچھے تھا۔ ٹنڈا اور مارٹی نہ جانے کون سی گلیوں سے نکلتے ہوئے ہم سے پہلے پاڑے پہنچ گئے تھے۔ زورا، چھیدا اور پاڑے کے بہت سے لوگ عمارت سے باہر گلی میں ہمارے منتظر تھے۔ جیسے ہی ہم گلی میں داخل ہوئے۔ اُن سب نے ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا اور جھکتے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔ میں انھیں پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور پاڑے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ تھینگا کے جانے کے بعد عمارت پر رنگ و روغن کر دیا گیا تھا اور اس کی شکل نکل آئی تھی۔ سب جیرت زدہ اور سراسیمہ تھے۔ ہم اندر جا کے بیدکی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر میں نے ہی زبان کھولی۔ "یہی پاڑا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ نجمل نے اپنا بھاری ہونٹ چبایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے منہ دم گھٹ گیا ہو۔ "اور یہ زورا ہے۔ یہ چھیدا ہے۔ یہ ..." میں نے اُسے وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کے نام بتانے شروع کیے۔ نجمل بہت بنا بیٹھا رہا۔

"تم نے اپن کے نام تو بول دیے راجا جی! پر دادا کون ہے؟" زورا نے اچنبھے کے ساتھ پوچھا۔

"اپن کو بھی تو دادا کے بارے میں کچھ بولو نا۔"

"یہ اُستاد نجمل ہیں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"اُستاد نجمل!" اُن سب نے حیرت اور مرعوبیت سے دہرایا۔

"میرے ... میرے سب کچھ ہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "اور یہ اُستاد جامو ہیں اور یہ کانتے ہے۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ "اپن یہیں کب آئے؟" کسی نے پوچھا۔

"آج سویرے۔" میرے بجائے جامو نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کے بارے میں راجا جی کبھی کچھ بولتا نہیں۔ اپن کو خبر ہوتی تو سب فیشن چلتے۔" زورا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے بولا۔

"ہمارا آنا اچانک ہوا۔" جامو نے نرمی سے کہا۔

"سب بھلی تو ہے؟" کا سوسے راتو دارالانظار میں پوچھا۔

"ہاں سب خیر ہے۔" جامو نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اپن کے لیے کوئی کام ہو تو بولو۔ تم راجا جی کا مہمان ہو تو اگی پاڑے کا مہمان ہو تو اگی علاقے کا مہمان ہو۔ اگا سنی کا مہمان ہو۔ راجا جی کے لیے اپن کا جان حاضر ہے۔" چھیدا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" جامو نے کسی قدر تندی سے کہا۔ "ہم اپنے راجا بہادر کو دیکھنے آئے ہیں۔"

"راجا جی کا کیا بولو۔" استاد چھگن لال نے لیا ناچ کر ایا کہ اپن دیکھتا

رہ گیا۔ اپن نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔ لودر وہ سالا بالم خان بھی بہت تڑی مار سا تھا اپن کا راجا کے دوچار ہاتھوں میں کٹی ہو گیا۔ راجا تو راجا ہے جامو دستاد! جب سے ایدپاڑے میں بیٹھا ہے ٹھلنے کا بھی لوگ بین کا مُرلی بجاتا ہے اور آجو باجو کوئی نہیں جو راجا کی آنکھ سے آنکھ لڑا سکے۔ راجا تو۔۔۔" پھیدا روانی میں بکے جا رہا تھا۔

"بس۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "بس۔"

"ابھی اپن نے کچھ بھی نہیں بولا راجا۔۔۔"

"بولتے رہو۔" یک لخت گنگی ٹھل کی گرجتی ہوئی آواز ابھری۔ "مُڑا اپنی کے زور کی کرسی کے پیچھے چلا گیا۔ پھیدا پلکیں جھپکانے لگا۔ "بولتے رہو۔" ٹھل نے دوبارہ تیز آواز میں کہا۔

"دادا!۔ دادا!" پھیدا نے مدافعت خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اپن کر نہیں سالم نے تمھارے حکم کا کیا مطلب ہے۔ اپن نے جو بولا ہے سچ بولا ہے۔ سالم ایدبمبئی میں آڑی کرتے ہوئے بال پر چاندی بننے لگا۔ پر اپن نے راجا جیسا کوئی استاد نہیں دیکھا۔ اپن سو بار بولا کہ راجا آگے بڑھو، تم تو آگ سٹی کا راجا بنیں گا۔ پر راجا اپنے پاڑے سے باہر نہیں نکلا۔ اُس سالا بالم کا بڑا ٹیم آگیا تھا۔ تبھی راجا کا آدمی پھیر دیا۔ دادا! راجا وہ پہلا پاڑا ماسٹر ہے جس نے پاڑے کا ایک پیسہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک بات ہو تو بولوں۔۔۔ باتوں کا ڈھیر ہے۔"

پھیدا باتیں کر رہا تھا تو سبھی کی نگاہیں ٹھل کی جانب مرکوز تھیں مگر ٹھل کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ آنکھیں میچے پھیدا کی باتیں سُنتا رہا۔ پھیدا خاموش ہوا تو ٹھل نے اپنی غنودہ آنکھیں کھولیں، اُن میں سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اُس نے پھیدا سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اسی اثنا میں پاڑے کے کئی آدمی تھیلوں اور ٹوکروں سے لدے پھندے سے اندر داخل ہوئے۔ درمیان کے چبوترے پر پہلے جہاں کبھی جھنگا بیٹھا تھا اور اب میں بیٹھنے لگا تھا اور میری مدام موجودی میں زورا یا پھیدا بیٹھتے تھے۔ اُسی چبوترے پر دیکھتے دیکھتے تمام چیزیں بچھ دی گئیں۔ مُڑا چبوترے پر پھدکتا پھر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پاڑے کے لوگ کھانے پینے کے کسی ہر گو کان سے کوئی نہ کوئی چیز اُٹھا لائے ہیں۔ چبوترے پر بیٹھنے کی جگہ بھی مشکل سے رہی تھی۔ زورا نے ٹھل کو چبوترے پر چلنے کے لیے کہا۔ اُس نے انکار نہیں کیا۔ یہ سامان پوری ایک برات کے لیے کافی تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی پھیدا کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ میں اور ٹھل بس اُن کا ساتھ دینے کے لیے ٹونگنے رہے۔ جامو اور کانتے نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ اُن کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔

میرا دماغ خالی خالی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے یا غلط؟ ٹھل کی غیر متوقع آمد پر اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ یہ دوپہر کا کھانا تو نہیں تھا مگر اس کے بعد کھانے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔ ظلمت میں باقاعدہ سکونتی کرے موجود تھے۔ اُن میں پاڑے کے بعض آدمی مستقل قیام کرتے تھے۔ کھانے کے بعد سفر کی تھکن دُور کرنے کے لیے ٹھل سے کمرے میں چلنے کو کہا گیا مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ البتہ جامو اور کانتے اُس کی اجازت سے مارٹی اور ڈرسے کے ساتھ باہر چلے گئے۔ پاڑے کے باقی لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ صرف زورا اور پھیدا رہ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چلے جائیں تاکہ میں ٹھل سے کوئی بات کر سکوں اور اُسے بتا سکوں کہ جو کچھ اُس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہ محض اس کے وقت سے پہلے یا بعد میں آنے کا اتفاق ہے۔ میں نے ابھی زورا اور پھیدا کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ نہیں کیا تھا کہ پاڑے کا نوجوان لڑکا ننھے بوکھلایا بوکھلایا انداز میں آیا۔ اُس نے ٹھل کو دیکھا تو ٹھٹک کے زورا کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ زورا اُس کے پاس پہنچا۔ ننھے نے اُس کے کان میں کوئی اہم بات کی۔ زورا کا چہرہ اچانک تمتمانے لگا۔ ننھے کا انداز بتا رہا تھا کہ بات کی نوعیت معمولی نہیں ہے۔ زورا فوراً پھیدا کے پاس گیا اور پھیدا بھی سے پاس آیا۔ ٹھل کے سامنے یہ کانا پھوسی مجھے عجیب لگی لیکن نہ جانے وہ کیا بات تھی جس سے زورا اور پھیدا مضطرب ہو گئے تھے۔

میں نے پھیدا کی سرگوشی بظاہر لاپروائے تحمل سے سُنی تھی مگر اب مجھ سے ایک پہلو نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ زورا اور پھیدا فوراً باہر جانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں روک لیا اور ننھے کو ہدایت کی کہ وہ پاڑے کے تمام آدمیوں سے فوراً فوراً کہہ دے کہ کسی غیر ضروری جھگڑے سے پرہیز کیا جائے۔ ننھے چلا گیا۔ "ہم نہیں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "کیا فتنہ ہے لاڈلے!" ٹھل کی تمسخر بھری آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے دادا!" پھیدا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا ہے لاڈلے! تو ہی بتا۔"

"پرسوں یہاں ایک سیٹھ شمبھو داس اور اُس کے ماں دگرو ھاری کا قتل ہو گیا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "شمبھو سیٹھ بہت مال دار تھا۔ بمبئی میں ہر جگہ اُس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ شمبھو کا کام تیواڑی دادا کرتا تھا۔ تیواڑی دادا نے دھمکی بھیجی ہے کہ سیٹھ شمبھو کے خون کے بدلے کے لیے تیار ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دھمکی اُس نے دوسرے اڈوں کو بھی بھیجی ہو۔ سُنا ہے کہ تیواڑی کا اچھا خاصا بڑا اڈا ہے اور وہاں کسی بات میں کوئی مار نہیں ہے۔ تیواڑی دادا شاید یہ جاننا چاہتا ہے کہ تنکا کس کی داڑھی میں نکلا ہے۔"

"اور سیٹھ شمبھو کو اپنے راستے سے ہٹایا کس نے ہے؟" ٹھل نے ہم تینوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم نے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"راجا!" زورا اور پھیدا نے ایک ساتھ احتجاج کیا۔

"ہاں تنکا تو تم سب کی داڑھیوں میں نظر آ رہا ہے۔"

"راجا نے نہیں دادا! شمبھو کو اپن نے ختم کیا ہے۔"

"پورا جاکے بولنے پر۔" ٹھل آہستگی سے بولا۔

"ہاں! میری ہدایت پر۔" زورا اور پھیدا کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے ٹھل کے کہا۔ "میں نے ہی ان سے کہا تھا۔"

"مگر دادا! کام بہت صاف ہوا۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ سالا پولیس کا باپ بھی اپن تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"مگر تیواڑی پہنچ چکا ہے۔" ٹھل نے زہر خند سے کہا۔

پھیدا اور زورا جز بز ہونے لگے۔ اُن کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، جواب صرف میرے پاس تھا۔ تیواڑی کی دھمکی خاص طور پر اس لیے کے استاد کو دی گئی تھی۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ تیواڑی اپنے بیٹے کے قتل کے متعلق کوئی رائے قائم کر چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا اور جس نے ایک بار ٹرین میں دوسری بار کلب میں اُن کی جان بچائی تھی۔ چونکہ میں نے زیادتی سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اُس نے بھی مجھ پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا ہو گا مگر اب۔۔۔۔ اب کوئی خفیف سا شبہ ہی اُن کے قدم روک لینا ہو گا۔ وہ کسی وقت بھی اس طرف آ سکتے تھے۔ جب ان کا شبہ یقین میں بدل جائے گا یا علاقے پر پولیس کا دباؤ کم پڑ جائے گا۔ پھر وہ کوئی اور صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ تم پہلے جا کے سیٹھ نور بھائی سے کہو کہ وہ علاقے کے گرفتار شدہ آدمیوں کو اپنی ضمانت پر رہا کرانے کا انتظام کریں۔" میں نے پھیدا کو ہدایت دی اور زورا تم تھانے جا کے اپنے آدمیوں کا غیر محسوس طریقے سے پتا لگاؤ کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو پہنچاؤ۔"

زورا اور پھیدا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ ٹھل کے سامنے اُن سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جاتی تو خواہ مخواہ کی پھیلا ہوتی۔ مجھے زورا پر اعتماد تھا اور پھیدا پر اعتماد تھا اور یہ اندیشہ نہیں تھا کہ گرفتاری کے بعد پولیس کی مار انھیں کمزور کر دے گی۔ اسی لیے پاڑے کے ہاتھ سے آدمیوں میں سے میں نے انھیں منتخب کیا تھا لیکن اُن کے ناخن پر زیادہ زور نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ یہ تاکید مجھے ٹھل ہی نے کی تھی۔ اب میں اور ٹھل تنہا رہ گئے تو میں نے اُس سے بات کرنے میں خود پہل کرنی چاہی مگر لفظ میرے حلق میں پھنس کے رہ گئے۔ وہ لگاتار میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھا تھا۔ مجھ سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ مجبوراً میں نے اُسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ ٹھل کا چہرہ کھنچ گیا اور وہ انگلیاں مروڑنے لگا۔ "لاڈلے! مسئلہ کیا ہے؟" وہ اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"جو تم دیکھ رہے ہو۔" میری زبان ہکلانے لگی۔

"مگر میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔" وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ "لاڈلے! میری جان! میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"میں تو بھی نہیں چاہتا تھا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"پھر یہ کیوں ہے؟" اُس کی آواز پھٹنے لگی۔ "تیرے پاس تو بڑی دولت تھی۔ تُو نے آزاد پنچھیوں کو پنجرے میں ڈال دیا تھا۔ تُو امتحان میں اوّل نمبر آتا رہا مگر تجھے کیا ہو گیا لاڈلے! مجھے کیا ہو گیا تھا رے! اگر یہی بات تھی تو لگتے کا اڈا کیا کم تھا۔ تُو مجھ سے کہتا تو میں وہاں سے ہٹ جاتا۔"

مجھے معلوم تھا کہ تم یہی باتیں کرو گے تمھیں یہی باتیں کرنی بھی چاہئیں لیکن تمھیں نہیں معلوم کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ ممکن ہے تم مجھ سے اتفاق نہ کرو مگر مجھے اس کی فکر نہیں ہے کیونکہ میں نے وہی کیا ہے جو میرے دل اور دماغ نے کہا تھا۔ میں تمھارے پاس سے چلا آیا تھا اور اس لیے چلا آیا تھا کہ مجھے چمپا بائی سے اپنے گھر والوں کا پتہ پوچھنا تھا۔ ویسے تم اور جامو بھی کچھ تاخیر سے سہی، چمپا بائی کو ڈھونڈ کے اُن کا پتہ چلا سکتے تھے لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ نتی اور میرے گھر والوں کی نشان دہی کسی اور کو ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ چمپا بائی ملے گی تو نہ جانے کیا کیا باتیں کھلیں گی۔ جامو اور کتن خان اور دوسرے لوگ اُس سے نہ جانے کس کس طرح اور کیا کیا اگلوا لیتے۔ نتی کے بیوی میں گھنگرو دیکھے سے پہلے گھر والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ میں اُن سے دوبارہ کوئی رابطہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔" میری آواز بھرا گئی۔ ٹھل کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے دبا لیا تھا۔ "مختصر یہ کہ میں چمپا بائی کو ڈھونڈتا ہوا اگرے پہنچ گیا۔ چمپا بائی نے بتایا کہ اُس نے نتی کو بمبئی سے حمال کیا تھا۔ میں اُسے جبراً اپنے ساتھ بمبئی لے آیا اور۔۔۔" میں نے ٹرین میں کرشنا جی کے ملنے، بمبئی میں آبا جان کی تلاش میں ناکامی، چمپا کی واپسی کی ساری روداد تفصیل سے اُسے سُنا دی۔

"پھر تُو واپس کیوں نہیں آگیا؟" ٹھل نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پھر میں نے سوچا کہ اب کہاں جاؤں گا، جہاں جاؤں گا لوگوں کو پریشان کروں گا۔ ابھی تو وہ نہیں ملی تھی کہ ابا جان بھی لاپتہ ہو گئے۔ میرا بھی کسی جگہ نہیں لگتا تھا۔ میں اسی شہر میں پڑا رہا۔ ایک دن اچانک جوہو کے ساحل پر کرشنا جی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور مجھے مسلسل نادم کرتے رہے۔ انھوں نے میرے کپڑے بنوائے، مجھے بڑے لوگوں کے کلب میں لے گئے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے، بالکل اپنا بھائی، اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ہر بار کرشنا جی کے خیال نے قدم روک لیے۔ میں نے انھیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انھوں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تو انھوں نے یہ ذکر ہی چھوڑ دیا۔ ابھی مجھے وہاں رہتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ کرشنا جی کچھ پریشان پریشان نظر آنے لگے۔ میں ایک دن اُن سے کچھ بتیر گھر سے نکل گیا اور باندرا کلا کے علاقے میں پہنچ گیا۔" میں نے مستانہ کا سارا واقعہ، چھاپے، گرفتاریاں، لڑکی کی واپسی، اخبارات کے تذکرے، کرشنا جی کی شہرت اور شہر میں اُن کے چرچوں کا حال اُسے سنایا۔ اس واقعے کے بعد کرشنا جی مجھے اور عزیز رکھنے

لگے۔ پھر ایک مرتبہ اُن پر کلب میں حملہ ہوا۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی وہ لٹیرے ڈاکوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُن کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ میں نے کئی بار انھیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا مگر انھیں اپنا کام اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ہر وقت فائلوں میں گھرے رہتے تھے۔ کلب کے حملے کے بعد ہم گھر لوٹے تو چمپا بائی ہمارا انتظار کر رہی تھی میں اُسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میں نے اُس پر بہت زور دیا کہ وہ واپس چلی جائے۔ چمپا بائی تو تیار ہو گئی تھی مگر کرشناجی نے اُسے روک لیا۔ چمپا نے اپنی روش بدل لی تھی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کرشناجی کو کچھ نہیں بتائے گی جب کرشناجی ہی اُسے گھر رکھنے پر آمادہ تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ویسے بھی کسی نہ کسی دن مجھے وہاں سے جانا ہی تھا۔ بس میں تھیں کیا بتاؤں کہ کیا کیا ہوتا رہا۔ میں روز نکلنے کی تدبیر کرتا تھا اور روز ارادہ بدل دیتا تھا۔ میں ہر وقت یہی سوچتا تھا کہ اب کس طرف جاؤں۔ پھر ایک دن کرشناجی میرے لیے جولین کو لے آئے۔ میں انھیں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھے پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں انھیں سچی بات بتا دیتا تو وہ سوالات کرتے کرتے میل تک پہنچ جاتے مگر میں کرشناجی کو غلط سمجھا تھا۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ جولین نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہے۔ اُس کا باپ بیمار تھا۔ میں روز اُسے گھر چھوڑنے جانے لگا۔ کلی کے لڑکے ہم پر آوازے کسنے لگے چنانچہ ایک روز مجھے اُن سے بات کرنے کے لیے رکنا پڑا۔۔۔۔"

تجمل میرے اور قریب کھسک آیا تھا۔ میں نے اُس سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ تجمل نے درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، نہ ہوں ہاں کی، نہ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ میں تو جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ بس مجھے اُس کی گہری سانسیں سنائی دیتی رہیں۔ "میں نے کرشنا جی کو بتا دیا تھا کہ پولیس افسر جسونت اپنے ایک ساتھی سے اُن کے متعلق کیا باتیں کر رہا تھا۔ وہ بولے تم نے یہ سب کیسے سن لیا؟ میں نے انھیں یقین دلانے کے لیے بتا دیا کہ میں انگریزی سمجھتا ہوں۔ اس پر وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے لے کے کمرے میں ناچنے لگے اور وہ بات بھول گئے جو میں نے اُن سے کہی تھی۔ میں نے دوبارہ اُن کی توجہ جسونت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹا کے یہاں سے اپنے گھر مدراس چلے جائیں گے مگر دوسرے ہی دن وہ سڑک پر تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں آئے۔"

"میں نے اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو کرشناجی کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ کرشناجی ایک فرض شناس اور دیانت دار پولیس افسر ہیں۔ انھیں بچانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے بہت دعا کی، اے خدا! اُن کے بجائے میری جان لے لے۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جن لوگوں نے کرشناجی کو مارا ہے، اُن سے میں ضرور سمجھوں گا۔ میں نے کرشناجی کا چہرہ یاد کیا ہوا جسم دیکھا تھا اُن کی آواز۔۔۔۔ مرتے وقت اُن کی آواز میں نے سُنی تھی۔ "میرا سینہ پھٹنے لگا۔ میں بلک بلک کے رونے لگا۔ تجمل نے مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے اور رونا آ گیا۔

"لاڈلے! لاڈلے! اے لاڈلے!" وہ مجھے تسلی دے رہا تھا مگر خود اُس کی آواز بھرّا رہی تھی۔

"کرشناجی چلے گئے۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے جانی!" اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے دائیں سے میرا چہرہ خشک کرنے لگا۔ "لاڈلے! جانا سبھی کو ہے۔ اپنا سکندر بھی چلا گیا، رستم پہلوان بھی مر گیا، اُس کا بیٹا سہراب بھی خاک ہو گیا۔ بڑا بڑا بادشاہ مر گیا۔ بڑا بڑا پھنے خاں مر گیا۔ تو بھی ایک دن مرجانے گا، میں تجھ سے پہلے چلا جاؤں گا۔ کچھ آنسو اور لوگوں کے لیے بھی رکھ۔ آدمی کو تمام آنسو ایک ہی ماتم بر باد نہیں کرنے چاہئیں۔ ان کی بار بار ضرورت پڑتی ہے۔"

"مگر کرشناجی بہت اچھے آدمی تھے تجمل بھائی!"

"پیر پیمبر اٹھ گئے لاڈلے! یہ تو دنیا ہے پرائے جانی!"

"وہ بہت اچھے تھے تم نے انھیں نہیں دیکھا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں نے تیری آنکھوں میں اُسے دیکھ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے لاڈلے! وہ بہت اچھا آدمی ہو گا، تیری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"میری آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ میں نے انھیں نہیں پہچانا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "میں اُن سے اپنے آپ کو چھپاتا رہا۔ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ چمپا نے وعدہ خلافی کی تھی اور انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ چپکے چپکے اپا جان کو تلاش کرتے رہے۔ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے بتایا۔۔۔۔ انھوں نے مجھے لاڈلے کے نام سے پکارا تھا، کہا تھا۔ لاڈلے! مجھے افسوس ہے۔۔۔۔"

"آگے بات کر لاڈلے!" تجمل اضطراری لہجے میں بولا۔

"آگے پھر کیا تھا۔" جسے جانا تھا، وہ چلا گیا۔ سارا گھر اجڑ گیا۔ اُن کی ایک ماں تھی۔ اُس نے ارتھی سے سر کٹایا تو پھر اُٹھایا نہیں۔ دونوں کو ایک ساتھ جلا دیا گیا۔ شروع شروع میں بڑا چرچا رہا۔ اخبار بھی کھتے لمبے چلے ہوتے ہے، اسطاہرے ہوتے مگر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایس پی شکلا کرشناجی کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ روز گھر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کرشناجی اپنی تمام جائداد میرے نام کر گئے ہیں۔ وہ مجھے مدراس لے گیا۔ اپا جان اُدھر خزانے کی تلاش میں نہ جانے کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں اور بیٹے پر دولت کی بارش ہو رہی ہے۔ کرشناجی کی تمام جائداد بیچ کے ساڑھے آٹھ لاکھ روپے میرے

نام سے بینک میں جمع کر دیے گئے۔"

"لاڈلے!" تجمل نے حیرت سے کہا۔

"میں نے یہ دن ضائع نہیں کیے تجمل بھائی!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے دولت بنائی ہے۔ میں لکھ پتی آدمی ہوں۔ اُدھر زمینوں کی حویلی اور جاگیروں کا بھی میں ہی مالک ہوں۔ تم بھی اپنا تمام پیسہ میرے نام کر دو۔"

"لاڈلے! تو نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔ کلیجا چھلنی کیے دیتا ہے، بس کر۔ میں نے تو تجھے نہیں سکھائی تھیں یہ باتیں۔ تو تو مجھ سے بڑا چاتو باز نکلا، تیرا چاتو تو نظر بھی نہیں آتا۔"

"تم جو چاہے کہہ لو، میں نے تم سے تقریباً ہر بات کہہ دی ہے۔ یقین کرو میں نے کرشناجی کی ارتھی پر عہد کیا تھا کہ میں اُن کے گنہگاروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وصیت کا تو مجھے بعد میں پتہ چلا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ مجھ سے صفائی مت کر۔"

"میں ایسا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ شہر میں میرا ایسا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ مجھے بہت اثر و رسوخ کا آدمی تھا اور مجھے بہت سے لوگوں نے کرشناجی کے ساتھ دیکھتے ہوئے اور اُن کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا میں نے خاصا وقت گزارا تاکہ انھیں کرشناجی سے میرا تعلق جھولنے کا وقت مل جائے۔ پھر مجھے انھیں تلاش بھی کرنا تھا کہ وہ کون ہیں جو مجھ کو آلۂ کار بنا رہے تھے۔ میں کس سے پوچھتا۔ بتاؤ، میں کس سے پوچھتا کہ کرشناجی کا قاتل کون ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی پاڑے میں آنے کی ضرورت تھی، آدمیوں کی ضرورت تھی۔ سو مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ میں نے تجھ کو مار دیا ہے تجمل بھائی! تیرا ڑی ابھی باقی رہ گیا ہے۔ جب تک میں اُس کا خون نہیں دیکھ لوں گا، کرشناجی کی روح مجھ سے شکایت کرتی رہے گی۔ میں نے تجھ کو پہلے اس لیے مارا کہ وہی بنیاد تھا۔ میں نے سوچا پہلے اُن کی بنیاد اُکھاڑ دوں۔ سمجھے تم؟ مجھے ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو دنیا ہی سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"لاڈلے!" اُس نے میری گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ "میرے طوطے! تو مجھے بھی تو بتا سکتا تھا۔ تو اکیلا کیوں رہا؟ کیا میں مر گیا تھا؟ کیا ہم سب مر گئے تھے؟"

"مگر تجھ سے ساتھ بھی وہی سلوک رہتا۔ پہلے تو یہ بات طے کرنی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اور یہ پہچان کسی اڈے کے بغیر ممکن نہیں تھی اور تم تو یہاں موجود ہی نہیں تھے۔"

"میں۔۔۔!" وہ چیخ کر بولا۔

"ہاں تم۔۔۔! یہ سب کچھ تھی نے تو مجھے دیا تھا۔"

"گال دے رہا ہے لاڈلے!"

"تم مجھ سے ایسی اُمید رکھتے تھے۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"نہیں لاڈلے! نہیں، میرا دماغ چل جائے اگر میں ایسا سوچوں۔ لاڈلے! میں نے تجھے اور بہت سی باتیں بھی تو بتائی تھیں۔ میں نے کہا تھا چاقو ہر جگہ نہیں چلتا اور دوست کی کینگی ہمیشہ سامنے رکھنا۔"

"میں کوئی بات نہیں بھولا۔ مجھے سب یاد ہے تم نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ کبھی کبھی چاقو سے اپنی انگلی بھی کاٹ لینی چاہیے اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ چاقو اُن لوگوں کو نہیں اُٹھانا چاہیے جو زمین کے اُوپری حصے سے محبت کرتے ہوں۔"

"ہاں! میں نے کہا تھا۔" وہ کرب سے بولا۔ "لاڈلے! تو مجھے ایک اشارہ کر دیتا، تجھے میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر چمپا جامو کو خط نہ لکھتی تو میں تیری صورت دیکھنے ہی کی آرزو میں مر جاتا۔"

"چمپا نے جامو کو خط لکھا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ میری طرف سے ناامید ہو گئی تھی۔ ڈیڑھ دو روز گھر سے غائب رہنے لگا تھا اور کچھ بتاتا بھی نہیں تھا اور وہ دو تولوں لونڈے تیرے پاس گھر گھر آتے تھے۔ وہ کبھی خط نہ لکھتی مگر جب مجبور ہو گئی تو اُسے جامو کو لکھنا پڑا۔"

"چمپا نے تمھیں بھی تنگ کیا۔ وہ ایسی ہی ہے، پہلے تمھی کو کوٹھے پر بٹھایا۔ پھر میرے پیچھے پڑ گئی اور کرشناجی کو سب کچھ بتا دیا اور اب تمھیں۔۔۔۔۔"

"عقل مت کر۔ جو معافی مانگ لے اُس کے لیے دل بڑا کر لینا چاہیے۔ وہ عورت کیا کر سکتی تھی۔ اُس نے تیرے بھلے ہی کے لیے جامو کو لکھا تھا۔ چمپا کو معاف کر دے لاڈلے! یہ سارا گرد کھڈ دھندا ہے۔ تو کس کس کا گریبان پکڑے گا اور کہاں کہاں جا تو نچائے گا۔ ہو سکے تو اس دُنیا کو آگ لگا دے۔"

"وہ سامنے رہتی ہے تو مجھے تمھی یاد آنے لگتی ہے۔"

"اتنی بڑی معافی کوئی نہیں مانگتا۔ زیادہ تو سوچ لے کہ اُس کا کیا قصور تھا۔ جانے دے لاڈلے! میری خاطر، تمھی کی خاطر اور اُس کی خاطر جس کے لیے تو نے اپنا یہ حال کر رکھا ہے۔ جانے دے۔ کوئی اور بات کر۔ یہ بتا کہ تو نے تیراڑی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے تھمی سے کہا۔

"اب تو بے فکر ہو جا، میں آ گیا ہوں تیرا عہد پورا ہونا چاہیے، وہ ضرور پورا ہو گا چاہے مجھے باقی عمر جیل ہی میں گزارنی پڑے۔"

"تو پھر بات ہی کیا ہوئی، یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"تو تو بڑا شیر ہے، شیر ببر۔ مگر تجھے کیا ضرورت پڑی ہے میں جو موجود ہوں۔ تو کہے تو میں ابھی اُس کا سر کاٹ کے لے آؤں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"دیکھ لاڈلے! شمبھو کو مارنے کے بعد اُٹھنے تیراڑی کو ویسے بھی اوجھا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لونڈا گیری پر اُتر آیا ہے۔ ذرا صبر کر لے پھر سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔ ویسے جو تو چاہے وہی ہو سکتا ہے۔"

"میں کرشنا جی کے قاتل کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے لاڈلے! ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"اب کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ مجھے جانا ہے۔"

اُس نے شاید میری بات نہیں سُنی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک کھلی آنکھوں سے جیسے سو گیا۔ پھر ایک دم چونک کر سے اٹھ بیٹھا اور میری گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے پاڑے میں گھومتا رہا۔ اُس نے پاڑے کا وہ حصہ بھی دیکھا جہاں زور ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی وہاں چند آدمی زور آزمائی میں مصروف تھے۔ مجھل وہاں چند ہی لمحے ٹھہرا اور پاڑے سے باہر آ کے گلی کے نکڑ تک چلا آیا جہاں معمول نکڑ پر پاڑے کے تین چار آدمی موجود تھے۔ اُدھر سے جامو اور کانتے واپس آ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا اور لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کانتے نے آنکھیں مسلنی شروع کر دی تھیں۔ جامو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مُنڈا کانتے کی ٹانگوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ سامنی جامو اور کانتے پیچھے کھڑے تھے۔ مجھل نے مادھی کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ مادھی نظریں جھکائے جھجکتا ہوا اُس کے روبرو پہنچا تو مجھل نے نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ "امڑا میرے لیے حقے کا انتظام کر۔"

- دادا! "مادھی نے سنتے ہی اُسے پکارا اور اُس کی پنڈلیاں پکڑ لیں۔ مجھل نے مادھی کے بال پکڑ کے سر جھنجھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کے مُنڈا بھی اُچھلتا ہوا مجھل کی ایک ٹانگ سے لپٹ کے رونے لگا۔ مجھل نے اُس کی گردن میں پنجہ ڈال کے اُسے اٹھایا اور زمین پر چھوڑ دیا۔ مُنڈا قلابازیاں کھاتا، اُچھلتا کُودتا ہوا مادھی کے ساتھ چوک کی طرف بھاگنے لگا۔

✿ شام کو مجھل درمیان میں گاؤ تکیے کے سہارے چوکے پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں جامو اور کانتے تھے۔ پاڑے کے پُرانے لوگ بھی چوکے پر اُس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھل کے آگے بادام اور پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چوکے کے نیچے بھی پاڑے کے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ علاقے سے اچھی خبریں نہیں آئی تھیں۔ سہ پہر کو مجھل میرے ساتھ بالم خاں سے حاصل کیا ہوا اڈا بھی دیکھ آیا تھا۔ علاقے میں پولیس موجود تھی معلوم ہوا کہ تیلاڑی کے کئی آدمیوں نے علاقے میں گڑبڑ کرنے اور خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی مگر پولیس موجود تھی اس لیے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے، بردباشت کریں۔ پاڑے کے گرفتار لوگوں کی ضمانت کل تک کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ مجھل کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پاڑے میں اور اس کے آدمیوں کے درمیان عرصے سے رہ رہا ہو۔ رات ہوئی تو اُس نے مجھے حکم دیا کہ میں کانتے کو اپنے ساتھ لے کے گھر چلا جاؤں۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلے مگر وہ وہیں ٹک گیا۔ میں رات وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا دن بھر تیلاڑی کے آدمیوں کی جلی بے جا دھمکیاں کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ مجھل نے سختی کے ساتھ مجھے گھر واپس جانے کا حکم دے دیا۔ پاڑے کے لوگ بھی میری طرف سے کچھ بے نیاز سے ہو گئے تھے اور مجھل کے گرد جمع لگا ئے بیٹھے تھے۔ مجبوراً مجھے کانتے کو لے کے گھر آنا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھل زیادہ مشتعل نہ ہو جائے۔ وہ یہاں بمبئی میں اجنبی ہے۔ میں نے تیلاڑی کی بابت اُسے ہر بات بتا دی تھی۔ پھر بھی مجھل سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کیا کر بیٹھے۔ پاڑے کے لوگ بھی اُسے برانگیختہ کر سکتے تھے۔ میں وہاں سے چلا تو آیا لیکن میرا دل وہیں اٹکا رہا۔

اُنھوں نے ہماری آہٹ ہی سُن کے دروازہ کھول دیا۔ جولین نے اپنے سینے پر فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ چمپا کے ہونٹ بُدبُدانے لگے۔ دونوں بہت بے چین تھیں۔ "وہ کہاں ہیں؟" جولین نے سرگوشی سے پوچھا۔

"وہ کہیں اور بیٹھ گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سب خیریت تو ہے۔"

"ہاں مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"بس کیا بتاؤں۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"تمھارے لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں ہے۔" وہ ترشی سے بولی۔

کانتے میرے ساتھ تھا، چمپا بھی موجود تھی۔ میں نے اُسے زیادہ ضد بحث نہیں کی۔ جولین کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اتنی دبلی اور کمزور ہو گئی تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ میں کانتے کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ہمارا کھانا بھی وہیں آ گیا۔ کانتے میرے برابر کے بستر پر لیٹ گیا اور فیض آباد سے میرے جانے کے بعد کا تمام حال سنانے لگا۔

"زرینہ کیسی ہے؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"بی بی تو اچ بی بی ہے لاڈلے! میں نے اسی اچھی لڑکی نہیں دیکھی۔ اُستاد کے ساتھ میں اُسی کی حویلی میں بیٹھتا تھا۔ کیا مجال جو آنکھ اٹھا کے دیکھ لے۔ ہمیشہ نظریں نیچی رہتی ہیں اور دو بات سر پہ۔ مجھے بھائی کہتی ہے کانتے بھائی۔ جب وہ مجھے بھائی کہتی ہے لاڈلے تو میرا جی چاہتا ہے اپنی چھاتی میں چاقو مار لوں۔ اُس پر ساری دُنیا کی دولت لٹانے کو جی چاہتا ہے۔ پر میں اپنی جان ہی اُس پر نچھاور کر سکتا ہوں۔ جب تو نکلا ہے بی بی نے کبھی تیرا نام نہیں لیا۔ کبھی اُستاد سے تیرا نہیں پوچھا وہ اُستاد کے آنے سے اتنی خوش ہوتی ہے کہ بس بتا نہیں جا سکتا۔ اُستاد نے جب بھی تیرا ذکر اُس کے سامنے کیا۔ وہ اُٹھ کے چلی گئی۔ ذکر اذکار تاتی تھی کہ وہ چپکے چپکے روتی رہتی ہے۔ لاڈلے! کیا تجھے بھی وہ یاد آتی ہے؟"

"آتی ہے۔" میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

"آتی ہوگی ضرور آتی ہوگی۔" وہ مچل کے بولا۔ "وہ یاد آنے کی چیز ہے۔ پہلا ڈلے تو نے اُسے ایک خط ہی لکھ دیا ہوتا۔"

"کانتے! ایسی باتیں مت کر۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"کیوں لاڈلے! - کیا تیری اُس سے لڑائی ہو گئی تھی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "کچھ اور بات کر۔ آپا رے ٹاپس چلتے ہیں۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے۔"

"اُستاد نے حکم دیا ہے کہ رات گھر ہی گزاری جائے۔"

مجھ سے ایک پل بھی نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ کانتے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ اُس پر طویل سفر کی تھکن سوار تھی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک میں یوں ہی بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اندر جھانکا تو جولین ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اُس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کرسی پر گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ میں دیر تک وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زرد ساڑی کا پلو کرسی کے بازو پر گرا ہوا تھا۔ روشنی میں اُس کی ٹھوڑی اور ہونٹ چمک رہے تھے۔ میں قدموں سے اُس کے پاس پہنچا۔ اُس کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ چار ہی دن پہلے اس گھر میں موت ہوئی تھی اور مجھے اُس کے باپ کے جنازے میں شریک ہونے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ میری آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا گئی۔ "کیسی طبیعت ہے تمھاری؟" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے انگریزی میں بولی اور اپنی ساڑی کا پلو درست کرنے لگی۔ "تم سوئے نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔

"کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟ دبا دوں؟"

"نہیں۔ درد نہیں ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں اُس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تم کیوں نہیں سوئیں؟"

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"تو میں دبا دوں؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"تم!" اُس کی آواز کانپ گئی۔ "نہیں نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس نہیں۔" وہ کھسیاتی ہوئی بولی۔

میں نے اصرار نہیں کی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "تم کسی ڈاکٹر کو دکھا دو نا۔ صبح میرے ساتھ چلنا۔"

"ہاں۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔

"اور تم کسی بات کی فکر مت کرو۔"

"ہُوں۔" اُس نے ساڑی کا پلو دانتوں میں دبایا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ مجھے احساس ہوا کہ لوگ مجھ سے بھی اسی طرح کہتے ہوں گے۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے مگر ایک آدمی دوسرے اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ وہ اگر اتنا بھی نہ کہے تو کیا کہے۔ میں جولین کے باپ کو مرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے فوراً بات بدل دی۔ جولین کے لیے اُس کے باپ کا ذکر تکلیف دہ ہوگا۔ میں نے کہا۔ "تم کہتی تھیں کہ تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسکول جھوڑو اور انادہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔ اب تمھیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمھارا دل بہل جائے گا اور تم بہت کام قابل بھی ہو جاؤ گی۔"

"کیا تمھاری یہی خواہش ہے!" اُس نے مجھے جھٹکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"اور تم۔" وہ تشکاتی لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا۔ اب تو سچ مچ ہی تم۔"

میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔ یکایک مجھے یاد آ گیا کہ صبح مجھل کی تمام باتیں اُس نے سُن لی ہوں گی۔ میں کرشنا جی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟" اُس نے استعجاب سے پوچھا۔

"اب تو سب کچھ بھول گیا ہوں۔"

"اب بھی چھپاؤ گے؟"

"ہاں اب چھپانے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔"

"بتاؤ نا۔ اچھا ابھی نہیں، پھر میں تمھارے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔" وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں اُسے روک نہ سکا۔ وہ گئی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اُس نے ٹرے میں چائے بنالی اور آ کے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اُسے کوشش کر کے مجھے بہت خوش دیکھ کسی کو خوش دیکھ کے مجھے رشک آتا تھا کہ آدمی کتنی جلدی خوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اُسے سب کچھ بتا دوں گا اور کیا کہ کر سو جاؤں گا۔ تاکہ وہ ملے تو اُس کے سامنے میرا سر نہ اُٹھ سکے کہ میں ضلعا، میں ٹھڑولا، میں پچھورا ساری دنیا سے فریب کرتا رہتا تھا۔ سب سے اُس کی شکایت کرتا پھرتا تھا۔ جولین کی خدمت اپنی تعلیم کے سوا میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ ظاہر ہے، چھپا کا پیٹ بہت ہلکا تھا۔ رہی سہی کسر مجھل نے آ کے پوری کر دی۔ سچا ہوا کہ کرشنا جی کا ذکر میل نکلا۔ اُن کا ذکر ہمیشہ نیا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے

ٹ پولی نما گنجے چوترے کو یہاں چوکے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

اُن کی ایسی دلچسپ باتیں بتانے لگی جن کا خود میں نے بھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جولین کی نظر کتنی گہری ہے اور کیسی کیسی جزئیات پر جاتی ہے۔

جب رات بہت ہوگئی تو میں نے اُسے ہدایت کی وہ اپنے کمرے میں جا کے سو جائے۔ گلی میں کتے بھونک رہے تھے۔ چوکی دار کی آواز ایک دم گونجتی تھی اور دیر تک اُس کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ جولین ہچر مچر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ڈرائنگ روم کی روشنی گل کر کے واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کانتے گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کی موجودگی میں مجھے اپنی، الگ گلے سے اکتاتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کے میں اُس کے دانوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کہیں صبح کے آخری وقت میری آنکھ لگ ہو گی۔

میرا ارادہ تھا کہ ہم صبح سویرے پاڑے کی طرف روانہ ہو جائیں گے لیکن کانتے کے اُٹھنے، نہانے اور ناشتہ تیار کرنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے اُسے اپنے کپڑے پہننے کو دے دیے تھے۔ سفید کُرتے اور پاجامے میں اُس کا رنگ روپ نکل آیا تھا۔

جولین کو دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ میں نے رات اُس سے کیا کہا تھا۔ وہ بہت گھبراہٹ بشاش بشاش بھی۔ کہنے لگی، اب طبیعت ٹھیک ہے ڈاکٹر کے پاس پھر کسی وقت چلیں گے۔ مجھے بھی پاڑے پہنچنے کی جلدی تھی۔ ابھی ہم دروازے سے نکلے ہی تھے کہ ایک پولیس گاڑی آ کے رُکی۔ کانتے نے میرا بازو پکڑ لیا مگر وہ ایس پی شکلا تھا۔ شکلا گاڑی سے اُترتے ہی میرے گلے سے لگ گیا۔ "کہاں تھے تم؟" وہ کبیدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے اتنے بھیجے کیے مگر تم آج ملے ہو۔"

"میں تو نہیں تھا شکلا جی!" میں نے پشیمانی سے کہا۔

"کہاں تھے ——— چمپا دیدی اور جولین سے پوچھو۔ میں کتنی بار آیا ہوں، انھوں نے تمھیں کچھ نہیں بتایا؟"

"بس اتفاق ہے کہ میں آپ کو نہیں مل سکا۔"

"اور تم نے بھی میری طرف آنے کی کوشش نہیں کی۔ خیر، یہ بتاؤ، اب تم کیسے ہو۔ کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "آیئے اندر بیٹھیے۔"

"نہیں، میں پھر آؤں گا۔ وہی قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ظہیر خاں! تم کسی وقت ملو تو میں تمھیں بڑی دلچسپ باتیں بتاؤں۔" اُس نے کانتے کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟"

"یہ میرے دوست ہیں کانتے۔"

"کانتے۔" اُس نے کانتے کو نمسکار کیا۔ کانتے شرمانے لگا۔

"اندر بیٹھیے نا۔"

"مگر چند منٹ۔ اور کوئی تکلف نہیں ہو گا۔"

"بالکل نہیں۔ جیسا آپ حکم کریں گے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ہم ڈرائنگ روم میں آ کے بیٹھ گئے۔ شکلا نے منع کیا مگر چپا چائے لے آئی۔

"تم نے سنا۔" شکلا میرے کان میں رازدارانہ انداز سے بولا۔ "سیٹھ شمبھو قتل ہو گیا ہے۔"

"ہاں سنا تو ہے۔"

"بس اب کچھ دنوں میں تمھیں ایک خوش خبری ضرور سناؤں گا۔"

"وہ کیا ——؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دن اور انتظار کرو۔"

"کچھ بتایئے نا۔" میں نے اصرار کیا۔

"مگر اپنے تک رکھنا۔" وہ ادھر اُدھر نظریں گھما کے بولا۔ کانتے ناشتے کی پلیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تو شکلا نے سرگوشی کی۔ "کرشنا جی کے قاتلوں کا اب جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"بس کیسے، ویسے مت پوچھو۔"

"کون لوگ تھے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"سامنے آ جائیں گے، سامنے آ جائیں گے۔" ظہیر خاں!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "شمبھو کے مرنے کے بعد صورت حال خاصی بدل گئی ہے۔"

"وہ شمبھو ہی تھا نا!؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ——" وہ فکرمندی سے بولا۔ "مگر پولیس کے جو افسران کرشنا جی کی بہت عزت کرتے تھے، وہ اب خاصے مطمئن نظر آتے ہیں۔"

"صرف مطمئن؟" میں نے زہرخند سے کہا

"کسی حد تک شیور۔" وہ جوش میں بولا۔

"تو وہ کون تھے؟ مجھے ذرا اشارہ کر دیجیے۔"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ چند دن اور انتظار کرو۔ بڑے بڑے انکشافات کی توقع ہے۔ مرکزی حکومت کے دل میں بھی تمھاری طرح کرشنا جی کی موت کی پھانس چبھی ہوئی ہے۔"

"پھر دیکھے کیا ہوتا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کرشنا جی کی موت اتنی آسانی سے ہضم کر لی گئی تو پولیس کی ملازمت چھوڑ دوں گا لیکن اب شاید مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑے۔ میں اپنے طور پر کام کر رہا تھا ظہیر خاں! میں نے مرکزی حکومت کو چوری چھپے بہت سے خط لکھے ہیں۔"

"تو کیا شمبھو کا قتل مرکزی حکومت نے کرا دیا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہوا۔ میں سمجھتا ہوں"

شمبھو کے لوگ ہی اُس سے ناراض ہو گئے ہوں گے یا شمبھو کے مخالف گروپ نے ایسا کرایا ہو گا لیکن اس سے وہ رکاوٹ ضرور دُور ہو گئی جو ہماری زندگی میں ہر قدم پر آڑے آتی تھی۔"

"آپ تو تمام راز فاش کیے دے رہے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ گھبرا کے بولا۔ "مگر یہ صرف ایک قیاس ہے۔"

"ٹھیک ہے شکلا جی! آپ اپنا کام کیے جایئے میں ——"

میں نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ "میں آپ کا منتظر رہوں گا۔"

"اب میں آتا رہوں گا بشرطیکہ تم ملے اور ہاں ایک خاص بات۔" وہ جھک کے بولا۔

"وہ جگہ جہاں سے ریمانڈر کے جواب آئے ہیں۔"

"کیا ——؟" میں کھڑا ہو گیا۔

"یہ جواب آیا ہے کہ تھانے سے آباجان جیسی شکل و صورت کے ایک آدمی دیکھے گئے تھے لیکن اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ ایک خط سورت سے آیا ہے، ایک بھوپال سے۔ گویا وہ بھوپال اور سورت میں بھی رہے۔" وہ تاسف سے بولا۔

"اور کیا لکھا تھا؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ بھی اس لیے ہوا کہ میں نے ایک دن اُن تمام پتوں پر پھر ریمانڈر ڈالے جن پر کرشنا جی نے سرکلر بھیجے تھے۔ وہ جگہ سے جواب آ گیا۔ مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی تم کوئی اچھی خبر سن لو گے۔"

"آپ نے بھوپال اور سورت بتایا نا؟"

"سورت کے خط میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ کوئی ایک صاحب اس شکل و صورت کے سورت کے ایک محلے میں بستے تھے مگر برسوں گزر گئے، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔"

"اور بھوپال میں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بھوپال کے خط میں ذرا وضاحت ہے۔ لکھا ہے کہ یہ صاحب اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ محلے والوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ عموماً تانگے میں باہر نکلتے تھے۔ پھر ایک دن اپنے خاندان سمیت اچانک کہیں چلے گئے۔ کسی کو اُن کا پتہ معلوم نہیں ہے کیونکہ وہ کسی کو بتا کے نہیں گئے تھے۔ جواب آئے ہوئے تو تین چار روز ہو گئے۔ میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ سکا اور سوچا تھا کہ یہ جواب بتا کے میں تمھیں اور پریشان کروں گا۔ اُس وقت بات منہ سے نکل گئی۔ مجھے معاف کرنا، تمھیں دُکھ ہوا ہو گا۔"

"نہیں شکلا جی! کس کس بات کا دُکھ کیا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ وہ یہاں نہیں ہیں مگر کسی نہ کسی شہر میں تو ضرور ہوں گے۔"

"مگر ایسا کیوں ہے؟" وہ اُداسی سے بولا۔

"ایسا یوں ہے کہ اُس خاندان میں ایک میں پیدا ہو گیا تھا۔" جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں شکلا کے سامنے یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ "شکلا جی! کہیں سے کوئی اور خط آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔"

ہماری گفتگو جہاں تک محدود تھی، کسی اور نے اُسے نہیں سُنا۔ البتہ کانتے بے چین ہونے لگا تھا۔ شکلا کو ہم سے زیادہ عجلت تھی۔ اُس کے جاتے ہی ہم گھر سے نکل گئے۔ کانتے مجھ سے پوچھتا رہا کہ ایس پی شکلا مجھ سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ٹال دیا لیکن میں خود کو نہیں ٹال سکا۔ شکلا نے آباجان کا ذکر کر کے میرے ارمان چھین لیے تھے۔ اتفاق سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ علاقے میں آج پولیس کل سے زیادہ تھی۔ بڑے چوراہے پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیکسی رکوا کے اُترنا چاہا مگر کانتے نے مجھے روک دیا اور سیدھے پاڑے چلنے پر زور دیا۔ پاڑے کی گلی کے نکڑ پر بھی پولیس موجود تھی۔ عمارت کے باہر بھی معمول سے زیادہ سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ کانتے نے ٹیکسی عمارت کے سامنے ہی رُکوا دی۔ ابھی میں اندر داخل نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا، رات کسی وقت تیواڑی کے آدمیوں نے علاقے میں گھس کے ہلا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لڑائی میں تشدد مارا گیا اور رتن زخمی ہو گیا۔ صبح سے پولیس کے کئی افسر پاڑے آ چکے تھے۔ استاد جھل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تیواڑی کے آدمیوں کا نام دلیں کہ دیں کہ حملہ آور پہچانے نہیں گئے۔ پولیس میں یہی بیان لکھوا دیا گیا تھا۔ رتن اسپتال میں پڑا تھا اور تشدد کی لاکشن آنے والی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو جھل حقہ پی رہا تھا۔ زوار اُس کے بائیں بازو بیٹھا ہوا تھا۔ مدار اُس کے پیر دبا رہا تھا اور جامو ایک طرف گاؤ تکیے سے لگا سوئچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"لو لاڈلا آ گیا۔" جھل نے مجھے دیکھتے ہی صدا لگائی۔ جامو زور سے دیکھنا۔ یہ اس کے ساتھ کون نواب کا بچہ حرام زادہ آ رہا ہے۔"

جامو کی نظر جیسے ہی کانتے پر پڑی، وہ اپنی نشست سے اچھل پڑا۔ "یہ تو کچھ کانتے دکھائی پڑتا ہے۔" اُس نے دیے نکالے کہا۔

میں تیزی سے چوکے پر چڑھ گیا۔ "یہ دروازے میں لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"سانس سنبھال۔" جھل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "آنے میں دیر کر دی شہزادے؟" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"نکلتے نکلتے دیر ہو گئی مگر —— مگر ——"

"جو تو نے سنا ہے ٹھیک ہے۔" وہ سکون سے بولا۔ "پر تُو نے کوئی غلط بات تو نہیں سنی ہے اور نہ یہ کوئی نئی بات ہے۔ سپاہی میدان میں مارا گیا۔ تیراک پانی ہی میں ڈوبتا ہے۔"

"مگر یہ ہوا کیا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"ہونا کیا۔ شدو کا وقت آ گیا تھا۔"

"اوہ نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "آج یہ ہوا ہے کل کچھ اور ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ہمارے علاقے میں گھس کے ہمارے آدمی کو مار دیا۔ وہ کیسے لوگ ہیں؟"

"اور کیا وہ اپنے علاقے میں لے جا کے مارتے۔" وہ مسکرا کے بولا۔ باتیں کھلے تھے، پولیس اونگھ رہی تھی۔ وہ آ گئے۔ کیا تیر مار لیا کوئی قلعہ جیت لیے؟"

"مگر یہ ناقابلِ برداشت ہے۔" غصے سے میری آواز لرزنے لگی۔

"ہے تو۔ تو اطمینان سے تو بیٹھ۔"

"تم..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔ "نندو کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے۔"

"پھر؟" میں نے وحشت سے کہا۔

اُس نے میرا نفو دبایا اور آنکھیں بند کر کے مجھے تحمل کی تلقین کی۔ میں اُس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ تحمل نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے دوبارہ مجھے تھپکی دے کے خاموش کر دیا۔ وہ آیا نہیں۔" اُس نے الجھے ہوئے لہجے میں زور سے پوچھا۔

"بس آتا ہی ہوگا دادا!" زور نے تردد سے جواب دیا۔

"کون؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

"چھیدا۔" تحمل نے آہستگی سے کہا۔ "اسے ذرا کام سے بھیجا ہے۔"

میں نے کام کی نوعیت نہیں پوچھی اس لیے کہ مجھے تحمل سے کسی اطمینان بخش جواب کی توقع نہیں تھی۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" موقع دیکھ کے میں نے چپکے سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے پہلی بار توجہ دی۔

"یہاں مناسب نہیں ہے۔" لیکن وہاں سے اُٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے اُس کے کان میں بات ڈال دی۔ صبح ایس پی نکلا آیا تھا۔"

"اچھا۔" وہ جیسے نزدیک کھسک آیا۔ "کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا کہ اب کرشنا جی کے قاتلوں کو پکڑنے میں کچھ ہی دیر جاتی ہے۔ اُس نے ہم تو نہیں لیا لیکن اُس کا اشارہ اسی طرف تھا۔"

"پھر؟" وہ کسمسا کے بولا۔

"اس سے پہلے کہ وہ اُس کا انجام طے کرنے کے لیے طویل وقت گزاریں اور ہزار باتیں سامنے آئیں، ہمیں کچھ سوچ لینا چاہیے۔ اُس کے اندر جانے کے بعد دونوں باتیں ممکن ہیں۔ وہ واپس بھی آ سکتا ہے اور ہم ایک لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا اور چند لمحے سوچنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا۔ "کچھ دیر صبر کر۔"

معلوم ہوا کہ نندو کی لاش لینے کے لیے پاڑے کے کئی آدمی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ نندو داسی علاقے میں رہتا تھا۔ اُس کی بوڑھی ماں اُس کے ساتھ تھی۔ نندو کی شادی ہو گئی تھی لیکن اُس کی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی پھر نندو نے شادی نہیں کی۔ وہ بہت جی دار شخص تھا۔ اُس کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔

جب چھیدا پاڑے میں داخل ہوا تو تحمل چوکے سے اٹھ گیا اور اُس نے چھیدا کو درمیان ہی میں روک لیا۔ چھیدا نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے اُسے کچھ بتایا۔ تحمل کا پھولا ہوا منہ باہر نکل آیا۔ وہ چھیدا کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے چند قدم خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے مجھے اور جامو کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ کانتے بھی ہمارے ساتھ اُٹھنے لگا۔ تحمل نے اُسے وہیں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور زور سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا۔ ہم چاروں پاڑے سے نکل کے گلی میں آ گئے۔ تحمل کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ چوراہے پر چھیدا نے ایک ٹیکسی روک لی۔ ٹیکسی والا اُسے جانتا تھا۔ تحمل جامو اور میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ چھیدا اگلی سیٹ والے کو ہدایت دیتا رہا اور ٹیکسی مختلف راستوں سے گزرتی رہی۔ مجھ سے خاموشی برداشت نہیں ہوئی۔ آخر میں نے جامو سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم استاد پیرو کے پاس جا رہے ہیں۔" جامو کے بجائے تحمل نے جواب دیا۔

استاد پیرو کا نام سن کے میرے کانوں میں پٹاخا سا بجا۔ میں حیرت سے تحمل کا منہ تکنے لگا۔ اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پیرو بمبئی کا ایک مشہور استاد تھا۔ تیواڑی کے بعد اگر بمبئی میں کسی کا نمبر آتا تھا تو پیرو کا۔ تحمل سے پیرو کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، ممکن ہے وہ اُس کا واقف کار ہو۔ ایک ساتھ بے شمار سوال میرے ذہن میں سر ابھارنے لگے مگر بمبئی میں تحمل کا کوئی شناسا موجود ہوتا تو وہ سب سے پہلے اُسے میرے متعلق بتاتا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر تحمل اور پیرو کا کوئی تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں ٹیکسی والے کی موجودگی میں نہ حیرت کا اظہار کر سکتا تھا، نہ وہاں جانے کا مقصد پوچھ سکتا تھا۔ میں گھٹ کے رہ گیا۔ چھیدا کا انتظار کرنا اور اُس کے آنے پر تحمل کا چھوتے سے اُٹھ جانا پھر اچانک پیرو کی طرف جانے کا ارادہ کر لینا، یہ سب بڑی انوکھی باتیں تھیں لیکن میں تحمل کی عادت سے واقف تھا۔ وہ اپنے فیصلوں پر لمبے زمی چند نہیں کرتا تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ ٹیکسی ماہم کے علاقے میں داخل ہو گئی اور گلیوں سے گزرتی ہوئی گیرو رنگ کی ایک دو منزلہ مضبوط عمارت کے سامنے ٹھیر گئی۔ تیسری منزل آدھی بنی ہوئی تھی۔ گلی چوڑی تھی اور زیادہ گنجان نہیں تھی۔ یہ عمارت گلی کے آخری سرے پر واقع تھی۔ اس طرح اُس کے دروازے تین اطراف کھلتے تھے۔ اونچی دیوار عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ چھیدا سب سے پہلے اُترا اور اُس نے دیوار کے ساتھ بنی اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کچھ کہا۔ وہ پیرو ہی کے اڈے کے آدمی تھے۔ انھوں نے جب تک آدمی واپس نہیں آیا۔ ہم ٹیکسی ہی میں بیٹھے رہے۔ آدمی اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ اُس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کے تین ادھیڑ عمر آدمی بھی تھے۔ وہ ٹیکسی کی جانب لپکے۔ ہم تینوں ٹیکسی سے اُتر آئے۔

اُن کی معیت میں ہم اندر لے جایا گیا۔ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے اور متناسب اعضا کا ایک شخص کھڑا تھا۔ اُس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ رنگ صاف تھا۔ "پیرو دادا! کلکتے والا استاد تحمل۔" چھیدا کی آواز میں گنگناہٹ آ گئی۔

"آؤ، آؤ استاد! اندر آؤ۔" اُس نے تحمل کا بازو پکڑتے ہوئے بڑے شیریں انداز میں کہا۔ "آؤ آؤ راجو! مہارا جو! ایدر بیٹھو۔" وہ ہمیں ایک ہلکے پیلے گیا۔ اُس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چوکی پر بیٹھنے سے پہلے تحمل نے میں گلے لگایا۔ وہ ایک سلجھا ہوا، صاف اور تیز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کلکتے سے کب آنا ہوا؟"

"کل سویرے۔" تحمل نے سکون سے جواب دیا۔ "پیرو دادا! مجھے تم سے کچھ خاص بات کرنی ہے۔ چھیدا نے میرے بارے میں تمھیں بتایا ہوگا۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ استاد کے بھوکے گیا؟ ولایتی وہسکی یا کوئی اور چیز؟" اُس کے بڑے بڑے دانت چمکنے لگے۔

"کچھ نہیں کھائیں گے ہمیں۔ گے بعد میں اس وقت تمھارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔ کھانے پینے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ تم ایدر بمبئی میں اپن کا مہمان ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "مہمان کے بس میں ہوگا، اپن اپنے مہمان کے لیے کریں گا۔"

"بات بڑی ہے پیرو دادا!" تحمل نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "یہ تمھارے سامنے کلکتے کا استاد تحمل بیٹھا ہے۔ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے اور یہ تمھارا راجا ہے جس نے چھنگا سے پاڑا یا ہے۔"

"یہ راجا ہے۔" وہ تعجب سے بولا۔ "اپن نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اپن راجا کو دیکھنے کا تڑپ رکھتا تھا۔"

"پیرو دادا! مجھے یقین ہے کہ تم نے ادھر بمبئی میں جو نام بنایا ہے، وہ اپنی بہادری اور سوجھ بوجھ سے بنایا ہے۔"

"استاد! بولو، بولو۔ کام بولو۔"

"دادا! ہم بہت صاف بات کرنے آئے ہیں۔ بات عجیب ہے لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔"

"بولو دادا! بولو۔ اپن وعدہ کرتا ہے کہ اپن سوچ سمجھ کے جواب دے گا۔ اپن کو کام بولو۔ ایدر اودر کی بات مت کرو۔"

"پیرو دادا! ہم تم سے کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟ تم کیا بولتا ہے استاد تحمل!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ دادا! بیٹھ جاؤ۔ میری بات سنو۔ سنو، ہم کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم جو چاہو تو ہم تمھیں راجا کو اڑا، کلکتے کا اڈا اور فیض آباد کا اڈا، تینوں کی ایک ساتھ پرچی لکھ سکتے ہیں۔"

"پر یہ تم کیا بولتا ہے استاد تحمل!" وہ نیم جانی انداز میں بولا۔ کمرے کی دیواروں سے لگے ہوئے اُس کے تینوں آدمی چوکنے ہو گئے۔ "ایسے کیسے ہوتا ہے استاد تحمل!"

"ایسا ہو سکتا ہے پیرو دادا! تم چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔" تحمل آہستگی سے بولا۔ "یہ اچھا تماشا ہے! ہم تم سے اسے مارنے کے لیے نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہم کو اس اڈے کی آمدنی سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ سب تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی۔ ہم تو صرف تھوڑے دنوں کے لیے یہ اڈا لینا چاہتے ہیں۔ تم سوچ لو۔"

"سوچنا کیسا استاد!" وہ تڑخ سے بولا۔ "کام ہی بول لے آیا ہے؟"

"ہاں!" تحمل نے خفگی سے کہا۔ "ہم اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"تم کلکتے کا استاد تحمل ہے۔" وہ ملتجی آواز سے بولا۔ "اپن نہیں سمجھتا کہ استاد ہو کے ایسا بات بولتا ہے۔"

"اگر اسے سودے کے طور پر دیکھا جائے تب بھی یہ برا دام نہیں ہے۔" تحمل کے لہجے میں کسی قدر تندی آ گئی۔ "لیکن ہم سودے بازی کرنے کے لیے نہیں آئے۔ ہم تو تم سے اور ہی بات کر رہے ہیں۔ پیرو دادا! ہم یہ اڈا تمھارا حق سمجھتے ہیں۔ یہ تمھارا ہے اور تمھارا ہی رہے گا۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہوگا اور تمھیں اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے ہوں گے۔ ہر استاد کو یہی کرنا پڑتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی اسی قسم کی باتیں میں نے چھنگا سے کی تھیں لیکن تحمل کا انداز بالکل مختلف تھا۔

"اپن کا گنجر فرجائے گا۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بات بڑی ہے اور نئی بھی ہے۔ پر تم اپنا دل اور سر کھول دو تو ایسا کر سکتے ہو۔ ہماری بات کا اعتبار کرو دادا! اڈے پر تمھارے ہی آدمی رہیں گے، ہی گم جاؤ ہوگا۔ ہم اپنے آدمی یہاں نہیں لائیں گے۔ ہماری بات مان لو، ایسا کر کے دیکھو۔"

"تم... تم استاد تحمل ہو۔" وہ تھتھے لگانے لگا۔

اُس کے تھتھے رُکے تو تحمل نے سنجیدگی سے کہا۔ "پیرو دادا! ہم تم سے یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ اب تم یہ اڈا چلانے کے لائق نہیں ہو۔ نہ ہم تم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ استادوں کی طرح پنجہ آزما کے یہ اڈا چھڑو۔ ویسے اگر تم چاہو تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ ارتاد جامو، راجا اور مجھ میں سے تم جسے چاہو، اپنے لیے چن سکتے ہو۔"

"ہو۔۔۔ ہو۔" وہ کھنکھارنے لگا۔ اُس نے چوکی پر زور سے گھونسا مارا مگر تحمل کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پیرو چند لمحوں تک تلملاتا رہا۔ اُس کے آدمی چوکی کے نزدیک آ گئے تھے۔ اچانک وہ بے حس و حرکت ہو کے ہمیں گھورنے لگا۔

"کوئی استاد دوسرے کی باتوں سے اڈا چھوڑتا ہے، یا تو وہ مرجائے یا کوئی دوسرا اُس سے اڈا چھین لے مگر ایک تیسری بات بھی ہو سکتی ہے

پیرو دادا!" مجھل نے نرمی سے کہا۔ "وہ یہ کہ جو کچھ ہم کہہ لیے ہیں تم اس پر عمل کرو۔ یہ کوئی حکم نہیں ہے ہم تم سے منت کر رہے ہیں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اپن کو لگتا ہے کہ تم استاد مجھل ہو، تم نکلتے کارا جاہو نہیں۔ ..نہیں .... ابھی تمارا کچھ فریلا ہو گیا ہے۔"

"اتنی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!" مجھل نے آنکھیں چڑھا کے کہا۔ "کوئی اور تمارے پاس اس طرح نہیں آسکتا تھا۔"

"پر..... پر تم اڈا کیوں لینا چاہتے ہو؟"

"یہ بعد کی بات ہے پہلے تم اڈا میرے حوالے کرنے کی بات کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس حالت میں تم اسے دو گے، میں اسی حالت میں اسے واپس کر دوں گا۔ ہمارے تمارے درمیان صرف بات کی بات ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"استاد مجھل! اڈا اپن نے بازو سے حاصل کیا ہے۔" اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی اسے بازو ہی سے لے سکتا ہے لیکن تم..... تم بڑی سخی کی بات بولتے ہو۔ اپن کو یہ کیسے پتہ چلے کہ تم ہی استاد مجھل ہو۔ اگر تم مجھل ہو تو اپن نے نام مزور سنا ہے، پر اپن اس طرح کیسے تم سے آگے بات کرے۔"

"میں نہیں چاہتا کہ میں اور تم آمنے سامنے آئیں لیکن تمارے تسلی کیلئے ضروری ہے کہ تم اپنے کسی آدمی کو اشارہ کرو۔ تم کو ابھی پتہ چل جائے گا۔" مجھل نے ناگواری سے کہا۔

پیرو دادا کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی بار بار چاقو اچھال رہا تھا اور یہیں سرخ سرخ نظروں سے مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ بہت پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ قد کا لمبا اور جسم کا مضبوط تھا۔ مجھل نے اسے نہیں دیکھا۔ معاف کرنا استاد مجھل! مجھل نے چونک کے دیکھا۔ تیا ماچی ہے! اسے اپنے چاقو پر بڑا مان ہے۔ اس سے چاقو چھین لو۔"

مجھل کی آنکھوں میں خون ابلنے لگا۔ "پیرو دادا! ماچی کا مان مت توڑو۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ تم بات کرو۔"

"ماچی کے بعد میں تم سے ضرور بات کروں گا۔"

"استاد مجھل نہیں اٹھے گا۔ ماچی کریں گا دیکھوں گا۔" جامو نے پہلی بار زبان کھولی۔ "استاد مجھل کی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!"

"تم میں سے کوئی بھی ہو۔ اپن کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اسے میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

جامو نے مجھے دھکا دے کے ہٹا دیا اور پھرتی کے ساتھ چوکی سے اتر گیا۔ اس نے رتی بھر لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ "استاد مجھل! اجازت ہے؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔

مجھل نے گردن ہلائی۔ جامو بجلی کی طرح تڑپ کے پلٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی چمک تھی۔ جامو نے استقبال کیا۔ ماچی اس پر حملہ کرنے کے لیے فرکشن پر تھرکنے لگا۔ اس کے برعکس جامو ایک جگہ جما کھڑا تھا۔ جامو نے دو تین مرتبہ اسے تنزل کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے اپنے جسم سے بجلیاں دیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتا اور اپنا قدم پھر پیچھے ہٹا لیتا۔ اس کی گردن اگے نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں ماچی کے چاقو کی نوک پر جمی ہوئی تھیں۔ بجلیوں سے ماچی کو غصہ آگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جامو صرف چند لمحوں میں فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ شاید اسی بات کے انتظار میں تھا کہ ماچی حملے میں پہل کرے۔ ماچی بھی پوری طرح مستعد تھا۔ اس کا جسم رواں تھا اور اسے چاقو پکڑنا آتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ جامو مجھ سے پہلے چلا گیا۔ پیرو نے غور نہیں کیا حالانکہ مجھل نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ فیض آباد کا استاد ہے مگر پیرو کا مطلب بھی کچھ اور تھا۔ جامو اور ماچی ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ ماچی نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی۔ جامو اپنا چاقو پھینکتا ہوا بجلیوں کی طرح اچھل کے سینہ زدن میں اس کے سر پر پہنچا۔ چاقو گرنے کی آواز ماچی نے بھی سنی ہوگی۔ اس نے اس طرف دیکھا ہی تھا کہ دوسرے لمحے اس کا چاقو والا ہاتھ جامو کے پنجے میں تھا۔ جامو نے ادھر ماچی کا ہاتھ پکڑا اور دیکھتے دیکھتے اسے اپنے کندھے پر رکھ کے اس کا بھاری جثہ ایک جھٹکے سے فرکشن پر پٹخ دیا۔ ماچی نے پھر بھی چاقو سنبھالے رکھا لیکن جامو نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ جامو اس پر پوری طرح حاوی آچکا تھا۔ اس نے اس کے گلے پر چوتھا رکھ کے ہاتھ موڑا۔ ماچی کی انگلیوں سے چاقو دبا یا نہیں جا سکا۔ چاقو گرتے ہی جامو نے ماچی کو چھوڑ دیا اور اپنے بال درست کرتا ہوا چوکی پر آ کے بیٹھ گیا۔ جامو نے کوئی نیا داؤ نہیں آزمایا تھا۔ اس نے سادی توجہ تیزی اور پھرتی کی طرف دی تھی کیونکہ فیصلہ چند ہی لمحوں میں ہونا چاہیے تھا۔ پیرو نے چوکی پر کھڑے ہو کے دونوں ہاتھ پھیلا لیے۔ جامو دوبارہ اٹھ کے اس کے گلے سے لگ گیا۔ سنا تھا" پر صرف سنا تھا" وہ اسے زور سے لپٹاتے ہوئے بولا۔ "کہ اودر دلی پار بڑا بڑا بانکا پڑا ہے استاد مجھل! معاف کرنا۔ اپن کو معاف کرنا۔"

"تمارا تسلی ہو گئی پیرو دادا! اب کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات کیا کرنے تم نے اپن کا سر جھکا دیا ہے۔"

"نہیں پیرو دادا! یہ اڈا تمارا ہے۔ اس کی یہیں ضرورت نہیں ہے۔ تمارا مال تمارے پاس ہے۔ ہمیں واپس اپنے اپنے شہر جانا ہے۔ ہم ادھر بمبئی میں نہیں رہنا چاہتے۔"

"اپن کو اب تمارا ہر بات کا اعتبار ہے۔" وہ جوش میں بولا۔ "آج سے یہ اڈا تمارا ہے۔ اور بولو اپن کے پاس کیا ہے۔"

مجھل نے آگے بڑھ کے اسے بھینچ لیا۔ "پیرو دادا! بس یہی بہت ہے۔ تم یہاں کے بادشاہ ہو۔ تم یہیں رہو گے۔ آفاندہ آفو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"چلو، چلو۔" وجلے غالب آواز میں بولا۔ مجھل اس کے ساتھ اندر کسی کمرے میں جانے لگا۔ پیرو جاتے جاتے پلٹ پڑا اور اپنے آدمیوں پر برسا۔ "مائیں ابھی چوکی خالی پڑا ہے۔ استاد مجھل آیا ہے۔ سالا تم لوگ کھڑا کھڑا کیا دیکھتا ہے۔" وہ دہاڑتا ہوا بولا۔ "معمان کے لیے کچھ لاؤ۔ کرو بھروو۔"

مجھل اسے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ اس کے جاتے ہی چھید اور جامو کے گال چومنے لگا۔ پیرو کے آدمی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ماچی بھی فرکشن سے اٹھ کے جامو سے لپٹ گیا تھا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ مجھل کی بات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ چوکی پر کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا گیا۔ سب نے مجھل اور پیرو کی واپسی کا انتظار کیا۔ وہ دونوں بہت دیر میں باہر نکلے لیکن دونوں ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ پیرو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میں اندازے ہی لگا سکتا تھا کہ انھوں نے اندر کیا بات کی ہوگی۔ پیرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ فلاں فلاں آدمی کو فوراً پاڑے پر بلا لائیں۔

جتنی دیر میں لوگوں نے آنا شروع کیا اتنی دیر میں ہم سب کھانا کھاتے رہے۔ پیرو مجھل کے قریب بیٹھا اس کی خاطر میں کوئی ہاتھ کرتے ہیں کسی دقت کا منظر نظر آتا تھا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد پیرو مجھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے بولا۔ "سالا لوگ! ذرا اپن کی بات سنو۔ یہ اپن کا دوست استاد مجھل ہے اور یہ استاد جامو ہے اور یہ راجا ہے۔ اپن آج سے پاڑے کا سارا انتظام مجھل استاد کو دیتا ہے۔ تم سالا کسی کو کوئی ٹوک ہو تو اپن کو ابھی بولو۔"

سب حیرانی سے پیرو کو دیکھنے لگے۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ لوگ کھسیانے اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "آج سے تم لوگ استاد مجھل اللہ استاد جامو اور استاد راجا کی بات سنے گا۔ جو یہ بولیں گا کرے گا۔ یہ پاڑا اب پیرو دادا کی جگہ استاد راجا کا پاڑا سمجھے گا۔ اپن کا یہ فیصلہ دور دور چلے بول دو۔ راجا کا پرانا پاڑا، بالم خاں کا پاڑا بھی اسی پاڑے میں مل گیا ہے سمجھا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "جس سالا کو پیرو کی مرضی پسند نہیں ہے، وہ علاقے سے کٹلی ہو جائے۔ اپن بھی ایدی بیٹھا ہے گا۔ پر استاد مجھل کے موت کا مانک۔ اپن کچھ نہیں بولیں گا اور اپن آگے کچھ بولے تو اپن کی بات سننے سے انکاری کر دو۔ سمجھا؟" وہ دوبارہ چلایا۔ وہ سب گنگ ہو گئے تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہر شخص کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں مگر پیرو کی باتوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ پیرو چپ ہوا تو مجھل نے اونچی آواز سے کہا۔ "سب کچھ اسی طرح رہے گا کسی کام میں فرق نہیں آئے گا لیکن بات بھلی چلے گی۔"

مجھل نے جامو اور چھید کو وہیں چھوڑا۔ پھر مجھے اور پیرو دادا کو اپنے ساتھ لے کے چل پڑا۔ باہر کئی ٹیکسیاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک ٹیکسی میں ہم بیٹھے۔ دوسری اور تیسری میں پیرو دادا کے آدمی بیٹھ گئے۔ جب ہم اپنے پاڑے پہنچے تو ہمارے ساتھ پیرو دادا کے راستوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پاڑے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔ مجھل نے بڑی عزت کے ساتھ چوکے پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ تھدو کی لاش اگئی تھی لیکن بارش کی وجہ سے اسے روکی پاگیا تھا۔ پیرو کا خیال تھا کہ تھدو کے جنازے میں تینوں پاڑوں کے لوگ شریک ہوں اور اسے دھوم دھام سے اٹھایا جائے مگر مجھل نے اس کی رائے رد کر دی۔ تھدو کے مردہ جسم پر پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پیرو نے اس کی ماں کے لیے فوراً تین ہزار روپے تھدو اور پچاس روپے ماہانہ وظیفے کا اعلان کیا۔ میں نے اپنا اعلان منہ ہی میں دبا لیا۔

تھدو کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ کٹ گئی تھی۔ آخری رسوم کے لیے اس کی لاش اٹھائی گئی تو پاڑے کے بہت سے لوگ بری طرح رونے لگے۔ تھدو نے بتایا کہ رتن کی حالت اب کسی قدر بہتر ہے اور اسے ہوش آگیا ہے، اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے بیان میں تواڑی کے آدمیوں کا نام نہ لے۔ مجھے ابھی کئی ہسپتال جانے کا وقت نہیں ملا تھا۔ کچھ دیر پاڑے میں بیٹھ کر کے مجھل، پیرو، گلنے اور میں علاقے میں گشت کے لیے نکلے۔ تھدو کی موت کی وجہ سے علاقے بھر میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ ہمیں موجود پاکے لوگوں کے چہروں پر اطمینان نمایاں ہوا۔ ہمارے پیچھے بہت سے آدمی چل رہے تھے۔ مادی اور منا بھی ان میں موجود تھے۔ مادی مجھ سے بات کرنے کے لیے بہت بے تاب تھا۔ پیرو نے یہاں بھی اپنا اعلان دہرایا تھا۔ سب حیران تھے کہ اس نے اپنا پاڑا میری نگرانی میں دے دیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ موجود ہے۔

تھدو قتل کر دیا گیا۔ پاڑے کے چند ہی لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔ اس کے علاقے کے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اندھیرا چھانے سے پہلے پیرو واپس چلا گیا مگر اس کے کئی آدمی ہمارے پاڑے میں رہ گئے۔ رات ہوئی تو میں نے مجھل کے کہنے سے پہلے پیش بندی کر دی کہ میں آج رات گھر نہیں جاؤں گا۔ اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ اس رات وہ خود مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ مادی اور منا بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھل رات بھر آرام کرے گا لیکن ٹیکسی باہر کھڑی رہی اور وہ جوتن اور چھپا سے جانے کیا کہہ کے واپس چلا گیا۔ منے کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا گیا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ان حالات میں وہ مجھے گھر میں آرام کرنے کے لیے کہتا تھا۔ میں نے رات گئے گھر سے نکلنے کی ٹھانی مگر گلی میں چند قدم چل کے واپس آگیا۔

شہر کے دور دراز علاقوں تک پیرو کی سبک دوشی اور اُس کے اڈے پر پیرے اور تجمل کے نپٹنے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ تین دن گزر گئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں یہ سب کچھ ایک تماشے کی طرح دیکھتا رہا۔ علاقے میں پھر کوئی واردات نہیں ہوئی۔ دو سرے ہی دن تیواڑی کے چند آدمی ٹوٹ کے پیرو کے پاڑے میں شامل ہو گئے۔ یعنی اُس پاڑے میں جو اب تیسرے نمبر سے موسم تھا۔ اُن کا بہت احتیاط سے خیر مقدم کیا گیا۔ تیسرے دن علاقے سے پولیس بھی ہٹ گئی۔ اب تجمل کا زیادہ وقت پیرو کے اڈے پر گزرتا تھا۔ کانتے اور جامو کبھی اِدھر کبھی اُدھر دونوں جگہ آتے جاتے رہے۔ میں نے کئی بار اُن سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ تجمل جب کوئی بات بتانا پسند نہیں کرتا تھا تو پھر کوئی بھی اُس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ پیرو کے اڈے میں بیٹھا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کا پرانا آدمی ہو اور نکلنے کا اڈا بمبئی میں منتقل ہو گیا ہو۔ پیرو نے اُس کے لیے یہاں بھی حقے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ عموماً اُس کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر تجمل کی کسی بات پر زبان نہیں کھولتا تھا۔ بس مسکراتا رہتا تھا اور تجمل کو احکام دیتے، بُرے بھلے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ تیسرا دن ہی تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کچھ تنہائی ملی تو میں نے تلخی کے ساتھ تجمل سے پوچھا: "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"جو تو چاہتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا۔

"لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے ناراضی سے کہا۔

"کیا تیری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے؟" وہ نرمی سے بولا۔

"تم نے قلعہ ضرور بنا لیا ہے مگر۔۔۔۔"

"پہلے قلعہ بنا لینا اچھا ہوتا ہے لاٹھے! تو ہی تو کہتا تھا کہ تیواڑی بہت بڑا استاد ہے۔ آدھی بمبئی اُس کے پاس ہے۔ ہر طرف اُس کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں اور اُسے کسی بات میں کوئی لاج نہیں ہے تو نے اُس کے متعلق بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ بڑے اُستاد کے لیے انتظام بھی بڑا کرنا پڑتا ہے۔ کام مناسب طریقے سے ہونا چاہیے نا۔ اپنی بھی عزت کی بات ہے لاٹھے! اور پھر تجھے جلدی بھی ہے۔ میرا بھی اس شہر میں دم گھٹ رہا ہے۔"

"میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ابھی میں تجھے کیا جواب دوں لے!"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"سب کچھ تیرے سامنے ہے۔"

وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ آخر میں نے تنگ آ کے اُس سے بات کرنا ہی بند کر دیا۔ جامو اور پیرو بھی وہاں آ گئے تھے۔ ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ تجمل اور جامو پیرو کے علاقے میں صبح و شام گشت کرتے تھے۔ علاقہ بڑا تھا لیکن وہ یہاں پھیل نکل جاتے۔ کبھی پیرو اُن کے ساتھ ہوتا، کبھی وہ تنہا ہوتے۔ رات گئے تجمل مجھے گھر واپس بھیج دیتا۔ تینوں پاڑوں میں غیر معمولی سرگرمی پائی جاتی تھی۔ عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا۔ تجمل شاید ہی کسی وقت آرام کرتا ہو۔ میں صبح آتا تو اُس کی آنکھیں سرخ دیکھتا۔ وہ یقیناً رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور پھر تم ایک اجنبی جگہ بیٹھے ہوئے ہو۔ کسی وقت بھی کوئی سر پھرا ناراض ہو سکتا ہے مگر مجھے اُس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تینوں پاڑوں کے آدمی اُس کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ہر وقت چاقو بازی اور زور آزمائی کی مشقیں جاری رہتی تھیں۔ چاقو میں کانتے کا ہاتھ بہت رواں تھا۔ وہ پیرو کے اڈے کے زور آوروں سے زور آزمائی کرتا رہتا تھا اور سب کو دنگ کر دیتا تھا۔ تجمل موجود ہوتا تو وہ کانتے کے سامنے نہتا کھڑا ہو جاتا۔ کانتے اُس پر چاقو لے کے جھپٹتا اور مختلف داؤ آزماتا، تجمل خود کو بچاتا رہتا اور آخر کار کانتے کے ہاتھوں سے چاقو چھین لیتا۔ پیرو کا خاص آدمی ماچھی اب تجمل کے گرد بیٹھا رہتا اور جب بھی موقع ملتا اُس کے پاؤں دبانے لگتا۔ پاڑے کے دوسرے لوگوں کا حال بھی یہی تھا۔

دسویں دن رات کو خلافِ توقع تجمل نے مجھ سے گھر جانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ جامو اور کانتے دیر سے غائب تھے۔ اڈے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ پیرو کچھ بے چین نظر آ رہا تھا لیکن تجمل کے چہرے پر تشویش کی کوئی علامت نہیں تھی۔ "اب تم سکتے کا ارادہ کب کرو گے پیرو دادا؟" تجمل کی آواز گونجی۔

"تجمل بھائی! جیسے ہی تیم ملا، اپن اُدر بھاگیں گا۔" پیرو خجل کے بولا۔ "پر اپن ابھی تم کو جانے نہیں دیں گا۔"

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے پیرو دادا! تم نے ہماری بات کا کہ ہی میں سدا اسے یاد رکھوں گا۔" تجمل نے ملائمت سے کہا۔

"شرمندہ مت کرو تجمل بھائی!" پیرو نے تجمل کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "کبھی کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو لکھنا۔"

"اپن کا جی کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کے تمھارے ساتھ چلے۔"

"نہیں پیرو دادا! ابھی تم کو بمبئی میں بہت کام کرنا ہے۔"

میں حیرانی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تجمل کچھ ہی دیر بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اُس کی آواز تھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بھاری تھیں۔ وہ باتیں پیرو سے کر رہا تھا اور زور زور سے بال میرے نوچ رہا تھا۔ گھنٹوں گزر گئے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ کچھ مجھے بھی اندازہ ہو چلا تھا۔ میری رگوں میں خون کا دوران تیز ہو گیا تھا۔

"دیر ہو گئی۔" اچانک پیرو نے اضطراب سے کہا۔

تجمل نے منہ بنا کر کہا: "راستے میں ہوں گے۔"

ابھی اُس نے ایک گہری سانس ہی لی تھی کہ باہر گاڑیوں کا شور اُبھرا۔ پیرو نے بے قراری سے تجمل کو دیکھا۔ تجمل نے گردن ہلائی اور چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں، تیز تیز چاپیں۔ پھاٹک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر یکایک چار دروازے پر نمودار ہوئے۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ میں جھٹ سے اچھل کے دروازے کی جانب بھاگا۔ کانتے اور جامو خون میں لت پت تھے۔ اُن کے کپڑے لال ہو گئے تھے لیکن وہ دونوں اپنے قدموں سے گردش پر کھڑے تھے۔ کانتے کی پیشانی اور کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو کا سارا بازو سُرخ ہو گیا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان اونچے قد اور کسے ہوئے جسم کا ایک زخمی شخص موجود تھا۔ وہ نہایت بپھرا ہوا اور سخت مشتعل نظر آ رہا تھا۔ میں اُسے نہیں پہچانا۔ جامو اور کانتے اسے لیے ہوئے آگے آ گئے۔ اُن تینوں کے پیچھے ایک ہجوم تھا۔ کئی آدمی زخمی تھے۔ زیادہ بھی تھا، پھیلا بھی تھا، مارتی بھی تھا۔ ہام خاں کے پاڑے کے بھی کچھ لوگ تھے۔ ماچھی بھی تھا اور پیرو کے پاڑے کے کئی آدمی بھی تھے۔

"تجمل بھائی!" اوپر ملّے نے لاج رکھ لی۔ "جامو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اسے زندہ لے آیا ہوں۔"

"جامو! مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ واپس نہیں آئے گا۔" تجمل نے بڑھ کے اُسے گلے سے لگا لیا۔

"میں نے کانتے کو زندہ پکڑ لیا۔" کانتے! یہ کیا ہے؟" میں نے ہمت سے کہا۔ "تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ہم تیواڑی کو لینے گئے تھے لاٹھے راجا!" اُس نے مسکرا کے میری ٹھوڑی پکڑ لی۔ "مالے کا پاڑہ چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ایک آدمی کو بھی اُس کی لگی سے ہلنے نہیں دیا۔ سڑک پر لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ پر ہم مالے آئے ہیں۔ بڑا زور کیا حرام کے جنے نے۔" کانتے نے زمین پر تھوک دیا۔ اُس کے تھوک میں خون ملا ہوا تھا۔

تجمل غور سے تیواڑی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تیواڑی بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ تجمل پیرو کا بازو پکڑ کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ "لاٹھے!" اُس نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ "اسے سنبھال۔" اُس نے تیواڑی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے چاقو نکال لیا۔ میری نظروں میں کرشنا جی کی پٹیوں میں بندھا ہوا جسم گھوم گیا۔ میں اُس کی بوٹی بوٹی کر دینے کے لیے آگے بڑھا۔ تجمل نے ہاتھ بلند کر کے مجھے روک لیا۔ "تیواڑی! کوئی آخری خواہش ہو تو بیان کر۔" تجمل نے سرد لہجے میں کہا۔

"ایک ہی آخری خواہش ہے داداؤ! اپن کو ایک چاقو سے دو اپن ایسے نہیں مرنا چاہتا۔ تم اپن کو چاقو سے بغیر مارو گے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔" تیواڑی نے جارحی لہجے میں کہا۔

چاقو کی موت تو عزت کی موت ہوتی ہے تیواڑی! میں تجھے لڑتے ہوئے مرنے کی عزت نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تیرا آنا ہی تیری موت کے برابر ہے۔ استاد جامو سے کہا گیا تھا کہ وہ تجھے زندہ پکڑ کے لائے۔ تو دیر ہوئی مر چکا ہے۔" تجمل کی آواز بھی جیسے اُس کی آنکھوں کی طرح سرخ تھی۔

"اپن نے تم سے اپنی آخری خواہش بول دی ہے اور اپن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہا ہے۔" تیواڑی نے گرج کے کہا۔

جامو نے اُس کی طرف چاقو اچھال دیا۔ "تجمل بھائی! اسے اپنی عزت نکال لینے دو۔ اسے چاقو سے مارا نہیں جائے گا۔"

"تیری مرضی جامو!" تجمل نے اپنا چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

"نہیں تجمل بھائی! تم نہیں۔" جامو تجمل کے سامنے زمانہ ہو گیا۔ اُدھر کانتے تیواڑی کی طرف چاقو لے کے بڑھنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تیواڑی کو میں دیکھوں گا۔ تم ہٹ جاؤ۔"

"لاٹھے!" تجمل دہاڑنے لگا۔

"مجھے منع مت کرو تجمل بھائی!" میں نے تلملا کے کہا۔

"تیرا کام چاقو چلانا نہیں ہے۔" تجمل غضب ناک آواز میں بولا۔

"مجھے مت روکو۔" میں ایک جست لگا کے تیواڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ کانتے نے پھر اُسے آنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے دھکا دے دیا۔ اردگرد کھڑے ہوئے لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کھڑے میں ہمارے لیے ایک دائرہ بن گیا۔ چاقو میرے ہاتھ نے نکالا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑی ہوئی تھی۔ مجھے تیواڑی کے مقابل دیکھ کے تجمل چپ ہو گیا۔ کہے میں ہر آواز معدوم ہو گئی تھی۔ میں اُس کے حملے کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کوئی داؤ آزمانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اُسی لمحے مجھے تجمل کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے جیل میں مجھے نصیحت کی تھی کہ لڑتے وقت دماغ ٹھنڈا اور جسم گرم رکھو۔ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم بہ جبر روک لیے ورنہ میں نے تو اپنا چاقو بھی پھینک دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جامو کا جو چاقو تیواڑی کے ہاتھ میں تھا، اُسے اُس سے اہانت محسوس ہونا چاہیے تھا۔ تیواڑی اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہا تھا۔ زخمی ہو جانے کے باوجود اُس کے جسم میں طوفان کی لپک تھی۔ اگر وہ زیادہ زخمی ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی اُس کے خلاف چاقو اٹھانے پر آمادہ نہ ہوتا مگر معلوم ہوتا تھا کہ جامو نے اُس کے گال اور سینے پر خون کی لکیریں بہت احتیاط سے کھینچی ہیں۔ یہ لکیریں کھینچنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اُسی وقت کھینچی جا سکتی ہیں جب رعایت کا کوئی گوشہ ذہن میں موجود ہو ورنہ ہاتھ ذرا سا بہک جائے تو گردن نکل آتا ہے۔ تجمل کہتا تھا کہ لکیر کھینچو تو ایسی کہ ناخن کا گمان ہو اور خوبی کی بو میں

پسینے کی طرح چھوٹیں۔

تیواڑی نے بندر کی طرح آگے پیچھے اُچھلتے کودتے ہوئے سب سے پہلے میرے گولے کو نشانہ بنانا چاہا۔ مجھے اب جمع کا کوئی ہوش نہیں تھا اور نہ دنیا کی خبر تھی میرے سامنے تو بس تیواڑی تھا۔ میں اُس کی پھرتی تو نہ پا سکا اس پھرتی میں ایک تحمل بھی تھا حالانکہ یہ تحمل کا موقع نہیں تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں وار کر رہا تھا اور میں نپے تلے انداز میں بچ رہا تھا۔ دو ایک بار میں بھی اُسے اپنے چاقو کی زد پر لایا مگر وہ اپنا جسم صاف بچا گیا۔ اگر نگاہ مخالف کے چاقو کی پابند کر دی جائے کہ جدھر جا تو جائے اُدھر نگاہ بھی اُس کے ہمراہ جائے تو مخالف کا وار عموماً ناکام ہو جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جسم بھی نگاہ کا پابند ہو۔

تیواڑی نے دو سرخ شدید وار میرے سینے پر کیا۔ وار اتنا غیر متوقع اور بے ساختہ تھا کہ میرے پاؤں اپنی جگہ سے ہلنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ اگر میں برق رفتاری سے اُس کا بڑھا ہوا چاقو اپنے چاقو پر نہ روکتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے اُسے روکا میرے ذہن میں فوراً ایک خیال شعلے کے مانند لپکا۔ میں نے چاقو پر زور برقرار رکھتے ہوئے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر کے ایک جھٹکے سے ہاتھ نیچے گرایا۔ اُس جھٹکے سے میرا چاقو نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اُسے دانستہ گرایا تھا۔ تیواڑی سمجھا کہ میں حواس باختہ ہو گیا ہوں مگر اب تیواڑی کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا میرے ہاتھ سے چاقو گرنے کی وجہ سے تیواڑی سخت برہم ہو گیا تھا۔ اُس نے میری گرفت سے کلائی چھڑانے کے لیے پے در پے کئی جھٹکے دیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ یہی کرے گا لیکن میں اپنا جسم ڈھیلا کر کے اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے جھول گیا تھا۔ کچھ اس طرح کہ میرے جسم کا سارا وزن تیواڑی کے ہاتھ پر آ گیا تھا۔ یہ دباؤ برداشت کرنا اُس کے لیے سخت اذیت ناک ہو گا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ظاہر ہے، اُس کے توازن کے ساتھ اُس کی سوچ بھی بگڑ گئی۔ وہ مجھ سے اس داؤ کی توقع نہیں کرتا ہو گا۔ بچھل سچ کہتا تھا کہ بہت سے داؤ موقع پر خود بخود تخلیق ہو جاتے ہیں۔ تیواڑی اب میری گردن اور منہ پر بھی ضربیں لگا سکتا تھا۔ میں اپنے گھٹنوں کے بل ترش پہ تقریباً بیٹھ گیا تھا۔ میں نیچے جھکا تو اُسے بھی جھکنے پر مجبور ہونا پڑا اور برجستہ احتیاط اُسے کوئی مناسب ضرب لگانے کے لیے کچھ سوچنا پڑا۔ اُس نے اچھا کیا۔ میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ اُس کا جھکا ہوا لاڑ ٹا اُسی ہاتھ کی سمت ہو سکتا تھا جس ہاتھ سے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے بائیں شانے تک جھک آیا۔ اُن چند لمحوں میں، میں نے اپنا جسم اڈا اپنے پیر پوری طرح قابو میں کر لیے تھے۔ جیسے ہی اُس کا جسم میرے شانے سے ٹکرایا۔ میں نے پھرتی سے اپنے جسم کو جنبش دی اور تمام تر طاقت سے شانہ کسی قدر اُوپر کر کے اُس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ میرے شانے سے گزرتا ہوا ترش پر چت گر گیا۔

اس جھونک میں چاقو اُس کے ہاتھ میں قائم رہتا تو مجھے اُس کی قسمت خطا میں معاف کر دینی چاہیے تھیں۔ میری تو تھے کے مطابق چاقو اُس کے ہاتھ سے نیچے گرا۔ ٹنی چٹخنے کی آواز آئی۔ وہ درد سے کراہا۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اُس کا چاقو اُٹھا لیا۔ ابھی میرا ہاتھ اُٹھا ہی تھا کہ بچھل چیخنے لگا۔ "نہیں نہیں ذرا ٹھہر۔" میرا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ "اسے اتنی آسان موت دے رہے ہو پگلے۔" اُس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ "چل ہٹ" اُس نے مجھے دُور دھکیل دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے تیواڑی پر جھپٹا۔ تیواڑی کی کرب ناک چیخ سے کمرہ لرز گیا۔ صرف ایک لمحے بچھل اُس کے جسم سے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی بند مٹھی میرے آگے کی میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ میرے ہاتھ میں تیواڑی کی کٹی ہوئی ناک تھی۔

یہ نے پٹ کے حیران آنکھوں سے تیواڑی کی طرف دیکھا۔

دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہوئے ترش پر بیٹھا رہا تھا۔ اُس کی کٹی ہوئی ناک میری ہتھیلی پر رکھی تھی اور بچھل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے جھرجھری سی آنے لگی اور میں بے اختیار اُس کے گلے لگ گیا۔ کمرے میں تیواڑی کی کراہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی مگر باہر کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے دوڑ کے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ سب سے آگے پیرو تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں کی کوشش کی۔ بچھل نے مجھے چھوڑ کے اُسے گلے لگا لیا۔ جامو اور نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور میرے گال چومنے لگے ایک دوسرے کو دھکیلتا اور کھینچتا ہوا آگے آیا اور ہم سے لپٹ کسی نے بچھل کا شانہ، کسی نے اُس کا گرتا، کسی نے اُس کی پنڈلیاں رکھی تھیں۔ پیرو داد بچھل کی گردن میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا اور دہاڑ رہا تھا لیکن لوگ ہمارے اطراف سے نہیں ہٹے۔ پیرو چیخا۔ "گوتم

جامو، کانتے، زورا، بھیما، مادھی اور دوسرے لوگ سے بغیر کے کپڑے خون اور پسینے سے تر بتر تھے جیسے وہ کہیں بھاری کھیل کے آئے ہوں۔ چند لمحوں تک لوگ اسی طرح شور کرتے دوسرے پر ٹوٹتے اور آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہے پھر جب بچھل نے ہاتھ ہلا کر کے انہیں خاموش ہو جانے اور دُور ہٹنے کی تلقین کرے کا شور کسی قدر کم ہوا۔ بچھل اونچی آواز میں مادھی کو پکار رہا تھا۔ بھیڑ کاٹتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ بچھل نے مضطرب لہجے میں اُس سے پوچھا۔ "گنتی کر لی ہے؟"

مادھی کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ "ایک" بچھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "سب ٹھیک ہے بچھل بھائی؟" مادھی کے بجائے جامو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کسی کو بھول تو نہیں آئے؟"

"اپن کا اکھا آدمی موجود ہے۔" مادھی ہانپتے ہوئے بولا۔

ہویا ہونے کو ہے۔" بچھل نے ناگواری سے کہا۔ "کیا اُن کے طرح اُڑ گئے؟" بچھل کا اشارہ واضح طور پر پولیس کی جانب میں بھن بھناہٹ سی بجنے لگی۔ "وہ ماسٹر مارٹی کا بچہ کدھر نہیں ذرا ٹھہر۔" میرا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ "اسے اتنی آسان موت ہے رے پگلے۔" اُس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ "چل ہٹ" اُس نے مجھے دُور دھکیل دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے تیواڑی پر جھپٹا۔ تیواڑی کی کرب ناک چیخ سے کمرہ لرز گیا۔ صرف ایک لمحے بچھل اُس کے جسم سے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی بند مٹھی میرے آگے کی میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ میرے ہاتھ میں تیواڑی کی کٹی ہوئی ناک تھی۔

یہ نے پٹ کے حیران آنکھوں سے تیواڑی کی طرف دیکھا۔

دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہوئے ترش پر بیٹھا رہا تھا۔ اُس کی کٹی ہوئی ناک میری ہتھیلی پر رکھی تھی اور بچھل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے جھرجھری سی آنے لگی اور میں بے اختیار اُس کے گلے لگ گیا۔ کمرے میں تیواڑی کی کراہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی مگر باہر کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے دوڑ کے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ سب سے آگے پیرو تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں کی کوشش کی۔ بچھل نے مجھے چھوڑ کے اُسے گلے لگا لیا۔ جامو اور نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور میرے گال چومنے لگے ایک دوسرے کو دھکیلتا اور کھینچتا ہوا آگے آیا اور ہم سے لپٹ کسی نے بچھل کا شانہ، کسی نے اُس کا گرتا، کسی نے اُس کی پنڈلیاں رکھی تھیں۔ پیرو داد بچھل کی گردن میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا اور دہاڑ رہا تھا لیکن لوگ ہمارے اطراف سے نہیں ہٹے۔ پیرو چیخا۔ "گوتم

جامو، کانتے، زورا، بھیما، مادھی اور دوسرے لوگ سے بغیر کے کپڑے خون اور پسینے سے تر بتر تھے جیسے وہ کہیں بھاری کھیل کے آئے ہوں۔ چند لمحوں تک لوگ اسی طرح شور کرتے دوسرے پر ٹوٹتے اور آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہے پھر جب بچھل نے ہاتھ ہلا کر کے انہیں خاموش ہو جانے اور دُور ہٹنے کی تلقین کرے کا شور کسی قدر کم ہوا۔ بچھل اونچی آواز میں مادھی کو پکار رہا تھا۔ بھیڑ کاٹتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ بچھل نے مضطرب لہجے میں اُس سے پوچھا۔ "گنتی کر لی ہے؟"

مادھی کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ "ایک" بچھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "سب ٹھیک ہے بچھل بھائی؟" مادھی کے بجائے جامو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کسی کو بھول تو نہیں آئے؟"

"اپن کا اکھا آدمی موجود ہے۔" مادھی ہانپتے ہوئے بولا۔

"مگر..... مگر بچھل! بچھل بھائی!" پیرو تڑپ کے اک اٹک کے کہا۔ "تم اسے کچھ دن اپنے پاس رکھنا چاہو تو رکھو۔ اس کا زخم بھر جائے تو اسے بھیج دینا۔ اب بٹنے کا خرچہ بھی بچ جائے گا۔ جامو! اسے سامنے سے اُٹھا لے اور تو بھی اپنا حلیہ ذرا ٹھیک کر کے آ۔ بڑی کرخت بچھل بھلا کے بولا۔

جامو نے بڑھ کے تیواڑی کو ایک جھٹکے سے کھڑا کیا مگر وہ اُس پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ تیواڑی نے زمین پر پڑا اپنا چاقو تک اٹھا لیا۔ اُس نے اُسے اُٹھا تو لیا مگر وہ اپنے سینے میں پیوست نہیں کر پایا کیونکہ کانتے نے بجلی کی طرح لپک کے اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ دبوچ لیا۔ میں پکڑ یا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے جبڑے پر مکا مارا۔ تیواڑی اپنے اوسان کھو چکا تھا اور اب وہ کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں تھا اس لیے جامو کو پھر اُس کے نزدیک جانا پڑا۔ اُس نے اُس کی گردن میں اپنے بازو ڈال کے اُسے دبوچ قابو میں کیا۔ اس اثنا میں کانتے تیواڑی کے چاقو چھین کے میری طرف اُچھال چکا تھا۔ جامو اور کانتے تیواڑی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے مگر بچھل کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔ "جامو استاد!" بچھل نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اس حرام کی اولاد کو ہوش آئے تو بول دینا کہ چاقو کے ساتھ ساتھ آنکھ کی دھار بھی تیز رکھنا پڑتی ہے اور بول دینا کہ مُنڈے کی آنکھ کھل ہو جائے تو چاقو بھی نہیں چلتا اور اس اس سوکھے کے بچے کو یہ بھی بول دینا کہ اچھا آدمی کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ بس اب اسے لے جا۔ لے جا۔" پیرو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُس کی زبان بند کی۔

اُن کے جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے کمرے پر سکوت چھا گیا۔ فرش پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ میری مٹھی میں ابھی تک تیواڑی کی ناک دبی ہوئی تھی۔ پیرو داد ہم دونوں کے ہاتھ تھامے بڑبڑاتا ہوا ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔

ہم کوئی آدھے گھنٹے منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے اڈے کے سب سے بڑے ہال جیسے کمرے میں آئے۔ یہاں پہلے سے کئی آدمی موجود تھے۔ درمیان میں سماوار رکھا ہوا تھا اور چائے کی خوشبو پھیل ہوئی تھی۔ ہم تینوں کو گلاسوں میں بغیر دودھ کی چائے پیش کی گئی۔ اس دوران میں وہاں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ ہماری طرح سب نے اپنے حلیے درست کر لیے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد جامو اور کانتے ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ بچھل نے انہیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ جامو نے ایک ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا۔ کرتے کی ایک آستین پھولی ہوئی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ آستین کے نیچے کلائی پٹیوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ کانتے کی پیشانی اور کانوں پر روئی چپکی ہوئی تھی۔ روئی کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اُس کے منہ کے درمیانی

حقے سے ٹھوڑی تک بھی ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔ پٹی کے باہر کانتے کے بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ تنگ لباس میں اُس کا چوڑا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ پیرو دادا تجمل کے کان میں کچھ کہہ کے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ جامو اور کانتے نے چائے ختم ہی کی تھی کہ تجمل نے مجھے ٹھوکا مارا اور نرم آواز میں ہدایت کی کہ میں جامو اور کانتے کو ساتھ لے کے جلد از جلد گھر روانہ ہو جاؤں۔ وہ دونوں جز بز ہونے لگے۔ میں سمجھتا تھا، وہ انکار کر دیں گے کیونکہ توقع گھر جانے کا نہیں تھا لیکن وہ دونوں کسی کے روکنے پر رُک گئے۔ میں نے مائی اور دوسرے لوگوں کو دیکھنے کا بہانہ کرنا چاہا مگر تجمل نے میرا منہ بند کر دیا۔ اُس نے مجھے تاکید کی کہ میں جامو اور کانتے کو گھر ہی روکے رکھوں۔ اس تاکید کے بعد جبل دجبت کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے تجمل کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ ابھی اندھیرا تھا اور ہم روشنی پھیلنے سے پہلے گھر پہنچ سکتے تھے۔

"اور تم — ؟" میں نے متفکر لہجے میں تجمل سے پوچھا۔

"میں پیرو دادا کے ساتھ رہوں گا۔" وہ درشتی سے بولا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جامو اور کانتے اُٹھ گئے۔ نتیجتہً مجھے بھی اُن کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ باہر بوڑ تیار کھڑی تھی۔ ہم تینوں بھیلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کانتے نے اپنا سر میرے کندھے پر ڈھلکا دیا تھا۔ میرا دماغ جل رہا تھا۔ ڈرائیور کی موجودگی میں اُن سے کچھ پوچھنا نازیبا تھا۔ سارے راستے خاموشی رہی پھر گھر سے خاصے فاصلے پر میں نے گاڑی رکوا دی۔ مجھے اس احتیاط کا اچانک خیال آ گیا تھا۔ ہم دبے دبے قدموں سے اندھیرے میں گھومتے ہوئے چند منٹ میں گھر پہنچ گئے۔ دروازہ پہلی ہی دستک پر کھول دیا گیا۔ جولین سامنے کھڑی تھی۔ ہم تینوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ ڈرائنگ روم میں ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ ایک کتاب فرش پر گری ہوئی تھی، باقی کتابیں صوفے پر بکھری ہوئی تھیں۔ جولین نے جلدی جلدی اپنا لباس درست کیا۔ وہ سراسیمگی سے ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ "تم اب تک جاگ رہی ہو؟" میں نے اُس کی حیرت اور پریشانی کم کرنے کے لئے نرمی سے پوچھا۔

اُس کی پلکیں پٹ پٹانے لگیں اور اُس نے تیزی سے گردن ہلائی۔

"جامو اور کانتے بھائی آرام کریں گے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہمارے لیے کوئی تکلیف مت کرنا۔" کانتے درمیان میں بولا۔

"یہ کیا ہو گیا؟" وہ کانتے کی پٹیوں کی طرف انگلی اُٹھا کے دہشت سے بولی۔ "تجمل بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ بھی جلد ہی آ جائیں گے، ذرا معمول سا بگھڑا ہو گیا تھا۔ کانتے اور جامو بھائی کو کچھ چوٹیں آئی ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ دودھ ہو تو گرم کر کے انھیں پلا دو۔"

"دودھ والا بس آتا ہی ہو گا۔" اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں بازار سے دودھ لے آتا ہوں تم ان کے لیے بستروں کا انتظام کر دو۔" جامو اور کانتے نے منع کیا لیکن جولین بھاگی ہوئی باورچی خانے سے دودھ کا برتن لے آئی۔ میں اُن دونوں کو وہیں چھوڑ کے گلی میں نکل گیا۔ دودھ والا راستے ہی میں مل گیا۔ جب میں واپس آیا تو جامو اور کانتے بستروں میں جا چکے تھے۔ جولین نے اتنی دیر میں دونوں کے لیے بستروں کا انتظام کر دیا تھا۔ انگیٹھی بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے کانتے کا لباس بدلوا دیا اور اُس کے لباس بیٹھ کے اُس کا سر و تار ہلا۔ صبح کی روشنی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ جامو نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ جولین کی آہٹ پر وہ دونوں بھی اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ جولین دودھ کے ساتھ مکھن اور بسکٹوں سے بھری ہوئی کشتی ساتھ لائی تھی۔ دودھ پیتے ہی جامو نے مجھے بھی اپنے ساتھ سو جانے کا شور مچوایا۔ میں تھوڑی دیر بعد آنے کا بہانہ کر کے باہر آ گیا۔ میرے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا اور نیند کی آنکھیں اُن کی طرح بوجھل تھیں۔ ڈرائنگ روم میں جولین مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگی۔ میں نے تیواڑی کی ناک کا غذ میں لپیٹ کے جیب میں رکھ لی تھی۔ سوچا تھا، اُسے دکھاؤں گا تو وہ ڈر جائے گی اور جب اُسے معلوم ہو گا کہ یہ کس کی ناک ہے تو اُس کی حالت قابلِ دید ہو گی۔ وہ کرشناجی کو اپنے باپ سے زیادہ یاد کرتی تھی۔ یہ مکان بھی اُسے کرشناجی ہی نے دلایا تھا۔ اُس نے ہر کمرے میں اُن کی تصویر سجا رکھی تھی۔ تیواڑی کی ناک میری جیب میں پڑی رہی اور میں اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلاتا رہا لیکن خود میری زبان بہک رہی تھی اور میرے منہ سے اوندھے سیدھے لفظ نکل رہے تھے۔ میں نے اُسے جامو اور کانتے کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُن کا کمرہ بند رہے اور پڑوسیوں کی نظریں اُن پر نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں ایسی باتیں کر کے خود اپنی ہی ہوئی تسلی خیز باتوں کی نفی کر رہا ہوں۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بند کرنے کی کوشش کی تو میری خاموشی سے وہ اور پریشان ہو گئی حالانکہ اندیشے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تجمل نے انھیں محض احتیاطاً گھر بھیج دیا تھا کہ وہ آرام بھی کر لیں گے اور وقتِ پرپولیس کے آنے کے بعد کوئی اُلجھن بھی پیدا نہیں ہو گی۔ دوسرے زخمی لوگوں کی طرح تجمل انھیں کسی اور جگہ بھی بھیج سکتا تھا اور اگر زیادہ تشویش کی بات ہوتی تو وہ انھیں کسی بھی گاڑی سے روانہ کر سکتا تھا۔ مقتنی دیر میں پولیس تفتیش شروع کرتی، وہ کسی اور شہر میں گھوم رہے ہوتے۔

کانتے کا سر دباتے ہوئے مجھے اُس سے چند ہی باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُن کے ساتھ ستر کے قریب منتخب آدمی تھے۔ وہ آدھی رات گزرنے کے بعد تیواڑی کے اڈے کے اطراف پھیل گئے تھے۔ انھوں نے اپنے راستے میں مزاحم ہونے والے ہر آدمی کو خاموش کر دیا

تھا۔ وہ گرفتاریاں بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا میں تو اپنے طور پر ہی سوچ سکتا تھا۔ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں صرف اندازے لگا سکے جا سکتے تھے۔ یہ امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ واقعات بالکل مختلف نوعیت سے پیش آئیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ میں جلد سے جلد تجمل کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ چاہے مجھے دیکھ کے وہ کتنا ہی ناراض ہو۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر تجمل پر کوئی حرف آیا تو میں ساری ذمہ داری اپنے سر لے لوں گا۔ پیسے آگے پیچھے دنیا میں ہے ہی کون۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ جامو اور کانتے گہری نیند سو چکے ہوں گے تو میں نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ کمرے میں گیا اور کوئی آہٹ پا کے نیند میں نے الماری سے اپنے کپڑے نکال لیے۔ وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ غسل خانے میں آ کے میں نے جیسے تیسے باس تبدیل کیا۔ جو کپڑے رات پیڑ کے اڈے پر پہنائے گئے تھے، وہ زمین پر تھے۔ جیسے ہی اُٹھتے وقت میرے ہاتھ میں پھر تیواڑی کی ناک آ گئی۔ میں اُسے خالی میں پھینکتے پھینکتے رہ گیا۔ نالی میں پھر بھی کسی قدر صاف پانی تھا۔

جولین اور پیچا کو ایک بار پھر جامو اور کانتے کے بارے میں خیال رکھنے کا کہہ کے میں گھر سے نکل آیا لیکن کچھ دُور پہنچ کے مجھے اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ میری جیب میں چند ہی سکے تھے۔ دوبارہ گھر واپس آ کے میں نے جولین سے چند روپے لیے اور ایک لمحہ بھی گھر میں ضائع نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پیڑ کے علاقے میں تھا۔ تکیسی باتے میں پھوٹ کے تیز قدموں سے میں پاڑے کی طرف بڑھنے لگا۔ علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی تھی۔ تقریباً ساری دکانیں کھل گئی تھیں، آگے مجھے پیڑ کے پاڑے کے دو ایک آدمی گشت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے اُن سے نگاہ چرانے کی کوشش کی مگر مجھے دیکھ کے وہ خود ہی بھاگتے ہوئے میری جانب لپکے۔ "کیا حال ہے!" میں نے پُرسکون لہجے میں اُن سے پوچھا۔

"اکھا خیر ہے راجا جی؟" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اور اُس طرف؟" میں نے نگاہوں سے پوچھا۔

اُن میں سے ایک نے آنکھ ماری، دوسرے نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے بانسری بنائی اور سیٹی بجانے لگا۔ میں اُن کے شانے دباتا ہوا آگے نکل گیا۔ علاقے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیڑ کے آدمی موجود تھے۔ یہ احتیاط بے سبب نہیں ہو گی۔ آگے کہیں کہیں تین تین، چار چار دُور سے انھیں اشارے کرتا ہوا پاڑے پہنچ گیا۔ عمارت میں قدم رکھ کے مجھے اپنا وزن کچھ ہلکا محسوس ہوا۔ دنیا کے معمول کے مطابق جل پھیل تھی، وہ سب مجھے روک کے بات کرنا چاہتے تھے لیکن میں سیدھا بڑھے کرے میں آ گیا۔ پیرو سامنے کی چوکی پر بیٹھا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ صرف ایک

جاگیا پہنے ہوئے تھا۔ ایک آدمی اُس کے کھنچے ہوئے سڈول جسم کی مالش کر رہا تھا۔ منہ پر نظر پڑتے ہی پیرو نے ان دونوں کو ہاتھ مار کے بھگا دیا اور چرخ سے اُٹھ گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ تشویش سے بولا۔ "تم اتنی جلدی کیسے واپس آگیا؟"

"منجھل بھائی کہاں ہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اپن نے بڑی مشکل سے اُسے کمرے میں بند کیا ہے۔ منجھل بھائی کئی دن سے جگائی کر رہا ہے لاڈلا! ابھی اپن نے بولا کہ تم اندر نہیں جائیں گا تو اپن تم سے کبھی بات نہیں بولیں گا۔" پیرو ہنسنے لگا۔ "استاد مان گیا۔"

"مادر فی اور دوسرے لوگ کدھر ہیں؟"

"سب سالا اپنے اپنے ٹھکانوں پر پارسل کر دیا گیا ہے۔ کوئی بات نہیں لاڈلا جانی! اب ڈنٹ فاٹ ہے۔ تم ایدر بیٹھو۔ بولو کیا پیئں گا؟ کیا کھائیں گا؟" وہ بیری کریں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ایسا جلدی کیسے آگیا؟"

"بس آگیا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"تو ایدر بیٹھو۔ بیٹھو راجا! ابھی تم سے بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا سالا رات بھر کائیں کائیں ہوتا رہا۔ رات اپن نے پہلا بار تیرا کھیل دیکھا راجا! وہ سالا تیواڑی کا پلا، آگی شہر میں کاوتا بھوکتا پھرتا تھا۔ جب تُو نے چاقو پھینکا تھا تو اپن کا مغز بھی فرطِ جوش ہو گیا تھا۔ اپن نے منجھل بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ سالا کیا داؤ تیرے بھیجے میں آیلے کہ تُو نے یوں کھٹاک چاقو پھینک دیا۔ پھر اُدھر منجھل بھائی نے ترسالا سب کی آنکھ فیر دیا۔ اپن نے ایسا جادو کبھی نہیں دیکھا۔ ایک پل میں بھاگ کے اُس کے پاس پہنچا اور دیکھتے دیکھتے ناک کاٹ لایا۔ نہ اُس کا لاسیس تیواڑی کو بلنے کا ٹائم دیا نہ جھلنے کا۔ ایسا جان پڑتا ہے جیسے تیواڑی ناک آگے کیے سالا تیار بیٹھا تھا کہ آڈا استاد منجھل! اپن کا ناک کاٹ لو۔ پتہ نہیں منجھل بھائی کب گیا، کب واپس آیا، سالا لوگ باگ سویرے سے ہمارا مغز کھانے سے کر دا! رات کو اپن لوگوں نے کیا دیکھا تھا، ہم بولا جادو دیکھا تھا، سپنا دیکھا تھا سالا!"

میں چپ بیٹھا سنتا رہا، وہ میرے جاگنے، کانتے اور منجھل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ میرے کچھ اور قریب کھسک آیا اور سرگوشی میں اصرار کرنے لگا کہ میں منجھل سے کہہ کے بمبئی میں اُس کا قیام چند دن کے لیے اور بڑھوا دوں۔ میں نے کہا کہ یہ سب منجھل کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کب یہاں سے جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ کم از کم پھر میں بھی اس شہر میں رُک جاؤں کیونکہ تیواڑی کا پاڑا آجانے کے بعد اتنا بڑا علاقہ سنبھالنا اُس کے لیے دشوار ہوگا۔ میں نے کہا کہ مجھے پاڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے تو ایک مجبوری کے سبب جھنگا استاد سے پاڑا لیا تھا اور وہ بھی مجھے تو کب کا بمبئی سے چلا جانا چاہیے تھا۔

"اپن کا سب کچھ تیرا ہے لاڈلا! پہ ایک بار ہاں کہہ دے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"اگر پاڑا چلانے کا کام کرنا نہیں چاہتا تو مت چلانا۔ تُو راجا بن کے رہنا اور کبھی پاڑے میں مت آنا۔ اپن تجھ کو منجھل کی طرح سمجھے گا راجا!"

"پیرو دادا!" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "مجھے جانا ہے۔"

"اپن کو پتہ ہے مجھے جانا ہے۔" منجھل نے اپن کو کچھ کچھ تیرے بارے میں بولا ہے۔ پر بہت زیادہ نہیں۔ اپن پوچھتا رہ گیا، بولا پیرو دادا! اپن کا اپنے آپ کو بند کرتا ہے تو مجھ سے اُس کو مت کھدواؤ۔ بول لاڈلے! اپن تیرے لیے کیا کر سکتا ہے؟"

"تمھارا بہت بہت شکریہ پیرو دادا! تم نے تیواڑی کے معاملے میں ہماری مدد کی۔ یہی بہت ہے۔ تمھارا دل بہت بڑا ہے۔"

"اپن نے کچھ بھی نہیں کیا لاڈلا! اپن تو میٹھا سا دیکھتا رہا۔" وہ اضطراب سے بولا۔ "لاڈلا! اپن نے تیرے لیے ایک بات سوچا ہے۔ ذرا تسلی سے سننا۔" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "لاڈلا! اپن چاہتا ہے کہ ابھی منجھل بھائی سے ایسا رشتہ بنا لے کہ کبھی نہ ٹوٹے۔ اپن نے منجھل بھائی سے کوئی بات نہیں بولا ہے۔ اپن نے سوچا، پہلے تجھ سے بات کر لے گا۔" وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "کچھ اور مت سمجھنا۔ خیال کر لینا کہ تیرے سامنے پیرو دادا بول رہا ہے جس کا کوئی عزت ہے۔ اپن تجھے ایک راز کی بات کھول رہا ہے۔ منجھل بھائی کی طرح اپن کا بھی ایک اولاد ہے۔ وہ اپن کا بیٹا بھی ہے، بیٹی بھی۔ اپن نے اُسے پاڑے کی زندگی سے مُحال رکھا ہے۔ اس کی ماں بڑے گھرانے کی عورت ہے۔ اپن اُسے لے آیا تھا۔ یہ ایک لمبا کہانی ہے۔ بس اتنا جان لے کہ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں گیا اور اپن بھی اُسے ایدر نہیں لایا۔ اپن نے آگے زندگی بنتا کھیلتا دیکھنے کے لیے بتا دیا ہے۔ جو باقی رہ گیا ہے، وہ بھی اُسی کے لیے ہے۔ اپن اُس کے ماتھے پر ایک لکیر دیکھنا نہیں مانگتا تھا۔ جو کچھ اپن سے ہو سکا، اُس کے لیے کیا۔ یہ پاڑا، یہ سالا آگی دھندا اُسی کے لیے ہے۔ سن جانی! اپن کی رانی کا ایک بیٹی ہے، ابھی اپن اپنے منہ سے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا بولے۔ وہ چانہ کا ٹھرکا ہے۔ پڑھتا کھتا ہے۔ اپن تجھے اُس کو دینا چاہتا ہے۔ اپن پیرو دادا ہے لاڈلا! کوئی باپ اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا نہیں بولتا پر اپن نے تجھ سے کوئی شرم نہیں کیا ہے کیونکہ اپن کا من صاف ہے اور اپن صاف بات مانگتا ہے۔ تو اُسے لے لے۔"

میرا گلا گن گنانے لگے۔ "پیرو دادا!" میں نے دہشت سے کہا۔

"ایسی باتیں مت کرو۔ جن کا جواب سنتے ہوئے تمھیں دُکھ ہو۔ تم مجھے اس لائق سمجھتے ہو، یہ تمھارا احسان ہے، بہت شکریہ۔" میری آواز گھٹ گئی۔ "مگر میں..... میں کسی لائق نہیں ہوں۔ مجھے نہ تو منجھل بھائی کے پاس رہنا ہے نہ کہیں اور۔ زبان بند کر لو پیرو دادا! بھول جاؤ تم نے..... تم نے ابھی مجھ سے یہ باتیں کی ہیں۔ مجھے اپنی نظروں میں مت گراؤ۔ مجھے اتنا نادم مت کرو۔"

"اپن کا کوئی زور نہیں ہے، اپن جانتا ہے۔"

"اس سے آگے کوئی بات مت کرنا، پیرو دادا!"

"لاڈلا! اپن تجھ سے منت نہیں کرتا، سوچنے کو بولتا ہے۔ اپن نے سوچا ہے۔ یہ باتیں زور دینے کی نہیں ہوتیں۔ یہ سب تیرے ہی پرسنے کے لیے تیرے سامنے ایک بات رکھی ہے۔ تُو چاہے تو اُسے ایک بار بھلے لے۔ تیرے لیے اپن یہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بہت اچھا بیٹی ہے۔ ایک دم ایک نمبر ہے۔"

"وہ ضرور اچھی ہوگی لیکن میں بہت بُرا ہوں پیرو دادا! کچھ اور بات کہو میرے لیے سر اُٹھانے کی گنجائش باقی رکھو۔"

"تُو سوچ لے۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "اچھی طرح سوچ لے۔ اپن منجھل بھائی کے فالک نہیں جانتا کہ تُو چاقو اُٹھائے۔ اپن تجھ کو وہی دیکھنا مانگتا ہے جو منجھل دیکھنا مانگتا ہے اور جیسا تُو خود ہے۔"

میں نے اُس کے ہیر پکڑ لیے۔ "سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے پیرو دادا!" میری آواز بھرّانے لگی۔ "اپنے لفظ واپس لے لو پیرو دادا!"

وہ کسی بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھے اپنے سارے جسم پر اُس کی نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ جی میں آیا، اُٹھ کے بھاگ جاؤں لیکن پیرو بھر بھری لیتا ہوا خود سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹائے اور انھیں اپنے سینے پر رکھ لیا۔ سہلانے لگا پھر اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں لفظ ہی ڈھونڈتا اُسے کس طرح بتاؤں۔ کیا کہوں۔ وہ اب کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اپن خاموشی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پیرو میرا ہاتھ چھوڑ کے چکی سے اُٹھ گیا۔ اسی وقت ایک آدمی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور پیرو کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ پیرو کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "اسے دو۔" وہ گرج کے بولا۔ "آنے دو۔"

"کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"پولیس کا آدمی۔" وہ تکملہ کے بولا۔ "لاڈلا! تم اندر جاؤ۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ جاؤ تم۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔

"میرے یہاں رہنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"نہیں لاڈلا! تم بات سمجھا کرو۔ وہ علاقے کی پولیس کا آدمی ہے کوئی خاص بات بولنا چاہتا ہوگا۔ ابھی اپن نے بھی اپنا کئی آدمی اور بھرتی کرانا ہے۔ تم ایدر سویرے سویرے کیسے واپس آگیا۔ تم کو منجھل بھائی نے گھر بھیجا تھا۔ تم اُن دونوں کو چھوڑ کے ایدر کیوں آگیا۔ ابھی تم اندر بھی مت جاؤ بلکہ پاڑے سے باہر جا کے ٹیکسی پکڑو اور سیدھا گھر جاؤ۔ کوئی بات ہوگا تو اپن آدمی بھیج دیں گا۔"

"میں تو گھر سے یہاں آیا ہوں اور تم واپس جانے کو کہتے ہو؟ جاسو اور کانتے گھر میں سو رہے ہیں جس طرح تم اور منجھل بھائی یہاں ہو، میں بھی ہو سکتا ہوں۔"

"تم بھی ہو سکتا ہے، پر تم کو منجھل بھائی نے کیا بولا تھا، تم سامنے مت آؤ تو اچھا ہے۔ ابھی ہم سالا ایدر کیا کھچی مار رہا ہے۔"

"مجھے یہیں رہنے دو۔ آخر تم مجھے کیوں واپس کرنا چاہتے ہو؟"

"لاڈلا! بچہ مت بنو۔ وہ سمجھنا بولا۔" اپن بولتا ہے تم جاؤ۔ وہ علاقے کا آدمی ہے۔ تم کو ایدر نہیں دیکھے تو ٹھیک ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی نوا آدمی ہو سکتا ہے۔ اپن ایدر موجود ہے، تم کیوں ٹکر کرتا ہے۔"

"اگر انھوں نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوں گا۔ پر کچھ بھی ہو سکتا ہے، ابھی اپن نے اپنا جیسا سوچا ہے، سالا دن کا رات ہوتے ہوتے کیا دیر لگتا ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ اڈا اب میرے ہاتھ سے چلتا ہے۔ کیا علاقے کی پولیس اس بات سے بے خبر ہوگی؟ میں یہاں نہیں ہوں گا تو وہ اور شکل ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ پوچھیں گے نہیں کہ راجا کون ہے اور کدھر ہے، پھر تم کیا جواب دو گے؟ ہم سب کو اُن کا سامنا کرنا چاہیے۔ جو زخمی ہیں اُن کی عدد کی تو بات ٹھیک ہے لیکن میرے جسم پر کوئی نشان نہیں ہے۔ میں بھی تمھاری طرح اُن کے سامنے آسکتا ہوں اور اُن سے بات کر سکتا ہوں۔"

"لاڈلا! یہ اڈا تیرے نام سے ضرور ہے اور تیرا ہی ہے۔ پر تُو نے آج تک علاقے کا پولیس کا آدمی سے بات نہیں کیا۔ اب بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپن زیادہ بات نہیں بولتا۔ وہ اب آتا ہی ہوگا۔ جا پچھلے دروازے سے نکل جا۔ وہ کوئی بھی ارادہ دل میں لے کے آسکتا ہے۔ وہ اپن سب کو چوڑیاں بھی پہنا سکتا ہے۔ لاڈلا! ماں دادا بھی تو دیکھ۔ پولیس سالا پبلک کو اور بڑا افسر کو کیا منہ دکھائیں گا۔ کچھ نہ کچھ تو اُسے کرنا ہوئیں گا۔ پولیس والا یہ نہیں سمجھیں گا کہ تیواڑی کے اڈے پر جگہ جگہ یہ پان کا پیک کس نے تھوکا ہے۔ کس پلٹے والا آدمی نے ایسا کیا ہوگا۔ وہ ہر طرف آئے گا۔ ایدر بھی آئے گا اور ایدر پہلے آئے گا کہ اپن کا اور تیواڑی کا بہت پہلے سے گٹھا تھا۔ اپن سالا تیواڑی سے سدا ہارتا گیا کہ اپن وہ دھندا نہیں کر سکتا تھا جو تیواڑی کرتا تھا۔ وہ سالا تو آدمی نہیں لگتا تھا۔"

"اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"

"لاڈلا! دھیان سے لگاؤ۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "تم کو یہ سب نہیں کرنا تو تم ایسا کیوں سوچتا ہے۔ جو اپن بولتا ہے وہ کرو۔ تم کیوں جائیں گا جب اپن ایدھر بیٹھا ہے۔ زیادہ آدمی جانا ٹھیک ہے یا کم آدمی؟"

"تھانے اور بھجل بھائی کے بدلے میں چلا جاؤں گا۔"

"اور اپن تجھے جانے دیں گا؟" وہ طیش میں بولا۔ دروازے سے ایک اور آدمی بھاگ کے آیا۔ پیڑو نے مجھے سخت لفظوں میں خفیہ دروازے سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میری کوئی بات اُس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جیل میں سات سال گزارے ہیں اور ان پولیس والوں سے میرا واسطہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ ٹبان سے ایک لمحے کے لیے ہٹنے کو میرا بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے حالات کی نزاکت کا پوری طرح احساس تھا۔ بھجل اندر موجود تھا۔ جو اس کا حشر ہوتا وہی میرا بھی ہوتا مگر پیڑو کا اصرار اتنا شدید تھا کہ مجھے اُس کی بات ماننی پڑی۔

پولیس اندر آئی تو ایک آدمی نے مجھے اشارہ کیا اور پاڑے کے خفیہ دروازے سے باہر نکال دیا۔ یہ دروازہ سڑک پر کھلنے کے بجائے برابر کی عمارت کے ایک فلیٹ میں نکلتا تھا۔ فلیٹ میں پیڑو کے ایک آدمی کا کنبہ رہتا تھا۔ اُس آدمی نے مجھے فلیٹ میں رکنا چاہا مگر میں سیڑھیاں اترتا ہوا گلی میں آگیا۔ علاقے میں ہر طرف پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ میں پاڑے سے کچھ دُور ہوٹل میں جا کے بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں پاڑے کا پھاٹک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ چائے کے دوران میں میری نظریں اسی دروازے پر مرکوز تھیں۔ ہوٹل میں پاڑے کے کچھ اور آدمی بھی تھے لیکن وہ مجھ سے لاپروا بنے بیٹھے رہے۔

مجھے متلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین گھونٹوں میں چائے ختم کرلی۔ ہوٹل میں بہت شور تھا۔ زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور میز پر کہنیاں ٹیک کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا ہوٹل میں آنے والے کے لیے گانا سننا شرط ہے۔ پیڑو کے جو آدمی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے، اُن سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انھیں بھی معلوم ہوگا کہ پاڑے میں پولیس موجود ہے اور وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں انہی کے خوف سے یہاں آکے بیٹھ گیا ہوں۔ جب خود میرا یہ حال ہے تو اُن پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے سوچا۔ واپس پاڑے چلا جاؤں۔ اس سے بہتر تھا کہ میں اس ہوٹل ہی میں نہ آتا بلکہ کہیں اور نکل جاتا لیکن یہاں آنے کے بعد اچانک اُٹھ جانا اُن کے لیے اور توشویش کا سبب ہوتا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ یہ ایک موزوں ترین جگہ تھی یہ یہاں سے میں پاڑے کی عمارت میں آنے جانے والے ہر شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ خاصی دیر ہوگئی۔ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ مجھے اپنے آپ پر چڑ ہونے لگی کہ میں نے پیڑو کی بات رد کیوں نہیں کردی۔ یہاں تماشائی کی طرح آکے کیوں بیٹھ گیا۔ پھر سوچا سویرے میں گھر سے واپس آنے کا کیا مقصد تھا۔

میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ سر میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ پولیس والے ابھی واپس نہیں ہوئے تھے۔ بہت لگتا تھا کہ جب وہ باہر نکلیں تو بھجل، پیڑو اور پاڑے کے بہت سے آدمی اُن کے ہمراہ ہوں۔ اگر نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ رات کو تیواڑی کے پاڑے میں گھس کے چاقوؤں کی دھار آزمائی جائے اور اُسے کسی نہ کسی طرح کھلی آنکھوں اور چلتے ہوئے جسم کے ساتھ پکڑے میرے سپرد کردیا جائے اور صبح اس واردات کے الزام میں خود کو پولیس کے حوالے کردیا جائے تو یہ خوب لطیفہ تھا۔ یہ نتیجہ بھگتتے ہوئے پیڑو اور بھجل مجھے شریک نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نتائج کی ساری ذمے داری انھی پر آنی چاہیے۔ جیسے تیواڑی سے تو انھی کا معاملہ تھا نا۔ میں تو ایک مہمان کا آدمی تھا اور میں نے تو انھیں اس کام کا ٹھیکا دیا تھا۔ نہ میں اُن کی سوچ میں شریک تھا۔ نہ میں نے عملی طور پر اُن کا ساتھ دیا تھا۔ وہ چلے جائیں اور میں دیکھا کروں خوب۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتے تھے۔

اگر بھجل کو یہ اندیشہ تھا کہ کرشنا جی کی وجہ سے بہت سے پولیس افسر میرے صورت آشنا ہیں، میں یہاں موجود ہوں گا تو اُن میں سے کوئی بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ مرنے کے بعد کرشنا جی کے نام پر کسی قسم کا داغ آئے۔ مجھے پہچان لیا جاتا تو اخبارات اور شہر بھر میں قسم قسم کی افواہیں بھن بھنانے لگتیں۔ متنازعہ واقعہ دہرایا جاتا اور کہا جاتا کہ راج کرشنا ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ رکھتا تھا جس کا تعلق شہر کے مشہور داداؤں سے ہے مگر وہ تو میں کسی وقت بھی پہچانا جاسکتا تھا۔ کرشنا جی کے ہاں بڑے افسر آتے تھے۔ اُن کا تعلق پولیس میڈل کرار سے تھا یا ہیڈ آفس سے۔ علاقوں کے چھوٹے افسر سے اُن کا رابطہ کم رہتا تھا۔ اس لیے علاقوں کے پولیس والے مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ادھر میں نے اپنے آپ کو محدود رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مجھے اس بات کا بہت پہلے سے خیال تھا۔ پاڑے کے تمام معاملات زدار اور چھیدا ہی پولیس سے طے کرتے تھے۔ رات کو بھی عموماً پاڑے میں نہیں ہوتا تھا۔ پھر کرشنا جی کی موت کو کئی مہینے گزر گئے تھے جب میں نے پھندگا استاد کے پاڑے میں قدم رکھا تھا۔ پاڑا لینے کے بعد کرشنا جی کے اہل خانہ کی نشان دہی میں بھی خاصا وقت لگ گیا۔ یوں عرف پر کوئی جاننے والا افسر کبھی دیکھ لیتا تو اسے یہ کیسے پتہ چلتا کہ پھندگا کے پاڑا پھینکنے والا شخص میں ہی ہوں۔ پھندگا کے پاڑے میں خود بخود میرا نام راجا پڑ گیا تھا لیکن کسی اڈے اور پولیس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو میں کسی جاننے والے کی نظر میں آسکتا تھا۔ میری شناخت کرشنا جی کی رسوائی تھی مگر اُن کے قاتل آزاد گھومتے رہیں، یہ بے شرمی اُس رسوائی سے زیادہ تکلیف دہ تھی کرشنا کے سامنے میری سبکی نہیں ہوئی۔ جب بھی اُن کی تصویر پر نظر پڑتی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ تاہم مجھے اس بات کا قلق تھا کہ یہ سب کچھ اُن کے مرنے کے بعد ہوا۔ مرنے سے پہلے ہوتا تو وہ مجھے لپٹا کے خوب پیار کرتے، اُن کا بہت نام ہوتا اور وہ زندہ رہ جاتے۔

میری شناخت اب بھی اُن کے لیے ایک نازیبا بات تھی حالانکہ اب صورت بالکل بدل ہوئی تھی لیکن اب بھجل موجود تھا۔ تیواڑی کے عوض اگر بھجل کے اندر جانے کا امکان تھا تو بات ایک رہی تھی۔ مجھے کیا کسی کو بھی یہ سودا منظور نہیں ہوسکتا تھا۔ بھجل نے کرشنا جی کی وضع کے صلے مجھے نہال کرنے کے لیے اپنے ذہن میں یہ مفاہمت کرلی تھی تو اُس نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ میں بھی اسے قبول کرلوں گا۔ کرشنا جی کی رسوائی کی قیمت بھجل کو نہیں چکانی چاہیے تھی۔ کرشنا جی موجود ہوتے تو وہ ہرگز اپنی یہ قیمت مقرر نہ کرتے۔ میرا سینہ اندوہ سے دھنس رہا تھا اور سر بیٹھا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا، کیا ہونے والا تھا۔ کیا سوچ کے بھجل نے اتنے لوگ اکٹھے کیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کچا نکل سکتا تھا۔ اُس نے اتنا شور کیوں مچایا۔ ہر جگہ یہ منادی کیوں کرائی کہ اب پیڑو کا اقبال راجا کے نام سے چلے گا اور تینوں پاڑے ایک ہوگئے ہیں۔ مشکوک ہونے کی تو یہی بات تھی کہ پیڑو نے کسی تامل کے بغیر اپنا اڈا اجنبی لوگوں کے حوالے کردیا ہے۔ ٹنک کی دعوت تو خود بھجل نے دی تھی۔ رٹنا کھاڑا جاتا، زور کرانا، چوکی پر بیٹھ کے حکم چلانا اور پیڑو کا خاموش بیٹھے رہنا۔ یہ ایسی باتیں نہیں تھیں جو دوسرے پاڑوں میں نہ پہنچی ہوں۔ اگر یہ سب تیواڑی کے لیے تھا کہ وہ ایک بہت بڑے اڈے کا مالک ہے، چھوٹے موٹے پاڑے شامل کرکے تقریباً آدھا مہاراشٹر کے زیر اثر آجاتا تھا اور اُس کے پاس آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ بہت بڑا کنبہ تھا اور بھجل نے یہ سب کچھ دیکھ کے اپنے داغ میں اُس کے لیے موت سے بدتر سزا تجویز کر رکھی تھی تو اسے اور باتوں پر بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اُسے یہیں یہ سزا نہ دے پاتا لیکن میں رفتہ رفتہ اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ شمبھو نواس کی موت کے بعد وہ آدھا رہ گیا تھا۔ باقی آدھا بھی کسی نہ کسی صورت سے مجھے ہی غم کرنا تھا مگر اس طرح نہیں ہوتا۔ شمبھو نواس کی طرح پولیس کھوج لگاتی رہتی۔ پیڑو نے ابھی ابھی جس لہجے میں بات کی تھی، اُس میں خوف کا نمک شامل تھا۔ گویا اُس کا یقین بھی متزلزل ہوگیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اور ہو چکا ہے، اُس میں اُس کا دامن صاف رہے گا۔ اُس نے مجھے پاڑے سے نکال دیا تھا کیونکہ اسے حالات بگڑ جانے کا اتنا ہی خدشہ تھا جتنا مجھے۔ شاید یہی کوئی چھپا ہوا خوف تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کا ذکر مجھ سے کرنا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے جو کچھ ہو سکا ہے، فراہم کیا ہے۔ تیواڑی کے بعد شہر میں دوسرا بڑا پاڑا پیڑو کا تھا۔ شہر میں دوسری بڑی آمدنی کا اڈا۔

اُسے آنے والے واقعوں پر اعتبار نہیں ہوگا۔ سبھی وہ مجھ سے کہتا تھا کہ اب یہ سب کچھ میں سنبھال لوں یعنی وہ بھی اب اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ بھجل کے اندازے غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ بھجل کے خیال سے وہ کھل کے اپنے مذبذب کا اظہار نہیں کر رہا تھا مگر وہ متردد ضرور تھا۔

بھجل اندر سو رہا تھا۔ جاموار کھانستے ادھر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیڑو جاگ رہا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ کسی آدمی نے اشارہ کیا ہوگا۔ پیڑو نے میرے سامنے ایک اور چائے کی پیالی میں ٹپ ٹپ گرا دی اور میں نے اپنے دماغ کی دھول جھاڑنے کے لیے بے اختیار کئی بار سر جھٹکا۔ اُسی لمحے پاڑے کے پھاٹک کی کھڑکی کھل۔ میں نے اپنی کرسی سیدھی کرلی۔ میری نگاہ وہیں ٹکی ہوئی تھی۔ پاڑے کے دو تین آدمی کھڑکی سے باہر نکلے۔ پھر ایک باوردی شخص برآمد ہوا۔ اُس کے ساتھ تین سپاہی تھے۔ میں انتظار کرتا رہا مگر اندر سے کوئی اور نہیں نکلا۔ پاڑے کے آدمیوں نے چند قدم تک پولیس والوں کا ساتھ دیا پھر واپس ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پولیس ٹلے ہوٹل کے قریب آگئے۔ وہ علاقے کے تھانے کا کوئی چھوٹا افسر تھا۔ میں نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا وہ نکروہ تھا۔ جب وہ ہوٹل سے گزر گئے تو میں نے اُٹھنے میں دو تین منٹ کا توقف کیا۔ ہوٹل ٹلے نے مجھ سے چائے کے پیسے نہیں لیے۔ پیڑو کے آدمیوں نے منع کردیا ہوگا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ پاڑے کی عمارت کے باہر اسٹول پر بیٹھے ہوئے لوگ میرے وہاں پہنچنے پر کھڑے ہوگئے۔ کیا بات ہے؟ میں نے اپنا تجسس چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"ایلا! ام آیا تھا۔" ایک بے پروائی سے کہا۔ "اپن کا ہی کبوتر ہے۔ دادا کو بولنے آیا تھا کہ ذرا نرم گرم ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ابھی سُنا ہے کہ رالا کچھ گڑبڑ خاطری کرے گا۔ بھلے کرلے۔" وہ ناک چڑھا کے بولا۔ "استاد کو بولتا تھا کہ ایک ڈزن آدمی اُدھر لے جائے گا۔ ابھی اپن نے استاد کو بولا کہ اپن کو بھیج دو۔ پھٹی کے ہوئے بہت دن ہوگیا۔ کچھ کمر ورم لگالے گا۔"

اُس کی باتوں پر اُس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ میں نے اُن کا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ میرے لبوں پہ تھرک کے رہ گئی۔ عمارت میں جانے کے بجائے میں وہاں سے آگے چل دیا۔ کچھ آگے جا کے میں نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ میرے پرانے علاقے میں بھی پولیس گشت کر رہی تھی بلکہ ٹیکسی جہاں جہاں سے گزری، چوراہوں پر ٹولیوں میں پولیس موجود تھی۔ ٹیکسی والا راستے بھر بھرے رات کے واقعے پر باتیں کرتا رہا کہ اُدھر آنے جانے پر سخت پابندی ہے۔ پولیس نے تیواڑی دادا کا پاڑا سیج سے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ گاڑی بھر بھر کے پولیس آتی ہے اور علاقے میں بکھر جاتی ہے۔ تیواڑی کے پاڑے کے قریب کا سارا بازار بند پڑا ہے اور

وں میں گھسے بیٹھے ہیں یا دگرد کی سڑکیں سنسان پڑی ہیں۔

میرے علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو زوراور بے تابانہ اُٹھ کے میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ یہاں آ کے مجھے کچھ پُرسکون ملا۔ یہاں "ہَما" بھی موجود تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اُچھلنے لگا۔ زورانے مجھے بتایا کہ مارتی کو سیٹھ دینا کے گودام میں رکھا گیا ہے۔ اُس کے ساتھ دو تین آدمی اور ہیں، مارتی کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ خون بہت نکل گیا ہے، پیرُو کے خاص ڈاکٹر نے بازو میں کئی ٹانکے لگائے ہیں سیٹھ دینا کا گودام پیرُو کے علاقے میں تھا۔ زورانے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ جگہ نہایت محفوظ ہے میرے علاقے سے چند لوگ پکڑ لیے گئے تھے۔ زورا اس پر فکرمند نہیں تھا۔ اُسے توقع تھی کہ جلد یا بدیر پولیس افسران اُسے بھی تھانے بلائیں گے یا خود یہاں آئیں گے۔ واپس آتے ہوئے میں نے بالم خاں کے اڈے کا بھی ایک چکر لگایا۔ پولیس نے وہاں سے بھی چند آدمی گرفتار کر لیے تھے۔

پیرُو کے علاقے میں واپس پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ میں پاڑے نہیں گیا۔ علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ وہیں مجھے پاڑے کے کئی آدمی مل گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ تھجل اور پیرُو عمارت میں موجود ہیں، کچھ دیر ہوئی تھجل سو کے اُٹھا ہے اور اُس نے چوکی سنبھال کے پیرُو کا کام کے لیے اندر بھیج دیا ہے، صبح سے دو مرتبہ پولیس آ چکی ہے اور کوئی پندرہ بیس آدمی حوالات میں بند کر دیے گئے ہیں، پیرُو تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا تھا اور علاقے کے ایک مختصر گشت کے بعد واپس چلا آیا۔ پھر جب اُنھوں نے تیواڑی کے پاڑے میں پولیس کو ملنے والی لاشوں کے بارے میں بتایا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ میں گنگ رہ گیا۔ وہ اُن کی تعداد ۲۷ بتا رہے تھے۔ میں نے اُن سے دوبارہ تصدیق کی اور مجھے ایسا گمان ہوا جیسے اونچا سننے لگا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پولیس کو کوئی بھی زخمی نہیں ملا۔ خود تیواڑی کے بہت سے آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، اُس کے ماتحت دوسرے پاڑوں کے کئی داداؤں کو بھی حوالات میں داخل کر دیا گیا ہے، اُن میں شعلہ استاد بھی شامل ہے۔ میں نے اُن کے سامنے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چپ چاپ ایک طرف بڑھ گیا۔ میرے قدم بوجھل ہو گئے تھے اور جسم اپاہج لڑنے لگا تھا۔ شاید یہ پہلا دن تھا کہ میں نے راہ گیروں کو غور سے نہیں دیکھا۔ شام ہو گئی اور روشنیاں آنکھوں میں کھبنے لگیں تو مجھے گزوپیش کی خبر ہوئی۔ میں نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔ یہ شہر کا کوئی ایسا علاقہ تھا جہاں میں اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ پیرُو کے علاقے سے یہاں تک ہزاروں لوگ سڑکوں پر گزرتے ہوں گے۔ لیکن مجھے اُن میں کورا بھی گزری ہو۔ مجھے اپنی اس بے خبری سے وحشت ہونے لگی اور کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ادھر سے ضرور گزری ہے۔ میں نے اُسے پھر کھو دیا ہے، اُس نے مجھے گم دیکھا ہو گا تو منہ پھیر لیا ہو گا کہ جب مجھے اس کا کچھ ہوش ہی نہیں ہے تو وہ مجھے کیوں آواز دے۔ میں نے اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹ لیا اور سیر کل میں آیا کہ میں ابھی اسی لمحے شہر سے نکل جاؤں، جو تھجل کا حشر ہو گا، اُسے میں نہیں روک سکتا۔ میں نے اُسے نہیں بلایا تھا اور میں نے اُس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرے۔ مجھے تو کورا کی تلاش میں آگے جانا ہے۔ میں یہاں رہوں گا تو پھر کوئی نہ کوئی بات ہو جائے گی، پھر کوئی زنجیر میرے پیروں میں پڑ جائے گی، کورا ایک پہنچنے میں اور دیر ہو جائے گی، میں دیر سے اُس کے پاس پہنچوں گا تو وہ کہے گی، اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی، ابھی اور دو چار کام نمٹا کے آتے۔ میں قریب کے اسٹیشن جانے والی ایک بس میں بیٹھ گیا۔ راستے میں، میں نے اپنے ذہن میں کوئی اور خیال نہیں آنے دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جو بھی گاڑی نظر آئی، اُسی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی میرا ارادہ منتشر ہو گیا۔ میرے رگ رگ میں پڑی ہوئی مالا تنگ ہونے لگی اور اُس کے دانے چبھنے سے لگے۔ ایسا لگا جیسے کورا شکایت کر رہی ہو کہ میں اُس سے ملوں گا تو وہ مجھ سے نہیں بولے گی۔ کہے گی کہ میں تھجل کو چھوڑ کے کہیں چلا آیا۔

وہ اتنی ہی اچھی تھی، اُس کا دل اتنا ہی نرم و نازک اور صاف و شفاف تھا۔ وہ ایسا ہی کہتی۔ وہ مجھے کسی کی نظروں میں کم نہیں دیکھنا چاہے گی۔ چاہے وہ خود تکلیف برداشت کر لے۔ اسٹیشن سے پیرُو کا علاقہ کچھ نزدیک ہو گیا تھا۔ میں ایک عزیز کے ساتھ اُس میں بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا تھا تھجل کے سامنے جاتے ہی اعتراف کروں گا کہ اس موقع پر اُسے چھوڑنے کا خیال میرے دل میں آیا تھا، جب میں رات کو اپنی مالا دیکھوں گا اور کورا میری بند آنکھوں میں کہیں سے اُتر آئے گی تو مجھے اُس کے سامنے ندامت نہیں ہو گی۔

علاقے میں صبح جیسی بات نہیں تھی۔ پولیس کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن سنبھالے رکھی۔ تھجل سے اگر کوئی لغزش ہو گئی تھی تو ایسا ہونا ممکن تھا۔ کسی سے بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ تھجل پہلے بھی کئی بار جیل جا چکا تھا۔ ایسی واردات کے بعد علاقے میں پولیس کا آنا، تفتیش کرنا اور گرفتاریاں کرنا کوئی توقع کے خلاف بات نہیں تھی۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ وہ اتنی آسانی سے تھجل اور اُس کے ساتھیوں تک پہنچ جائیں اور کسی اور طرف سوچنے اور منتشر ہونے کے بجائے اسی جانب اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ خود تھجل نے پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کر کے اُن کے لیے راستہ آسان کر دیا تھا مگر تھجل نے ایسا کیوں کیا؟ پاڑے جانے سے پہلے مجھے معلوم ہو گیا کہ ابھی تک پیرُو اور تھجل پاڑے ہی میں ہیں، دن بھر پولیس کے کار نبٹے آتے جاتے رہے ہیں لیکن انھیں اہتمام کے ساتھ رسمی تفتیش کے لیے تھانے نہیں بلایا گیا ہے۔ تھجل نے ضرور تمام پہلوؤں پر غور کیا ہو گا، میری بے یقینی کی وجہ

شاید کورا ہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو مجھے پھر دیر ہو جائے گی۔ وہ تھجل کو تھانے بلا لیں، جیل میں بند کر دیں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھوں نے تھجل پر فردِ جرم عائد کر دی۔ تھجل نے اپنے دفاع کی ہر ممکن پیش بندی میں محفوظ اور ملفوظ کبھی ہو گی۔ اس کے باوجود کوئی حادثہ رونما ہو جائے، کوئی روزن کھل جائے تو تھجل کیا کر سکتا ہے۔ پھر تو آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور رسمِ شناسائی کو ختم کرنے کے بعد تیواڑی سیدھا نکل جانا ہے اور سمبھو ناس اُسے سونے کی دیوار میں چھپا لے۔ تھجل نے یقیناً ہر امکان نظر میں رکھا ہو گا۔

پیرُو کے آدمیوں نے مجھے پاڑے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھاٹک کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پتہ چلا کہ اندر علاقے کے تھانے کے بڑے افسر کے ساتھ وہ افسران بھی موجود ہیں جنھیں تیواڑی کے پاڑے کی واردات کے سلسلے میں متعین کیا گیا ہے اور اُنھیں آئے ہوئے خاصا وقت گزر گیا ہے۔ میں دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ہٹاتے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تھجل کے ہونٹوں میں حقہ کی نے دبی ہوئی تھی۔ پیرُو اُس کے بازو میں بیٹھا تھا۔ چوکی پر پولیس کے چار افسر موجود تھے۔ تین سپاہی دُور دیوار سے لگے ہوئے کھڑے تھے مافروں کے سامنے لیمن کی ٹرے میں کُل ہوئی تھیں، سب سے پہلے تھجل نے مجھے دیکھا اُس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحوں بعد دوبارہ کھولیں تو اُن میں تاسف اور پریشانی کے اثرات تھے جیسے وہ مجھے دروازے سے لوٹ جانے کی تلقین کر رہا ہو۔ میں کشمکش میں دروازے پھاٹک کا کھڑا رہا لیکن واپس جانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں تیزی سے چوکی کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے کی طرف جن افسروں کی پشت تھی وہ اب میرے سامنے تھے۔ میری آنکھیں جُھک گئیں۔ اُن میں میرا ایک شناسا تھا۔ مجھے اپنے حواس بحال رکھنے میں شدید پیش آئی اُس کا بھی یہی حال ہوا۔ میرے ہاتھ سلام کے لیے اُٹھے کے اُٹھے رہ گئے۔ اُس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ مجھے حیران نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں نیچی جھکا لیں ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے۔ تھجل کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ "شکلا جی!" تھجل نے بیزار لہجے میں کہا۔ "کوئی اور بات پوچھنی ہو تو مجھ سے کریں جو کچھ ہم جانتے اور سمجھتے تھے، ہم نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آگے بھی جب آپ کا جی چاہے اِدھر آئیں۔ جو خاطر ہم سے ہو سکی کریں گے۔ اگر ہمارے اندر آنے سے آپ کا بھلا ہو سکتا ہے تو ہم آپ کے لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔"

شکلا خاموش رہا۔ اُس کی نظریں بھی پرمرکوز تھیں۔ اُس کے بجائے ایک دوسرے افسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تھجل دادا! واردات بہت سنگین ہے۔"

"ہے تو۔" تھجل سر ہلا کے بولا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔

"اور اب کیا بول سکتا ہے۔" پیرُو نے تیزی سے کہا۔

"اور ہم کسی کوشش سے گریز نہیں کریں گے۔"

"ایسا ہونا بھی چاہیے۔" تھجل نے دُم اُٹھائی۔ "میں کام کسی پاڑے کے آدمیوں ہی نے کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے، انھوں نے کسی کے بولنے پہ ایسا کیا ہو۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ پولیس والے ہیں یہ آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ پاڑے کے لوگوں کو پاڑے کے آدمیوں سے بیر ہو گا۔ بستی والوں کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ آپ بولتے ہیں کہ گلی کا چوکی دار بھی محفوظ نہ رہا تو کوئی دشمنی کی بات لگتی ہے صاب لوگ!"

"اور تیواڑی کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ اپنا دشمن خود ہو سکتا ہے اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ہم بھی اُس کے دشمن ہیں۔" تھجل نے کہا۔ "ہمیں تو یہ جان کے خوشی ہوئی ہے۔ تیواڑی کا ریکارڈ تو آپ کے پاس ہو گا۔ لیکن ہے، کسی نے اُسے چھپا دیا ہو۔ نہ ملے تو ہم سے پوچھ لیں۔ پچھلے علاقے کی پولیس علاقے کے باسیوں، نوجیوں اور بھنگی بالوں کو اب اُس کا اتنا خیال نہیں ہو گا۔ ابھی اُس کے اڈے کے بہت سے آدمی زندہ ہیں، آپ زور دیں تو شاید بے وفائی کر لیں۔ پولیس چپ ہے تو ہم بھی چپ ہیں۔ آپ پوچھتے ہو تو زبان کھولیں۔ پر آپ بالو لوگ اب جانتے ہوں گے۔"

"ہم تو نکلتے سے آئے ہوئے تھے تیواڑی کے بارے میں اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں؟" ایک افسر نے تندی سے کہا۔ وہ سب سے زیادہ معتبر تھا۔

"بڑے صاب! تھجل خود مجھے بھیجے میں لایا۔ پیرُو تو ادھر رہتا ہے اور بھی اپنی جان یہاں رہتا ہے اسے اچھا بولے ہیں اور اڈے پیرُو کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ دیکھنے اور سننے کے لیے کل پرسوں پوچھ لیکھنے پڑتے ہیں۔ ناک الف رکھنی پڑتی ہے نا۔"

"اور ہم لوگ اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہو جناب!" پیرُو نے اُسی قدر ترشی سے کہا۔ "ذرا دم تو لینے دو۔ ابھی سالا اپن کو خود اُس مائی کا لال کا کھوج ہے جو اُدھر اُس شان سے پہنچا۔ کل وہ اُدھر جا سکتا ہے تو آج ایدھی آ سکتا ہے۔ ابھی اپن بھی آپ کا مانگ....."

تھجل نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ بایاں ہاتھ بڑھا کے وہ مجھ سے بولا۔ "بیٹھ جا راجا! کھڑا کیوں ہے۔ آ اِدھر۔" اس پر تمکنت سے ہم دونوں کو دیکھ کے سر جھکا لیا۔

"دیکھو پیرُو دادا! کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔" شکلا کے برابر بیٹھے ہوئے افسر کے لہجے میں غصہ شامل تھا۔ "ہم نہیں چھوڑیں گے۔ چاہے وہ ہمارا باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لاقانونیت برداشت نہیں کی جائے گی۔ اگر تمھیں کچھ پتہ ہے تو ہمارا ساتھ دو۔ قانون کی صورت میں رعایت ضرور ہو سکتی ہے ورنہ..... ورنہ۔" وہ تھجل کے بولا۔ "بہت

بہت خراب ہو سکتی ہے۔ ہم بولے دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اُن کی گردنوں تک پہنچیں اور رعایت کی کوئی گنجائش دیں، وہ خود کو ہمارے حوالے کر دیں تو اچھا ہے۔ اس مرتبہ پولیس کے وہ لوگ سامنے نہیں ہیں جو پہلے تھے۔"

"اب وہ لوگ کہیں سامنے ہوں گے۔ تیواڑی کا معاملہ ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے بمبئی کے جنگل کا شیر ہے۔ اب تو سب کچھ بدل جائے گا۔" بھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بڑے آدمی کے لیے قانون بھی بڑا ہونا چاہیے۔ زیادہ سخت لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔ زیادہ بڑے قانون داں محکمہ داں افسر لوگوں کی۔ جناب! صاف صاف بات کرو۔ ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ چلو پیرو دادا! اب تمھارے ہاں سے اپنا دانہ پانی شاید اٹھ ہی گیا ہے۔"

"اور ان پولیس والوں کو بھی ہمارے ساتھ لیتے چلیے۔ بن کی جگہ آپ آئے ہیں اور جنھیں بدلنے کی آپ نے اب ضرورت سمجھی۔" میں نے شکلا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو چپ رہ، بڑے آدمیوں کے بیچ میں بولتا ہے۔"

"یہ کون ہے؟" معترا فسر نے پوچھا۔

"یہ اپن کا راجا ہے۔" پیرو میری کمر پہ دھپ لگاتے ہوئے بولا۔

بھل نے میرے بال کھینچ لیے۔ "اسے معاف کر دیا صاب! یہ نئیں، اس کی عمر بول رہی ہے۔ ابھی افسر میں اُٹھا بیٹھا نہیں ہے۔"

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں، غلط نہیں، بے موقع بات کہی ہے اور بے موقع بات بھی غلط بات کے برابر ہے۔" بھل آہستگی سے بولا۔ پھر اس کی آواز تبدیج اونچی ہوتی گئی۔ "ہر بات کہنے کے لیے ایک وقت اور موقع ہوتا ہے۔ قانون کی کتاب اندھا بھی پڑھ سکتا ہے بچے! یہ عدالت، وکیل منصف ایک حاکم کے اوپر دوسرا حاکم۔ یہ سب گورکھ دھندا کس لیے ہے۔ موقع آئے گا تو منہ سے نکلی ہوئی بات اچھی بھی لگے گی۔"

"بھل دادا! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں صاب!" میں راجا کو سمجھا رہا تھا۔ اس کی زبان اس کے ہاتھ اور سر کی طرح اس کے بس میں نہیں ہے۔ آپ بولیں آپ نے پورے پاڑے کی تلاشی لے لی ہے۔ سب کچھ جان بوجھ لیا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس سے زیادہ کیا بولیں۔ کچھ اور لیمن ویمن منگوائیں؟ رات کے کھانے کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔ یہ جگہ آپ لوگوں کی شان کے مطابق نہیں اور ٹائم بھی ایسا نہیں کہ آپ سے کھانے کے لیے بولا جائے۔" بھل حقہ گڑگڑانے لگا۔

ایس پی شکلا کے سوا اُن سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔

"ہم تمھیں ایک موقع اور دیتے ہیں، ہم پھر آئیں گے۔"

"ضرور آئیں۔ آپ کو دروازہ ہر وقت کھلا ملے گا۔ مجھے جانا تھا۔ پیر کی وجہ سے رُک گیا تھا۔ اب آپ لوگوں کی وجہ سے رُکنا پڑے گا۔" ایس پی شکلا اچانک کھڑا ہو گیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی دوسرے افسروں نے بھی چوکی چھوڑ دی۔ بھل اور پیرو بھی فرشتہ پر آ گئے۔ "ابھی اپن ایک بات بولیں؟" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بولو۔" معترا فسر نے پلٹ کے پوچھا۔

"اپن سمجھتا ہے کہ پہلے آپ ایدر ٹائم خراب کرانے کے بجائے کسی اور طرف جاؤ۔ اودر شاید تم کو کچھ مل جائے۔ ایدر تو اپن ہر ٹائم پر موجود ہے۔ جب بولے گا، چلا جائے گا۔ اپن کا بھل بھائی بولتا ہے کہ ہر دادا کا دو گھر ہوتا ہے۔ کبھی اِس گھر میں کبھی اُس گھر میں۔ اور بولتا ہے کہ مرنے سے پہلے بیس بار موت کا مزہ چکھنا چاہیے، انیس بار ہوا تو دادا سالا انیس نمبر ہے۔" اُس کی جھڑکتی ہوئی آواز جلد ہی ماند پڑ گئی۔ ابھی اپن کے منہ سے کوئی جاسوسی بات نکل گیا ہو تو معاف کرنا۔ اپن سے بولنا نئیں آتا۔ سالا سارا ٹائم چاتو میں لگ گیا۔ کوئی اور کام ہو تو بولو۔"

معترا فسر کے ہونٹوں پر سوکھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس کی گردن معنی خیز انداز میں ہلتی رہی۔ ساری بادی اُس نے ہم تینوں پر نظر ڈالی۔ پھر دروازہ پر، اور قدم بڑھا دیے۔ ہم تینوں انھیں پھاٹک تک پہنچانے گئے۔ ایس پی شکلا اُن سب سے آگے تھا۔ موٹر میں بیٹھنے کے بعد اس نے سر اُٹھایا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں کچھ چھوٹی ہو گئی تھیں اور مجھی پر مرکوز تھیں۔ مگر موٹر فوراً چل پڑی۔ ہم چند منٹ تک جاتی ہوئی موٹریں دیکھتے رہے۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں، اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آدمی لپک کے ہمارے پاس آ گئے۔ "کیا ہو رہا ہے دادا؟" ماچھی کی آواز چیخی۔

"واپس چلا گیا ہے۔" پیرو نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"کیا بولتا تھا؟"

"پریشان تھا۔"

"ٹھیک تو دبا؟" ماچھی نے آنکھ دبا کے پوچھا۔

"ہاں۔" بھل اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ اور میری کمر پکڑتا ہوا اندر چلا آیا۔ "تو پھر آ گیا رے؟" وہ جماہی لیتا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بھل بھائی! میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ یہ کیا..... یہ سب کیا ہے؟" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں ہے؟"

وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ "لاڈلے! کیا یہ تیری آواز ہے؟"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی تھیں؟"

"تو تو بہت دیر سے آیا۔ اس سے پہلے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں، ابھی اور ہو سکتی ہیں۔ یہ آنا جانا، سنتا سنانا تو لگا رہتا ہے۔"

بستائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مگر یہ کس طرح کی باتیں تھیں؟"

"یہ تیری سمجھ میں ابھی نہیں آئیں گی۔ بالوں کا رنگ بدلتا ہے، تب یہ نرم گرم سمجھ میں آتی ہے۔" وہ چوکی پر بیٹھ کے چلم کی آگ کریدنے لگا۔ "یہ تو بہت بے معنی، کچی پکی، شکوک اور فرسودہ باتیں تھیں۔"

"اسی طرح ہوتا ہے لاڈلے! کبھی اونچی کبھی نیچی، کبھی سرد کبھی گرم جان بوجھ کے کچی کچی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ چلے گئے نا؟"

"ہاں چلے تو گئے لیکن پھر واپس آ سکتے ہیں۔"

"پھر چلے جائیں گے، پر اب انھیں آنے میں دیر لگ سکتی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے وہ کہ تم نے یہ قدم اُٹھاتے ہوئے کچھ جلدی کی، زیادہ نہیں سوچا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "مجھے آثار اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"لاڈلے! میں نے تجھے اسی لیے گھر بھیج دیا تھا تاکہ تو اپنے مال پر بوجھ نہ ڈالے مگر تو کانتے اور جاسو کو چھوڑ کے یہاں آ گیا۔"

"میں اس لیے آ گیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔"

"تو کہیں گھبرا تا ہے نئے! کچھ اور بات کر، لبل جا اور کانتے کا خیال ہے اور وہ گردا کیسی ہے؟ کیا نام ہے اُس کا؟....."

"میں صبح سے گھر نہیں گیا۔" میں نے تنک کے کہا۔

"پھر دن بھر کہاں رہا؟"

"یوں ہی گھومتا رہا۔"

"اب تو گھر جا کے سو جا، جب تک میں نہ آؤں اِدھر مت آنا۔ اب چلنے کی تیاری کرنا ہے۔ میرا خیال ہے، میں جلد ہی تیرے پاس لبل جاؤں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تمھیں بس ایک دو دن ہی میں چل دینا ہے۔ مجھے تو اب یہاں سے تنہائی مشکل معلوم ہو رہا ہے۔"

"لاڈلے! ضرورت پڑی تو ہم چلے جائیں گے۔ دل چھوٹا مت کر۔"

"اور ہاں!" میں نے ہکلا کے کہا۔ "یہ ایس پی شکلا تھا نہ بھل بھائی! اُس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔"

"جو تو سوچ رہا ہے، یہی وہ بھی سوچ رہا ہو گا۔ تو نے بات اُگنی ہے، اُس نے تجھے نہیں دیکھا۔ تو نے اُسے اپنے آپ کو دکھا دیا۔"

"مگر وہ اس سے پہلے بھی تو مجھے دیکھ سکتا تھا اور میں بھلا اس وقت پر گھر کیسے رہ سکتا تھا۔ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔"

"میں تیرے کہنے پہ گھر میں بیٹھا رہتا۔"

"بالکل نہیں تم تو گھر جاتے ہی نہیں۔"

"اب جانے دے، کون کیا کرتا، کیا نہ کرتا۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہر آدمی اپنی جگہ ہوتا ہے لاڈلے! آدمی ایک دوسرے کی جگہ بدل لیا کرے تو پھر یہ دنیا بڑی ہلکی ہو جائے۔"

"تم خفا ہو گئے۔ یقین کرو، میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

"لاڈلے! میری جان!" اُس نے مجھے دلاسا دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تو کیا سوچ رہا ہے۔ پر تو اتنا مت سوچ میرے بھل! یہ وقت تو گزرنا ہی تھا۔ تو دیکھتا رہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھروسہ اتنا رکھ کہ میری بات مان لے گھر چلا جا۔ وہاں جا اور کانتے کے ساتھ رہ۔ یہاں میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ شکلا نے تجھے نہ دیکھا تو اچھا تھا، پر اُس نے تجھے اب دیکھ لیا ہے تو دیکھنے سے زیادہ یہی سمجھے گا کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔"

"کچھ اور بھی سمجھ سکتا ہے۔ مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"اب خیال آنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ تیرے آتے ہی اُس کی زبان پر تالا لگ گیا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کیا تھا، سچ کہتا تھا، وہ اچھا اور سچا آدمی ہے۔"

"تمھیں یاد ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ شکلا نے مجھ سے اتنا تیواڑی کا ذکر کیا تھا، اُس نے نام تو نہیں لیا تھا لیکن وہ سلسلہ ملا سکتا ہے۔"

"ملا لے، کچھ اور وقت لگ جائے گا میرے بیر میں پہلے ہی یہ بات تھی لیکن اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم اتنے مطمئن کیوں ہو؟" میں نے جھلا کے کہا۔

"کیا تجھے میرا اطمینان بُرا لگتا ہے؟" وہ مسکرانے لگا۔

"نہیں، کچھ عجیب لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ مجھے اُس کی ہنسی بہت بُری لگی۔ اتنے میں پیرو آ گیا اور بھل سے کچھ پوچھے بغیر اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ "کیا ہے بھل بھائی! ابھی سالا کھانے والے کا بھی کچھ ہونا چاہیے۔" وہ بھل کے ہاتھ سے حقہ کی نے لے کر کش لینے لگا۔ پھر بے تحاشا کھانسنے اور ہنسنے لگا۔

"تمھارے بس کا نہیں ہے پیرو۔" بھل نے اُس کے مزے لیے۔ "تمھارے لیے وہ سالی پری ہیم چھاپ ہی ٹھیک ہے۔"

وہ دونوں آپس میں فضول باتیں کرتے رہے۔ جب کھانا آیا تو بہت سے لوگ آ گئے۔ سب کھانے پر ایسے پلے جیسے کئی دنوں کے فاقے سے ہوں۔ میں بھی کودتا رہا۔ صبح سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میں پیرو کے آدمی بھل سے اصرار کرنے لگے کہ وہ ایسے چند نیا باتی آئی ہوئی ہے۔ آج رات اُسے بلا لیا جائے۔ بھل نے جز بز ہو کے اجازت دے دی۔ پاڑے میں شور مچنے لگا۔ مچھی اور ماچھی فوراً چندنیا کو لینے چلے گئے۔ فرش پر سفید چاندنی بچھا دی گئی۔ میں نے بھل سے مارٹی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے منع کر دیا اور مجھے تسلی دی کہ مارٹی کی پوری دیکھ بھال کی جا رہی ہے، اُس کی حالت صبح سے اچھی ہے۔

چند دنیا جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔ وہ اُسے ایک گھنٹے کے اندر لے آئے۔ وہ لڑکے قد اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ جُوڑا بندھا ہوا تھا اور کانوں میں پھولوں کی بالیاں لٹک رہی تھیں۔ ماجی اور اقبے کے دوسرے آدمیوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر جمشل نے مجھے چھیڑنے نہیں دیا۔ میں خود بھی اب وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ گانا شروع ہونے سے پہلے میں وہاں سے چلا آیا۔ علاقے میں پولیس کا زور تھا۔ میں کچھ دُور تو گلیوں گلیوں راستہ طے کرتا رہا۔ پھر میں روڈ پر آ کے بس میں بیٹھ گیا۔

گیارہ بجے سے پہلے میں گھر پہنچ گیا۔ جامو اور کانتے ڈرائنگ روم میں تاش کھیل رہے تھے۔ جولین، چمپا اور جولین کی ماں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں میرے انتظار میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جامو اور کانتے نے کھیل بند کر دیا اور چبھتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے اشاروں میں انھیں بتایا کہ ابھی سنانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن میرے اشاروں سے اُن کا اضطراب بڑھ گیا۔ جولین، چمپا اور جولین کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم لوگ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے کھسک گئیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ انھیں ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا۔ پھر ارادہ بدل دیا اور دل بھر کی روداد جستہ جستہ سنائی۔ اُن پر کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہا کہ میں اُن کے منہ نوچ لوں۔ میں نے برگشتہ ہو کے تمام خطرے اُن کے کان میں ڈالے۔ جامو سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا سنتا رہا۔ مجھے کچھ قرار آیا لیکن اُس کی سنجیدگی چند لمحے برقرار رہی۔ اُس نے منہ بنا کے زور سے سر جھٹکا اور جیسے میری تمام باتیں دوسرے کان سے اُڑا دیں۔ میں نے اُسے پھر متنبہ کرنا چاہا تو وہ بھڑک گیا، بھرکے کہنے لگا۔ "اوئے لے! لبے نے مجھل بھائی کو کریا اتر کا بچا سمجھ لیا ہے۔ اپنی یاری اُس سے ایک سال سے اوپر کی نہیں ہے۔ تُو نے تو اُس کے ساتھ ایک وقت گزارا ہے۔ پھر ایسی بے ازار بندہ باتیں کیوں کرتا ہے۔ کیس دیکھ لاڈلے!" وہ ٹھملے کے بولا۔ "پولیس گھن چکر بنی ہوئی ہے۔ سالا ہم ایک ایک آدمی چن چن کے اُٹھا کر آئے ہیں اور تیواڑی کی لاش بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اُس کے دو تین آدمی بھی غائب ہیں۔ تین چار روز میں اپنے کچھ زخمی اچھے ہو جائیں گے اور اپنے اپنے اڈوں پر واپس آ جائیں گے۔ باقی لوگ تو موجود ہی ہیں۔ پولیس کی ابھی نگاہ بھی نہیں جا سکتی کہ کون موجود نہیں ہے۔"

"اور اُن میں سے اگر کوئی اوپچا نکل گیا؟"

"ابے اُن میں ایک ساتھ دس اوپچے نکلیں تب بات بنے گی۔ ایک دو تو سالے مسکوٹ کرتے رہ جائیں گے۔ اُن کو یقین ہے کہ ہم کو جانا ہے۔ پھر سارا مُسن اُٹھی پر ہو گا۔ وجہ بھی لاڈلے! ہم نے اتنے لوگوں کو اس لیے اکٹھا کیا کہ ایک تو تیواڑی کے اڈے پر زیادہ لوگوں کی وجہ سے کوئی حرامی نیک کے نہیں جائے گا اور تیواڑی کو زندہ پکڑنے میں بھی آسانی ہو گی۔ دوسرے اتنے بہت سے لوگ شامل ہوں گے تو کمینہ پن کرتے ہوئے سالوں کی میا مرے گی۔ واردات بھی اپنی جگہ انیاٹاک ہو گی اور پولیس بھی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ اس کیس میں ہر بات کا خیال رکھنا تھا۔ اب دیکھ پولیس ناچ رہی ہے۔ وہ جمشل بھائی اور پیرو پر ہاتھ ڈال کے دیکھیں خواہ مخواہ میں مگر بس بار بار نامزد مست پلیل کر۔ اس کے سوا کچھ ہوا تو سالی ہوئی کر کر ہی سکتا ہے، ہو جائے۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا پیارے! وہ رپورٹ نہیں لکھا۔ اب ٹھوے بھائیں گیا۔" جملی بن! اُس نے آواز لگائی۔ "کھانا لگا تو۔"

جامو نے کچھ کہنے کے لیے چھوڑا ہی نہیں تھا۔ میں نے بھی پیالہ لی۔ اُس کی ایک یہی بات دل کو لگی کہ گزرے ہوئے وقت پر سر کھپانا فضول ہے۔ اُس نے یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی تھی مگر وہ اور کہہ کیا گیا۔ وہ یہ بات پریشانی سے بھی کہتا تو ایک ہی مطلب تھا۔ جامو کو بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ وہ ایس پی شکلا کو نہیں جانتا تھا لیکن اگر اُسے تمام واقعات اور تمام سلسلے معلوم بھی ہوتے تو یہی کہتا۔ ہم پیرو کو تنہا چھوڑ کے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں یہیں رہنا تھا اور جو ہونا تھا، اُسے قبول کرنا تھا۔ اب کچھ بھی ہو جائے۔

میز پر کھانا لگتے ہی جولین نے ہم سب کو بلا لیا۔ میں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ میں تھوڑا بہت کھا کے آیا ہوں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ جولین نے بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش خوش تھی۔ صرف ایک دن میں وہ سب اتنے گھل مل گئے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ چمپا کو جولین نے ہمارے ساتھ ہی بٹھا دیا تھا۔ مجھے چمپا پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب اُسی کا کیا دھرا تھا۔ نہ وہ جمشل کو خط لکھتی، نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد خط لکھ دیتی۔ بارہ بج چکے تھے لیکن وہ سب دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ جولین کانتے کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور کانتے اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اُسے گٹ پٹ سکھائے۔ جولین میری طرف دیکھ کے کہنے لگی کہ ایک کو سکھایا تھا، بعد میں بہت شرمندگی ہوئی۔ کانتے ہلکے اور مذاق کرنے لگا۔ آخر جولین کو وعدہ کرنا پڑا کہ وہ اُسے ضرور انگریزی سکھائے گی۔

"اور میں اپنی پیاری بہن کو سونے میں لاد دوں گا۔" کانتے جوش میں بولا۔ "پھر میں بنگلا اور ہندی میں بات نہیں کروں گا۔ میں تو جولین کی طرح ایک میم لاؤں گا اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے گردن اُٹھا کے لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ چلوں گا۔ وھاٹ یو ول ٹرام پی تا۔۔۔"

جولین کی ہنسی کمرے میں کھنکنے لگی۔ وہ اتنے زور سے ہنسی جیسے اوپر سے کسی نے ڈھیر سی چوڑیاں زمین پر گرا دی ہوں۔ جامو نے اُلٹے ہاتھ سے کانتے کو ٹھلا پر سیدھا کیا۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ آنے والا کل جیسے انھوں نے خرید لیا ہو۔ وہ ٹھاٹ سے پاؤں پسارے چائے پی رہے تھے۔

جولین نے برا سا منہ بنایا۔ انھیں اُن کے کمرے میں بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی سلانا چاہتے تھے مگر میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹ گیا۔ جولین کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر جب میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تو اٹھ کے اندر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی ہیلا گرین سے اُتار لی۔ میں نے اُس کے ایک ایک وار نے کو خوب پیار کیا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

***

سویرے سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے ہالا گرین میں ڈالی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں صوفے پر کروٹیں بدلتا رہا اور مجھے ایس پی شکلا کا خیال ستانے لگا۔ وہ نہ جانے کیا سوچتا ہو گا۔ ممکن ہے وہ یہ سوچ رہا ہو کہ میں نے کرشنا جی کی دولت اِدھر اُدھر لٹانی شروع کر دی ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ بات بھی آ سکتی ہے کہ تیواڑی کو ختم کرانے کے لیے میں نے کرشنا جی کی دولت سے آدمی خریدے ہوں گے۔ سب سے پہلا خیال اُس کے دل میں یہی آئے گا کہ پیرو کے پاٹے سے میرے پالے کا سبب یہی ہو سکتا ہے اور جب یہ بات اُس کے دل میں گھر کرے گی تو وہ کھوج لگاتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ اُسے سرا مل جائے گا تو کھوج لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ میں نے طے کیا کہ وہ آئے گا تو میں اُسے بینک کے سارے کاغذات دکھا دوں گا کہ میں نے ایک پیسہ بھی بینک سے نہیں نکالا ہے۔ ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہوئی۔ جولین نے اُدھا کو اڑ کھولا اور اپنے دونوں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے اُٹھ کے میرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ کھلنے میں ذرا سی دیر لگی۔ ایس پی شکلا عام لباس میں اندر داخل ہوا۔ میں اپنی نشست سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ شکلا کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ جولین اور چمپا اُس سے اُس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں وہ انھیں سرسری جواب دے رہا تھا اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں نے بھی اندازہ کر لیا کہ شکلا آج پریشان پریشان ہے اور شاید اسی خیال سے وہ ہٹ گئیں کہ صبح صبح اُس کے آنے کا کوئی خاص ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ وہ بیٹھی رہیں۔ پھر مجھے جامو کی بات یاد آ گئی کہ ایک آدمی، دوسرے آدمی کو زیادہ سے زیادہ کیا سزا سنا سکتا ہے۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ کیا تم وہی ہو جسے میں نے کل رات دیکھا تھا؟" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

کچھ اولنے سے پہلے وہ میری صورت دیکھنے لگا۔ اُس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ "کیا... کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"آپ کو پورا اختیار ہے شکلا جی!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"عہدے کا اختیار یا اپنا؟"

"وہ تو ٹوٹ لیکن اس وقت آپ گھر آئے ہیں۔"

"میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"کسی بھی نام سے جو آپ کو اچھا لگے۔"

"یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔ ظہیر خاں عرف راجا عرف۔۔۔"

میں نے اپنی زبان منہ میں دبالی۔ شکلا جی! آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" اُس کی آواز کہیں دُور سے آئی۔

"میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

"ظہیر خاں!" اُس کی آنکھیں کھسلنے لگیں۔ "تم وہاں کب پہنچ گئے؟"

"بہت دن ہوئے۔"

"مگر کیوں؟" اُس کی گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

"بس یوں ہی مجھے تھوڑا بہت چاقو چلانا آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے دھندے کے طور پر کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

"غلط! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے عدالت میں تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں تو اپنے گھر اور ملاقاتیوں میں تمھارا حوالہ دیتا تھا۔"

"اب مت دیجیے گا۔ تردید کر دیجیے گا کہ جو کچھ آپ نے میرے بارے میں کہا تھا، سب غلط تھا۔"

"نہیں، نہیں۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا لیکن میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم سے کسی ایسی جگہ ملاقات ہو جائے گی۔"

"شکلا جی! مجھے اندازہ تھا کہ آپ پہلی فرصت میں میرے پاس آئیں گے اور مجھ سے ایسی باتیں کریں گے لیکن میرے پاس آپ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے یا یوں سمجھیے کہ میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے احساس ہے کہ میں کرشنا جی نہیں ہوں لیکن میں اُن کا ایک خادم تھا۔ میں تمھارے بارے میں اُن کی طرح نہیں سوچ سکتا لیکن یقین کرو کہ میں رات بھر نہیں سویا۔ مجھے بار بار اپنی آنکھوں پر صدمہ ہوتا رہا۔"

"کیوں شکلا جی! کیا وہ لوگ آدمی نہیں ہیں؟"

"وہ لوگ آدمی ضرور ہیں مگر گرشنا جی ہوتے تو اُن کے درمیان تمھیں دیکھ کے اُن کا سینہ بھی جلنے لگتا۔ تم تو بہت اچھے لڑکے ہو ظہیر خاں! کرشنا جی اپنے دل میں تمھارے لیے کیا کیا اُمیدیں رکھتے تھے۔ میں پوچھتا ہوں، تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ تمھارے پاس کمی کس چیز کی تھی؟ تمھیں ایسی کون سی ضرورت وہاں کھینچ لے گئی؟ اگر مجھے یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے تو تم جواب دو۔ میں وجہ جاننا چاہتا ہوں؟" میں اُسے کیا وجہ بتا سکتا تھا، وجہ شاید وہ خود بھی جانتا ہو گا پھر میرے ہی منہ سے سننے کی اذیت کا خواہش مند کیوں تھا۔ بولو ظہیر خاں! بولو۔ تم چپ کیوں ہو۔ مجھے جواب دو۔" میں سوچتا ہی رہا کہ اُسے کیا جواب دوں۔

"سنو ظہیر!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "میں آج سے طویل رخصت پر جا رہا ہوں۔ یہ کاغذ ہے۔ چاہو تو اسے پڑھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

"یہ چھٹی کی درخواست ہے۔ اس کے بعد شاید میں پولیس میں واپس بھی نہ آؤں۔ مجھے اپنے بارے میں اب کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔"

"مگر آپ یہ کہاں کریں گے؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ تم غور کرو تو اس کی وجہ تمہاری سمجھ میں آجائے۔ اب میری تم سے ایک درخواست ہے۔ تم اسے حکم بھی سمجھ سکتے ہو اور منت بھی۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ بہت دُور چلے جاؤ۔"

"کیوں شکلا جی؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس ظہیر خاں!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو میں کرشنا جی کی آتما سے معذرت کر لوں گا کہ جو کچھ انھوں نے مجھے سکھایا تھا میں اُس کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ شاید اس سبب سے کہ مجھے اُن کے ساتھ رہنے کا کم ہی وقت ملا۔ ظہیر خاں! یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مگر شکلا جی! کیوں؟"

"اس لیے ظہیر کہ کرشنا جی نے تمھارے بارے میں جو خواب دیکھا تھا میں اُس کی تعبیر اُلٹی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمھیں کرشنا جی کا واسطہ دیتا ہوں۔ میں تو جا ہی رہا ہوں لیکن تم بھی ان لوگوں کو چھوڑ کے کہیں نکل جاؤ اور سب کچھ بھلا دینے کی کوشش کرو۔ پھر کبھی اُس طرف کا رُخ مت کرنا۔ جب انگلیاں ٹھیک کام کرتی ہوں تو چاقو اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ انگلیوں سے قلم بھی چلایا جا سکتا ہے۔ انگلیوں سے بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ظہیر خاں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کس طرح بات کروں۔ تم نے رات کی گفتگو سُن لی ہوگی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں لیکن میں تمھارے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ حالات بہت بگڑ بھی سکتے ہیں۔ راستے مسدود بھی ہو سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو؟"

"شکلا جی!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "آپ نہ چھٹی کی درخواست دیجیے، نہ ملازمت ترک کرنے کا خیال کیجیے، اپنا کام کرتے رہیے۔ رہا میرا سوال تو میں یہاں سے بہت جلد چلا جاؤں گا بشرطیکہ حالات نے اجازت دی مگر ابھی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟"

"میرے ساتھ کچھ مجبوریاں ہیں۔ انھیں مجبوریوں میں آپ کے خیال سے کہہ رہا ہوں حالانکہ مجھے ذمّے داریاں کہنا چاہیے۔"

"کیسی ذمّے داریاں؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔"

"ظہیر خاں! تم آگ میں بیٹھے ہوئے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سانس کھینچ کے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ شکلا جی کے علاوہ آپ کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور بدقسمتی سے میری بھی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی سخت مرحلے سے دوچار ہوں۔ ہم اپنی دوسری حیثیتیں یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے آپ بھی میری مجبوری سمجھیں۔ آپ بھی صاف بات کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں اور میں بھی کوئی ایسی بات کرنا نہیں چاہتا جس میں آپ سے اپنے تعلق کی بنا پر کسی رعایت طلبی کا پہلو نکلتا ہو۔"

"تم کیسی سمجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہو۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "ایسے نہیں ہو سکتے۔ میں رات کو بھی تمھارے پاس آسکتا تھا لیکن جب میں یہ کاغذ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تب میں نے تمھارے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔"

"آپ اپنے کام پر جائیے شکلا جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔ میں کشمکش توڑ کے آپ کے سامنے آؤں گا۔"

"نہیں ظہیر! نہیں۔ میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔ تم میرے بے کرشنا جی کا ورثہ ہو۔ کرشنا جی میرے بہت محترم تھے، وہ مجھے بہت عزیز تھے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے تمھارے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔" شکلا نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ "ظہیر! میں اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ میں کام نہیں کر سکتا۔"

"پھر آپ مجھے مجبور کر دیں گے۔"

"مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر لگی ہے اور تمھاری باتیں سُن کے اب اس فیصلے کی توثیق بھی ہو گئی ہے۔"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے کہ جس میں آپ کے فیصلے کی توثیق کا کوئی مفہوم پوشیدہ ہو۔" میں نے تندی سے کہا۔ "میں تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ آپ کی دست برداری اور خاموشی غلط ہے۔"

"لیکن بڑی بُرائی سے چھوٹی بُرائی بہتر ہوتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے ذہن میں کوئی حتمی رائے قائم کر لی ہے اور وہی آپ کی اُلجھن کا سبب ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی رائے درست نہ ہو۔"

"میں نے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی ہے۔ میں وردی بہن کے نہیں آیا ہوں، نہ میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا نادرست لیکن اگر یہ صحیح ہوا تو..... تو؟"

"تو آپ اسے غلط ثابت کرنے کی مشکل میں نہ پڑیے گا۔ آپ کوئی لحاظ مت کیجیے گا۔" میں نے شکستگی سے کہا۔

"شاید یہ میں نہ کر سکوں۔" وہ آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں اپنی بات دُہراتا ہوں۔ میں یہ پُرزہ لے کے ہیڈ آفس جا رہا ہوں۔ تم..... تم

بھی ہو سکے تو اُدھر مت جانا۔ میں تم سے یہی کہہ سکتا ہوں۔ سوچ لینا ظہیر اور بہ سکے تو مان لینا۔"

یہ کہتے ہی وہ اُٹھ گیا۔ مجھ میں اُسے روکنے کی ہمّت نہیں تھی۔ اُس نے چھپاؤ اور سویلین کا انتظار بھی نہیں کیا۔ تیزی سے دروازہ کھول کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ موٹر چلنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کے گلی میں پہنچا۔ اُس کی موٹر نکل چکی تھی۔

میرے خون کی گردش رُک گئی تھی۔

اُدھر وہ گیا اِدھر جامو اور کانتے نے مجھے آ کے گھیر لیا اور کہنے لگے کہ ایس پی شکلا کیا کہنے آیا تھا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ وہ کچھ کہنے نہیں، کچھ سنانے آیا تھا۔ بیان لینے نہیں، بیان دینے آیا تھا۔ میری خاموشی پر وہ ناراض سے ہونے لگے تو میں نے انھیں ساری بات بتا دی کیونکہ ان باتوں کا تعلق اُن سے بھی تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح اُن کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے مسکرا کے اُن کی طرف دیکھا۔ جامو کا سر جھک گیا تھا۔ کانتے بھی اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔ جولین نے اُن کے سامنے چائے لا کے رکھ دی۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ خاصی دیر اسی طرح گُم سُم بیٹھے رہے۔ پھر جامو نے سر اُٹھایا اور بوجھل آواز میں بولا۔ "لاڈلے! مجھے بتا تو کس نتیجے پر پہنچا ہے؟"

"یہ تم نے عجیب بات کہی جامو بھائی!" میں نے زہرخند سے کہا۔

"دیکھ لاڈلے! اور باتوں کے سوا ہم کو اس وقت پہلے نتیجہ دیکھنا ہے۔ تیری باتوں سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلے سُن لینا۔ چرا چری بعد میں کرنا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شکلا کو پتہ چل گیا ہے کہ پرسوں رات واردات سالی کس نے کی تھی۔ اب وہ تجھ کو جتانے اور مشورہ دینے آیا تھا کہ اِبھی وقت ہے تو اُن چھو ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ اب ذرا تصویر الٹ کے دیکھ۔ اُدھر کورا کاغذ ہے۔ بالکل چپٹا میدان۔ کوئی گھاس پھوس نہیں، کچھ نہیں کھا، کوئی بکیر نہیں پڑی۔ اس پی نے کل رات تجھے پیڑ کے اڈے پہ دیکھا تو تصویر کے کوری طرف اُسے کچھ دکھائی دینے لگا۔ اپنا آدمی بیچ میں نظر پڑ جائے تو سالا ایسا اپنے آپ ہونے لگتا ہے۔ شکلا کے سر میں شک بھر گیا۔ شک کیا، خوف بھر گیا کہ کہیں تُو تو ان لوگوں میں شریک نہیں ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ تو اڑی اور اُس کے آدمیوں نے کرشنا جی کو ختم کیا ہے اس لیے اُس کے شک کو اور ہوا لگی اور وہ شک کی حالت میں تیرے پاس آیا کہ تجھے ہوشیار کر دے۔ مطلب یہ کہ وہ دو حالتوں میں سے ایک میں تیرے پاس آیا۔ شک کی یا یقین کی۔ دونوں میں اُس کے لیے مرن ہی مرن تھا۔ سو اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اب ہم کو یہ جاننا ہے کہ وہ کس حالت میں تیرے پاس آیا۔ لاڈلے! یقین کی بات ہوتی تو ایک تو اُس کی باتوں کا رنگ دوسرا ہوتا، دوسرے والدات کے بارے میں جو میں نے تجھ سے مغزماری کی تھی، اب بھی وہی کہتا ہوں۔ تو کہتا ہے کہ تو نے بھل بھائی کو شکلا کے بارے میں بول دیا تھا۔ بھل بھائی کے سر میں ایس پی شکلا کا دھیان ضرور ہو گا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے انڈیل لی۔ میں حیرانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خود سے باتیں کر رہا ہوں۔ "تم نے تمام....."

"ابھی نہیں۔" اُس نے مجھے بات نہیں کرنے دی۔ "ابھی میری بات ادھوری ہے۔" وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا۔ "تو نے شکلا سے بھٹ کی کہ وہ عرضی واپس لے لے۔ اُس نے منع کر دیا۔ ہم شکلا سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمی تھے اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی اپنی جگہ کام کرنا نہیں چاہتا۔ بجھا لاڈلے! اب اپنی طرف آجا۔ ہم تو جیل جانے کے بعد جیل سے نکلنے کا ہر جتن کرتے رہیں گے اور شکلا بھی سامنے آیا تو گردن ہلاتے رہیں گے۔" جامو زور زور سے نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تُو تو پڑھا لکھا ہے۔ اگر تجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے تو مجھے بتا دے۔ شکلا کو اتنا خیال تو ہو گا اور ہونا چاہیے کہ ہم نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ اب تو پکڑ لونا چاہے تو لے دھرکی بول۔ میں نے اپنی بات ختم کر دی ہے۔"

میں نے جامو کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اُس دن میں دن بھر گھر ہی رہا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے بھل کے پاس گیا تو وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ کل والی خواجہ نہیں تھی، کوئی دوسری لڑکی تھی، دُبلی پتلی۔ مجھ کی آواز سُنی تھی۔ سب گُم تھے اور وہ چوکی کے سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی تھی ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

میرا جی چاہا کہ میں وہیں بیٹھ کے سُنتا رہوں مگر جب اُس کے گھنگرو بجے تو مجھے فتی یاد آنے لگی۔ میں بھل کو ایس پی شکلا کی بابت کچھ نہ بتا سکا۔ صرف چند باتیں ہو سکیں۔ جب میں چلنے لگا تو دروازے کے پاس پیر رُکے میرے سر پہ نوٹوں کی گڈی رکھ کے مجھے روک لیا۔ بھل نے اُسے آواز دی مگر پیر و دگن تھا۔ لڑکی ناچتی گاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اُس کی پیشانی اور گالوں پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بھینچ لیں اور کھڑے کھڑے ہانپنے لگا۔ میرا لاجسم پسینے میں نہا گیا۔ لڑکی گاتی رہی۔ جیسے ہی اُس نے میرے سر سے نوٹوں کی گڈی اٹھائی، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا رہی تھی اور پیر قہقہے لگا رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ دُور تک اُن کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

پاڑے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کہ اندر پولیس تو موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ

پولیس آج سارا دن نہیں آئی البتہ علاقے میں اُس کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو رات زیادہ ہو گئی تھی۔ جولین ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں دن میں دیکھ چکا تھا کہ پرسوں رات کی واردات کے بارے میں کیا کیا خبریں چھپی ہیں۔ جولین کے خیال سے میں نے اخبار صوفے کے نیچے پھینک دیا تھا لیکن وہ اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ آج کی خبروں میں سب سے نمایاں خبر اسی واردات کی تھی۔ اخبار نے مرنے والوں کے نام اور اُن کی روداد شائع کی تھی کہ اُن میں کون کتنی بار کس کس جرم میں جیل گیا۔ اُس نے اسے اپنی نوعیت کی سب سے منفرد اور سنگین واردات قرار دیا تھا اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی تھیں۔ ایک جگہ سرسری طور پر کرشنا جی کا ذکر بھی تھا۔ لکھا تھا کہ اس موقع پر وہ بہت یاد آئے ہیں۔ اخبار میں چھپنے کے بعد ہر بات انوکھی اور حیرت انگیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ واقعہ بھی اخبار نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تھا اور توقع ظاہر کی تھی کہ جلد ہی اہم انکشافات ہونے والے ہیں۔ اخبار میں ایک اور نمایاں خبر کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں پولیس کی ناکامیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ جولین کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اُس نے خبر ضرور پڑھ لی ہے۔ جاگو اور کانتے زخمی حالت میں اُس کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ صبح اس پی شکلا آیا تھا پھر جاگو اور کانتے دن بھر آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے تھے۔ بچل غائب تھا۔ جب میں واردات والی صبح منہ اندھیرے واپس آیا تھا تو میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ سوچنے کے لیے جولین کے پاس بہت کچھ تھا۔ میں نے اُس سے رسمی بات کی اور جلدی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ دونوں ابھی جاگ رہے تھے۔ میں کانتے کے پاس ہی لیٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئے گی تو ڈرائنگ روم میں جا کے سو جاؤں گا۔ میں نے دیکھا تھا اُس کی آنکھیں آنی ہوئی تھیں میرے بس میں ہوتا تو میں اُس کے سامنے آنسو نچوڑ لیتا۔ وہ ہنستی ہوئی بالکل پھول کے مانند کھل جاتی تھی۔ اُس کی ہنسی چھلکتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ ہمیشہ ہنستی رہے۔ ہنستے ہوئے اُس کے دانت اس طرح جگمگاتے تھے جیسے اُس کے منہ میں دودھیا روشنی بھر گئی ہو۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اُس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ تم کہیں روتی ہو، دو مت۔ مگر میں سوچتا ہی رہ گیا۔ بہت دیر بعد آہٹ ہوئی۔ میں دبے قدموں وہاں پہنچا۔ پہلے میں نے بھائک کے اطمینان کر لینا چاہا۔ وہ ابھی تک موجود تھی۔ اُس کا آدھا بدن چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور بند آنکھوں سے آنسو رس رہے تھے، چہرہ اُوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں دیکھتا رہا اور رینگتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر دوبارہ آہٹ ہوئی لیکن میں پلنگ پر پڑے پڑے اندھیرا گھورتا رہا۔

پانچویں دن وہ زخمی اپنے اپنے پاڑے واپس آ گئے جن کے زخم معمولی تھے اور جن کی حالت ابھی ٹھیک نہیں تھی، وہ ابھی تک پچھے ہوئے تھے۔ مارٹی کا حال پہلے سے اچھا تھا۔ اُس کا زخم خشک ہو رہا تھا۔ میں اُسے دیکھنے گیا تو وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے گلے سے لگایا۔ مارٹی کے ساتھ دو ایک زخمی اور تھے۔ اُن کے قریب پھلوں کا انبار تھا۔ ایک آدمی اُن کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ پیرو کے علاقے کا خاص ڈاکٹر روز رات کو انھیں دیکھنے آتا تھا۔ اس اثنا میں پولیس افسر کا زور کچھ بڑھ گیا۔ میں نے اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گزارا۔ جولین جامو اور کانتے کی نرسنگ کرتی تھی۔ کانتے کی پیشانی اور کان کا زخم بھر گیا تھا۔ البتہ ٹھوڑی خشک ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ جامو کے بازو میں چاقو لگا تھا۔ وہ دیسی دواؤں سے اپنا علاج خود کر رہا تھا۔ جولین کی ماں بازار سے سودا لینے جاتی تھی تو اُن کی دوائیں بھی لے آتی تھی۔ اخباروں میں روز خبریں چھپ رہی تھیں۔ ہر طرف تیواڑی کی تلاش جاری تھی۔ اب خبروں کا رجحان تیواڑی کی گم شدگی یا فرار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اُس کے باقی آدمی بھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بہت سوں نے پیرو کے پاڑے میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ پیرو نے کہہ دیا کہ وہ کچھ عرصے بعد دھرکائنج کریں۔ تیواڑی کا علاقہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ پولیس کی موجودگی کے باوجود علاقے میں لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے تھے۔ پولیس نے ہر طرف گرفتاریاں کی تھیں، چند ہی آدمیوں کو چھوڑا تھا۔ وہ پیرو کے پاڑے کے کچھ اور آدمی پکڑ کے لے گئے تھے۔ شعلا استاد ابھی جیل میں تھا۔

اپی شکلا اس کے بعد گھر نہیں آیا، نہ ہی وہ اُن افسروں میں شامل تھا جو بار بار پیرو کے پاڑے آتے تھے اور ہر بار نئے نئے سوال اُٹھاتے تھے۔ میں نے جولین کو اسکول جانے سے روک لیا تھا جس دن سے اُس نے خبر پڑھی تھی، اُس دن سے وہ گم سُم ہو گئی تھی۔ کانتے اُسے بہلانے کی کوشش کرتا تو وہ دبی دبی پھیکی پھیکی ہنسی ہنستی تھی۔ پیپا بھی چپ چپ رہتی تھی۔ یا تو نماز پڑھتی رہتی یا مصلے پر بیٹھی تسبیح گھماتی رہتی۔ کئی دن گزر گئے تھے اب تنہائی کے چند لمحے بھی مشکل سے نصیب ہوتے تھے۔ رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ آدمی مرجائے تو اُس کے پاس جانا آسان ہو جاتا ہے۔ زندہ لوگوں کے پاس جانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تھی لیکن میں اپنے کمرے میں بند ہو کے کسی نہ کسی طرح اُسے بلا لیتا تھا۔ اُس کی پرچھائیاں وہاں آ جاتی تھیں۔ میں اُس کی بالوں والی ٹانگوں میں اُس کی خوشبو سونگھ لیتا تھا اب تو گردن سے بالا نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لوگ ہر وقت سامنے رہتے تھے۔ دل ہر وقت اُڑا اُڑا رہتا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو طبیعت نہیں کرتی تھی اور سب سے بات کرنی پڑتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ دن کب ختم ہوں گے اور وہ کون سا دن ہو گا جب کوئی دیوار سامنے نہیں رہے گی۔

رات کے وقت میں روز پاڑے جاتا تھا اور جلد ہی واپس آ جاتا تھا۔ چھٹے دن رات کو میں بچل کے پاس خاموش بیٹھا تھا کہ مٹو اور لکھے بھاگتے اور ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "دادا! — دادا!" مٹو نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "دادا! — وہ ..... وہ اپن کا زور اکوار لیٹ کر کے لے گیا۔" مٹو نے بدحواسی سے کہا۔ پولیس کا لوگ راجا جی کو لوتا تھا، زور لوٹا، راجا نے پاڑا اپن کو دے دیا ہے۔ راجا اس ٹائم نہیں ہے۔ جب لوٹو اور زور چلا چلے گا۔ ابھی کوئی اس پاڑے کا بات کرنا تو تو لوگ اپن سے کرو۔ وہ سالا زور اکو لے گیا دادا!"

بچل کے ہاتھ میں بھری ہوئی چلم تھی۔ دفعتہً مٹو کی بات سن کر اُس کے منہ پر پھینک ماری تھی۔ فرش پر چنگاریاں بکھر گئیں۔ مٹو اپنا منہ کھسوٹنے اور بری طرح چلانے لگا۔ "ماچی! ماچی!" بچل کی گرج دار آواز پر ماچی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ماچی! اس کتے کے پلے کو اُٹھا کے باہر لے جا۔ جب تک اس کو رات کا آ جائے گا، مٹو مت چلانا۔" ماچی اُسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہر طرف سکوت مسلط ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد بچل کی بھری ہوئی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ وہ لکھے سے مخاطب تھا۔ "لکھے! اچھا ہوا کہ تو نے زبان نہیں کھولی۔ سالا تم اپنی سسرال والوں سے گھبراتے ہو۔ پیرو ایسا گدھے کے بچے بدمعاش بنتے ہیں۔ ان لفنگوں کو اتنا نہیں معلوم کہ ہتھکڑی چاقو والے کا زیادہ ہے اور جیل خانہ۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "جیل خانہ سسرال ہے جن کو یہ رشتے بھی نہیں معلوم، وہ حرام کے تخم نرشہ بن جاتے ہیں۔"

"بچل بھائی! غصہ تھوک دو۔" پیرو دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ سب سالا ایکدم ٹوٹو کا دم ہے۔ یہ بمبئی ہے۔ سالا ہر اونگا بر اونگا دادا بننے کے شوق میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے سالا دادا نہیں ہوا، پڑی مار ہو گیا، سرکس کا بوکر ہو گیا۔" وہ تھوک کے بولا۔

بچل نے اسی وقت پیرو کے خاص آدمی گلیا کو ہدایت کی کہ وہ لکھے کے ساتھ زور کے پاڑے میں جا کے کہے کہ زور آیا، سارا پاڑا بلا جا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے اُس نے لکھے کو آواز دی۔ "لکھے! چھپا سے بول دینا کہ حوالات میں زور اسے جا کے مل لے اور بتا دے کہ خبر ہو گئی ہے۔"

لکھے سر ہلا رہا تھا۔ اُس نے سر جھکایا اور گلیا کے ساتھ فوراً باہر نکل گیا۔ بچل کے کہنے سے پہلے ہی میں بھی وہاں سے چل دیا۔ دوسرے دن دوپہر کو پولیس نے پیرو کو گرفتار کیا۔ رات کو جب میں حسب معمول علاقے میں پہنچا تو پاڑے سے کچھ دُور ہی مجھے یہ اطلاع مل گئی۔ میرے پیر زمین سے اکھڑنے لگے۔ سنبھل سنبھل کے میں نے عمارت میں قدم رکھا۔ بچل کو جلد سے جلد دیکھنے کی خواہش میرے سینے میں آندھی کی طرح اٹھی تھی۔ کمرے میں سب سے پہلے میری نظر اُسی پر پڑی۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے چکی کے درمیان میں بیٹھا تھا۔ اردگرد لوگ جمع تھے۔ خلافِ توقع وہ بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا اور کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ جیسے ہی میں اُسے دکھائی دیا، اُس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اُس کے قریب بیٹھے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ اُس نے کھینچ کے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ "سب خیریت ہے؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

"ہاں۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔

"کوئی نئی بات؟"

"وہ تو نے باہر سُن ہی لی ہو گی۔"

"کیا؟" میں نے جان بوجھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ میں پیرو کی خبر اُسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ میری صورت دیکھ کے وہ اگر افسانی لینے لگا تو میری یہی مرضی ہے کہ میرے بڑے سُنے تو سُن۔ پیرو چلا گیا ہے۔" وہ تیزی سے انگلیاں کھولنے اور بند کرنے کی مشق کرتے ہوئے بولا۔

"پھر۔۔۔؟" میں نے تجسس سے کہا۔

"پھر کیا، پھر۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اب چلنے کی تیاری کر۔ انداز ذرا سا ٹیڑھا ہو گیا۔ دیر زیادہ ہو گئی۔ اب کوئی کام رہ گیا ہو تو جلدی سے نمٹا لے۔"

"تم..... تم ہوش میں ہو؟" میں نے ہکلا کے کہا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ہوش میں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولا۔ "اب کیا یہیں بیٹھا رہے گا لے! چلنا نہیں ہے کیا؟"

"مگر ہم کیسے جا سکتے ہیں۔"

"اب دیر کیا رہ گئی ہے۔ تھوڑا سا کام اور ہے۔"

"ابھی پیرو بند ہے۔" میں نے تلملا کے کہا۔

"وہ بھی آ جائے گا۔ منہ کا مزہ لے گیا ہے۔ کبھی کبھی برکت ہوتی رہنی چاہیے۔ مجھے بھی دن بہت ہو گئے۔" وہ کسمسا تے ہوئے بولا۔

میں نے نہیں پوچھا کہ پیرو کب لوٹ کے آ جائے گا۔ وہ کسی بنیاد ہی پر یہ بات کہہ رہا ہو گا۔ میں نے اُس سے ضد بحث نہ کر دی تھی جو وہ کہتا تھا، میں سن لیتا تھا کیونکہ اُس سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کوئی اور بات نہ ہو جائے۔ جو وہ کہہ رہا ہے، سچ ثابت ہو جائے۔ مجھے اپنی دعاؤں سے ڈر لگتا تھا اس لیے میں نے دعا نہیں مانگی۔ میری زبان ہی کالی تھی۔ بمبئی چھوڑنے کے خیال سے میری رگوں میں تھن اچھلنے لگا۔ وہاں رواں کھڑا ہو گیا۔

"ہم کب تک چل سکیں گے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اب دن اور وقت کی بابت تو میں تجھے نہیں بول سکتا۔ پر جلد ہی لاڈلے! مجھے پتہ ہے کہ تو یہاں سے نکلنے کے لیے کتنا بے چین

ہوگا۔ بس کچھ دن اور ٹھیر جا۔"

"تجھے اندازہ ہے کہ میں کس طرح ....."

"ہاں ہاں" اس نے مجھے ٹوک دیا۔ "انتظار کرلا ڈلے!"

"اور کیا ہو رہا ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"زندگانی انتظار ہی انتظار ہے، اچھے دن، اچھی رُت کا انتظار، بچھڑے ہوؤں کا انتظار، بچپن سے جوانی کا، جوانی سے بڑھاپے کا انتظار اور موت کا انتظار۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔

جامو اس قابل تھا کہ پاڑے جا سکے۔ دوسرے دن میں پہلی بار اس کے ساتھ وہاں پہنچا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پیرو وہاں بیٹھا تھا۔ کمرے میں پیرو کے تمام خاص خاص آدمی موجود تھے۔ زور اور پھیلا بھی تھے۔ جامو کو دیکھ کے سب اس کی طرف دوڑ پڑے اور اس سے گلے ملنے لگے۔ بجھل بھی اپنی نشست سے اٹھ کے آگیا اور جامو کو لے کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ پیرو جامو کو دلاسے دیتے ہوئے تھا اور اس سے وہی بات کر رہا تھا جو ایک بار اس نے مجھ سے کہی تھی۔ جامو بجھل کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگا۔ بجھل نے پھر معذرت چاہی "آئیں گے پیرو داد! پھر آئیں گے۔ اب جانے دو۔ اب ہم لوگ کے ادھر کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ایسا سمجھتے ہو تو کہہ دو۔"

"نہیں بجھل بھائی؟" پیرو اضطراب سے بولا۔ "ابھی اپن سالا سب سنبھال لے گا۔ اس بار تھا سے رکنے کو نہیں بولتا۔ اپن کا مطلب کچھ اور ہے۔ آکھا دن تو سالا اٹھک بیٹھک میں خلاص ہوگیا۔ اپن تم سے ٹھیک بول سکا، نہ تھالے پاس بیٹھ سکا۔ ابھی کچھ ٹائم دو نا کہ پیرو اپنے بجھل بھائی کو سُتی کا جلوہ شلوہ دکھائے۔"

"وہ بعد میں ہو جائے گا پیرو داد! تم کو بہت کام پڑے گا۔"

"کام سالا ہوتا رہے گا۔" پیرو بجھل کے بولا۔ "تم کو کوئی روز روز ایدھ آتا ہے۔ اپن کی بات پر نامت بولو، بولو ہاں، ہاں، ہاں۔" اس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔

"ہاں کیسے بول دے پیرو!" بجھل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور پیرو کو سمجھانے لگا۔ مگر سامنے بیٹھے ہوئے آدمی بھی پیرو کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اُن کی باتیں میرے پلے بالکل نہیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ مجھے سُنانے کے لیے کہہ رہے ہوں اور مجھے چھیڑ رہے ہوں یا بہلا رہے ہوں۔ ممکن ہے بجھل نے پہلے سے کہہ رکھا ہو کہ جب میں آؤں تو وہ میرے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے لگیں۔ اس طرح کچھ وقت اور نکل جائے گا۔ پرسوں رات زور اور کل دوپہر پیرو پکڑا گیا۔ اُن کی واپسی اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ پیرو کے اصرار اور بجھل کے انکار کا سلسلہ دیر تک جاری رہا

تاآں کہ درمیان میں جامو کود پڑا۔ جامو نے وعدہ کیا کہ ہم چند دن اور ٹھیر جائیں گے۔ جامو کی یقین دہانی پر وہ سب نعرے لگانے لگے اور پیرو نے جامو کے گالوں کی بوٹی لے لی۔

کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ ہر شخص زور زور سے بول رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا اور ایک دوسرے کو گھونسے مار رہا تھا اور گلے مل رہا تھا۔ مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ سب مل سے یہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ جانے کا ارادہ ملتوی کردیں۔ میری حیرت اُس وقت کچھ اور سوا ہوگئی جب کمرے میں بجھل کی آواز پر سکوت طاری ہوگیا۔ اس کے مخاطب سبھی لوگ تھے اور وہ پاڑوں کے انتظام اور تقسیم پر کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے اُن کے درمیان کچھ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تیواڑی کے پاڑوں پر ہاتھ ڈالنے کا وقت نہیں آیا ہے لیکن کچھ عرصے بعد یہ سب پیرو کے پاس آجائیں گے۔ راجا کے دونوں پاڑے بھی اب پیرو کے پاڑے میں شمار ہوں گے۔ بجھل جامو کا نہ تو رشتے دار تھا نہ اس سے ملنے والے پاڑوں میں سے کسی کے دعویدار نہیں ہیں۔ یہ سب پیرو کے ہیں اور پیرو کو اختیار ہے کہ وہ کسے کون سا پاڑا دے۔

اس موقع پر پیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ "تیواڑی کا پاڑا تمہارا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ بھی تمہارا ہے، سب تمہارا ہے بجھل بھائی! تم ایدھر رکنے کو بولو۔"

بجھل نے پیرو کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اُس کا بازو پکڑ کے بولا۔ "تم میں سے بہت سے آدمی پاڑا سنبھالنے کی جان کاری رکھتے ہیں لیکن اصل جان کاری کیا ہے۔ یہ تم انھیں طرح جانتے ہو۔ جس کا ہاتھ تلتا ہے اور جس کا سر صاف ہے، وہی جان کار ہے۔ ہم کو خوشی ہوگی، اگر تم یہ سب اپنے پاس ہی رکھو۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ تم میں یہ کتنا سمانا ہے۔ تم سالا اُتھلے برتن نکلتے ہو یا کٹوا بن جاتے ہو۔ بس ہم کو اتنا کہنا تھا۔"

یکلخت بجھل چُپ ہوگیا۔ پھر ایک دم پیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی اپن کو بھی بولنے دو۔ سالا بجھل بھائی کے آنے کے بعد اپن کا کھوپڑی جھل ہوگیا ہے۔ اپن بولتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے تم سب لوگوں کا ہے۔ پیرو سالا تھالے بغیر کچھ نہیں اور تم سالا ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں۔ ابھی اپن کے مل میں ہلبلہ سا اُٹھتا ہے۔ پیرو اپنا پاڑا چھوڑتا ہے۔ اپن یہ تم کو دینے کو بولتا ہے، بولو منظور ہے؟"

سب حیرت سے اُسے گھورنے لگے۔ کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر یہ سناٹا بھن بھناہٹ میں بدل گیا اور شور ہونے لگا۔ "منظور ہے۔" ماچھی نے پہل کی۔ سب نے چلا کے اُس کی تائید کی۔

"پیرو یہیں رہے گا۔" جامو نے ترشی سے کہا۔ "پیرو کو تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں پیرو کی۔ تم نے پیرو کو کھو دیا تو تم نے سالا سب کھو دیا۔ اس کو پکڑے رکھنا۔ اپنی بات یاد رکھو۔"

"ابھی جامو بھائی مسخری کرتا ہے۔" پیرو ہنسنے لگا۔

پھر اُن میں سے ہر آدمی بڑھ چڑھ کے مشورے دینے لگا کہ پاڑوں کا انتظام کس طرح کیا جائے کہ آپس میں جھگڑے فساد کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ ہر آدمی اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ ہم تینوں چُپ چاپ سنتے رہے۔ انھوں نے طے کیا کہ پیرو جیسا چاہے گا، اپنی مرضی سے پاڑے پر بٹھائے گا۔ اب چونکہ شہر کا بڑا حصہ ان پاڑوں پر مشتمل ہوگا اس لیے مختلف آدمیوں کو پاڑے تفویض کیے جائیں گے اور اُن کی مدت مقرر نہیں ہوگی۔ ہر پاڑا اپنے دادا کے نام سے پکارا جائے گا لیکن ان کا نگراں پیرو ہوگا اور یہ بات پولیس سے پوشیدہ رکھی جائے گی۔ ہر پاڑے سے آمدنی کا دسواں حصہ پیرو کے پاس آئے گا۔ پیرو اپنے پاس صرف ایک پاڑا رکھے گا۔ ہر مہینے کی کسی ایک تاریخ کو تمام پاڑوں کے دادا پیرو کے پاڑے میں جمع ہوں گے اور کوئی پریشانی یا شکایت ہوگی تو پیرو کے سامنے رکھ دیں گے۔ پیرو کے پاس تمام پاڑوں سے لیے ہوئے آدمیوں کا ایک خاص گروہ ہوگا جو کسی پاڑے کے دادا کی مخالفت پر اُس کے سر پر پہنچ جائے گا۔ اُن میں سے ہر آدمی کی حیثیت دادا کے برابر ہوگی۔ کسی پاڑے کی آمدنی کم ہے تو دسواں حصہ اُسے معاف بھی کیا جاسکتا ہے بلکہ اپنی طرف سے اُس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر پیرو کی منشا کے مطابق دادا وں کا تبادلہ بھی ہوتا رہے گا۔ ہر پاڑے میں چاقو زنی، اکھاڑے وغیرہ کا باقاعدہ انتظام ہوگا۔ آپس میں مقابلے ہوتے رہیں گے۔ اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ دادا بننے کا اہل ہے تو اُسے سیدھے پیرو کے پاس آنا پڑے گا۔ پیرو اُس کے مقابلے کا انتظام کرے گا۔ جیتنے کی صورت میں آزمائشی طور پر پہلے اُسے کوئی چھوٹا پاڑا دے دیا جائے گا۔ اگر اُس نے ٹھیک طرح پاڑا چلایا تو اُسے کسی بڑے پاڑے پر منتقل کردیا جائے گا۔ ہر پاڑا اپنے اپنے علاقے میں آزاد ہوگا۔ پیرو کی طرف سے محض مجبوری کے عالم میں دخل اندازی کی جائے گی۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جائے گی جو دادا وں کی آزادی میں حائل ہو، جس سے اُن میں بددلی پیدا ہو، اُن کی ہمت شکنی ہو۔ وہ خود کو پیرو کا غلام سمجھیں۔ پیرو کے خاص آدمیوں کے گروہ کا کوئی آدمی پیرو کی اجازت کے بغیر کسی پاڑے کے معاملات میں دخل نہیں ہوگا۔ اس انتظام کی بنیاد یہ تھی کہ پاڑوں کے درمیان میل جول قائم رہے اور جو حال کیا گیا ہے، وہ آپس کے انتشار میں کھو نہ دیا جائے۔ پھیلا نے تجویز پیش کی کہ علاقے میں پھیلے ہوئے آدمیوں کے کام بھی طے کردیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ طاقت کے زعم میں لے لگا ہو جائیں اور جو کچھ اب تک نہیں ہوا ہے، وہ ہونے لگے اور تیواڑی کی طرح انھیں کسی بات کا خیال نہ رہے۔

وہ بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ بجھل گردن جھکائے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ جامو کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں بگولے اُٹھ رہے تھے۔

جب وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں تو یقیناً انھیں تیواڑی کے معاملے میں اب کسی بڑی الجھن کا اندیشہ نہیں ہے اور بجھل کی بات سچ ہے کہ اب جانے کا وقت آگیا ہے۔ اب میری آنکھیں میرے پاس ہوں گی اور میں انھیں اُسی کے لیے وقف کردوں گا۔ میں نے جب پہلے پہل سوچا تھا کہ اب اگر راستے میں کوئی کرشنا جی نظر آئے تو میں نظریں جرالوں گا، راستہ ہی بدل دوں گا۔

جب بہت دیر ہوگئی تو پیرو بھڑک اُٹھا اور چیخ کر بولا۔ "بس، سب ٹھیک ہے۔ جیسا تم بولتے ہو، وہی ہوئے گا۔ اگر اس مافک کام ٹھیک نہیں چلا تو تین مہینے بعد اپن سب لوٹ دے گا۔ بھیا اب اپنے منہ پہ تالا لگاؤ اور سالا یہ سوچو کہ بجھل بھائی جانے والا ہے۔ وہ جا کے اُودر کیا بولے گا کہ تم لوگوں نے اُس کے ساتھ کیا کیا۔ ہم مارا۔ ناٹک کرتا رہا۔" پیرو انھیں برا بھلا کہتے اور گالیاں دینے لگا۔ اُس نے حکم دیا کہ فوراً ایک بڑے جشن کا انتظام کیا جائے۔ سارے شہر سے طوائفیں لائی جائیں اور تین دن تک ناچ رنگ کیا جائے۔ دوسرے علاقوں کے استادوں کو بھی مدعو کیا جائے اور دیگیں چڑھا دی جائیں۔

مگر بجھل اس جشن کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اُس نے سختی کے ساتھ منع کردیا کہ یہ موقع جشن منانے کا نہیں ہے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ بجھل کے انکار سے اُن کے مہرے لگ گئے۔ پیرو ناراض ہو کے بیٹھ گیا۔ بجھل نے اُسے سمجھایا کہ جشن کے اور بہت سے موقعے آئیں گے۔ بجھل نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ وہ انکار کرے۔ وہ نہ بولتا تو میں منع کر دیتا لیکن میرے کچھ کہنے کی نوبت نہیں آئی۔

جب میں اور جامو پاڑے سے باہر نکلے تو رات بہت گزر گئی تھی۔ میرے پیر زمین پر ٹیک نہیں رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور ہلکی ہلکی پھوار نے اُسے گیلا کردیا تھا۔ ٹیکسی موجود تھی۔ ابھی ہم کچھ دُور گئے ہوں گے کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ وہ وہی تھا۔ اُس نے بتایا کہ پیرو نے مجھے کل دوپہر پاڑے آنے کی ہدایت کی ہے۔ میں اُس سے وجہ پوچھنا چاہتا تھا مگر جامو میرا ہاتھ کھینچ کے آگے بڑھ گیا۔ میں ہر روز رات کو پاڑے جاتا ہی تھا، پھر دو بار کو خاص طور پر بلانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں بہت گھبرا گیا۔ خاصی بھاگ دوڑ کے بعد ہمیں ٹیکسی ملی۔ برسات کی وجہ سے ٹیکسی والے بھی سڑکوں سے بھاگ گئے تھے۔ جامو کا زخم ابھی ہرا تھا۔ پانی پڑنے سے بگڑ سکتا تھا۔ تاہم گھر سے کچھ فاصلے پر ہمیں ٹیکسی چھوڑنی پڑی۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ میں نے جامو کا بازو اپنی اوٹ میں لے لیا لیکن چلنے کے دوران میں یہ ایک مشکل کام تھا۔ جیسے تیسے بھاگتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔ جولین نے دروازہ کھول

دیا۔ ڈرائنگ روم روشن تھا لیکن جولین کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ہمیں بھیگا ہوا دیکھ کے وہ جلدی سے تولیے لائی اور مجھے اس نے ایک پاؤں دے دی۔

"ارے جولی بہن! تم اب تک جاگ رہی ہو؟" جامو نے حیرت سے کہا۔ ڈرائنگ روم بے ترتیب پڑا تھا۔ جولین بھی کچھ بے ترتیب سی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اسے ساڑی کا ہوش نہیں تھا۔ جامو کے دل کے برے خیال آیا۔ اس نے محاسن باتھ سے اپنی ساڑی درست کی اور نظریں نیچی کر لیں۔ "ہم نے تو کہہ دیا تھا کہ ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔" جامو نے ندامت سے کہا۔ "میں اب تمہیں کچھ دنوں کی تکلیف اور دے ہم جلد ہی چلے جائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ منتشر لہجے میں بولی۔ "آپ کپڑے بدل لیجیے جامو بھائی! بہت بھیگ گئے ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

"اب تم سو جاؤ۔ میں اس وقت چائے نہیں پیوں گا۔" جامو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں چند لمحوں تک وہیں بیٹھا ہوا جولین کو دیکھتا رہا۔ پھر میں بھی چلا آیا۔ کپڑے بدل کے میں کانٹے کے ساتھ بستر پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں جولین کی آواز آئی۔ وہ مجھے باہر بلا رہی تھی۔ جامو نے فوراً چادر اوڑھ لی کیونکہ اس نے قمیض اتار دی تھی۔ میں باہر گیا تو جولین چائے لیے کھڑی تھی۔ میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ ٹرے اس کے ہاتھ میں لرز رہی تھی اور پیالیاں بج رہی تھیں۔ ٹرے لے کے میں اندر آ گیا۔ جب بھی یہاں سے جانے کی کوئی امید پیدا ہوتی تھی، مجھے جولین کا خیال آنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے جانے کا سنے گی تو کتنی اداس ہو جائے گی۔ اب تو اس کا باپ بھی نہیں تھا اور نہ ہی کرشنا جی۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ دور کے چند رشتے دار ہوں گے تو وہ اس ماحول میں واپس جانا نہیں چاہتی تھی، نہ ہی اس کا وہاں جانا مناسب تھا کیونکہ وہ ایک علیحدہ ملک تھی۔ جولین اس اکیلی زندگی سے بہت گھبرائے گی۔ ذرا سی بھی ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہے۔ اس کا دل بہت کمزور ہے۔ وہ مارٹی سے کتنا ڈرتی تھی۔ میں نے اس کے لیے مارٹی سے لڑائی مول لی، کرشنا جی نے اسے نئے مکان میں منتقل کر دیا اور اچھی ملازمت دلوائی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ خوش رہے ہنستی رہے لیکن وہ روز بہ روز اداس ہوتی جاتی تھی۔ اس کا خیال میرے دماغ سے چمٹا ہوا تھا۔ کرشنا جی نے میرے لیے بڑی دولت چھوڑی تھی مگر جولین اس سے بھی بڑی دولت تھی۔ اس کی خوب صورتی صرف چہرے تک محدود نہیں تھی۔ رات دن صبح و شام وہ ہر وقت کرشنا جی کی طرح مجھے آرام پہنچانے کی جستجو میں لگی رہتی تھی۔ اب جانے کی کوئی صورت بنتی تو اسے اطلاع دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی حالانکہ میں اس سے بارہا کہہ چکا تھا کہ مجھے یہاں ٹھہرنا نہیں ہے۔ اسی لیے میں اس کے ساتھ گھر میں بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بہت پہلے سے احساس تھا کہ اس کے ساتھ رہوں گا تو اسے اور پریشان کروں گا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک مارٹی کے آزار سے نجات دلانا کون سی بڑی بات تھی اور مارٹی بھی اس کے ساتھ مجھے دیکھ کے زیادہ تنگ کرنے لگا تھا ورنہ وہ اس سے پہلے بھی وہیں رہتی تھی۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا میرے ہاتھ پیر تو ٹوٹے ہوئے تھے۔ میرا کام ان لوگوں کو دکھ پہنچانا رہ گیا تھا جو میرا خیال کرتے تھے۔

چائے پی کے جامو جلد ہی سو گیا۔ میں کرسی پر بیٹھا جاگتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ابھی تک جاگ رہی ہو گی۔ جامو نے میرے سامنے اس سے کہا تھا کہ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ اس نے میری اور جمل کی تمام گفتگو سنی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سوچتی ہو گی کہ مجھے روکنے کا مجھے کیا حق پہنچتا ہے۔ وہ بہت سی باتیں سوچ رہی ہو گی مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ جو میرے بس میں نہیں ہے، وہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ کیا میں جولین جیسی بے سہارا لڑکی کو سہارا دینے کے لیے بمبئی میں ٹھہر جاؤں؟ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ ہم دونوں بہت سکھ سے رہیں گے بمبئی میں جی نہ لگا تو کہیں اور چلے جائیں گے مگر پھر جولین تو میرے ساتھ رہے گی مگر میں خود کس کے ساتھ رہوں گا؟ میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں ہوں گا ورنہ پھر میں نرمیں کے پاس سے کیوں چلا آیا تھا؟ میں نے جمل سے کیوں فرار اختیار کیا اور جیل سے نکلنے کے بعد اس کی تلاش میں کیوں نکل کھڑا ہوا؟

بہتر ہے کہ میں اسے جا کے بتا دوں جولی! اچھی جولی! مجھے بہت کام ہے۔ تم خود اپنے بارے میں کچھ سوچو۔ کسی نہ کسی دن تو مجھے اس سے یہ بات کرنی ہی ہے۔ فرض کرو، میں نہ ہوتا اور اس کا باپ بھی مر گیا ہوتا اور کرشنا جی بھی نہ ہوتے تو وہ کیا کرتی۔ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ بے سہارا ہیں اور میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ میں کرسی سے اٹھ گیا اور ہلکی چاپوں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ جولین صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میری آہٹ پر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اس نے ساڑی کے پلو سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ خشک کیا اور پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم ابھی سوئی نہیں؟" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔ اس کے بدن میں ارتعاش سا ہوا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی گردن کچھ اور جھک گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "جولین!" چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے اسے پکارا۔ اس نے کسمسا کے ایک نام لینے کے لیے نگاہیں اٹھائیں اور اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ اس وقت

مجھ سے کوئی بات ہو رہی تھی اور نہ شاید وہ کچھ سننا چاہتی تھی چنانچہ میں نے سکوت اختیار کر لیا مگر یہ خاموشی نہ بولنے سے زیادہ بری تھی۔ "جولین!" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں اسے پھر مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تاکہ کہیں میری زبان رک نہ جائے۔ "مجھے اب چند دنوں میں یہاں سے جانا ہے۔" اس کی پلکیں پھر جھپک پڑیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس اطلاع سے دکھ ہو گا۔" میری آواز بھر بھرانے لگی۔

"میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا ہے مگر میری عقل کام نہیں کرتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ جولین! میں رک نہیں سکتا اور نہ تمہیں اس طرح تنہا چھوڑ کے جانے کو جی چاہتا ہے۔ تمہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ "مت رو۔ مت رو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم بہت اچھی ہو جولین! یقین کرو، میں تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہوں اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ تمہیں خوش دیکھ سکوں اور تمہارے لیے خوشی مہیا کر سکوں مگر جو چیز میرے پاس نہیں ہے، وہ میں کسی کو کیسے دے سکتا ہوں۔ شاید تمہیں میرے متفکر چہرے سے کچھ معلوم ہو گیا ہو یا جامو رکاکنتے نے تمہیں باتوں باتوں میں کچھ بتا دیا ہو لیکن جو کچھ انھوں نے تمہیں بتایا ہو گا یا تم نے اندازہ کیا ہو گا، وہ بہت کم ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنا مت۔ بس میں تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے جانا ہے اور مجھے نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ تم ایک ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے کہ میں تمہیں وہاں لے جاؤں اور تمہارے سامنے ایک بڑی زندگی پڑی ہے۔ فیض آباد میں ایک نوکری زیر بستی ہے مجھے خیال آیا تھا کہ میں تمہیں وہیں پہنچا دوں۔ وہ بھی تمہاری طرح بہت اچھی اور تنہا ہے۔ تمہاری تو ماں بھی ہے۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔ ایک بڑی حویلی میں رہتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے مل کے تو بہت خوش ہو گی۔ تم وہاں ملازمت بھی کر سکتی ہو اور تعلیم بھی جاری رکھ سکتی ہو مگر جب میں نے سوچا تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس طرح کوئی کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ شاید تم بھی اسے پسند نہ کرو۔ جولین! کرشنا جی نے میرے نام بہت بڑی رقم چھوڑی ہے۔ وہ رقم میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ تم اس رقم میں سے جو چاہو لے لو یا سب اپنے پاس رکھو۔ پھر تم ایک بہت اچھا گھر بنا سکتی ہو، ملازم رکھ سکتی ہو اور ملازمت چھوڑ کے اطمینان سے کام کر سکتی ہو۔ تم چاہو تو اپنی ماں کا کہیں انتظام کر کے ہوسٹل میں بھی رہ سکتی ہو، ولایت بھی جا سکتی ہو۔ اس رقم سے تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ خبر ہے، کتنی رقم ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔ میں گھبرا گیا۔ "ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب۔"

اس نے اپنی بھیگی لرزتی ہوئی پلکیں اٹھائیں اور اپنا منہ پھیر لیا۔

"تم نے سنا کرشنا جی مجھے کیا سمجھتے تھے۔ میری آواز بھٹکنے لگی میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا اس لیے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ روپیہ بینک میں محفوظ ہے۔ میں نے اس میں سے ایک پائی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ کرشنا جی نے نہ جانے کیوں مجھے میرے نام کر دیا تھا۔ تم اس قدر رو کیوں رہی ہو؟ جولین! میری باتوں کا جواب دو۔" میں نے وحشت سے کہا۔ "رونا بند کرو۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا دیے۔ وہ نڈھال ہو کے میرے سینے پر گر پڑی۔ میری سانس بند ہونے لگی اور جسم سن ہو گیا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ جولین میرے سینے پر سسک رہی تھی۔ میں دیر تک گنگ بیٹھا رہا۔ پھر میری سانس چھوٹنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ اسے خوب زور سے گلے لگا لوں، خوب پیار کروں اور کہہ دوں کہ میں نہیں جاؤں گا، میں یہیں رہوں گا لیکن میری زبان اور عقل پر سے عشر طاری ہو گیا تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کس طرح اور کب جولین کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ میں نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ "مت رو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ میری بلند آواز سے گھر میں کوئی بھی جاگ سکتا ہے۔ جولین خود ہی سنبھل گئی۔ "میری بات سنو جولین! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمہاری فکر نہیں ہے لیکن تم... تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں کون روک سکتا ہے۔" وہ ہچکتی ہوئی بولی۔

"اس طرح مت کہو۔ میں رک جاؤں گا تو تمہیں پریشان ہی کرتا رہوں گا۔ میں نے رکتے ہوئے کہا۔ "نہ خود چین سے بیٹھوں گا، نہ تمہیں چین لینے دوں گا۔ میں ہر لمحہ تمہیں رلاتا رہوں گا۔ اب تک تو میں نے ہی کیا ہے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہاں رکنے میں نے تمہیں کیا دیا۔ آنسو دیے۔ میرے پاس اور ہے بھی کیا۔ میں تو کب کا چلا جاتا۔ ایک کام نے روک رکھا لیکن اب میں ایک طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ سمجھ لو، کرشنا جی نے مجھے کچھ کام سونپا تھا۔ وہ اب نمٹ چکا ہے۔ وہ چونکے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔

"لیکن میں تمہاری جانب سے فکرمند ہوں جولین! میں نے تمہارے سامنے کئی باتیں رکھی ہیں۔ تم اپنے لیے جو بات مناسب سمجھو، مجھے بتا دو۔ میرا خیال ہے تم ایک نیا مکان لے لو۔ پیسے کی فکر کسی کام آئیں گے۔"

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

"کیوں نہیں چاہئیں؟" کرشنا جی تمہیں بھی اتنا عزیز رکھتے تھے جتنا مجھے۔ ان کے پیسوں پر تمہارا بھی حق ہے اور اب تو یہ میرے پیسے ہیں۔ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ تمہارے دل میں کچھ اور خیال آ رہا ہے

کیا؟ نہیں.... نہیں اسے دل سے نکال دو۔ میں یہ بات تم پر ترس کھا کے نہیں ضرورت مند سمجھ کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تم خوش رہو سمجھیں۔"

"تم چلے جاؤ۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔

"مگر تمہارا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں میں زندہ رہ لوں گی۔" اُس کی زبان ڈگمگا رہی تھی۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا پڑے گا۔" اُس کی ٹھٹھری ہوئی آواز اُبھری۔

"زندہ رہنا ہے۔"

"ہاں جولین! میری اچھی جولین! کچھ نہ کچھ ضرور سوچو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلتا مگر میری کوئی منزل، کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر خدا نے میری بات سن لی تو میں کبھی نہ کبھی ضرور واپس آؤں گا۔ یہاں میں مارٹی سے کہہ دوں گا۔ وہ میری عدم موجودگی میں تمہارا خیال رکھے گا اور میں تمہیں چند ایسے نام بتا کے جاؤں گا کہ جب بھی میرا نام لے کے تم اُن سے ملو گی اور تمہیں کوئی پریشانی ہوگی تو وہ فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ وہ میرے نام کا اتنا پاس ضرور رکھیں گے۔ وقت پڑا تو وہ تمہارے لیے جان بھی لڑا سکتے ہیں۔ جولین! تم یہ بھی تو سمجھ سکتی ہو کہ میں مر گیا ہوں۔ کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ گزشتہ شام کی جو چاقو گے ہارگردہ مجھے لگ جاتے؟"

جولین بُت بنی بیٹھی تھی۔ وہ نہ میری طرف دیکھ رہی تھی نہ رو رہی تھی۔ اُس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ گیلے رخساروں پر لیمپ کی پیلی روشنی دمک رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ بار بار تھرتھرانے لگتے تھے۔

"تم بولتی کیوں نہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کچھ تو ضرور سوچ رہی ہوگی؟"

"وہ گم صم بیٹھی رہی۔" میں بھی سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔ باہر مسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پرنالے گرنے کا شور اندر تک گونج رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی کبھی مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ شاید بجلی جانے والی تھی۔ جب دیر ہو گئی اور اُس کے بدن کی کوئی آہٹ نہیں اُبھری تو میں نے بے چینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ جولین کا بدن ساکت تھا۔ صرف سینہ متحرک تھا۔ صبح تک میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ وہ بھی بیٹھی رہی۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ دودھ والے نے آواز لگائی تو وہ چونک پڑی۔ گھبرا کے اُٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکی۔

نماز کے لیے چھپاکے اُٹھنے سے پہلے میں اندر چلا آیا۔

صبح بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا۔ چھپاکے آئی تو میں نے منع کر دیا کہ میرا ہی ناشتے کو نہیں کر رہا ہے۔ پھر کافی اصرار کر کے مجھے ناشتے کی میز پر لے آیا۔ میری نظریں جولین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے میں کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور بسوں پر گھومتا رہا۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک۔ ایک چوک سے دوسرا چوک۔ بار بار مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جولین میرے پہلو میں چل رہی ہو اور مجھے پیچھے سے آوازیں دے رہی ہو۔ راستے میں کئی بار میں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا کہ نہ جانے جولین کی طبیعت کیسی ہو لیکن میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

جولین کو کیا اندازہ تھا کہ کوئی اُس سے بھی زیادہ تنہا ہو سکتا ہے۔ اُس کا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس سے تو سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ وطن جگہ جگہ اُس کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ مولوی محمد شفیق نے نہ جانے کب تک ساتھ دیا ہوگا۔ کوئی جولین سے اس طرح نہیں بچھڑ گیا تھا جس طرح اُس سے بچھڑا کسی نے اُس کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ اُس پر وقت کی گرد پڑ جائے۔ وہ تو میرے دل میں روز بہ روز روشن ہو رہی تھی۔ جولین کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے سینے میں کیسی جلن ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اپنے جسم میں چاقو کھینچ دوں۔

فٹ پاتھوں پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی بارش بند ہوئی لوگ چیونٹیوں کی طرح سڑکوں پر اُبل پڑے ——— بھیڑ زیادہ ہوتی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا کہ کہیں نگاہ چوک نہ جائے۔ راہ گیر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے کیونکہ ابھی تک آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں وہاں تک جانا چاہتا تھا جہاں تک آدمی نظر آتے ہیں کسی دن انھی آدمیوں کے درمیان وہ مجھے مل جائے گی۔ میں نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا۔ دھوپ نکلی تو مجھے یاد آیا کہ پیرو نے آج دوپہر مجھے آنے کی ہدایت کی تھی۔ جب میں پاڑے پہنچا تو مجھے کچھ سکون تھا کہ میں نے صبح سے اب تک کا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ پیرو میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے اور جُھل نے اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ "لاڈلے جانی! اتنی دیر کر دی؟" وہ مجھے دیکھتے ہی چلایا۔ "اب چل، جلدی چل۔"

"کہاں چلنا ہے؟" میں نے اُداسی سے پوچھا۔

"بیت پوچھ! اپن نے جُھل بھائی کو بھی نہیں بولا ہے۔"

"چلو۔" میں نے اُسی سے کہا۔ وہ دونوں تیار ہی بیٹھے تھے۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور آدمی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ علاقے میں کچھ دُور پیدل چل کے پیرو نے ایک ٹیکسی روک لی۔ چند منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک بڑے جنرل اسٹور کے سامنے رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے باہر ہی کھڑے کھڑے اُس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اشارہ کیا۔ اُس کے اشارے کی دیر تھی۔ ایک آدمی لپکتا ہوا اسٹور سے باہر آیا اور اُس نے پیرو کے ہاتھ میں چار بیوں کا گچھا تھما دیا۔ اسٹور کے برابر ہی گیراج

تھا۔ پیرو نے وہاں سے ایک موٹر بائیک لی۔ وہ خود اسے چلا رہا تھا۔ آگے کی نشست پر جُھل اور پچھلی پر میں بیٹھ گیا۔ موٹر کی رفتار تیز تھی۔ پیرو ایک بار آہستہ عبور کرتا ہوا ایسے علاقے میں داخل ہو گیا جہاں اونچے اونچے مکانات تھے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اب میری کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ پیرو ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد موٹر ایک سبز پوش آہنی پھاٹک کے پاس رُک گئی۔ ہارن کی آواز پر کسی نائجیریا کے نیگرو دربان نے پھاٹک کھولا اور موٹر اندر داخل ہو گئی۔ چوکی دار نے پیرو کو جُھک کے سلام کیا۔ وہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ عمارت کے سامنے میدان میں سبزہ بچھا ہوا تھا۔ پیرو نے پورچ میں موٹر کا انجن بند کر دیا۔ جُھل نے تجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ جُھل بھائی!" وہ جُھل کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بے تابی سے بولا۔ "اندر آؤ۔"

"یہ تم کہاں لے آئے پیرو دادا؟" جُھل نے مسکرا کے پوچھا۔

"جُھل بھائی! اپن کسی کو آج تک یہاں نہیں لایا۔ پاڑے کے صرف ایک آدمی کو میں کو پتہ ہے کہ اپن ہفتے میں ایک بار کہاں جاتا ہے۔ تاجی وہ تاجی رہا تھا کہ اندر سے ایک خوش لباس جوان عورت برآمد ہوئی۔ اُسے ادھیڑ کہنا غلط ہوگا۔ اُس کا تو جولین کی طرح لانبا، رنگ سُرخ و سفید، جسم متوازن اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کے وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ "جُھل بھائی! یہ چاؤ کون ہے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

جُھل چند لمحے سوچتا رہا پھر پُرسکون آواز میں بولا۔ "جابی۔"

"واہ جُھل بھائی!" وہ اچھل پڑا۔ "یہ تم نے کیسے جانا؟"

"تم دونوں کی آنکھوں سے۔"

عورت نے دونوں ہاتھ جوڑ کے پہلے جُھل کو نمسکار کیا پھر مجھے۔ پھر وہ پُرمسرت چلّاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کا جُھل بھائی اور لاڈلا لایا۔" پیرو نے ایک ہی سانس میں ہمارے متعلق نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ رانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے ہمیں اندر چلنے کے لیے کہا اور ایک سجے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور ارد گرد آرام دہ کرسیاں اور صوفے رکھے ہوئے تھے۔ رانی تابستگی سے جا کے سامنے بیٹھ گئی۔ اُس کے کانوں میں چھوٹے بُندے چمک رہے تھے اور ہاتھ پر بندے دار کنگن بھی تھے گلے میں موتیوں کی مالا پڑی تھی۔ جوڑا بندھا ہوا تھا اور چہرے پر غمگینی چھائی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے پیرو دادا؟" جُھل نے مضطرب ہو کے سرگوشی کی۔

"بس جُھل بھائی!" پیرو کھل کھلانے لگا۔ "اپن نے تم کو نہیں بولا تھا۔ یہ ہی اپن کا پاڑا ہے۔ ابھی جُھل بھائی! اپن نے سوچا تم سے کوئی پردہ رہ گیا تو اپن کو بعد میں بہت خواری ہوگا۔ سالا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اپن جنم کو بہت پہلے ایدر لے آتا اور یہیں بیٹھ رنے کو بولتا۔ پر وہ سالا چھیڑا پھاڑی جو اور چلا کہ ہاتھا یا پن کا رانی ہے جُھل بھائی!" وہ ہکی ہوئی آواز میں بولا۔ "بھی جُھل بھائی کی خاطری کرو رانی! اپن کو آنے میں دیر ہو گئی، بڑی بھی گھر میں ہے لے آؤ اور وہ۔۔۔۔ وہ پیرو کا بچپنی لادانی گیتا کیدرے؟ اُسے بولو چاچا جُھل آیا ہے۔ جلدی جاؤ۔ بولو تو دیکھ کون آیا ہے۔"

پیرو کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رانی اُٹھ کے اندر چلی گئی۔ پیرو بہت خوش تھا۔ اُس نے وہی داستان جُھل کو سنانی شروع کر دی جو چند دن پہلے سرسری انداز میں مجھ سے بیان کر چکا تھا۔ جُھل استیاق اور تعجب سے سُنتا رہا۔ "اپن اس کو بالکل دھوکر کی چیز جُھل بھائی! رانی کو تب ہے کہ اپن کہاں رہتا ہے پر چھوکری کچھ نہیں جانتا۔ رانی بہت اچھا رہتا ہے جُھل بھائی! ایک دم سونبر ہے۔ وہ اُس کو سمجھاتا ہے۔ کبھی اپن کا بہت جی کرتا ہے کہ بس ایدر ہی رہے، اُودر واپس نہ جائے۔ پر اپن کیا کرے، تم جانتا ہے جُھل بھائی! اپنا تو مالا ایک ہاتھ کو چھیٹ جاتا ہے تو پچھا نہیں چھوڑتا۔" پیرو اداسی سے بولا۔ وہ بتانے لگا کہ اُسے بہ گھر لوگوں کی نظروں سے دُور رکھنے میں کتنی مشکل پیش آئی ہے اور اُس کی بیوی نے کس موقع پر اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُس نے کبھی اپنے ماں باپ کا نام نہیں لیا۔ اُسی وقت دروازے سے چوڑیاں بجیں۔ پیرو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اُس نے درمیان سی میں آنے والی لڑکی کو جھپٹ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اُس کی پیشانی سر اور ہاتھ چومنے لگا۔ "ہماری بچی! وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیسا ہو تم؟"

جب پیرو اُس سے ہٹا اور اُس کا ہاتھ تھامے ہمارے پاس لایا تو میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ پیرو نے اُس کے بارے میں جو کچھ مجھ سے کہا تھا، وہ بہت کم تھا۔ اُس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اُس کے گالوں سے خون چھلک رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے رنگ روپ پر گئی تھی۔ وہی قد، وہی نقشہ، وہی سیاہ بال اور بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ "چاچا کر پ نام برا۔" پیرو نے اُسے گود میں لے لیا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کے جُھل کے پیر چھوئے۔ جُھل نے کھڑے ہو کے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ جُھل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ "بیٹی رہو۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "پیرو! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" میں خالی ہاتھ گھر آ گیا۔" جُھل نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے ناراضی سے کہا اور جتنے نوٹ اُس کی جیب میں تھے۔ اُس نے نکال کے لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیے۔ لڑکی کو تامل ہوا مگر پیرو نے اُسے ڈپٹ دیا۔ اُس نے دوبارہ جُھل کو پرنام کیا اور یہ لاڈلا لاڈلا جا!" پیرو نے اُسے میری طرف متوجہ کیا۔ "لاڈلا! یہ اپن کی گیتا ہے۔" اُس کے لہجے میں لرزش تھی۔ "یہ اپن کا ہماراپی ہے۔ اپن اس کا غلام ہے۔"

"پتاجی! گیتا ناگواری سے بولی۔ "پھر آپ نے!"

"اوہ۔" پیرو ہنس کے بولا۔ "اپن بھول گیا۔ یہ گیتا اپن کا بیٹی ہے لاڈلا! اپن اس کا باپ ہے غلام نہیں۔ اپن کا بہت پیارا بیٹی ہے۔"

پیرو نے اُسے اپنے اور تجمل کے درمیان بٹھا لیا۔ "تجمل بھائی! ابھی تھوڑا بھتیجی نے گیارہ نمبر درجہ پاس کیا ہے۔ فٹ فٹ والا ہی ہوتا ہے اپن کا جان ہے۔" وہ گیتا کو اپنے بازو میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

گیتا کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ وہ ڈھیلی موری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے تھی۔ چُنا ہوا دوپٹا گلے میں پڑا تھا۔ وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔

"چاچا تجمل کہاں سے آئے ہیں؟" اُس نے جھجکتے ہوئے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"چاچا کلکتے سے آیا ہے بیٹا!" پیرو نے ایسے لہجے میں اُسے جواب دیا جیسے گیتا چھوٹی سی بچی ہو۔ وہ کن انکھیوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

"تو یہ یہاں کیوں نہیں ٹھیرے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"کیا بولے بیٹا! چاچا کو جانے کا جلدی ہے۔ اپن نے بہت منع مارا۔ اب تم بول کے دیکھو۔ چاچا اپنی بھتیجی کی بات نہیں ٹالیں گا۔"

"پھر آئیں گے بیٹا!" تجمل نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چاچا کلکتے میں کیا کرتے ہیں؟"

"چاچا!" پیرو نکلانے لگا۔ "چاچا کا اُودر بڑا کاروبار ہے۔"

"کیا کاروبار ہے!" وہ تجسس سے بولی۔

پیرو نے تذبذب سے تجمل کو دیکھا۔ "ابھی تم چاچا سے ملنے کلکتے جانیں گا نا۔ تو پوچھنا۔" پیرو الجھ الجھ کے بولا۔ "یہ بہت سوال کرتا ہے تجمل بھائی!"

"ہاں تم اُدھر آنا تو خود دیکھ لینا۔" تجمل نے سائس بھر کے کہا۔

"تم اُودر جا کے ماں سے بولو کہ جلدی کھانا دیو۔ ایک دم جلدی آنجا۔" وہ گیتا کے کان مروڑتے ہوئے بولا اور ابھی وہ اٹھی بھی نہیں تھی کہ اُس سے پوچھنے لگا۔ "واپس آگیا؟"

"آگئی۔" وہ پیرو کے سامنے سیدھی کھڑی ہو گئی اور چھن چھن سننے لگی۔

"دیکھا تم نے تجمل بھائی! کتنا شریر ہے یہ۔" پیرو نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کے اُس کے ہیجے کی طرف کیے اور ہنس کر کے اُسے ڈرانے لگا۔ وہ اٹھلتی بھاگتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ پیرو تجمل سے اُسی کی باتیں کرنے لگا کہ وہ کتنی ذہین شوخ اور کتنی معاملہ فہم لڑکی ہے۔ تجمل اپنا ہمدرد سر ہلاتا رہا۔

چند ہی لمحوں میں وہ واپس آگئی۔ "رانی جی کہتی ہیں ابھی دیر ہے صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" وہ سامنے کرسی پہ ہم کے بیٹھ گئی۔

"دیکھا دیکھا تجمل بھائی! کیا کیا بات اس کو پتہ ہے۔" پیرو چہکتے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا چھوٹا عمر میں یہ ایسا بڑی بڑی باتیں بولتا ہے۔"

ایک بوڑھی ملازمہ نے میز پہ پھلوں کا شربت اور مٹھائیاں لا کے رکھ دیں۔ گیتا نے گلاس بھرے۔ تجمل کو گلاس دینے کے بعد وہ میرے پاس آئی۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو اُس نے نظریں نیچی کر لیں۔ کرا جب مجھ سے جُدا ہوئی تھی، اُس سے خاصی چھوٹی تھی لیکن وہ مجھے بہت بڑی معلوم ہوتی تھی اور جب میں اُسے گھر سے لے کے آیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اچانک میری عمر بڑھ گئی ہے۔ پیرو کو گلاس دینے کے بعد وہ اپنی جگہ جا کے بیٹھ گئی مگر اب وہ بار بار میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس نے میرے بارے میں پیرو سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور نہ پیرو نے میرے نام کے سوا اُسے کچھ بتایا تھا۔ اُس کے پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور وہ اپنے دوپٹے کی چنٹیں کھول رہی تھی۔ پھر پیرو کو خود ہی خیال آگیا یا شاید اُس نے محسوس کر لیا کہ گیتا میرے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہے۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم دونوں چپ بیٹھے تھے۔ "گیتے! تم جاسے نہیں ملا۔ یہ راجا ہے۔ راجا تجمل بھائی کا۔ ..." وہ جھجکا۔ پھر بولا۔ "تجمل بھائی کا بیٹا ہے۔" راجا اپن کا تجمل بھائی کے مالک ایک دم فس کلاس ہے۔ تم اس سے بات بولو۔ ائے تم دونوں چپ کیوں بیٹھا ہے؟ وہم دونوں کو ڈانٹنے لگا۔ "بولو۔ بولو راجا! یہ تمہارا گھر ہے۔ ابھی تم گھومو پھرو گیتے! راجا کو باغ کا سیر کراؤ۔ راجا! گیتا پھولوں کا ماشق ہے۔ سالا پچھواڑے ایک سے ایک پھول مار رکھا ہے۔ کالا پیلا نیلا۔"

"آپ پڑھتے ہیں؟" گیتا نے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پڑھ چکے ہیں؟" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں تک؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تھوڑا بہت۔"

گیتا میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن بات اُس کے ہونٹوں پہ آتے آتے رہ گئی۔ پیرو نے اُسے دوبارہ ٹوکا۔ وہ کھسیاتی ہوئی اُٹھی اور اضطراری نظروں سے میری جانب دیکھ کے بولی۔ "آیے۔" اُس کا لہجہ شرمیلا تھا۔

مجھے اُس کا ساتھ عجیب سا معلوم ہوا۔ میں منع کر دینا چاہتا تھا مگر گیتا کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کوٹھی کے پچھلے حصے میں لے آئی۔ یہ چمن تھا۔ پیرو اسے باغ کہہ رہا تھا۔ یہاں ہر طرف ہریالی تھی اور قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمن کے ایک کونے میں چھوٹا سا "مالاب تھا۔ اُس میں سفید بطخیں تیر رہی تھیں۔ گو چمن کا رقبہ زیادہ نہیں تھا مگر پودے بہت سلیقے سے لگائے گئے تھے۔ سایہ منظر بہت پیارا تھا۔ فرصت ہوتو آدمی کرسی ڈال کے بیٹھ جائے اور سوچتا رہے۔ گیتا کی پھولوں سے دلچسپی کے بارے میں پیرو نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے اس کی تعریف میں کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ میں چپ

چاپ اُس کے ساتھ گھومتا رہا۔ "آیئے یہاں بیٹھ جایئے۔" اُس نے پتھر کی ایک بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔ "آپ کلکتے میں رہتے ہیں؟" اچانک اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے بے سوچے سمجھے جواب دیا۔

"پھر... پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں بس ایسے ہی شہروں شہروں گھومتا رہتا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ تذبذب سے بولی۔ "آپ کا کام ہی ایسا ہو گا؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔"

"آپ کو پھولوں سے شوق نہیں ہے؟" کچھ توقف کے بعد اُس نے پوچھا۔

"ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"مجھے تو بہت ہی شوق ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "آپ کو چمن پسند آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"آپ ایک مہینے پہلے آتے تو دیکھتے، پتے نظر نہیں آتے تھے؟"

"جی۔" میں نے ہنکاری بھری۔

"اُس کی آنکھیں سکوڑیں۔ آپ... آپ کی طبیعت کیا خراب ہے؟"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ ہمیشہ اتنا ہی بولتے ہیں؟"

"جی۔!" میں نے گھبرا کے کہا۔ "کیا میں نے آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا؟"

"دیا تو مگر... مگر آپ نے اپنی طرف سے کوئی بھی بات نہیں کی۔" وہ تیزی سے بولی۔ "کیا آپ بتا ہی اور تجمل چاچا سے بھی بس اتنی ہی باتیں کرتے ہیں؟"

"مجھے زیادہ بولنا نہیں آتا۔" میں نے لیں ہی کر دیا۔

"پھر آپ کو کیا آتا ہے؟" وہ چمک کے بولی۔

"زیادہ سننا۔"

"میں بھی یہی کوشش کرتی ہوں مگر میری زبان نہیں رکتی۔ امی جی مس ڈرگا کہتی ہیں کہ کم بولنا، کم کھانا دونوں تن درستی کے لیے ضروری ہیں۔" آپ کی مس سچ کہتی ہیں لیکن وہ ایک بات کہنا شاید بھول گئیں۔ کم سوچا بھی تن درستی کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

"اچھا!" وہ تعجب سے بولی۔ "میں اُن سے پوچھوں گی کہ ہمیں یہ کیوں نہیں بتایا۔ کیا آپ سوچتے بھی کم ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پھر بھی آپ کی... آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔"

"اور آپ کی بھی بہت اچھی ہے۔"

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ چمک پڑی۔ "مجھے اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی۔ یہی کہ آپ کے بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میری آواز گلے میں پھنس گئی۔

"اب تو سے کیا مطلب؟ یعنی ...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں اب کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تو آپ چاچا کے اکیلے بیٹے ہیں؟"

"ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور کوئی بھی نہیں ہے؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں ہے۔"

"آپ کی ماتا جی!"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

اُس کی پلکیں پھڑکنے لگیں۔ "پھر تو آپ بہت تنہائی محسوس کرتے ہوں گے؟"

"ہاں۔" میں نے تندی سے کہا۔ "چلیے اندر چلیں۔"

"چلیے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ ہم اُٹھے ہی تھے کہ ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ کھانے کا کمرہ دوسرا تھا۔ ایک بڑی میز کے اطراف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں مگر تجمل اور پیرو تخت پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ملازم موجود تھے اور اندر سے سامان لا کے تخت پر رکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پیرو چلانے لگا۔ اُس نے اپنے ایک طرف گیتا کو اور دوسری طرف مجھے بٹھا لیا اور مجھ سے چمن کا حال لیے چلنے لگا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے پیرو چمن کے بارے میں ہم اور گیتا کے بارے میں زیادہ پوچھ رہا ہے اور مجھے جتا رہا ہے کہ اُس نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی تھی۔ گیتا بھی چمن کی طرح خوب صورت تھی میرے دل میں آیا، اُن باتوں کو جو میں اور گیتا دونوں مجھے اچھے لگے۔ تاہم میں نے لفظ سنبھل سنبھل کے ادا کیے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب لوگوں سے کم بات کیا کروں گا اور دوسرے کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ میرے اخفا کے باوجود پیرو بہت کوشش ہوا۔

گیتا کی ماں رانی کے آنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ تکلم زیادہ نہیں تھیں لیکن کھانا لذیذ بے حد تھا۔ تجمل کی بات یہ تھی کہ سب کچھ اتنے کم وقت میں تیار ہو گیا تھا۔ "یہ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے ہیں۔" گیتا کی ماں نے پیرو سے میری شکایت کی۔

"ہاں راجا مہمان بنا ہے تجمل بھائی!" پیرو میرے کولھے پر زور سے کہنی مارتے ہوئے بولا۔ "کھا راجا! خوب کھا۔" رانی نے بھنچے ہوئے رغ کا ڈونگا میرے آگے کر دیا۔ پیرو نے میری پلیٹ میں مسلم رغ لوٹ دیا اور

گیتا نے پٹخنی بھیر دی۔ کھانے کے دوران میں پیرو ہی زیادہ باتیں کرتا رہا۔ گیتا نے ایک بار پھر مخمل سے کہا کہ وہ چند دن کے لیے یہاں ٹھہر جائے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں مخمل آمادہ نہ ہو جائے لیکن اُس نے گیتا سے معذرت کر لی۔ رانی اپنی سہمی ہوئی سی آواز میں بار بار مجھے ٹوکتی تھی۔ جب بھی میں نے نظر اُٹھایا، اُسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ بھی پیرو کے مانند بہت نحوست تھی جیسے ہم اُس کے دشمنے دار ہوں اور بہت دن بعد اُس کے ہاں آئے ہوں۔ جو تھوڑی بہت اہمیت باقی تھی، وہ کھانے کے دوران میں ختم ہو گئی۔ چلتے وقت رانی نے مجھے ایک سو ایک روپے دیے۔ ہم پانچ بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ دونوں دروازے تک ہمیں پہنچانے آئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ جانے سے پہلے ہم ایک بار اور اُن کے گھر آئیں۔ گیتا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں کسی دن شام کو آ جاؤں تو وہ مجھے اپنی موٹر میں بمبئی کی سیر کرائے گی۔ میں نے ڈھل مل یقین وعدہ کر لیا۔ پیرو نے جنرل اسٹور کے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور اُسی طرح پاڑے واپس آ گیا جس طرح گیا تھا۔ وہاں پہنچ کے پتہ چلا کہ پولیس افسران کی ایک جماعت پیرو سے بات کرنے کے لیے آئی تھی، اُس کے آدمیوں نے کہہ دیا کہ پیرو شام کو مل سکتا ہے۔ پولیس کے ذکر سے میرے کان کھڑے ہوئے۔ ملاقاتیں میں بھی ابھی تک پولیس کا زور کم نہیں ہوا تھا۔ پیرو ایک دن گزار کے واپس آ چکا تھا لیکن اُس کی واپسی اُس کے بری الذمہ ہونے کی دلیل نہیں تھی۔ پولیس کا پھر اس طرف آنا بے مقصد نہیں ہو گا۔ انھوں نے متعدد مرتبہ پاڑے کی تلاشی لی تھی اور مختلف لوگوں کو گرفتار کیا تھا لیکن نہ پاڑے سے انھیں کچھ حاصل ہوا، نہ گرفتار ہونے والوں نے کچھ بتایا۔ شاید تواڑی کے کسی خاص آدمی نے اُنھیں پھر پیرو کو ٹٹولنے پر اُکسایا ہو گا یا کوئی اور بات ہو گی۔ اُدھر مخمل اور جامو واپسی کے ارادے باندھ رہے تھے۔

وہ واپسی کا ارادہ اُسی وقت کر سکتے تھے جب پیرو کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہوں۔ جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پولیس یوں چپ نہیں بیٹھ جائے گی۔ اُوپر سے دباؤ پڑ رہا ہو گا۔ اطلاع سن کے پیرو کے چہرے پر ہی چھا گئی لیکن وہ محض کچھ دیر قائم رہی۔ پھر پیرو پاڑے کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہر طرف سے آدمی آ رہے تھے۔ پاڑے میں اچھا خاصا مجمع تھا۔ رات کو پاڑے کے آدمیوں نے بادرچی بلا کے پاڑے ہی میں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد ناچ گانے کے لیے ایک طوائف بھی بلائی گئی تھی اور نقلیں اُتارنے والا ایک مسخرا بھی۔ اُس نے نقلیں اُتارنی شروع ہی کی تھیں کہ پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ مخمل نے مجھے اشارہ کیا۔ پولیس ابھی پاڑے سے دُور تھی۔ میں وہاں سے پہلے ہی نکل آیا اور پیدل چل دیا۔ سڑکوں پر آمد و رفت زیادہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک جگہ اندھیرے میں ایک سپاہی نے میرا راستہ روک لیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کے تلخی سے پوچھا۔

"گھر۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ گھر کدھر ہے؟ میں نے اُسے پتہ بتا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیب میں چاقو موجود تھا۔ میں نے اُس کا پنجہ پکڑ لیا۔ "جیب سے ہاتھ نکال۔" میں نے غصّے سے کہا۔

"چاقو۔" وہ طنز سے بولا۔ "اور نوٹ بھی؟ کدھر سے آ رہا ہے؟"

وہ اپنا پنجہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے حقارت سے بولا۔

"میں نے چوری نہیں کی ہے۔ یہ روپے میرے ہیں۔" میں نے تُرشی سے کہا۔

"تیرے ہیں، تیرے باپ کے ہیں۔ تھانے چل۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "چل۔" مجھے دھکا دینے لگا۔ ایک فحش گالی دے کر میں بھی اسی طرح ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا تھا اور ایک بیوہ عورت اور بیگم نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ سپاہی سمجھ گیا کہ میرا ارادہ آسانی سے اُس کے ساتھ جانے کا نہیں ہے۔ اُس نے فوراً سیٹی بجا دی۔ اُس کے جواب میں دُور سے سیٹیاں گونجیں اور گرد و پیش میں سیٹیاں ہی سیٹیاں بجنے لگیں۔ ساتھ ہی گالیاں بھی بکنے لگے۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے سپاہی سے نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ سے سیٹی چھین لی۔ "تم شور کیوں مچا رہے ہو؟"

"سیٹی واپس کر۔" وہ چیختے ہوئے بولا اور میرے ہاتھ سے سیٹی چھیننے کے لیے اُچھلنے کودنے لگا۔ "اکیلے میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"میں نے تمھارا بگاڑا کیا ہے بھائی! میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا ہے؟ مجھے جانے دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ابھی تم نے ایک پولیس مین کی ڈیوٹی میں دخل دیا۔ اُس سے سیٹی چھینا اور اُس کے ساتھ اکڑ کے بات کیا۔ زیرِ دفعہ ۳۳۲ دستِ اندازی پولیس میں چھ مہینے کا ٹے گا تو پتہ چل جائے گا کہ تو نے کیا جرم کیا ہے۔"

سیٹیاں قریب ہو رہی تھیں۔ یہ سیٹیاں سُن کے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ایسی ہی سیٹیاں اُس وقت بھی تھیں جب کرا کو بدمعاش لیے جا رہے تھے۔ ان سیٹیوں سے میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ دوسرے سپاہی اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں چند لمحے سوچتا رہا۔ مجھے دوسرے کے آنے سے پہلے بھاگ جانا چاہیے تھا ورنہ وہ جلد ہی مجھ تک پہنچ جاتے اور مجھے دھکے دیتے ہوئے تھانے لے جاتے۔ تھانے جانے میں کوئی بات نہیں تھی۔ میں انھیں بتا سکتا تھا کہ میرا نام راجا ہے۔ تھوڑی سی تصدیق کر کے وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ یہ بات میں سپاہی کو بھی بتا سکتا تھا مگر ان حالات میں سپاہی کو یا تھانے جا کے اپنا نام پتہ بتانے سے اور اُلجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں اور اگر میں اپنا نام صحیح نہ بتاتا تو وہ چاقو کی موجودگی سے شک میں پڑ جاتے اور صبح ہونے سے پہلے مجھے ہرگز نہ چھوڑتے۔ جیب میں جتنی بھی رقم تھی، وہ میں نے سپاہی کو دینے کا خیال کیا لیکن اگر سپاہی رقم لینے سے انکار کر دیتا تو بات اور بگڑ سکتی تھی۔ دوسرے سپاہی کسی لمحے بھی یہاں پہنچنے والے تھے۔ میں نے اپنے سامنے دائیں بائیں دیکھا۔ سیٹیاں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی سیٹی زمین پر دُور پھینک دی۔ سپاہی بوکھلا کے اُسے حاصل کرنے کے لیے دوڑا۔ اُس نے میری جیب چھوڑ دی۔ میرے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ جھکا، میں نے جھپٹ کے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ بند کیا اور کسی تاخیر کے بغیر دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن پر ضرب لگائی۔

سپاہی کی ایک ہلکی کراہ بلند ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں اُسے دکان کے تختے پر ڈال کے آہنگی سے رینگتا ہوا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں تعفن پھیلا ہوا تھا۔ تنا بیاں لگ کوڑا کرکٹ ڈالتے تھے۔ بارش کا پانی گڑھوں میں جمع تھا۔ میرے پاؤں کوڑے کچرے میں دھنستے رہے لیکن میں مین روڈ پر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور سے پاؤں تک میرا جائزہ لے کے مجھے بٹھانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اُسے دگنے بیسوں کی پیش کش کی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے کیونکہ جس جگہ سے "کسی چلی تھی" وہ میری دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ ڈرائیور کی نیت خراب ہو گئی۔ اُس نے ایک سنسان جگہ گاڑی روک لی۔ میں سمجھا گاڑی خراب ہو گئی ہے لیکن اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور وہ مجھ سے جیب کی ساری رقم نکالنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں اُسے سارے پیسے دے دوں گا بشرطیکہ وہ مجھے میری منزل پر پہنچا دے۔ اُس نے چاقو میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے اُس سے دوبارہ کہا کہ وہ میری بات کا یقین کر لے۔ اُسے کچھ خیال آ گیا مگر اُس نے یہ شرط رکھی کہ میں پہلے سارے پیسے اُس کے حوالے کر دوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے تمام روپے اُسے تھما دیے۔ دوسرے ہاتھ میں آ جانے کے بعد وہ مجھے ٹیکسی سے فوراً اُترنے کا حکم دینے لگا۔ مجھے غصّہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ "چلو، اُترو اور بھاگ جاؤ۔" اُس نے چاقو میری گردن کے گرد لہراتے ہوئے سختی سے کہا۔ میں نے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر سکون سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک مہم اچھلا۔ اُسے میری جانب سے اس برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ ہلکنے کے وقفے میں۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اُس نے زور کیا۔ میں اُس کا ہاتھ اُس کے سینے تک لے گیا۔ میرے انگوٹھے کے ناخن سے اُس کی نس دبی ہوئی تھی جس سے اُس کے ہاتھ کی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ وہ چاقو سنبھالنا نہیں جانتا تھا۔ اُس نے گھبرا کے چاقو چھوڑ دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو اُٹھا کے اُسے بند کر دیا۔

"چلو۔" اپنی نشست سے کھسکاتے ہوئے میں نے کہا۔

"دادا! اپن کو معاف کرو۔" وہ التجا کرنے لگا۔

"سیدھی طرح چلو۔" میں نے اُسے چاقو واپس کر دیا۔

ڈرائیور نے راستے میں کئی دفعہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنا منہ بند کر لیا۔

گھر سے خاصے فاصلے پر میں ٹیکسی سے اُتر گیا۔ ڈرائیور نے باہر اُگے میری پنڈلیاں چھوئیں اور تمام روپے واپس کر دیے۔ میں نے اُسے مقررہ کرایہ دینا چاہا۔ اُس نے وہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ "نہیں دادا! اپن کے لیے ایک ڈبل حرام ہے۔"

میں نے اُس سے زیادہ ضد نہیں کی۔ گلیوں میں چوکی داروں کی آوازیں اور لاٹھیوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ابھی گھر دُور تھا اور پھر کوئی بھی درمیان میں آ سکتا تھا۔ کیا پتہ کون کس وقت کس ارادے سے سامنے آ جائے۔ میں چاروں طرف دیکھ دیکھ کے محتاط انداز میں قدم بڑھاتا ہوا گھر کے قریب ہوتا رہا۔ یہ احتیاط بے کار تھی، جب تک دوسرے بھی احتیاط نہ برتیں۔ دوسرے جو اندر ڈال دیتے ہیں۔ اپنے طور پر طے کی ہوئی ہر بات ادھوری ہے جب تک دوسرا اُس کا ساتھ نہ دے۔ بسنے کے لیے کوئی اور دنیا تو ہے نہیں۔ اگر میں خاموش رہتا تو گھر پہنچنے کے بجائے اُس وقت کہیں اور ہوتا۔ اپنے گھر واپس آنے طالے اُلجھاؤ کو نہ جانے کتنی شکلوں سے گزرنا پڑتا ہو گا، راستے میں طرح طرح کے لوگ ملتے ہوں گے، اُن لوگوں سے بچ کے گھر پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر شخص اپنے پاس چاقو تو نہیں رکھ سکتا۔ میرا ہی تساہل رہا تھا۔ ہر آدمی کو اُس سے خطرہ ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ میں اُس کے پاس پہنچ سکوں۔ جلیس نے دروازہ کھولا۔ میں بے حد ہانپ رہا تھا۔ میں چلا آیا اور فرش پر چادر بچھا کے لیٹ گیا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں بجتی رہیں اور آنکھوں سے پانی بہتا رہا۔

دوسرے دن پولیس نے شہر کے مختلف پاڑوں پر اچانک چھاپے مارے۔ تلاشی لی اور بہت سے آدمی پکڑ لیے۔ انھوں نے پاڑوں کے کئی داداؤں کو بھی گرفتار کر لیا۔ پیرو کے پاڑے سے انھیں کچھ دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ دوسری جگہوں سے انھیں منشیات، سرقہ مال اور ہتھیاروں کا انبار ملا۔ ہر جگہ سے کئی ہوا دیوں کو یک وقت پکڑا گیا تھا۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے بھی تھے جنھیں پہلے گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھنگا اور بالم خاں کے پاڑے بھی خالی گئے۔ اس مرتبہ پولیس نے نام بنام بہت سے لوگوں کو طلب کیا تھا۔ زیادہ تر زخمی واپس آ چکے تھے۔ مادی بھی دو ایک دن میں آنے والا تھا۔ فہرست میں اُس کا نام نہیں تھا لیکن وہ ایسے نام فہرست میں شامل تھے جو ابھی تک خفیہ جگہوں پر اپنے زخم سنکھا رہے تھے، اُن کی واپسی میں ابھی دیر تھی۔ پیرو نے اُن کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی

وہ گزشتہ دو روز سے غائب ہیں، شاید اپنے گاؤں چلے گئے ہوں، آئیں گے تو انہیں تھانے بھیج دیا جائے گا۔ ستائے آدمیوں میں سے دو کا موقع پر نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کئی اور زخمی بھی تھے جن کا نام اُن کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہ فہرستی بھی نہیں تھا کہ ہر آدمی روزانہ پاڑے میں آ کے حاضری دے۔ ویسے مچھل نے ایسے لوگ منتخب کیے تھے جن کے گھر دور نہیں تھے اور جو پاڑوں میں مستقل طور پر یا ادھر اُدھر پڑے رہتے تھے۔ جن لوگوں کے گھر بار تھے، انھیں واردات کی رات تیواڑی کے اڈے کے آس پاس تعینات کیا گیا تھا تاکہ وہ کاری زخم گننے سے محفوظ رہ سکیں۔ پاڑے سے متعلق لوگوں کا زخمی ہونا عام بات تھی۔ پولیس انھیں پکڑ بھی لیتی تو یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ کہاں زخمی ہوئے ہیں اور انھیں کس نے زخمی کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ہی پاڑوں کے کسی آدمی کا نام لے سکتے تھے۔ جامو اور کانتے بھی اب باہر نکل سکتے تھے۔ اُن کی وارنٹی عرصہ اختیاطی تھی۔

اخبارات پولیس کی ناکامی پر بہت جز بز تھے۔ ان تازہ گرفتاریوں کے بعد خبروں میں پھر سے سرگرمی نظر آنے لگی۔ اب کے پیرو نے اپنے پاڑوں سے گرفتار ہونے والوں کی ضمانت کا انتظام کرنے میں مہلت نہیں کی۔ دو دن سخت پوچھ گچھ کر کے پولیس نے بیشتر آدمیوں کو خود چھوڑ دیا۔ اُن پر خاصا تشدد کیا گیا تھا مگر کسی نے اقرار نہیں کیا۔ پولیس کی یہ یقینی اور تذبذب کی کیفیت اس بات سے عیاں تھی کہ اُس نے پاڑوں پر چھاپے مارنے میں کوئی خصوصیت نہیں برتی تھی۔ تیواڑی کے ماتحت پاڑوں پر بھی اسی طرح اچانک چھاپے مارے گئے تھے۔ مانجھی نے مچھل بہت سی باتیں بتائیں لیکن تیواڑی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ اُسے مچھل اور پیرو نے کہاں چھپایا ہوا ہے، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے، ایسے حالات میں انھوں نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں رکھا ہوگا۔ ان کی لاشیں کہیں کسی پختہ فرش کے نیچے دبا دی گئی ہوں گی یا انھوں نے تیواڑی کو چھوڑ دیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیواڑی میں کچھ غیرت باقی تھی، وہ اپنی کٹی ہوئی ناک لے کے اپنے لوگوں یا پولیس کے پاس نہیں جا سکا۔ میں نے بہت کریدا کہ مگر کسی نے مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

اخبارات تیواڑی کی بازیابی پر مسلسل زور دے رہے تھے۔ مچھل نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں اب رات کو بھی پاڑے نہ آؤں مگر میں روز جاتا رہا۔ گھر میں ہر وقت جولین تھی۔ اُس کا چہرہ اب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھی۔ دن بھر میں بھی اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ اُس دن کے بعد سے نہ اُس نے مجھ سے کوئی بات کی تھی نہ میں نے اُس سے بات چیت بند بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے کھانے کے لیے بلا تی، میں چلا جاتا۔ وہ مجھے چائے دے جاتی، میں لے لیتا۔ جامو اور کانتے دن میں کئی بار ڈرائنگ روم میں جا کے بیٹھتے تھے۔ وہ مجھے بھی بلاتے تھے مگر میں کوئی نہ کوئی عذر کر کے انھیں ٹال دیتا تھا۔ جولین نے اُن کی خاطر داری میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ کانتے اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ مسکراتی تھی لیکن کانتے اُس کی مسکراہٹ دیکھ کے خود اُداس ہو جاتا تھا۔

گرفتاریوں کا چوتھا دن تھا۔ میں پاڑے پہنچا تو اُس دن سرگرمی کچھ زیادہ نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ پیرو نے آج شام پاڑوں کا انتظام اسی انداز میں کر دیا ہے جو کچھ دن پہلے ایک رات اُن سب کے درمیان طے پایا تھا۔ مچھنگا مالا پاڑا مستقل طور پر زوالے کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ مچھیلا کو پیرو نے اپنے پاس رکھنے کا اعلان کیا تھا اور بالم ناں کا پاڑا ماسٹر مارنی کر دیا گیا تھا۔ پیرو نے اپنے پاڑوں پر بھی مختلف آدمی بٹھا دیے تھے اور اگرچہ ابھی تیواڑی کے پاڑے اُس کے قبضے میں نہیں آئے تھے لیکن انھیں سنبھالنے والے آدمیوں کی نام زدگی کی جا چکی تھی۔

اُس رات مچھل میرے ساتھ گھر واپس آگیا۔ جولین اُسے دیکھ کے بوکھلا سی گئی۔ مچھل نے آتے ہی اُس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ اُس کا ڈبگ اڈا کیوں ہے؟ جولین کچھ جواب نہیں دے سکی۔ واردات کے بعد مچھل پہلی بار گھر آیا تھا۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے مچھل کو جانے کی جلدی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چائے کے بعد اُس نے بتایا کہ پرسوں اُس کی رونمائی ہے۔ میرے کانوں میں سن سناہٹ ہونے لگی۔ میں نے بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ مچھل کی نظریں جولین پر جمی ہوئی تھیں۔ جولین سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ چھپا اور جولین کی ماں ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ مچھل نے جولین کو آواز دی۔ وہ چونک پڑی۔ مچھل نے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے پرے ہٹ گئے۔ جولین ڈگمگاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور مچھل کے پاس جا کے چپ بیٹھ گئی۔ "جولی بیٹا! اہم جا رہے ہیں۔" مچھل نے مہنگی سے کہا۔ جولین کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی۔ "میں لاڈلے کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ لاڈلے کو آگے بہت سے کام ہیں۔ شاید تم کچھ جانتی بھی ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اکیلی ہو جاؤ گی لیکن اگر میں لاڈلے کو چھوڑ کے بھی چلا گیا تو یہ یہاں نہیں رہے گا۔ ہم تم کو اپنے ساتھ لے چلتے پر وہ جگہ ٹھیک نہیں ہے اور ہمارا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے کہ ہم آج کہاں ہوں گے کل کہاں۔ ہمت کر کے تم کو ادھر ہی رہنا ہے۔"

"نہیں استاد!" کانتے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "جولی بہن ہمارے ساتھ جائے گی۔ تمھاری ذمے داری پر نہیں، میری ذمے داری پر۔ میں اسے کھلتے لے جاؤں گا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا، وہ اس کے لیے کروں گا۔"

"چپ رہ۔" مچھل نے تلخی سے کہا۔ "اپنا آپ سنبھالا نہیں جاتا، جوان بہن کو سنبھالے گا۔ کتنے دن سنبھالے گا نقشین! پہلے یہ بیل بوٹے مٹا لے جو تو نے کھال پر جگہ جگہ لگائے ہیں۔ بہن کو رسوا کرے گا؟"

"استاد!" کانتے بگڑ کے بولا۔ "اس بچ تم چپ ہو تو بہتر ہے۔"

"منہ نہ کھلوا کانتے!" مچھل نے گرج کے کہا۔ "بہن کے سامنے گالی..."

"میں نہیں رہوں گی بابا!" جولین اکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں رہنے میں تیرا سکھ ہے تو جول بیٹا!" مچھل نے اپنا لہجہ نرم کرنے کی کوشش کی۔ "جو تیرے لیے بہتر ہے، وہی میں بول رہا ہوں۔"

"جولی بہن اگر جہاں سے ساتھ جانا چاہے تو ہمیں منع نہیں کرنا چاہیے مچھل بھائی!" جامو تُرشی سے بولا۔ "ہم اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ کیا ہم ایک عورت اور ایک لڑکی کا بار نہیں اٹھا سکتے؟"

"جامو!" مچھل نے ناگواری سے کہا۔ "تو بھی ایسی لونڈیوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ کیا جولی کوئی لاچار لڑکی ہے۔ اس نے موئی موئی گتا میں پڑھی ہیں سے! یہ کتابیں اسی لیے لکھی جاتی ہیں کہ آدمی اکیلا نہ ہے۔ کتابوں کی دھار چاقو کی دھار سے تیز ہوتی ہے۔ سالا ردی سے سنوں ٹنوں کاغذ کیا یوں ہی ردی کیا جاتا ہے۔ جولی اپنا اچھا بُرا تجھ سے بہتر جانتی ہے ملہو! ابھی جولی کی ماں موجود ہے، سب کے باپ زندہ ہیں ہوتے اور تو... تو اور کانتے کیا اپنی بات کچھ بول سکتے ہیں۔ بہنے دے جامو! بس کر۔ زریں بیٹا کا حال نہیں دیکھا۔ جولی تو نے دلاوی اور چیزیں بھی تو دلائے۔ جامو استاد! ان کی ان کہی بہنے دے۔"

"آپ لوگ کیوں ایک دوسرے سے نادامن ہو رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے، میں یہیں رہوں گی۔ میں اور میری ماں۔ اگر ظہیر نہ ملتا تو کیا ہم لوگ نہ رہتے۔" جولین نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم جولی کو زریں بہن کے پاس ٹھیرا سکتے ہیں۔ وہ بھی اکیلی ہے اور وہ بھی بہت اچھی ہے۔ جولی کو دیکھ کے خوش ہوگی۔" کانتے بولا۔

"ہاں ضرور خوش ہوگی۔ تم لوگ اگر جولی کے بجائے زہر لے جاؤ گے تو بھی وہ خوش ہوگی۔ پر کانتے! کیا ہم زریں بٹیا کو خوش کر سکے؟" مچھل کا لہجہ بوجھل تھا۔ "بس زیادہ مت بول۔"

"پر استاد! جولی بہن..."

"جولی یہیں رہے گی کانتے!" مچھل نے بلند آواز میں کہا۔ کانتے اپنے کان نوچنے لگا۔ "جولی یہیں رہے گی کانتے! اور عزت سے رہے گی۔ جولی! اگر تم کو کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو بولو۔ پر جو اپنے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ ہم تم کو نہیں دے سکتے۔ تم سمجھتی ہوگی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں جولی! جب بھی تم جامو کو کانتے کو یا مجھ کو کسی کام کے لیے بولو گی، ہم تیسرے دن ادھر آ جائیں گے۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں۔"

"بابا! آپ کا بہت شکریہ۔" جولین رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں جولی! یوں بول کے ہم کو چھوٹا مت کرو۔ ہم ویسے ہی بہت چھوٹے ہیں۔ تم اپنے بھروسے پر بھٹکتے آنا چاہتی ہو تو آ جاؤ، یا جہاں تم بولو پر جولی! جگہ بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی کوشش کرے تو جدھر چاہے وہ اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ دنیا میں آدمیوں کی کمتائی نہیں۔ نظر سنبھال کے ڈال جائے تو مرضی کے آدمی مل جاتے ہیں۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" جولین سراسیمگی سے بولی۔

"چولی میرا ہے استاد!" کانتے نے بھرے کے کہا۔

"پر تو جوہری نہیں ہے، تیرے ہاتھ ہیں، ہاتھیں مت بنا۔"

"میں اس کے لیے اپنے ہاتھ صاف کر لوں گا۔" کانتے غصے سے بولا۔

"ساری دنیا کا مال باہر خرچ ہو جائے گا کانتے! کر لے اگر تو یہ کر سکتا ہے تو کر لے۔ تو اس ہیرے کو ساری دنیا میں بند کر کے دکھنا۔"

"کانتے بھائی! آپ بابا کے ساتھ جائیں۔" جولین نے اپنی آنکھیں چھپا لیں۔ "میں یہاں بالکل خوش رہوں گی۔ بہت آرام سے رہوں گی۔"

کانتے نے کچھ اور کہنا چاہا مگر جامو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے تحمل کی تلقین کی۔ "چھپا بائی!" مچھل نے چھپا کو مخاطب کیا۔ اُس کی آواز بگڑی ہوئی تھی۔ چھپا سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں... میں کیا سوچوں۔" وہ ہکلاتی ہوئی بولی۔

"چھپا بائی!" مچھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تمھیں بھی کچھ سوچنا تو ہوگا۔ تم چاہو تو یہیں جولی کے پاس رہ سکتی ہو یا ہو تو ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔"

"میں تو ظہیر ہاں کی دھے یعنی آئی تھی اور اسی کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔" چھپا جھجکتی ہوئی بولی۔

"مگر تم میرے پاس کیسے رہو گی؟ میں تمھیں کہاں رکھوں گا؟"

میں نے وحشت سے کہا۔ "مجھے تو دُور... بہت دُور..."

مچھل نے میری بات کاٹ دی۔ "چھپا بائی! لاڈلے ابھی کسی ایک جگہ نہیں رہے گا۔ جب کبھی اس کا گھر ہو جائے، تم اس کے پاس چلی آنا۔ میں لاڈلے کو تمھاری طرف سے بولوں گا۔ ابھی تم اپنے آپ کے بارے میں فکر مت کرو۔ جیسا تم بولو گی، وہی ہو سکتا ہے۔ جولین بھی اپنی بٹیا ہے۔ تم اِدھر بھی رہ سکتی ہو اور چلنا چاہو تو چل بھی سکتی ہو۔"

چھپا بائی میری طرف دیکھنے لگی۔ جولین کی ماں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ابھی چھپا کو اِدھر چھوڑ جاؤ۔ ہم بالکل اکیلا ہو جائیں گا۔"

"اس کا فیصلہ خود چھپا بائی کرے گی۔" مچھل نے نرمی سے کہا۔

"کیوں چھپا بائی! ابھی تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گی؟" جولین کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں متی! چھپا دیدی کو مجبور مت کرو۔" جولین کی جھرّی ہوئی اور میلی آواز میں

"میں وہاں سے آنے کے بعد کئی جگہ جا سکتی تھی لیکن مجھے ظہیر کے پاس آنا تھا، اس کے پاس رہنا تھا۔ میری کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب بھی یہی ہے لیکن اب مجھے ظہیر کی طرف سے کچھ سکون ہے کیونکہ یہ تمھارے ساتھ جا رہا ہے مچھل بھائی! میں ابھی جولین کے ساتھ یہیں گی

لیکن مجھے رہنا تو ظہیر ہی کی چوکھٹ پر ہے۔ میں اس کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔" جولین کی ماں نے چمچا کو زور سے چٹخا لیا۔

کچھ دیر بعد مجھل کل آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے اُٹھ گیا۔ میں، جامواور کانتے اُسے ٹیکسی تک پہنچانے گئے۔ کانتے بہت چُپ چُپ تھا۔ واپس آ کے بھی وہ کسی سے بات کیے بغیر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں رات بھر جولین کے پاس جانے کے لیے سوچتا ہی رہا، پھر صبح ہو گئی۔

صبح اُٹھ کے سب سے پہلے میں نے کرشنا جی کی جامہ داور جینک سے متعلق تمام کاغذات نکالے۔ مدراس سے آنے کے بعد انھیں میں نے اب تک نہیں چھوا تھا۔ ایس پی شکلا کے گھر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ جولین اور چمپا غالباً ایک دو بار وہاں جا بھی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پتہ پوچھتے پوچھتے آخر میں اس کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا نام سُن کے شکلا بے تابی سے باہر آیا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے تجسس نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ مجھے فوراً اندر لے گیا اور میری اس غیر متوقع آمد کا مقصد پوچھنے لگا۔ شکلا جی انیس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنی ڈیوٹی پر واپس جائیں۔ میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لایا ہوں، انھیں دیکھ لیجیے میں نے ان میں سے ایک پیسہ استعمال نہیں کیا ہے۔"

"مگر تم یہ مجھے کیوں دکھانا چاہتے ہو؟" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ "یہ پیسہ تمھارا ہے۔ تم اسے جہاں چاہو خرچ کرو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن تم اسے اچھی جگہ خرچ کرو گے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"میں نے اسے خرچ ہی نہیں کیا ہے اور اب میں جا رہا ہوں، چلتے وقت مجھے آپ سے ملنا بھی تھا اور آپ سے ایک کام میں مدد بھی لینی تھی۔"

"کہو کہو، کیا کام ہے؟" میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنا سارا روپیہ جولین کے نام منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں جو ضروری قانونی کارروائیاں ہیں، اُن کی تکمیل میں وہ میری مدد کرے۔ چونکہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں ان باتوں سے ناواقف بھی ہوں۔ ظہیر خاں!" وہ حیرت زدہ آواز میں بولا۔ "کیا تمھارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"کیوں شکلا جی! کیا میں یہ پیسہ کسی کے نام نہیں کر سکتا؟"

"ضرور ضرور، تم اسے آگ بھی لگا سکتے ہو، کنویں میں بھی پھینک سکتے ہو۔ تم مالک ہو۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

"شکلا جی! مجھے احساس ہے کہ یہ رقم کرشنا جی کی ہے، میں اسے کہیں اور ضائع نہیں کر رہا ہوں، جولین کو دے رہا ہوں۔ کرشنا جی اسے بھی خود سے بہت قریب سمجھتے تھے۔"

"مجھے شک ہے کہ اس وقت تمھاری طبیعت ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ تم یہ سارا روپیہ جولین کے نام کر دینا چاہتے ہو۔ وہ لڑکی اسے سنبھال سکے گی؟" وہ نیا نی انداز میں بولا۔ "اگر تمھیں جولین کی کچھ مدد ہی کرنی ہے تو اُسے چند ہزار دے سکتے ہو، ایک لاکھ دے سکتے ہو، اس سے کچھ اور زیادہ دے سکتے ہو مگر یہ.... اوہ۔ کرشنا جی ہوتے تو! مگر کرشنا جی کیوں ہوتے؟"

"کیا وہ ناراض ہوتے؟"

"وہ اپنا سرپیٹ لیتے ظہیر خاں!"

"وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔ وہ اگر یہ سب کچھ اپنی زندگی میں میرے نام کر دیتے اور میں اسے جولین کو دے دیتا تو وہ زبان پر ایک حرف بھی نہ لاتے۔"

"تم جولین کو یہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں اُسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ اکیلی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

"روپیہ تو اُس کی پریشانی اور بڑھا دے گا ظہیر خاں! روپے سے اگر پریشانیاں دُور ہو جاتیں تو تم اس قدر پریشان نہ ہوتے۔"

"وہ اور بات ہے۔"

"وہ اور بات نہیں ہے ظہیر خاں! میرے دوست! ذرا غور کرو۔" شکلا میرا ہاتھ دباتے ہوئے تعلقاتی آواز میں بولا۔ "میں تمھیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا اور نہ اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد کروں گا۔"

"شکلا جی! میں آپ سے مشورہ لینے نہیں آیا ہوں۔ آپ مناسب نہیں سمجھتے تو یہ رقم آدھی کر دیجیے۔ جولین کو واقعی روپے کی ضرورت ہے۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے، وہ ولایت چلی جائے۔ وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اُس کی ترقی میں جو رکاوٹ ہے، وہ روپے سے بڑی حد تک دُور ہو سکتی ہے۔"

"تم نے جولین سے اس کا تذکرہ کیا تھا؟"

"ہاں، پہلے اُس نے منع کر دیا۔"

"منع کر دیا! تو جان لو کہ وہ اب بھی اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"میں اُسے بتاؤں گا ہی نہیں۔ رخصت ہوتے وقت کاغذ دے جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد وہ دیکھے گی تو خود بخود اُسے قبول کرنا ہو گا۔"

"نہیں نہیں۔" اُس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ وہ مجھے سمجھا رہا مگر میں اپنی بات پر تُلا رہا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ رقم اُس کی جیب سے نہیں جا رہی ہے اور جولین کو وہ خود بھی پسند کرتا ہے۔ مجھے سوچنا چاہیے کہ پھر اُس کی نا آمادگی کی کیا وجہ ہے۔ "تم کب جا رہے ہو؟" اُس نے اُکتاہٹ کی سے پوچھا۔

"کل رات۔"

"اور کہاں جا رہے ہو؟"

"کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"کوئی تو منزل ہو گی؟" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی شاید کلکتہ سمجھیے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"وہاں تمھارا پتہ کیا ہو گا؟"

"میرا پتہ!" میں سوچنے لگا کہ اُسے کیا پتہ بتاؤں۔ مجھے کلکتے میں [illegible] ہنا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر میں کلکتے گیا تو وہاں شاید چند [illegible] ٹھیروں گا پھر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ "مگر آپ پتہ کیوں پوچھ رہے [illegible]" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارے بارے میں کوئی خط آیا تو کہاں مطلع کروں؟"

"چھوڑیے شکلا جی! خط آنا ہوتا تو اب تک آ جاتا۔"

"مجھے اب بھی اُمید ہے۔ فرض کرو، تمھاری عدم موجودگی میں کوئی [illegible] سے آ جائے تو میں تمھیں کہاں ڈھونڈوں؟"

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے اُسے فیض آباد میں زریں کا [illegible] دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے خط لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی [illegible] اُس نے لکھا بھی تو زریں کے پاس وہ خط محفوظ رہے گا۔ وہ مجھل کو مطلع [illegible] گی۔ یہ پتہ کسی اڈے کا نہیں تھا، زریں کا تھا۔ شکلا نے اسے [illegible] میں نوٹ کر لیا۔ میں نے دوبارہ اُس کی توجہ رقم کی طرف دلائی۔ اُس [illegible] مشورہ دیا کہ مجھے اور سوچ لینا چاہیے۔ یہ رقم بعد میں بھی کسی وقت [illegible] ہو سکتی ہے۔ اُس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شاید بعد میں میرا [illegible] بدل جائے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کاغذات کی تکمیل کے [illegible] اس وقت میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اُٹھ گیا۔ میں نے اُس [illegible] ورغلا لیا کہ وہ اپنی ملازمت پر واپس چلا جائے گا۔ اُس نے مجھے [illegible] گلے لگایا، میرے گال چومے اور کہا کہ کل کسی وقت مجھ سے ملنے [illegible] لیے وہ گھر آئے گا۔

باہر آنے کے بعد ہی میں نے کسی وکیل کی تلاش شروع کر دی۔ [illegible] میں ایک جگہ ایک بورڈ پر میری نظر پڑی۔ میں جھجکتے جھجکتے وکیل [illegible] میں پہنچا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اُس نے میری بات پوری توجہ [illegible] اور سر ہلاتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ اُس نے کئی بار میری شکل دیکھی۔ [illegible] کوئی جرم ہوں۔ میں نے اُسے اپنی پوری فائل دکھائی پھر وہ مجھ [illegible] طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ جولین میری کون ہوتی ہے اور میں یہ [illegible] اُسے کیوں دے رہا ہوں۔ میں نے کہا، تمھیں اس سے کیا، تم تو کاغذ [illegible] کے مجھے دے دو اور اپنی فیس بتا دو۔ وہ بڑی مشکل سے آمادہ [illegible] اُس نے بتایا کہ زیادہ لمبے چوڑے طریقۂ کار میں پڑنے کی ضرورت [illegible] ہے۔ میں جولین کے نام جس رقم کا چاہوں، ایک چیک کاٹ [illegible] اور چیک کے ساتھ احتیاط کے طور پر جینک کر خط بھی لکھ سکتا [illegible] خط کا مضمون بھی اُس نے مجھے بتا دیا۔ میں نے فیس کے لیے کہا تو اُس نے انکار کر دیا کہ وہ مشورے کی فیس نہیں لیتا۔ میری جیب میں پیسے بھی کم تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ زیادہ پیسے نہ مانگ لے۔ اب تمام کام مجھے کرنا تھا۔ وکیل سے بات کر کے مجھے اپنا وطن کچھ کم محسوس ہوا۔

پاڑے میں مجھل کی وہ آخری رات تھی۔ جامو اور کانتے میرے ساتھ تھے۔ آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ ہر طرف بریانی اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ آج وہاں مارفی بھی نظر آ رہا تھا۔ زورا اور بھیدا بھی تھے۔ پیرو گرمجھل کے پاس بیٹھا ہوا تھا مگر کسی سے بہت کم بات کر رہا تھا۔ میں نے مارفی کو جولین کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ وہ رونے لگا اور بولا کہ راجا! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں پھر کبھی ضرور ملاقات ہو گی۔ جامو اور کانتے بھی اُن کے درمیان گھرے رہے۔ سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد رامائے کی جگہ پیرو ساز ندوں اور طوائفوں نے قبضہ کر لیا۔ آج ایک نہیں چار چار طوائفیں موجود تھیں۔ سب زرق برق لباس پہنے اور سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ گانے میں ہم بس تھوڑی دیر بیٹھے۔ جامو اور کانتے کی وجہ سے مجھے بھی رکنا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے تو محفل درہم برہم ہو گئی۔ مجھل اور پیرو کے آنسو تھمنا بھی ہمارے ساتھ ہی میں آ گئے اور باہر بھی میں اپنے سینوں میں بھینچے رہے۔

جولین نے میرے لیے ایک سوٹ کیس خرید لیا تھا۔ میرے تمام کپڑے اُسی سوٹ کیس میں بھر دیے گئے تھے۔ یہ کپڑے کرشنا جی نے بنوائے تھے اور بعد میں جولین نے سلوائے تھے۔ ہم گھر پہنچے تو یہی تیاری ہو رہی تھی۔ جولین نے مجھل کا نتے اور جامو کے کپڑے بھی نکالے تھے۔ جولین کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ میں تولیے کمرے میں آ گیا۔ وہ دونوں رات گئے تک باہر ہی بیٹھے رہے۔ صبح ہوئی تو میں آخری بار ملنے تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ ممکن ہے، وہ اسی شہر میں ہو اور اب تک میری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔ میں گھنٹوں حیران و پریشان ہوں پر کھڑا ہوا لوگوں کو تکتا رہا۔ شام کو واپس آیا تو میرے پیروں میں دُکھن ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر ایک نئی لمبی سیاہ موٹر کھڑی تھی اور بلدیو کی ڈرائیور سیٹ پر اونگھ رہا تھا۔ یہ موٹر میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ڈرائیور سے پوچھ لینا مناسب سمجھا کہ اندر کون آیا ہے۔ اُس نے نورین کا نام لیا۔ مجھے تسلی ہوئی۔ اندر نورین ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں اکثر آتی رہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل بھی آئی تھی اور مجھ سے اُسے میری روانگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک گل دستہ لائی تھی اور گیارہ بجے دن سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُسے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ وہ نیل نیس اور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے گلے میں ایک خوبصورت بند تھا۔ بالکل کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہو رہی تھی۔ اگر میں کل نہ آتی تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔ وہ شکایت کرنے لگی۔ میں نے اُس سے معذرت کی کہ میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے اس دوران میں اُس سے نہیں مل سکا اور نہ اُس

کے گھر آسکا۔ نورین نے میری معذرت قبول کرلی اور کرشنا جی کا ذکر کرنے لگی کہ کلب میں لوگ انھیں بہت یاد کرتے ہیں اور کبھی کبھی میرا تذکرہ بھی ہو جاتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہاں لوگ میرے بارے میں مختلف قسم کی باتیں کرتے ہیں اور ڈیڈی بھی تمھیں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ یہ باتیں نم آنکھوں سے کر رہی تھی۔ جولین بھی موجود تھی۔ نورین نے اُس سے ہائی ہیلو کیا اور جولین جیسے ہی اندر گئی، نورین کھسک کے میرے قریب آگئی۔ اُس نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کچھ وقت ہے؟ میں نے جواب دیا کہ گاڑی رات کو جاتی ہے، ابھی خاصا وقت پڑا ہے۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں مگر یہاں نہیں۔ پھر کبھی سہی۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں یہیں پہنچا دوں گی۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"کیسی باتیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کچھ اہم باتیں۔" میں نے تجسس سے اُسے دیکھا۔ وہ تیزی سے بولی۔ "ایسی کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ بس تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں نے بے تابی سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جولین کے آنے پر وہ چپ ہو گئی۔ میرے دل کو بے کلی ہو گئی کہ وہ مجھ سے ایسی کیا باتیں کرنا چاہتی ہے۔ چند منٹ بعد وہ واپس جانے لگی۔ میں بھی اُس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ جولین اور چمپا بھی دروازے سے باہر آگئی تھیں۔ نورین نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے ابھی کچھ دیر بعد واپس لے آئے گی۔ وہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔ موٹر فراٹے سے روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اعلا درجے کے ایک پُرسکون اور ٹھنڈے ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "تمھارے پاس وقت کم ہے اس لیے میں کسی تمہید کے بغیر بات کروں گی۔" وہ میرے کو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کہنے لگی۔ اردو میں بولی۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا نہیں آتا۔ میں تمھارے گھر کوئی دس بار آئی ہوں گی، تم کسی بار نہیں ملے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید جولین اور چمپا تمھیں میرے بارے میں کچھ بتاتی نہیں ہیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ انھوں نے ہر بار مجھے بتایا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" وہ عجلت میں بولی۔ "پہلے مجھے تم سے چند سوال کرنے ہیں جواب دیتے رہنا۔ پھر میں اپنی بات بتاؤں گی۔" اُس کی آواز میں لرزہ تھا۔

"پوچھیے۔"

"یہ بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگتی ہوں؟"

"جی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں مجھے بتاؤ کہ میں کیسی لگتی ہوں؟"

"تم..... تم بہت اچھی ہو۔"

"نہیں۔" وہ چِل کے بولی۔ "مجھے بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگتی ہوں؟ صرف چہرے مہرے اور رنگ روپ سے نہیں، دونوں طرح تمھیں پوری آزادی ہے کہ تم جس طرح سمجھتے ہو، کسی جھجک کے بغیر کہہ دو۔ مجھے خوشی کرنے کے لیے جواب نہ دینا۔ اب تم جا رہے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر کبھی نہ ملیں اور ایک دوسرے سے شرمندہ نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے تم سے صاف جواب کی اُمید نہ ہوتی تو میں یہ سوال کرتی ہی نہیں۔"

"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس میری بات کا جواب دو۔"

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"تم بھی مجھے اچھے لگتے ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔ میں نے طے کیا ہے کہ تم مجھ سے اور میں تم سے شادی کر لوں۔"

"کیا۔ ؟" میں اچھل گیا۔

"ہاں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ "یہ بات تمھیں عجیب محسوس ہو گی لیکن ہم ایک دوسرے کے کیوں جھجکیں اور غیر ضروری باتوں میں وقت کیوں ضائع کریں۔"

"مگر..... مگر۔" میری آواز دھڑکنے لگی۔

"ہاں تمھارے ذہن میں چند سوال آسکتے ہیں۔ پہلا سوال یہ آسکتا ہے کہ میں ایک پارسی لڑکی ہوں اور تم مسلمان ہو۔ میرے لیے یہ کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔ تمھارے لیے میں مسلمان ہو سکتی ہوں۔ دوسرا سوال شاید تمھارے ذہن میں یہ ہو کہ میں ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہوں اور تم اتنی بڑی حیثیت کے آدمی نہیں ہو۔ میں اسے بھی مسترد کرتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو جو کچھ تمھارا ہے، وہ میرا ہے اور جو میرا ہے، وہ تمھارا ہے۔ تیسرا یہ سوال تمھیں پریشان کر سکتا ہے کہ میرے ڈیڈی رستم جی کیسے اور کیوں تیار ہو جائیں گے تو اس کی فکر بھی چھوڑ دو۔ میرے ڈیڈی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں اُن کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انھوں نے بہت پہلے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں جسے پسند کروں گی، انھیں اُس کے ساتھ میری شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں نے ایک بار اُن سے تمھارا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے تمھارے بارے میں اچھی رائے ظاہر کی تھی۔ میں تمھارے لیے ایک اچھی بیوی ثابت ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے لیے ایک عمدہ شوہر....."

"نورین۔" میں نے سراسیمگی سے کچھ کہنا چاہا لیکن بے بسی سے خاموش ہو گیا۔

"تمھیں کوئی اور لڑکی مجھ سے زیادہ پسند ہو۔ یہ بات میرے لیے دکھ کی ہے لیکن میں تمھارے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تم اپنے لیے مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ میں چھ مہینے تک تمھارا انتظار کروں گی۔ یہ عرصہ سوچنے کے لیے بھی کافی ہو گا اور تمھیں کام نمٹانے کے لیے بھی۔"

"لیکن..... لیکن سوچنا کیا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"سوچنا ہے غیر۔ سوچنا چاہیے۔ میں نے اپنے طور پر تمھارے بارے میں خوب سوچ لیا ہے لیکن تم نے میرے متعلق اس انداز سے ممکن ہے نہ سوچا ہو۔ یہ شادی ہے۔ ہم دونوں زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ ایک دوسرے کے وفادار۔ ہم دو ہیں، ایک ہو جائیں گے۔ ہماری روحیں ایک

بندھ جائیں گی۔ سوچے بغیر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں سوچنے کا پورا موقع دینا چاہتی ہوں۔"

نورین کے گال تمتما سے تھے۔ میرا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ اُس نے بڑی جلدی کافی بنائی۔ ایک پیالی میرے آگے رکھی۔ میں نے اپنے منتشر مجتمع کرنے کی بہت کوشش کی۔ اُس سے کچھ کہنے کے لیے میرے لب کپکپانے لگے۔ "چلو اٹھو، تمھیں دیر ہو رہی ہے۔" اُس نے بیرے کے ایک نوٹ دے دیا اور ریستوراں سے نکل آئی۔ واپس پر اُس نے دکانوں سے میرے لیے سوٹ کا کپڑا، شیونگ کا سامان، جوتے، بسکٹوں کے ڈبے اور بہت سی چیزیں خریدیں اور تمام سامان کے ساتھ مجھے چھوڑ وہ اندر نہیں آئی۔ موٹر روانہ ہونے سے پہلے اُس نے یاسیت سے کہا تھا۔ "میرے مثبت جواب کی توقع نہ رکھنا۔" اُس نے کچھ اور بھی کہا جو میں سن نہیں۔ موٹر چل پڑی۔

گھر میں سبھی میرے منتظر تھے۔ انجل آچکا تھا۔ سوٹ کیس اور بستر ڈرائنگ روم میں رکھے تھے۔ جولین کانٹے اور جامو کے دلسوز نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ میری سانس قابو میں نہیں تھی اور مجھے سفر کے خیال سے بخار ہو رہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ انجل نے میرا بازو پکڑ کے مجھے جھنجوڑ دیا۔ "بات ہے لاڈلے؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

"چلنا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں چلو۔" میں نے بجھے بجھے انداز میں کہا۔ میں اُس سے اپنی اس کیفیت کا اظہار نہیں کر سکا کہ بس آج کے لیے سفر کا ارادہ منسوخ کر دیا جائے۔ ٹیکسی لینے چلا گیا تھا۔ دو ٹیکسیاں آئیں۔ جولین کی ماں گھر ہی پر تھی۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دعائیں دے کے مجھے رخصت کیا۔ چمپا اور میں ایک ٹیکسی میں اور دوسری میں وہ تینوں بیٹھ گئے۔

ٹیکسی میں خاموشی طاری تھی۔ پھر چمپا کی رقت بھری آواز اُبھری۔ "میاں خط لکھنا۔" میں نے گردن ہلائی۔ وہ آیتیں پڑھ پڑھ کے پھونک رہی تھی۔ اسٹیشن پر پیرو پہلے سے موجود تھا۔ اُس کے ساتھ قلی تھا۔ بھیڑ، بھگدڑ اور مار دھاڑ تھی۔ گاڑی روانہ ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے چمپا کو علیحدہ لے جا کے ایک لفافہ دیا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ گھر پہنچ کے کسی مناسب وقت لفافہ جولین کو دے دے۔ چمپا نے میری پیشانی چوم کے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر جھکا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ سب ہم سے بار بار گلے مل چکے تھے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی تو پیرو نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر تھام لیے اور پیشانی سے سر ٹکاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ اللہ تمھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے، شاد آباد رکھے۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "تمھاری مرادیں پوری ہوں۔ تمھارے لیے جیون سے لڑنے کا انتظام کرے۔"

میں چمپا سے الگ ہوا تو اُس کے پہلو میں کھڑے نمی ہوئی جولین کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں ویران تھیں۔ سوکھی سوکھی حال خال سی۔ میں نے اُسے دیکھا تو اُس پہ کپکپی طاری ہو گئی۔ اگر میں اُس کا بازو تھام لیتا تو شاید وہ گر جاتی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا۔ میں نے اُسے زور سے بھینچ کے اپنے بازوؤں میں بند کر لیا۔ جولین کی بچکیاں بندھ گئیں۔ اُسے انجل نے مجھ سے جدا کیا۔ گاڑی حرکت میں آگئی تھی۔ چمپا نے ایک طرف، دوسری طرف سے مادھی نے بھاگ کر جولین کو سنبھال لیا۔

ٹیڈا دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔

ڈبے میں ہم چار ہی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ برابر کلاس کا ڈبا تھا۔ اسٹیشن سے چلتے ہی گاڑی اندھیرے میں ڈوب گئی اور تدریج تیز ہوتی گئی۔ ڈبے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے سے دور نشستوں کے کونوں میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ دیر تک سامان نرکش ہی پر پڑا رہا۔ گھر سے جولین اور چمپا نے جو سامان ساتھ کیا تھا، اُس میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پیرو اور اُس کے آدمی کھانے پینے کی اتنی چیزیں ساتھ لائے تھے کہ ایک ہفتے کے سفر میں بھی بچ جائیں۔ جامو کانٹے اور انجل نے اپنے گلوں سے ہار اُتار کے برتھ پر ڈال دیے تھے۔ کچھ دیر بعد انجل قریب آگیا اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال کے آہستگی سے بولا۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تیاڑی کی ناک کاٹو نے کیا کیا لے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"وہ میں نے گٹر میں پھینک دی تھی۔"

"بڑی ٹھیک جگہ پہنچی تو نے۔"

"اور تیاڑی کا کیا ہوا؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"وہ بھی کسی ایسی ہی جگہ پڑا ہو گا۔" انجل اگھائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جانے دے اب تو سو جا۔ باتیں صبح ہوں گی۔" کچھ رکا کے مونا۔

"نیند بھوک نہیں ہے۔"

"کھالے! مجھے تو بہت لگ رہی ہے۔"

"تم کھالو میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اب جی سنبھال کے رکھ، کب تک۔ بچہ گردی کرے گا۔"

میں نے گھور کے اُسے دیکھا۔ "کیسی۔ بچہ گردی؟"

"ننھا ہو گیا؟" وہ ہنسنے لگا۔ "ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتا ہے۔ یہی تو بچہ گردی ہے اور کیا ہے۔ خبر ہے تیری عمر کیا ہے۔ تجھ سے

کیا کم ہوگی۔"

"میں ناراض تو نہیں ہوا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"لاڈلے!" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "اب کہیں اور مت نکل جانا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"میرے ساتھ ہی رہنا۔"

"تمھارے ساتھ! مگر مجھے تو۔۔۔!"

"ہوں ہوں۔ بے صبری مت کر۔ بے صبری میں سارا کام خراب ہوجاتا ہے۔ تو اگر مجھے پہلے بتادیتا تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔"

"تم اسے بے صبری کہتے ہو؟ سات سال وہاں گزر گئے، ایک سال سے اوپر ہوگیا اور تم۔۔۔۔ تم کیا کرسکتے ہو؟ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ تم کیا کوئی جادوگر ہو؟"

"ہاں۔" وہ اداسی سے بولا۔ "میں بھی مجبور ہوں پر لاڈلے! اکہری سوچ سے دُہری سوچ اچھی ہوتی ہے۔ میں تجھ سے کچھ سوچ سمجھ کے ہی بولتا ہوں۔"

"اب تو تمھیں تقدیر بتا ساری باتیں معلوم ہیں مجھے سوچ کے جواب دو کہ میں کیا کروں؟" میں نے زہرخند سے کہا۔ "تم تو مجھے کلکتے لیے جا رہے ہو لیکن میں تمھیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں، مجھے کلکتے میں نہیں رہنا ہے۔ تم وہاں جا کے اڈے پر بیٹھو۔ جب تم اس معاملے میں کچھ کر ہی نہیں سکتے تو خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں چلا جاؤں گا۔ کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"میں نے تجھ سے کب بولا ہے کہ تو کلکتے میں رہنا۔ کون چاہتا ہے کہ تو اڈے پہ بیٹھے۔ پہلا لاڈلے! اب تو جائے گا نہیں میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔" وہ مکیدہ لہجے میں بولا۔ "اور اگر تو چلا گیا تو سمجھ لینا کہ میں تجھ سے کبھی بات تک نہیں کروں گا اور تو بھی کبھی میرا نام مت لینا۔"

"تو تم میرے ساتھ چلو گے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ایسا بنا تو میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"کہاں تک؟" میں نے بھنچے کہا۔ "تلوں میں چھلے پڑجائیں گے۔"

"میرے دل میں چھلے پڑے ہوئے ہیں، تو تلوں کی بات کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "تم نے طے کر ہی لیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ تم نے تو کرنے کے لیے کوئی بات نہیں رکھی۔"

"لاڈلے! مجھے ایک بار تفصیل سے تمام باتیں بتا۔ دیکھ اب کچھ چھپانا نہیں۔ ہر بات بول دے۔" وہ اپنا بازو تنگ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر کوئی بات رہ گئی تو شاید میں کچھ فیصلہ نہ کرسکوں۔"

جاوا اور کانتے اونگھنے لگے تھے۔ میں نے اُسے ساری باتیں ترتیب سے بتادیں۔ گھر سے نکلنے کا سارا واقعہ، اپنا اصل نام مولوی محمد تحقیق کے ساتھ اور کلکتے کے مختلف ہوٹلوں میں قیام۔ بدھ گیا میں کورا کی تلاش میں بھٹکنے والے بھکشو کی بے تابی، اُس کا قتل۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ وہ یہ سب کچھ سُن کے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ کیوں؟ کیسے سوچنے لگے؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"لے! جواب تو آٹھ سال سے سوچ رہا ہے۔ کیا مجھے اُس کے لیے چند گھنٹوں کا وقت بھی نہیں دے گا؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"گھنٹے کیا، دن لے لو، سال لے لو۔" میں نے تنک کے کہا۔ "یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ سوچنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ کچھ نہیں ملے گا۔"

"کیسی باتیں کررہا ہے لے!" وہ ناگواری سے بولا۔ "جب تو اتنا مایوس ہے تو پھر خود کیوں کسی ایک جگہ نہیں ٹک جاتا؟"

"میرا کیا ہے۔ اگر میں کہیں دیر تک ٹھہر جاتا ہوں تو میرا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ میرے سینے میں جلن ہونے لگتی ہے۔ جب میں چلنے لگتا ہوں تو میری طبیعت ٹھیری رہتی ہے۔ میرے نصیب ہی میں یہ لکھا ہے پھل بھائی! مجھے معلوم ہے، دُنیا بہت بڑی ہے۔ اس بڑی دُنیا میں اُسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ جدھر دیکھو اُدھر ہی ایک راستہ جاتا ہے مگر وہ آخر کسی جگہ تو رہتی ہوگی۔ رہتی ہوگی نا؟"

"کیوں نہیں ہابرے! شیر ببر اُسے ڈھونڈیں گے۔ کلکتے جانا ضروری ہے، تھوڑے دن ٹھیر کے پھر نکل پڑیں گے۔"

"مگر کس طرف؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"سوچنے دے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو نے بتایا کہ وہ مولوی کلکتے کے ایک مدرسے میں پڑھاتا تھا اور مراد آباد شہر میں تھا۔"

"ہاں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "مگر میں مدرسے بھی گیا اور مراد آباد بھی۔ اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ جیسا کہ میں نے تمھیں ابھی بتایا ہے۔"

"پھل پھر چپ ہوگیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چونک کے مجھ سے کوئی بات پوچھتا۔ پھر کھو جاتا۔ سارے سفر میں اُس کا یہی حال رہا۔ جاوا اور کانتے بیشتر وقت سوتے رہے اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا بھاگتی ہوئی بستیاں دیکھتا رہا۔ کبھی اسٹیشن آتا، میں اُتر جاتا۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا

اس دلچسپ ترین داستان کے
بقیہ واقعات دوسرے حصے
میں ملاحظہ فرمائیں